دوسرا سال
پہلا شمارہ

مجلس ادارت:

- ڈاکٹر عبد المغنی (پٹنہ)
- ڈاکٹر ابن فرید (علی گڑھ)
- ڈاکٹر احمد سجاد (رانچی)
- حفیظ میرٹھی (میرٹھ)
- طیب عثمانی (گیا)
- کیف نوگانوی (بھنڈارا)

مدیر:
ابوالمجاہد زاہد

- ایک شمارہ: تین روپے
- بارہ شمارے: تیس روپے

مدیر مسئول:
م۔ نسیم

معاون مدیران:
شبنم سبحانی
عزیز بگھروی

پاکستان میں:
۱۶۵، کلے ٹن روڈ، کراچی ۵
فون: ۴۱۰۶۶۶

★ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر: م۔ نسیم
● مقام اشاعت: ۲۴۴۸
بارہ دری شیر افگن، بلیماران، دہلی ۶

ترتیب

اداریہ

کوئی معاشرہ جب ظلم کے خلاف تاب مقاومت سے محروم ہو جاتا ہے اور جب کسی سماج میں ایسے لوگوں کی تعداد پت جھڑ کے موسم میں درختوں کی شاخوں پر رہ جانے والے معدودے چند پتوں کی مانند کم سے کم تر ہو جاتی ہے جو مظلوم کی حمایت میں آواز بلند کر سکیں تو یہ سمجھنا چاہئے کہ اب اس معاشرہ کی نبضیں ڈوب رہی ہیں اور ایک مہلک مرض نے اس کو آگھیرا ہے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں اپنے وطن عزیز کی تاریخ میں ہم ایسے دو نازک ادوار سے روشناس ہیں جب ہماری اقدار کی شمعیں جھلملا رہی تھیں، فرد کے دل میں خود اعتمادی کی چنگاری بجھ گئی تھی اور حمایت مظلوم میں لب کشا ہونا اتنا دشوار ہو گیا تھا جتنا کہ کھنچی ہوئی تلوار کے روبرو کلمۂ حق زبان پر لانا جاں گسل ہے۔ ایک عہد وہ تھا جب دلی کے تخت پر کم سند نااہل حکمرانوں کی وجہ سے ملک کا گوشہ گوشہ فتنہ و ہنگامہ کی آماجگاہ بن چکا تھا اور نظیر اکبر آبادی جیسے سخت دل اور رجائیت پسند شاعر کو بھی یہ کہنا پڑا تھا — مانگو عزیزو ایسے برے وقت سے پناہ۔

اور دوسرا دور وہ تھا جب انگریزی تہذیب کا جلال و جبروت ہر ہندوستانی کے شعور و لاشعور پر مستولی ہو چکا تھا اور ہر وہ شئے جس کا تعلق مغرب سے تھا دل کش و دلآویز تھی اور ہر وہ چیز جو مشرق کی پروردہ تھی حقیر و ناقابل توجہ تھی۔ غدر ۵۷ء کے ہولناک نتائج کے بعد پورا ملک انگریزی اقتدار کے سامنے گھٹنے ٹیک چکا تھا۔ لسان العصر اکبر بھی یہ کہنے پر مجبور تھے کہ ؂

نہ حالی کی مناجاتوں کی پروا کی زمانے نے — نہ اکبر کی نصیحت سے رکے یاران خود آرا

ہمارے ملک کی موجودہ تاریخ بھی ایسے ہی ایک اور مرحلے سے ہمکنار ہے۔ جمہوریت کے لبادوں میں حکمرانی کے سرچشموں پر جو ساحرانہ قوتیں قابض ہیں انہیں مکر و فریب اور ظلم و جبر کی صد با کرشمہ کاریوں پر عبور ہے اور اس کا سحر ادب و تہذیب اور فکر و ثقافت کے تمام اداروں کو متاثر و منحرف کر رہا ہے۔ ابلاغ و ترسیل کے جملہ وسائل اور منزلت و مدارات کے تمام اسباب اہل فن اور اہل قلم کے ضمیر کو صید زبوں بنانے میں شب و روز مصروف ہیں۔ کیا ان حالات میں ادب فرد و معاشرہ کا ساخت حیات میں شریک سفر بن سکتا ہے اور ان کے اندرون کو روشن اور ان کی منزل سفر کو تابناک بنا سکتا ہے۔ اس سوال پر ہمیں غور کرنا ہے تاکہ ہم ادب کو اس کا صحیح منصب بحال کرا سکیں۔ اور عوام سے اس کے رشتے کو دوبارہ استوار کر سکیں۔ فرد کے دل کی دھڑکنیں اور معاشرہ کی نبض کی تھرتھراہٹیں اگر عصر رواں کے ساز ادب کے پردہ کو مرتعش نہ کر سکیں اور اس عہد کا صاحب قلم جرأت گفتار اور عظمت کردار کے بلند مقام سے خوف و دہشت، ظلم و ناانصافی، ضمیر فروشی اور کردار کشی کے خلاف صدائے احتجاج نہ بلند کر سکا اور فرد کو ایک تابناک مستقبل کی تعمیر کے لئے اس انداز سے بشارت نہ دے سکا جیسے علامہ اقبال نے پہلی جنگ عظیم کے بعد خضر راہ میں اور دوسری جنگ عظیم سے پہلے مسجد قرطبہ اور ساقی نامہ میں دی تھی تو اس عہد کا تاریخ اس عہد کے قلمکار کو کبھی معاف نہ کرے گی۔

نمائندہ

ماہنامہ **نئی نسلیں** کے بارے میں

اہم اعلان

سن ۱۹۸۰ء کے مارچ سے "نئی نسلیں" کا ایک دوسرا دور، نام کی ذرا سی تبدیلی کے ساتھ شروع ہوا۔ کسی رسالہ کا اجرا آج کل دوسری شادی کرنے کے برابر ہے۔ اوّل نقصانِ مایہ — دوم شماتتِ ہمسایہ۔ یہ رسالہ بھی اسی دوطرفہ مصیبت کا شکار رہا ہے۔ بہت سی دِقتوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ رسالہ کا جنم ایک جگہ ہوا، پرورش دوسری جگہ اور تعلیم تیسری جگہ — گویا بندہ ایک اور باپ، بیٹا اور "روح" بندگی تینوں کی۔

اس حالت کی ذمہ داری رسالے کے مدیر مسئول پر بھی تھی جو نئی دنیا کی کھوج میں گئے ہوئے تھے۔ اب، کافی سوچ بچار اور بہت سی ہمت آفریں تجزیوں کے ساتھ یہ انتظام طے ہوا ہے کہ:

رسالہ انشاءاللہ آئندہ سے علی گڑھ سے شائع ہوگا۔

- عارضی پتہ یہ ہے:
  ۴، عبداللہ مارکٹ، علی گڑھ یوپی
  مستقل پتہ اگلے شمارے میں شائع ہوگا۔
- تمام سالانہ خریداروں کو بارہ شمارے بھیجے جائیں گے۔ چاہے کچھ شمارے دو ماہ کے یکجائی شائع ہوں۔ (اسی لئے سالانہ قیمت کی جگہ بارہ شماروں کی قیمت لکھا جاتا ہے)
- **انتظامی باتوں کے علاوہ، تمام مقالات اور نثری تخلیقات:**
  جناب ڈاکٹر ابنِ فرید، حفیظ منزل، میرس روڈ علی گڑھ کے پتے پر بھیجی جائیں۔
- **شعری تخلیقات:**
  جناب ابوالمجاہد زاہد درس گاہ اسلامی دو محلہ روڈ، رام پور کے پتے پر روانہ کی جائیں۔

یہ اعلان پڑھنے والے دعا بھی کریں کہ یہ نیا انتظام نومولود رسالے کو راس آئے۔

(م نسیم۔ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر)

فنِ تنقید

پروفیسر عبدالسلام (کراچی)

نیاز فتحپوری نے ٹھیک لکھا ہے کہ تنقید کا لفظ جس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اس کے لئے صحیح لفظ نقد یا انتقاد ہے لیکن تنقید کا لفظ اس قدر مستعمل اور عام فہم ہے کہ غلط ہونے کے باوجود اسے ترک کرنا مناسب نہیں۔ یہ غلط العوام نہیں بلکہ غلط العام ہے اور اسی لئے فصیح سمجھے جانے کا مستحق ہے۔

تنقید کے معنیٰ میں پرکھنے یا کسوٹی پر کسنے کے ہیں گویا یہ لفظ اپنے مقاصد کی طرف رہنمائی کرنے کے لحاظ سے اپنے انگریزی مترادف (CRITICISM) سے زیادہ واضح ہے۔ انگریزی میں (CRITICISM) کے معنی انصاف کرنے یا فیصلہ صادر کرنے کے ہیں۔

ہمارے یہاں عام گفتگو میں تنقید سے مراد نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ یہ معنی بہت پرانے زمانے سے اس سے منسوب ہوتے چلے آئے ہیں۔ چنانچہ اردو ادب کے ابتدائی ادوار میں بہت سے نقاد یہی فرض انجام دیتے رہے ہیں۔ بعض لوگ تنقید کا صحیح شعور نہ رکھنے کی وجہ سے آج تک اس لفظ سے جھجکتے ہیں اور اسے ایک مذموم فعل قرار دیتے ہیں اس غلطی میں عامی ہی نہیں پڑھے لکھے اور بعض ممتاز شعرا بھی مبتلا ہیں مثلاً جوشؔ نے "نقاد" کے عنوان سے جو نظم کہی ہے اس میں نقاد کو "ادب ناآشنا" "اندر زندانِ علم و کتاب" وغیرہ کہہ کر پکارا گیا ہے جو فن تنقید کو اس قدر مذموم فعل قرار دینا تنقیدی شعور کی کوتاہی کو ظاہر کرتا ہے کلیم الدین نے ایک جگہ ایلیٹ کا قول نقل کیا ہے لکھا ہے :- "غالباً کسی مصنف کی تصنیف میں جو محنت صرف ہوتی ہے اس محنت کا بڑا حصہ تنقیدی محنت چھان بین کرنا۔ ترتیب دینا، تعمیر کرنا کچھ بدلنا اور خارج کرنا۔ خامیوں کو دور کرنا اور پھر جانچنا۔ یہ محنت یہ کاوش صرف تخلیقی نہیں تنقیدی بھی ہے .... بعض فنکار دوسرے فنکاروں سے بہتر ہوتے ہیں تو صرف اس لئے کہ ان کی قوتِ تنقید زیادہ اچھی ہے۔

کسی مغربی نقاد کا قول ہے کہ ادیب میں تین شخصیتیں

غزل

قمر مرادآبادی

چمن میں جب کبھی پیغامِ رنگ و بو آئے
خدا کرے مجھے آواز دینے تو آئے

ہیں اہلِ شوق یہ ہم فصلِ گل سے کیا مطلب
بہار آئے نہ آئے چمن میں تو آئے

یہ چاند تارے، یہ برق و شرر، یہ کاہکشاں
مجھے نہیں جو کبھی تو بھی روبرو آئے

تمہارے دم سے بہاریں ہیں لالہ و گل کی
چمن میں تم چلے آؤ تو رنگ و بو آئے

گئے تھے شوق و تمنا و آرزو لے کر
ہم ان کی بزم سے لیکن لہو لہو آئے

چھپا ہے حسن خود اپنی نظر کے پردے میں
یہ پردہ اٹھے تو وہ جانِ آرزو آئے

چلا ہوں ان کی طرف عرضِ مدعا کے لئے
خدا کرے مجھے اندازِ گفتگو آئے

تلاشِ دوست میں دونوں جہاں سے گذرا ہوں
یہ دیکھنا ہے کہاں حدِ جستجو آئے

خدا کا شکر، بڑا سخت امتحاں تھا قمرؔ
ہم آج کوچۂ قاتل سے سرخرو آئے

پوشیدہ ہوتی ہیں۔ (۱) شاہد و ناظر کی شخصیت جس سے وہ کائنات کا مشاہدہ کرتا ہے (۲) خالق کی شخصیت جس سے وہ ادب کی تخلیق کرتا ہے (۳) نقاد کی شخصیت۔

ادب میں اگر تنقیدی عنصر نہ ہوگا یا کم ہوگا، تو وہ اپنے کلام کو ... ریالیس سے پاک نہ کر سکے گا۔ مومنؔ نے بھی اپنے کلام کو بے مثال سمجھ کر اسے بہتر بنانے کی کوشش نہیں

۷- میر بھی اگر اپنے کلام پر نظرِ ثانی کر لیتے تو ان کا مرتبہ ... ادب میں اور بھی بلند ہوتا۔ غالب کا بھی اگر پورا کلام شائع ہوتا تو شاید نہیں یہ عظمت حاصل نہ ہوتی مگر اپنے محبوب کی طرح وہ بھی آرائشِ جمال سے فراغت حاصل کرنے کے قائل نہ تھے۔

تنقید کی وہ صورت جسے ہم تنقیص یا نکوہی تنقید کہہ سکتے ہیں واقعی بڑی مذموم چیز ہے لیکن اس سے بھی زیادہ گمراہ کن وہ تنقید ہے جس کا منشا صرف مدح سرائی ہو ہمارے تذکرے اس قسم کی تنقید سے پُر ہیں۔ حقیقتاً ان دونوں صورتوں کو تنقید سے کوئی مناسبت نہیں یہ خرابی ہمارے یہاں ہی نہیں بلکہ مغرب میں بھی رائج رہی ہے۔ البتہ اس کی مثالیں ہمارے یہاں کے مقابلہ میں وہاں بہت کم ہیں ڈاکٹر زور نے "روحِ تنقید" میں ایڈیسن کا قول نقل کیا ہے وہ کہتا ہے "صحیح نقاد وہی ہے جو خوبیوں پر نظر رکھتا ہے اور معائب کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔

سینٹ بیو نے لکھا ہے "پڑھنا، سمجھنا، بحث کرنا اور دوسروں کو اس پر مجبور کرنا، تنقید کہلاتا ہے۔ تنقید کو اگر مدح سرائی کے لئے مخصوص کر دیا جائے، تو اس سے ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ تنقیدی صلاحیت نہ قارئین میں رہے گی، نہ فنکار میں۔"

بعض نقاد تنقید سے صرف تشریح کا کام لینا چاہتے ہیں۔ والٹر پیٹر کے خیال میں نقاد کا کام صرف یہ ہے کہ وہ محاسن کو محسوس کرے اور ان کی تشریح کر دے اور نتائج اخذ کرنے کا کام قارئین پر چھوڑ دے۔ تشریح یقیناً تنقید کے مقاصد میں داخل ہے مگر تنقید کا بدل نہیں ہو سکتی۔

میتھیو آرنلڈ نے لکھا ہے کہ تنقید کا مقصد صرف یہی ہے کہ دنیا میں جسے بہترین تصور کیا جاتا ہے اسے جاننا اور پھر دوسروں کو بتلانا۔ اس طرح سچے اور تازہ خیالات کی ایک رو پیدا کرنا اس کا کام ہے اور اس خدمت کو بے لاگ رعایت دیانتداری اور مطلوبہ اہلیت کے ساتھ انجام دینا اس کے علاوہ اس کا کوئی مقصد نہیں ہے اسے مستقل

نتائج سے تعلق رکھنے والے تمام سوالات سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہیے۔ دراصل آرنلڈ اخلاق پرست ادیب تھا اس نے علم و فن کی ہر شاخ کو عیسائی اخلاقیات کے تابع کرنا چاہا اس نے تنقید کے لئے جس غیر جانب داری پر زور دیا ہے وہ تنقید کا ایک زریں اصول ہے مگر یہ مقام بڑی ریاضت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ خود آرنلڈ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ساری عمر غیر جانب دار نہ رہ سکا۔ عملی نتائج سے بے تعلق ہونے کا اس نے جو مشورہ دیا ہے اس سے دراصل اس کا اشارہ سیاست کی جانب تھا وہ کہتا ہے کہ تنقید کو سیاسی نظریات کا محکوم نہیں ہونا چاہیئے اسی سلسلہ میں آل احمد سرور نے لکھا ہے "تنقید کو سیاست کی غلامی نہیں کرنا چاہیئے سیاست کا ساتھ دینا چاہیے۔ اس کی رفاقت کرنی چاہیئے۔" سیاست کی غلامی اختیار کر کے تنقید اپنے مقام سے گر جاتی ہے اور تنقید نہیں رہتی پروپیگنڈا ہو جاتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ خطرناک ہمارے زمانہ میں ادبی گروہ بندیاں ہیں جن کے اثر سے نقاد اپنے گروہ سے تعلق رکھنے والے ہر ادیب کی بے جا حمایت کرتا ہے آرنلڈ نے تنقید کی جو تعریف کی ہے ایلیٹ اس سے غیر مطمئن نظر آتا ہے اس نے لکھا ہے

THE DISINTERESTED ENDEAVOUR TO KNOW IS ONLY A PRE-REQUISITE OF THE CRITIC, AND IS NOT CRITICISM, WHICH MAY BE THE RESULT OF SUCH AN ENDEAVOUR

"جاننے کی غیر جانب دارانہ کوشش تنقید نہیں ہے بلکہ یہ تو نقاد کا محض ایک لازمہ ہے تنقید تو دراصل ایسی کوشش کا نتیجہ ہوتی ہے۔"

اس کے نزدیک تنقید کا لب لباب یہ ہے کہ انسان اچھی نظم کو منتخب کر سکے اور بری نظم کو رد کر سکے۔ اس کی صلاحیت کی سخت ترین آزمائش ہے کسی نئی نظم کو منتخب کر سکنا اور ایک نئی صورت حال کی طرف متوجہ ہونا۔ ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ پرانے شعرا اور نثر نگاروں پر لوگ

غزل

فضا ابن فیضی

بحر میں خاک اُڑی، دشت میں پانی پھیلا
تو بھی جا شہر میں یہ جھوٹی کہانی پھیلا

اپنی ہی ضد کے سہارے ہوئی سب کی پہچان
دھوپ کا نام بھی سائے کی زبانی پھیلا

کہیں ایسا نہ ہو، یہ بھی تہی مایہ نکلیں
سامنے لفظوں کے، مت دستِ معانی پھیلا

ڈھل کر اک نقطۂ موہوم میں رہ جائے گا
اس قدر بھی نہ بساطِ ہمہ دانی پھیلا

سارے چہروں پہ وہی کہنہ خط و خال ہیں ثبت
کچھ نئے نقش، سرِ صفحۂ ثانی پھیلا

وہ عجب شخص ہے، جب سے مرا ہمسایہ ہوا
اور کچھ دائرۂ بُعدِ مکانی پھیلا

چھاؤں اندر کی نہ کر دے ترے جذبات کو سرد
دھوپ کو اور سرِ نخلِ جوانی پھیلا

خامشی نکلی مری، کتنی معانی انگیز
دور تک سلسلۂ سحرِ بیانی پھیلا

یوں کہ ہوں لفظ کے پیکر سا، مری بات بھی لو
ورنہ کس کے لئے آغوشِ معانی پھیلا

اے فضا یہ تری فکرِ طرب انشا کا فروغ
مجھ سے قطرے میں بھی ارمانِ روانی پھیلا

زیادہ لکھتے ہیں غالب اور اقبال پر زیادہ کتابیں صرف اس لیے نہیں لکھی جا رہی ہیں کہ ان کا شمار اردو کے عظیم ترین شاعروں میں ہوتا ہے بلکہ اس لئے بھی کہ ان پر لکھنا آسان

غزل

اظہر کمالی۔ بدایونی

چار و ناچار آرہے ہیں خستہ حالوں کی طرف
دھوپ ہے اب سایۂ دیوار والوں کی طرف
روشنی میں لوگ ٹھوکر کھائیں گے ہر گام پر
یہ خبر ہوتی تو کیوں آتے اُجالوں کی طرف
روح بھی تو پیرہن کے ساتھ میلی ہو گئی
کیوں گئے ہم تن کے اجلوں من کے کالوں کی طرف
زرد پتے کہہ رہے ہیں کچھ زبانِ حال سے
غالباً روئے سخن ہے نو نہالوں کی طرف
دیکھ کر شہرِ خرد میں حسنِ تعمیرِ حیات
ذہن جاتا ہے جنوں کے خوش خیالوں کی طرف
سوچئے پتھر نہ آئیں گے تو کیا پھول آئیں گے
آئینہ خانوں کے اندر رہنے والوں کی طرف
اے مسافر خارِ صحرا کتنی امیدوں کیساتھ
دیکھتے ہوں گے ترے تلووں کے چھالوں کیطرف
کوئی آخر کیسے رکھے، تا بہ کے رکھے نگاہ
آستینوں اور داما نوں کے بالوں کی طرف
وہ نگاہیں غار کی تہہ کی خبر کیا لائیں گی
دیکھتی ہیں جو فقط مکڑی کے جالوں کی طرف
کوئی کیوں پہنچے مآلِ خندۂ گل دیکھ کر
گریۂ شبنم میں پوشیدہ سوالوں کی طرف
دیکھنا تھا ہم کو اظہرؔ سوئے زندانِ صلیب
دیکھتے ہیں ہم کتابوں کے حوالوں کی طرف

ہے۔ الف کے قول سے ب کی تردید کر دیجئے اور "ب" کے قول سے "ج" کی اور پھر ان کو ملا کر کوئی نئی بات پیدا کر دیجئے ہماری تنقید کا بیشتر حصہ اسی قسم کا ہے اچھے نثر نگار یا نظم کی دریافت کی صلاحیت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔

تنقید کی ماہیئت کے بارے میں مختلف لوگوں نے مختلف باتیں کہی ہیں۔ دراصل ہر شخص نے تنقید کے بارے میں اپنے اپنے عقیدہ کا اظہار کیا ہے کولرج نے لکھا تھا "تنقید کی غرض و غایت تحریر و تصنیف کے اصول قائم کرنا ہے نہ کہ دوسروں کی تصانیف پر فیصلے صادر کرنے کے اصول مہیا کرنا کولرج کے یہاں دراصل ارسطو کے نظریۂ تنقید کی آواز بازگشت سنائی دے رہی ہے۔ ارسطو سے لے کر تقریباً ڈرائیڈن تک تنقید کا رخ مصنفین کی جانب تھا نقادوں کے نزدیک ان کے قارئین وہی تھے۔ ارسطو نے یونان کے اچھے المیوں طربیوں اور رزمیہ نظموں پر بحث کر کے گویا لکھنے والوں کو یہ بتایا ہے کہ ان نظموں کو اس طرح لکھیں۔ اسی نقطۂ نظر سے ادب میں سند کو اہمیت دینے کا رواج ہوا اور یہ مرض اس حد تک پھیل گیا تھا کہ ایجاد واختراع پر سند یعنی اتباع کو برتری دی جاتی تھی۔ غالب نے جو ترکیبیں استعمال کی تھیں وقت کے سخن فہموں نے ان کے حسن و قبح پر غور کرنے اور فیصلہ صادر کرنے کے بجائے ان سے سند طلب کی یہ سند کا پھندا ہمارے یہاں پچھلے ۵۰-۶۰ سال سے ٹوٹنا شروع ہوا اور اب سند کی آواز شاید ہی کسی گوشے سے بلند ہوتی ہے۔

ارنلڈ، انگریزی کے چند بڑے نقادوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ مگر تنقید کے لئے وہ بھی سند کا قائل تھا اور فیصلے صادر کرنے کے لئے قدما کی اچھی نظموں اور بعض اوقات صرف اکّے دکّے مصرعوں ہی کو سامنے رکھنے پر زور دیتا ہے۔ ہمارے تذکروں میں بھی عموماً یہی رجحان پایا جاتا ہے۔

ڈرائیڈن کے بعد تنقیدوں کا رخ ادب کے عام قارئین کی طرف ہو گیا ایک انگریز نقاد کے الفاظ میں اب اس

کا رخ (PRODUCERS) کے بجائے (CONSUMERS)
کی جانب ہوگیا۔ ان کے زیادہ تر بیانات کا مخاطب ادب کے
قارئین ہوتے ہیں۔ (HELEN GARDNER) کے نزدیک
نقاد کا کام یہ ہے کہ ایک مخصوص ادب پارہ اس کی نظر میں
جس قدر و قیمت کا حامل ہے۔ اپنے قارئین کو اس کا پتہ لگانے
میں مدد پہنچائے۔ (H. COOMBES) کے نزدیک بھی
نقاد کا کام اسی قسم کی خدمات انجام دینا ہے لکھتا ہے کہ نقاد
کسی مصنف کی تحریریں۔ ڈرامہ۔ ناول نظم یا انشائیہ کو پڑھ
کر جس قدر بھی وضاحت کے ساتھ اور مکمل طور پر ممکن ہو لینے
تاثرات پیش کرتا ہے اور اس طرح اس تحریر میں یا اس کی
پشت پر جو تجربہ پوشیدہ ہوتا ہے اس سے پوری طرح لطف
اندوز ہونے اور اسے سمجھنے میں ہماری مدد کرسکتا ہے
یا کسی ادب پارہ کو تفصیلی طور پر جانچ پرکھ کر ان عناصر
کو اجاگر کرتا ہے جنکے اجتماع نے کہ اس ادب پارے کو ایک
مخصوص نوعیت عطا کی ہے۔

ان میں سے ہر بیان اپنی جگہ پر تشنہ ہے مگر مجموعی
طور پر یہ تنقید کے فن اور اس کے فرائض کا احاطہ کرلیتے
ہیں ہڈسن نے تنقید کی جو تعریف پیش کی ہے وہ زیادہ
جامع ہے لکھا ہے۔

"جب ہم ادبی تنقید کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو ہم
فیصلہ صادر کرنے والے لٹریچر کے علاوہ اور بھی بہت
کچھ اس میں داخل کر لیتے ہیں ہم وہ تمام تحریریں اس میں
داخل کرلیتے ہیں جو ادب کے متعلق لکھی گئی ہیں چاہے ان
کا مقصد تجزیہ ہو یا ترجمانی یا قدریں متعین کرنا یا ان سب
کا مجموعہ۔ شاعری۔ ڈرامہ اور ناول براہ راست زندگی
سے تعلق رکھتے ہیں۔ تنقید شاعری ڈرامہ ناول اور خود تنقیدی
ادب سے بحث کرتی ہے۔ اگر تخلیق ادب اپنی گوناگوں
اصناف کے ذریعہ زندگی کی ترجمانی کرتا ہے تو تنقید ہر

ایسے ادب کی ترجمانی کرتی ہے۔

آل احمد سرور اس پر اضافہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"تنقید کا کام فیصلہ ہے تنقید دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیتی ہے۔ تنقید وضاحت ہے صراحت ہے ترجمانی ہے تفسیر ہے۔ تشریح ہے تحلیل ہے تجزیہ ہے۔ تنقید قدریں متعین کرتی ہے۔ ادب اور زندگی کو ایک پیمانہ دیتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تنقید کے یہ مقاصد بہت خوشنما ہیں۔ مگر آج تک کوئی ایسا طریق کار ایجاد نہیں ہوا جس سے کہ کسی مخصوص ادب پارہ میں سے دودھ اور پانی کو الگ کر کے دکھایا جائے اور پھر اس تجزیہ پر ماہرین متفق ہو سکیں اس عہد میں جس طرح ہر علم اور ہر فن کو سائنسی نقطۂ نظر دینے کی کوشش کی جا رہی ہے تنقید میں بھی یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ غیر شخصی اور سائنسی بنایا جائے۔ پروفیسر ملٹن نے تو تنقید کی تعریف ہی یہ کی ہے کہ ادب کی بحث کو تحقیقی اور تجرباتی سائنس کے دائرہ میں شامل کرنا تنقید کہلاتا ہے۔"

ڈی۔ ایچ۔ لارنس تنقید کو سائنس بنانے کی شدت سے مخالفت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"CRITICISM CAN NEVER BE A SCIENCE: IT IS, IN THE FIRST PLACE, MUCH TOO PERSONAL AND IN THE SECOND, IT IS CONCERNED WITH VALUES THAT SCIENCE IGNORES. THE TOUCH-STONE IS EMOTION, AND NOT REASON. WE JUDGE A WORK OF ART BY ITS EFFECT ON OUR SINCERE AND VITAL EMOTION, AND NOTHING ELSE."

تنقید کبھی بھی سائنس نہیں بن سکتی۔ اولاً تو بہت ہی زیادہ شخصی ہوتی ہے دوم یہ کہ اس کا تعلق ان قدروں سے ہوتا ہے جنہیں کہ سائنس نظر انداز کر دیتی ہے۔ اس کی کسوٹی جذبات ہوتے ہیں نہ کہ عقل۔ ہمارے سچے اور حقیقی جذبات پر کسی فن پارہ کا جو اثر ہوتا ہے ہم کسی فنی کارنامہ کی قدر و قیمت کا تعین اسی کے توسط سے کرتے ہیں کسی اور بنا پر نہیں۔

احتشام حسین بھی اسی خیال کے حامی ہیں لکھتے ہیں۔ "کچھ نقاد اپنے اصول منظم اور مرتب طریق کار کی بنا پر تنقید کو سائنس کہنے پر اصرار کرتے ہیں لیکن جب ادب کی نزاکتوں پر نگاہ جاتی ہے اور انسانی ذوق کی نیرنگیوں کا احساس ہوتا ہے تو طریق کار کے سائنٹفک ہونے کے باوجود تنقید کو سائنس کہنا دشوار ہو جاتا ہے۔"

تنقید کی بنیاد تاثر پر قائم ہے اور تاثر ہزار کوشش کے باوجود بہت بڑی حد تک شخصی رہتا ہے اس لئے تنقید اپنی ماہیت کے اعتبار سے بقول سینٹ بیو آرٹ ہے اور ایک جا بکدست آرٹسٹ کا مطالبہ کرتا ہے۔ تنقید کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا کافی مشکل کام ہے اسی لئے

رسکن نے کہا تھا کہ کسی نوجوان سے ثقہ تنقید ناممکن ہے۔

تنقید پر بعض لوگوں نے کچھ اعتراضات بھی کئے ہیں ہڈسن نے بھی ان سے بحث کی ہے کسی زمانہ میں ان اعتراضات کی اہمیت رہی ہوگی مگر اب قارئین کا تنقیدی شعور کافی آگے بڑھ چکا ہے اس لئے کئی اعتراضات اب مضحکہ خیز نظر آتے ہیں۔ تنقید پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ہمیں ادیب سے براہ راست تعلق پیدا کرنا چاہیئے اس کا مطالعہ ہمیں بغیر کسی واسطے کے کرنا چاہیئے۔ اسے تسلیم کرلیا جائے تو پھر درمیانی واسطوں کی جنہیں نقاد کہتے ہیں کیا ضرورت ہے ہم اپنا بیش قیمت وقت سیکسپیر فردوسی غالب اور اقبال کے کلام کا مطالعہ کرنے میں کیوں نہ صرف کریں۔ ہم ان کے متعلق نقادوں کی تصانیف کو پڑھنے میں کیوں۔ اپنا وقت ضائع کریں۔ پھر تنقیدوں کا سلسلہ بڑا طوفانی ہو جاتا ہے۔ ہر تنقید نگار دوسرے کی رائے سے اختلاف کرتا ہے اور یہ ثابت کرتا ہے کہ جو کچھ وہ لکھ رہا ہے وہی درست ہے باقی سب غلط اور گمراہ کن ہے۔ بقول رشید احمد صدیقی جہاں ایک کہتا ہے غالب صوفی تھا دوسرا کہتا ہے ملحد تھا تیسرا کہتا ہے قوم پرست تھا ایسی حالت میں اگر شخص یہ پوچھے کہ غالب کیا تھا تو یہی جواب بن پڑتا ہے

شامت اعمال ما صورت غالب گرفت۔

یہ خطرہ دراصل اس وقت اور بھی بڑھ جاتا ہے جب معمولی صلاحیت والے اور ذوق سلیم سے عاری لوگ نقاد بن بیٹھیں۔ ایسی صورت میں پڑھنے والا مختلف رایوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ اور اصل کتاب کو بھول جاتا ہے گویا نقاد ادب کی ترجمانی کرنے کے بجائے ادیب اور قاری کے درمیان دیوار کی طرح حائل ہو جاتا ہے۔ مگر یہ خطرہ ناپختہ اور بڑے نقاد سے پیدا ہوتا ہے اچھا نقاد ہم میں تنقیدی بصیرت بھی پیدا کرتا ہے اور ادب سے کما حقہ طور پر لطف اندوز ہونا سکھاتا ہے اس کا کام بقول ایلیٹ (ELUCIDATION) اور (ILLAMINATION) ہے وہ بعض اوقات ایسے گوشوں کی طرف بھی ہماری رہنمائی کرتا ہے جنہیں مصنف لاشعوری طور پر بیان تو کر گیا مگر وہ ان کی ہیئت کو سمجھنے سے قاصر رہا تھا۔

بعض کتابیں اس قدر طویل اور مبسوط ہیں کہ آج کی مصروف دنیا میں انھیں پڑھنا تقریباً ناممکن ہے مثلاً الف لیلہ داستان امیر حمزہ بوستان خیال وغیرہ کلیم الدین کی چھوٹی سی کتاب داستان

نیرنگِ حیات

نازش پرتاپگڈھی

یہاں شفق بھی ہے ظلمت بھی ہے دھندلکا بھی
یہ کائنات فقط سیم بار رات نہیں
جو راستہ ہے تو آئیں گے پیچ بھی، خم بھی
جو زیست ہے تو غمِ زیست سے نجات نہیں
گلوں کی قدر بڑھاتے ہیں ساتھ کے کانٹے
حیات سم ہے اگر تلخیٔ حیات نہیں
وہ زندگی ہے کہ صرف اک سپاٹ ویرانہ
جہاں کوئی بھی خیابانِ حادثات نہیں
نشاطِ زیست [illegible] چیز یوں تو ہے لیکن
[illegible] تغیرات نہیں
ہو دیرپا تو وہ [illegible] ہے ذہن کا [illegible]
ہو مستقل تو علالت ہے واردات نہیں
جو رک گئی کسی مرکز پہ کھو گئی وہ زماں
ٹھہر گئی جو کہیں بھی تو پھر حیات نہیں
تغیرات سے قائم ہے رونقِ ہستی
فقط نشاط نہیں، صرف غم کی [illegible] نہیں
کبھی ہو ترکِ مراسم کبھی ہو بغض و گریز
فقط وفا ہی بنائے تعلقات نہیں
جمود کوئی بھی ہو، موت کی ہے پرچھائیں
یہ فلسفہ مری دیوانگی کی بات نہیں
ٹھہر گئی جو کہیں بھی تو پھر حیات نہیں

امیر حمزہ اور بوستان خیال وغیرہ کی خوبیوں کو سمجھنے میں کافی مدد دیتی ہیں
پہنچاتی ہے۔ یہاں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ تنقید خواہ کتنی ہی بلند
مرتبہ کیوں نہ ہو اصل کتاب [illegible]
کتاب کی خوبیوں اور اس کے [illegible] انرات [illegible] اندازہ

صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ہم اس کتاب کو پڑھنے
کی زحمت بھی گوارہ کریں اور تنقیدوں پر ہی اکتفا نہ کریں۔

اس سلسلہ میں ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اگر
ہم کسی کتاب کا مطالعہ اس کی شرحوں اور تنقیدوں کی مدد سے
کریں تو ایک زبردست خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ
ہم دوسروں کی رایوں کو طوعاً و کرہاً تسلیم کرتے گئے ہیں۔ یہ
خطرہ اچھی تنقیدوں کے ساتھ اور بھی بڑھ جاتا ہے اگر کوئی
نقاد غیر معمولی صلاحیت۔ وسیع علمیت، زورِ بیان اور بلند
مرتبہ شخصیت کا مالک ہے تو وہ ہمارے دل و دماغ پر چھا
جائے گا ہم اس کے فیصلوں کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں گے۔ گویا
ہم اپنے دماغ سے نہیں بلکہ اس کے دماغ سے سوچیں گے کتاب
کا مطالعہ اپنی آنکھوں سے نہیں بلکہ اس کی آنکھوں سے کرینگے
جن چیزوں پر اسکی نظر پڑی ہے انہی پر ہماری نظر پڑے گی
جو چیزیں اس کی نظر سے بچ گئی ہیں ہم بھی انہیں اسی طرح چھوڑ
جائیں گے اس خطرہ کا علاج صرف یہی ہے کہ اپنے مذاقِ سلیم
کو بھی کام میں لائیں اور زیر نظر تنقید کو صرف چراغ راہ کے
طور پر استعمال کریں اسے منزل نہ سمجھ بیٹھیں۔

ان اعتراضات کے باوجود تنقید کی اہمیت مسلم ہے
ایلیٹ نے ٹھیک لکھا ہے کہ تنقید سانس لینے کی طرح ناگزیر
ہے ایک بڑا شاعر ہمیں زندگی کے اہم مسائل اور عمیق معانی
سے روشناس کراتا ہے تنقید ہمیں شاعر کی فکر کی گہرائیوں
تک پہنچانے کی کوشش کرتی ہے بقول ایک انگریز نقاد
اس کا کام ہے TO ADD SUNSHINE TO DAYS
LIGHT HAPPIER BY MAKING THE HAPPY

ایلیٹ کے نزدیک نقاد کا کام ادب کی درجہ بندی
کے اصول اور ضابطے متعین کرنا نہیں ہے بلکہ روشنی مہیا
کرنا ہے۔ لکھا ہے: THE TORCH RATHER THAN
THE SCEPTRE WOULD BE ANY SYMBOL
FOR THE CRITIC

بقول ایمرسن ایک بڑا نقاد نہ صرف معلومات بہم
پہنچاتا ہے بلکہ وہ ہمارے اندر وجدان بھی پیدا کرتا ہے ہم اس

کی تنقیدوں سے اتفاق کریں یا اختلاف کریں لیکن دونوں صورتوں میں یقینی طور پر ہماری ذہانت اور قابلیت میں اضافہ ضرور ہوگا۔ تنقیدی شعور کے بغیر اچھا تخلیقی ادب وجود میں نہیں آسکتا۔

تنقید زمان و مکان سے آزاد ہوتی ہے یہ نہ ماضی سے بیزار ہوتی ہے نہ مستقبل سے غافل۔ یہ ماضی حال اور مستقبل کو ایک مسلسل لڑی کی شکل میں دیکھتی ہے۔ اچھی تنقید ہر مقام اور ہر وقت کے لئے ہوتی ہے۔ یہ اپنی مشعل ہدایت دکھا کر ادب کو راہ راست پر لاتی ہے اور اسے بے راہ روی سے بچاتی ہے۔ یہ ادب کے چمن کو خود رو جھاڑیوں اور خس و خاشاک سے پاک و صاف کرکے اس کے حسن میں اضافہ کرتی ہے تنقید اساسی تعمیری ہوتی ہے۔ ادیب کی کوتاہیاں اور خامیاں بیان کرنے کے باوجود یہ تخریبی نہیں ہوتی اس لئے کہ تنقید کی ہر رائے اصولوں پر مبنی ہوتی ہے۔ نقاد کی آواز عوام کی آواز ہوتی ہے۔ والٹر ریلے نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "تنقید کا کام مردہ مصنف یا تصنیفات کو زندہ کرنا ہے" اس کی زندہ مثال سوئن برن کی تنقید ہے جسنے رباعیات عمر خیام کے انگریزی ترجمہ کو گمنامی کے غار سے نکال کر از سر نو زندگی عطا کی

(باقی صـ ۵۸ پر)

اعتذار

بعض مجبوریوں کی بنا پر امریکہ کے سفرنامے ـــ "نئی دنیا کی کھوج"، کی تیسری قسط اس شمارہ میں شامل نہیں ہے۔ انشاء اللہ آئندہ شمارہ سے یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

(ادارہ)

بارہ ماسہ ایک مخصوص ہندوستانی صنف شعر ہے اور شمالی ہند کی تمام جدید پراکرتوں میں اس کے دل آویز شعری نمونے بھاکاویوں اور لوک گیتوں میں ملتے ہیں۔

اس کا موضوع جیسا کہ اس کے نام سے بھی ظاہر ہوتا ہے سال کے بارہ ماہ میں بدلتی ہوئی موسمی کیفیات اور ان سے وابستہ ایک فراق آشنا عورت کے لمحات جدائی کا بیان ہے جس کا شوہر اسے چھوڑ کر کہیں دور دیس چلا گیا ہے اس دوری و مجبوری کے عالم میں اس کا شباب اپنے لہو کی آگ میں جل رہا ہے وہ ایک ایک ماس کو اپنی منفرد موسمی کیفیتوں کے ساتھ آتے اور دھوپ چھاؤں کی طرح گزرتے ہوئے دیکھتی ہے اس کی بے قراریاں لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جاتی ہیں اور اس کے جذبات کی ندی نئے چاند کی طرح چڑھتی جاتی ہے وہ اپنے شوہر کو بے تابانہ یاد کرتی اور اس کی جدائی کے دکھ کو ہر ایک سے بیان کرتی ہے اسی کے ساتھ وہ موسموں کے آداگون کا ذکر اور ان سے وابستہ تیج تہواروں کو بھی بہت ہی پرسوز و نشاط انگیز انداز سے بیان کرتی جاتی ہے ــــ اس طرح بارہ ماسہ میں "مدتو ورتن" اور "برہ ورنن" ایک ساتھ ہوتا ہے اور ایک نارِ مہجور کی زبان سے ہوتا ہے۔

بارہ ماسہ کے ابتدائی نقوش اپ بھرنش کے آخری دور کی شعری تخلیقات بالخصوص "سندیش راسک" میں ملتے ہیں جس کا تخلیق کار ایک مسلمان نوربافِ عبدالرحمان تھا۔ اسے ہندی ادبیات کی تاریخ میں ابدھ مان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی کے جین سا ہتیہ میں بارہ ماسہ کے بہت دلکش نمونے اور جذبات نگاری کے خوبصورت مرقع ملتے ہیں، پنجابی راجستھانی اور اودھی بھاشا کے تقریباً تمام عشق ناموں یا پریم کتھاؤں میں غم جدائی کے موقع پہ بارہ ماسے لکھے گئے ہیں اور یہ دلچسپ بات ہے کہ پنجابی اور اودھی کے ان عشق ناموں کے شاعر و تخلیق کار بیشتر مسلمان ہیں۔

اردو کے مثنویائی ادب میں غم جدائی کا بیان بارہ ماسہ کے اسلوب میں نہیں ملتا لیکن ایک مستقل صنف شعر کی حیثیت میں اسے اپناتے ہوئے اردو شعرا نے بہت سے بارہ ماسے لکھے ہیں۔ اب تک شمالی ہندوستان میں اردو شاعری کا سب سے پہلا نمونہ افضل جھنجھانوی یا پانی پتی کی "بکٹ کہانی" ہے جو خود ایک دوازدہ ماہیہ یا بارہ ماسہ ہے افضل ایک درویش منش اور صوفی مشرب شاعر تھے ان

کے بارہ ماسہ میں بھی جو ہندوی شاعری کی روایت کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے، عشق و تصوف کی گہری چاشنی موجود ہے آیت اللہ جوہری، عبدالولی عزلت اور مفتی الٰہی بخش کاندھلوی اردو کے بہت ممتاز بارہ ماسہ نگاروں میں ہیں، عبداللہ انصاری جو زیرِنظر بارہ ماسہ کے مصنف ہیں اسی سلسلۃ الذہب" سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی یہ تصنیف جسے بارہ ماسہ ربانی کا نام دیا گیا ہے تصوف و عشق کے ساتھ گہرے مذہبی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔

اس بارہ ماسہ کا سال تکمیل سنہ ۱۳۲۳ھ ہے
موجودہ نسخہ جو راقم الحروف کی ذاتی لائبریری کی زینت ہے خود مصنف نے اپنے کسی مرید کو عطا کیا تھا جس کا اندازہ اس نسخہ کی بیاض پیشانی پہ ہلکے زعفرانی رنگ کی روشنائی سے لکھی ہوئی اس مختصر تحریر سے ہوتا ہے "عطیہ جناب مولوی عبد اللہ انصاری پیر جی"
سرورق دیدہ زیب ہے اور اس کے مندرجات حسب ذیل ہیں۔

"ھو الاول ھو الآخر ھو الظاہر ھو الباطن
الموسوم دیہ) درد نہانی بارہ ماسہ ربانی تصنیف مولانا عبداللہ انصاری خلیفہ حضرت حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہٗ باہتمام خاکسار۔ سعید احمد فاروقی۔ در مطبع احمدی علی گڑھ طبع شد"

اس سرورق کی پشت پر کتب قابل دید مصنفہ و مترجمہ مولانا عبداللہ انصاری ناظم مدرسۂ دینیات مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے ذیل میں "آغاز اسلام" اور "عقائد اسلامیہ" نامی کتابوں کے تعارفی اشتہارات ہیں متن کتاب ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے آخر کا ورق نشان شمار سے خالی ہے اور "ارکان اسلام" "سعادۃ المریدین، المدینۃ والاسلام، اخلاق محمدی اور تسارالمسلمین" کے اشتہارات کے لئے وقف کیا گیا ہے اس کی مدد سے مولوی عبداللہ انصاری کے موضوعات فکر و قلم کو بھی جان سکتے ہیں۔

متن کے خاتمہ پر مولانا اشتاق احمد صاحب ساکن قصبہ انبہٹہ ضلع سہارنپور کی لکھی ہوئی تقریظ ملتی ہے اس کا انداز قدیمانہ ہے مگر مصنف کے ایک ہم وطن کے قلم سے لکھی ہوئی یہ تقریظ اساسی طور پر اپنے قاری کو موضوع کتاب سے بخوبی متعارف کرا دیتی ہے۔ .... "یہ عاجز رسالہ متبرکہ منظومہ اسم بامسمیٰ درد نہانی بارہ ماسہ ربانی مصنفہ حضرت مولانا... جناب شاہ محمد عبداللہ انصاری چشتی انبہٹوی...... کے مطالعہ سے مشرف ہوا سبحان اللہ حضرت مصنف نے اس رسالہ میں عجیب اسلوب اور حصول معرفت و انکشاف حقیقت کا راستہ بتایا ہے اور

جعفر بلوچ

مبصر غور فرمائیں کہ ہے یہ مسئلہ ٹیڑھا
کجی چہروں میں ہے یا اصل میں ہے آئینہ ٹیڑھا

انہیں اصرار ہے لوگ ان کو الیاس و خضر مانیں
وہ جن کی فکرِ ژولیدہ کا ہے ہر زاویہ ٹیڑھا

وہی اپنی بصارت کی نمائش کرتے پھرتے ہیں
نظر آیا ہے جنہیں کون و مکاں کا سلسلہ ٹیڑھا

کتاب زندگی اب نقشِ فریادی کی صورت ہے
ورق اس کے دریدہ خط شکستہ حاشیہ ٹیڑھا

کوئی کیا ان اندھیروں میں تمہارا ساتھ دے جعفر
تمہاری منزلیں اوجھل تمہارا راستہ ٹیڑھا

جاں گداز و جگر سوز پیرایہ کا سماں دکھایا ہے۔ فراق محبوب و ہجر مطلوب میں ایک طالب صادق و دل سوختہ عاشق کی نہ صرف کہانی ہے بلکہ یہ رسالہ گنجینۂ معانی ہے۔

جو رمانت و لذت اس کے ظاہری الفاظ میں پائی جاتی ہے اس کی کیفیت کو اہل دردہی خوب جانتے ہیں اور سوز و گداز والے ہی کما حقہٗ پہچانتے ہیں۔۔۔۔"

متن کا آغاز بسم اللہ الرحمان الرحیم سے ہوتا ہے اس کے نیچے کافی جلی قلم سے "حمد باری" لکھا ہے۔ بعد ازاں "نعت رسول کردگاری" سے متعلق اشعار لائے ہیں۔

سبب تصنیف سے متعلق اشعار میں مصنف نے اس تصنیف کے محرکات پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ افضل اور مفتی الٰہی بخش کی لکھی ہوئی بکٹ کہانیوں سے متاثر ہو کر انھوں نے یہ چاہا کہ وہ خود بھی ایسی کوئی تصنیف پیش کریں لیکن مرشد کے تصور اور امداد غیبی و تائید لاریبی کے بغیر اس اہم کام کی تکمیل ممکن نہ تھی اس لئے وہ اپنے مرشد حقیقی۔۔۔۔۔ حضرت حاجی امداد اللہ کے فیوض و برکات کے طالب ہوئے اور جب ادبیہ کا اشارہ ہو گیا تو انھوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا۔

افضل اور مفتی الٰہی بخش کے مقابلہ میں عبداللہ انصاری کے یہاں مقصدیت زیادہ درخشاں و شفاف انداز میں سامنے آئی ہے جس نے ایک سے زیادہ موقعوں پر اس کے شعری حسن کو بھی فنی اعتبار سے متاثر کیا ہے۔ پھر بھی اس کے بہت سے حصے دلچسپ اور ادبی اعتبار سے لائق تعریف ہیں۔

اس کا موضوع تو عشق حقیقی ہے لیکن تصوف و سلوک کے اسرار و رموز کے ساتھ عشق مجازی کی بھول بھلیوں کی سیر بھی کچھ کم سحر انگیز اور اپنے پرکشش عناصر کے اعتبار سے دل آویز نہیں ـــــ اس کی روایتی ہیروئن بھی جو در اصل فراق آشنا روح انسانی کی تمثیل ہے۔ عشق مجازی کی بھول بھلیوں میں پھنس کر جو قوس قزح کی طلسمی دائرہ کی طرح بے حد حسین و دل نواز ہے، عشق حقیقی کا راستہ ڈھونڈ رہی ہے، جو کہ یہی در اصل روح انسانی کی منزل مراد ہے۔ صورت و معنی کے سحر آفریں جلوے ہمہ وقت اس کے باورے نینوں میں سمائے رہتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

جدا ہو کر پیا جب سے سدھارا۔ مرا دل کر گیا ہے پارا پارا\
سنو نے کنتھ کو جب سے گنوایا ـــ سکھی سکھ چین کو اپنے نہ پایا!

برہ کی آگ نے تن من جلایا — جلا کر غم کے دریا میں بہایا\
پیا نے دلیش اپنا جب سے چھوڑا — مرے سکھ چین نے مکھ مجھ سے موڑا

آگے چل کر کہتی ہے

سنگار اپنا تجونگی دکھ کی ماری — مرونگی مار کر دل میں کٹاری\
بھلا اب کس کے کارن پان کھاؤں — یہ کاجل اور مہندی کیا لگاؤں\
سہانے جوڑے کو میں آگ دونگی — پیا کے پیچھے میں جوگن بنوں گی

یہ بالا جوبن اور پیتم بدیسی! — بھرے جاؤں مصیبت کب تک ایسی۔\
نویلے ون ہیں اور بالم سفر میں — نہ ہو ناسور کیونکر اب جگر میں\
کہوں بپتا سکھی میں پائے کس سے — نہیں کوئی ملے دل میرا جس سے

بڑی بات ہے کہ ایک برہن کے دکھ کی یہ تصویر اس پس منظر میں ابھرتی ہے جو گھر آنگن کے ماحول ہے اور اس کی فضا اس میں پلی ہوئی ایک ہندوستانی عورت کے فن کی فضا ہے۔

اردو شاعری پر ایک بڑا الزام یہ ہے کہ وہ فارسی شاعری کی نقل ہے یہ بات کہنے والے اردو قصیدہ، مثنوی اور بالخصوص غزل کی اس فضا کو پیش نظر رکھتے ہیں جو ہند ایرانی تہذیب کی پروردہ روایت شعر کی ترجمان ہے اور اردو شاعری کی ان اصناف اور خود غزل کے اس تہذیبی ماحول کو نظر انداز کر دیتے ہیں جس کی ضمیر و خمیر عہد وسطیٰ کی تاریخ و روایت کو اس مخصوص رنگ و آہنگ کے ساتھ پیش کرنا ہے جس کا تعلق صرف ہندوستان سے ہے۔

اردو زبان و ادب کے ماضی کی دریافت بالخصوص اس کے ہندوستانی مزاج کی شناخت کے لئے بارہ ماسہ جیسی اصناف شعر کی طرف توجہ دینی ضروری ہے جنکی روایت ایک طرف پراکرتوں اور ان سے وابستہ لوک ساہتیہ سے جڑی ہوئی ہے اور دوسری طرف اس کا روحانی اور رومانی رشتہ

عشق و تصوف کی اعلیٰ اقدار فکری سرچشموں سے ملتا ہے
تمہیدی اشعار کا یہ سلسلہ آنسوؤں کی لڑیوں کی
طرح ٹوٹتا ہے تو اساڑھ آجاتا ہے۔ جہاں سے بارہ ماسہ
کی اس دکھ بھری کہانی کا سلسلہ آغاز ہوتا ہے۔
اساڑھ آیا مجھے دکھ سہتے سہتے۔ ہوئے پٹ بین آنسو بہتے بہتے
یہ رم جھم کر کے تھی ری منہ جو برسے۔ پیا بن رات دن جی مرا ترسے
پھواریں جو پڑے ہیں منہ کی آکر — کرے ہیں وہ جگر پر کار نشتر
ہوا ٹھنڈی چلے اس ماس بیری — اگن نکلے مری ہر سانس میں ری
ہوا سے جب مرا دروازہ کھڑکے — تو پھر دل مرا رہ رہ کے دھڑکے
سجن بن رات کو سوؤں میں کس طور — چنگھاڑے جھینگری دادر کرے شور
ارے یہ کوکلے کرلائیں دن رین — کرے کرلاہٹ ان کا مجھکو بے چین
منظر نگاری یہ اساڑھ کی ٹھنڈی پھواروں کا، کوکلوں
کی کرلاہٹ اور اس پس منظر میں برہنی کا ابھرتے ہوا کردار نہ صرف
یہ کہ اردو شاعری کا رشتہ پراکرتوں کی روایت سے جوڑ دیتا
ہے بلکہ اس ماحول اور اس فضا میں ہمیں ہندوستان کے
دیہات سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ کہا یہ جاتا
ہے کہ اردو ادب میں پریم چند نے دیہات کو دریافت
کیا یہ ایک خاص معنی میں صحیح بھی ہے لیکن سچ یہ ہے کہ پریم
چند سے بہت پہلے اردو کے گیت نگار اور اس کے
بارہ ماسہ لکھنے والے شاعر بڑے جیتے جاگتے انداز میں
ہندوستان کے دیہات کو پیش کر چکے تھے۔
جب اس برہ کی ماری اور غم فراق کی ستائی ہوئی
روح گھر میں کسی طرح سکون نہیں محسوس کرتی اور اسے کسی
پر کار کل نہیں پڑتی تو وہ اٹاری پر چڑھ کر آنے والے کا
انتظار کرتی ہے۔
ہوا جنگل سبھی سرسبز سارا — اٹاری سے کرے ہر اک نظارہ
اٹاری پر گھڑی میں راہ دیکھوں — گھڑی پھروں پی کو آہ دیکھوں
اب اسی رت میں اس نکھے سمے میں جب وہ اپنی سہیلیوں
اور پاس پڑوس کی ناریوں کو لال جوڑے پہنے جھولوں میں
جھولتی پینگیں بڑھاتی اور آپس میں اٹکھیلیاں کرتی ہوئی دیکھتی
ہے تو اس کے من میں بے اختیار ہوک اٹھتی ہے اور ساتھ

طاہر تلہری

ہوتا ہر قید سے آزاد تو اچھا ہوتا
کاش میں پیڑ سے ٹوٹا ہوا پتا ہوتا

وہ ہے بس ایک سراب اس کا تعاقب کرو
ابر ہوتا تو کہیں ٹوٹ کے برسا ہوتا

چاند بن کر ہے وہ محتاج ضیائے خورشید
شمع بنتا تو کسی گھر کا اجالا ہوتا

چھین لیں مجھ سے اجالوں نے تری یادیں بھی
اس سے بہتر تھا کہ دنیا میں اندھیرا ہوتا

نہ سہی میرے لئے سعیٔ مداوا نہ سہی
کم سے کم تم نے مرا حال تو پوچھا ہوتا

آدمیت سے علاقہ ہی اسے کیا طاہر
شیخ اگر شیخ نہ ہوتا تو فرشتا ہوتا

ہی کوئل کی کوک سنائی دینے لگتی ہے۔ کچھ شعر سنئے
گھٹا چاروں طرف سے جھوم آئی۔ اگن برہ میں میرے لگائی
مجھے ستانے کوئی آکر چلی میں۔ ہوائی ہو گئی چکی کھلی میں:
ارے جب دیکھتی ہوں کالے بادل۔ سراسر کو ندتی ہے جل جل
.....
سکھی سب ناریاں تیجیں منائیں۔ وہ [illegible]

خوشی سے سب وہ کودیں اور ناچیں ۔ سکھیوں جب شوق میں ملیا کلاچیں

نگر کی ناریاں سب بیاہی کنواری !
نبی کے پوجنے کو جائیں ساری !
سجن ملنے کا میں تو راگ بوجھوں
نہ میں پوجوں نبی نے ناک بوجھوں
گینی چیتریاں سب کی سہانی !
ہوئیں دیکھ کر رواو دوانی !
گنوں تھی میں تو پی آنے کی گھڑیاں
یہ کیسی آگئی ساون کی جھڑیاں
بھینری کیا اری ساون میں آئی
سپوک اور ہے کل دل کو لگائی۔

اسی طرح ایک ایک کرکے مہینہ آتے اور جاتے رہے چیت کا مہینہ آیا تو گویا دوبارہ موسم بہار آگیا لیکن اس ناری کے جیون میں جو پت جھڑ کا موسم آیا تھا وہ اب بھی کہیں نہیں گیا اس کے من کے آنگن میں ابھی تک خاک اڑ رہی ہے جبکہ اس کے چاروں طرف ادھر سے ادھر تک بہار رہے تھی یہ چاندنی کے پھول پیارے ۔ مرے سیکھے اور انگار سارے یہ بھونرے مالتی پر گھومتے ہیں ۔ نشہ خوشبو کا پی کر جھومتے ہیں آخر بیشہ ماس میں اسے قاصد نے آکر یہ اطلاع دی کہ اب جدائی کا یہ زمانہ بیت گیا اور تیرا بچھڑا ہوا ساجن جلد ہی آکر تجھے مل جائے گا۔ تو اس کے من کا مرجھایا ہوا کمل ایک بار پھر کھل اٹھا اور اس نے بے اختیار قاصد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

اوے قاصد میں تجھ پر جان واردوں
ترے قدموں کو پلکوں سے بہاروں
چنور کیوں کا میں اپنے بنا کے !
کروں دل خوش ترے اوپر ہلا کے
تجھے میں خس کی ٹٹی میں بٹھاؤں
ہووں سے جیٹھ کی تجھ کو بچاؤں !
صحن میں جو کہ ہے زیتون میرے !
اسی سے باندھ دوں گھوڑے کو تیرے

غفلت

آہ! تمہاری غفلت کیسی شدید اور تمہاری گمراہی کیسی ماتم انگیز ہے کہ تم لیلۃ القدر کو تو ڈھونڈتے ہو پر اس کو نہیں ڈھونڈتے جو لیلۃ القدر میں آیا اور جس کے ورود سے اس رات کی قدر و منزلت بڑھی ــــ اگر تم اسے پالو تو تمہارے لئے ہر رات لیلۃ القدر ہے۔

ــــ مولانا ابوالکلام آزادؒ ــــ

شارح نے اپنے بیانات کی شرح جو کتاب کے حاشیوں میں جگہ جگہ قلمبند کی ہے اس میں وضاحت کی گئی ہے کہ جت کے ظاہری رسوم و آداب اور معاشرہ میں تیج تہوار کی رنگوں سے مراد فلاں فلاں مذہبی اعمال اور روحانی اشغال ہیں کتاب کے آخر میں سبب تصنیف سے پہلے جو اشعار کئے ہیں وہ خود اس حقیقت کی طرف واضح طور پر اشارہ ہیں۔

ہوئی جس پر تجلی خاص پی کی ۔
بھلا کب ہو رہے اس میں خودی کی ۔
کہے جو کچھ وہ سب کہتا ہے پی کا !
ملا ہے رنگ بالکل اس سے جی کا
سکھی یہ بات ہے از بس کہ باریک !
وہ کیا سمجھے کہ جس کا دل ہے تاریک !
ہوا ہے جس کا دل ہو حق سے درپن !
یہ ہوتی ہے اسی پر صاف روشن !
ولیکن بات ہے یہ مثل تلوار !!
مقابل کو نہ ہو بے ڈھال زنہار !

سمجھ لینے کو اتنا بھی ہے کافی!
کہ سب فانی وہی ہے ایک باقی!

اردو شاعری میں فارسی الفاظ وتراکیب کی آمیزش نے زبان کی تہہ داری، ومعنی آفرینی میں اضافہ کیا لیکن گیت اور بارہ ماسہ کی لسانی فضا کا اروج ہی دوسرا ہے اسے ٹھیک اردو کہنا چاہیے اس میں موجود ہندوی الفاظ ہردو کے پیکروں سے رشتہ کا اظہار کرتے ہیں اور ان کی شمولیت اس زبان کی اپنی مٹھاس اور اس کے لہجہ کی شیرینی اور گھلاوٹ میں اضافہ کا باعث بنتے ہیں۔

سچ یہ ہے کہ اردو زبان کی لسانی ساخت تاریخی دورنگ سے مشابہ ہے اور اس اعتبار سے وہ قدیم آریائی یا ویدک بھاشا سے زیادہ قریب ہے جس نے ایک طرف وادی جیحوں وسیحوں سے اپنے تہذیبی رشتہ کو باقی رکھا اور دوسری طرف اس ہندوستانی مزاج کو اپنایا جس میں کئی قدیم پراکرتوں اور دراوڑ بھاشاؤں کا رس اور حسن شامل تھا۔

زیادہ تر ہمارے نقادوں نے نمایاں طور پر سامنے آنے والے اردو شاعری کے حصہ قصائد وغزلیات ہی کو سامنے رکھ کر زبان کے مسئلہ پر گفتگو کی اگر عوامی مرثیوں، گیتوں، اور بارہ ماسوں کو بھی مطالعہ میں شامل رکھا جاتا تو صورت حال کچھ دوسری ہوتی اور اخذ نتائج کے ذریعہ جن سچائیوں تک رسائی ہوتی وہ زبان کی تاریخ اور اس کے تہذیبی رشتوں کو سمجھنے میں زیادہ معاون ہوتیں۔

غزل

حوادث بھی ذریعہ ہیں حیات آموزگاری کا
اٹھا لیں فائدہ ہم وقت کی ناخوشگواری کا

چلا آتا ہے صیادوں کا لشکر واہ رے موسم
بہت تھا گرم شہرہ آمد فصل بہاری کا

گرا کرتی تھی بجلی چرخ سے برسات میں لیکن
کوئی موسم نہیں اہلِ چمن کی شعلہ باری کا

بڑے سیدھے ہیں رہبر کارواں والوں کی نظروں میں
کوئی رشتہ نہیں اُن رہزنوں سے رستگاری کا

جگر خونیں عنادل لالہ وگل خستہ و بسمل
چمن میں کس سے کہیے حال اپنی دل فگاری کا

سحر ہوگی ہر صدی اہل نظر پیدا قیامت تک
ازل سے یہ اجارہ ہے وفا کے فیضِ جاری کا

نہ اہلِ کارواں خوش ہیں نہ میرِ کارواں اکرم
وہی ہے سلسلہ باہم دگر بے اعتباری کا

اکرم دھولپوری

اردو ادب میں انشائیہ انگریزی ادب کے ESSAY کی طرح ایک مخصوص صنف کی حیثیت رکھتا ہے پہلے ESSAY سے مضمون مراد لیا جاتا تھا ڈاکٹر اختر اورینوی نے پہلی مرتبہ اس کے لئے لفظ انشائیہ کی اصطلاح مخصوص کی دور حاضر میں زندگی کی پیچیدگیاں روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں اور انسان کے نئے نئے مسائل درپیش وہ کوہ بن کر حائل ہو رہے ہیں۔ صورت میں انشائیہ اظہار تاثرات اور جذبات کا بہترین ذریعہ ہے۔ انشائیہ ایک ایسی مختصر تحریر ہے جس میں بغیر کسی ترتیب اور تنظیم کے کسی حقیقت کا اظہار ہو جائے انشائیہ نگار کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرتا اور نہ کوئی مشورہ ہی دیتا ہے اس کا کام کسی ایک چیز کے انوکھے اور تازہ پہلو کی طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے وہ ایک مخصوص انداز سے سوچنے کی ترغیب دیتا ہے اس طرح انشائیہ وہ صنف نثر ہے جس میں ایک صاحب طرز ادیب کسی بھی خیال کو بے تکلفی کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ اس میں منطقی استدلال کی گنجائش نہیں ہوتی۔

اردو میں انشائیہ نگاری دراصل ۱۸۵۷ء کے بعد شروع ہوئی اس کے اولین نمائندے سر سید احمد خاں ہیں۔ انھوں نے اپنے مضامین سے اس صنف کو فروغ دیا۔ سر سید کے حالات زندگی سے ان کی حب الوطنی قوم پرستی علم نوازی اور جدت پسندی کا پتہ چلتا ہے انھوں نے جس زمانے میں آنکھیں کھولیں وہ ہندوستان اور خصوصاً اردو ادب کے لئے ایک عبوری دور تھا مشرقی تہذیب کا چراغ مٹ رہا تھا اور ایک غیر ملکی تہذیب کا آفتاب پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ افروز ہو رہا تھا انشائیہ کی پہلی نقش سر سید کا مضمون، امید کی خوشی سے پیدا ہوتی ہے سب سے پہلے یہ مضمون تہذیب الاخلاق میں شائع ہوا جس سے انشائیہ کا فن رونما ہوا۔ تہذیب الاخلاق میں مختلف موضوعات پر مضامین اور انشائیے لکھے جاتے تھے جس طرح ٹیٹلر اور اسپکیٹر میں انشائیہ شائع ہوتے تھے۔ سر سید کے بعد بہت سے لکھنے والے جلوہ افروز ہوئے اس میں خواجہ حسن نظامی کا نام سر فہرست ہے۔

خواجہ حسن نظامی اردو ادب میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے انشائیہ کو بام فلک تک پہنچایا۔ انشائیہ کی جتنی خصوصیات ہیں وہ سب خواجہ حسن نظامی کے یہاں موجود ہیں۔ شبلی نعمانی خواجہ صاحب کے بارے میں کہتے ہیں کہ نثر میں ایسی بے نظیر شاعری کرتے ہیں جس کا اثر آج کل کی نظموں میں بھی بہت

کم پایا جاتا ہے۔ انشائیہ لکھنے کا مقصد خواجہ صاحب خود فرماتے ہیں کہ میں نے جتنی بھی خامہ فرسائی کی ہے وہ تو محض اس لئے کی ہے کہ نئی روشنی کے ڈھنگ جو صوفیوں کی پرانی کتابیں نہیں پڑھتے یا ان کتابوں کے قدیمی طرز تحریر کے سبب تصوف ہی

سے غیر مانوس ہوتے جاتے ہیں وہ میرے نئے انداز تحریر سے ادھر راغب ہوں اور کیف روحانی سے فائدہ اٹھائیں خواجہ صاحب بڑے پہلو دار شخصیت کے مالک تھے انہیں ہشت پہل ادیب کہنا غلط نہیں وہ مخصوص طرز نگارش کے بانی ہی

انشائیہ کے آئینہ میں

• ذوالفقار علی ایم۔اے

تھے اور عالم بھی وہ بلند مرتبہ انشا پرداز تھے ہلکے پھلکے الفاظ میں انکشافِ ذات کا فن انہیں خوب آتا تھا۔ الفاظ کے استعمال میں کفایت شعاری سے کام لیا کرتے تھے تھوڑے الفاظ کے ہیر پھیر سے تخلیق مکمل کرنے کے عادی تھے۔ انشائیہ نگاری کی خوبی ہے کہ الفاظ کے استعمال میں کفایت برتی جائے یہ ان کے یہاں فطری طور پر موجود تھی وہ مشکل ترکیبوں کو اپنی تحریروں میں داخل نہیں کرتے اور بات میں بات پیدا کرنے میں مہارت رکھتے تھے انتہا درجے کے باریک بین تھے معمولی معمولی باتوں پر نگاہ رکھتے تھے مشاہدات میں گہرائی اور تجربات میں بے کراں وسعت تھی۔

خواجہ صاحب کے انشائیوں میں سب سے پہلے جس چیز پر نظر پڑتی ہے وہ ان کے عنوانات کا نرالا پن ہے ان کے عنوان ہی سے انبساط کا پہلو نمایاں ہوتا ہے وہ ایسی چیزوں پر قلم اٹھاتے ہیں جس کسی نے ہیچ بھی نہ کیا ہو۔ انہوں نے عام رنگ سے ہٹ کر اپنا راستہ الگ اختیار کیا ہے ان کے عنوان بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ عنوان دیکھتے ہی قاری ہنسنے لگتا ہے انشائیہ کی خوبی ہے کہ عنوان کے اندر ندرت ہو خواجہ صاحب بہت غور و خوض کے بعد عنوان رکھتے ہیں کیونکہ عنوان ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ انشائیہ نگار کیا کہنا چاہتا ہے عنوان ہی انشائیہ کی جان ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جھینگر کا جنازہ، گرفتار شدہ خطوط کا ناباقی، مکھی مچھر تک کو عنوان بنا کر انہوں نے ایسے انشائیے تخلیق کئے ہیں جن میں فنی خوبیاں موجود ہیں۔

خواجہ صاحب کے انشائیوں میں کوئی نہ کوئی درس ملتا ہے کہیں صبر کی تلقین ہے کہیں عبرت حاصل ہوتی ہے کہیں غرور و تکبر سے نفرت دلائی جاتی ہے کہیں موت کی بھیانک تصویر آنکھوں کے سامنے لائی جاتی ہے وہ ایک جگہ فٹ بال کا ذکر کرتے ہوئے غرور و تکبر سے نفرت دلاتے ہیں۔ جب فٹ بال کو کھیل کے میدان میں سب ٹھوکریں مار رہے تھے اور وہ ہر کھلاڑی کے پاس پناہ لینے دوڑ رہی تھی مگر کوئی پناہ نہ دیتا تھا تو گیند روئی اور اس نے یہ گانا گا کر کہا کہ میرے اندر خود پسندی کی ہوا نہ ہوتی اور میں گھمنڈ سے پھولی ہوئی نہ ہوتی تو مجھے یوں ٹھکرایا نہ جاتا اور میرے ہم جنس چمڑے کا بوٹ میرے ٹھوکر نہ مارتا۔ خواجہ صاحب کے یہاں تاثراتی انداز پایا جاتا ہے یعنی وہ جس چیز سے متاثر ہوتے ہیں اس پر لکھتے چلے جاتے ہیں وہ چیز کسی کو اپیل کرے یا نہ کرے خواجہ صاحب اس کی پرواہ نہیں کرتے

غزل

شفیق طاہری

مٹ کے دل اس کی تمنا کے نشاں چھوڑ گیا
بجھ گیا چاند مگر روشنیاں چھوڑ گیا

میں نے پہروں اُسے پھولوں کی دعائیں دی ہیں
جو مری راہ میں اک سنگِ گراں چھوڑ گیا

یہ مرا حسنِ مسافت تھا کہ عزمِ منزل
میں ہر اک موڑ پہ وقتِ گزراں چھوڑ گیا

اب مجھے ترکِ تمنا کی بھی توفیق نہیں
ایسے عالم میں ترا دردِ کہاں چھوڑ گیا

سختیٔ راہِ وفا کب سے ہے آئینہ بدست
کون یہ کانپتے پیروں کے نشاں چھوڑ گیا

کیا قیامت تھا تری نیم نگاہی کا فسوں
ذہن میں کتنے قیاسات و گماں چھوڑ گیا

اب میں زندہ ہوں فقط اپنی انا کے دم سے
اس کا خنجر بھی شفیق یہ رگِ جاں چھوڑ گیا

انشائیہ تاثراتی ہوتا ہے جس طرح سے سیاح اپنے ایسے تاثرات پیش کرتا ہے جس پر دوسروں کی نظر نہیں جاتی اس طرح خواجہ صاحب اپنے تاثر سے چھوٹی چھوٹی چیزوں کو اونچا مقام دیتے ہیں۔ خواجہ صاحب فطرت کے نبض شناس تھے انسانی نفسیات کو سمجھتے تھے ان کے ادب پاروں میں فطرت کی کامیاب تصاویر پائی جاتی ہیں۔ انھوں نے ان چیزوں پہ قلم اٹھایا ہے جن کو لوگ حقیر سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر گلاب اور کیکر کو لے لیجئے کیکر کو گلاب کے مقابلے میں بہت ہی حقیر سمجھا جاتا ہے لیکن انہوں نے عام مذاق کی نفی کی ہے۔ گلاب کا پھول ہر شخص کو پسند ہے اور کیکر کے پھول سے کسی کو دلچسپی نہیں ہوتی مگر خواجہ صاحب نے اس کی ستائش کی ہے "گلاب کے کانٹوں کو دیکھیے دھوکے باز ہیں دکھائی نہیں دیتے ہاتھ لگاتے ہی چبھ جاتے ہیں کیکر کے کانٹے دور سے نظر آتے ہیں کیا مجال کہ بے خبری میں کسی کو ستائیں۔ گلاب کے کانٹے سوکھ جائیں تو پھینک دیئے کے قابل کیکر کے کانٹے سوکھ کر گھروں اور کھیتوں کی حفاظت کریں۔ اس پر طرّہ یہ کہ کیکر کا کانٹا کیسا سیدھا سا تھا اور نکیلا ہوتا ہے رنگ دیکھو تو وہ بھی انوکھا نرالا شاعروں کے گلاب کو یہ بات کہاں میسّر؟

انشائیہ کا امتیازی وصف اس کی "تازگی" ہے تازگی سے مراد موضوع اور نقطۂ نظر کا وہ انوکھا پن بھی ہے جو ناظر کو زندگی کی یکسانیت اور ٹھہراؤ سے اوپر اٹھا کر ماحول کا از سرِ نو جائزہ لینے پر مائل کرتا ہے خواجہ صاحب کے یہاں تازگی اور لذت پائی جاتی ہے انشائیہ کا مقصد انبساطی اور نشاطی ہے جس طرح کسی نظم اور غزل کو پڑھ کر مسرت اور لذت حاصل ہوتی ہے اسی طرح کسی اچھے انشائیہ کو پڑھنے کے بعد بھی ایک سرور اور وجدان کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اس لئے کسی نے کہا ہے کہ انشائیہ نثری غزل ہے خواجہ صاحب کی طبیعت بہ نہایت شگفتہ تھی وہ ہر چیز میں انبساط اور مسرت کا پہلو دو ڈرانا چاہتے تھے انشائیہ علمی نکات واضح نہیں کرتا اور آزادانہ ذہنی ترنگ کا مظاہرہ کرتا ہے ان کی بہت سے تحریروں میں آزادانہ ذہنی ترنگ موجود ہے اسی بنا پر وہ انشائیہ نگاروں کی فہرست میں ممتاز مقام حاصل کرنے کے مستحق ہیں۔ اچھی نثر کا حسن یہ ہے کہ اس میں صوتی آہنگ پایا جائے ایک انشائیہ کے لئے یہ بہت ضروری چیز ہے تاکہ اس کو پڑھ کر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو سکے نظم اور نثر دو الگ الگ چیزیں ہیں لیکن جب نثر نظم کی حدوں کو چھونے لگے تو اس کی عظمت دوبالا ہو جاتی ہے ان کے یہاں صوتی آہنگ موجود ہے بعض مقامات پر تو صوتی آہنگ کی اس قدر تکرار فرمائی ہے کہ ان کی نثر آزاد نظم معلوم ہونے لگتی ہے بھگت کے بس میں آنجگوان "میں ان کی نثر شعریت میں ڈوبی ہوئی

ہے۔ شوکت والے طاقت والے توپوں اور سنگینوں والے
دکھ کے کرتا سکھ کے سر دپ ہوکے ترسے پیاسے ترے اچھا
یہ ہے تو ہو پاس پھول بھی تو خار بھی نیزا اور بھی تو نار بھی تیری
آنکھیں تیری سب کچھ تیرا من کے اندر تیرا ڈیرا لبیں میں آنگلان

خواجہ صاحب کی زبان بہت سادہ اور رواں ہے تصنع کا پتہ نہیں آدارہ سے پاک ہے سادگی اس کی جان لطافت بانکپن اور شیرین اس کا حسن ہے ان کی زبان میں عارف کا خلوص عاشق کی تڑپ اور مجذوب کی کی وارفتگی بھی پائی جاتی ہے، انھوں نے اپنی عبارت میں عربی فارسی کے ثقیل الفاظ استعمال کرنے سے پرہیز کیا ہے ان کی زبان دلی کے ٹکسالی زبان ہے بے تکلفی اور بے ساختگی ان کی زبان کا نمایاں جوہر ہے۔ انھوں نے ہندی کے الفاظ اکثر و بیشتر استعمال کئے ہیں ان کا مقصد توحید الٰہی کی تبلیغ تھا اس لئے انھوں نے اپنے انشائیوں میں کہیں کہیں قرآن شریف کی آیات کو دلیل کی طور پر پیش کیا ہے ان کے اسلوب میں ایک دھیما دھیما ترنم اور الفاظ میں موسیقیت ملتی ہے۔

خواجہ حسن نظامی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کی دلکش اور جاندار تصویریں پیش کرتے ہیں۔ یہ ایسی تصویریں ہیں کہ آنکھوں کے سامنے ہو بہو آموجود ہوتی ہیں انھوں نے واقعہ نگاری میں بیانیہ اسلوب سے کام لیا ہے ان کے جملے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں اور واقعات کی سچی تصویر کھینچتے چلے جاتے ہیں اور ساتھ ہی رعایت لفظی سے کام لیتے ہیں رعایت لفظی حسن میں اضافہ کرتی ہے ہر اچھے انشا پرداز کے یہاں رعایت لفظی کا اہتمام ہوتا ہے انھوں نے رعایت لفظی کے استعمال میں اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا یہی وجہ ہے کہ رعایت لفظی نے ان کی عبارتوں میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔

خواجہ صاحب کے انشائیہ ایک پھلجھڑی کی مانند ہیں ان سے روشنی ہوسکتی ہے لیکن حرارت نہیں ہوتی رنگ ہوتے ہیں۔ لیکن انھیں گرفت میں نہیں کیا جاسکتا۔ خواجہ صاحب انشائیہ کے ذریعے قوم جو مردہ ہوچکی تھی اس میں جوش ولولہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

عشرت کرتپوری

دریائے زندگی پہ غضب کا چڑھاؤ ہے
اپنا اثاثہ ایک ہی کاغذ کی ناؤ ہے

آؤ کسی قریب کے گاؤں میں جا بسیں
اس شہر میں تو اہلِ ہوس کا پڑاؤ ہے

کچے گھڑے پہ پار اترنا پڑے گا اب
تاریک شب ہے تیز ندی کا بہاؤ ہے

گھاؤ بہت سے وقت کے مرہم نے بھر دیئے
احساس اس لئے ہے ابھی تازہ گھاؤ ہے

اہلِ خرد نے اپنے چلن کو بدل دیا
اہلِ جنوں کا اب بھی وہی رکھ رکھاؤ ہے

اک میکدہ بچا تھا تعصب کی آگ سے
اس وقت میکدے میں بڑا بھید بھاؤ ہے

کل اس جگہ تھا اک گلستاں کھلا ہوا
اب جس جگہ پہ اہلِ خرد کا پڑاؤ ہے

ابہام وتجرید، قدیم وجدید اور مقصدیت و
بے مقصدیت کی (یعنی بحثوں سے پاک

ادب میں حسن وصحت، استقلال واعتدال اور تخلیق وتنقید کا سنگم۔ فنی آداب
اور صحت مند تہذیبی اقدار سے مزین تقریباً ڈھائی سو صفحات پر مشتمل

ڈیمائی سائز کا یہ بیش قیمت رسالہ عنقریب منظر عام پر آرہا ہے۔

... اس شمارے کی ایک جھلک

مقالہ نگار وافسانہ نویس

جیلانی کامران • عبدالمغنی • محمد حسن عسکری
جمیل مظہری • شانتی رنجن بھٹاچاریہ
ضیا عظیم آبادی • طلحہ رضوی برق
اقبال مسعود اور حسن رضا وغیرہ

مجلس مشاورت

پروفیسر اسلوب احمد انصاری
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
پروفیسر عبدالقوی دسنوی
ڈاکٹر طہٰ ابن فرید
ڈاکٹر عبدالمغنی

شعرا

• جمیل مظہری • جگناتھ آزاد • پرکاش فکری • رضاالقوی داہی
• سلطان اختر • کرشن کمار طور • مظفر حنفی • حنیف کیفی وغیرہ

سرپرست: سلیمان صادق

★ مدیر: احمد سجاد ★ مدیر معاون: مظفر احمد مہدی • تزئین کار: محمد مظہر

خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتہ:
منیجر "ابلاغ" طارق منزل، بریاتو
ہاؤسنگ کالونی، رانچی - بہار ۸۳۴۰۰۹

• سالانہ: ۱۵/- روپے • فی پرچہ ۱۰/- روپے
• بیرون ہند ۳۵/- " • " " ۱۵/- "

مولانا مودودیؒ

ڈاکٹر عبدالمغنی

عصرِ حاضر کا سب سے بڑا دماغ

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے جس وقت تحریک اسلامی کا آغاز کیا، ہندوستان، ایشیا، افریقہ اور پورا مشرق غلام تھا۔ عالمِ اسلام پر بھی اغیار کا غلبہ تھا، مغربی فکر و فلسفہ دنیا پر مسلط تھا، یورپی سیاست کا ڈنکا بج رہا تھا، امریکی معیشت متمدن ممالک و اقوام پر اپنے پنجے گاڑنے لگی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اشتراکی نظریہ اپنی تمام فتنہ سامانیوں کے ساتھ روس میں برسرِ اقتدار آ کر بڑی تیزی سے اپنا دائرہ اثر عالمی سطح پر بڑھا رہا تھا۔

اس عالم میں شبلی کی تاریخ نگاری، اقبال کی شاعری اور ابوالکلام آزاد کی خطابت ہندوستان کے مسلمانوں اور مشرق کے انسانوں کو حریت و اخوت کا وہ پیام دے رہی تھیں جو مغربی ریاست اور طاقت کے خلاف سب سے مضبوط ذہنی سہارا تھا۔ مصر میں رشید رضا اور محمد عبدہ نے بھی باطل کی بڑھتی ہوئی تاریکی کے مقابلے پر حق کا چراغ جلا رکھا تھا۔ ان سب سے پہلے جمال الدین افغانی بین الملیت کی دعوت دے چکے تھے۔ ان کے علاوہ ترکی کے دورِ زوال میں بدیع الزماں نورسی نے بھی الحاد کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی اور بہت بعد میں حسن البنا شہید نے عربوں کو اسلام کے لیے ابھارنے کی سعی کی تھی۔

لیکن عصرِ حاضر کو ایک ایسے مردِ مومن کی ضرورت تھی جو ایک طرف اپنے علم و تحقیق سے رائج الوقت افکار کی دنیا میں ایک زلزلہ ڈال دے اور مغربیت و اشتراکیت کے ذہنی طلسم کے تار و پود بکھیر کر رکھ دے، جبکہ دوسری طرف اپنے کردار اور حق پرستوں کا عزم و حوصلہ بلند کرے، یہی وہ مردِ مومن ہے جس کی تمنا میں اقبال نے ولولہ انگیز نغمات گائے۔

اقبال فرماتے ہیں ۔

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس
خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیارے
پیرانِ کلیسا ہوں کہ شیخانِ حرم ہوں
نے جدتِ گفتار ہے، نے جدتِ کردار
ہیں اہلِ سیاست کے وہی کہنہ خم و پیچ
شاعر اسی افلاسِ تخیل میں گرفتار
دنیا کو ہے اس مہدیٔ برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار

(مہدیٔ برحق، ضربِ کلیم)

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال
ملا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق
افکار میں سرمست، نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

(مستیٔ کردار، ضربِ کلیم)

ایک انقلابی مفکر کی تلاش میں اقبال کی حسرت درج ذیل اشعار سے نمایاں ہوتی ہے۔

ہند میں حکمتِ دیں کوئی کہاں سے سیکھے
نہ کہیں لذتِ کردار، نہ افکارِ عمیق
حلقۂ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں
آہ، محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق
خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

اِن غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

(اجتہاد، ضربِ کلیم)

اقبال یقین کرتے تھے کہ مغرب کے طحدانہ تصورات کو کوئی ایسا شخص ہی شکست دے سکتا ہے جو مشرق سے حکمت دیں کا جھنڈا لے کر اٹھا ہو، لیکن ان کے دور میں جو چند شخصیتیں وقتی طور پر امید افزا طریقہ سے ابھریں وہ بالآخر کھوکھلی، ناقص اور بے اثر ثابت ہوئیں۔ مصطفیٰ کمال اور رضا شاہ پہلوی جیسے لوگوں سے اقبال اپنی مایوسی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ مشرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

(مشرق، ضربِ کلیم)

اقبال کو عصرِ حاضر میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے جس شخصیت کا انتظار تھا اس کے بارے میں وہ اپنے وقت کے اولیاء اور صوفیاء سے اس طرح سوال کرتے ہیں۔

اب حجرۂ صوفی میں وہ فقر نہیں باقی
خونِ دلِ شیراں ہو جس فقر کی دستاویز
اے حلقۂ درویشاں وہ مردِ خدا کیسا
ہو جس کے گریباں میں ہنگامۂ رستاخیز
جو ذکر کی گرمی سے شعلے کی طرح روشن
جو فکر کی سرعت میں بجلی سے زیادہ تیز

(غزل، بالِ جبریل)

اقبال کے مذکورہ بالا اشعار محض اشعار نہیں ہیں بلکہ ان حقائق کا بہترین اظہار ہیں جو بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی تک نہ صرف مشرق اور عالمِ اسلام بلکہ پورے عالمِ انسانیت میں پائے جاتے تھے اور جن کی سنگینی و خطرناکی کو دیکھتے ہوئے اہلِ نظر شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ اگر کوئی ایسا مردِ خدا سامنے نہیں آیا جو دورِ جدید کی جاہلیت و ظلمت کو چیلنج کر کے ہوا کا رخ پلٹ سکے تو دنیا کی مخلوق تباہی کے اس غار میں گر کر رہے گی جس کی طرف وقت کے مفکرین و مدبرین اسے لئے جا رہے ہیں

کارل مارکس اور چارلس ڈارون نظریات نے عصرِ حاضر کا جو ماحول تشکیل دیا ہے اس میں ایک طرف لینن اور ماؤ جیسے معماران قوم پیدا ہوئے اور دوسری طرف چرچل اور روزویلٹ جیسے مدبرین نمودار ہوئے اور ان ہی کے درمیان مسولینی اور ہٹلر جیسے مطلق العنان آمر بھی جلوہ گر ہوئے۔ یہ سب لوگ جدلیاتی مادیت اور میکانکی ارتقاء کی مخلوق تھے۔ اور انھوں نے مل کر جو نئی دنیا بنائی اس میں دو عظیم عالمی جنگیں واقع ہوئیں جنھوں نے انسانیت کی تمام معروف مسلم قدروں کو غارت کر کے رکھ دیا، اپنی اپنی قوموں اور ملکوں کے ان مفکروں اور رہنماؤں نے نہ صرف یہ کہ دوسرے ممالک و اقوام کو سامراجی عزائم اور نو آبادیاتی استحصال کا شکار بنایا بلکہ خود اپنے سماجوں کو حیوانوں کا معاشرہ بنا کر رکھ دیا۔ پھر چونکہ یہی معاشرہ سائنسی اور صنعتی اعتبار سے غالب حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا ایک مصنوعی تمدن اور غیر فطری تہذیب پوری انسانی دنیا میں رائج ہوگئی، یہاں تک کہ تعلیم یافتہ افراد اور ترقی پسند ذہنوں نے اسی طرح تہذیب و تمدن کو معراجِ انسانیت تصور کر لیا۔

ہندوستان کے مسلمان اور غیر مسلم سبھی عام طور پر مغربی سائنس صنعت، معیشت، اور معاشرے، نیز فلسفۂ تعلیم اور سیاست کے ہمہ گیر ظلم میں گرفتار تھے اور سامراج کے خلاف آزادی کی پوری جنگ ان ہی ہتھیاروں سے لڑی جا رہی تھی جو خود سامراجی ملک کے تمدن و تہذیب نے ڈھال رکھے تھے۔ حتیٰ کہ تحریکِ آزادی کے تقریباً تمام ہی راہ نما باضابطہ مغربی و برطانوی تعلیم و تربیت کی گود میں پلے اور بڑھے تھے، گاندھی اور نہرو دونوں انگلستان سے بیرسٹر بن کر آئے تھے اور نہرو کی شیروانی سے لے کر گاندھی کی لنگوٹی تک جو ذہن کام کر رہا تھا وہ اپنی جگہ نہایت مخلصانہ طور پر وطن دوست اور قوم پرست ہونے کے باوجود انگریزی فلسفہ و تدبر کا خوشہ چیں اور مغربی نظامِ حیات کے بنیادی تصورات سے مرعوب تھا۔ جنگِ آزادی کی قیادت کی اس کیفیت کو ابوالکلام آزاد جیسا مشرق کا ترجمان اور اسلام کا رازشناس بھی درست کرنے سے قاصر تھا بلکہ آزادی کو بھی رنگِ زمانہ کے پابندی کے ساتھ ہی حل کرانے کے مشورے

سے اور ان کی بنائی ہوئی لائن پر کام کرنا پڑا تھا۔ اور اس معاملہ میں آزاد کے حکومت الٰہیہ کے تخیل سے لے کر گاندھی کے رام راج کے نقشے تک مشرقی فکر کے سبھی رجحانات کو سوراج کی اس قربان گاہ پر چڑھا دیا گیا تھا جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ اہلِ مغرب کے ہاتھوں سے عنانِ اقتدار چھین کر مغرب پسند ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں دے دی جائے۔ چنانچہ آزادی کے بعد برطانوی دولت مشترکہ میں شرکت کا مطلب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ مروجہ سیاست و معیشت سے استفادہ کا موقع باقی رہے۔ دوسری طرف محمد علی جناح نے پاکستان کا مطالبہ صرف مسلمانوں کے ایک سیاسی وطن کے لئے کیا اور یہ چاہا کہ مسلم فرقہ کی ایک مستقل بالذات حکومت قائم ہو، تاکہ جدید جمہوریت میں مسلمان دوسرے فرقہ کی اکثریت کے رحم و کرم پر نہ ہوں۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے شعور نے اسی ماحول میں آنکھیں کھولیں اور ان کا ذہن اسی فضا میں پروان چڑھا بلکہ بعض رائج الوقت اداروں سے وہ وابستہ بھی رہے اور ان اداروں کی بعض سرگرمیوں کے ساتھ انھوں نے تعاون بھی کیا۔ انھوں نے جمعیۃ علماء کے ترجمان کی ادارت بھی کی اور مسلم لیگ کے لئے قرارداد لاہور مرتب کرنے والوں میں بھی شامل رہے لیکن جب انھوں نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب کے ذریعہ "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کا حل پیش کیا تو وہ کانگریس اور لیگ دونوں کی قوم پرستی سے مختلف تھا۔ اس لئے ان کے نزدیک "مسئلہ قومیت" وہ نہ تھا جو عصرِ حاضر کے مفکرین اور مدبرین سمجھ اور سمجھا رہے تھے۔ مولانا مودودی نے وطنیت کے پرشور ہنگامے میں ایک آفاقی اور دینی ملت کا وہ اسلامی تصور پیش کیا جو عالمی اور بین الاقوامی انسانی برادری پر مشتمل تھا، اس سے قبل مولانا "الجہاد" کے عنوان سے ایک مبسوط تصنیف میں اسلام کے قانون جنگ و امن پر روشنی ڈال کر دنیا کو بتا چکے تھے کہ عصرِ حاضر کے تمام رائج الوقت فلسفوں اور نظریوں کے برخلاف اسلام کا تصورِ جنگ و امن ایک خالص اصولی، نظریاتی اور اخلاقی تصور ہے۔ جو دوستی اور دشمنی کا معیار، تعاون و تصادم کا محور، سیاسی و معاشی مفادات اور قومی و ملکی یا شخصی و گروہی اغراض و عزائم کے بجائے خیر اور حق و باطل کی حمایت میں شر اور باطل و ظلم کی قوتوں سے نبرد آزمائی کو قرار دیتا ہے۔

اس طرح مولانا مودودی نے سیاست وقت کا رُخ موڑ کر اسے اسلام کی سمت میں ڈالنے کی زبردست فکری کوشش کی اور ایسے نازک وقت پر کی جب مغرب زدہ مسلمانوں اور غیر مسلم دونوں ہی ان پر شبہ اور حملہ کر سکتے تھے، اس لئے اجتماعی امور میں اسلامی تصورات پورے انسانی سماج حتیٰ کہ مسلم معاشرے میں بھی نامانوس اور اجنبی بن چکے تھے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ عصرِ حاضر کے غالب رجحانات قوتوں کے ساتھ مولانا کی ناقابلِ مصالحت جنگ بالکل اسلامی بنیادوں پر شروع ہو گئی اور جیسے جیسے مولانا کے زیرِ قیادت تحریکِ اسلامی بڑھتی گئی ویسے ویسے یہ جنگ تیز تر ہوتی گئی۔ زندگی کے ہر موضوع پر مولانا نے فکری اجتہاد اور عملی جہاد دونوں کا حق ادا کر دیا۔ عصرِ حاضر میں اسلام کی تجدید، مسلم معاشرے کی اصلاح اور عالم انسانیت میں ایک بنیادی اور ہمہ گیر انقلاب کے لئے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اپنی زندگی کی آخری سانس تک وہ سب کچھ کرتے رہے جو ضروری اور ممکن تھا۔

مولانا نے اپنے وسیع لٹریچر میں ایک کامل نظریۂ زندگی اور مکمل ضابطۂ حیات کے طور پر اسلام کو مدلل اور موثر طریقے سے پیش کیا۔ اسلامی نظامِ زندگی کا نقشہ مرتب کرنے کے لئے انھوں نے ایمانیات، اخلاقیات، سیاسیات، سماجیات اور معاشیات کے تمام پہلوؤں پر اصولی بحث کی اور ایک ناقابلِ تردید بنیادی فکری مواد مہیا کیا۔ اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر ڈالنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے اسلامی ریاست کی تشکیل کا خاکہ بھی ترتیب دیا "اسلام اور جاہلیت" کا فرق واضح کرتے ہوئے "سلامتی کا راستہ" اور "قرآن کی راہ" متعین کیا۔ اسلام کا سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی نظریہ بتاتے ہوئے انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل" کی نشاندہی کی اور "سود" جیسی اہم ضخیم کتاب لکھ کر دورِ حاضر کے پورے معاشی نظام

کو چیلنج کیا اور اس کے مقابلہ پر اسلام کی شکل میں ایک بہتر متبادل بھی باضابطہ پیش کیا" پردہ" جیسی تاریخی تصنیف کے ذریعہ مغربی نظام معاشرت کی دھجیاں اڑا دیں اور اس کے مقابلے میں اسلامی نظام معاشرت کی برتری ثابت کر دی "خلافت و ملوکیت" نے اسلام کے اس شورائی نظام کی تشریح کی جو مغرب کی ناقص جمہوری نظام کا نعم البدل ہو سکتا ہے، ساتھ ہی اس نظام خلافت کے قیام و استحکام اور تحفظ و ترقی کے لئے ہر قسم کی ملوکیت اور آمریت کے خلاف جہاد کا ولولہ انگیز پیغام دیا۔

مولانا کا ایک نہایت کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے عصر حاضر کے سب سے طاقتور الحادی نظریے اور فتنے اشتراکیت، کو محض ایک سیاسی و معاشی تصور کے بجائے اس کی اصل فلسفیانہ شکل میں، اس کے تمام ذہنی مضرات اور اخلاقی مضرات کے ساتھ پیش کر کے اس نظریے کے تمام پول کھول دیئے اور اسے بالکل برہنہ کر دیا، اس سلسلہ میں مولانا نے یہ پتے کی بات بتائی کہ اشتراکیت بھی درحقیقت ایک دین باطل ہے اور اس کے فاسد عقائد افراد کے ساتھ ساتھ پوری قوم کو مسخ کر کے رکھ دیتے ہیں اور اس کی مجموعی شخصیت کو اتنا مفلوج کر دیتے ہیں کہ اشتراکی جماعت، ریاست اور معاشرت میں روٹی، کپڑا اور مکان کی افیون پلا کر انسانی ضمیر اور کردار کو بالکل فنا کر دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ محض حیوانی ضروریات کے مقاصد حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کے غیر اخلاقی، غیر انسانی اور غیر فطری ذرائع اختیار کرنے کی پوری چھوٹ ہوتی ہے اور انفرادی و قومی سے عالمی و بین الاقوامی سطحوں تک اشتراکیت ہر اس فتنہ و فساد، ظلم و ستم، بدعنوانی اور جرائم پیشگی کو روا رکھتی ہے جو اشتراکی قیادت کے شخصی و گروہی طبقاتی عزائم کے حصول میں موثر ثابت ہو سکے۔ مولانا مودودی کی اس تشریح نے نئی نسل کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو عام طور پر اشتراکیت کے فتنے سے محفوظ کر دیا۔ پھر مولانا نے اشتراکیت کی معاشی بنیادوں کو فکری طور پر منہدم کر کے ایک طرف تو یہ واضح کر دیا کہ اشتراکیت بھی دراصل سرمایہ داری ہی کی ایک شکل ہے اور بدترین شکل ہے اس لئے اس میں وسائل معیشت پید ریاست اور ریاست کے نام پر ایک محدود سے حکمران طبقے بلکہ بسا اوقات ایک ہی شخص کی اجارہ داری کا تصور پایا جاتا ہے۔ چنانچہ کسی اشتراکی ریاست کا سربراہ اپنے عوام و خواص کے سروں پر ایک فرعون، نمرود اور شداد کی طرح مسلط ہوتا ہے۔ اور گویا مخلوق خدا کے مقابلے میں ربوبیت اور رزاقیت کا مدعی ہوتا ہے۔ جبکہ دوسری طرف اسلامی نظام معیشت کے مثبت اور فلاحی عناصر کی تشریح کر کے مولانا نے اشتراکی معاشیات پر اسلامی معاشیات کی برتری بھی ثابت کر دی اور اس چیز نے اسلام پسندوں کے حوصلے بلند کر کے انہیں سوشلزم جیسے فتنے کی طرح پھیلتے ہوئے تصور کے مقابلے پر ایک زبردست اقدامی پوزیشن میں کھڑا کر دیا۔

ایک عظیم الشان فکری اجتہاد و جہاد کے ساتھ ساتھ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلام کی علمبردار ملت اسلامیہ کو ہر جہت سے منظم و مستعد کرنے کے لئے مسائل حاضرہ کے تنقیحات و تفہیمات، سے آگے بڑھ کر دین کے اصل سرچشمہ قرآن حکیم کی مبسوط تفسیر کی اور اسلامی معاشرت کے نمونہ کامل سیرت رسول کو بھی مرتب کیا۔ نیز ہر قسم کی الجھنوں کو صاف کرنے کے لئے "رسائل و مسائل" کی جلدوں میں ان تمام سوالات کے جواب دئے جو جدید معاشرے میں ایک اسلام پسند کو پیش آتے ہیں، اس کے علاوہ مولانا نے، جماعت اسلامی کے نام سے ایک ایسی فعال تنظیم تشکیل دی جو ایک متعین نظم و ضبط کے تحت، ایک واضح منصوبے اور نقشہ کار کے ساتھ زندگی کے ہر محاذ پر تمام اور ہر قسم کے غیر اسلامی عناصر کا مؤثر مقابلہ کر کے نظام اسلام کے غلبہ و نفاذ کے لئے راہ ہموار کرے۔

بلاشبہ جماعت اسلامی کی عملی جد و جہد نے مولانا مودودی کی شخصیت اور پیغام کو ان کی زندگی میں بعض وقت اور بعض پہلوؤں سے نزاعی بنا دیا۔ جبکہ اگر مولانا نے اپنے آپ کو صرف تصنیف و تالیف اور وعظ و پند تک محدود رکھا ہوتا۔ اور اپنے گرد تزکیۂ نفس کا ایک حصار کھینچ کر محض ذکر و فکر کی کسی مسند پر بیٹھ جاتے تو ان کے بارے میں یا کبھی کوئی نزاع

نہیں پیدا ہوتی یا تھوڑے ہی عرصہ میں ختم ہو جاتی۔ اور بالآخر امت کے تمام علماء، صوفیا، مشائخ اور اولیا ان کو اپنا پیر و مرشد مان لیتے۔ لیکن مولانا مودودی کی دینی بصیرت و عزیمت نے اپنے لئے پیر طریقت کا آسان مگر بے اثر راستہ پسند و اختیار نہیں کیا۔ بلکہ ایک مجتہد، مجدد اور صاحب کی پُرخطر اور پُراثر راہ شریعت پر گامزن ہونا طے کیا وہ ایک مرد مومن تھے اور کش مکش زندگی سے گریز ان کے لئے ممکن ہی نہ تھا، وہ تو اٹھے ہی تھے عصر حاضر کے مرکز فکر و عمل میں اسلام کو کفر کی صفوں کے مقابلے پر ایک موثر طاقت بنا کر کھڑا کرنے کے لئے تاکہ باطل کے بڑھتے ہوئے لشکر کی پیش قدمی روک کر حق کو فتح مند ہونے کا موقع دیں۔ ایمانی جرات و فراست کی اس مستقیم راہ میں مولانا مودودی نے ہر قسم کا خطرہ مول لیا۔ ہر طرح کا حملہ برداشت کیا طرح طرح کی ناگواریوں اور مصیبتوں کو انگیز کیا۔ یہاں تک کہ اپنی جان کی بازی لگادی اور پھانسی کے تختے پر چڑھنے کے لئے تیار ہو گئے۔

اعلاء کلمۃ الحق کا یہ افضل الجہاد عصر حاضر کے کسی اور صوفی، ولی اور قطب نے بھی اس شان سے کیا ہے؟

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا مشن ان کی زندگی میں پورا نہیں ہوا۔ جس ملک میں نظام اسلامی کے لئے انھوں نے اپنی جان تک کی بازی لگادی وہاں ابھی اسلامی ریاست کے قیام کی منزل ابھی نہیں آئی ہے اور نہ اسلامی معاشرہ بروئے عمل آسکا ہے۔ لیکن یہ ایک انسان کی حدِ عمل تھی جو زیادہ سے زیادہ اپنے وقت کا مجدد تھا۔ قدرتِ الٰہی کی مشیت کو مولانا مودودی سے جو کام لینا تھا وہ اس نے پورے طور سے اور بہت ہی موثر اور کامیاب انداز میں لے لیا۔ آج کی دنیا میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور انسانی معاشرے میں انقلاب کے آثار رجحان جو پائے جا رہے ہیں ان کے پیچھے مولانا مودودی کی فکر اور ان کا لٹریچر نیز ان کا نمونہ عمل یقیناً کام کر رہا ہے آج اگر اسلام ایک ابھرتی ہوئی قوت ہے اور اسلامی نظریہ و نظام ایک طرف مغربی جمہوریت اور امریکی سرمایہ داری کو اور دوسری طرف روس یا عالمی اشتراکیت کو چیلنج کر رہا ہے تو یہ کارنامہ سب سے زیادہ اور سب سے بڑھ کر مولانا مودودی ہی کا ہے۔ آج اسلامی تحریک دنیا کے جس گوشہ میں بھی کام کر رہی ہے اس کا بنیادی لٹریچر نظام فکر اور نقشہ عمل مولانا مودودی ہی کا دیا ہوا ہے۔ دنیا کی اکثر زبانوں میں مولانا کی کتابوں کے ترجمے ہو چکے ہیں اور ہر جگہ ان کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ ہر ملک میں مسلمانوں کا ذہین طبقہ مولانا کو اپنا فکری رہنما سمجھتا ہے، نئی نسل انھیں اپنا پیشوا مانتی ہے اور عوام و خواص میں ان کے ساتھ عقیدت روز افزوں ہے۔ دنیا کے متعدد مسلم سربراہان سلطنت مولانا کی ذہنی قیادت کو تسلیم کرتے ہیں۔ کئی ملکوں میں انقلاب اقتدار کے علمبرداروں نے مولانا کے فکر و عمل سے جذبہ حاصل کیا ہے غیر مسلم دانشوروں کے درمیان مولانا کے تصورات کے متعلق تجسس بڑھتا جا رہا ہے اور دانش گاہوں میں ان کے پیغام اور کام پر تحقیقات ہونے لگی ہیں، مولانا مودودی کے ہمہ گیر اثرات کی حد یہ ہے کہ غیر اسلامی دنیا میں اسلام اور مودودی گویا ایک دوسرے کے مترادف ہو گئے ہیں اور آج جس کسی کو اسلام کی مذمت کرنی ہوتی ہے وہ مولانا مودودی کی مذمت کرنا بھی ضروری سمجھتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اپنے فکر و تدبر اور اقدام و عمل کا جو عظیم الشان سرمایہ چھوڑ گئے ہیں وہ کسی ایک ملت اور قوم و فرقہ کی میراث نہیں ہے، عصر حاضر کی پوری انسانیت کا بہترین اثاثہ اور دنیا کے مستقبل کے لئے ایک متاع گراں ہے۔ اس لئے کہ یہ اسلام کا وہ تاریخی ورثہ ہے جسے مولانا کے قلم اور اقدامات نے ہر قسم کے غبار و کدورت سے پاک کر کے اس کی اصل و حقیقی اور فطری و مکمل شکل میں عصر حاضر کے سامنے تاریکیوں کے درمیان ایک روشن چراغ بنا کر رکھ دیا ہے اور آئندہ انسانیت کے قافلے ارتقاء کی جو بھی منزلیں سر کریں گے اس چراغ کی روشنی میں کریں گے ورنہ اندھیروں میں بھٹک کر نہ صرف منزل کا راستہ گم کر دیں گے بلکہ سفر ہی

سے مٹ جائیں گے۔ آج کی دنیا ایک دوراہے پر کھڑی ہے
یا تو اسلام کے صراطِ مستقیم پر گامزن ہو کر ارتقا کی باقی
اور بلند ترین منزلیں طے کرے یا غیر اسلامی نظریات کے
چکر میں پھنسی ہوئی اپنی تمام مادی ترقیات کے ساتھ تباہی
ہلاکت، فنا کے غار میں جا گرے، اور عصر حاضر کی انسانیت
کے پاس تباہی و ہلاکت اور فنا کے سوا بچنے کی کوئی چارۂ کار
اسلام کی شکل میں ہے، یہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ہی
واضح کیا ہے۔ اقبال نے عصر حاضر میں انسانیت کی آفاقی
نشأۃ ثانیہ کے لئے اسلام کے جس داعی اور علمبردار کی تمنا
کی اس کے صفات انھوں نے جن اشعار میں بیان کئے
ہیں ان میں درج ذیل کا اضافہ کر کے تجزیہ کریں تو جدید
اسلامی قیادت کے عناصر ترکیبی کا یقین کر سکتے ہیں۔

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں
بہانہ بے عملی کا بنی شراب الست
فقیہ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور
کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست
گریز کشمکش زندگی سے مردوں کا
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

(شکست، ضرب کلیم)

۱۔ عصر حاضر میں اسلامی قیادت کے منصب پر فائز ہونے
کے لئے ضروری ہے کہ ایک شخص بیک وقت قدیم و جدید
اور دینی و دنیوی علوم کا جامع ہو۔
۲۔ دینی اور دنیوی علوم سے اس کی واقفیت وسیع، گہری
اور مجتہدانہ ہو۔
۳۔ وہ اپنے علم و ادراک پر اعتماد کر کے فرسودہ اوہام کے
ساتھ ساتھ جدید تخیلات کو بھی چیلنج کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو
۴۔ وہ زندگی کے تمام شعبوں اور گوشوں میں قرآن و حدیث
کے اساسی تصورات کو سائل حاضرہ پر منطبق کر کے ہر شئے کا
خالص اسلامی حل پیش کر سکے۔
۵۔ اس کا طرز کلام واضح، قطعی، موثر اور اقدامی ہو۔
۶۔ وہ ایک منظم فکر اور ایک نظام حیات تصورات پیش کرنے
کی اہلیت رکھتا ہو۔
۷۔ اس کا ذہن متوازن اور مرکب ہو اور وہ مختلف
رجحانات کے اعلیٰ ذہنوں کو ایک مرکز پر جمع کر سکے۔
۸۔ وہ شعور کے استقامت کے ساتھ ساتھ کردار کی
صلابت کا بھی حامل ہو۔
۹۔ وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے ایک تنظیم قائم اور
ایک تحریک برپا کر سکے۔
۱۰۔ اس کی تحریک و تنظیم وقت کی غیر اسلامی قوتوں کے
ساتھ پنجہ لڑا کر اپنی اخلاقی برتری ثابت کر دیں۔

ان اوصاف کو سامنے رکھ کر انیسویں اور بیسویں صدیوں
پر مشتمل عصر حاضر میں اگر ایک جامع الصفات قائد اسلام
کی تلاش کی جائے تو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی علیہ الرحمۃ
کے سوا کسی دوسری شخصیت پر نگاہ نہیں ٹھہر سکے گی۔
واقعہ یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کے زوال کا آغاز ہونے کے
بعد سترھویں صدی سے بیسویں صدی تک جتنی بھی تحریکیں
مختلف مواقع اور مقامات پر تجدید و احیائے دین کے لئے
ابھریں ان کی علمبردار شخصیتوں کے تمام جداگانہ اوصاف
مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے شعور اور کردار میں نہایت
اعتدال و توازن اور مکمل ترتیب و ترکیب کے ساتھ جمع ہو گئے
تھے، درحقیقت مولانا کا ذہن، پیغام اور عمل چار صدیوں
کے بہترین اسلامی رجحانات و عناصر کا خلاصہ اور ان میں
ایک زبردست اضافہ تھا۔ مولانا کی وفات چودھویں صدی
ہجری کے خاتمے پر ہوئی ہے اور صاف نظر آ رہا ہے
کہ پندرھویں صدی ہجری میں عالمی سطح پر تحریک اسلام کی
جو پیش قدمیاں ہو رہی ہیں اور عمومی طور پر جو ایک عظیم آفاقی
انقلاب رونما ہونے والا ہے۔ اس کی قیادت مولانا مودودی
کی فکر کرے گی۔ اور جدید تاریخ میں یہ شرف و امتیاز نہ
صرف علامہ اقبال کو حاصل ہوا کہ نہ صرف یہ کہ انھوں نے
ایک ہمہ گیر فکری اور عملی اسلامی قیادت کی نشاندہی کی۔ بلکہ
اپنی عمر کے بالکل آخری حصہ میں مولانا مودودی کو حیدرآباد
سے پنجاب بلا کر اس قیادت کا مرکز بھی متعین کر دیا۔ چنانچہ

میں اتنی بنیادوں پر اقبال نے جس آفاقی انقلاب کی نغمہ سرائی
کی تھی اس کے تمام اساسی تصورات کی تشکیل مولانا مودودی
نے اپنی وفات سے قبل کردی، جو "شعاعِ امید" اقبال کی شاعری
میں آج کی دنیا کے لئے چمکی تھی اور جس نے عصرِ حاضر کی
شبِ تاریک کو "سحر" کرنے کا اشارہ کیا تھا۔ بالآخر مولانا
مودودی کے لٹریچر میں ایک آفتابِ ہدایت بن کر طلوع ہوئی

مشرق سے ہو بیزار، نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارا ہے کہ ہر شب کو سحر کر

(شعاعِ امید، ضربِ کلیم)

اقبال نے "ضربِ کلیم" کی ایک نظم میں مشرق و مغرب کی
نہایت بلیغ اور فکر انگیز کردار نگاری اس طرح کی تھی۔

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی
اس زمانہ کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام
مردہ لادینی افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطیِ افکار سے مشرق میں غلام

(عصرِ حاضر، ضربِ کلیم)

مشرق و مغرب کے اصل مرض کی بہترین تشخیص۔ ان
شعروں بالخصوص آخری شعر میں ہے۔ عصرِ حاضر کے
یورپ اور امریکہ کی سب سے بنیادی اور بڑی کمزوری اور
خامی یہی ہے کہ ان کے دانشوروں کے افکار کی لادینی
نے ان بر اعظموں کے انسانوں کو عشقِ حقیقی کے سوز و
گداز سے محروم کر کے انھیں عقلِ محض کی کٹھ پتلیاں اور
ایک چوبی، مصنوعی اور مشینی وجود بنا دیا ہے، جبکہ ایشیا
و افریقہ کی بیماری یہ ہے کہ اس خطۂ زمین کے دانشوروں
کے افکار و خیالات عام طور پر غیر منظم ہیں اور اس انتشار
ذہنی نے انھیں مغرب سے عقلی طور پر مرعوب اور مغربی
فلسفیوں کا بندہ بے دام بنا دیا ہے، یہاں تک کہ بیسویں صدی
کے دوسرے نصف کے آس پاس ایشیا و افریقہ کے ملکوں
کی قومی آزادی اور سیاسی استقلال بھی انھیں یورپ
اور امریکہ کی ذہنی غلامی سے نجات نہیں دے سکا۔ اس فضا
میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی منظم فکر کا کمال اور کارنامہ
یہ ہے کہ اس نے مغرب کے ذہنی برتری کا طلسم توڑ کر
ایک طرف اہلِ مشرق کو اپنے شعور و کردار پر اعتماد کرنا سکھایا
اور سب سے بڑھ کر اپنے دین و ایمان بالخصوص اسلام
کے ساتھ ان کی وفاداری کا تازہ و مستحکم کردیا۔ تاکہ
مشرق کی عظیم روحانیت اور اخلاقیات مغرب کی مادیت کی
اصلاح کر سکے اس کے سائنسی و صنعتی وسائل کو صحیح انسانی
خدمت اور ایک صالح معاشرہ کی تشکیل نیز ایک حقیقی فلاحی
ریاست کی ترقی پر مرکوز کرا سکے۔ جبکہ دوسری طرف خود
اہلِ مغرب کے ضمیر کو بیدار ہونے کا موقعہ ملے اور ان کے
اندر یہ احساس پیدا ہو کہ ارتقاء کے اگلے مدارج طے
کرنے کے لئے عقل کو کسی زاویۂ نظر یعنی ہدایتِ وحی کا تابع
کرنا ضروری ہے۔ تاکہ ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں
کا اپنے افکار کی دنیا میں "سفر" کر سکے اور اپنی حکمت کے
"پیچ و خم" سے نکل کر انسانی و اخلاقی بنیادوں پر فیصلہ نفع و ضرر
کرے اور اس طرح سورج کی شعاعوں "کو گرفتار" زندگی کے
شبِ تاریک سحر کرنے کی بصیرت حاصل کرے۔

(زمانہ حاضر کا انسان، ضربِ کلیم)

مفکرین اور مدبرین، فلسفی سائنسداں، دانشور، صنعت کار
رہنما، سیاست داں اور منتظم سلطنت پیدا کئے، جن کی کوششوں
کے نتیجہ میں یورپ اور امریکہ نے مادی، سیاسی اور معاشی
وعلمی ترقیات کی ارفع و اعلیٰ منزلیں طے کیں۔ یہاں تک کہ ان
کی تہذیب اور تمدن پوری دنیا پر غالب آگئے اور ان کے تصورات
اور اقدامات کا سکہ روئے زمین کے ہر گوشہ میں جاری ہوگیا
لیکن انہی ترقیات اور ان سے وابستہ گروہی مفادات نے
بیسویں صدی کی پہلی اور دوسری چوتھائی میں دو عظیم عالمی جنگیں
برپا کر کے نہ صرف سلطنتِ مغرب کے زوال و انتشار کا سامان
کردیا۔ بلکہ پوری دنیا کو روحانی انتشار نیز مادی تباہی کے خطرات
سے دوچار کردیا۔ آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافیت نے
بلاشبہ مادہ پرستی کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ لیکن ایک نئی

اور بہتر دنیا کے امکانات روشن کئے۔ مگر اس کے نظریات کے
مضمرات کو سمجھ کر بروئے عمل لانے کے بجائے مغرب کا فاسد
ومفسد ذہن صرف زیادہ سے زیادہ تحکم اور استبداد کے لئے
اور اپنی سیاسی ومعاشی طاقت وفوقیت کے اسباب مہیا کرنے کی
طرف مائل ہو گیا۔ برٹرینڈ رسل اور برنارڈ شا جیسے دانشوروں
نے جنگ بازی کے خطرات سے اہل مغرب کو متنبہ کیا لیکن اس کا
کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس لئے کہ کسی مغربی مفکر کے پاس صحیح وصالح
نظم فکر کا وہ اسلامی نسخۂ کیمیا نہیں تھا جو اس "فرنگی معنویت"
کے نقائص کو دور کر سکے جو درحقیقت ترقی یافتہ اور ترقی
پذیر انسانوں اور قوموں کی تمام غلط اندیشیوں اور غلط کاریوں کا
سرچشمہ تھا۔ اس صورت حال میں اشتراکیت کے نام سے
جو نیا نظریہ مغربی دنیا میں ابھرا وہ صرف معاشی مساوات کا
کھوکھلا نعرہ ہی بلند کر سکا۔ جبکہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے
دوسرے تمام اور اہم تر امور میں اس ناقص اور غیر فطری نظریہ
نے مغربی فکر وعمل کی تمام خامیوں اور خرابیوں کو دو چند۔ بلکہ
صد چند کر دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ چرچل، روزویلٹ، مسولینی، ہٹلر
اور ڈیگال جیسے بیسویں صدی کے بڑے مغربی رہنماؤں کی طرح
لینن، اسٹالن اور ماؤ کو کوئی نیا نظام سیاست دریافت نہیں
ملا۔ بلکہ ان اشتراکی رہنماؤں کو کارل مارکس کے فلسفۂ معیشت
وسیاست کے تحت بالکل نئی قومی ریاستیں تشکیل دینی پڑیں اور
اس مقصد کے لئے تحریکی وتنظیمی جدوجہد کرنی پڑی اور اس میں
بھی شک نہیں کہ اشتراکی تصور اور اقتدار نے یورپ اور امریکہ
کے فاسد سرمایہ دارانہ نظام، کلیسائی فرسودہ اخلاق، بوسیدہ
مغربی نوآبادیات اور عالمی سامراجیت پر ایک کاری ضرب
لگائی اور منفی طور پر ایک بہتر نظام کے لئے عصر حاضر کا میدان
صاف کر دیا مگر مغربی اور سرمایہ دارانہ تصور واقتدار کی جگہ، خود
اشتراکیت نے جس متبادل نظام فکر وعمل کو دنیا میں رائج ونافذ
کرنا چاہا۔ اس نے متعلقہ ملکوں میں پوری پوری قوم کو بدترین غلامی
اور درندگی کا شکار بنانے کے علاوہ بین الاقوامی سطح پر ذلیل
ترین سیاسی داؤ گھات لگا کر اقتدار وطاقت کے حصول کے لئے مکروہ
ترین سازشیں اور ریشہ دوانیاں کیں، یہاں تک کہ اشتراکی

مدبروں نے پورے عالم انسانیت کو محض شطرنج کی ایک بساط
بنا دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ نازی کیمپ اور اشتراکی کنسنٹریشن کیمپ
بالکل ایک دوسرے کی نقل مطابق اصل رہیں۔ اس لئے یا بہ
اور بدتر فرق کے ساتھ نازیت کے عذاب خانے صرف جرمن
قوم کی یہودی اقلیت کے لئے تھے جبکہ اشتراکیت کے جہنم
کدے پوری روسی اور چینی قوم پر مسلط کر دئے گئے۔

مولانا مودودی کا کام مارکس، لینن اور ماؤ سے زیادہ
مشکل تھا۔ مارکس نے ایک انتہائی ترقی یافتہ اور روز بروز
زیادہ سے زیادہ ترقی پذیر یورپ کی نئی تعمیر کے لئے اپنا فلسفہ
ونظریہ پیش کیا۔ اس مقصد کے لئے وہ جرمنی سے انگلستان
آیا جو اپنے وقت میں دنیا کی سب سے بڑی طاقت کی حیثیت
سے ابھر رہا تھا اور تاج برطانیہ کے قلب میں بیٹھ کر اس نے
ایک صنعتی اور کاروباری ملک کے سماج کو ایک نیا پیغام اور
نظام دینا چاہا۔ اس نے وقت کی دوسری بڑی طاقت فرانس
کو اپنے انقلابی خیالات کی جولانگاہ بنانے کی کوشش کی
اور وہیں اس کے سوشلزم نے کمیونزم کی شکل اختیار کی
اس کے بعد لینن نے بھی اشتراکیت کا تجربہ وقت کی
ایک نہایت طاقتور حکومت یعنی، زار شاہی کے مرکز میں کیا
ماؤ کو بلاشبہ ایک پسماندہ اور غلام قوم کی ترقی کے ساتھ ساتھ
آزادی کے لئے بھی جدوجہد کرنی پڑی مگر آزادی کی مہم کا ایک
بڑا حصہ ماؤ سے پہلے سن یات سین اور چیانگ کائی شیک
جیسے قوم پرستوں نے سر کر لیا تھا اور مکمل قومی آزادی کے
بعد ماؤ کو ایک ایسا مطلق اقتدار نئی قوم کی تعمیر کے لئے ملا
نیز ایک کثیر آبادی اور زرخیز سرزمین کے اتنے وافر
وسائل میسر آئے کہ اس کا کام بہت آسان ہو گیا۔ ان سب کے
برخلاف مولانا مودودی نے ایک زوال پذیر ملت کی گود میں
آنکھیں کھولیں اور ایک غلام ملک میں پروان چڑھے۔ انھیں
ایک جامد سماج اور فرسودہ و بوسیدہ انسانی برادری سے سابقہ
پیش آیا، وہ ایک منتشر، پسماندہ اور کمزور قافلے کے مسافر تھے
انھیں اپنوں سے بھی لڑنا تھا اور غیروں سے بھی، ان کے
مقابلے پر ایک طرف دنیا کی ساری بڑی طاقتیں اپنی تمام ترقیات

(باقی صفحہ ۷۸ پر)

عزیز مرادآبادی

عثمان فضل حق کی گرفتاری کا واقعہ الیاس محلہ کے لئے کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ گرفتاری کی خبر سنتے ہی پورے محلے میں سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ ہر شخص عالم تذبذب میں تھا، شکوک و شبہات کی دلدل میں پھنستا چلا گیا تھا۔

گزشتہ کئی سال سے فضل حق اپنے محلے میں نمائندہ شخصیت کی طرح عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ مگر حالیہ گرفتاری نے ان کے معتقدین میں سے کئی ایک کو ان کے کردار کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا کر دیا تھا۔

فضل صاحب کا محلہ ان کے آباؤ اجداد کے زمانے سے ہی فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور یکجہتی کی نادر مثالیں پیش کرتے نادر نمونہ بن گیا تھا۔ اسی وجہ سے ہی ہر نازک موقع پر یہ محلہ ہمیشہ فساد جیسی بھیانک آگ سے محفوظ رہا تھا ـــــ اس محلے کی آبادی کا جائزہ لیا جائے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور غیر مسلم انتہائی قلیل تعداد میں رہتے ہیں اور آبادی کا یہ تناسب برسہا برس سے کم و بیش جوں کا توں ہے ـــــ فضل حق یہیں پلے بڑھے۔ جوان ہوئے اور اب بڑھاپے کی سرحد میں بھی یہیں داخل ہو رہے ہیں۔ اس طرح بچپن سے ہی ان کا کردار محلے والوں کے سامنے کھلی کتاب کی طرح ہے۔ وہ غمگینوں کے غمگسار، دکھیوں کے ہمدرد بے سہاروں کے مددگار اور مزدور تنگدستوں کے حاجت روا ہیں مالی حیثیت اچھی ہونے کی وجہ سے خدمت خلق کے جذبے کو کار لانے میں بھی انہیں بڑی مدد ملتی ہے۔ ہر فرقے کے لوگ ان کے اپنے ہیں اور ہر فرقے کے لوگ بھی انہیں اپنا سمجھتے ہیں۔ ان پر جان چھڑکتے ہیں۔ ان کی سنتے ہیں۔ اپنی سناتے ہیں چھوٹے موٹے تنازعات انہیں کی عدالت میں طے ہو جاتے ہیں ان کا فیصلہ فریقین کو بے چون و چرا تسلیم ہوتا ہے اسی وجہ سے محلے بھر کے ہندو مسلم اتحاد اور برادرانہ رشتوں میں ایک دوسرے سے مضبوطی کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ کبھی کبھار ہی کوئی

نظم

خواجہ غلام السیدین

ہمارا دیش فصیلوں کا دیش ہے شاید
یہاں کے لوگ حصاروں میں قید رہتے ہیں
ہم آج ساری فصیلوں پہ لکھ ہی ڈالیں گے
کہ اس زمین کی تزئین ہم سے قائم ہے
شفق ہمارے لہو کی رہینِ منّت ہے
دھنک کے رنگ سجانے کو ہر زمانے میں
ہماری ماؤں کے آنچل اتارے جاتے ہیں
یہاں کی دھوپ کی تیزی میں آج تک دیکھو
ہمارے جلتے مکانوں کی آنچ باقی ہے
ہم اس کے بعد بھی اب تک نہیں بدل پائے
وہی جگر ہے وہی دل، وہی کلیجہ ہے
ہمارے دم سے اخوت کا نام چلتا ہے
جو عید آئے تو پھر آزمانے آجانا
ہمارے خون سے ہولی منانے آجانا

آپسی جھگڑا سرکاری عدالت تک پہونچ پاتا ہے۔ دلچسپ اور قابل تقلید بات یہ ہے کہ ہر فرقے کے لوگ فضلِ حق صاحب کے سلسلے میں ہر شبہ سے عاری رہے ہیں مذہب یا عقیدے کی بنیاد پر انھوں نے دنیاوی معاملات میں کبھی امتیاز سے کام نہیں لیا۔ ان کی بے لوثی، بے غرضی، خلوص اور جذبۂ یگانگت کے پیش نظر محلے والوں کے ذہن میں یہ سوال اکثر الجھن کا باعث بنتا رہتا تھا کہ خان فضل حق کے بعد ان کی جگہ کون سنبھالے گا۔؟ ان کی ذمہ داری کو کون نبھائے گا۔؟ ہو بہو ان کے جیسے کردار والا اور ہے کون؟ آخر ایسا کون ہو سکتا ہے، جو اپنے مسائل کو بالائے طاق رکھ کر دوسرے کے مسائل حل کرانے میں اپنی پوری قوت صرف کر سکتا ہو؟! کون ہے جو انصاف کے موقع پر رشتہ داری اور دوستی کو نظر انداز کر کے حق بات کہہ سکے؟ ایسا کون ہے، جس کی بات پر محلے والا بغیر کسی پس و پیش کے مان لے؟! بھلا اپنے دکھ درد کو بھلا کر دوسروں کے دکھ درد دور کرنے کی خاطر انتھک جدوجہد کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہ سکے؟ خدمتِ خلق کو عبادت سمجھنے والا اور کون ہے۔ اس محلے میں؟ اتنی صلاحیت اور لیاقت کس میں ہے، جو تعلقات کی بڑھتی خلیج کو پُر کر کے لڑائی جھگڑوں سے محلے والوں کو باز رکھ سکے؟ ایسی مدبر ہستی فضلِ حق کے بعد کون ہو سکتی ہے..؟

مگر ان کی گرفتاری کے باعث ان کے شفیق چاند جیسے کردار کو داغدار بنا دیا گیا تھا۔ ان کے تعلق سے جن باتوں کا گمان بھی ناممکن تھا۔ وہ اب قرین قیاس تھیں۔ اسے ذہنی افراط کہیے یا بگڑتے ہوئے حالات کا اثر کہ خان فضلِ حق بھی غیر جانبدار رہنے میں ناکامی کا شکار ہو گئے تھے ـــــ سوال یہ تھا کہ کسی محلے میں مسلمانوں کے گھر بار لوٹے گئے تو کیا یہ ضروری ہے کہ ان کے محلے میں ہندوؤں سے انتقام لیا جائے؟ غالبًا اس سوال کا جواب ہی خان صاحب کی گرفتاری کا سبب بنا تھا ـــــ! اور شاید اسی قسم کا خیال محلے کے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا ہی تھا ـــــ ہندو ٹولیوں بھی عارضی طور پر نقل مکانی کر چکے تھے۔ کیونکہ فسادات کی نوعیت ہی کچھ ایسی تھی...!!

اس بار جو شہر بھر میں فسادات کا خوفناک سلسلہ چلا تو خان فضل حق کا محلہ بھی انتہائی غیر یقینی صورت حال سے دو چار ہو گیا تھا۔ سارا محلہ دہشت اور ہیبت کے ماحول میں سائیں سائیں کرنے لگا تھا۔ ہندوؤں کو مسلمانوں کے اور مسلمانوں کو ہندوؤں کے چہروں پر اجنبیت کے خول چڑھے ہوئے نظر آنے لگے تھے۔ ایک دوسرے کے دلوں میں شبہات

کا طوفان بپا تھا — مسلمانوں کو تو کسی دوسرے ہندو محلے والوں کے حملہ آور ہونے کا ڈر تھا، تو ہندو اپنے ہی محلے کے مسلمانوں سے خوفزدہ تھے ... لیکن ایسے ہی دحشت ناک ماحول میں خان فضل حق اپنے آپ سے بیگانہ، دونوں قوموں میں باہمی اعتماد اور بھائی چارے کی فضا کو ہموار کرنے میں جان و دل سے مصروف تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ان کی بڑا اعتماد آواز بھی نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوئی تھی۔

کرفیو نافذ ہونے سے کچھ دیر پہلے جب محلے کے ایک گھر پر بلوائیوں نے حملہ کر دیا تو سارے محلے میں کھلبلی مچ گئی مگر نہ اکثریتی فرقے کا ... ! پھر کیا تھا۔ اقلیتی فرقہ بڑی طرح گھبرا گیا۔ لوگ اپنے گھروں کو چھوڑ کر دوسرے محلے میں مقیم اپنے عزیزوں اور دوستوں کے گھروں کی طرف دوڑ پڑے۔ فضل حق روکتے ہی رہے، مگر وہاں کون تھا ان کی سننے والا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہندوؤں کے سارے گھر خالی ہو گئے۔ صرف ایک گھر ایسا تھا۔ جو غالباً اپنی موت کے انتظار میں خالی نہیں ہوا تھا وہ تھا ہری کرشن کا! ہری کرشن باہر کا رہنے والا ہے۔ لیکن کاروبار کے سلسلے میں یہیں کا ہو رہا تھا سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد اس نے اپنا کاروبار شروع کر دیا تھا جب اس نے یہاں کے لوگوں کی محبت اور برادرانہ سلوک کو کھرا پایا تو اس نے اپنے آبائی وطن واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ وہ فسادات کی آگ بھڑکنے سے پہلے کاروبار کے سلسلے میں کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ گھر میں اس کے بیوی بچے تنہا تھے۔ ممکن تھا کہ ہری کرشن گھر پر ہوتا تو کسی شناسا کے ہاں بیوی بچوں کو لے کر چلا جاتا! کرشن کی بدحواس بیوی نے خان فضل حق سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا تو انھوں نے اس کی ڈھارس بندھائی اور اپنے گھر میں پناہ دینے کی پیش کش کی جسے اس نے بحالت مجبوری فوراً قبول کر لیا۔ فضل حق کے گھر والوں نے حسب ہدایت کرشن کے بچوں کو ہر ممکنہ سہولت فراہم کی اور ان کے دل سے خوف و ہراس کے ہوتے ہوئے بھی نکالنے کی پوری کوشش کی — چونکہ فضل حق کی پوزیشن بڑی مضبوط تھی، اس لئے سال چھ مہینے کے خرچ کا اناج اور دوسری اشیائے ضروری کا اسٹاک ان کے یہاں ہمیشہ رہتا تھا۔ دس پانچ خشک دودھ کے ڈبے بھی گھر پر رہتے تھے کہ آڑے وقت میں کام آسکیں۔ اس لئے کرفیو کے دوران بھی انہیں ناگفتہ بہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ بلکہ اڑوس پڑوس والوں کی حتی الوسع امداد کی ذمہ داری بھی انھوں نے اپنے سر لے رکھی تھی۔

کئی روز تک کرفیو نافذ رہا۔ فسادات کی آگ سلگتی

غزل

حاذق ضیائی سہسرامی

خشک بستی میں کچھ تری دیکھی
پھول پتوں میں زندگی دیکھی

ایسی دل کش بہار دنیا کی
کیا بتاؤں کہ کے گھڑی دیکھی

اپنے گھر کا پتہ بھلا بیٹھے
آپ کی جب سے وہ گلی دیکھی

سب ہی اپنی انا پہ مرتے ہیں
کب کسی نے مری خودی دیکھی

جن کی صورت پہ جان دیتے تھے
ان کے چہرے پہ برہمی دیکھی

دوستی میں بدل گئی پھر سے
ہم نے ایسی بھی دشمنی دیکھی

اس نے دامن جھٹک لیا اپنا
جب اندھیرے میں روشنی دیکھی

تم نے ویران کیا تھا جس گھر کو
ہم نے محفل وہیں سجی دیکھی

جب بھی مجھ سے خطا ہوئی حاذق
ان کے ہونٹوں پہ کچھ ہنسی دیکھی

اور سحر ڈکتی رہی۔ گھر لٹتے رہے۔ معصوم اور بے گناہ ہوں کا خون بہتا رہا۔ عزت و آبرو کی بے حرمتی ہوتی رہی۔ اور تو اور عبادت گاہوں تک کو نہیں بخشا گیا۔ مگر یہ سوال ہر شخص کے ذہن میں ڈنک مار رہا تھا کہ دورانِ کرفیو کون لوگ ہیں، جو یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔؟

خدا خدا کرکے پہلے روز کرفیو میں۔ دو گھنٹے کی نرمی کی گئی تو خان فضل حق بھی گھر سے نکلے۔ محلے والوں کی خیریت دریافت کی۔ ہندو بھائیوں کے خالی گھروں پر نظر ڈالی سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا ــــ لیکن ایک مکان کے قریب پہونچ کر وہ ٹھٹھک گئے۔ اس کے صدر دروازے کے کیواڑ ٹوٹے پڑے تھے۔ اندر جھانک کر دیکھا تو تقریباً سبھی کمروں کے دروازے وا تھے۔ سوچا کہ اندر جاکر دیکھیں کہ کیا معاملہ ہے؟ مگر مصلحتاً اندر نہیں گئے اور پولیس کو پہلے اطلاع دینا مناسب خیال کیا۔ پولیس نے انھیں ساتھ لیا اور گھر کے اندر معائنہ کے لئے گھس گئی سارا سامان الٹ پلٹ پڑا تھا۔ لگتا تھا کہ کسی نے اطمینان سے تلاشی لی ہے اور ضرورت کی چیزیں صاف کر دی ہوں گی تبھی ایک پولیس کیپ کمرے کے فرش پر پڑی نظر آئی۔ جسے وہاں موجود سپاہیوں میں سے ایک نے اٹھا کر پینٹ کی جیب میں گھسیڑ لیا۔ اس پر فضل حق نے احتجاج کیا۔ "جناب! اس ٹوپی کو آپ جیب میں مت چھپایئے۔ یہ تو مکان لوٹنے والے یا والوں کو بے نقاب کرنے کے لئے بڑا ذریعہ ثابت ہوگی"

"بکو مت! جو کچھ ہم لوگ کر رہے ہیں، چپ چاپ دیکھتے رہو! پولیس کی کارروائی میں روڑا اٹکانے کی کوشش مت کرو! ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ کام کس کا ہے؟ لٹیرے پولیس کی عقابی نظروں سے نہیں بچ سکتے۔"

"لیکن میں گواہی دوں گا۔ اور اس ٹوپی کو نظر انداز نہیں کر سکتا!" فضل حق نے متنبہ کیا تو پولیس والے نے آنکھیں نکال کر انھیں پھر ڈانٹ پلائی۔ "تمہاری گواہی کی ضرورت ہی کب پیش آئے گی نیتا جی!؟ زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش مت کرو، ورنہ ...... !"

"خیر، چھوڑیئے صاحب!" چونکہ فضل حق آ[illegible] ورنہ ایسے آگے کی بات بخوبی سمجھ گئے تھے۔ اس لئے انھوں نے فی الحال خاموش رہنے میں بہتری سمجھی۔

تلاشی یا جائزے کا کام مکمل کر لینے کے بعد پولیس نے فضل حق صاحب کو اپنے گھر جانے کی ہدایت کی اور خود گشت کے لئے چل دی۔ تھوڑی ہی دیر بعد پتہ چلا کہ مکان لوٹنے کے شبہ میں ملحقہ مکانات کے کچھ مکینوں کو پولیس گرفتار کرکے لے گئی ہے۔ اس وقت تک کرفیو میں نرمی کا وقت ختم ہو چکا تھا اور بے چارے فضل حق تلملا کر رہ گئے تھے۔ انھیں افسوس اور سخت تشویش اس بات کی تھی کہ لٹیروں کا سراغ مل جانے کے باوجود ایک ہندو بھائی کا گھر لوٹنے کا الزام پڑوسی مسلمانوں پر تھوپ دیا گیا تھا۔ جہاں محافظ ہی لٹیرے بن جائیں تو وہاں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور باہمی اعتماد کی فضا بحال کرکے امن و اماں قائم کرنا کتنا بڑا فریب ہے۔!

دوسرے دن کرفیو میں پانچ گھنٹے کی نرمی کی گئی۔ اکا دکا دکانیں بھی کھلیں آمد و رفت کا ہلکا سا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ دو چار مالکانِ مکان اپنے اپنے گھروں کی حالت دیکھنے بھی آئے۔ کچھ لوگ فضل حق سے بھی ملے۔ انھوں نے اپنے مکانوں کو صحیح حالت میں پاکر ان کا اور پڑوسیوں کا شکریہ بھی ادا کیا، کہ انھوں نے ان کے مکانوں کو نقصان پہونچانے کا کوئی منصوبہ نہیں بنایا تھا۔

دریں اثنا، چند پولیس والوں کے ہمراہ شری کرشن بھی محلے میں آیا اپنے بال بچوں کو گھر میں نہ پاکر بدحواس ہو گیا دل میں برے برے [illegible] نے سر ابھارا اور دل برداشتہ ہوکر پولیس انسپکٹر سے اس نے دل کی بات کہی تبھی اس کا سامنا خان فضل حق سے ہو گیا دونوں ایک دوسرے سے گرمجوشی کے ساتھ ملے۔ مگر شری کرشن کی آنکھوں میں آنسو تھے آواز میں رقت تھی۔ چہرہ اداس اور قابل رحم تھا۔ اس کی رحم طلب آنکھوں کی زبانی فضل حق نے سمجھ لی تھی۔ اس لئے بلا تاخیر انھوں نے اسے خوش خبری سنائی۔

"بھیا! تمہارے بیوی بچے سب بخیریت و بحفاظت ہیں انھیں [illegible] نے [illegible] پناہ دے رکھی ہے ......!" یہ

سن کر شری کرشن کی آنکھوں میں چمک عود کر آئی اور خوشی کے دو آنسو آنکھوں سے نکل کر رخساروں پر پھسل گئے۔
ادھر پولیس والے بھی ان دونوں کی باتیں بڑے غور اور دلچسپی سے سن رہے تھے۔ خان فضل حق کو پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوئی کہ پولیس انسپکٹر وہی تھا جس نے مذکورہ لوٹے گئے مکان کی رپورٹ تیار کی تھی۔
"فضل بھائی! میں آپ کو اس عنایت کا شکریہ کیسے ادا کروں؟" سری کرشن نے عقیدت کے جذبات سے سرشار ہو کر کہا۔
"بھیا کرشن!! اس میں شکریے کی کوئی بات نہیں ہے میں نے تو صرف اپنا فرض پورا کیا ہے... ذرا سوچو، اگر میری جگہ تم ہوتے تو کیا یہی سب کچھ نہ کرتے ——!؟" فضل حق نے مسکرا کر جواب دیا ——!؟"
"کیوں۔ نہیں ——!؟"
"اچھا، اب گھر چلو اور اپنے بچوں کو اپنے گھر لے آؤ وہ بھی تمہاری وجہ سے بے حد پریشان اور فکرمند ہیں۔"
اسی لمحہ پولیس انسپکٹر نے کرشن سے پوچھا۔ "تم اپنے مکان پر ہی رہنا چاہو گے یا کہیں محفوظ مقام پر پہونچا دیا جائے تمہیں بھی۔؟!"
"انسپکٹر صاحب! میرا گھر یہیں ہے اور اس سے زیادہ محفوظ مقام میرے لئے کوئی اور نہیں ہو سکتا آپ نے دیکھا نہیں کہ میری غیر موجودگی میں بھی میرے بچے محفوظ رہے ...!!"
"ٹھیک ہے۔ تو ہم تمہارے بچوں کو اپنی نگرانی میں تمہارے گھر پہونچائے دیتے ہیں کہ یہ ہماری ڈیوٹی ہے۔"
"آیئے انسپکٹر صاحب ...!" فضل حق نے کہا۔
سری کرشن کے بچوں کی منتقلی کے کچھ ہی دیر بعد کرفیو کی نرمی کے پانچ گھنٹے پورے ہو چکے تھے ———— کرفیو دوبارہ نافذ ہوتے ہی پولیس خان فضل حق کے گھر پہونچی اور انہیں دو الزامات کے تحت حراست میں لے لیا۔ پہلا الزام یہ کہ "تم نے اقلیتی فرقے کے لوگوں کو اغوا کیا، دوسرا یہ کہ تم نے انہیں مسلسل کئی روز تک بطور یرغمال کے اپنے گھر میں رکھا ——!!"
خان فضل حق کی گرفتاری کا واقعہ خواہ کتنا ہی غیر معمولی کیوں نہ ہو، مگر گرفتاری کی اصلی وجہ پولیس کے علاوہ ابھی تک کسی اور کو معلوم نہیں ہے۔

غزل

طالب زیدی

نہ روک پائیں فصیلیں نہ بام و در ہم کو
لپٹ کے رہ گئی اک آخری نظر ہم کو
کسی نے یاد کیا ہو گا عمر بھر ہم کو
یہ اک فریب لگا کتنا معتبر ہم کو
کبھی غزل کبھی افسانہ لکھ ہی لاتے ہیں
بہت ہے راس ترے شہر کا سفر ہم کو
اگر تلاش کرو گے تو مل ہی جائیں گے
یہ اور بات کہ اپنی نہیں خبر ہم کو
کوئی بھی ہو ہمیں دل توڑنا نہیں آتا
جلائے جاتی ہے امیدِ چارہ گر ہم کو
بہت دنوں میں ملا اپنی بے دلی کا سراغ
بہت دنوں میں ملی آپ کی خبر ہم کو

بانی درسگاہ (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) سر سید احمد خاں مرحوم نے جب اس مدرستہ العلوم کا خاکہ تیار کیا تو وہ محض ایک عام تعلیم گاہ کا خاکہ نہیں تھا۔ بلکہ وہ ایک ایسی تعلیم گاہ تھی جہاں قوم کے نونہالوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت

بھی ہو۔ ایسی تربیت جو ان کے اندر خود اعتمادی پیدا کرے جہد بقا کی خواہش پیدا کرے، مصائب زندگی کے مقابلوں میں ممتاز بنانے والی توانائی پیدا کرے، وہ امنگ پیدا کرے جو پستیوں کو بلندیوں سے اور ظلمتوں کو نور سے بدل دینے کا حوصلہ رکھتی ہو۔ سر سید کا یہ محض رومانی خواب نہیں تھا، صرف خیال کی ترنگ نہیں تھی۔ انھوں نے برسہا برس اس مسئلہ پر غور کیا تھا۔ قوم میں پھیلی ہوئی جہالت اور اس سے پیدا ہونے والی تنگ نظری، افلاس اور اس سے پیدا شدہ عیوب، دین کے نام پر دین کی مسخ شدہ صورت ۱۸۵۷ء کا خونیں انقلاب، ایک نظام کی موت اور دوسرے کا شاندار تسلط، اثرات مابعد کے طور پر ظلم و جور کی کارفرمائی

یہ سب ان کے سامنے تھا۔ اور وہ محض خاموش تماشائی نہیں تھے بلکہ خونیں موجیں ان کے سر پر سے گزری تھیں۔ انھوں نے اس طوفان کے تھپیڑے سہے خطرات مول لیے، یگانوں اور بیگانوں، دونوں کی نظروں میں مشکوک و مطعون ہوئے۔ لیکن قدرت نے ان کو جری اور دردمند دل دیا تھا۔ نہ وہ بزدل ہوئے، نہ ہمت ہاری نہ اپنی ذات کے خول میں بند ہوئے انھوں نے اپنی ذات اور مفاد کو قوم اور اس کے مفاد کے ساتھ وابستہ کر لیا اور اسی اُدھیڑ بن میں شب و روز گزارے کہ اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے اور اس زوال سے نجات پانے کی تدبیر کیا ہو۔ انھوں نے نہ کوئی سیاسی جماعت بنائی، نہ احتجاج کئے، نہ نعرے بازی کی اور نہ محض مرثیہ خوانی

انھوں نے یورپ کی ترقیات کو دیکھا اور ان کے اسباب کا جائزہ لیا۔ اور جس نتیجے پر پہنچے وہ یہ تھا کہ علم اور اس کے ساتھ عمل ہی تمام تر دنیوی اور دینی ترقیوں کا ضامن ہے جو قوم زیور علم سے آراستہ نہیں اور قوت عمل کی حامل نہیں وہ

تحقیق کی راہ پر گامزن ہونے کے بجائے منزل کی گہرائیوں میں اتر جائے گی۔ اسی لئے انھوں نے تعلیم کا ایک ایسا جامع منصوبہ بنایا جس میں تربیت کو بنیادی اہمیت حاصل ہوا اور تربیت کا ذریعہ تھیں ہماری اقامت گاہیں۔

ان اقامت گاہوں کا تصور محض یہ نہیں تھا کہ یہاں طلبا کے رہنے اور کھانے پینے کا بندوبست ہو جائے اور گویا یہ طلبا کے مکانات یا ہوٹل کا متبادل ہوں۔ ان کے ساتھ ایک ایسی تجربہ گاہ کا تصور وابستہ تھا جہاں مستقبل کے اچھے مسلمان اچھے ہندوستانی، اچھے عالم، اچھے منتظم، اچھے رہنما اور اچھے انسان تیار ہو سکیں۔ گھروں میں والدین کے زیر سایہ بھی بچوں کی تربیت ہوتی ہے والدین کی خواہش بھی یہی ہوتی ہے کہ ان

سرسید کے

کے بچے ہونہار ہوں، اچھی عادتیں اختیار کریں، عمدہ اخلاق کے حامل ہوں اور پھر اعلیٰ مراتب حاصل کریں۔ اس کے لئے وہ انھیں نصیحت بھی کرتے ہیں، ترغیب بھی دیتے ہیں، ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتے ہیں اور سزا بھی دیتے ہیں، لیکن یہ عمل انفرادی ہوتا ہے

عام طور پر ماحول کی دوسری قوتیں ان پند و نصائح کا ساتھ نہیں دیتیں، اس لئے یا تو ان کا اثر ہی نہیں ہوتا یا جو اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ دیرپا نہیں ہوتے۔ اقامت گاہ کا قیام ایک ایسا ماحول قائم کرنے کی کوشش تھی جہاں تمام افراد ایک ہی ضابطہ

کے پابند ہوں اور عمدہ اخلاق پر کاربند ہوں، حتیٰ کہ عمدہ اخلاق رفتہ رفتہ ان کی طبیعت ثانیہ بن جائے قبل اس کے کہ ہم یہ دیکھیں کہ آیا مطلوبہ عمدہ اخلاق پیدا ہوئے یا نہیں، ایک نظر اس پر ڈال لیجئے کہ ان عمدہ اخلاق میں سرسید اور ان کے رفقا کن باتوں کو شامل کرتے تھے۔ ان کے تصورات کا خلاصہ کچھ اس طرح کیا جا سکتا ہے :

"سب سے زیادہ ضرورت مسلمانوں کی موجودہ اور آئندہ نسلوں میں اتفاق و یک جہتی اور قومی ہمدردی پیدا کرنے کی ہے۔ ان میں اتفاق پیدا ہونے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ ان کی نسلیں اتفاق کے سائے میں نشو و نما پائیں اور ایک مدت تک ایسی سوسائٹی میں زندگی بسر کریں جہاں مختلف خاندانوں

صابر فخر الدین یادگیری

دکانیں بند تھیں بازار سنگ گزیدہ تھے
تمام شہر کے حالات ہی کشیدہ تھے

نہ جانے چاندنی راتوں میں کیا قصور ہوا
درخت سارے کے سارے ہی سر بریدہ تھے

خیال و خواب کی دنیا میں آج بھی اکثر
کٹے پھٹے سے بدن ذہن خوں چکیدہ تھے

ہمارے لوگ جو بستے تھے پچھلی صدیوں میں
جوان حوصلے، لیکن کمر خمیدہ تھے

مختلف صوبوں اور مختلف مذہبوں کے لڑکے ایک ہال میں کھانا کھائیں ایک مسجد میں نماز پڑھیں، ایک فیلڈ میں مردانہ کھیل کھیلیں ایک کالج میں پڑھیں اور ایک احاطہ میں دن رات سگے بھائیوں کی طرح شیر و شکر ہو کر رہیں اور اس طرح اتفاق کی حالت مال کی دودھ کی طرح ان کی رگ و پے میں سرایت کر جائے۔

"جو طالب علم یہاں سے نکلیں وہ قوم میں مستعدی اور جفاکشی کی مثال ہوں اور سستی اور کاہلی جو مسلمانوں کی ایک قومی خصلت سمجھی جانے لگی ہے بجائے اس کے وہ ان میں چستی و چالاکی کی بنیاد ڈالیں ... وہ تعلیم یافتہ ہوں اور سپاہی بھی۔ وہ ان فرسودہ دماغوں کی طرح جن میں کثرت مطالعہ سے تحمل اور برداشت کی طاقت نہیں رہتی چڑچڑے نازک مزاج اور بددماغ نہ بن جائیں ... وہ اپنے دست و بازو پر بھروسا کر کے ہر کام پہ ہاتھ ڈالنے کی جرأت کر سکیں۔ بیکاری اور آرام طلبی ان کو وبال معلوم ہونے لگے۔ ریاضت جسمانی اور کھیلوں پر توجہ دینے سے یہ مقاصد حاصل ہو سکتے ہیں۔

"بورڈنگ سسٹم سے ایک فائدہ یہ بھی سمجھا گیا کہ اس سے طالب علموں کو ضبط اوقات کی عادت پڑتی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی اولاد سب سے زیادہ تضیع اوقات کرنے والی مشہور ہے۔ جو لوگ وقت کی کچھ قدر نہیں کرتے نہ وہ دین کے فرائض ادا کر سکتے ہیں نہ دنیا کے۔ بورڈنگ ہاؤس میں دن بھر کا نظام اس طرح ترتیب دیا جائے کہ طلبا صبح کے پانچ بجے سے رات کے نو بجے تک مختلف کاموں میں مصروف رہیں، اور ہر کام کے لئے خاص اوقات مقرر ہوں جن میں بیماری کے سوا کبھی فرق نہ آئے۔

"شریفانہ اور باقاعدہ اطاعت و فرمانبرداری جو ہر قوم کا زیور ہے اس کی عادت ڈلوانے اور مشق کرانے کے ذرائع اختیار کئے جائیں۔ کلاس روم، بورڈنگ ہاؤس، ڈائننگ ہال، کھیل کے میدان، یونین کلب، اسپتال، مسجد، غرض ہر جگہ ایک نہ ایک نگراں موجود ہو، جس کا حکم ماننا ہر طالب علم کے لئے لازم۔ جب برابر سات آٹھ برس طالب علموں کی زندگی ان ضوابط کے ساتھ بسر ہوگی تو باقاعدگی اور اطاعت ان کی طبیعت میں پیدا ہو جائے گی۔ اور وہ ہر دل عزیز ہو کر رہنا سیکھ جائیں گے

"لباس کا متحد ہونا قومی یگانگت کے بڑھانے اور مغائرت کے دور کرنے میں ویسا ہی دخل رکھتا ہے جیسا زبان نسل اور مذہب کا متحد ہونا۔ اسی لئے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اول سرسید نے ترکی لباس اختیار کر کے مثال قائم کی۔ پھر کالج کے بورڈروں کے لئے یونی فارم ضروری قرار دی۔"

یہ چند وہ امور تھے جن کو بانیان مدرسۃ العلوم نے واضح طور پر بیان کیا، لیکن ان کا مدعا اور مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا کہ ایک طرف کالج کی تعلیم طالب علموں کو اس علم سے آراستہ کرے جس کی ان کو اپنی عملی زندگی میں ضرورت درپیش آتے

والی تھی اور جو مستقبل میں زندگی کا معیار بننے والا تھا اور دوسری طرف اقامت گاہوں میں انکی تربیت اس انداز کی ہو کر وہ قومی تشخص کے ساتھ تہذیب و شائستگی کا نمونہ ہوں، ان کے اندر کی پوشیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار آنے کا موقع ملے، وہ ایک صحت مند اور توانا شخصیت یہاں سے لے کر جائیں تاکہ وہ ایک زندہ اور توانا قوم کی بنیاد بن سکیں، دوسروں کے مقابلے میں ان میں کچھ نہ کچھ ایسی خوبیاں زیادہ ہوں کہ وہ قلت تعداد کے باوجود خود کو نمایاں اور ممتاز کر سکیں۔ لیکن ہوا کیا؟ اگر آج ہم یہاں چودھویں صدی کا صرف مرثیہ پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ اس کا معروضی جائزہ لے کر پندرھویں صدی کی تعمیر کے منصوبوں کے لئے جمع ہیں تو ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہوگا کہ کیا بانیان کے ان خوابوں کی تعبیر مل گئی؟ کیا واقعی ہم نے ایک صدی میں ایسے افراد پیدا کئے جو ایک صالح توانا اور داعی خیر امت کے ارکان کہلائے جا سکیں؟ صدق نیت سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے ایک عظیم الشان یونیورسٹی تو قائم کر دی، لیکن اس کی وہ بنیادیں استوار نہ رہ سکیں جو اس کا اصل مدعا تھیں۔

حضرات! ۱۸۷۰ء کو آج ۱۱۰ برس گزر رہے ہیں۔ یہ وہ سال تھا جب سرسید نے ایک کمیٹی قائم کی جس کا نام تھا "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان ہندوستان" اور اس کا مقصد یہ قرار دیا گیا تھا کہ "کمیٹی اس بات کے دریافت کرنے میں کوشش کرے کہ سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں مسلمان طالب علم کس لئے کم پڑھتے ہیں۔ علوم قدیمہ ان میں کیوں گھٹ گئے اور علوم جدیدہ کیوں رواج نہیں پاتے" عبرت اور تاسف کا مقام ہے کہ سرسید کا یہ استفسار اپنے جواب کے لئے آج بھی اسی طرح قومی توجہ کا محتاج ہے جس طرح آج سے ایک سو دس سال پہلے تھا۔ ایک ایسی ہی کمیٹی کے قیام کی ضرورت آج بھی اسی طرح قائم ہے جس طرح ۱۸۷۰ء میں محسوس کی گئی تھی۔ تعلیم کا بھی کم و بیش وہی حال ہے جو تربیت کا ہے تعلیم کو عمومی مقبولیت آج تک حاصل نہ ہو سکی اور تربیت کا وہ نظام جو ان مخلصین کے پیش نظر تھا، اس میں بھی بگاڑ کا سلسلہ اسی وقت سے شروع ہو گیا۔ مثال کے طور پر صرف ایک بات عرض کروں گا۔ کھیلوں اور جسمانی مشقت پر اس مقصد سے زور دیا گیا تھا کہ آرام طلبی کی عادت سے نجات ملے۔ لیکن انگریز پرنسپلوں خاص کر مسٹر بیک وغیرہ نے اس کا نقشہ ہی پلٹ دیا۔ انھوں نے بڑی چالاکی سے مقصد کا رخ موڑ کر ایک نئے راستے پر ڈال دیا۔ جن طالب علموں نے کھیلوں میں ذرا سی کامیابی حاصل کی ان کا بے پناہ افزاز کیا، کالج میں ان

رباعیات

ظفر مرادآبادی

کر کام نہ وہ جس میں ہو خطرے کا سوال
کر قصد نہ وہ جو کہ بنے امر محال
اس راہ پہ چل، جس پہ ہو حق راہنما
وہ راہ نہ چل جس پہ مذبذب ہو خیال

عصیاں کا نہ اب بوجھ سنبھالے کوئی
اس بار کو محشر پہ نہ ٹالے کوئی
ہو پاک وہ سر تا پا، گناہوں سے ظفر
گر اشک ندامت میں نہالے کوئی

بے جہد بھی ہو سکتا ہے قابل کوئی
بے قصد بھی ملی پائی ہے منزل کوئی
کیوں اپنے گناہوں کو کہیں حق کی رضا
کہتے ہیں، تو ہم سا نہیں جاہل کوئی

قطعات

تری چشمِ کرم ہی کے سہارے جی رہے ہیں ہم
غمِ دنیا کی ساری تلخیوں کو پی رہے ہیں ہم
بہار آئی تھی دامن کر گئی وہ چاک چاک احقر
خزاں کی فرصتوں میں چاک دامن سی رہے ہیں ہم

بجھی ہے شمع تو پروانے منتشر ہوں گے
نہ دور رہے تو پیمانے منتشر ہوں گے
بہار کیفِ جنوں لے کے ہو گئی رخصت
خزاں کے دور میں دیوانے منتشر ہوں گے

احقر ایم۔اے

گرامات دی گئیں، انگریز حکام سے ملاقات کا شرف ان کو بخشا گیا، ان کی نوکریوں کا بندوبست کرایا گیا، یہاں کے طلبا کو محسوس ہونے لگا کہ کامیابی کا راستہ کھیل کے میدانوں سے ہو کر گزرتا ہے نتیجہ یہ تعلیم کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی اور کھیل مقصود بالذات ہو گئے اور کھلنڈراپن یہاں کی زندگی کا جزو بن گیا۔ دوسرے تمام مقاصد نگاہوں سے اوجھل ہو گئے یا ان کی صورت مسخ ہو گئی۔

ہمیں اپنے تعلیمی اور تربیتی نظام کا پھر سے جائزہ لینا ہوگا عصری تقاضوں کو سمجھنا ہوگا، صرف حال نہیں بلکہ مستقبل کے لئے نقشوں کو مرتب کرنا ہوگا۔ منزلِ مقصود کا تعین کر کے اس کے راہیں متعین کرنی ہوں گی اور یہ کوشش کرنی ہوگی کہ یہ قافلہ ان راہوں سے بھٹکنے نہ پائے۔

یہ منزلِ مقصود کیا ہے؟ اس کا تعین کس طرح ہوگا اور کون کرے گا؟ ان سوالوں کا جواب ہم حالات کے سیاق و سباق سے علیحدہ ہو کر حاصل نہیں کر سکتے۔ مثلاً ہمیں اس بات کو مدنظر رکھنا ہوگا کہ آج ہم آزاد ہندوستان کے شہری ہیں جس کی بنیادی پالیسی سیکولرازم پر مبنی ہے۔ ہم مسلمان ہیں اور متعین نظریات پر مبنی ایک تصورِ حیات رکھتے ہیں۔ اس یونیورسٹی کے لئے ہم اقلیتی کردار کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ان تینوں ہی کے سلسلے میں ہمیں واضح تصورات کی تشکیل کرنی ہوگی اور ان میں ایک ایسا امتزاج پیدا کرنا ہوگا کہ یہ ایک دوسرے سے متصادم ہونے کے بجائے ایک دوسرے کے معاون ثابت ہوں۔ اس صورتِ حال کا تقاضا یہ ہے کہ ہم یہاں وہ اوصاف پیدا کریں جو دوسروں سے بھی ہمارے امتیازات کو تسلیم کرا لیں مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ ذاتی اغراض اور گروہی مفادات سے بالاتر ہو کر اسلام کے بنیادی حقانی اصولوں کو رہنما بنا لیا جائے تو ایک ایسا معاشرہ یقیناً وجود میں آ سکتا ہے جو اپنے لئے خیر اور دوسروں کے لئے رحمت ثابت ہو۔ مگر کیا ہم اس یونیورسٹی میں اور اپنی اقامت گاہوں میں ایسے افراد کی تشکیل کر سکتے ہیں؟ کیا ہم اپنے نوجوانوں کو مستقبل کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کر سکتے ہیں؟ یہ درست ہے کہ علی گڑھ کل ہندوستان نہیں ہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کو پورے ہندوستان کی نظریں علی گڑھ پر لگی ہوئی ہیں۔ اور اب بھی ہندوستانی مسلمان کو قیادت یہیں سے مل سکتی ہے اور ہماری اقامت گاہیں اس کا سب سے بڑا ذریعہ بن سکتی ہیں کہ کلاس کے چند گھنٹوں کے علاوہ طلبا کا باقی وقت یہیں گزرتا ہے۔ انھیں اگر ایک طرف اپنی تعلیمی جدوجہد کو تیز تر کرنا اور تعلیم کے میدان میں امتیاز حاصل کرنا ضروری ہے تو دوسری طرف ایک ایسی تہذیب کا بھی علمبردار بننا ہے جس کی بنیاد اسلامی تصورات و اقدار پر ہو۔ وہ اقدار جو انسانیت کا شرف اور جوہر ہیں اور جو ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کر سکتی ہیں جو پورے عالم کے لئے رحمت بن جائے، جس میں عدل ہو، ضبط ہو، احسان ہو، ایثار ہو، رحم باہمی ہو، جس کے افراد کے عزائم بلند اور مقاصد عظیم ہوں، جن میں ضبط و نظم کی پابندی ہو اور زندگی کی اعلیٰ ترین اقدار جن کا نصب العین ہوں۔ ہمیں ایک ایسا نظام قائم کرنا ہوگا۔ جس میں ہمارے نوجوانوں کی تمام مضمر صلاحیتوں کو آشکار ہونے کا موقع ملے، ان کی ذہنی اور جسمانی توانائیاں بھرپور طور پر بروئے کار آئیں۔ ان میں تہذیب و شائستگی و شرافت کے جوہر چمکیں اور وہ ملک و قوم کے لئے خود کو قیمتی اثاثہ ثابت کر سکیں سرسید اور ان کے رفقا کے حوالے سے جن نکات کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں ہوا ان کو آج بھی آزمایا جا سکتا ہے اور سچی لگن ہو تو ان سے مطلوبہ نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

کافی عرصے سے "اقبال کے دو اشعار" موضوع بحث بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کسی نہ کسی طرح ایک شعر کا مفہوم تو صاف ہو گیا ہے۔ مگر دوسرا شعر اب بھی معمہ بنا ہوا ہے اور ناقدین کسی ایک مفہوم پر متفق نہیں ہو سکے ہیں۔ "ہماری زبان" ۱۵ جولائی ۸۰ء میں اس سلسلہ کا آخری مضمون ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی کا شائع ہوا ہے جس میں موصوف نے اقبال کے اس شعر کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کا یہ شعر ہے۔

محمد بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا!!
مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا؟

ڈاکٹر اعظمی اس شعر کے مختلف مفاہیم کا تجزیہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"بلاشبہ شعر ابہام سے خالی نہیں ہے۔ اور اس کو پیدا کرنے والا حرف اشارہ "یہ" ہے۔ مسئلہ صرف اتنا ہے کہ اس کا اصل مشارٌ الیہ کیا ہے؟ مختلف اہل قلم نے اس سلسلہ میں مختلف چیزیں بتائی ہیں۔ کسی نے قرآن حکیم کو اس کا مشارٌ الیہ کہا ہے تو کسی نے جذبۂ عشق کو، کسی نے کلام اقبال کو تو کسی نے اس کائنات کو بھی شامل کر لیا ہے۔ جناب حیات اللہ انصاری نے سب سے الگ قرآن کی زبان کو اس کا مشارٌ الیہ قرار دیا ہے ... اس سلسلہ میں سلیم تمنائی کا عندیہ کلام اقبال کی طرف ہے ـــ ڈاکٹر گیان چند نے قرآن کریم کو اس کا مشارٌ الیہ قرار دیا ہے"

(اقبال کے دو اشعار۔ ہماری زبان ۱۵ جولائی ۸۰ء)

ڈاکٹر اعظمی اس کا مشارٌ الیہ اقبال کو تسلیم کرتے ہیں جس سے ان کی مراد بنی نوع انسان ہے۔ موصوف فرماتے ہیں۔

"اس شعر میں "ترجمان" کا لفظ ہر ایک کے ساتھ لگا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ لفظ ترجمان اس شعر میں کلیدی حیثیت کا حامل ہے اس سے یہ پیچیدہ قفل کھولا جا سکتا ہے۔ شاعر کہنا چاہتا ہے کہ محمدؐ تیری ترجمانی کے لئے مبعوث ہوئے اس کام

بر جبریل مقرر کئے گئے جس سے تیرا اصل ترجمان قرآن ڈھونڈ لیں آیا جو رہتی دنیا کے لئے انسان کے پاس ہدایت کے ایک سرچشمہ کی شکل میں جاری رہے گا۔ لیکن یہ انسان کس کا ترجمان ہے بلاشبہ یہ بھی تیرا ہی ترجمان ہے اور تیرے اوصاف کا مظہر اسی لئے راقم الحروف کے خیال میں "حرف شیریں" سے کلام اقبال مراد نہیں ہے بلکہ خود حرف یعنی لفظ "اقبال" مراد ہے جو انسان کا نمائندہ ہے۔" (ایضاً)

شعر زیر بحث کے یہ مختلف مفاہیم اس کو اور الجھا دیتے ہیں اور قاری کسی ایک نتیجہ تک نہیں پہنچ پاتا۔ اس غلط بحث کی اصل وجہ یہ ہے کہ بعض اوقات اقبال کے اشعار کا مفہوم متعین کرتے وقت ہماری نظروں سے اقبال کا شعری مسلک اوجھل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس شعر کے مفہوم کے تعین میں بھی اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ لہٰذا اشد ضروری ہے کہ

اقبال اور پیروی شبلی" میں رقمطراز ہیں۔

"دام الکتاب سے شاعر کی عقیدت رسمی اور سرسری نہیں ہے بلکہ ایمان کی صورت اختیار کئے ہوئے ہے"

اقبال اور پیروی شبلی ص۹۳

موصوف آگے چل کر فرماتے ہیں۔

"ان کے کلام میں اس بات کے واضح شواہد موجود ہیں کہ انھوں نے عصر حاضر میں پیدا شدہ معاشی، سیاسی، اور معاشرتی مسائل کا حل ڈھونڈنے کے لئے قرآن حکیم کا سہارا لیا۔" (ایضاً ص۹۶)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

"قرآن کی مختلف آیات کا مفہوم اپنے الفاظ میں قلمبند کرنے کے علاوہ شاعر ملت نے اپنی تلمیحات کا بیشتر حصہ بھی اسی سے حاصل کیا ہے۔" (ایضاً ص۹۷)

محمدؐ بھی ترا، جبریلؑ بھی قرآن بھی تیرا

شعر زیر بحث کا مفہوم متعین کرنے سے قبل اقبال کے شعری مسلک سے بحث کر لی جائے۔

اس سلسلہ میں "قرآن اور اقبال" کے مصنف ابو محمد مصلح لکھتے ہیں۔

"بہرحال اس بات کے تسلیم کرنے میں کسی کو تامل نہ ہوگا کہ اقبال کی شاعری اور ان کے پیام کی بنیاد زیادہ تر قرآن پر ہے۔" (اقبال اور قرآن ص۲۴)

مصنف آگے چل کر فرماتے ہیں۔

"اقبال کا شاعری سے مقصد قرآن تھا۔ وہ اس بات سے بیزار ہیں کہ ان کے قرآنی مقصد کو فراموش کر دیا جائے اور انہیں نرے شاعروں کی صف میں لا کر کھڑا کیا جائے خواہ یہ حیثیت ملک الشعرا کی ہی کیوں نہ ہو۔" (ایضاً ص۲۵)

اسی سلسلہ میں ڈاکٹر سید افتخار حسین شاہ اپنی تصنیف

اقبال کے اسی شعری مسلک کے بارے میں ان آوار سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے اپنے کلام کے ذریعہ قرآن کے اسرار و رموز کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس پر اس کا اردو فارسی کلام شاہد ہے۔ اس نے خود بھی اپنے اسی مسلک کا اظہار اپنے ایک خط میں اس طرح کیا ہے۔

"میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ فن شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لئے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے۔"

(مکتوب مورخہ ۲۰ راگست ۱۹۳۵ء بنام سید سلیمان ندوی)

اس شعری مسلک کا اظہار اقبال اس طرح بھی کرتا ہے۔

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرم راز درون میخانہ

اور کلام اقبال سے پتہ چلتا ہے کہ یہ رازہائے درون میخانۂ قرآن مجید کے اسرار و رموز ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو عصر حاضر کا اسی طرح مصلح سمجھتا تھا جس طرح مولانا روم رح اپنے زمانہ کے لئے تھے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؂

چوں رومی در حرم دادم اذاں من — ازو آموختم اسرار جاں من
بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن او، — بہ دورِ فتنۂ عصرِ رواں من

اقبال کا یہ اعلان صاف بتا رہا ہے کہ اس نے اپنی شاعری کو اسی مقصد کے لئے وقف کر دیا تھا اور اس نے اس سے وہی کام لیا ہے جو مولانا روم نے اپنی شاعری سے لیا تھا۔ اور چونکہ ؂

مثنوی مولوی معنوی — ہست قرآں در زبانِ پہلوی

ایک مسلّم شدہ حقیقت ہے اس لئے کلام اقبال بھی مثنوی مولانا روم کی طرح "ہست قرآں در زبان پہلوی"

کو ملحوظ رکھ کر جادۂ دنیا پیما گامزن ہوجاتا ہے۔ اب شعر زیر بحث کے مفہوم کو متعین کرنے کے لئے پوری نظم کا مطالعہ کر کے دیکھا جائے کہ یہ شعر مضمون کے کس حصہ سے بحث کرتا ہے اور موضوع کے ارتقا کی اس منزل میں کیا مفہوم دے رہا ہے۔ اس کے بغیر شعر معمہ تو بن سکتا ہے۔ تفہیم اقبال کی گرہ کشائی نہیں کر سکتا۔

یہ غزل "بال جبریل" کی دوسری غزل ہے۔ اس غزل کے ابتدائی شعر ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ آدم کو جلد سے جلد عالم بالا میں بلانے کا مشتاق ہے۔ اس لئے کہ جذبۂ عشق اسی کو ودیعت کیا گیا ہے اور نظام کائنات کی بقا بھی جذبۂ عشق کی مرہون منت ہے۔ اقبال نے خود کہا ہے ؂

جذب باہم جو نہیں، محفل انجم بھی نہیں۔

اور انجذاب باہمی میں عشق کی کارفرمائی ہے۔ اس مختصر

مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا؟

ہے اور یہی مسلک ان کی اردو شاعری کے لئے بھی ہے۔ اقبال کے شعری مسلک کی اس وضاحت کو سامنے رکھ کر اگر شعر زیر بحث پر غور کیا جائے تو اس کا مفہوم متعین کرنے میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے۔

یہ شعر اگرچہ غزل کا ہے لیکن اسی پوری غزل کے پیش نظر رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ غزل سے زیادہ نظم ہے۔ اور اس لئے اسے "غزل نما نظم" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس کے اشعار میں موضوع ارتقائی منزلوں میں نظر آتا ہے اور آخری شعر میں شاعر کا نقطۂ نظر کھل کر واضح ہو جاتا ہے۔ اس غزل نما نظم کا اصل موضوع عظمت آدم اور اس کی وفا شعاری ہے۔ اقبال اس نظم میں بتاتا ہے کہ آدم اتنا وفا شعار ہے کہ وہ اس سے بے نیاز رہتا ہے کہ محبوب کا رویہ اس کے ساتھ کیا ہے۔ اس کا کام تو صرف آداب عشق

تمہید کو سامنے رکھتے۔ اور پھر غزل کے پہلے شعر کو پڑھئے

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکر جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا

گویا کہ آدم خدا سے اس بات پر روٹھا ہوا ہے کہ اسے جنت سے کیوں نکال دیا گیا؟ جب اسے وہاں سے نکال ہی دیا گیا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ تو ہونا ہی تھا کہ نظام کائنات میں عشق کی کارفرمائی میں خلل پڑ جائے اور اس کے اثر سے انجم کج رو ہو جائیں۔ اقبال آدم کی نمائندگی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر نظام کائنات میں اس کے جذب دروں اور عشق و مستی کی اتنی اہمیت تھی تو پھر اسے جنت سے کیوں نکالا گیا اور جب نکال دیا گیا تو مجھے کوئی پروا نہیں ہے کہ نظام کائنات میں اس سے کیا خلل واقع ہوتا ہے۔ کائنات خدا کی ہے اس لئے وہی اس کی فکر کرے۔ مجھے اس سے کوئی

• جاوید اکرم

میرے ہاتھوں میں آئینہ رکھ دے
کوئی چہرہ تو آشنا رکھ دے

میری آنکھوں سے تو نمی لے جا
میرے ہونٹوں پہ قہقہہ رکھ دے

میرا سایا میری تلاش میں ہے
شب کی دہلیز پہ دیا رکھ دے

لوگ چلتے ہوئے ٹھہر جائیں
سونے رستوں پہ حادثہ رکھ دے

کیا خبر پھر ملیں، ملیں نہ ملیں
اپنی یادوں کا سلسلہ رکھ دے

مطلب نہیں۔

جب آدم واپسی کے لئے آمادہ نہیں ہوتا تو خدا کی طرف سے ایک دوسرے انداز سے بات کہی جاتی ہے کہ آدم کے جنت سے آجانے کے بعد "لامکان" ہنگامہ ہائے شوق سے خالی ہوگیا ہے اور اسی پر ویرانی چھائی ہوئی ہے۔ مگر اس کے باوجود آدم پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور بڑی بے نیازی سے جواب دیتا ہے۔ ؎

اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس کی ہے یا رب لامکاں تیرا ہے یا میرا؟

گویا کہ آدم کی زبان سے اقبال نے خدا کو جواب دے دیا ہے کہ اگر وہ لامکان "اِن میری اتنی اہمیت تھی تو پھر مجھے وہاں سے نکالا کیوں گیا؟ یہ تو پہلے سوچنا چاہئے تھا۔

اس کے جواب میں خدا تعالیٰ آدم کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے اور اس واقعہ پر روشنی ڈالتا ہے کہ کس طرح اس نے آدم کو تخلیق کرکے اس کی عزت بڑھائی اور فرشتوں سے اس کو سجدہ کروا دیا۔ مگر ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور اس جرم کی پاداش میں اس کو جنت سے نکال دیا گیا۔ اور آدم کا مسکن جنت کو بنا دیا گیا۔ مگر جب آدم نے بھی وہاں نافرمانی کر ڈالی تو اس کو بھی جنت سے نکالنا پڑا گویا کہ جنت سے محروم آدم کی خطا کی وجہ سے تھی۔ نہ وہ خطا کرتا نہ جنت سے نکالا جاتا۔ اقبال اس کے جواب میں کہتا ہے ؎

اے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیوں کر؟
مجھے معلوم کیا وہ رازداں تیرا ہے یا میرا؟

گویا کہ صبح ازل ابلیس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار ہی اس لئے کیا تھا کہ وہ تیرے منصوبہ سے واقف تھا اور اسی لئے اسے سجدہ کرنے سے انکار کرنے کی جرأت ہوئی ورنہ مخلوق ہوتے ہوئے وہ انکار کی جرأت کیسے کرسکتا تھا؟ اور چونکہ وہ تیرا رازداں تھا اس لئے اس نے تیرے منصوبہ کے مطابق کام کیا اس میں آدم کی کیا خطا تھی؟

اس کے بعد شعر زیرِ بحث کی باری آتی ہے۔ نظم کے اس مسلسل مضمون کے پس منظر میں اب شاعر خدا تعالیٰ کو یہ بتا رہا ہے کہ ایک طرف تو آدم کے ساتھ یہ رویہ اپنایا گیا اور دوسری طرف اسے جنت میں دوبارہ داخل ہونے کا مستحق بنانے کے لئے تو نے ایک دوسرا منصوبہ مرتب کر لیا ہے۔ تاکہ

؂ ڈاکٹر اعظمی نے اس شعر میں لفظ "انجم" سے انسان مراد لیا ہے۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں انجم سے مراد اجرامِ فلکی یا کائنات ہے۔ ورنہ دوسرے مصرع میں اقبال "جہاں" کا لفظ استعمال نہ کرتا جو کائنات کا مرادف ہے، زمین کا نہیں۔

تیرا لامکان اس کے پہنچ جانے سے ہنگامہ ہائے شوق سے گونج اٹھے۔

اس منصوبہ کے تحت تو نے دنیا میں انبیاء کا سلسلہ شروع کیا اور ان کے پاس جبریل امین کے ذریعہ اپنا پیغام بھیجا تاکہ وہ بنی نوع انسان کے سامنے اس کو رکھ دیں اور انہیں تیری اطاعت کے حلقہ میں لے آئیں تاکہ اس طرح وہ دوبارہ جنت کے مستحق بن سکیں۔ اس سلسلہ انبیاء کی آخری کڑی محمد عربی ہیں۔ وہ بھی تیرے فرستادے ہیں، جبریل تیرے فرشتہ ہیں اور قرآن تیری آخری کتاب لیکن اس کے باوجود انسانیت گمراہی میں بھٹک رہی ہے۔ اور نافرمانی کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے۔ ایسی صورت میں تو دیکھ رہا ہے کہ میرا پورا کلام (حرف شیریں) تیری کتاب ہدایت کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اور اس طرح تیرے مقاصد کی تکمیل میں معاون ہے۔ میں گلا سے بے نیاز ہوں کہ میرے ساتھ کیا گیا گیا کیونکہ یہ میرے جذبۂ وفاداری اور اس کے معیار بلند نے میں نہیں کھٹا اس لیے کہتا ہے ؎

محمدؐ بھی تیرا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا؟

گویا کہ محمدؐ، جبریل اور قرآن تو تیرے ترجمان ہیں ہی مگر یہ دیکھ کہ میں نے بھی اپنی صلاحیتوں کو تیری ترجمانی کے لیے وقف کر دیا ہے اور اپنے کلام کے ذریعہ تیرے مقاصد کی تکمیل میں لگا ہوا ہوں تاکہ تیرا "لامکان" "ہنگامہ ہائے شوق" سے خالی نہ رہ جائے اور نظام کائنات میں عشق کی عملداری ہو جائے۔

غزل کے اس پورے پس منظر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس شعر میں حرف اشارہ "یہ" کا اشارہ "الذیحرف شیریں" ہے جو کلام اقبال کے معنی میں مستعمل ہوا ہے اس سے مراد نہ قرآن ہے نہ زبان قرآن، یہ نہ کائنات کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور نہ اقبال یا آدم کے معنی میں غزل کے آخری شعر میں اقبال نے اپنے مسلک کی اہمیت کو پُرزور انداز میں بیان کیا ہے ؎

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

اقبال کہہ رہا ہے کہ اس نے اپنے کلام کے ذریعہ کلام اللہ کی ترجمانی کی ذمہ داری کچھ اس لئے نہیں لی ہے کہ اسی میں آدم اور بنی نوع آدم کا بھلا ہے بلکہ اس لئے لی ہے کہ یہی انسان ہے جس کی وجہ سے کائنات میں رونق اور حسن باقی ہے۔ اگر انسان زوال پذیر ہو جاتا ہے تو یہ خدا تعالیٰ کا سب سے بڑا نقصان ہوگا۔ اسی کی کائنات اس کی تابانی سے محروم ہو جائے گی، اس میں مہیب تاریکی چھا جائے گی "لامکان" ویران پڑا رہ جائے گا اور انجم کی کجروی کا کوئی علاج ممکن نہ ہوگا لیکن اگر آدم کو زوال سے بچا لیا گیا تو پھر "لامکاں" کی ویرانی "ہنگامہ ہائے شوق" سے گونج اٹھے گی اور اس کا جذبۂ عشق کائنات کے رگ و پے میں دوڑنے لگے گا۔ اور نظام کائنات میں نظم و ضبط برقرار رہ سکے گا۔ یہاں "زوالِ آدمِ خاکی" سے مراد انسان کا مادی زوال نہیں ہے اور نہ اس کی ترقی سے مراد مادی ترقی بلکہ زوال سے مراد عشق خداوندی کی کمی اور ترقی سے مراد بھی عشق خداوندی کا ارتقاء ہے جس سے اطاعت خداوندی کے لئے زمین ہموار ہوتی ہے اور جس کے نتیجہ میں آدم جنت کا مستحق بن جاتا ہے۔

اقبال کی یہ غزل اس کے فن کا عجیب و غریب نمونہ ہے۔ یہ اگرچہ خدا اور بندہ کے درمیان ایک مکالمہ ہے مگر اقبال نے اسے کچھ ایسی ٹیکنک سے تخلیق کیا ہے کہ اس میں متکلم کا تو پورا کلام موجود ہے مگر مخاطب کا تخاطب بالکل غائب ہے۔ اس میں جواب سارے ہیں سوال کوئی نہیں۔ مگر شاعر نے متکلم کے جوابات کو اسی طرح پیش کیا ہے کہ ان پر ذرا سا غور کرنے سے سوال خود بخود ذہن میں آجاتا ہے بلکہ کہئے کہ مخاطب اور متکلم کے درمیان کیا بات چیت اور مباحثہ ہوا، واضح طور پر ذہن میں آ جاتا ہے اور پوری غزل میں نظم کی سی ترتیب کے ساتھ

مکمل ڈرامہ کا لطف پیدا ہو جاتا ہے اور اس کے تاثر میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اقبال کی یہ غزل نما نظم اس کی تکنیک کی بہترین مثال پیش کرتی ہے۔

اس غزل کے ذریعہ اقبال نے دو باتوں کی ترسیل کی ہے۔ ایک تو یہ کہ آدم کو جنت سے نکال کر خدا تعالیٰ اس سے بے نیاز نہیں ہو گیا ہے۔ اور نہ جنت میں کی گئی نافرمانی کی وجہ سے اس سے ناراض ہے بلکہ اسے بڑی بے چینی سے اس بات کا انتظار ہے کہ وہ کب اس حال میں واپس آتا ہے کہ اسے دوبارہ جنت میں داخل کر دے۔ جس کے لئے اسے پیدا کیا گیا تھا۔ خدا کی یہ خواہش عشق کی یہ حد تک بڑھی ہوئی ہے۔ اسی لئے خدا تعالیٰ نے بڑے انداز دلجوئی سے بات کہی ہے تا کہ یہ روٹھا ہوا آدم پھر سے راضی ہو جائے جسے اس نے جنت سے نکال کر ناراض کر دیا ہے۔ خدا تعالیٰ اس کو اپنے پاس ہونے کے لئے کبھی انجم کے گرد ہونے کا بہانہ کرتا ہے تو کبھی لامکان کے "ہنگامہ ہائے شوق سے خالی ہونے کا جواب میں اقبال نے بھی بڑے انداز محبوبی سے اٹھلا اٹھلا کر خدا کو جواب دیا ہے تا کہ وہ اس کی اور ناز برداری کرے۔ اس انداز سے یہ بتانا مقصود تھا۔ کہ خدا تعالیٰ خود بھی آدم سے عشق کرتا ہے اور اسے جنت میں داخل کرنے کا متمنی ہے۔ آدم اور بنی نوع آدم سے خدا تعالیٰ کا یہی عشق ہے جس کی وجہ سے اس نے بار بار اپنے نبی دنیا میں بھیجے، اپنے مقرب ترین فرشتہ جبرئیل کے ذریعہ ان کے پاس اپنا پیغام بھیجا اور انسان کی ہدایت کے لئے بے شمار ہدایت نامے نازل کئے۔ اگر اسے انسان سے عشق نہ ہوتا اور اسے جنت میں داخل کرنے کی شدید خواہش اس میں نہ ہوتی تو اس سلسلہ

انبیاء اور صحف سماوی کی آخر کیا ضرورت تھی ؛ وہ آدم کو اپنے حال پر چھوڑ دیتا اور اسے جہنم کا ایندھن بنا دیتا

دوسری بات اقبال نے اس نظم میں جو بتائی ہے وہ ہے عظمت آدم۔ وہ کہتا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات

غزل

● — شاکر تسلیم میرٹھی

مرا ناآشنا کوئی نہیں ہے
اگرچہ ہم نوا کوئی نہیں ہے

خدا شاہد ہم ایسے سرپھروں میں
سبکدوش وفا کوئی نہیں ہے

یہ سب یارو کراماتِ جنوں ہے
خرد کا معجزہ کوئی نہیں ہے

رئیسِ میکدہ تو سیکڑوں ہیں
گدائے میکدہ کوئی نہیں ہے

میں تجھ کو صرف اتنا جانتا ہوں
ترے گھر کا پتا کوئی نہیں ہے

دل آزاری ہی ان کا مشغلہ ہے
کہ جن کا مشغلہ کوئی نہیں ہے

سکندر رہوں مرے کیسہ میں لیکن
متاع انبیاء کوئی نہیں ہے

یہی اک آسرا کچھ کم ہے شاکر
کہ میرا آسرا کوئی نہیں ہے

ہے۔حاصل کائنات ہے خدا کا لاڈلا شہکار ہے، رونق بزم جہاں ہے، کوکب کائنات ہے، مجسمۂ جذب و مستی ہے اور خدا کا محبوب ہے اس لئے اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ بھی ایسے خدا کو اپنا محبوب بنا لے، اس کے عشق میں سرشار ہو جائے، اس کی اطاعت کیشی پر کمربستہ رہے، اس کے مقاصد کے لئے کام کرے، اسی کے چشم ابرو سے خوف کھائے، اس کے عشق کا متوالا ہو، اور اپنے قول سے اس کی ترجمانی اور عمل سے اس کے مقاصد کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف رہے تاکہ محبوب کی رضا اس کو حاصل ہو جائے۔ اس کائنات میں آدم کی اس قدر اہمیت ہے کہ جب وہ "لامکاں" میں تھا تو اس میں رونق تھی اور جب وہاں سے نکل آیا تو وہ ویران ہو گیا اور جس زمین پر اس نے قدم رکھا رونق بزم ہستی وہاں منتقل ہو گئی۔ اور جب اپنے وظیفۂ حیات کی تکمیل کے بعد "لامکان" میں قدم رکھے گا تو "لامکان" بھی ہنگامہ ہائے شوق سے گونج اٹھے گا۔

اس طرح اقبال نے خدا اور بندہ کے درمیان عشق کے رشتہ کو استوار کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح کہ آدم بھی خدا کا عاشق ہے اور خدا بھی آدم کا۔

اس وضاحت سے یہ بات مبرہن ہو جاتی ہے کہ زیر بحث شعر میں "یہ" کا مشار الیہ "حرف شیریں" ہے جو کلام اقبال کے معنی دے رہا ہے جس میں اس نے قرآن مجید کے اسرار و رموز کو بیان کیا ہے اور جسے وہ "راز درون مے خانہ" کہتا ہے اور اپنے آپ کو اسی کا "محرم"۔

اس مسئلہ میں ڈاکٹر گیان چند کی رائے تسلیم کرنا مشکل ہے۔ قرآن مجید تو خدا کی کتاب ہے ہی اور اس وجہ سے اسے کلام اللہ کہا جاتا ہے اور ظاہر ہے وہ جس کا کلام ہے اسی کا ترجمان بھی ہوگا۔ ایسی صورت میں اس کے لئے "ترجمان تیرا ہے یا میرا؟" کے انداز میں استفہام کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اسی طرح جناب حیات اللہ انصاری صاحب کی رائے بھی محل نظر ہے۔ ان کی رائے کی اہمیت اس وقت تسلیم کی جا سکتی تھی جب معلوم ہوتا کہ صحف سماوی کا نزول زبان عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں نہیں ہوا ہے۔ حالانکہ بقول خود قرآن مجید کے خدا تعالیٰ نے ہر قوم میں اس کی زبان میں اپنے نبی اور ہدایت نامے نازل کئے ہیں۔ ایسی صورت میں عربی زبان کی کوئی تخصیص نہیں رہ جاتی کیونکہ خدا کی کتاب دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی نازل ہوئی ہیں۔ رسول عربی چونکہ عرب میں پیدا ہوئے تھے اور ان کی قوم کی زبان عربی تھی۔ اس لئے قرآن اس میں نازل ہوا۔ اس لئے یہ کسی قسم کے فخر کی بات نہیں ہو جس کے لئے "مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا" کہا جا سکتا ہو۔ اس طرح نہ "حرف شیریں" جذبۂ عشق کے معنے میں مستعمل ہوا ہے اور نہ کائنات کے لفظ خالص کلام اقبال کے معنی دے رہا ہے ڈاکٹر اعظمی صحیح نتیجہ تک پہنچتے پہنچتے بہک گئے شعر کا تجزیہ کرتے ہوئے موصوف نے اس امر کو نظرانداز کر دیا کہ یہ مکالمہ ہے متکلم اور مخالف کے درمیان۔ اس میں مخاطب خدا ہے اور متکلم اقبال جن کے لئے شعر میں "تیرا" اور "میرا" کے ضمائر لائے گئے ہیں۔ اور "یہ حرف شیریں" صاف بتا رہا ہے کہ یہ "تیرا" اور "میرا" کے علاوہ کوئی تیسری چیز ہے۔ اور وہ یہ ہے کلام اقبال نہ کہ اقبال خود جو "میرا" کی ضمیر میں موجود ہے اس کے علاوہ اقبال یا آدم کے لئے حرف شیریں" کا استعمال بھی محل نظر ہے۔ اس کے باوجود اگر اس سے مراد اقبال یا آدم کو لے لیا جائے تو یہ شعر معیار بلاغت سے گر جائے گا کیونکہ پھر یہ آدم کا کارنامہ نہیں رہتا بلکہ اس کا فطری تقاضہ بن جاتا ہے جس میں اس کی مرضی کو کوئی دخل نہیں رہتا۔ لیکن اس سے کلام اقبال مراد لینے سے آدم کا جذبۂ وفاداری اپنے عروج پر پہنچ جاتا ہے کہ جنت سے نکال دئے جانے کے بعد بھی وہ جادۂ وفا سے ہٹا نہیں ہے بلکہ گمراہی پھیلانے پر فنا ہونے کے بعد بھی وہ اپنے زبان و قلم سے خدا کی ترجمانی میں لگا ہوا ہے

اس مسئلہ میں سلیم تمنائی صحیح نتیجہ تک پہنچ کر بھی ہچکچا گئے اور اس ادبی مسئلہ کو آنے والے وقت کے حوالے کر کے الگ ہو گئے۔

■■

ضیا حسنی

لکھنے کے معاملے میں ہم نے موضوع کی تلاش کبھی نہیں کی دنیا کی جو شے سامنے آئی اُسے جھٹ ہم موضوع بنا ڈالتے ہیں بکھی، مچھر، چیونٹیاں، چھپکلی اور کچھوا حسب توفیق ہم ان سبھی پر خامہ فرسائی کر چکے ہیں۔ ادھر کھٹملوں نے سوتے جاگتے ہر دن اپنے وجود کا احساس دلا کر ہمیں لکھنے کے لئے اکسایا تو ہم نے ذرا سا بھی تساہل نہیں کیا اور ان کے بارے میں یہ مضمون لکھ ڈالا۔

کتھئی رنگ کا یہ ننھا منا سا کیڑا محتاج تعارف نہیں عام طور پر یہ چار پائیوں میں مسکن بناتا ہے اور انسان کے خون سے اپنی تشنگی بجھاتا ہے اس کے علاوہ جہاں بھی انسانی خون میسر آسکتا ہے وہاں بھی وہ رہ بس جاتا ہے چنانچہ پلیٹ فارم کی بنچوں۔ کمپارٹمنٹ کی برتھوں۔ سینما گھروں، اسکول کالجوں کی کرسیوں میں بھی اس کا سراغ ملتا ہے۔ ہاں تو یہ کھٹمل ہمارے خون کا بھی ذائقہ چکھتے رہے ہیں اور شاید آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ہم انہیں اپنے نایاب خون کے قطرات کو پلا کر بھی اپنے دل میں ان کے لئے نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جب کبھی ہمیں کسی سے تکلیف پہنچی تو ہم نے اس کی خوبیوں کی جستجو ضرور کی ہے چنانچہ قطرہ قطرہ خون پلانے کے طویل تجربہ کے بعد ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ حقیر کیڑا کافی جیالا ہے خطرات سے آنکھیں چار کرتے۔ ہتھیلی پہ جان لئے وہ جس طرح شکم پری کے لئے نکلتا ہے، جرآت مندی اور بے خوفی کا یہ حوصلہ ہمیں کم کیڑوں میں دکھائی دیتا ہے۔ انسانوں کے درمیان جرأتمندی اور بے خوفی کے سلسلہ میں جب بات چھڑتی ہے تو وہ یہ کہہ تو دیتے ہیں کہ جو انسانی خطرات سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا اسے جینا نہیں آتا بس وہ یونہی زندگی گزار رہا ہے۔ کہنے کو تو یہ بات کہہ دی جاتی ہے لیکن اکثر بزدل اور نکمے لوگ خطرات سے آنکھیں چراتے ہیں اور کڑی دھوپ سے بچ کر دبیز سایوں میں دبک کر بیٹھنے کو ترجیح دیتے ہیں اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم نے کھٹمل کے جذبہ سرفروشی کو ہمیشہ سراہا ہے۔ قابل غور بات ہے کہ ہر دن کھٹمل اپنے ہم جنسوں کو انسان کے ہاتھوں بے دردانہ موت کے گھاٹ اترتے دیکھتا ہے لیکن جب کبھی اسے موقع ملتا ہے تو وہ انسانی خون کے پینے سے ذرا

نمائندہ نئی نسلیں دہلی

ساپیچھا نہیں کرتا اور موت سے بے خوف ہو کر مختلف رنگ و نسل کے لوگوں کے خون سے منہ کا مزہ بدلتا رہتا ہے اور اس کے پائے استقامت کو ذرا سی جنبش نہیں ہوتی۔ ممکن ہے آپ ہم سے متفق نہ ہوں لیکن ہم اس کے آہنی ارادوں اور اٹوٹ قوت فیصلہ کو فروز سراہیں گے۔

اکثر لوگ بے مقصد وقت گزارتے ہیں لیکن چور اور کھٹمل دونوں آدھی رات کے بعد ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرتے کیونکہ رات کا یہ حصہ دونوں کے سرگرم عمل ہونے کے لئے کافی موزوں ہوتا ہے۔ شاطر چور اور کھٹمل وہی کہا جا سکتا ہے جو کام کر جائے لیکن نظر نہ آئے ان میں سے کئی ناتجربہ کار رنگے ہاتھوں پکڑ لئے جاتے ہیں۔ چور کی جان پہ بن آتی ہے اور کھٹمل جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

انسانی خون کا چسکا کھٹمل کو رواں دواں کرتا ہے۔ وہ پرسکون حالات میں تکیہ کے غلاف، رضائی گدے کے محفوظ گوشوں، چارپائی کی درازوں اور چولوں میں رہتا ہے پھر وہ ان کمین گاہوں سے نکل کر تشنگی بجھاتا ہے اور چٹخارہ لیتا ہوا۔ وہیں واپس آجاتا ہے۔ آپ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ ان ناتواں کیڑوں کی مختصر زندگی دھوڑ بھاگ اور جد و جہد ہی میں گزر جاتی ہے۔ کھٹمل کا مسئلہ خوراک خاصا جان جوکھم ہوتا ہے قدم قدم پر سولی کے پھندے دکھائی دیتے ہیں۔ اور لمحہ بہ لمحہ موت سر پہ منڈلاتی ہوئی نظر آتی ہے لیکن جب کھٹمل آگے بڑھ جاتا ہے تو پھر پیچھے نہیں ہٹتا سر دھڑ کی بازی لگانا اس کا معمول بن گیا ہے۔ سنگدل لوگ کھٹمل کو بڑی عبرت ناک سزائیں دیتے ہیں، اگر اس جبر و ستم کو چنگیز خاں اور ہلاکو بھی دیکھیں تو شرما جائیں۔ غور طلب ہے کون سی سزا نہیں دی جاتی، ان پہ ابلتا ہوا پانی ڈالا جاتا ہے چٹکیوں سے ملا جاتا ہے، نذر آتش کیا جاتا ہے، زہریلی دواؤں سے ختم کر دیا جاتا ہے ان لوگوں کی بات الگ رہی رحم دل لوگ بھی جب اسے دیکھتے ہیں تو ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے اور وہ کھٹملوں کی اس مجبوری کو مدنظر نہیں رکھتے کہ یہ ان کی شکم پری کا معاملہ ہے انسان بھی اناج پر اکتفا نہیں کرتا چوپایوں کے علاوہ مچھلیوں، مچھروں اور مینڈکوں کو بھی ہڑپ کر جاتا ہے۔

کھٹملوں کو ختم کیا جاتا ہے کہ وہ چوری چھپے وار کرتا ہے اور پھر ڈنکے کی چوٹ پر حملہ کرتا ہے ان دونوں باتوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن عقل مندی کا تقاضا تو یہ ہے کہ موقع و محل اور نشیب و فراز کو دیکھ کر کام کیا جائے۔ چلئے! ہم مانے لیتے ہیں کہ کھٹمل عالم خواب میں یا انہماک کی صورت میں اپنا کام کرتا ہے لیکن انسانوں کی بھیڑ میں بھی ہیں ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو اپنے ہم جنسوں کا اعتماد حاصل کر کے یا انہیں غافل دیکھ کر بغلی چھری مار دیتے ہیں۔

کھٹمل کی ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ جب انسان محبت کی پینگیں بڑھاتا ہے تو اس کی رگ شرارت مزید بھڑکتی ہے چنانچہ جب وہ منچلے کسی کونے کھدرے میں بیٹھے ہوئے بے تکلفی سے باتیں کرتے ہیں تو ایسے موقع پر کھٹمل ٹھہر ٹھہر کر سنبھل سنبھل کر دلنشین محبت کو نشانہ بناتا ہے لیکن برا ہو محبت کا۔ وہ کانٹوں کے بستر پہ دراز ایک دوسرے کی محبت میں لگے رہتے ہیں۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان نیند کی آغوش میں جھولتا ہوا کوئی دلکش خواب دیکھنے میں لگا ہوتا ہے اور ایسے میں کھٹمل پے در پے وار کرنے لگتا ہے انسان جاگ پڑتا ہے اور خواب کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو ملاتا ہے۔ لیکن ٹوٹی ہوئی کڑیاں پھر کہاں ملتی ہیں اور وہ ہاتھ مل کے رہ جاتا ہے پھر وہ چوٹ کھائے ہوئے درندے کی طرح کھٹملوں کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔

کھٹملوں کو یہ تشویش برابر رہتی ہے کہ انسان کے ہاتھوں ان کا اجتماعی خون خرابہ ہوا کرتا ہے وہ اپنی نسل کشی کی سازش کو دیکھ کر لرز اٹھتے ہیں اور یہ واقعہ بھی ہے کافی ہولناک طریقوں پر ان کو تباہ و برباد کرنے کے منصوبے بنائے جاتے ہیں اور پھر لاتعداد کھٹمل عبرت انگیز طریقوں پر موت کے گھاٹ اتار دیئے جاتے ہیں۔ یہ تباہ کاری کا سلسلہ کئی کئی دن چلتا ہے اور ایسے میں ان مظلوموں کو سر چھپانے کی جگہ نہیں ملتی وہ قطار اندر قطار اپنے ٹھکانوں سے نکل پڑتے ہیں اس

م۔ رحمٰن صدیقی

نگاہِ ساقی بدل رہی ہے مقامِ رندی زوال پر ہے
نظامِ ہستی بھی ہے دگرگوں بقا کا سورج زوال پر ہے

لہو سے سینچا ہے جس چمن کو اسی چمن سے بچھڑ رہے ہیں
غضب تو یہ ہے کہ باغباں کا عتابِ پیہم کمال پر ہے

وفا کے بدلے ستم شعاری شکوک پھر بھی مری ارادت پر
تری نظر میں قصور میرا کہ فکر میری مآل پر ہے

خلافِ فطرت قدم اٹھا کر سراغِ ہستی نہ پا سکو گے
نظامِ باطل کی دلفریبی کمال پر بھی زوال پر ہے

سنا ہے فصلِ بہار آئی جنونِ خفتہ نے سر ابھارا
ابھی تو زخموں میں تازگی ہے لہو میں سوزش کمال پر ہے

وقت ان کی پریشانی اور سراسیمگی دیکھی نہیں جاتی۔ ہم جب کبھی جوق درجوق کھٹملوں کو حیران و پریشان رینگتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ہمیں بے اختیار مہاجروں کے وہ قافلے یاد آتے ہیں جنہوں نے سیاسی وجوہات کی بنا پر ایک ملک سے دوسرے ملک کو ترک سکونت کی۔

اس میں شبہ نہیں کہ موقع بہ موقع لاتعداد کھٹملوں کو کافی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے پھر بھی قدرت کچھ کھٹملوں کو ضرور بچا لیتی ہے۔ ایسا نہ ہو تو ان کی نسل صفحۂ ہستی سے نابود ہو جائے چنانچہ پسماندہ کھٹمل اپنی اپنی کمین گاہوں میں بیٹھ کر اس دن کا بے چینی سے انتظار کرتے ہیں کہ جب تفریق کی بنا پر انسان اپنے ہم جنسوں کا خون بہانے میں لگ جاتا ہے ایسے موقعوں پر کھٹملوں کو افزائش نسل کی سوجھتی ہے اور جب ان کے ہم جنسوں کی تعداد کافی بڑھ جاتی ہے تو ان کے یہاں بھی جگہ کی تنگی محسوس ہوتی ہے لیکن وہ انسان کی طرح افزائش نسل میں روڑے نہیں اٹکاتے اور ان میں سے ان گنت کھٹمل پرسکون حالات میں چارپائیوں، بنچوں اور کرسیوں سے ترک سکونت کرکے دیواروں پر رینگتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں پھر وہ دیواروں کی درازوں میں اپنا گھر بنا لیتے ہیں اور وہ وہاں سے نکل کر مسئلہ غذا کو حل کرتے ہیں۔ ہم نے اکثر انہیں قطار اندر قطار رینگتے ہوئے دیکھا تو ان کی تنظیم اور ڈسپلن کو دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ ایسے میں ان کے درمیان انتشار اور افراتفری کبھی نہیں ہوتی، نہ بھگدڑ ہوتی ہے نہ وہ کچل کر مرتے ہیں، لوٹ کھسوٹ اور رہزنی کے واقعات بھی سامنے نہیں آتے۔ اس قسم کے حادثات تو انسانوں کی بھیڑ میں ہوتے ہیں۔

بعض ملکوں میں مکھی مچھر اور کھٹملوں کو جانا پہچانا نہیں جاتا بلکہ مشہور ہے کہ انہیں پسماندہ ملکوں کی آب و ہوا راس آتی ہے اور غریبوں کا خون مرغوب ہے۔ خدا جانے ماہر تو جانتے ہیں کہ جب سے یہ دنیا وجود میں آئی یہ کھٹمل پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں البتہ ان بے چاروں کی پیدائش پر نہ جشن منائے جاتے ہیں نہ سال بہ سال سالگرہ کی رسم ہوتی ہے اور نہ ان کے قتل عام پر کوئی سوگ منایا جاتا ہے۔

غرض آپ کھٹملوں کو کچھ بھی کہیں لیکن ہمارا خیال ہے کہ انسانی خون پینے کی لت سے قطع نظر یہ ایک پرسکون اور بے ضرر کیڑا ہے۔

■■

نیا کابلی والا

توقیر وجاہت

اس پہلی تاریخ کو بھی بہت کوششوں کے بعد بھی نظر گل " کسی کو دکھائی نہیں دیا۔ میونسپل کارپوریشن اے جی آفس، ضلع کچہری اور جی۔ پی۔ او کے بابو لوگوں کو پچھلے دو مہینوں سے جانے کیوں یہ یقین نہیں آرہا تھا کہ پہلی تاریخ آگئی اور نظر گل کی صورت نہیں نظر آئی۔ ورنہ معمول تو یہ تھا کہ ادھر تنخواہ لے کر ادگ نکلتے اور ادھر کمپاؤنڈ کے گیٹ پر نظر گل کی مسکراہٹ ان کا استقبال کرتی۔ مفلوک الحال بابو کلرک چپراسی سب کے سب اپنی تنخواہ میں سے جس میں نہ جانے کس کس کا حصہ ہوتا، سود کی ایک قسط نظر گل کے حوالے کر دیتے۔ اور گھر جا کر بچوں کو پھر ایک بار اچھا سا بہانہ بنا کر سمجھا دیتے کہ کھلونے اور مٹھائی اس بار نہیں اگلی پہلی تاریخ کو ضرور لا دیں گے۔

لیکن یہ تیسرا موقع تھا کہ تنخواہ کے وقت کسی نے اس کم تر پٹھان کو دفتروں کے آس پاس نہیں دیکھا۔۔

میں نظر گل خان کو پچھلے چار برسوں سے جانتا ہوں۔ ہوٹل کے ٹھیک پیچھے پرانے طرز کے ایک مکان میں وہ گزشتہ ۱۵ سالوں سے رہ رہا ہے۔ ان دنوں صبح کو جب میں سامنے کی ہوٹل میں چائے پینے جاتا تو گرین کلر کی "رائیل سائیکل ہوٹل کے سامنے کھڑی ہوتی اور نظر گل کسی نہ کسی بینچ پر گلابی چائے پیتا مل ہی جاتا۔ عمدہ پولسٹر کی شلوار قمیض۔ گلے میں بڑا سا چاندی کا تعویذ۔ بازو پر امام ضامن۔۔۔۔ جب تک میں ہوٹل میں رہتا وہ اجنبی اجنبی نظروں سے مجھے دیکھتا رہتا۔ مجھے اپنے جسم پر اس کی نظروں کی چبھن محسوس ہوتی۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوتا۔ دونوں کی آنکھیں ملتیں وہ فوراً گھبرا کر کسی اور طرف دیکھنے لگتا۔۔۔ ایک دن وہ میرے سامنے آکر بیٹھ گیا۔ مضطرب سا بے چین سا۔ مجھ سے کچھ کہنے کو بے چین۔ میں بھی جان کر خاموش رہا آخر اس نے پہل کی۔

"خان سے دوستی کرو گے"؟

"کیا بات ہے"؟

"خان کے ساتھ چائے پیو"

"نہیں"

"کیوں"؟

"تم۔۔۔تم۔۔۔ خان ہونا۔ تم سود لیتے ہو میں تمہاری چائے

نمائندہ [illegible] دہلی

شمس غازی آباد

قلب حزیں کچھ اور مچل
چین نہیں مشکل کا حل

زیرِ قدم کیا چیز نہیں
کوئی ارادہ ہو تو اٹل

ذوقِ نظر ہے صرف خودی
نخوتِ حسنِ ناز سنبھل

شمعِ صفت جل جانا کیا
جل تو پرائی آگ میں جل

عشق و جنوں افتادہی
ہوش و خردمندی بھی خلل

دنیا اُف ہرجائی دنیا
دنیا اپنی آج نہ کل

بدلا ہے دنیا کا مزاج
شمس مذاقِ فکر بدل

نہیں ہوں گا۔ تمہارے پیسے کی کوئی چیز مجھے نہیں چاہئے۔ ایک سایہ سا اس کی آنکھوں میں لہرا یا۔ کرب کی پرچھائی میں نے اس کے چہرے پر بہت نمایاں دیکھی تھی۔ میں وہاں سے اٹھ گیا۔ نظر گل کو جلتا بھُنتا چھوڑ کر ... لیکن دوسرے دن پھر اس کی متلاشی آنکھیں میرے استقبال کو موجود تھیں ... اس بار وہ مجھ سے بہت قریب ہو کر بیٹھا۔ آنکھیں سرخ چہرہ ستا ہوا۔ پسینے کی ایک عجیب خوشبو مجھکو چھونے لگی۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کچھ مقناطیسی لہریں اس کے جسم سے نکل کر مجھ تک پہونچ رہی ہیں میں چاہوں تو ان سے بھاگ نہیں سکتا .... اس دن اس نے کچھ نہیں کہا۔ سرخ سی بے بس آنکھوں سے میری طرف دیکھتا رہا۔

دونوں خاموش رہے۔ آخر میں نے کہا۔

"خان" کل پر آلگ گیا۔ اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔ اور خواہ مخواہ سامنے پڑے ہوئے گلاس کا پانی پی ڈالا ..... اس دن سے آج تک تقریباً ۴ سال ہو گئے ہماری دوستی ہے۔ وہ مجھے چائے پینے کے لئے نہیں کہتا۔ میں اس کے پیسوں کا کچھ کبھی نہیں کھاتا۔ لیکن ہم دونوں کے دل بہت زیادہ قریب ہیں۔ بہت زیادہ قریب

ان چار سالوں میں اس کی زندگی کی تمام گرہیں۔ تمام جل میرے سامنے کھل گئے۔ ۱۵ سالوں سے HOMESICK (ہوم سک) نظر گل کا جب کبھی گھر سے خط آتا وہ مجھے ضرور سناتا۔ اس دن وہ مجھے عجیب نظروں سے دیکھتا۔ میں بھی اپنے گھر سے دور تھا اس کے دکھ کو سمجھ لیتا۔ خط کے ساتھ وہ ماضی کی کتاب سے کوئی بھولا بسرا باب مجھے سناتا۔ میں اس کے الفاظ کی قندیل کی روشنی میں اس کے ماضی کی پگڈنڈی پر دھیرے دھیرے بے تکان چلتا رہتا۔

حتیٰ کہ افغانستان کے ایک دور دراز قصبہ کی سرحدیں شروع ہو جاتیں اور ایک ہیولیٰ سا دکھائی دینے لگتا۔ جو شدید سردی کی ایک رات کو بوسیدہ شلوار قمیص پہنے .. کاندھے پر پوٹلی باندھے ایک غمزدہ چپ چپ سی بیوی اور ۵ سالہ بچے کو پیچھے چھوڑتے ہندوستان آرہا ہے۔ آلوچے اور خوبانی کے پیڑ اسے روک نہیں پا رہے ہیں... ... اور۔ اور یہی سب دیکھتے دیکھتے میری نظر دھندلا جاتی۔ خط کب کا ختم ہو جاتا ہے لیکن دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش خلا میں گھورتے

رہ جاتے۔ اسے اپنا وطن یاد آ جاتا۔ مجھے اپنا گھر۔ تھوڑی دیر بعد دونوں چپ چاپ اٹھ کر چل دیتے۔

ایک روز میں صبح ہی صبح SHAVE کر کے اپنی دھن میں ہوٹل کے سامنے سے گزرا نظر گل مل گیا۔ بہت دیر مجھے دیکھتا رہا۔ میں اس کی آنکھوں کو پڑھ نہیں پایا۔ اس دن وہ پہلی بار اصرار کر کے مجھے اپنے گھر لے گیا۔ پرانی سی ایک پیٹی نکال اس میں کپڑوں کی تہوں کے نیچے سے ایک ریزر نکالا۔ اس دن جانے کیوں نظر گل مجھے بہت جذباتی لگا۔ وہ مجھے بتانے لگا کہ اب اس کا بیٹا شیر گل بڑا ہو گیا ہو گا۔ اس کے گالوں پر سبز رواں جم رہا ہو گا۔ جب وہ گھر جائے گا۔ تو اسے داڑھی بنانے کے لئے یہی ریزر دیگا۔ میرے ہاتھوں میں کتابیں دیکھ کر اس نے کہا تھا کہ۔ میں اس کے لئے ایسی ہی تین چار موٹی موٹی کتابیں لا دوں۔ جسے پڑھ کر اس کا شیر گل بڑا آدمی بن جائے گا۔ پھر اسے افغانستان سے اتنی دور نہیں رہنا پڑے گا۔ میں ایک ٹک اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس دن مجھے پتہ چلا کہ پردیس میں انسان خواہ نخواہ جذباتی ہو جاتا ہے۔

جانے کیوں، تقریباً ایک سال ہوا۔ جب سے افغانستان میں یہ کمبخت خانہ جنگی شروع ہوئی نظر گل بہت مضطرب بےچین رہنے لگا تھا اور مجھ سے اردو اخبار پڑھوا کر سنتا۔ B.B.C کے ENGLISH BULLEIN کا خلاصہ پوچھتا۔ میں ہمیشہ اس کو دلاسہ دیتا کہ نظر گل فکر مت کرو حالات ضرور بدلیں گے۔ وہ نہ چاہ کر بھی میری بات پر بھروسہ کر لیتا۔ دن گزرتے رہے۔ حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ ایک روز وہ بہت زیادہ پریشان پریشان سا مجھ سے ملا۔ میں نے حال پوچھا۔ اس نے پشتو میں لکھا ہوا خط ایک طویل میرے سامنے کر دیا میں خط تو نہیں پڑھ سکا۔ البتہ اس خط سے اٹھنے والی خون کی خوشبو اور تحریر سے نکلتی ہوئی آگ سے پہچان گیا کہ یہ شیر گل کا خط ہے۔ میں نے نظر گل سے پوچھا "کیا لکھا ہے"۔ اس نے دھیرے سے خط میرے ہاتھ سے لیا ایک بار پھر میری طرف دیکھا اور خط سنانا شروع کیا۔ شیر گل نے لکھا تھا۔

"بابا!"

"کب آؤ گے تم۔؟ اماں کہتی ہے تم ہندوستان بہت سارے پیسے لانے گئے ہو۔ لیکن کب لوٹو گے۔ یہ سب لے کر۔ اور کس کے لئے؟ یہاں تو ہر راستے ہر گلی میں گولیوں کی زبان میں بات ہوتی ہے۔ ہر چوراہا ہر موڑ پر خون کے فواروں کے بیچ معصوموں کے سر ملتے ہیں۔ آلوچے اور خوبانی کے باغ نہ جانے کہاں گم ہو جا رہے ہیں۔ ہماری بھیڑیں اور گھوڑے بھی شاید ہم سے بیزار ہو گئے۔۔۔ ایک اماں ہے جس کو لئے لئے میں کھیتوں کھیتوں گھومتا ہوں، مجھے خود کی نہیں بس اماں کی فکر ہے اس کی بے عزتی مجھ سے نہیں دیکھی جائے گی۔ تم آجاؤ۔۔۔ میں اب بڑا ہو گیا ہوں مجھے دیکھو گے نہیں؟ میں تو اب اپنے ملک کے لئے بھی لڑتا ہوں۔ اپنے مذہب کے لئے بھی لڑتا ہوں میں یہاں کے کسی بھی نوجوان سے پیچھے نہیں ہوں۔ میں اپنی رگوں میں موجود تمہارے خون کو شرمندہ نہیں کروں گا

ہاں۔۔۔ اماں بتا رہی تھی تم وہاں پیسے ادھار دیتے ہو تو اس کے بدلے میں سود لیتے ہو۔ بابا لکھ دو یہ سب جھوٹ ہے جھوٹ ہے۔ کاش یہ جھوٹ ہوتا۔۔ بابا تم اب پیسے مت بھیجنا۔ خدا کسی کو بھوکا نہیں مارتا۔ حالات بدل ہی جائیں گے۔ ہم درندوں سے اپنا ملک چھڑا ہی لیں گے۔ پھر ایک نیا ملک بنائیں گے۔ جہاں برائی اور اچھائی کے بیچ ایک لکیر ہو گی۔ امتیاز کی لکیر تم اگر افغانستان لوٹنا چاہو تو لوٹ آؤ۔ لیکن مظلوموں کی رگوں سے چوسا ہوا۔ وہ سب خون وہیں چھوڑ دینا۔ ہماری سرحدوں میں ہمارا اپنا ہی خون ابھی تک جما نہیں ہے اور خون کہاں رکھیں گے اگلا خط کب لکھ سکوں گا کہہ نہیں سکتا۔ اماں سلام کہتی ہے خدا حافظ۔"

تمہارا شیر گل

خط ختم ہو گیا۔ لیکن آگ برابر سلگتی رہی۔ میرے دل میں بھی اور نظر گل کے سینے میں بھی میں کچھ کہہ نہیں پایا۔ چپ چاپ واپس لوٹ گیا۔ وہ خط پڑھے، مجھے پورے دو مہینے ہو گئے۔ اس دن سے نظر گل کی صورت تک نہیں دکھائی دی۔ میں یہ سمجھنے لگا تھا کہ اس کے مکان کے بند کواڑ اب نہیں کھلیں گے۔ کبھی نہیں۔ نظر گل جا چکا ہے اپنے شیر گل کے پاس۔ خوشی بھی ہوئی کہ چلو ۱۵

برس سے گھر چھوڑا ہوا دکھی آدمی گھر پہونچا تو۔
لیکن کل آدھی رات تک پڑھتے رہنے کے بعد گیلری میں آیا تو دور LAMP . POST کے نیچے ایک سایہ لہرایا۔ چلنے کے انداز سے جانے کیوں نظر گل کی یاد آگئی غیر ارادی طور پر میں نیچے اترا آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ "وہ شمال مغرب" کی سمت جلتی بجھتی روشنیوں کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں قریب پہونچا۔ پسینہ کی ایک جانی پہچانی خوشبو نے مجھے گھیر لیا خود رفتگی میں میرے منھ سے نظر گل ..... نکل گیا۔

وہ اپنا نام سن کر چونک گیا۔ مجھے پہچان کر گلے لگا لیا بہت دیر تک بھینچے رہا۔ مجھے اپنے کاندھے پر نہ جانے کیوں کچھ نمی سی محسوس ہوئی۔

میں نے پوچھا۔"

"تم کہاں تھے!"؟

وہ خاموش رہا۔ نظر نہیں ملائی۔ خواہ مخواہ ادھر ادھر دیکھنے لگا شاید آنکھوں میں آئے قطروں کو سکھانا چاہتا تھا

میں نے پھر پوچھا۔

"بہت دنوں سے دکھائی نہیں دئے۔ کہاں تھے میں سمجھا تم افغانستان چلے گئے۔"

وہ بہت دیر تک نفی میں گردن ہلاتا رہا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن کچھ کہہ نہیں پایا۔

آواز نے ساتھ نہیں دیا ہوگا۔

میں اسے ساتھ لے آیا۔ کمرہ میں روشنی کی تو پورا نظر گل بدلا بدلا سا لگا۔

پولسٹر کی بجائے اب معمولی سوتی کپڑے کی شلوار قمیض تھی پیر میں سستی سی چپل چہرے پر کرب اور دکھوں کے سائے میں نے پوچھا "کیسے ہو؟" "ٹھیک ہوں۔ شیر گل؟"

اس نے جواب میں ایک نم سا کاغذ نکال کر مجھے تھما دیا میں نے اسے الٹا پلٹا کر دیکھا کچھ بھی نہیں تھا اس کاغذ پر جو کچھ لکھا ہوگا۔ شاید کھارے پانی سے دھل گیا تھا۔

کس کا خط ہے" میں نے پوچھا۔

"شیر گل کی ماں نے کسی سے لکھوایا ہے"

"کیا لکھا ہے۔"

"شیر گل افغانستان کیلئے لڑتے لڑتے شہید ہوگیا۔ مجھے بتایا ہے اس کی ماں نے۔"

"گئے نہیں۔"

"سفارت خانے سے اجازت نہیں ملی۔"

"تمہاری یہ حالت کیسی ہوگئی تمہاری سائیکل کہاں ہے۔ یہ میلے کپڑے کیوں پہنتے کہاں ہو۔ ملے کیوں نہیں۔"

میں نے ایک سانس میں کتنی سوال کر ڈالے۔

"بابا۔ میں نے سود کا کاروبار بند کر دیا ہے۔ دیئے ہوئے پیسے بھی کسی سے واپس نہیں مانگے۔ گھر کا کرایہ دینے کے لیے سائیکل بیچ دی۔ اب میں رات کو گوداموں کی چوکیداری کرتا ہوں اور اب گھر جاؤں گا۔ تو یہ پسینہ ساتھ لے جاؤں گا جس میں صرف میرے پسینہ کی خوشبو ہوگی۔ لیکن ... لیکن کس کے لیے ... جس کے لئے یہ سب ... وہ آگے بول نہیں سکا۔

نم سا کاغذ مجھے تھما کر وہ دھیرے سے کہنے لگا۔

"بابا تم اپنا نام نہیں بدل سکتے"

"بدل سکتا ہوں۔ کیوں کیا بات ہے" میں نے پوچھا۔ "کچھ نہیں۔ تم اپنا نام شیر گل رکھ لو" وہ دھیرے سے اٹھا اور کمرے سے جانے لگا۔ میں اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ آنسو کے محدب شیشے میں اس کا عکس پڑھنے لگا۔ گھبرا کر میں نے آنکھیں ملڈالیں۔ وہ دھیرے دھیرے مجھ سے دور جاتا رہا۔ دور جاتا رہا۔ آج بھی وہ نم کاغذ میرے پاس محفوظ ہے۔

میں جب بھی شمال مغرب کی طرف دیکھتا ہوں مجھے دور ایک روشن نقطہ[1] نظر آتا ہے جو F.C.I کے گوداموں کے قریب متحرک اس روشن نقطہ[2] سے بہت زیادہ مماثل ہے میں اس دن کے انتظار میں ہوں جب دونوں نقطے مل کر ایک تحریر بنا دیں گے مسیحائی کی تحریر۔ جہد کی تحریر۔ قربانی کی تحریر پھر اس تحریر کو کوئی نہیں مٹا سکے گا۔

---

[1] افغانستان میں شیر گل کی قبر
[2] ہندوستان میں نظر گل۔

بقیہ عصرِ حاضر کا سب سے بڑا دماغ

اور زبردست وسائل کے ساتھ صف آرا تھیں تو دوسری طرف خود مسلم عوام و خواص نہ صرف یہ کہ ان کے پیغام، اسلام سے نامانوس ہو چکے تھے۔ بلکہ ان کے کام میں مزاحم تھے، جبکہ حالات کی ان تمام سختیوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے مولانا مودودی کے پاس مادی وسائل اور ذرائع تقریباً صفر تھے۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ عصرِ حاضر میں ؎

آدم کو ثبات کی طلب ہے دستورِ حیات کی طلب ہے

تو تمام بے سروسامانیوں اور باطل کی قہرمانیوں کے باوجود صرف اپنے ذہنی و اخلاقی قوی کو لیکر میدانِ عمل میں آ گئے۔ اور یہ مؤثر آمار اعلان کر دیا ؎

دیں مسلکِ زندگی کی تقویم دیں سرِ محمد و براہیم

(ایک فلسفہ زدہ سیدزادے کے نام (ضربِ کلیم))

اس اعلان کو عصرِ حاضر میں عالمِ اسلام کی سب سے بڑی تحریک بنانے کے لئے مولانا مودودی نے سب سے پہلے وقت کے تمام دماغوں سے اپیل کی ہے اور ان کو قائل کرنے کے لئے ایک لاجواب طاقتور اور پراثر لٹریچر تصنیف کیا اس کے بعد باطل کی تمام قوتوں سے لوہا لینے کے لئے انھوں نے ایک زبردست تنظیم جماعتِ اسلامی کے نام سے تشکیل کی۔ پھر اپنی پوری عمر اور اپنے جسم و ذہن کی ساری صلاحیتیں انھوں نے اس تحریک و تنظیم کو آگے بڑھانے میں صرف کر دیں۔ ہر قسم کی مادی محرومیوں اور روحانی اذیتوں کے درمیان تقریباً نصف صدی تک پوری یکسوئی اور انہماک کے ساتھ اپنا کام کرتے رہے نہ صلے اور ستائش کی تمنا کی اور نہ بڑے سے بڑے خطرے اور سخت سے سخت سزاؤں سے ڈرے یہاں تک کہ جب ان کی وفات ہو گئی، تو دنیا نے دیکھا کہ مودودی کسی شخص، کسی ادارے، بلکہ کسی جماعت کا نام نہیں ہے، ایک ہمہ گیر عالمی اور آفاقی تحریک، ایک بڑھتی ہوئی قوت اور روئے زمین کے ہر خطے میں پھیلتے ہونے کا اثر کا نام ہے اور عصرِ حاضر میں انسانی نشاۃ ثانیہ کے تیزی سے رائج ہوتے ہوئے سکے پر اس نام کی مہر لگی ہوئی ہے جو اس سکے کے لئے سب سے بڑی سند ہے۔

مولانا مودودی کو اپنے تصورات کے تجربے کے لئے کوئی ملک نہیں ملا۔ کوئی قوم ان کے پیغام کو لے کر کھڑی نہیں ہوگی کسی حکومت کے اختیارات و وسائل ان کے نظریے کی خدمت میں نہیں گئے۔ خود وہ کسی منصب اقتدار پر فائز نہیں ہوئے۔ لیکن آج ہر ملک میں ان کے تصورات نفوذ کر چکے ہیں۔ ہر قوم پر ان کے پیغام کا اثر پڑا ہے، ہر حکومت ان کے نظریے پر توجہ دینے کے لئے مجبور ہے۔ اور اقتدار کا ہر منصب ان کے تصورات، پیغام اور نظریے کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے لرزہ براندام ہے یا پھر اس کے لئے آغوشِ قبولیت وا کئے ہوئے ہیں۔

یہ حقیقتِ حال واضح کرتی ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا کارنامہ عصرِ حاضر میں دنیا کے دوسرے تمام مفکرین، مدبرین اور قائدین سے بڑا، بہت بڑا ہے۔ انھوں نے ایک پورے دور کے غالب رجحانِ فکر اور طرزِ حیات کو چیلنج کر کے ان کی معاشرے میں عالمی سطح پر ایک بنیادی اور ہمہ گیر انقلاب کی دعوت خالص اسلامی نصب العین کے تحت دی۔ اور نصف صدی کی فکری و عملی جد و جہد کے بعد دنیا کے ایک بڑے حصے میں کم از کم حالات رخ بدل دیا اور آج ایشیا افریقہ، یورپ اور امریکہ ہر جگہ ایسے ذہین اور فعال لوگوں کے حلقے پیدا ہو گئے ہیں جو مولانا مودودی کی روشن کی ہوئی راہ پر چل کر انسانیت کے قافلے کو ارتقاء کی صحیح اور بلند ترین منزل تک لے جانے کے لئے کمربستہ اور کوشاں ہیں، عصرِ حاضر نے کئی انقلاب دیکھے ہیں مگر وہ سب کے سب جزوی علاقائی یا وقتی قسم کے تھے، ان کی بنیاد کمزور اور رخ غلط تھا۔ لیکن دنیا اب جو انقلاب دیکھنے والی ہے اور جس کے آثار طلوعِ سحر کی طرح نمایاں ہیں وہ ایک کلی، آفاقی اور پائیدار انقلاب ہوگا مستحکم بنیاد پر اور صحیح رخ پر۔ یہ وہ عظیم الشان انقلاب ہوگا۔ تاریخِ انسانی کا آخری انقلاب جو ارتقائے حیات کو اس کی انتہائی منزل تک پہنچا دے گا۔ اس انقلاب کے نتیجے میں روئے زمین پر انسان کی خلافت کا مقصد مکمل ہو جائے گا لہٰذا الشاعر

ازل سے اپنے سپرد کی ہوئی امانت خداوندی کا حق ادا کر کے آخرت کی ابدی زندگی کی طرف قدم بڑھائے گا، یہی وہ معراج انسانیت ہوگی جس کی طرف اشارہ خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں معراج کے عدیم النظیر واقعہ سے کیا جا چکا ہے، یہ عالمی، آفاقی، کلی اور قطعی انقلاب دنیا کے تمام فلسفوں، نظریوں، مذہبوں اور نظاموں پر شریعت محمدی کی آخری فتح ہوگی اور بندوں کے ساتھ خدا کا یہ وعدہ پورا ہوگا۔

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (القرآن)

"اللہ نے اپنے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ہدایت نامہ اور دینِ حق دے کر دنیا میں اس لئے بھیجا ہے کہ اپنے دین کو دوسرے تمام طریقوں پر غالب کر دے۔"

یہ اسلامی انقلاب اور اس کے نتیجے میں انسانیت کی نشاۃ ثانیہ بالکل اسی نقشے پر بروئے عمل آئے گی، جس کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں عصرِ حاضر کے سامنے پیش کرنے کا شرف اللہ تعالےٰ نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو عطا کیا اس عظیم انسان کا نامے کے پیش نظر پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا مودودی عصرِ حاضر کا سب سے بڑا دماغ ہے انھوں نے دوسرے تمام دماغوں سے بڑھ کر ایک ایسا مثبت، ہمہ جہت، تعمیری اور موثر عصرِ حاضر میں انسانیت کی تجدید اور صالح ارتقاء کے لئے پیش کیا، جس کا سرچشمہ رب العالمین کا کلام اور رحمت للعالمین کی سنت ہے۔ یہ درحقیقت اسلامی ذہن اور دینی فکر و نظر کی فوقیت ہے جس کا نقش مولانا مودودی کی تحریروں اور اقدامات نے جریدۂ عالم پر ثبت کر دیا ہے۔ آج یہ دماغ، عصرِ حاضر کا بہترین دماغ اسلام کا عظیم ترین ذہن جسمانی طور پر ہم سے رخصت ہو چکا ہے اور اس کی شخصیت تاریخ کا ایک نمایاں جز بن چکی ہے۔ لیکن اس کا پیغام اور کام ہمارے درمیان ایک امانت، توحید اور رسالت کی امانت کے طور پر ہے۔ وہ امانت جو ہمارے سینوں میں موجود تو ہمیشہ رہی ہے مگر اسے زندہ و تازہ کیا۔ مولانا مودودی کے حکیمانہ و مجاہدانہ لٹریچر اور عمل نے اس امانت کا حق ادا کرنا اور مولانا مودودی کے چھوڑے ہوئے کام کو پورا کرنا ایک دینی و ملی فریضہ ہے جو ہم پر اس خدا تعالیٰ اور رسول کی طرف سے عائد ہوتا ہے جس کی وحدانیت و رسالت پر ہم ایمان لائے ہیں اور جس کے دین و شریعت کے ایک وفادار اور کارگزار خادم کی حیثیت سے مولانا مودودی نے عصرِ حاضر کی تاریخ میں وہ اعلیٰ مقام حاصل کیا ہے جس کی کوئی نظیر دورِ جدید میں نہیں پائی جاتی۔ وقت کے اس عظیم ترین مفسر، محدث، فقیہ، سیرت نگار، مفکر، مدبر، مجاہد اور قائد کو ہمارا بہترین خراجِ عقیدت یہی ہو سکتا ہے کہ ہم اس کے مشن کی تکمیل میں دل و جان سے اپنی تمام ذہنی و جسمانی قوتوں کے ساتھ لگ جائیں اور مستقبل میں اسلامی انقلاب اور انسانی نشاۃ ثانیہ کو بروئے کار لانے کے لئے اپنے تمام وسائل داؤ پر لگا دیں۔

اس کی نفرت بھی عمیق، اس کی محبت بھی عمیق
قہر بھی اس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق
پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں
ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق
انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اس کو
شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق
مثلِ خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں،
بات میں سادہ و آزادہ معانی میں دقیق
اس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق

(مردِ بزرگ، ضربِ کلیم)

بقیہ: فن تنقید :

جارج واٹسن نے تنقید کی اہمیت کو بڑی عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے لکھا ہے "بے شک تنقید جھوٹ بولنے کو بند نہیں کر سکتی مگر یہ اس بات پر نظر رکھنا اپنا فرض سمجھتی ہے کہ جھوٹ سچائی کی حیثیت سے اپنا وجود نہ منوا لے"

مکرمی جناب ...... شبنم سبحانی صاحب

- اسلام علیکم ... پچھلے دنوں "نئی نسلیں" کا اگست کا شمارہ نظر سے گزرا۔

"اپنی باتیں" پڑھا ایسا لگا خود میرے سینے میں گھٹے ہوئے الفاظ دتوں سے دبے ہوئے جذبات کو نطق مل گیا۔ بہت ڈھارس بندھی بہت ہمت ملی۔ کہ چلو ابھی قلم بالکل ہی مر نہیں گئی ہے خون بالکل ہی جم نہیں گیا ہے سبھی ذہن بکے نہیں ہیں۔ سبھی صلاحیتیں گروی نہیں ہیں۔ تعریف میں میں یہ نہیں کہوں گا۔ آپ نے نئی راہ بنادی ہے۔ نئی منزلیں متعین کردی ہیں۔ البتہ حقیقت کے اعتراف کے لئے یہ ضرور کہوں گا۔ کہ آپ نے وہ مشعل دکھائی ہے جس سے دور تک راہ روشن ہوگئی ہے اب تخلیقی ذہن صحیح راہ پر دور تک جاسکیں گے۔ دور تک ...... دعا ہے کہ خدا آپ کے قلم کو استقامت، جلال دعلام سب کچھ دے دے عامر عثمانی صاحب مرحوم کے بعد پھر یہ احساس ہوا کہ "نہیں ابھی قلم کے دھنی موجود ہیں"۔

خواجہ غلام السیدین۔ ناگپور

★

تازہ شمارہ توقع کے مطابق خوب داد وصول کررہا ہے کتابت، طباعت اور مواد گزشتہ شماروں سے کہیں زیادہ وقیع ہے۔ تزئین اور حسن کاری کے لحاظ سے دیکھا جائے تو واقعی آپ کی کوششیں اور محنتیں رنگ لارہی ہیں۔ "نئی دنیا کی کھوج میں" اور "اردو افسانہ میں تعمیری رجحانات" ہی اس جریدہ کا اصل معیار قرار پاسکتے ہیں۔ امید ہے کہ رسالہ کا رنگ مزید نکھرے گا۔ (رمضان سعید۔ مالیر کوٹلہ)

رسالہ برابر مل رہا ہے۔ اس میں خوشگوار تبدیلیوں کا بھی احساس ہو رہا ہے۔ خدا کرے آپ حضرات کی کوششیں اسے بہتر اور مقبول بنا سکیں۔

امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

پروفیسر عتیق احمد صدیقی
علی گڑھ

★

برادر عزیز و محترم!

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ حضرات "نئی نسلیں" کا ایک خصوصی نمبر شائع کر رہے ہیں۔ خدا کرے اس نیک مقصد میں کامیابی ہو اور اردو ادب کے ذہین اور ہوشمند قارئین کو اس کے ذریعے سے بہت سا صاف ستھرا شعری و ادبی مواد مجموعی طور سے ایک جگہ پڑھنے کو مل جائے۔

(فضا ابن فیضی۔ مئو ناتھ بھنجن)

★

محبی عزیز صاحب، ہدیۂ سلام مسنون،

ماہ نومبر کا شمارہ ملا،

اور اب دسمبر کے شمارے کا انتظار ہے

رسالہ دیکھ کر خوشی ہوئی "نئی نسلیں" کے اجراء کے ساتھ جو توقعات وابستہ کی گئیں تھیں۔ وہ بڑی حد تک پوری ہو رہی ہیں، شبنم سبحانی صاحب کا اداریہ اپنی جرأت اظہار اور بیباک حق گوئی کی بنا پر لائق تحسین ہے دوسرے مضامین بھی معیاری اور رسالے کے موقف سے ہم آہنگ ہیں، افسانوی حصہ بھی جاذب توجہ ہے ہاں حصۂ نظم مزید توجہ چاہتا ہے۔ کتابت بہت ناقص اور طباعت خراب ہے۔ اس طرف خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتابت میں غلطیوں کی

کے صحیح کی جانب قرار واقعی توجہ نہیں دی جاتی۔ یہ کمیاں رسالے کے معنوی حسن پر نظرانداز ہوتی ہیں رسالے کے سلسلے میں یہ رائے آپ کے لئے ہے طباعت کے لئے نہیں۔ بعض غزلیں دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی حفیظ میرٹھی پر تعارفی شذرہ اچھا ہے۔ لیکن تشنہ ہے۔

اظہر کمالی۔ سکندر آباد

★

برادر عزیز۔ سلام و رحمت

ان دنوں زیادہ تر وقت دورے پر صرف ہو رہا ہے لکھنا مشکل ہے، پھر بھی سعی کروں گا کہ گاہے گاہے کچھ لکھوں، میرا شہر مخالفوں کا شہر ہے۔ بعض نوازوں نے سب کچھ برباد کر دیا علمی و دعوتی کاموں کی راہ مسدود ہے مگر اپنی سی سعی جاری ہے۔ کوثر یزدانی صاحب، احقر ایم۔ اے صاحب اور ناظم لبنوی صاحب سے بھی کچھ مواد حاصل کیجئے۔ اصغر علی عابدی صاحب سے بھی لکھوائیے۔ عبدالباری ایم۔ اے الہ آبادی ثم موسی بنی بہاری کی بعض تحقیقات شائع کیجئے نمائندہ نئی نسلیں کی ترتیب و تزئین پر مزید دھیان دیجئے

محمد ارتضاء الدین۔ سہسرام (بہار)

★

عزیز بھائی ــــ ۔۔ تحیہ و سلام
دسمبر کا شمارہ نظر نواز ہوا۔

بدیدار تو دل شاد ند باہم دوستان تو
تاہم شادماں خواہم چو روئے دوستاں بینی

موجودہ شمارہ کا انداز کافی حد تک رو بہ ترقی ہے مضامین بھی صحت مند اور شائستہ ہیں اگر یہی جذبہ اور ناقدانہ خلوص کے نوک قلم سے ادب و تہذیبی اقدار کی تزئین کرتے تو بجا طور پر غیر مرئی انداز میں رسل و رسائل کے ہنگاموں میں بھی "نئی نسلیں" اونچے مقام پر فائز نظر آنے لگے گا۔

ماتہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

کل تک جو ادیب اور دانشور ادب میں اسلامی افکار اور مذہبی برتری کی معنر زشی سمجھتے تھے اور جنکی تمام تر کاوشیں اور صلاحیتیں اسی کے لئے وقف تھیں۔ ان کے افکار و تصورات کی دیواریں متزلزل ہیں ان کی تحریروں میں بھی وابستہ یا ناوابستہ طریقے سے اسلامی افکار و اقدار کی جھلکیاں نظر آنے لگی ہیں۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ باطل نظریات اور غیر فطری تصورات کی اجارہ داری ختم ہو گئی ہے

ہے انتہائے یاس بھی اک ابتدائے شوق
پھر آگئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم

"حقائق پوش عینک ساز کمپنی" کامیاب جائزہ ہونے کے ساتھ ساتھ فریب خوردہ ذہنوں کے لئے پیام عبرت بھی ہے۔ نقمی صاحب "شہر آشوب" عمدہ نظم ہے ــــ "اردو افسانے میں تعمیری رجحانات" ایسے مضامین کی ضرورت بھی ہے جو ہمیں صحیح اور غلط راستوں کے انتخاب میں مدد دے اور یہ بتائے کہ کہاں زر خالص ملتا ہے اور کہاں ملمع سازی کا کاروبار ہوتا ہے۔

نئی نسلیں "جن قدروں کا علمبردار اور جن افکار کا آئینہ دار ہے اس کے بالمقابل ایک دنیائے گوناگوں پھیلی ہوئی ہے خوب و ناخوب دونوں حالات اس کے لئے چشم براہ ہیں تمام مادی حمائل و ذرائع اس کے خلاف صف آرا ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ قوت تسخیر بھی اس کے ہاتھوں میں ہے جس کے لمس سے آہن زر میں تبدیل ہو جاتا ہے

ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے
بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تخت جم و کے

دست بدعا ہوں

ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

امید ہے بخیر ہوں گے۔ م رحمن صدیقی

صدیقی منزل بلائی پور۔ گورکھپور

★

مکرمی۔ سلام و رحمت

آج بہت دنوں کے بعد آپ سے مخاطب ہونے کا موقع مل رہا ہے۔

نومبر کا تازہ شمارہ ملا۔ بلاشبہ معیاری ادب کا فی اضافہ ہوا ہے، تمام مضامین نظم و نثر پسند آئے۔ اچھا ٹھہریئے شروع سے چلتے ہیں۔ مراد آباد کے ساحر پرشبنم صاحب کی باتیں بڑی کھری ہیں جس کے اندر ایک درد، کسک اور ٹھیس ہے۔ اور انداز میں کچھ تیکھا پن بھی۔ یہ جذبات بڑے قیمتی ہیں اور دانشوران قوم کے لئے یہ ایک لمحہ فکریہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ شبنم صاحب سے ایک بات عرض کرنی ہے کہ وہ اداریہ کے اس ادبی صفحہ کو صرف سیاسی موضوعات کے اظہار کا ذریعہ نہ بنائیں بلکہ کبھی کبھی ادبی مسائل پر بھی اپنے خیالات سے ہم طالبان ادب کی رہنمائی فرمائیں۔

اس بار مقالات کا حصہ تعداد کے لحاظ سے بہت کم ہے۔ اس جانب ڈاکٹر عبدالمغنی، ڈاکٹر ابن فرید اور ڈاکٹر احمد سجاد صاحبان کو متوجہ کرتے رہئے۔ م۔ نسیم کا سفرنامہ اس شمارے کی جان ہے۔ نسیم صاحب کی نگاہیں واقعات کے جزئیات پر خوب پڑتی ہے۔ جیسے ان کا قلم اپنی گرفت میں لے کر بڑی خوبصورتی سے ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے کاش نئی نسلیں کے اس دوسرے جنم میں ہی ان کی آدھی کتاب مکمل ہو جاتی۔ حصہ نظم جاندار و شاندار ہے۔ رضا لقوی واہی کے نظم خاص طور سے پسند آئی۔ مجھے امید ہے کہ ان کا تعاون ملتا رہے گا۔

شخصیات کے تحت حفیظ میرٹھی کا مختصر تعارف آپ نے شائع کر دیا ہے مگر ہمارے اس مضمون کا جس میں حفیظ کی شاعری کا بھرپور فنی تجزیہ کیا گیا ہے۔ مجھے پتہ نہیں۔ اب بھی توقع ہے۔ اسے شائع کر دیجئے تاکہ سوز صاحب کے مقالے کی تکمیل ہو سکے۔ افسانوی حصہ ہمیشہ کی طرح کمزور اور کم تعداد ہے، کاش صالح افکار کے حامل جدید افسانہ نگاروں کا تعاون آپ کو حاصل ہو جاتا۔ فکر و خیال کے تحت ایک صفحہ کا "رفیک حور بخت" "کچھ عجیب سا لگا۔ خوب و ناخوب میں خوب کے ساتھ ناخوب بھی آنا چاہئیے۔ ظفر حبیب کی اس رائے سے میں متفق ہوں، نقد و نظر میں فنکار سے فن تک کا جائزہ محض سرسری ہے۔ موضوع کا حق ادا نہیں ہو سکا ہے۔ یہ کتاب جس اعلیٰ انعام کی حامل ہے اس کا تعین بہتر طریقے سے ہونا چاہئیے تھا۔ پرچہ کی کتابت بہت ناقص ہوئی ہے حضرت کاتب نے اچھے اچھے مضامین کا حلیہ بگاڑ دیا ہے اس جانب خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے

(شاہ رشاد عثمانی۔ گیا)

★

محترمی ....

خلوص بیکراں!

امید کرتا ہوں کہ آپ بخیر ہوں گے۔ کلی طور پر "نئی نسلیں" کا تعارف برادر شاہ رشاد عثمانی نے کرایا۔ اور ساتھ ہی تخلیق بھیجنے کے لئے ہمیں انھوں نے تیار کیا۔ اس لئے میں پہلی دفعہ ماہنامہ "نئی نسلیں" کی بزم میں ایک افسانہ بعنوان "ضمیر کے آنسو" لئے حاضر ہوا ہوں۔ میں امید کرتا ہوں کہ "نئی نسلیں" کے معیار پر یہ افسانہ پورا اترے گا۔

میں ہمیشہ تخلیقات کی بہتری کا اندازہ مدیر کے ذوق انتخاب کے اعتبار سے لگاتا ہوں۔ انتخاب ادبی معیار کا ہے تب پرچہ ماہنامہ ہو یا سالنامہ ارفع و اعلیٰ تخلیقات پر مشتمل ہوگا۔

ماہنامہ "نئی نسلیں" پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے ان تھک محنت اور سچی لگن کے ساتھ ساتھ اپنی تمام تر توجہ اور ساری قوتیں اور صلاحیتیں یکجا کر کے اس کے ہر صفحہ پر ثبت کر دی ہیں۔ کسی بھی کہنہ مشق مدیر کی مشاقانہ کاوشیں بھی اس سے بہتر اور معیاری رسالہ نہیں نکال سکتی ہیں۔

یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوتی ہے کہ آپ لوگ ایسے مشکل ترین دور میں بھی ادب کی سرپرستی میں منہمک ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو اپنے ارادوں میں کامیابی عطا کرے اپنی اس جرأت رندانہ کے لئے آپ مبارکباد اور ستائش کے مستحق ہیں اور آپ کے ادارے کا ہر فرد لائق ستائش و مبارکباد ہے۔!

رسالہ کو جستہ جستہ ہنوز دیکھ سکا ہوں۔ جو کچھ اب تک نظر سے گذرا وہ یقیناً اطمینان بخش مواد ہے۔ یہی خیال رکھئے کہ معیار نہ گھٹنے پائے بلکہ روز بروز رفعتیں شامل ہوتی رہیں۔

احسان تابش (پرتاپ گڑھ)

★

برادرِ مکرم

تسلیم بہ صد تعظیم!

"نئی نسلیں" کا اکتوبر و نومبر کا مشترکہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ جریدہ دیکھ کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔ واقعی آپ نے خالص ادبی مواد پیش کر کے ہم شیدائیانِ اردو کے دل جیت لئے ہیں۔ مبتدی شعرا کے ساتھ اردو کے جانے پہچانے اور کہنہ مشق حضرات کو یکجا شائع کر کے یہ بات واضح کر دی ہے کہ آپ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کیا لکھا گیا ہے بہ نسبت اس کے کہ کس نے لکھا ہے اور ہونا بھی یہی چاہئیے آپ کی یہ روش مجھے بے حد پسند آئی۔ بندہ دعا گو ہے کہ پروردگار آپ کو توفیق عطا فرمائے کہ آپ اپنی اس روش پر گامزن رہیں اور منزلِ مقصود تک رسائی حاصل کر سکیں۔ آمین۔ ثم آمین

(آزاد گورداسپوری)

محترمی ......

جناب ابوالمجاہد زاہد صاحب!

.. سلام مسنون

آپ کا رسالہ "نئی نسلیں" مجھے پابندی سے مل رہا ہے حقیقت یہ ہے کہ نئی نسلوں کے لئے یہ رسالہ ایک صحت مند پیغام ہے۔ اس دور میں جب کہ اخلاقی قدروں کی شکست و ریخت ہو رہی ہے ان حالات میں پیغامِ حق ہی سب سے بڑا تعمیری قدم ہے۔ خدا آپ کو اپنے مقصد میں کامیاب کرے مجھے شرمندگی ہے کہ ذاتی مکروہات کی وجہ سے اس قلمی محفل میں شریک نہ ہو سکا اب ایک مضمون روانہ کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ اس کو کسی قریبی اشاعت میں جگہ دیں گے۔

نیازمند

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی۔

"قرآن کے اسلوبِ بیان میں تصویر کشی ایک بہترین ذریعہ افہام ہے۔ یہ کسی ذہنی خیال، نفسیاتی کیفیت، محسوس واقعہ اور آنکھوں کے سامنے کے منظر، نیز انسانی نمونے اور بشری طبیعت کی سیار صورت میں بہترین عکاسی کرتی ہے۔ پھر یہ تصویر کشی پردۂ ذہن پر مرتسم خیالی صورت کو مزید ترقی دے کر محسوس اور مجسم زندگی عطا کرتی ہے یا نئی حرکت بخشتی ہے۔ تب یہ ذہنی خیال ایک ایک ہیئت یا حرکت کی شکل اور نفسیاتی حالت ایک سیج پردے یا منظر کی حیثیت اور کا لبد انسانی ایک زندہ جاوید ہستی اور طبیعت انسانی ایک مرئی جسم کی صورت اختیار کر لیتی ہے مختلف حادثات اور واقعات اور مختلف کیفیات و مناظر شخصی صورت میں آنکھوں کے سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔ ان میں زندگی بھی ہوتی ہے اور حرکت بھی۔ جب گرد و پیش کے ماحول میں انہیں دیکھا جاتا تو عالمِ تخیل کے جملہ پہلو ان میں موجود نظر آتے ہیں۔ جوں ہی ایک حالت کے بعد دوسری حالت طاری ہوتی ہے سامعینِ کلام ناظرین کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ حادثات کے اس پہلے اسٹیج پر جا پہنچتے ہیں جہاں وہ واقع ہو چکے ہوتے ہیں یا واقع ہونے والے ہوتے ہیں۔ اجسام متحرکتے اور منظر کے بعد منظر آنکھوں کے سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔ اور سامع یہ تک بھول جاتا ہے کہ وہ کوئی کلام پڑھ رہا ہے یا تمثیل بیان کر

(باقی صہ ۶۳ پر)

نقد و تبصرہ

آئینۂ سکندر

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$
ضخامت : ۱۹۲ صفحات ،
قیمت ۱۰/-
علاوہ محصول ڈاک ،
نام مصنف :
فخر تغزل ، حضرت قمر مرادآبادی
ملنے کا پتہ : تاج بن قمر ، قاضی ٹولہ مرادآباد

آئینۂ سکندر ، شہنشاہِ تغزل حضرت جگر مرادآبادی کے حالاتِ زندگی ، رندی و سرمستی ، شاعر و شخصیت ، خلوت و جلوت پر مبنی ایک جامع اور مستند سوانح کی حیثیت رکھتی ہے ۔ کتاب میں جگر کے ان تمام پہلوؤں اور تاریک گوشوں کی عقدہ کشائی کی گئی ہے جو عوام و خواص کی نگاہوں سے اوجھل تھے یا گھناؤنے اور مسخ شدہ کردار کی حیثیت سے اب سے پہلے پیش کئے گئے ہیں ۔ حضرت قمر نے موصوف پر یہ کتاب لکھ کر جہاں حق رفاقت و دوستی ادا کیا ہے وہیں ان سے وابستہ افواہوں کی بالتفصیل تردید بھی کی ہے جو جگر صاحب سے منسوب تھیں ۔

بیشتر لوگوں کے خیال کے مطابق جگر کو حضرت اصغر گونڈوی کا شاگرد سمجھا گیا لیکن قمر صاحب نے مدلل انداز میں ان کے مراسم کی وضاحت کی ہے کہ " جگر حضرت اصغر کا ان کی بزرگی کی وجہ سے حد درجہ احترام کرتے تھے جن کے سبب لوگوں نے ان کو استاذ و شاگرد قیاس کیا حالانکہ ان کے تعلقات دوستی اور قابلِ ذکر دوستی کے زمرے میں آتے ہیں "

قمر مرادآبادی حضرت جگر مرادآبادی مرحوم کی زندگی میں عزیز رفیق کی صورت میں رہے ہیں ۔ انہوں نے خلوت و جلوت کی مصروفیتوں و مشاعروں میں ان کی ہمہ گیر مقبولیت اور پہلو دار شخصیت پر بے کامنہ انداز میں اپنی فن کارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے اور جگر صاحب کو بحیثیت شاعر

بقیہ : ان کی باتوں میں

رہا ہے بلکہ وہ یہ خیال کرتے لگتا ہے کہ یہ کوئی منظر ہے جو آنکھوں کے سامنے پیش آ رہا ہے ۔ یا کوئی واقعہ ہے جو وقوع پذیر ہو رہا ہے ۔ گویا یہ متشخص و مجسم وجود ہیں جن پر شام گذرتی ہے اور صبح طلوع ہوتی ہے ۔ فی الحقیقت نفسیاتی حالتوں میں اثر پذیری انفعالیت کی یہ وہ مختلف علامات ہیں جو دہل کے مقام اور مشاہدے سے پیدا ہوتی اور حادثات کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں ۔ یہ وہ کلمات ہیں جن سے زبانیں حرکت کرتی ہیں ، وہ الفاظ ہیں جو پوشیدہ احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں ۔ یہاں بھی اصل زندگی مراد ہے نہ کہ زندگی کی حکایت ! یہ پہلو خصوصاً قصص آنی کے بہ نظر عمیق مطالعہ کے لئے نہایت ضروری ہے ۔

از سید قطب شہید
" التصویر الفنی فی القرآن "

اور بحیثیت ایک "فرد" دونوں اعتبار سے قابلِ تعظیم اور قابلِ ستائش کردار کے روپ میں پیش کیا ہے
قمر صاحب خود شاعر اور خاص طور کلاسیکی طرز کے منفرد غزل گو ہیں ان کے تین مجموعہ کلام
(۱) ماہ تمام
(۲) شعورِ غم
(۳) اور کلیاتِ قمر کافی مقبول ہوئے۔ اس کے علاوہ نثر میں انہوں نے معراجِ داغ، روحِ اصغر اور آئینۂ سکندری تین قابلِ قدر تصنیفات کی ہیں جن میں "آئینۂ سکندر" بلا شبہ پہلی دو نثری تصنیفات کے مقابلے میں افضل ہے جس کو پڑھنا اربابِ ادب اور اہلِ ذوق حضرات کے لئے انتہائی اہم ہے نیز "آئینۂ سکندر" جگر اور قمر صاحب کی رفاقت اور دیرینہ مراسم پر مبنی اردو ادب میں ایک بے بہا تحفہ کی حیثیت رکھتی ہے۔
(ظفر مراد آبادی)

عکسِ غیور

مرتبہ: رئیس رشیدی
سائز: ۲۰×۳۰ / ۸
صفحات ۹۶
قیمت صرف ۳ روپے

جسے پیا چاہے وہی سہاگن ہے لیکن پیا بھی تو کچھ پرکھ کر، چھان کر، پھٹک کر، سوچ و سمجھ کر ہی چاہے گا اور سہاگن کے درجے کے قابل سمجھے گا۔ "عکسِ غیور" ایک ایسی ہی سہاگن کی بجز نمائیوں کا آئینہ دار ہے۔ جس میں مختلف لکھنے والوں نے اپنے اندازِ فکر اور اندازِ تحریر سے جناب غیور حسن صاحب کی علمی، ادبی شخصیت کو سہاگن کے روپ میں پیش کیا ہے۔

عہدِ حاضر میں مخلص ادبی نقد نگاروں کا قحط ہے اور مصلحت پسندی نے اوّل درجے کے ادیبوں کو کم اہم کو اعلیٰ سطح پر فائز کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کی! ایسے دور میں "عکس غیور" اندھیرے میں چراغ کی طرح ہمارے سامنے آتی ہے۔ بلاشبہ غیور صاحب کی شخصیت اس سے بھی زیادہ تعریف و توصیف کی مستحق ہے۔ اس کتاب میں شامل مضامین میں جہاں نوجوان ادیبوں کی اپنی پرکھ اور تجزے موجود ہیں وہیں۔ بزرگ اور معتمد حضرات نے بھی اپنے بصیرت افروز مضامین میں غیور صاحب کی شخصیت کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ کسی ادبی شخصیت کا احاطہ کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

جناب حکیم کلب علی صاحب کا یہ جملہ — "غیور کی آپ بیتی، میر کی آپ بیتی سے کہیں زیادہ پرسوز پر غوغا ہے لیکن غیور رنج و آلام کی چٹانوں سے گزرتے ہوئے ہوئے نغمہ خواں بن گئے ہیں" ایک مکمل تعارف کی حیثیت رکھتا ہے اور اسی مضمون سے ماخوذ یہ جملہ "غیور نے ہر پیکر کے ظروف احوال کو اپنے مخصوص اور معتبر چاک پر ایسی چابکدستی اور تر دماغی سے اتارا ہے کہ کسی ظرف کی دھاک کو کسی کیفیت و حال کے الجاد و عناصر کو آنچ نہیں آسکی ہر پیکر کی تصویر تنومند و توانا ہے" ان کی ادب نگاری پر ایک جامع اور مرصع تصویر کی مانند ہے اس کے علاوہ خود مرتب جناب رئیس رشیدی کے مضمون کا یہ پیرہ "ان کا طرزِ تحریر نرالا ہے۔ اس میں سلاست ہے روانی ہے ان کے یہاں آمد ہی آمد ہے وہ خاکہ لکھیں یا خطوط یا طنزیہ مضامین، ان کی شوخی و ظرافت کے تیر ہر محاذ پر چلتے نظر آتے ہیں۔" غیور صاحب کے فن کی عکاسی کرتا ہے۔ عکسِ غیور میں دیگر تمام مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں جن میں غیور صاحب کی ادبی شخصیت تیکھی، دھیمی، پکار۔ اور کہیں سادہ انداز میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔

(ظفر مراد آبادی)

Numainda **NAI NASLEN, Monthly**
2448, Ballimaran, Delhi-110006

**Registered with Registrar of
Newspapers No. (N) 360
Regd. No. D (D) 910**

تعمیری ادب کا نمائندہ

دھلی

دوسرا سال دوسرا شمارہ

مارچ، اپریل، مئی، جون۔ سنہ ۱۹۸۱ء

ترتیب

ابن فرید
انجم نعیم

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر

م۔ نسیم
۲۴۴۸، بارہ دری شیر افگن
بلیماران، دہلی ۱۱۰۰۰۶

رابطہ: شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

بارہ شمارے: تیس روپیے   ایک شمارہ: تین روپیے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اپنی باتیں

اردو زبان کو بہت سے مسائل درپیش ہیں۔ جس قدر اس کی جان کو جنجال ہیں، اس سے کسی نوعیت سے کم مصائب کا سامنا اس زبان کے ادب کو نہیں کرنا پڑ رہا ہے۔ کچھ تو یہ زبان "سیاسی یرغمال" بنی ہوئی ہے، اور کچھ دوست نما دشمنوں کا تختۂ مشق بنی ہوئی ہے۔ اس کی وضاحت اگر کی جائے تو بہت سے سیاسی مسائل زیرِ بحث آ جائیں گے۔ اس لئے اس موضوع پر غور کرنے اور فکرمند ہونے کا کرب ہم ماہرینِ سیاست کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ اور روئے تخاطب "ہام (ہم) اردو والے" کی طرف موڑ دیتے ہیں۔

اردو کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ گذشتہ تیس سالوں میں یہ ان لوگوں کی بے اعتنائی کا شکار رہی ہے جو اردو کو اپنی مادری زبان کہنے پر مجبور تھے لیکن پشیمان بھی! چنانچہ ان کی باصلاحیت اولادیں دوسرے مضامین کی طرف متوجہ ہوئیں، کیوں کہ روزی کے امکانات انھیں سے وابستہ تصور کئے جاتے تھے۔ البتہ جو نوجوان زندگی میں کچھ نہیں کر سکتے تھے وہ اردو پڑھنے لگتے تھے۔ اردو اساتذہ کو بھی اردو طلبہ کی شدید ضرورت تھی کیوں کہ ان کے فقدان کے بعد ان کے شعبوں کے بند ہو جانے کا خطرہ ان کے ذہنوں پر کابوس بن کر چھایا ہوا تھا۔ چنانچہ جانے کیا کیا جتن کر کے اور کون کون سے وعدے وعید کر کے یہ "ہام (ہم) اردو والے" کو دلوں کو گھیر گھار کر لاتے تھے اور اپنے درجات کی چند کرسیاں آراستہ کر لیتے تھے۔ اردو کے ان بے حوصلگی کی اس نوعیت کی جد و جہد کرنے والے، اردو کے مستقبل سے نہیں، اپنی بے روزگاری سے خائف تھے۔ اب جب کہ ان کی کوششیں بار آور ہوئی ہیں تو وہ لوگ جو خود کو خادمانِ اردو کہتے ہیں، دراصل ملازمانِ شعبہ جات اردو ہیں۔ ان کی سب سے بڑی بے بسی یہ ہے کہ یہ اردو میں کوئی کارِ نمایاں انجام نہیں دے سکے ہیں۔ اور نہ اپنے وقت کا صحیح استعمال کر سکے ہیں۔ ان کی ساری جد و جہد ملازمانہ نوعیت کی ہوتی ہے۔ آپس کی ریشہ دوانیاں، گروہ بندیاں، سازشی کارروائیاں ان کی اہم ترین مصروفیات ہیں۔ ادب میں اپنا اعتراف کرانے کے لئے یہ جو جواز پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ صدر شعبہ ہیں اور اتنا اونچا عہدہ منشی کھیل میں نہیں مل جایا کرتا۔ آپ ان کی اس دلیل کو مان لیجئے کہ ملازمت میں اس کے سوا چارہ کیا ہے۔ لیکن خدا کے لئے اگلا سوال نہ کیجئے، یعنی یہ نہ پوچھئے کہ "آپ کی ادبی خدمات؟" کیوں کہ سوال کا جواب عتاب کی شکل میں ملتا ہے۔ کسی نے بہت درگذر سے کام لیا تو اپنے غضب کو ضبط کرتے ہوئے اتنا کہہ دیا "مجھے یہ عہدہ عطا کرنے والے کور چشم تو نہ تھے!"۔ خیر ہمیں ان نکات کی باریکیوں میں جانے کی کیا ضرورت۔

یہ ملازمانِ اردو، بالعموم، اپنے اختیارات کو استعمال کرنے میں بڑے مستعد ہوتے ہیں۔ ان کی نظر اس پہلو پر نہیں ہوتی کہ ادب سے کس کو دلچسپی ہے، کون سنجیدگی کے ساتھ اسے اپنا وقت دیتا ہے۔ کس نے اپنی صلاحیتوں کو اس کی خدمت کے لئے صرف کیا ہے۔ ان کے پیشِ نظر تو صرف یہ امور ہوتے ہیں کہ کون ادب کے بجائے ان کی حمایت کرتا ہے، کون ان کی ہے سر دیا قصیدہ خوانی کرتا ہے، کون انھیں ادب کا کوہِ گراں قرار دیتا ہے، اور کون بے صلاحیت حامیوں کے مقابلے میں باصلاحیت اہلِ نظر کو نظر انداز کرتا ہے۔

گویا یہ ادب میں ملازمانِ ادب کی گٹ بندیاں ہیں، جو اردو کو پسِ پشت ڈال کر اپنے ذاتی اور شخصی مفادات کے لئے کی جا رہی ہیں۔

ان ملازمانِ ادب کی ایک سازش یہ بھی ہے کہ بظاہر یہ ساز بھی بن گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ یمنی بن بیٹھے ہیں تو کچھ یساری ہو گئے ہیں۔ کسی کا رخ زرد ملوکیت کی طرف ہے تو کوئی سرخ طبقہ واریت کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ کسی کے لئے ادب بذاتِ خود منزل مقصود ہے تو کسی کے لئے ادب طبقاتی کشمکش کو ہوا دینے کا وسیلہ ہے۔

اے محترم ملازمانِ اردو! جب اصل اہمیت خود آپ کی اپنی ہے تو پھر ادب کیسے بذاتِ خود منزل مقصود بن گیا؟ اور یہ بھی! ــــ کہ آپ خود جب THESIS ہیں تو ANTITHESIS کی علم برداری کا جواز آپ کو کیسے نصیب ہو سکے گا؟

ان یمینیوں اور یساریوں کی ایک بدتوفیقی تو یہ ہے کہ انھیں خود اپنے نقطۂ نظر کے بارے میں پوری طرح واقفیت نہیں ہے۔ شعبہ جات اردو سے غیر متعلق حضرات انھیں جتنا مواد اردو زبان میں فراہم کر دیتے ہیں وہی ان کا ماخذ ہوتا ہے۔ اس سے آگے کی رسائی ان پر لازم و ملزوم نہیں۔

ہمیں اس صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد سوچنا ہوگا کہ اردو ادب کو اس کے اپنے اندرونی فاسد مادے سے کیسے بچایا جائے۔ اور ان کے لاعلمی کے نظریاتی موقفوں کی اصلیت کو کیوں کر فاش کیا جائے۔

اس صدی کے اختتام پر اردو کے لئے یہ سب سے اہم مسئلہ ہے جس پر ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔

ابھی کل ہی ترقی اردو بیورو کا سہ ماہی خبرنامہ "اردو دنیا" بابت جنوری تا مارچ ۱۹۸۱ء موصول ہوا۔ ورق گردانی کرتے کرتے آخری ورق پر پہنچا تو یہ خبر نظر سے گزری کہ شمس الرحمٰن فاروقی ترقی اردو بیورو سے اپنے اصل محکمہ ڈاک و تار میں واپس چلے گئے ہیں اور ان کی جگہ پہ کے کھلر صاحب ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو ہو گئے ہیں۔ یہ خبر غیر متوقع نہ تھی۔ البتہ تکلیف دہ ضرور ہے۔ کھلر صاحب خواہ کتنے ہی باصلاحیت ہوں لیکن اردو دنیا کے لئے تو وارد بھی نہیں ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ وہ اردو کے باصلاحیت اہل قلم سے یکسر ناواقف بھی ہوں گے۔ انجام کار نوکر شاہی کے چکر میں پڑ جائیں گے اور یہاں بھی ملازمانِ اردو کی بن آئے گی۔ شمس الرحمٰن فاروقی کو جو ترقی اپنے محکمہ میں مل رہی ہے وہ بیورو میں بھی دی جا سکتی تھی۔ کھلر صاحب کسی نوعیت سے ان کا بدل نہ بن سکیں گے۔ اور ایک بار پھر بیورو سیاسی سفید ہاتھی کی طرح جھومتا نظر آئے گا۔

مجھے شمس الرحمٰن فاروقی سے ادب کے معاملہ میں بیسیوں اختلافات ہیں، لیکن اس موقف کے ساتھ ساتھ میں اس امر کا بہر حال معترف ہوں کہ ان کے اندر ادب کے لئے لگن ہے۔ جو امتیاز کے خوگر کتنے ہی "نام آوروں" میں نہیں! کاش ان کی صلاحیتوں سے کام لیا جاتا نہ کہ ان کی جگہ ایک ڈپٹی سکریٹری سے پر کر دی جاتی۔

ہمیں اس دفتری کارروائی سے رنج بھی ہوا اور تکلیف بھی!

(ا۔ ف)

تمام ادارتی اور انتظامی امور کے سلسلہ میں علی گڑھ کے پتہ پر رابطہ قائم کریں۔
(منیجر)

ابن فرید

اردو نثر اور اس کا تعمیری نصب العین

اردو نثر جب سے ضبط تحریر میں آئی ہے اس وقت سے اب تک اس کا غالب سرمایہ تبلیغ اسلام یا فروغ دین اسلام سے متعلق رہا ہے، چنانچہ اولین ترین کتاب جسے اردو نثر کی ابتدا سے منسوب کیا جاتا ہے وہ بھی تبلیغ دین کے موضوع پر ہی ہے جسے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی تصنیف قرار دیا جاتا ہے اس کے بعد کے دور کی نثر کا بھی اگر ہم مطالعہ کریں تو اس نوعیت کے اور بھی بہت سے نمونے ہمیں دستیاب ہو جائیں گے۔ مثلاً صوفیائے کرام اور بزرگان دین کے ملفوظات اس کے بعد اسلام کے بنیادی موضوعات پر مستقل تصنیفات اور اسی سلسلہ میں فارسی تفاسیر اور اردو تفاسیر کا سلسلہ وغیرہ۔

ابتدائی زمانے کی اردو نثر کے نمونے جب بھی پیش کئے جاتے ہیں تو تفاسیر کو خاص اہمیت دی جاتی ہے اور ان کے لفظ زیر لفظ ترجمہ کو ایک منفرد لسانی مقام دیا جاتا ہے کیوں کہ اس زمانے میں جب بھی قرآن حکیم کا ترجمہ کیا جاتا تھا تو صحت متن کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر لفظ کے نیچے اس لفظ کا ہی ترجمہ کیا جاتا تھا۔ اور اس بات پر زور نہیں دیا جاتا تھا کہ جملہ مربوط اور رواں بن رہا ہے بلکہ توجہ اس طرف ہوتی تھی کہ قرآن کریم میں جو لفظ استعمال ہوا ہے اس کے صحیح ترین اور متعین ترین معنی ادا ہوں۔ چناں چہ اگر آپ مولانا حامد حسن قادری مرحوم کی "داستان تاریخ اردو" (حصہ نثر) کا مطالعہ کریں تو آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ نثر کے جو ابتدائی نمونے انھوں نے پیش کئے ہیں وہ شاہ عبد القادر، شاہ عبد العزیز اور مولانا عبد الحق دہلوی وغیرہ کی تفسیر دیباچے ہیں جن کو انھوں نے اردو نثر کے اٹھارویں صدی کے نمونے قرار دیا ہے۔

انیسویں صدی میں وہ نثر جسے علی گڑھ تحریک سے منسوب کیا جاتا ہے، یا جسے سر سید کی نثر کے تصور سے منسوب کیا جاتا ہے، وہ نثر بھی بنیادی طور پر دین اسلام کے فروغ کے لئے عالم وجود میں آئی ہے۔ مثلاً خود سر سید کی تفسیر قرآن جس نے اردو نثر کے لئے علم الکلام کے در وا کر دیئے۔ سر سید ہی کی ایک اور معرکتہ الآرا تصنیف جس کو ضبط تحریر میں لانے کے لئے انھوں نے اپنا سارا اثاثہ فروخت کر دینے کی ہدایت اپنے گھر والوں کو کی، تاکہ وہ ان مغربی مفکرین اور مستشرقین کو مسکت جواب دے سکیں جنھوں نے مغرب میں اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف گمراہی غلط بیانی اور کذب و افترا کا ایک طوفان کھڑا کر رکھا تھا چنانچہ اس تصنیف یعنی "خطبات احمدیہ" کا اگر آپ مطالعہ کریں تو آپ یقینی طور پر محسوس کریں گے کہ اس کی نثر ان کی مشہور کتاب "آثار الصنادید"

(جوان کے ابتدائی دور کی تصنیف ہے) کی نثر سے کہیں زیادہ رواں توانا اور اثرانگیز ہے۔ اس میں جو فطری بہاؤ اور جذبہ کی تہذیب ہے وہ اردو نثر کو سرسید کے بعد صرف چند ہی لوگ عطا کر سکے ہیں۔ ان کے خطبات سے یا ان خطبات کے مختلف مقامات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، جو صحت مندی کی علامت ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انیسویں صدی میں اردو نثر کی معیاری اور اعلیٰ ترین کتاب "خطبات احمدیہ" ہی ہے۔ اس موقع پر ایک اور امر کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ میر امن کے ترجمہ "قصہ چہار درویش" کو عموماً ہم لوگ صرف قصے کی حیثیت سے پڑھتے ہیں اور اسے محض داستان کی حیثیت سے اہمیت دیتے ہیں۔ لیکن آپ کو حیرت ہوگی کہ گارساں دتاسی کہتا ہے کہ میر امن بہت ہی کٹر قسم کا متعصب مسلمان تھا۔ اور اس نے "باغ و بہار" کے ذریعہ اسلام کی بہت ہی پرزور تبلیغ کی ہے۔ یہ بیان کہاں تک حقیقت پر مبنی ہے، اس کا فیصلہ اہل علم کریں گے، لیکن اس رائے کی اہمیت اس نوعیت سے ضرور ہے کہ گارساں دتاسی نے اپنی عصبیت کو عریاں کرنے کے ساتھ اردو نثر میں اسلامی سرمایۂ ادب کی کمیت کو بھی واضح کر دیا ہے۔

بہرحال اردو نثر میں ابتدا سے ہی اسلام سے متعلق جو سرمایہ جمع ہوتا رہا ہے وہ ناقابل فراموش ہے اور اتنے بڑے سرمایہ کو فراموش کر دینا ممکن نہیں ہو سکتا اردو ان زبانوں میں سے ہے جس کے بارے میں بلا تردید یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں اسلام سے متعلق جس قدر سرمایہ فراہم کیا گیا ہے اتنا بڑا سرمایہ کسی اور زبان میں، حد یہ ہے کہ عربی اور فارسی زبان میں بھی نہیں ہے۔ یہ اس زبان کو استعمال کرنے والوں کے رجحان کی واضح نشاندہی ہے۔

اس تمہید کی روشنی میں اردو نثر کے بارے میں پورے اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے تشکیلی دور سے ہی اس کے سامنے ایک تعمیری نصب العین رہا ہے اور اس نے ہر دور میں بڑے وسیع پیمانے پر تعمیری خدمات انجام دی ہیں۔

نثری اور تعمیری نصب العین سے میرا مقصد یہ ہے کہ تحریر خواہ کسی بھی نوعیت کی ہو، اور اس سے چاہے ہمیں نظریاتی اختلاف یا اتفاق ہو اس میں ایک نصب العین بہرحال اور بہر صورت مستور ہوتا ہے۔ وہ لوگ جن کی تحریروں کے سلسلے میں ہمیشہ بہت زیادہ ناک بھوں چڑھائی جاتی رہی ہے، ان میں سے چند جن کے میں نام لیتا ہوں مثلاً ڈی ایچ لارنس سعادت حسن منٹو، انور سجاد اور اسی طرح کے دوسرے حضرات، جنھوں نے بعض مسائل کو اس طرح لیا ہے کہ ہمیں بنیادی طور پر یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے منفی پہلوؤں پر شدت سے زیادہ زور دے رہے ہیں۔ اسی طرح افتخار جالب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ نثر میں جس انداز کی تحریریں وہ عام طور سے پیش کرتے ہیں، ان کا بنیادی محرک ذہن کو الجھا دینا یا پراگندہ کر دینا ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک مقصد ہے، ایک منزل ہے یا ایک نصب العین ہے جو ان کے پیش نظر ہے۔ اس تخریب، تنقید یا نفی کے بعد وہ جو کچھ تعمیر کرنا چاہتے ہیں یا زندگی کا کیا خاکہ ان کے سامنے ہے مجھے اس سے بحث نہیں، کن مسائل کو وہ اہمیت دیتے ہیں، مجھے اس سے بھی واسطہ نہیں، لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ بگاڑ کر کچھ بنانے کی خواہش، کچھ توڑ کر پھر کچھ جوڑنے کی آرزو ان کی تعمیر کی خواہش اور ان کی تعمیر کی آرزو سے وابستہ ہے۔

اردو نثر میں خاص طور سے یہ کوشش کسی نہ کسی تعمیر کے لئے ہی کی گئی ہے۔ جیسا کہ میں اس سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں خواہ وہ تبلیغ دین کے لئے ہو یا صوفیائے کرام کے ملفوظات ہوں، یا بعض متعین مقاصد ہوں، جیسے سرسید کی تحریروں کا مقصد یا حالی اور شبلی کی تحریروں کا مقصد، یا سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل کی تحریروں کا مقصد، یا دیوبند کے علماء کی تحریروں کا مقصد (مغربی کلیسائیت کے سیلاب کے خلاف پشتہ بندی کی جد و جہد) ان سب کے پیش نظر ایک واضح تعمیر بھی ہے۔ اور زندگی کی تعمیر کے لئے انھوں نے کچھ مثبت پہلو اپنے لئے متعین کئے ہیں، جنھیں انھوں نے ہمیشہ اہمیت دی ہے اور ان پر اپنی فکر و نظر کو مرکوز رکھا ہے۔ اس لحاظ سے نثر

کا نصب العین ہمیشہ تعمیری رہا ہے ۔

اس تعمیری نصب العین کو اگر ہم سامنے رکھیں اور ایسے بعد ان خدمات پر غور کریں جن کو ہم تعمیری خدمات قرار دیتے ہیں تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہم نے زندگی کو جس طرح جانا یا پہچانا ہے ۔ اور زندگی جس شکل میں ہمارے سامنے آئی ہے، اس کے بعد اس کو جس طریقے سے ہم نے اسے اپنا کر اپنے عمل کا ایک جزو بنایا ہے وہ ہم سے مطالبہ کرتی ہے کہ ہم اپنی ادبی تحریروں میں اس کا اظہار کریں ۔ اور وہ اظہار جس کے لئے میں ہمیشہ اصرار کرتا رہا ہوں، اپنے طور پر نہیں بلکہ جدید ترین تقاضوں کے تحت، وہ صرف EXP-RESSION نہیں ہے بلکہ ایک نوعیت سے MANIFESTA-TION بھی ہے ۔ جہاں ہمارے اپنے ذہنی و فکری سانچے، ہمارے جذباتی اور حسی ادراکات یا تجربات ہمیں اس بات پر آمادہ کرتے ہیں کہ ہم اس طرح بولیں، اس طرح کہیں، اور اس طرح دوسروں کے سامنے اپنے ما فی الضمیر کو پیش کریں ۔ گویا ہماری عملی یا حقیقی زندگی کا مظاہرہ (Manifestation) وہ ہماری تحریروں سے بھی ہو ۔ یہ سیاسی DIRECTIVE نہیں بلکہ فطری عمل ہے ۔ ہم نہ بھی چاہیں تب بھی یہ اظہار یا مظاہرہ اسی نوعیت سے ہوتا ہے کہ جس نوعیت سے وہ ہماری شخصیت کی پہنائیوں میں نمو پذیر ہوتا رہا ہے ۔

ہماری زندگی کے ہم سے کچھ اقداری اور جمالیاتی مطالبات ہوتے ہیں جن کا بنیادی تعلق اس نظام حیات سے ہوتا ہے جسے ہم نے روایتی طور پر یا شعوری طور پر اختیار کر رکھا ہے ۔ ان مطالبات کے تحت کوئی بھی صورت گر، فنکار، صناع یا (بہت ہی عام اصطلاح میں) کوئی بھی مالی جب اپنے چمن کو سجاتا ہے، اس کو سنوارتا ہے تو اس میں ایک خاص ادا پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ یہ ادا اس طرح پیدا نہیں ہوتی کہ اس کی زندگی میں جو کچھ ہے اسے اسی طرح پیش کر دے ۔ بہر حال زندگی کو من و عن پیش کر دینا بھی تو ضرور ہے لیکن ایسا ہی ہے جیسے بے ترتیب بے ہنگم انداز میں ہمارے سامنے آجائے ۔ جب بھی کسی پودے کو خوبصورت بنانے یا کسی چمن کو سنوارنے، کسی تصویر کو مکمل کرنے یا کسی نظم کو آخری شکل دینے کی سعی کی جائے گی تو اس عمل کے لئے تراش خراش کرنی ہی پڑے گی ۔ اور یہ تراش خراش ہم اپنی زندگی میں بھی کرتے ہیں ۔ فطرت نے ہمیں جس طرح پیدا کیا ہے اس کے لئے ہمیں ردگاری (CHANNELISATION) کا ایک عمل (PROCESS) بھی دیا ہے اور اس عمل کے تحت ہم صرف ان چیزوں کو اختیار کرتے اور قبول کرتے ہیں جو اپنی مثبت حیثیت رکھتی ہیں اور اسی مثبت حیثیت کی بنیاد پر وہ اقدار بنتی ہیں ۔ چنانچہ نثر کی تعمیری خدمات اگر کچھ ہو سکتی ہیں تو وہ تنظیم و تہذیب، وہ حسن کاری و تزئین ہو سکتی ہے جس سے آراستہ ہوکر اگر کوئی تخلیق ہمارے سامنے آئے تو ہم واقعتاً اسے ادب پارہ قرار دے سکیں ۔ روزانہ آپ کے سامنے بہت سے شاعروں کے نام آتے ہیں، میں ایک ایسے شاعر کا نام لیتا ہوں جس کے بارے میں کبھی بات کی جاتی ہے تو بہت ہی عقیدتمندانہ انداز میں یا پھر اس کا مقام منوانے کے سلسلے میں، میرا اشارہ میر انیس کی طرف ہے ۔ میر انیس کو بڑی کثرت کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اور ایک بڑی اکثریت انھیں میرزا دبیر سے بہتر شاعر قرار دیتی ہے ۔ کیا وہ عقیدت، وہ خود سپردگی، وہ جذباتی تعلق جو میر انیس کے یہاں تھا، میرزا دبیر کے یہاں نہیں تھا؟ پھر کیوں ہم میر انیس سے اس طرح متاثر ہوتے ہیں جس طرح میرزا دبیر سے نہیں ہوتے؟ بلکہ میں یہ کہنے کی بھی جرأت کروں گا کہ میرزا دبیر دماغ کے شاعر ہیں اور میر انیس اس پورے فرد کے شاعر ہیں جو اس کے باطن سے لے کر اس کے ذہن تک اور اس کی سوچ سے لے کر اس کی زبان تک اپنے وجود میں شامل کئے ہوئے ہے ۔ آپ مرثیوں کو نظر انداز کر دیجئے (حالانکہ یہ میر انیس کے بہت بڑے عطایا ہیں) ان کی رباعیاں لے لیجئے ۔ انھوں نے ان رباعیوں میں ان حقیقتوں کو پیش کیا ہے اور ان مسائل کا احاطہ کیا ہے جو نہ صرف سچائیاں ہیں بلکہ ایسی اقدار بھی ہیں جو بالاتفاق اسلامی اقدار ہیں ۔ ان میں انھوں نے جو انداز بیان اختیار کیا ہے وہ سب اس ذہن و فکر کے لئے وسیلہ بن جاتا ہے جو ان کے باطن میں رچ بس گیا ہے اور جس کو انھوں نے سوز گداز سے پیش کیا ہے ۔ یہی وہ خدمت ہے جو انھوں نے اردو شاعری کے لئے انجام دی ہے یہی خدمت حالی نے اپنے مقدمہ شعر و شاعری

بقیہ صہ ۲۵ پر

انور صدیقی

ادب میں انحطاط کا مفہوم

اس مضمون کو پڑھتے ہوئے اٹھارہ سال پہلے کے ادبی منظر نامہ کو ذہن میں تازہ کر لیجئے۔ ا۔ف

تلازمۂ خیال کے اعتبار سے لفظ انحطاط میں وہ معنویت نہیں ہے جو انگریزی لفظ DECADENCE میں ہے DECADENCE کا لفظ استعمال کرتے ہی ہمارے ذہنوں میں BAUDLAIRE، رامبو، زولا اور ورلین کے ادبی اور شعری اکتسابات اور ان کی زندگیاں اپنی پوری شدت کے ساتھ آسکتی ہیں۔ دراصل ادب میں انحطاط یا ادب میں صحت مندی تہذیب کی صحت مندی یا انحطاط کی جانب اشارے کرتی ہے کسی ایسی تہذیب میں جس کی تخلیق صحت مند اقدار حیات پر ہوئی ہو ہمیں بیماری کے بجائے صحت اور انتشار کے بجائے نظم و ضبط کی کارفرمائی نظر آئے گی۔ دراصل انحطاط پسندی کا رجحان جو فرانس اور انگلستان میں ابھرا اور پھیلا، وہ مغربی تہذیب کے قریب المرگ ہونے کی ایک بشارت تھا۔ اس رجحان میں ایک طرح کا طنز بھی تھا لیکن اس طنز کو سمجھنے والے بہت تھوڑے تھے۔ انحطاط پسند ادبا اور شعرا اپنے جلتے ہوئے احساس کے ذریعہ سماج اور تہذیب پر ایک طنز کر رہے تھے لیکن اس طنز کی شدت کو پھر جیسی سختی رکھنے والی تہذیب نہیں محسوس کر سکتی تھی۔ قبل اس کے کہ ہم ادب میں انحطاط پسندی کے رجحانات کا تاریخی تجزیہ کریں بہتر ہوگا کہ ہم موجودہ اردو شاعری کی نراجی تہہ کی طرف اشارے کر دیں۔ اس سے بات بخوبی واضح ہو جائے گی کہ ہم آج کیوں ادا رہے کو انحطاط پسند کہنے میں ایک فخر سا محسوس کر رہے ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد اردو شعرا و ادب کے سامنے کوئی آدرش نہ رہ گیا۔ اگر کچھ آدرش ابھرے بھی تو وہ ہمارے ادیبوں کو شدت کے ساتھ متاثر نہ کر سکے کہ ان کی بنیاد پر کوئی تخلیقی کارنامہ انجام دیا جا سکتا۔

بالخصوص پاکستان میں شروع ہی سے ایک طرح کی نراجی کیفیت نمایاں ہو گئی۔ اس نراجیت کی انتہا وہاں بہت پہلے ہو چکی تھی۔ اس کے اماموں میں ن۔م۔ راشد اور میرا جی تھے جو بار بار اپنی تحریروں میں مشرق کی خواہش مرگ (DEATH WISH) کا اظہار کر چکے تھے۔ اور اس بات کا بھی اعلان کر چکے تھے کہ وہ تمام اقدار مر چکی ہیں یا نزع کے عالم میں ہیں جن کی بنیاد پر ایک اعلیٰ ادب کی تخلیق کی جا سکے۔ میرا جی کو اپنی تہذیبی وراثت کا راشد کے مقابلے میں زیادہ گہرا افسوس تھا۔ مگر یہ احساس کسی نظم و ضبط اور کسی توازن و اعتدال سے عاری تھا۔ قدیم ہندوستانی تہذیب میں انھیں غدود کی افزائش اور ہیجان کے سوا کچھ نہ ملا۔ وہ اس بات کو فراموش کر گئے کہ قدیم ہندوستانی تہذیب میں جنسی جذبہ مقصود بالذات نہ تھا بلکہ اس کے تخلیقی ارتقاء پر بھی زور دیا جاتا تھا۔ ایک دوسری ذہنی گمراہی جس میں وہ مبتلا ہو گئے وہ فرانسیسی انحطاط پسندوں کی کورانہ تقلید تھی یہ تقلید انھوں نے شاعری میں بھی روا رکھی اور زندگی میں بھی۔ زندگی میں زیادہ اور شاعری میں کم۔ انھیں کسی نے یہ بتا دیا کہ والیس اس وجہ سے اچھی شاعری کر گیا کہ وہ سوزاک میں مبتلا تھا۔ چنانچہ انھوں نے دہلی کے ان تمام ارباب نشاط سے ملاقاتیں کیں جن میں انھیں اس مرض کے جراثیم کے موجود ہونے کا شبہ تھا۔ بالآخران کی یہ مراد پوری ہوئی مگر وہ اس درجہ کی شاعری نہ کر سکے

جس درجہ کی شاعری والین نے کی تھی، وہ صرف ایک مرض میں
مبتلا ہو گئے اور مبتلا ہونے کے بعد شعر کہنے سے زیادہ اس کے
علاج کی فکر کرنے لگے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی زندگی
میں ایسے ایسے وہ تمام جنسی تجربات کئے جن میں فرانسیسی شعرا
مبتلا رہ چکے تھے۔ ایسے شعرا کے ادبی ورثا تقسیم کے بعد پاکستان
میں کافی نظر آنے لگے۔ پاکستان کی جدید شاعری بڑی حد تک
میراجی اور ان کی نسل کی مبالغہ آمیز شکل ہے۔ وہاں یہ صورت اس
وجہ سے اور بھی پیدا ہوئی کہ ملک کی تقسیم تہذیبی بنیادوں پر نہیں
بلکہ سیاسی بنیادوں پر ہوئی تھی۔ وہاں کے ادیبوں کو وہ جذباتی
سہارے (SPIRITUAL MEANINGS) نہ مل سکے
جو انھیں اپنی روایات سے ہم رشتہ رکھتے، چنانچہ انھوں نے
فرانس اور امریکہ کی طرف دیکھنا شروع کیا جس کے نتیجہ میں
نہ صرف ان کا ملک بلکہ ان کا شعر و ادب بھی امریکہ کی ایک
کالونی بن گیا۔ وہاں کی تقلید ہندوستان میں بھی شروع ہو گئی،
اگرچہ یہاں کے ادبا کا تہذیبی شعور اور روایت سے ان کا
رشتہ نسبتاً گہرا تھا۔ یہاں کی نئی شعری روایت جسے روایت
سے زیادہ فیشن کہنا مناسب ہوگا، نتیجہ تھی ان چند ذہنوں کا
جنھوں نے دوسروں کو ستر پوشی دیکھ کر اپنی عریانی میں ایک طرح
کی مہم آزمائی اور انفرادیت دیکھی۔ ہندوستانی تہذیب اور اس کے
ورثہ پر آزادی کے بعد کچھ اس غیر فطری انداز سے زور دیا گیا کہ
ادیبوں کے ذہن میں اس کی طرف سے شک و شبہ پیدا ہونے لگا۔
نتیجہ کے طور پر ہمارے ادیبوں ہندوستان میں بیٹھ کر نیو یارک
اور پیرس کے انسانوں کی تباہیوں کو نظم کرنا شروع کر دیا۔
انھیں غالباً اس بات کا علم نہ ہو سکا کہ ہندوستان کا
انسان ابھی اتنا تنہا نہیں ہو پایا ہے کہ وہ AUDEN کی
طرح یہ لکھ سکے کہ:-

WE ARE AFRAID OF PAIN, WE
ARE AFRAID OF SILENCE

HARRIET MONROE کی EZRA POUND یا
کو یہ لکھ سکے کہ:-

WE ARE THE TERRIFYING VOICE

OF CIVILIZATION.

ہندوستان کے ادیب اس بات کو فراموش کر گئے کہ ہندوستان
میں ابھی نئی دنیا کے ساتھ ساتھ پرانی دنیا بھی بڑی تیزی کے ساتھ
سانس لے رہی ہے۔ یہاں تنہائی کے احساس کو جن شعرا نے
فیشن بنایا وہ خود اپنے ساتھ اور اپنی تہذیب کے ساتھ جھوٹ
بول رہے ہیں۔ اس کے علاوہ تنہائی کا رومانی احساس جو مغربی
رومانیت پسندوں اور ہمارے یہاں اقبال کی بعض نظموں
بالخصوص ان کی فارسی نظم "تنہائی" میں پایا جاتا ہے، موجودہ
دور کی امریکی اور انگریزی شعرا کے احساس تنہائی سے بہت
مختلف ہے۔ اقبال کی یا دوسرے بعض بڑے رومانی شعرا کی
تنہائی اپنی معنویت، گہرائی اور تخلیقی امکانات کے اعتبار سے
زیادہ اہم ہے اور وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ انسان
کے اندر اپنے گرد و پیش اور تہذیبی بندھنوں سے ماورا
اور مافوق ہو جانے کی صلاحیت زیادہ ہے۔ مگر آج کے
شعرا کی تنہائی اپنے اندر کسی قسم کے تخلیقی امکانات نہیں
رکھتی اور ہر لحاظ سے بنجر ہے۔

غالباً اس حقیقت سے انکار ہماری نادانی ہوگی کہ ہم بڑی
تیزی کے ساتھ ان تہذیبی اقدار کو اپناتے چلے جا رہے ہیں
جن کو اپنا کر مغربی تہذیب اس مرحلہ پر پہنچی ہے جہاں انسان
کابوس زدہ ہو کر کہتا ہے :-

WE ARE THE HEAPS OF BROKEN
IMAGES. (WASTELAND, ELIOT)

WE ARE THE HOLLOWMEN,
WE ARE THE STUFFED MEN,
OUR HEADPIECE FILLED WITH STRAW
(HOLLOWMEN: T.S. ELIOT)

ان معروضات کے پیش نظر اب ذرا تاریخی پس منظر میں
DECADENCE کی تحریک کا جائزہ لیجئے، انحطاط پسندی کے
اولین شعری مظاہر ہمیں OSSIAN اور کھنڈرات کی شاعری
میں نظر آتے ہیں۔ جدید زندگی کی روح کو قدیم
انحطاط زدہ ادب کی روح سے ہم آہنگ کیا۔ اس نے

جمالیاتی احساسات کے انحطاط میں ایک طرح کا حسن دیکھا اور
اسے انحطاط کے جذبے کی کارفرمائی ان ادوار میں بھی نظر آئی
جن میں شباب و معصومیت ہم آغوش رہے تھے۔ میکلاہے اور
FRONCIS THOMSON نے جنریوں کے انحطاط میں ایک
طرح کا حسن تلاش کیا۔ تھامسن کی نظم ODE TO THE
SETTING SUN اس نقطۂ نظر احساس کی عکاس ہے۔
ورلین نے سب سے پہلی بار اس لفظ کو تنقیدی اور ادبی اصطلاح
کا رتبہ دیا۔ اسے یہ لفظ صوتی اعتبار سے بے انتہا پسند تھا چنانچہ
وہ لکھتا ہے :-

"مجھے اس لفظ DECADENCE سے شدید محبت ہے
اس لفظ میں ارغوانی اور سنہری چمک ہے۔ یہ لفظ تکمیل یافتہ تہذیب
کے لطیف ترین تصورات بلند ادبی مذاق، اور ایک ایسی روح
کا مظہر ہے جو شدید ترین جذبات مسرت سے لطف اندوز
ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔"

ورلین کے اس جملے میں اس تحریک کے سارے بنیادی
مقاصد کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ یہ تحریک دراصل فطرت
پر فن کو ترجیح دینے کی تحریک تھی، اس تحریک نے زندگی کو
فن کی طرح گزارنے کی اہمیت پر زور دیا۔ زندگی کو فن کی
طرح گزارنے کا مطلب اس تحریک کے علمبرداروں نے
یہ سمجھا اور سمجھایا کہ فن کار شدید ترین مسرتوں کے راستے سے
شدید ترین غموں تک پہنچے، اس اصول نے ان ادیبوں کو
بہت ساری گمراہیوں میں مبتلا کر دیا۔ زندگی کی بعض اہم ذمہ
داریوں سے فرار اختیار کرنے کا رجحان بڑھا۔ چنانچہ اس تحریک
کے علمبردار LESTTE ADAM YILLIERS
کا ہیرو AXEL کہتا ہے "تم زندگی کے وسائل کے بارے
میں باتیں کرتے ہو۔ ہمارے ملازمین یہ سب کچھ ہمارے لئے فراہم
کر دیں گے۔" اس رجحان نے ایک ایسا آرٹ پیدا کیا جس کا
تعلق عام انسانی مسائل سے برائے نام رہ گیا اور نتیجے کے طور پر
فن طبقۂ امراء کی چیز بن گیا۔ مزید براں ان فن کاروں نے
شدید جذبات مسرت کو محسوس کرنے کے عجیب و غریب راستے
دریافت کئے۔ ان ادیبوں نے ان تمام مروجہ اخلاقی معیاروں
کی خلاف ورزی کی جو ان کے جذبات کی آزادانہ تسکین و تکمیل
میں حارج تھے، چنانچہ ان میں سے بہتوں نے ہم جنسی تک
کو اپنی زندگی کا شعار بنایا۔ بیشتر فن کاروں نے ایک خطرناک
قسم کی شراب پینی شروع کر دی جو ABSINTHE کے نام سے
یاد کی جاتی ہے۔ اس تحریک کے علمبرداروں نے ۱۸۸۶ء میں
LE DECADENT نام کا ایک رسالہ جاری کیا جو زیادہ
دنوں تک نہ چل سکا اور اس کی جگہ SYBOLIST نے لی
اس تحریک کے علمبرداروں میں HUYSEUAN اور
D'AMUZIU تھے۔ انگلستان میں OSCAR WILD
کے علاوہ ROMANTIC NMET کے فن کار اس رجحان
کی علمبرداری کرتے ہیں۔ دراصل HAVE LOCKELLIS
اور D'EREND کے نظریات نے جنسی جذبے کو غیر معمولی
اہمیت دے دی تھی، اس وجہ سے ان ادیبوں نے اپنے اندر
جراءت محسوس کی اور ہر اس پُراسرار جذبے کی تسکین کے درپے
ہوئے جسے آج سے پہلے بداخلاقی پر محمول کیا جاتا۔ جنسی مہم
آزمائیوں میں بیشتر ادیب یہ بھول گئے کہ انھیں زندگی کو فن کی
طرح حسین بنانا ہے۔ تم لازم ہیں اپنی زندگی کے ہر مرحلے پر اس
نکتہ کو فراموش نہیں کرنا ہے۔ ●●

[دیکھیں انور صدیقی اب اس مضمون کا اختتامیہ
کس انداز سے لکھتے ہیں۔ (ابن فرید)]

بقیہ : وہ ایک چھوٹی سی بات

کے اندر چھپا کر آسمان کی وسعتوں میں گم ہو گئی۔
نوجوان خالی خالی نظروں سے خلاؤں میں گھور رہا تھا۔
بے بی فاختہ کے حوصلے کو یاد کر کے دادی فاختہ کے لبوں
پر تبسم دوڑ گیا۔
رنگیں پردوں میں وہ اپنی سخت چونچ چھپا کر آنے والی
صبح کا انتظار کرنے لگی۔ ●●

محسن انصاری

شعر و ادب میں بے یقینی

ایک وقت تھا کہ شعراء کا دیوان حمد سے شروع ہوتا تھا پھر وہ وقت آیا کہ خدا کے ذکر سے شرم آنے لگی۔ ان کو بھی جو خدا کے قائل نہ تھے اور ان کو بھی جو خدا کے قائل تھے اس صدی کے تیسرے دہے میں شعر و ادب کے اندر جو ہوا چلی تھی یہ اس کا اثر تھا۔ ترقی پسند ادب کی تحریک کے علمبردار اشتراکی اہل دانش تھے مگر انھوں نے اپنے زمرے میں غیر اشتراکی ادبا و شعراء کو بھی شریک کر لیا تھا۔ پرانے نظام سیاست و معیشت اور مذہبی اخلاق کے نام پر توہم پرستی اور فرسودہ رسوم و رواج سے نئی نسل نامطمئن تھی۔ اس کے خلاف بغاوت کرنے کے لئے اشتراکی ہونا ضروری نہیں تھا۔ اس اظہار بغاوت میں اشتراکی اہل قلم کے آگے دوسروں کا رنگ پھیکا تھا۔ اس ماحول میں خدا اور رسول کا ذکر تو کیا ان پر ایمان رکھنے کا شبہ بھی نہ ہونے دینا فکری آزادی اور ادبی کمال کی دلیل تھا۔ خدا کا ذکر تمسخر کے ساتھ ہی ٹھیک معلوم ہوتا تھا۔ مثلاً ن۔م راشد نے کہا ت اونگھتا رہتا ہے۔ تیرے بیکار خدا کی مانند۔ انکار خدا کے بعد کائنات میں مادہ ہی کی کارفرمائی دیکھی گئی۔

جب کائنات کا کوئی خالق ہی نہیں تو اس عالم کے سوا کوئی دوسرا عالم بھی نہیں۔ اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی بھی نہیں۔ جب ایسا ہے تو موجودہ زندگی کی قیمت کیا؟ اس کا مفہوم کیا؟ مگر پھر ذہن انسانی کے ازلی تجسس اور روح انسانی کی آرزوئے دوام کا کیا کیا جائے؟ مذہب نے تو اس دنیاوی زندگی کے بدلے ایک ابدی زندگی اور حور و قصور کا تصور عطا کیا تھا۔ انکار خدا آدمی کو کیا امید دلاتا؟ یہ سوالات اپنا جواب چاہتے تھے۔ عملی طور پر یہ ہوا کہ مادی زندگی کی اس کی ہر تفصیل کے ساتھ مدحت طرازیاں ہونے لگیں۔ اس نگار ہزار عشوہ کا عشق سب سے بڑی سوغات تھی جو شعر و ادب کی ہر صنف میں بٹنے لگی۔ عالم خارجی نے بڑی اہمیت حاصل کر لی۔ فطرت مادر فطرت کی شفقت و محبت کے گیت گائے جانے لگے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ زندگی خدا کی سب سے بڑی نعمت نہیں اور فطری مناظر جاں پرور نہیں۔ مگر ان سب ترانہ سنجیوں اور مدحت طرازیوں سے یہ بڑا مقصد حاصل کرنا تھا کہ دنیاوی زندگی میں انہماک اس قدر بڑھے کہ آخرت پر ایمان کمزور ہو جائے بلکہ ختم ہو جائے۔ فطرت اور زندگی کی گوناگوں رنگینیوں اور دلچسپیوں میں نظر اس طرح الجھ کر رہ جائے کہ خالق کائنات کی ربوبیت کا تخیل فراموش ہو جائے۔ شعر و ادب میں ہزار طرح سے اس تخیل کا اعادہ کیا گیا۔ یہ زندگی بہت حسین ہے۔ اس کے ان گنت جلوے ہیں۔ یہ زندگی جو مادی ہے فانی ہے۔ یہ کائنات کا سب سے بڑا عجوبہ اور سب سے بڑا راز ہے۔ اسی کے عشق میں سرشار رہو۔ اسی کے گیت گاتے رہو۔ اگر مذہب نے ذات خدا کے ننانوے اسمائے حسنیٰ بتلائے ہیں تو زندگی کے اس سے کم اسمائے حسنیٰ پر کیوں اکتفا کیا جائے؟

یہ حقیقت ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں آدمی نے آدمی پر ظلم روا رکھا ہے۔ ناانصافی ہوئی ہے۔ خون خرابہ ہوا ہے۔ مگر علمی لحاظ سے اس امر میں کبھی شبہ نہیں کیا گیا کہ آدمی ہی کائنات میں سب سے افضل اور اپنے انجام کے لحاظ سے بے مثل

ہے۔ مذہبی احکام کی تمام بندشوں کو قبول کرنے کے بعد بھی انسان کی برتری کا تخیل اپنی جگہ رہا اس لئے کہ شریعت کا بار اٹھانے کا انسان ہی اہل تھا۔ اور شریعت کی تفویض اور انبیاء کی بعثت کا مقصد ہی انسان کو جسمانی اور روحانی طور پر آزاد کرانا اور ان کی بیڑیوں کو کاٹنا تھا۔ صوفیا سبیل معانی کا فیصلہ نہ کر سکے اور انا الحق کا نعرہ لگا دیا۔ اشتراکی فکر میں انسان کی آزادی و عظمت کا تخیل انکار خدا پر قائم ہو کر سرکشی اور بغاوت کا سرچشمہ بنتا ہے ادبیات میں اس رجحان کا پہچاننا کچھ دیدہ وری چاہتا ہے حد کہ ایک مومن اور ایک ملحد کے طرز بیان پر یکساں ہونے کا گمان ہوگا یونانی فکر و فلسفہ میں انسان ہی کے عظیم و قادر ہونے کا تصور کارفرما تھا۔ وہ توحید سے نا آشنا تھے اور ان کا شرک لامحدود تھا ان کے علم الاصنام میں ایک خاص بات یہ دیکھی جا سکتی ہے کہ انسانوں اور دیوتاؤں کی کشمکش میں عموماً انسان ہی کامیاب ہوتا ہے۔ ان کے دیوتا بھی 'بتایا جاتا ہے' کہ یکسر لذت پرست اور خواہشات کے غلام تھے۔ یونانی پیکر محسوس کی موزونیت کے سب سے بڑھ کر شیدائی تھے۔ وہ جسمانی خواہشات کو شدت سے محسوس کرنے والے لوگ تھے۔ چنانچہ اپنی اسی خواہش کو بجھانے کے لئے انھوں نے طرح طرح کے کھیل ایجاد کئے اور فن بت گری کو حد کمال تک پہنچا دیا۔ سب بت پرست قوموں میں یونانی ہی وہ قوم ہے جس کے بت سب سے خوبصورت پائے جاتے ہیں اور اس کے بنائے ہوئے مجسمے اب تک بے مثل ہیں۔ بدن کو موزوں اور خوبصورت بنانے کے لئے یونانی مختلف کھیلوں کو قومی شعار کے طور پر اختیار کئے ہوئے تھے صنمیت یونانیت کا دوسرا نام ہے۔ زمانۂ حاضرہ میں بھی جمال پرستی کے ساتھ بدن اور بدنی خواہشات کا یونانی ذوق و شوق پھر زندہ ہوا۔

رہبانیت یقیناً غلط تھی اور کار دنیا سے بے تعلقی بھی غلط اور خطرناک۔ مگر یہ فکر بھی غلط تھی کہ انسان کا کوئی معبود و مسجود نہیں۔ نہ کچھ خیر ہے نہ شر۔ عیش کوشی اور لذت اندوزی کے علاوہ کوئی مقصد حیات نہیں۔ فرد کا عیش ہو یا جماعت کا۔ صلاح و فلاح ہو یا راحت اور عذاب اس کا حال ہے بس ابھی اور یہاں۔ مارکس نے مذہب کو افیون قرار دے کر اشتراکی کے لئے ایک مستقل فکر و عمل کی راہ متعین کر دی تھی۔ جدلی مادیت پر مبنی مارکسیت کے اندر تصور خدا کی کوئی گنجائش نہیں۔ چند امور کو یادداشت میں تازہ کرتے چلیں۔

مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے بعد انگریزی حکومت کے تحت ہندوستانی قوم ایک سخت روحانی کرب کے عالم سے گذر رہی تھی۔ غدر میں بزرگوں کی کمائی لٹ چکی تھی۔ دنیاوی مال و جاہ بھی نہیں رہا اور علمی اور روحانی تفوق بھی ختم ہوا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد آنکھوں کے سامنے یہ منظر آیا کہ اسلامی خلافت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ انگریزی اقتدار مستحکم سے مستحکم تر ہو گیا ہے اکبر کا طنز اپنی جگہ اور سرسید کا خلوص اپنی جگہ تخلیقی سوتے تقریباً خشک ہو چکے تھے۔ عقائد بے جان، رسوم خرافات اور زندگی کے ولولے سرد، زمانے کے تقاضوں کو سمجھنے اور اپنے حال پر تنقیدی نظر ڈالنے سے گریز تھا۔ شاعری کے موضوعات اپنی اصلیت کھو چکے تھے۔ صرف الفاظ کی جادوگری رہ گئی تھی۔ مگر زندگی ایک ڈھرے پر نہیں چل سکتی۔ انقلاب کی کشمکش ہی میں قومی روح زندہ باقی ہے۔ ہندوستان کی سیاست میں بھی گرمی آ رہی تھی۔ طبقات ایک دوسرے کے قریب آ رہے تھے۔ بیداری کی ایک نئی لہر دوڑ رہی تھی۔ علم میں۔ فکر میں۔ ادب میں۔ شاعری میں۔ صحافت میں اور دوسرے فنون میں۔ اکبر، ظفر علی خاں اور اقبال جیسے سربرآوردہ شعراء نے اردو شاعری کے موضوعات، اسالیب اور امکانات کو بے انتہا وسعت دی۔

ترقی پسند ادب کا ظہور سجاد ظہیر کے انگلستان سے ہندوستان واپس آنے پر ہوا۔ اس تحریک کا منصوبہ انھوں نے اپنے چند ہم خیال دوستوں کے ساتھ مل کر بنایا تھا اور ان کا عزم تھا کہ ہندوستان کی سب ممتاز زبانوں میں یہ تحریک چلائی جائے۔ مگر اردو ہی میں یہ تحریک پروان چڑھی۔ خود تیسرے دہے کے انگلستان میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی نظم "ویسٹ لینڈ" (Waste Land) کے اثرات اب تک زلزلہ آفریں تھے۔ اس کے اندر تہذیب جدید سے شدید بے اطمینانی کے جذبہ سے متاثر ہو کر نوجوان شعراء کے دل میں آگ بھڑک رہی تھی۔ خود ایلیٹ اشتراکی نہ تھا

مگر ویسٹ لینڈ سے متاثر ہو کر کتنے ہی شاعر اشتراکی ہو گئے۔ نوجوان شعراء و ادبا کا ایک متحرک گروپ تھا جو بلومز بری گروپ (BLOMI, BURY GROOP) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس سے ورجینا وولف اور ڈبلیو ایچ آڈین اور اسٹیفن اسپنڈر جیسے لوگ بھی منسلک تھے۔ لندن کے ادبی حلقوں میں کھل کر سیاست، ادب اور دونوں کے اشتراک پر بحثیں ہو رہی تھیں پھر اسپین کی خانہ جنگی کا زمانہ آیا شعراء و ادبا "انٹرنیشنل بریگیڈ" میں شامل ہو ہو کر اسپین میں ریپبلک کی طرف سے لڑنے کے لئے جانے لگے۔ مگر اس حادثۂ فاجعہ نے بہت سے شعراء و ادبا کے لئے ایک موڑ پیدا کر دیا لام پر سے واپس آنے کے بعد کتنے شاعر اور ادیب اشتراکیت سے برگشتہ ہو گئے اور کتنے متشکک ہو گئے۔ مگر نظریاتی شاعری کے ادعا میں جان تھی۔ شاعر اس میں اپنے فن اور مقصد کی روح پکار رہے تھے۔

اردو میں ترقی پسند تحریک کی باگ ڈور اشتراکیوں کے ہاتھ میں تھی مگر یہ تحریک تمام تر انھیں پر موقوف نہیں تھی۔ دوسرے مخلصین بھی اسی کے ساتھ تھے۔ اس کی وجہ تھی کون ہمارے علمی اور دینی زوال سے واقف نہیں تھا؟ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ شاہی اور شاہی نظام کے لوازمات رخصت ہوئے۔ بیداری جمہور کا زمانہ آیا۔ خلافت کا نظام ٹوٹا تو ضرورت لاحق ہوئی کہ دین اور اسکی دعوت کو عوام میں پھیلا کر مقتضیاتِ دین کا شعور زندہ رکھا جائے۔ اور ادب و شعر۔ ان کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ سرسید نے اپنے قلم کے ذریعہ اردو نثر کو سنجیدہ، پر مغز اور جاندار بنایا غالب نے اپنے خطوط سے خلوص اور صداقت کی طرف دلائی اور شاعری؟ کیا یہ ثابت کرنا مشکل تھا کہ وہ تمام تر افسانہ و افسوں پر مشتمل تھی؟ بالخصوص حالی کی اس شدید مذمت کے بعد یہ وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر ——— اس سے بڑھ کر اقبال کو یہ علانیہ کہنے کی جراءت ہوئی کہ

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا

ایوانِ شاعری کی دیواروں سے کاغذی پھولوں کو نوچ ڈالنا اچھا تھا اور قدرتی پھولوں سے در و دیوار کا سجانا بھی اچھا مگر دوسری ہوا بھی چلنے لگی "مادیت" شاعری اور دوسرے فنون لطیفہ کی ایسی صفت قرار پائی جس کے آگے حور و قصور اور کوثر و تسنیم کا ذکر لادینی بلکہ فضول ٹھہرا جہاں یہ پرانی شاعری کا شدید ردعمل تھا وہیں وہ ایک نئے جوش کا اظہار بھی تھا جس کا ماخذ جدلی مادیت تھا۔ مادیت ایک پارس پتھر تھی جس کے لمس سے ادب پاروں میں ایسی روشنی کا مشاہدہ کیا جاتا تھا جس کے آگے ستارے بھی ماند تھے ساری رعنائیاں اور لطافتیں پیکر محسوس کے لئے وقف ہو گئیں، موجودہ لمحۂ زندگانی کے آگے کسی حیاتِ جاودانی کا تصور فضول خیال کیا جانے لگا جوش کس ایک لمحۂ سرمستی میں کہا ہے

ایسے میں مجھے فکر بہشت و کوثر
لاحول ولا قوۃ الا باللہ

خارجیت کا اہتمام شاعری میں معیوب نہیں مگر نئے شاعروں نے اس کا ایسا چرچا کیا کہ داخلیت کو فرد کی ذہنی گھٹن اور سماجی غیر ذمہ داری کی علامت سمجھا جانے لگا۔ سیاسی رجحان کی وہ اہمیت بڑھی کہ غزل اور رباعی کے سارے دفتر کو گل و بلبل کی شاعری کہہ کر دریا برد کرنے کی کوشش کی گئی وہ تو کہیے کہ غزل کا ایسا اسلوب اور امکانات اتنے وسیع تھے کہ وہ باقی رہی بلکہ بہت سے اشتراکی شعراء نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے اسی ہیئت کا استعمال کیا۔ البتہ سمت قبلہ بدلی ہوئی تھی

مری نگاہ میں ہے ارض ماسکو مجروح
وہ سرزمیں کہ ستارے جسے سلام کریں

انسان کے تمام علوم و فنون کی بنا عقل پر ہے۔ عقل ہی کے سبب انسان کو جبر و اختیار کے معاملات میں الجھایا گیا ہے عقل کی اہمیت سے کسی درجہ انکار ممکن نہیں۔ لیکن حقیقت کا ادراک جہاں عقل کے ذریعہ ہوتا ہے اسی طرح وجدان بھی ادراک کا ایک ذریعہ ہے۔ عقل حواس خمسہ کی مدد سے جزو آجزواً حقیقت کا ادراک کرتی ہے اور وجدان میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ ایک دم میں حقیقت کا ادراک کر سکتا ہے۔ مگر عقل سے خاطر خواہ کام نہ لینا اور اپنے آپ کو یکسر وجدان کے حوالے کر دینا

خطرناک ہے۔ زندگی کے خارجی امور میں عقل کی بالادستی مسلم ہے۔ ایک زوال پذیر معاشرہ میں تقلید، خود تنقیدی کے فقدان اور متقدمین کے کارناموں کی پاسداری ہی میں سلامت روی نظر آتی ہے۔ سائنس انسانی عقل سے کام لیتی، اس کو ترقی دیتی اور ذہنی افق کو وسیع کرتی ہے۔ مگر اکثر لوگ سائنس کی روح سے بے خبر ہیں۔ وہ صرف سائنسی انطباقات سے واقف ہیں۔ سائنس کا پہلا کام انکار خدا ہرگز نہیں۔ سائنس تو محسوس مظاہر فطرت کا تحلیل و تجزیہ کرکے ان کے اندر مشترک کارفرما قوانین کی تلاش کرتی ہے۔ اس کے لئے ایسے عالم امکان کا انکار کرنا جو حواس سے ماوراء ہو کیسے درست ہو سکتا ہے۔ ایسا انکار ایک غیر سائنسی فعل ہوگا۔ چنانچہ دنیا کے سائنس داں انکار خدا پر متفق نہیں ہیں۔ خرد شچیف نے اپنے روسی خلاباز کی واپسی پر جو یہ بیان دیا تھا کہ میرے خلاباز کو خلاؤں میں کہیں خدا کا سراغ نہیں ملا تو اس نے محض ایک پرانے واقعہ کی یاد دلائی تھی جب ایک نمرود نے کہا تھا کہ میرے لئے ایک سیڑھی بنوا دو تاکہ اس پر چڑھ کر میں آسمانی خدا کو دیکھ سکوں۔ عقلیت کا ایسا جھوٹا زعم جوش کے یہاں کثرت سے ملتا ہے جو جوش سراسر جاگیردارانہ نظام کی پیداوار اور اس کی مخصوص ذہنیت کی تجسیم ہے۔ اخلاقی بے راہ روی اور الحاد کے سوا دوسری کوئی اشتراکی قدر اسکے کلام میں نہیں ملتی۔ وہ کہتا ہے ؎

عبودیت بھی زیر دام انساں تھی جہاں میں تھا

اس سے زیادہ بکواس یگانہ چنگیزی اور کیفی اعظمی نے کی کہ انھوں نے پیغمبر اسلام کی شان میں بھی گستاخی کی۔ ظ انصاری نے "ورق ورق" میں الحادی خیالات کا اظہار کیا۔ سردار جعفری نے خدا کے رزاق ہونے کے عقیدہ پر یوں پھبتی کسی ؎

روٹیاں آسماں سے اترتی نہیں روٹیاں شاخ طوبیٰ پہ پھلتی نہیں

اس طرح کی شاعری نے ان شاعروں کے فنی گھٹیا پن کا ثبوت دیا ہے

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

کفر و الحاد دنیا میں نئی چیز نہیں۔ قدیم زمانے میں بھی منکرین کا یہ خیال تھا کہ ہم یونہی پیدا ہوتے ہیں اور یونہی مر جاتے ہیں۔ ہماری موت اور حیات زمانے کے ہاتھ میں ہے۔ گویا زمانہ ہی بااختیار ہے۔ بیسویں صدی میں زمانہ کے قادر مطلق ہونے کا تصور پھر جوان ہو گیا ہے۔ تاریخ زمانے کے واقعات کو سمجھنے اور بیان کرنے کا علم ہے۔ جب زمانے کے خالق پر اعتقاد نہ ہو تو واقعات کی تعبیر و تشریح کیسے کی جائے گی۔ کسی علیم و خبیر ہستی کی قدرت کاملہ کا کوئی سوال نہ ہوگا۔ جدلی مادیت کے زیر اثر تاریخی واقعات کے تجزیہ و تعبیر کے لئے نئے انداز ایجاد ہوئے۔ تاریخی ارتقا، تاریخی تقاضا، تاریخ کا فیصلہ اور تاریخی قوت جیسے الفاظ عام ہو گئے۔ قدرت کے رازہائے سربستہ کے ظاہر ہونے کو تاریخی قوتوں کے پردے کا راز کہنے سے تعبیر کیا جانے لگا۔ تاریخ ہی علیم و خبیر، سریع الحساب اور شدید العقاب قرار پائی۔

جس طرح مارکس نے سیاست میں انقلاب پیدا کیا اسی طرح فرائڈ نے فکر و خیال کی دنیا میں انقلاب برپا کیا۔ اس کے علم تحلیل نفسی نے علت و معلول اور محرکات عمل کے نئے ماخذات کی نشاندہی کی۔ اس کے شعور و لاشعور اور OEDEPUS COMPLEX کے نظریات نے وہم و گمان کے ہزاروں دروازے کھول دیئے۔ ظاہر و باطن کے نقشے گڈمڈ ہو گئے۔ کوئی نیت صحیح نہ رہی اور کوئی اعتقاد راسخ نہ رہا۔ تحلیل نفسی نے ارادہ اور اعتقاد کی حقیقت ہی کو مشتبہ کر دیا۔ تمام محرکات عمل لاشعور کے ہاتھ میں آگئے۔ تمام اعمال جنسی خواہشات سے رنگین یا داغ دار ہو گئے۔ جب انسان اپنی مرضی کا مختار نہیں تو اس کے اعمال پر جزا اور سزا کا اطلاق کیسا؟ انسانی اعمال مختلف جبروں کے حوالے کر دیئے گئے۔ تاریخی جبر، معاشی جبر، سیاسی جبر، انفرادی عمل کی ذمہ داری جیسی کوئی چیز نہیں رہ گئی۔ ایک ذمہ دار فرد کا تخیل حرف غلط ٹھہرا۔ ایسے نظریات نے مجموعی طور پر شاعرانہ فکر کو کس طرح متاثر کیا اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں [1]

آتش نے کہا تھا ؎

چشم نامحرم کو برق حسن کر دیتی ہے بند
دامن عصمت ترا آلودگی سے پاک تھا

فیضؔ نے کہا ؎

تو اپنے حسن کی معصومیت کو کم کر دے
گناہ گار نظر کو حجاب آتا ہے

غالب نے کہا تھا:

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

مجاز نے کہا ہے

ترے جلو میں نئی جنتیں نئے دوزخ
نئی جزائیں انوکھے عذاب پیدا کر

جو لوگ اسٹالن کے زمانے کی تاریخ اور اشتراکی ممالک کے حالات سے باخبر ہیں وہ نئی جزاؤں اور انوکھے عذابوں کی حقیقت سے بھی واقف ہوں گے۔

آزادی کے بعد نئے ماحول میں جو سوچنے اور سمجھنے کے نئے مواقع پیدا ہوئے تھے وہ اکثر و بیشتر ضائع کر دیئے گئے۔ سماجی زندگی اور فکر و خیال کی تشکیل نو کرنے میں شاعروں اور ادیبوں نے خاطر خواہ جرأت کا ثبوت نہیں دیا۔ بے یقینی زمانۂ جاہلیت اور زمانۂ وسطیٰ میں بھی پائی جاتی تھی مگر انکار خدا پر مبنی کوئی ہمہ گیر فلسفہ اور نظام جس کی پشت پر ریاست کی طاقت ہو کبھی وجود میں نہ آیا تھا۔ اسی طرح تاریخ عالم میں اسلام ہی وہ دین ہے جو عقیدۂ توحید کی بنیاد پر زندگی کے تمام اداروں کی تشکیل کرتا ہے۔ بے یقینی اردو کے جسد شعر و ادب میں داخل کی گئی ہے وہ ہماری روایت کے تسلسل کو توڑتی اور ہماری تخلیقی توانائی کو غلط سمتوں میں لے جاتی ہے۔ شاعروں کی ایک نئی پود جو اپنے آپ کو جدید کہلاتی ہے ضرور وجود میں آئی مگر اس کے کارنامے بہت محدود۔ اس کی فکر بے جان اور اس کا نظریۂ حیات سخت یاس انگیز ہے۔ ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کا زور اب تک قائم ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے نظریات اتنے سچے اور طاقتور ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کوئی ان کا مزاحم و مقابل نہیں بنا۔ سیل کو سیل ہی تھام سکتا ہے۔ اسلامی ادب جس جامعیت کے ساتھ ابھرنا چاہئے تھا نہیں ابھرا۔ نظریہ کوئی بھی ہو، شاعری کو شاعری اور ادب کو ادب رہنا چاہئے۔ جو صاحب فن اپنے مطالعہ، کاوش باطنی اور تجربات سے شاعری اور ادب کو انھیں کی شکل میں کچھ دے گا اشتراکی ادب کے مقابل اسی کی تخلیق اپنی برتری کی آپ دلیل ہوگی۔ •••

نازش پرتاپ گڑھی

سال ختم ہوگیا

(ایک قومی رہنما کی تقریر)

دوستو اور کوئی کام ہوا یا نہ ہوا
یہ بھی کیا کم ہے کہ اک سال گزار آئے ہم
آپ کے خون دل و جاں کا سہارا لیکر
اپنے چہرے کو ذرا اور نکھار آئے ہم

آپ بھی خوب سمجھتے ہیں ہمارے فن کو
ہم بھی لاعلم نہیں آپ کی رگ ریشے سے
آپ بھی زندہ رہے صدہا فسادات کے بعد
ہم بھی دبلے نہ ہوئے شہر کے اندیشے سے

آپ بھی روز کیا کرتے ہیں شکوے ہم سے
ہم بھی روز اک نئی تقریر پلا دیتے ہیں
آپ کے دم سے سلامت ہے ہماری کرسی
آپ کے جہل و حماقت کو دعا دیتے ہیں

آپ تہمت نہ رکھیں ہم پہ بدل جانے کی
صرف لہجے میں اور آواز میں تبدیلی ہے
کل بھی ہم آپ کے سیوک ہی تھے اور آج بھی ہیں
اک ذرا ملنے کے انداز میں تبدیلی ہے

دست غیب آکے جو کرتا ہے ہماری امداد
آپ ہم سے نہیں قسمت سے شکایت کیجے
خون کیوں ہوگیا دیرینہ رفیقوں کا سفید
آپ اس ٹوپی کی رنگت سے شکایت کیجے

ناخدائی کی نئی رسم نکالی ہم نے
تند تھیں جتنی بھی موجیں وہ سفینوں میں رہیں
دیکھئے کتنی حفاظت سے رکھا قوم کا مال
گولیاں جتنی تھیں انسانوں کے سینوں میں رہیں

جن کے بل بوتوں پہ جیتا ہے الکشن ہم نے
ان جواں مردوں کو کس طرح دبائے رکھئے
لا اینڈ آرڈر ہیں بہرحال بدیشی لعنت
کب تک اس کوڑھ کو ماتھے پہ سجائے رکھئے

جرم جو چاہئے کر لیجے کھلی چھٹی ہے
اور پھر جیل نہ جانا ہو تو ہم سے کہئے!
بے خطا ہو جو کوئی بھی وہ عدالت جائے
کسی قاتل کو بچانا ہو تو ہم سے کہئے!

بینک بیلنس بڑھاتے ہیں تو مطلب یہ ہے
کہ ہمیں قوم کی خدمت کا خیال آتا ہے
دوسرے دیشوں میں کیونکر نہ پڑھاٹ کے ساتھ
سامنے ملک کی عزت کا سوال آتا ہے

آپ ان رشیوں کے بیٹے ہیں جو کھاتے ہی نہ تھے
آپ کو روٹی کا غم ہے؟ جگ میں ہنسائی ہو گی
آپ مرتے ہیں تو بے گور و کفن ہوتے ہیں
یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہو گی!

بات کہنے کی نہیں آپ نہ سمجھیں گے اسے
چشم و ابرو کے اشارات بڑے نازک ہیں
ہاں کبھی ہم بھی تھے سرمایہ پرستی کے خلاف
لیکن اس دور میں حالات بڑے نازک ہیں

کون کہتا ہے کہ شنوائی نہیں ہوتی ہے
آپ جائیں تو زر و مال کی بارش لے کر
نوکری آپ کے بچوں کو بہ آسانی ملے
ڈھونڈھئے ایک منسٹر کی سفارش لے کر

آپ جیلوں میں سڑے آپ نے ڈنڈے کھائے
شکر ہے قوم میں اتنی تو جواں مردی ہے
کیا کہا آپ نے سب کچھ ہوا بے جرم و قصور
یہ اگر سچ ہے تو پھر آپ سے ہمدردی ہے

منزلیں ارتقا کی طے ہوئیں ہفتے بھر میں
کل تھے ہم ملک کے آج اپنے وفادار ہوئے
آپ ہی کہئے یہ ہے قومی ترقی کہ نہیں
ہم سخن فہم تھے۔ غالب کے طرفدار ہوئے

بھک مری کا تو کوئی واقعہ اب تک نہ ہوا
دام اجناس کے بڑھتے ہیں تو ڈرنا کیسا
موت تو وہ ہے جو کر سی کی طلب میں آئے
سرِ دیاں کھا کے جو مرتے ہیں وہ مرنا کیسا

موجِ عشرت کے تھپیڑے ہمیں سہنے دیجے
آپ کمزور ہیں کس طرح سنبھل پائیں گے
ہم نے دکھ جھیلے تھے کل آج مزے کرتے ہیں
آپ بھی صبر کریں آپ بھی پھل پائیں گے

قیمتیں ہوں کہ فسادات ہوں یا زرداری!
بڑھتے رہنا ہے ہر اک شئے کا مقدر لوگو
کل کے بازاروں میں کیا بھاؤ تھے کیا رونق تھی
مڑ کے دیکھو گے تو بن جاؤ گے پتھر لوگو

اک ذرا وقت کی رفتار سے اندیشہ ہے
باقی سب ٹھیک ہے بیمار کا حال اچھا ہے
عین ممکن ہے ہمیں اور بڑا عہدہ ملے!
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

آئینہ کہ بہال دارد
(نئی نسل کے نام)

سیّد احمد شمیم

ہزار ہا گم شدہ صدائیں
خیال کی سرمئی فصیلوں
شکستہ ٹوٹی ہوئی منڈیروں
کر جھکائے ہوئے ستونوں سے سر کو اپنے
ٹپک رہی ہیں

کروڑوں روشن حسین ذرے
کبھی جو دھندلا کے بجھ گئے تھے
چمک اٹھے ہیں
حسین لمحے ملے تو مہتاب بن گئے ہیں

مری کشادہ
تلاش کرتی ہوئی
نگاہوں کے سامنے رقص کر رہی ہیں
جواں امیدوں کے گلستاں کی
جمیل و عشوہ طراز پریاں
جنھیں حقیقت سیاہ چادر
اڑھا کے اک دن نکل گئی تھی

مجھے سلگتے ہوئے خموش صحرا کی جلتی تپتی ہوئی
ہواؤں کے ہاتھ دے کر
چلی گئی تھی
نگاہ دھندلا کے رہ گئی تھی

مگر اچانک
دلوں کی وادی میں شمع اک ہو گئی فروزاں
شکستہ دل، مضمحل نگاہوں
ملول روحوں کو جس کے دم سے
ضیا ملی ہے، جو لاکھوں صدیوں سے جل رہی ہے
جلا کرے گی — !!

دبیز فرسودہ کالے پردے
اگر ہٹیں گے
چمکتے شفاف آئینوں کا
قطار اندر قطار پھیلا
طویل بے حد طویل سا سلسلہ ملے گا۔

یہ آئینے ایسے آئینے ہیں
کہ جن میں تاریخ اپنے نقش و نگار محفوظ کر چکی ہے۔

زمیں کے تاریخ کا پہلے صحیفے کا پہلا صفحہ،
تمام پھیلی ہوئی سیاہی
سکوت کا بے پناہ سمندر
زمیں سے افلاک تک مسلط ہے، خامشی کا عجیب عالم

کوئی صدا ہے نہ روشنی ہے
نہ زندگی کی جھلک کہیں ہے
تمام چھایا عدم کا عالم
وجود کا کچھ پتہ نہیں ہے ...... کہ پھر اچانک
خلا کی خاموش وسعتوں میں
صدا اک ایک جو کن کی گونجی

تو اس زمیں نے
زمیں کے اوپر
پہاڑ، صحرا

سمندروں نے
دمکتے سورج نے
چاند تاروں نے
روشنی نے وجود پایا
خدا نے اپنا جمال دیکھا

ورق جو پلٹا، زمیں کی تاریخ کے صحیفے کا
آدمی نے حیات پائی
وہ آدمی
جو کہ جنگلوں میں
لباس و تہذیب سے گریزاں
شکار کرتا تھا، سادہ دل، جو کم طلب تھا۔
ہوائے حرص ہوس نے جس کو چھوا نہیں تھا۔
نکل کے جنگل سے شاہراہوں کی سمت آیا
تو آگہی کے چراغ نے روشنی دکھائی
جب آگہی کا چراغ روشن ہوا
تو نیل و فرات و گنگا و سندھ، مینوب و یانگسی کی
جوان موجوں نے
جگمگاتے حسین و شاداب خواب دیکھے
عروس ہستی کا احمریں رنگ کچھ اور نکھرا
کچھ اور سنورا

دلوں میں خوابوں نے کروٹیں لیں
تو آرزوؤں کی نیند ٹوٹی
وہ آرزوئیں جو ارتقا کی دلیل بھی ہیں
جو زندگی کی نقیب بھی ہیں
کہ جن کی فطرت میں ہے محبت بھی دوستی بھی
کہ جن کی فطرت میں ہے عداوت بھی دبری بھی
انہیں تضادوں کی کشمکش سے
کبھی اندھیرا
کبھی اجالا۔

خیال کی سرمئی فصیلوں سے دیکھتا ہوں
کبھی ہے ویدوں کی شانت لہروں کی گنگناہٹ،
کبھی منو کے اصول کا جگمگاتا سورج،
کبھی ہواؤں کی بانسری کی مدھوم ڈوبی جوان لے ہے۔
کبھی ہے بدھ کا مہان بھارت
کبھی ہے جنگل میں پا بہ جولاں یہ تیاگ کا بے مثال پیکر
کبھی ہے پیپل کی ٹھنڈی چھاؤں میں
گیان کی جستجو میں بیٹھا نجات کے راستے کو تکتا
کبھی یہ حکمت کا چاند بن کر ہے چین کے آسماں میں روشن
کبھی اپولو کی مملکت میں
دہکتے زہراب کا پیالہ لبوں سے اپنے لگا رہا ہے
فنا کو حسن ثبات دے کر حیات کے گیت گا رہا ہے۔
کبھی تو وادیٔ نیل میں یہ
عمارتوں کی مہیب صورت بنا کھڑا ہے
عروج پا کر "خدا" بنا ہے
کبھی لرزتے نحیف ہاتھوں میں زندگی کا عصا ہوا ہے۔
کبھی عرب کے اداس صحرا میں ساری دنیا کا ایک مرکز
بنا رہا ہے

کبھی یہ کانٹوں کا تاج پہنے
صداقتوں کی صلیب کاندھے پہ ڈھو رہا ہے
کبھی سیاہی کے بالمقابل
بلند فاراں کی چوٹیوں پر
یقیں کا سورج بنا رہا ہے
جہاں کو رستہ دکھا رہا ہے
کبھی یہ آندھی کے سامنے بھی
چراغ حق کا جلا رہا ہے۔
زمینِ کرب و بلا کو اپنے لہو سے مہندی لگا رہا ہے۔۔۔

خیال کی سرمئی فصیلوں سے دیکھتا ہوں
کبھی اندھیرا
کبھی اجالا

کبھی اجالا
کبھی اندھیرا

خیال کی سرمئی فصیلوں سے دیکھتا ہوں
کہ وقت کا بے کراں سمندر اب اور تیزی سے بہہ رہا ہے
اب اور تیزی سے بہہ رہا ہے
ہر ایک لمحہ زمیں کی صورت بدل رہی ہے
جو ایک طوفان جا رہا ہے
تو ایک طوفان آ رہا ہے .....
تمام ہلچل مچی ہوئی ہے
زمیں سے تا خلا کہیں بھی کوئی سکوں نہیں ہے
تمام خوابوں کے چاند تارے بجھے ہوئے ہیں
کسی کو بھی اب کسی پہ کوئی یقیں نہیں ہے
یہ کون جانے —— ؟
یہ کون پوچھے —— ؟
کسی کو بھی یہ خبر نہیں ہے۔
کسی بھی لمحہ کوئی دوانہ
تمام دنیا کو آگ کے بے کراں سمندر میں جھونک دیگا۔
اداس نسلیں
لہو میں ڈوبی
نڈھال عریاں کھڑی ہوئی ہیں
زمیں کی تاریخ کا صحیفہ
مجھے مگر یہ بتا رہا ہے
عروس گیتی کے گیسوئے خم بہ خم ہمیشہ
سنور سنور کر بکھر گئے ہیں
بکھر بکھر کر سنور گئے ہیں۔

خیال کی سرمئی فصیلوں
شکستہ ٹوٹی ہوئی منڈیروں
اداس برجوں سے دیکھتا ہوں
کہ تیرگی کے اسی سمندر میں آئینے بھی نکھر رہے ہیں

صد انفصادوں میں گونجتی ہے
ایں آئینہ کہ جمال دارد
ایں آئینہ کہ جمال دارد۔

سفرنامہ
تیسری قسط

م۔ نسیم

نئی دنیا کی کھوج میں

ہوسٹن کے رن وے پر اتر کر جہاز کافی دوڑا ہوگا۔ مگر پھر تھک ہار کر اپنی جگہ آکر تھم چکا تھا اور اب میکسیکو جانے سے پہلے سستا رہا تھا۔

سارے مسافر اپنے کوٹ، اپنے بیگ، یا اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے باہر جا رہے تھے۔ صرف ہم آپا کے لئے کرسی آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ آخرکار ڈہیل چیر لائی گئی۔ آپا بیٹھیں۔ ہمارے جھولے، تھیلے پیا رے لدے پھندے چلے۔ اور جہاز کے اسٹاف سے "بائی بائی" کا آخری کورس سنتے ہوئے ہم پہیہ دار لوگ ٹیکساس کی دھرتی پر اتر آئے۔

اب میں شیشے کی ایک لمبی سی سرنگ میں، آپا کی ڈہیل چیر تھامے، اسے چلاتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔

لوگ سب بڑھتے گئے اور کارواں گھٹتا گیا۔

سرنگ میں بے حد خوبصورت رنگین بورڈ استقبال کرنے کو کھڑے ہوئے تھے۔ کوئی ہوسٹن آنے پر مبارکباد دے رہا تھا۔ کسی میں یہ آگاہی تھی کہ اپنی اور اپنے مال کی خیریت چاہتے ہو تو سارا پیسہ صبح ہونے تک نبک آف ہوسٹن کے کھاتے میں جمع کر دو — ورنہ سود کی باؤ فیصدی بڑھی ہوئی شرح سے محروم کر دیئے جاؤ گے! ایک دل فریب بورڈ کا، راجہ کی برات جیسی سجی ہوئی کائنریٹیل یہ کہہ رہی تھی کہ، زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب اور موت کیا ہے؟ —— شیراٹن ہوسٹن کے ریسٹوراں میں ڈنر نہ کھانے کی بدبختی!

سرنگ کم ہوتی گئی۔ اس کا منہ پاس آتا گیا۔ اور ہم دونوں آخری مسافر اس کے منہ سے باہر نکلنے کے لئے بے چین ہوتے گئے۔

کچھ لوگ وہاں سرے پر کھڑے، معلوم ہوئے۔ پھر ان میں سے ایک رفتہ رفتہ ڈاکٹر نثار احمد۔ ایم۔ڈی (رگیسٹرڈ والنٹائن) ہو تے گئے۔ ان کے برابر کی مسکراتی ہوئی خاتون، بہن شاہدہ احمد ہوتی گئیں۔ ایک گورا گورا چشمہ سنبھالتا ہوا آٹھ سالہ بچہ طارق احمد بنتا گیا۔ ایک بچی، سر سے پاؤں تک، ہڈ والے فرکوٹ کا ر دب دھارتی گئی اور ایک ننھی سی بچی، چلتی پھرتی گڑیا بنی، انگوٹھا پیتی رہی۔

لوگ پاس آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔

آپا ڈہیل چیر پر ہی ایک کے بعد ایک سے گلے لگ کر، وعلیکم السّلام کہہ کر۔ دعائیں دے کر پیار کرکے فارغ ہوگئیں پھر میں کرسی کے پیچھے سے نکل کر مردانہ وار آگے بڑھا۔ اور یہ مہم سر کی — تو یہ طارق میاں ہیں۔ اور یہ ہڈ والا فرکوٹ، کوٹ نہیں ہے۔ ہما بی بی ہیں — اور یہ چلتی پھرتی، آنکھیں کھولتی بند کرتی گڑیا، ایمان احمد ہے۔

نثار بھائی نے خوش ہوکر۔ گڈ۔ گڈ — آپ کیسے ہیں؟ میں چونکہ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ اس لئے قبول کر لیا "جی — بالکل ٹھیک ہوں"۔

یہاں سے سب کے ساتھ بڑھتے ہوئے ہم لفٹ میں داخل ہوئے۔ اور نیچے اتر کر اس علاقے میں پہنچے، جہاں چلتی پھرتی بیلٹ پر سارا سامان گھمایا جاتا ہے۔ اور جس میں جتنی ہمت ہوتی وہ خود سامان اٹھا لے جاتا ہے۔ یا قلی جیسے حضرات سے اٹھوا کر اپنی راہ لیتا ہے۔

ایک قلی جیسے حضرت سے ہمارے سامان کا واسطہ بھی پڑا۔ تھے تو یہ بھی مردِ سیاہ فام ہی۔ لیکن نہ تو ان کی پیشانی پر ہم کو دیکھ کر شکنیں پڑیں۔ اور نہ ٹرالی میں سامان لاد کر چلنے میں انھوں

نے امریکہ کی بے عزتی سمجھی۔ یہ سب اس وجہ سے تھا کہ ہمارے ساتھ ڈاکٹر صاحب تھے۔ وہ ہماری بیماری تو جانتے ہی تھے۔ ان حضرت کا مرض بھی سمجھ گئے تھے۔ اس لئے کار میں سامان رکھوانے کے بعد، نسخے کے بجائے دو ڈالر دیئے فوراً ہی (بغیر پوچھے بغیر) ان حضرت میں صحت مندی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔

ہم عشاء کی نماز جہاز ہی میں دس بجے پڑھ چکے تھے لیکن ہماری کلائی کی گھڑی کا مستقل فتویٰ یہ تھا کہ بالکل غلط پڑھی ہے یہ تو فجر کے بھی بعد کا وقت ہے۔ سات بج رہے ہیں۔ ویسے هذا ماعندی۔ آگے تم خود عاقل بالغ ہو۔ یہاں آکر یہ معلوم ہوا ایسا برا وقت آگیا ہے کہ نیویارک اور ہوسٹن کی بھی آپس میں نہیں بنتی۔ دونوں میں دو گھنٹہ کمی کا اختلاف ہے۔ اس لئے جہاز میں چار گھنٹے گذار کر بھی وہی مرغے کی دو ٹانگیں تھیں یعنی ابھی ہمارے دو ہی گھنٹے گذرے تھے۔ اور رات ایسے دبے پاؤں گذر رہی تھی کہ کھینچنے پر بھی وقت ساڑھے گیارہ سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ جب ہم نے نثار بھائی سے اس کا علاج پوچھا تو ڈاکٹر صاحب نے یہ امریکہ کی عام بیماری بتائی کہ پورے امریکہ میں آپ کے وقت پر کوئی کام نہیں ہوتا۔ سارے ملک میں پانچ ٹائم چلتے ہیں اور اس پر بھی چین نہیں پڑتا تو مئی میں ساری گھڑیوں کو بونس کی طرح ایک گھنٹہ اور دے کر آگے بڑھا دیا جاتا ہے۔ تاکہ جو رہی سہی کسر تھی وہ پوری ہو جائے۔

امریکی جنت کے بارے میں پہلا تاثر ہی غلط ملا۔ آڑے وقت پر یہاں کوئی کام نہ آسکے گا بھلا ریاست ہائے متحدہ کہلانے کا فائدہ ہی کیا۔ اگر یہاں وقت پر بھی اتحاد نہ ہوسکے۔ ایسے ملک سے کیا توقع رکھی جائے کہ وہ زمانے کا ساتھ دے گا۔

اس الجھن سے چھٹکارا پانے کیلئے، ہم نے یہ خیال کرنا ہی چھوڑ دیا کہ کبھی ہمارا بھی وقت تھا۔ طے کرلیا کہ جس کی گھڑی اس کا زمانہ۔

سفید کیڈلک کار، بغیر جھٹکا دیئے، بے حد چوڑی فری وے پر فراٹے بھرتی ہوئی گذرتی رہی۔ اندر خیر و عافیت کا تبادلہ ہوتا گیا۔ ایرکنڈیشن آہستہ آہستہ کار کو گرم کرتا گیا۔ اور میں روشنی میں نہائے ہوئے اس شہر کو۔ اس کی دو طرفہ کشادہ سڑکوں کو اس کے بلند روشن بورڈوں کو۔ اس کے بقعہ نور اسٹوروں کو۔ اس کی دن جیسی رات کو دیکھتا گیا۔

بجلی کے کھمبوں سے تگنے اونچے موٹے موٹے لوہے کے ستونوں پر، فری وے کے دونوں طرف، بڑے بڑے جلتے بجھتے بورڈ سامنے آتے اور پیچھے رہ جاتے۔ اتنے بڑے بورڈ کہ زمین پر بچھا دیں۔ تو تین کاریں اس پر کھڑی ہو جائیں۔ کار والا سے لے کر ہے کاروں تک۔ ہر بورڈ کے اشتہار میں ہر ایک کی دلچسپی کا سامان تھا۔ نئے برانڈ گولڈن لائٹ سگریٹ سے ملئے۔ کیا سگریٹ ہے! پہلا کش لیتے ہی مارے تعجب کے سگریٹ ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ (سگریٹ پینا پھر بھی نہیں چھوٹتا) یہ دیکھئے نئی دلہن کی طرح سجی سجائی بیوک کار ۸۰ء کے ماڈل کی۔ بنائیے (جب جی بھر جائے چھوڑ دیجئے۔ طلاق کا کوئی مسئلہ نہیں) یہ مچھلی مس فلوریڈا ہیں۔ اپنے قد سے بڑی بوتل کا سہارا لئے، اعلان کر رہی ہیں۔ ارے روسیو اچھا لو اپنے کیچپ، ہم نے تم سے اچھی وڈکا کشید کرلی ہے۔ یہ جرمن کار اپنی چھڑی پر ٹکی ہوئی منہ میں پائپ دبائے مسکرا رہی ہے۔ واکس ریگن تم نے پھر میدان مار لیا۔

پرانے ٹائروں کی نئی کاریں ہیں۔ نئی بوتلوں میں پرانی شرابیں ہیں۔ جدید کلب والے۔ قدیم بینک والے ہر ایک اپنے اپنے بورڈ پر کچھ نہ کچھ سجائے بیٹھا تھا۔ کانٹے میں چارہ لگا تھا۔ ڈوری میں کانٹا بندھا لٹکا تھا۔ ایک سرا شکاری کے ہاتھ میں تھا۔ اور اس کی نگاہ ڈوبی ہوئی ڈوری پر تھی — بس کسی بھی مچھلی کے منہ مارنے کی دیر تھی۔

لیکن فری وے پر کاریں پیٹ بھری مچھلیوں کی طرح، ساٹھ ستر میل کی رفتار سے رواں دواں تھیں۔ سوائے میرے کسی نے نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا کہ دنیا کیا کچھ سجائے، گاہکوں کی منتظر بیٹھی ہے۔

کار کے اندر ہلکی ہلکی لو چلنے لگی تھی۔

شہر کی رونق کچھ پھیکی پڑ رہی تھی کہ اجالوں سے بھرے ہوئے علاقے سامنے آگئے۔ سنہری روپہلی جھنڈیوں والی چھت کے

نیچے، فلڈ لائٹ کی دھوپ جیسی روشنی میں، فٹ بال فیلڈ جتنے بڑے بڑے میدان نئی کاروں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ بیسیوں، سیکڑوں۔ ان گنت۔ اتنی کاریں تھیں کہ ایک فیلڈ بھر گاڑیاں، پورے اتر پردیش کو کافی ہوجائیں۔ اتنے بہت سے گیراج ہر طرح کی آسان قسطوں پر، ایک ایک کار بیچ ڈالنے کا تہیہ کئے بیٹھے تھے۔ ایک سے ایک بہانہ تھا۔ نئی کاریں بھی پرانی گاڑیوں کے مول بیچی جارہی تھیں۔ اصل غرض یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح گیراج کی گود خالی ہوجائے۔

مگر اس وقت، نہ آدم نہ آدم زاد۔ بلکہ نہ گاہک تھا نہ گاہک زاد۔ کوئی نہ تھا بس پورا ہوسٹن جنت نگاہ تھا۔ اور نگہ کوئی نہ تھی۔

اب پھر اندھیرے نے اجالے کو دبا لیا۔ ایک سوتا ہوا علاقہ گذرا جہاں کی بتیاں تک اونگھ رہی تھیں۔ پھر چھوئی موئی کے گھروندوں جیسی حسین کوٹھیاں گذریں۔ جو سبزہ زاروں کے بیچ میں اگی ہوئی تھیں آگے بڑھے تو فری وے سے ناطہ توڑ کر کچھ سڑکیں، اٹھلاتی بل کھاتی، ادھر ادھر نکل گئیں۔

ان میں سے دونوں طرف ایک عشوہ ساز سڑک نے ہماری گاڑی کو بھی لبھا لیا۔ اور بہت ہیرا پھیری کے بعد، سفید کیڈلک کو آخر خوبصورت کوٹھیوں والے سرکل میں ایک خوبصورت کوٹھی کے خوبصورت گیراج کے سامنے لاکر چھوڑ دیا۔

نثار بھائی نے گاڑی دھیمی کرکے برابر رکھی ہوئی پان کی ڈبیا اٹھائی اور اس سے پہلے کہ میں کہوں نہ۔ نہ اس وقت پان کی تکلیف نہ کریں، ڈبیا کا بٹن دبا دیا۔ کھل جا سم سم کی طرح گیراج کا دروازہ گھرر رر کرکے اٹھنا شروع ہوگیا۔ گویا ڈبیہ کے جن کو اشارہ ملنے کی دیر تھی۔

مجھے دھیان آیا۔ یہی حال کار کا رہا ہے۔ بٹن دبایا، دروازے کو تالا لگ گیا۔ بٹن دبایا کھڑکی کا بند شیشہ کھل گیا۔ بٹن دبایا۔ (معاف کیجئے) کھڑکی کا شیشہ پھر بند ہوگیا۔ بٹن دبایا۔ سامنے آئینہ کا زاویہ ٹھیک ہوگیا۔ بٹن دبایا پیچھے کی ڈگی کھل گئی۔ بٹن دبایا انجن کا ڈھکنا کھل گیا۔ بٹن دبایا۔ اور —— آنکھیں کھل گئیں، بچے اور بڑے سارے جہادِ زندگانی کا سامان، اپنی اپنی امنگ کے مطابق اٹھائے، گھر میں داخل ہوئے۔ آپا نے بسم اللہ پڑھکر اندر قدم رکھا۔ اور میں نے ماشاء اللہ پڑھ کر۔ نیت دونوں کی ایک تھی۔

"بیٹر ہوم اینڈ گارڈن" جیسے گھروں کا ہو بہو چربہ تھا۔ ان رسالوں میں یہ گھر ایسے لگتے تھے جیسے بھرے ہیں جس قدر جام و سبو، میخانہ خالی ہے۔ لیکن اس الف لیلوی گھر میں تو پوری ایک فیملی بسی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نثار احمد کی۔ کچھ سامان ملاقاتی کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ کچھ سوٹ کیس کھانے کے کمرے تک آکر وہیں ٹک گئے۔ اور جھولوں، تھیلوں اور پٹاروں نے جہاں سر چھپانے کی جگہ دیکھی، وہیں بسیرا کر لیا۔

کپڑے بدلے، ہاتھ منہ دھویا۔ سب کے پاس ٹیبل پر آبیٹھے کچھ کھایا۔ کچھ کھانوں کو پہچانا۔ مگر اس طرح جیسے خواب دیکھ رہے ہوں دور سے نیند کے دیو کی صدا آرہی تھی "کہاں جائے گا بچہ جہاں جائے گا۔ ہمیں پائے گا۔

نرم بستر پر، سوتے میں ایک آدھ ہی کروٹ بدلی ہوگی کہ آنکھ کھل گئی۔ بستر ابھی تک نرم، ماں کی گود کی طرح۔ اور سلانے کو تیار تھا مگر سورج نکل آیا تھا اور افسوس کے ساتھ یہ دن چڑھے کا اٹھنا دیکھ رہا تھا۔ بردبار باپ کی طرح۔

ہم آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھے۔ چھوٹوں بڑوں کو سلام کیا۔ آپا بھی اٹھ گئی تھیں۔ چائے تیار تھی۔ مگر ناشتہ وغیرہ نہ تھا۔ ہمیں کچھ عجیب سا لگا۔ ہاتھ منہ دھوکر لوٹتے ہوئے، نظر کلاک پر پڑی تو وہ پانچ بجا رہا تھا۔ ہم وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کہاں جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

آخر کس گھڑی اور کس وقت کا اعتبار کریں —— سوائے قیامت کی گھڑی اور آخری وقت کے۔

آپا نے ہماری شکل پر لکھی ہوئی پریشانی کا تب تقدیر کی طرح پڑھ لی۔ اور دوسرے مصرعے کی شرح یوں کی کہ یہ درویشی یا سلطانی کی عیاری نہیں، شیطان کی مکاری ہے۔ آدھی رات سے سونا شروع ہوا تھا اور اب سارا دن گذار کر اٹھنا شروع ہوا ہے۔ اب پوچھتے ہیں سادہ دل بندا کہاں جائے —— چلو بیٹھو یہاں آکر چائے پیو۔

چلئے یہ نتیجہ ہوا امریکہ کی جنت میں آنے کا۔ پہلے ہی دن نمازیں
گلے پڑگئیں۔ جلدی سے لوٹ کر وضو کیا۔ اور پھر فجر کو ظہر سے عصر تک
ملاتے چلے آئے۔ پھر آکر بیٹھے۔ چائے پی۔ کچھ کھایا۔ اور کچھ کھانے
کی مشق کی۔ اور کچھ سننے کی بھی کوشش کی۔ مگر کچھ بھی سمجھ میں نہ
آیا۔ سامنے ایک بڑا سا ٹی وی اپنے بھاری بھرکم اسٹینڈ پر سلطنت
کے ولی عہد کی طرح ٹیک لگائے براجمان تھا۔ اور آنکھ، کان، دل
سب اس کے حضور حاضر تھے۔ اور سب طرف سے غیر حاضر۔

اتنے میں اندھیرے نے کھڑکی میں سے جھانک کر کہا۔ میں
نے سوچا کہ بتا دوں۔ میں آگیا ہوں۔ ایکدم مجھے ہوش آیا۔ ہڑبڑا
کر اٹھا کہ کہیں مغرب اور عشاء بھاگ کر پھر سے نہ جا ملیں۔

باہر جھٹپٹا ہو چلا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے باوجود، باہر لان پر نماز
پڑھنے کے شوق میں جا کھڑا ہوا۔ جونہی نیت باندھنے کے لئے ہاتھ
اٹھائے کہ شاہدہ بہن نے آواز دی۔ دولہا بھائی۔ یہ کدھر نماز پڑھ
رہے ہیں؟ میں رک گیا۔ امریکہ میں گھاس پر نماز پڑھنا شاید جائز
نہ ہو۔ لیکن مجھے بتایا گیا کہ آج سے مجھے مشرق کی طرف منہ کرکے نماز
پڑھنی ہوگی۔ قبلہ پیچھے رہ گیا ہے۔

ان کے کہنے سے میں نے رخ تبدیل لیا لیکن نیت کیسے
بدل جاتی۔ منہ میرا کعبہ کی طرف، کہتے ہی ایسا لگا جیسے کعبہ کو بھول
کر الٹا کھڑا ہو گیا ہوں۔ بڑی مشکل سے طبیعت کو بہلا پھسلا کر
نماز پوری کرائی۔

نماز ہی میں برفیلی ہوا نے دو چار تھپڑ لگائے۔ اور جوان مردی
کو تھرتھری آگئی۔ بھیگی بلی کی طرح جلدی سے گھر میں گھسے تو سارا
کمرہ گرما گرم۔ جیسے سنکا ہوا ٹوسٹ۔ اور کوٹ اتار کر کہیں بیٹھنا
چاہا۔ لیکن گھوم پھر کر جو آرام دہ خالی کرسی ملی تھی تو پھر ٹھیک ٹی وی
کے سامنے۔ اب ٹی وی کا شہزادہ بھاؤ بتا بتا کر گا رہا تھا۔ پھر
اپنی منڈلی کے ساتھ وہ ناچنے لگا۔ پھر وہ اچھلنے اور ہوا میں تیرنے
لگا۔ پھر طرح طرح کے بہروپ بھرنے لگا۔ کبھی باپ، کبھی بیٹا۔ کبھی
بیٹے کا باپ۔ کبھی باپ کا باپ۔ ہنستا ہنساتا، روتا ہنساتا، گاتا
ہنساتا اور ہنستا رلاتا۔

پھر پتہ نہیں کیسے دس بج گئے۔ ہم نے تو گھڑی کی طرف آنکھ
اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ بچوں کے نعروں سے معلوم ہوا۔ ابو آگئے!

گیراج کھلا ہے۔ ہمیں یہ بھی اندازہ نہ ہو سکا۔ ہم تو رونے والے
پر ہنسنے اور ہنسنے والے پر رونے میں لگے ہوئے تھے۔ اتنی دیر
میں کچن کے پچھلے دروازے سے، سلام کرتے ہوئے نثار بھائی
برآمد ہوئے۔ اور ہاتھ میں لٹکا ہوا اپنا مطب خانہ رکھنے اور کپڑے
بدلنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ہم نے اس بہتے پانی جیسی دنیا
سے دل لگانے کے بجائے پھر ٹی وی کے گیان دھیان میں لگنا
چاہا۔ مگر پلک جھپکتے میں کھانے کا اعلان ہو گیا۔

کھانے کی میز پر بھی قسمت سے ایسی کرسی ملی جو پہلے ہی
ٹی وی کی طرف منہ کئے بیٹھی تھی۔ ہم کو بھی یوں ہی بیٹھنا پڑا۔ اس
طرح بیٹھنے کا یہ اثر تھا کہ ٹی وی کی برکت سے ہماری پلیٹ میں
چیزیں کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی گئیں۔

اس کے بعد آپا نے اپنا سوٹ کیس کھلوانے کا اعلان
کیا۔ مطلب یہ کہ اب کراچی سے لائی ہوئی سوغات، بڑوں میں
بٹے گی۔ بچوں میں پھیلے گی۔ اور ہندوستان کے وقار کا مسئلہ پیدا
ہو جائے گا۔ ہم نے فوراً ہندوستان کی حمایت کا فیصلہ کیا۔ اٹھ کر
اپنا سوٹ کیس۔ اپنا بیگ۔ اپنا جھولا اور اپنا پٹارا کھولا۔ کشمیر کی
چادر، شال۔ لکھنؤ کی چوڑیاں، ہنٹی کی چڑیاں، مٹی کی لونگیں
الائچیاں، اخروٹ بادام چھوہارے، الم غلم اور دہلی کا حبشی حلوہ
اور وہاں کا الم غلم۔ غرض ایک ایک صوبے کی نمائندگی کرکے
ہندوستان کی آبرو رکھ لی۔

کافی دیر تک مقابلہ چلتا رہا۔ کبھی کوئی چوکا یا چھکا لگتا تو
شائقین کی صفوں سے تحسین کا غلغلہ بلند ہوتا۔ لیکن دوسری
اننگ میں بھی یہی حال رہا۔ تو ہار جیت کا فیصلہ ہونے کے بجائے
میچ ڈرا ہو گیا۔

اس کے بعد وہیں بیٹھے بیٹھے دو تین منٹ بعد (جو کسی طرح
بھی ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں تھے) شب کی آخری چائے پیش کر دی
گئی۔ ہم نے پیالی کی طرف رخ کیا۔ بلکہ پیالی نے ہماری طرف رخ
کیا۔ اور ہم دونوں کا منہ پتہ نہیں کیسے ٹی وی کے بجائے گھڑی
کی طرف ہو گیا اور چائے کی چسکی منہ کی منہ ہی میں رہ گئی۔

بارہ بجنے میں گیارہ منٹ باقی تھے۔
وقت کا اندازہ کرنا واقعی اس ملک میں مشکل ہے۔ گھر ہے تو

وہ گرم - ٹی وی ہے تو وہ گرم گرم - باتیں تھیں (معلوم نہیں کیا
کیا باتیں تھیں) توان میں بھی گرمی - گھڑیاں گرم ٹھنڈی، دونوں
بے کار - اپنی گھڑی میں معلوم ہی تھا کہ بدھ کو ہی جمعرات کے
ساڑھے گیارہ دن کا عمل ہوگا - اور یہاں کی گھڑیوں میں ابھی بدھ
کادن ہی گوتم بدھ بنا بیٹھا تھا -

جلدی سے اٹھ کر نماز پڑھی - سفر تو ختم ہو چکا تھا - اس لئے
نماز آدھی کرنے کا جو کنسیشن ملتا تھا اب وہ بھی نہ تھا - نماز پوری
کرکے پھر کرسی تلاش کی - اور جو زیادہ آرام دہ لگی، اس پر بیٹھے
ہی تھے کہ ٹی وی پھر سامنے آکر نظروں میں سما گیا - نیند سے آنکھیں
خالی تھیں - اس لئے جس کا جی چاہتا ہے، خالی گھر میں آبستا ہے -

ڈیڑھ بجے ٹی وی نے ہم سے گڈ مارننگ اور ہم نے اسے
شب بخیر کہا - شاہدہ بہن کو آواز دے کر بلایا - کہ آکر ٹی وی بند
کردیں -

انھوں نے آکر پروگرام جلدی بند کر دینے پر ٹی وی کا کان
زور سے مروڑا - اور پھر ہم سے بہت دُلار سے بولیں " کہیں اور
دوسرا چینل لگادیں؟"

ہم فوراً پینتالیس برس ماضی میں لوٹ گئے - جب غبارہ
پھٹ جانے پر بڑی آپا دلاسہ دیتی تھیں - چلو کوئی بات نہیں - گندا
تھا نا اس لئے پھٹ گیا - لاؤ ہم دوسرا پھلا دیں -

ہم نے بڑی عقیدت کی آنکھوں سے، بڑی آپا کی طرح
شاہدہ بہن کو دیکھا - اور پانچ برس کے بچے کی طرح ہاں میں
سر ہلانے ہی والے تھے کہ ہمارے پینتالیس برس، ماضی میں
سے ہانپتے کانپتے دوڑے ہوئے آئے - اور ہمارا منہ ادھر سے
ادھر گھما دیا - غضب کرتے ہو بڑے میاں -

شاہدہ بہن کو اپنی سادگی میں ہمارے منہ کا اس طرح
ملنا انکار معلوم ہوا - انھوں نے ٹی وی کا دوسرا کان مروڑ کر
اسے ٹھنڈا کیا - اور خدا حافظ کہتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئیں -

اب ——— میں تھا - مرا بستر تھا اور گوشۂ تنہائی -

تقریباً دو سو ستّرہ کروٹیں لینے، اور بستر سے کھسک کر
رفتہ رفتہ کارپٹ تک آتے آتے صبح نے ہم کو آلیا - اور ہندوستان
میں مرغ نے بانگ دی - جو ٹی وی بند ہونے کی وجہ سے سنائی
نہیں دی -

نماز نے سلام پھیرا اور ہم کو سمجھایا - جاؤ کچھ دیر امریکہ
میں ٹہل آؤ - یہاں کی ہوا کھاؤ گے تبھی پانی راس آئے گا -
میں نے اس مشورہ کو گرہ میں باندھا - گرہ رومال میں لگائی
رومال اوور کوٹ میں رکھا - کوٹ پہن کر اونی ٹوپی پہنی - اور
جوتے پہن کر دبے پاؤں باہر امریکہ میں نکل آیا -

(تیسری قسط ختم)

فارم ملکیت نمبر ۴

رسالہ — نمائندہ نئی نسلیں
زبان — اردو
وقفۂ اشاعت — ماہنامہ
ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر — م نسیم
شہریت — ہندوستانی
پتہ — ۲۵۰۳ بارہ دری شیر افگن
بلیماران - دہلی ۶
جائے اشاعت: ۲۴۴۸، بارہ دری شیر افگن
بلیماران - دہلی ۶

مندرجہ بالا تمام باتیں میرے علم و یقین کی حد تک
صحیح ہیں -

دستخط : م نسیم

حیدر صفت

اس کے شانوں پہ سحر رکھ دیتے
شب گزیدہ تھا مگر رکھ دیتے

ایک نقطہ تھا فسانوں سے الگ
حاشیوں پر ہی اگر رکھ دیتے

منتظر رہنے سے اچھا تھا کہ تم
میری پلکوں پہ شرر رکھ دیتے

اس تعلق کا بھلا سا کوئی نام
سلسلہ، خواب، سفر رکھ دیتے

اس کی پرچھائیں سے کیوں ڈرنے لگے
خود ہی شمشیر پہ سر رکھ دیتے!

لب کشائی کی نہ جرأت تھی اگر!
کچھ تراشے ہوئے پر رکھ دیتے

کیا ضروری تھا کہ وحشت ملتی
اک قدم اور ادھر رکھ دیتے!

وہ اتّصال کا جذبہ جو خار و خس میں نہیں
گلوں کو بخش دیا اور ان کے بس میں نہیں

کنارے کاٹتی لہروں کا اضطراب نہ دیکھ
سپردگی میں جو لذت ہے پیش و پس میں نہیں

سمٹ کے پھر مرے اندر وہ خوف پالے گا
اسے یقین دلاؤ کہ وہ قفس میں نہیں

بس ایک چیخ فضاؤں میں گونجتی رہ جائے
یہ وقت جب کہ صدا بھی کسی جرس میں نہیں

بدن کے لمس کا احساس کھو چکا ہوں میں
اے شہر! میں ترے آغوش کی ہوس میں نہیں

بہت تھکی ہے مری آنکھ خون رو دے گی
یہ انتظار کی شدت کہ میرے بس میں نہیں

اسعد بدایونی

چہار سمت عجب آندھیاں صدا کی ہیں
اٹھاؤ ہاتھ کہ یہ ساعتیں دعا کی ہیں!
اتر گئے ہیں درختوں کے جسم سے پتے
شرارتیں یہ ہوائے گریز پا کی ہیں!
خدا دکھائے نہ لگنے زمانے والوں کو
ہمارے عہد میں جو صورتیں وفا کی ہیں
ترے لبوں کی حقیقت میں وہ صفا کہاں
ہم اہل شعر نے جو صورتیں عطا کی ہیں
نہ جانے ہیں چہرے سے مطمئن اسعد
ہماری روح میں بے چینیاں بلا کی ہیں

ایم۔ آر۔ قاسمی

اب اک آوازِ جنوں سب سے جدا چاہتا ہوں
اب اک اندازِ سخن اور نیا چاہتا ہوں
مری خواہش کا کوئی نام نہیں ہے یارو!
خود مجھی پر بھی نہیں کھلتا میں کیا چاہتا ہوں
تیرگی وہ ہے کہ آنکھوں سے دھواں اٹھتا ہے
صرف کچھ دیر کو تھوڑی سی ضیا چاہتا ہوں
دوستوں کی تو عنایات بہت ہیں مجھ پر
اپنے دشمن سے بھی میں حرفِ دعا چاہتا ہوں
یہ مری کم نظری ہے کہ نظر بندی ہے
افراتفری کے زمانے میں خدا چاہتا ہوں
جانتا ہوں کہ تجھے خط نہ لکھوں گا لیکن
جانے کیوں تجھ سے ترے گھر کا پتہ چاہتا ہوں
اس گھٹن سے کوئی دے مجھ کو رہائی اے کاش
جاں لبوں پر ہے مری تازہ ہوا چاہتا ہوں

عبدالرؤف بدایونی

بنامِ انجمن آرائی بن کر
رہا ہوں مدتوں تنہائی بن کر
ہرا ہوتا گیا ہر زخم دل کا
صبا آئی مگر پروائی بن کر
کہے تھے لفظ جو اس نے وفا کے
وہی گونجا کئے شہنائی بن کر
زمانے بھر میں رسوا ہو گیا ہوں
ادائے یار کا شیدائی بن کر
یہ سبزہ دور تک لہرا رہا ہے
کسی کے حسن کی انگڑائی بن کر
رؤف اس کے تغافل کا گلہ کیا
مرا دل بھی رہا ہرجائی بن کر

عزیز گھمروی

نہاں نظر سے تھی شبنم شرار سامنے تھا
خزاں نصیب سا عہدِ بہار سامنے تھا
کھڑے تھے اہلِ ہنر گردنیں جھکائے ہوئے
ترا تراشا ہوا شاہکار سامنے تھا
خزاں بضد تھی کہو موسمِ بہار اسے
لباسِ غنچہ و گل تار تار سامنے تھا!
سکوں سے بیٹھتے کیسے نظر ورانِ چمن!
حیاتِ نو کا دہکتا چنار سامنے تھا
اٹھا کے ساغرِ زہراب پی گئے میکش
ہزار شوق کا انجام کار سامنے تھا
ہوا کچھ ایسی چلی گلستاں میں اب کے برس
کہ خار خار بنامِ بہار سامنے تھا
ملا خلوص نہ جب انجمن سے اٹھ آئے
کہ اہلِ فکر و نظر کا شعار سامنے تھا
نظر نہ آتا تھا چہرہ کوئی بھی صاف عزیز
عجیب وقت کا گرد و غبار سامنے تھا

عبد الغنی جوہر بلیادی
جمشید پور

ہر آن چڑھا وقت کا دریا نہ رہے گا
کل رنگ جہاں دیکھنا ایسا نہ رہے گا
جب دیدودل میں کوئی رشتہ نہ رہے گا
اپنا بھی کوئی ہوگا تو اپنا نہ رہے گا
یہ شہر ملامت ہے یہاں سنگ جفا سے
لگتا ہے سلامت کوئی شیشہ نہ رہے گا
ہر پیڑ سلگ اٹھا ہے خود آگ میں اپنی
اس سال کسی شاخ پہ پتا نہ رہے گا
رخسار پہ لمحات کے یوں گرد جمی ہے
اب وقت کی گردن پہ بھی چہرا نہ رہے گا
بس گونج کے رہ جائے گی دیوانے کی آواز
ویرانہ تو ہر حال میں ویرانا رہے گا
آنکھوں میں سمٹ آئے ہیں اشکوں کے سمندر
اب دل میں کوئی درد کا صحرا نہ رہے گا
نغموں کا سفر وقت کے شانوں پہ ہے جوہر
مٹ جائے گا جو شاعر فردا نہ رہے گا

ناصر شکیب
لالہ رخ، میڈیکل کالج روڈ۔ علی گڑھ

یوں دشمنی وہ خود سے نبھاتا ہے آج کل
اپنے لہو کا آپ ہی پیاسا ہے آج کل
یارب بس اب تو اپنی زمیں کو سمیٹ لے
ہر سمت اک غبار سا پھیلا ہے آج کل
اپنے کی اور غیر کی پہچان مٹ گئی
دھندلاہٹوں میں فرد کا چہرا ہے آج کل
حیران ہوں کہ راہ کا ملتا نہیں نشاں
ہر سمت اک دبیز سا کہرا ہے آج کل
شادابیوں کے دور میں تم سے ملا تھا جو
وہ شخص اک اجاڑ سا صحرا ہے آج کل
جانے کہاں گئی وہ چراغوں کی روشنی
میرے تمام گھر میں اندھیرا ہے آج کل
اب زندگی کو خواہش آوارگی نہیں
اپنے غموں کا پیڑ گھنیرا ہے آج کل!
ناصر نہ کر خیال تو اپنی ہی ذات کا
ہر آدمی نگر میں اکیلا ہے آج کل

رام پرکاش راہی

پیڑ ننگے ہیں تو ایسے میں ہوا کیا اوڑھیں
اڑتی پھرتی یہ دریدہ سی ردا کیا اوڑھیں

وقت کی دھوپ میں دن رات جنھیں جلنا ہے
آتے جاتے کسی موسم کے سوا کیا اوڑھیں

جسم یا جسم پہ محدود لباسوں کے نقوش
آنکھ پڑھ لے تو یہ غماز صدا کیا اوڑھیں!

ایک یہ ہے تو کئی بند قبا سی شرطیں
جسم اپنا ہے تو مانگے کی قبا کیا اوڑھیں

خود دماغی ہی جہاں گوش برآواز ملے
ہونٹ آہنگ حدی تلخ نوا کیا اوڑھیں

دل جو آماج گہِ خوفِ خدا ہے راہیؔ
اپنے ہونٹوں پہ کوئی نامِ خدا کیا اوڑھیں

محمد ادریس ضیاؔ

اثر انداز ہونے کا گماں رکھ
نگینے پتھروں کے درمیاں رکھ

ہوائیں تیز ہوتی جا رہی ہیں!
ابھی تو بند گھر کی کھڑکیاں رکھ

اجالوں کی اگر خواہش ہے تجھ کو
لہو اپنے بدن میں بیکراں رکھ

ابھی تو تیرگی باقی بہت ہے
ابھی روغن سے بھیگی بتیاں رکھ

زمیں پر لکھ فسانے خوشبوؤں کے
سفر میں تو مسلسل کارواں رکھ

شجر مدت سے یہ سہمے کھڑے ہیں
ضیاؔ سینوں میں ان کے آندھیاں رکھ

احمد یوسف

اترتی چڑھتی روٗنقیں

وہ جو زینے سے اتر رہا ہے، اور وہ جو زینے پر چڑھ رہا ہے ۔ دونوں کی کسی نہ کسی مقام پر مڈبھیڑ ہو ہی جاتی ہے، اور تب یہ ہوتا ہے کہ عین سلیک کے بعد ایک اوپر چلا جاتا ہے اور دوسرا نیچے۔

نام جلال احمد تھا لیکن ہمارے یہاں وہ کہلاتا "جلا" تھا گھر کے دوسرے نوکروں کی طرح وہ بھی ایک نوکر تھا، پر سمجھا یہ جاتا تھا کہ وہ دادا میاں کے خاص نوکروں میں ہے، کیوں کہ دادا میاں کا کوئی کام اس کے بغیر نہیں چلتا تھا۔

ہر چند کہ ان کے کام دوسرے بھی انجام دے سکتے تھے، لیکن ان کا یہ دستور تھا کہ کوئی سامنے آجائے تو کہتے بھئی جلا کو بلاؤ وہ سب کچھ جانتا ہے۔

ان کی اس بات کا کوئی بھی برا نہیں مانتا تھا کیونکہ سبھوں کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ جلا وہ سب کچھ جانتا ہے جو دوسرے نہیں جانتے ہیں۔

ان کی چیزوں کو رکھنے کا طریقہ ـــ ان کی پسند نا پسند ـ ان کے معمولات ـــ یہ ساری باتیں ایسی تھیں جن پر جلا کی پوری گرفت تھی۔

اتنی بات تو میں بھی جانتا تھا کہ ان کے کلاک میں روزانہ کو ٹھیک اسی وقت چابی دی جاتی ہے جب ریڈیو ۸ بجے صبح کی خبریں شروع کرتا ہے۔

لیکن پھر یہ کہ صبح وہ کس وقت منہ دھوتے ہیں۔ ان کے لئے گرم پانی کا انتظام کس ماہ سے کس ماہ تک کیا جاتا ہے۔ ان کے ناشتے کی الماری میں کس موسم میں کون سا حلوہ رہتا ہے ۔ وہ صبح کے وقت کے پیالی چائے پیتے ہیں۔ چائے میں شکر کتنی دی جاتی ہے۔ کچہری جاتے وقت وہ کون سی چھڑی استعمال کرتے ہیں۔ ان کے جوتوں میں پالش کتنے کتنے دنوں کے بعد کی جاتی ہے۔ وہ حجامت کتنے دنوں بعد بناتے ہیں۔ وہ استنجا کس وقت سے کس وقت تک لگاتے ہیں اور ان کی صفائی کس کس وقت کی جاتی ہے۔ اور یہ کہ جس پیالے میں دانتوں کا سیٹ رہتا ہے اس میں پانی کتنی مقدار میں رکھا جاتا ہے۔ سویرے مچھر دانی اتار کر کہاں رکھی جاتی ہے۔ انھیں دن میں کتنے پیکٹ کی ضرورت ہوتی۔ دیا سلائی وہ کون سی استعمال کرتے ہیں ـــــــ یہ وہ علوم تھے جن کی جستہ جستہ واقفیت تو گھر کے ہر فرد کو تھی لیکن ان پر اتھارٹی جلال احمد خاں عرف جلا ہی کو تھی۔

پانچ برس کی میری عمر تھی کہ مدرسے میں میرا داخلہ کرایا گیا۔ جلا اس وقت لگ بھگ پچیس سال کا ہوگا۔ اس کا بڑا لڑکا کمال احمد خاں عرف کملا میری ہی عمر کا تھا۔ وہ بھی کسی مکتب میں پڑھتا تھا۔

بلا اکثر ہمارے یہاں آجاتا، میرے گھر کے ان بچوں کی اتاری قمیض، پائجامے یا نیکر میں ملبوس جو اسی کے ہم عمر تھے۔ پاؤں میں کھڑاؤں، ناک بہتی ہوئی، بال گرد سے اٹے ہوئے اور ہاتھ پاؤں میں کیلوں کا میل۔

لیکن ان دنوں بجز اس فرق کے کہ ہم صاف ستھرے رہتے اور وہ گندہ رہتا، ہمیں اس کے اور اپنے مابین کوئی اور فرق نظر نہیں آتا تھا۔

بلا ہمارے درمیان گلیوں کے کھیل گلی ڈنڈا، کانچ کی گولیاں اور لٹو لے آتا، اور ہم اس کے ساتھ گھر میں چھپ چھپ کر یہ سارے کھیل کھیلتے۔ دراصل ہمارے گھر میں کھیل کے اوقات مقرر تھے اور بچوں کو شام کے وقت پارک میں یا کھیل کے میدان میں لے جایا کرتے تھے۔ لیکن گلیوں کے ان کھیلوں میں ہمیں بڑی دلچسپی کا احساس ہوتا۔ اور بلا ان کھیلوں میں بڑا ہوشیار تھا۔ پر جب ہم پکڑے جاتے، گھر کی چھت پر یا کہیں کونے کھدرے میں تو ہماری پٹائی ہو جاتی اور ہم سے کہیں زیادہ بلا پٹتا کیونکہ گھر والوں کا خیال تھا کہ بلا ہی ہمیں ان کھیلوں کا شوق دلاتا ہے۔

پھر بلا کی پٹائی کے بعد جلا کی بھی اچھی خاصی خبر لی جاتی —
"بیٹے سے کہہ دو کہ گھر میں آتا ہے تو شریفوں کے اطوار سیکھے اور گلی کوچے کے آوارہ چھوکروں کے کھیل بچوں کو نہ سکھایا کرے۔"

اس تنبیہ کے بعد بیچارہ بلا ایک بار اور اپنے باپ کے ہاتھوں پٹتا اور خوب گالیاں سنتا۔

اس نوع کے حادثوں کے بعد بلا کچھ دنوں تک ہمارے یہاں آنا جانا چھوڑ دیتا لیکن پھر اپنی عمر کے بچوں کے ساتھ بڑی سی چھت اور بڑے سے گھر میں بھاگ دوڑ اور کھیل کا چسکا اسے کشاں کشاں ہمارے یہاں کھینچ لاتا۔

دادامیاں کی تحویل سے اکثر کچھ نہ کچھ رقم غائب ہو جایا کرتی لیکن وہ جس تہذیب کے آدمی تھے، وہاں طرح دینا اور چشم پوشی کرنا مزاج کا خاصہ بن چکا تھا۔ ہم سب جانتے تھے کہ ان چوریوں کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔ اباجان، میرے دونوں چچا اور گھر کے دوسرے افراد، اکثر دبی زبان میں دادامیاں سے کہا کرتے۔
"جلا کو آپ نے بہت سر چڑھا رکھا ہے، یہ سب اسی کی حرکت ہے۔" لیکن دادامیاں ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیتے "کہہ سکتا ہے کہ وہ کسی کو دے کر بھول گئے ہوں، یا حساب میں غلطی ہو گئی ہو۔ اور پھر جب تک کسی کو چوری کرتے دیکھا نہ جائے، اس پر الزام رکھنا بھی تو مناسب نہیں ہے۔"

مگر اس کو کیا کہیں گے کہ جب جلا ہمیں اسکول پہنچانے جاتا تو اس کی بیڑی کی ڈبیا میں دو ایک سگریٹ بھی نظر آ جاتے اور جب وہ ایک خاص شان سے سگریٹ نکال کر پیتا تو اس دھوئیں کی بو ویسی ہی ہوا کرتی جیسی دادامیاں کے سگریٹ کے دھوئیں کی ہوا کرتی تھی۔

تب کرنا خدا کا یہ ہوا کہ ایک رات دادامیاں اپنے بٹوے میں سو سو کے دو نوٹ رکھ کر سو گئے۔ ان کا بٹوہ ہمیشہ ان کے سرہانے گدے کے نیچے رہا کرتا تھا۔

دوسرے دن کچہری جانے کے وقت جب دادامیاں نے اپنا بٹوہ کھولا تو اس میں وہ نوٹ نہیں ملے۔ انھوں نے ادھر ادھر دیکھا، کیش بکس کھول کر دیکھا، لیکن وہ نوٹ کہیں دکھائی نہیں دیئے۔ پھر گھر والوں کو خبر ہوئی اور سب لوگ اپنے اپنے طور پر نوٹوں کی تلاش میں لگ گئے۔ تب ہی میرے چھوٹے چچا نے کہا۔

"ارے نوٹ یہاں کہاں ملیں گے، وہ تو جلا کے گھر پہنچ چکے ہوں گے۔" ان کے لہجے میں ترشی اور شکایت تھی۔

دادامیاں اس وقت بھی اپنی وضع پر قائم رہے۔ "نہیں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے۔"

لیکن یہ معاملہ سنگین تھا کہ ان دنوں دو سو روپے بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ اتنے میں شفیق خاں مختار بھی آ گئے۔ انھوں نے بھی حساب کتاب کی جانچ پڑتال کی۔ ادھر ادھر نوٹ تلاش کیے اور آخر میں انھوں نے بھی وہی کیا جو سب کہہ رہے تھے۔ "میں تو سرکار سے برابر کہتا رہا کہ جلا بھروسے کا آدمی نہیں ہے۔"

تب ہی کسی نے پوچھا "جلا ہے کہاں"؟

اس کے بعد جلا کی ڈھونڈ شروع ہوئی۔ وہ پاس کے ایک چائے خانہ میں مل گیا۔ وہ آیا تو دادامیاں نے اسے نوٹوں کے غائب ہونے کی خبر دی۔ جلا قسم کھانے لگا کہ اس نے وہ نوٹ نہیں نکالے ہیں۔

دادامیاں نے کہا۔ "تم سے یہ کب کہا جا رہا ہے کہ تم نے نوٹ نکالے ہیں۔ میں تو تم سے یہ پوچھ رہا ہوں کہ تم نے نوٹ دیکھے ہیں؟"

لیکن جلا تھا کہ قسم کھائے جا رہا تھا۔ اُس کی اس حرکت سے شفیق خاں کو جلال آ گیا۔ اور انھوں نے کہا۔ "سرکار یہ

کمینہ ایسے نہیں سنے گا"۔ یہ کہہ کر وہ اٹھے اور انھوں نے جلال کو دو چار چلنے تلے کس کس کر لگائے۔

پھر ادھر ادھر سے بھی کچھ لات جوتے پڑے، لیکن جلال تھا کہ "اللہ کی قسم اللہ کی قسم" کی رٹ لگائے جا رہا تھا۔

اس دن ہم سبھوں کے سامنے پہلی بار دادا میاں نے گویا ایک راز کا انکشاف کیا۔

"جلال میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میرے بٹوے سے ریزگاریاں کس طرح کم ہو جاتی ہیں، سگریٹ کے پیکٹ سے ہمیشہ دو چار سگریٹ کون غائب کرتا ہے اور حلوے کی قاب سے حلوہ کون نکالتا ہے"۔

یکایک ان کا پارہ چڑھ گیا ـــ "کم بخت تو نے میرے احسانوں کا یہ بدلہ چکایا۔ دور ہو جا میری نظروں سے"۔

جلال جانتا تھا کہ دادا میاں کا کہا پتھر کی لکیر ہوتا ہے ایک بار جو فیصلہ صادر کر دیتے تھے اس پر کسی بھی حال میں نظر ثانی کرنے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔

وہ کچھ دیر کھڑا شفیق خاں کو گھورتا رہا۔ تب ہی شفیق خاں نے جوتا نکال کر کہا۔ "حرامزادے مارے جوتوں کے فرشی کر دوں گا۔ بھاگ جا یہاں سے ورنہ پولیس میں دیدوں گا"

اس طرح جلال سیڑھیوں سے اتر کر چل دیا، اور وہ روپئے جان مال کا صدقہ سمجھ کر بھلا دیئے گئے۔

دس سال گذر گئے۔ دادا میاں نے خلد کا آشیاں آباد کیا۔ اور ہماری اپنی دنیا میں وقت ایک چنگیز بن کر اٹھا اور اس نے یہاں سے وہاں تک قتل و غارتگری کا کاروبار شروع کر دیا۔ اس چنگیزی طوفان کے نتیجے میں ایک قالب دو ہو گئے اور جا بجا دیواریں کھڑی ہو گئیں۔

جب طوفان ذرا سرد ہوا تو ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ وہ اپنے ساتھ بہت سی رونقیں بھی لے گیا۔ تصویریں ماند پڑ گئیں۔ در و دیوار کی قلعی اڑ گئی اور ہم صورتوں کو دیکھ کر ایسا گمان ہوتا کہ وہ کریم لگائے ہوئے دودھ جیسے ہو گئے ہیں۔

ہر سو خاک اڑاتی ہوئی، دھنی دھنائی ہوئی حویلیاں ستے ہوئے مکینوں کے چہرے جیسے ساری رات کوئی بھیانک خواب دیکھ کر اٹھے ہوں۔

وہ شاخ جس پر آشیانہ تھا طوفان کی نذر ہو چکی تھی۔ اور اب پاؤں تلے تپتی ہوئی زمین تھی اور سر پر غیظ و غضب میں ڈوبا ہوا سورج۔

نوجوان ایمپلائمنٹ ایکسچینج میں اپنے نام درج کرا رہے تھے، اور ادھیڑ اور بوڑھے اپنی اپنی حویلیوں کو تک رہے تھے کہ انھیں کس طرح اپنی آمدنی کا ذریعہ بنایا جائے۔

جلال کے حالات اکثر اس کے سسر سے معلوم ہوتے رہتے۔ ہمارے یہاں سے نکل کر وہ سیدھا کلکتے کو بھاگ کھڑا ہوا۔ پاس میں روپئے تھے ہی۔ کچھ بیوی بچوں کو دیا اور کچھ اپنے ساتھ لے گیا۔ وہاں ایک موٹر ورکشاپ میں ہیلپر کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔

پھر معلوم ہوا کہ مکینک ہو گیا۔

اس نے اپنے سالے کے ذریعہ اپنے لڑکے بلال کو بھی کلکتہ بلا لیا ہے اور اسے وہیں بٹھا رہا ہے۔

وہ اپنے مالک کے بہت قریب ہو گیا ہے۔

وہ ہیڈ مکینک ہو گیا ہے۔

اور ایک دن اس کے سسر نے بتایا۔ "آپ نے کچھ سنا جلال کا مالک مر گیا۔ چار پانچ مہینے ہو گئے۔ لاولد تھا بیچارہ"۔

کچھ دن اور بیتے تو ایک دن سرراہ جلال کے سسر سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا آپ کو کچھ خبر ہے جلال نے اپنے مالک کی بیوہ سے نکاح کر لیا" اور تب ہی اس نے اپنی برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ـــ "پیدائشی حرامی ہے جس تھالی میں کھاتا ہے اسی میں چھید کرتا ہے۔ آپ کے دادا نے کیا کیا نہیں کیا تھا اس کے ساتھ لیکن ......"

تب ایک دن سفید قمیض، لٹھے کے کھڑکھڑاتے پاجامے اور پیٹنٹ کے چرمراتے ہوئے جوتے میں جلال ہمارے یہاں وارد ہوا۔

وہ دیوان پر بیٹھا رہا۔ میں نے اس سے کہا بھی کہ صوفے پر آ جاؤ، لیکن اس نے بتایا کہ وہ آرام سے بیٹھا ہے۔ اس نے اپنی جیب سے سگریٹ نکالا اسے جلایا اور پھر انگلیوں

میں پھنسا کر خوب لمبے لمبے کش لینے لگا۔ اچانک جانے کہاں سے
دادامیاں کے سگرٹوں کی بو میرے شامہ میں آبسی، لیکن فوراً
ہی جلال کی سگریٹ کی بو نے اس بو کو پرے دھکیل دیا۔
میں اس کے لئے چائے اور ناشتہ لے آیا۔ وہ کچھ دیر تک
حالات کا جائزہ لیتا رہا اور پھر بہت کچھ جان لینے کے بعد اس
نے پوچھا ۔۔۔ "بھیا کیا حال ہے"؟
میں نے کہا ۔ "بس اللہ کا شکر ہے۔"
اتنے ہی میں ابا جان آگئے اور اس نے بڑی پھرتی سے سگریٹ
پھینک کر اپنے جوتے سے مسل دیا اور سلام کرکے مودبانہ کھڑا
ہو گیا۔
ابا جان نے کہا۔ "بیٹھو بھئی جلال۔"
اس پر جلال نے کہا ۔ "بڑے صاحب آپ کا نمک کھایا ہے"۔
چنانچہ جب تک ابا جان صوفے پر نہ بیٹھے وہ دیوان پر نہیں بیٹھا۔
میں ہائی اسکول کرکے کالج میں داخل ہو چکا اور مجھ سے
بڑے اونچی تعلیم پانے کے بعد نوکری کی تلاش میں سرگرداں تھے۔
جلال نے بتایا کہ اس کا ورکشاپ خوب چل رہا ہے۔ اس نے
ایک پریس بھی خرید لیا ہے ایک مکان اور اسے اپنی بیوی کا
مل گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے ایک اور پلاٹ خرید لیا
ہے اور جلد ہی اس میں ہاتھ لگوانے والا ہے۔
جانے لگا تو اس نے ہاتھ جوڑ کر ابا جان سے کہا۔ "کوئی
ضرورت ہو تو اس خادم کو ضرور یاد کیجئے گا۔"
ابا جان زیرلب مسکرا دیئے اور ہم نے محسوس کیا کہ جس
طرح جلال کے جملے کی کئی تہیں تھیں۔ اسی طرح ابا جان کی
مسکراہٹ میں بھی کئی تہیں چھپی تھیں۔ اب دادامیاں کی انکساری
اور رواداری ابا جان میں بھی آگئی تھی۔ شائد حالات کا یہی تقاضہ
تھا۔ چنانچہ انھوں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "ضرور ضرور"
اس کے بعد جب میں یونیورسٹی کے آخری تعلیمی سال میں
تھا تو جلال ایک بار پھر آیا۔ اس دن اسے دیکھ کر ہمیں یہ محسوس
ہوا کہ جب وہ پچھلی بار آیا تھا تو ہمارے گھر کی کچھ بچی کھچی رونق
بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا جو اب اس کے گرم کوٹ اور اس
کے صاف ستھرے اور اچھی طرح پریس کئے ہوئے کپڑوں
اور اس کی شکل و شباہت سے پھوٹی پڑتی تھی۔
اس بار وہ تھوڑے سے اصرار پر ہمارے ساتھ ہی
صوفے پر بیٹھ گیا۔
اباجان وغیرہ تو آج بھی اسے "تم" ہی سے مخاطب کر رہے
تھے لیکن ہم لوگ اسے "آپ" کہہ رہے تھے، کیونکہ اب ہم
ماضی کے قصے تیزی سے تہہ کرنے جا رہے تھے۔ اب ان
ابواب کے کھولنے کا ہمیں بہت کم موقع ملتا تھا۔
جلال نے بتایا کہ بلال نے بی۔ اے کر لیا ہے اور اب
وہ اسے کسی کام میں لگانا چاہتا ہے۔ وہ دو گھنٹے بیٹھ کر جانے
لگا تو اس نے ابا جان سے کہا ۔۔۔
"بڑے صاحب اگر بھیا کا یہاں کوئی سلسلہ نہ ہو سکے
تو آپ انھیں کلکتہ بھیج دیجئے۔"
ابا جان نے آج بھی اسے وہی مختصر سا جواب دیا
جو آج سے کئی سال پہلے دے چکے تھے "ضرور ضرور"۔
لیکن جب وہ چلا گیا تو انھوں نے برا سا منہ بنا کر کہا
"چھوٹے آدمیوں کے یہی طور طریقے ہوتے ہیں۔ تمھیں
بھی اپنے کارخانے میں مستری بنانا چاہتا ہے۔"
تب ایک دن راہ میں جلال کے سسر سے ملاقات
ہوئی تو اس نے بلال کے متعلق بتاتے ہوئے کہا۔
"اس عورت سے اسے کوئی اولاد نہیں ہوئی ۔۔۔ بلال
کی ماں کو ماہ بہ ماہ اتنی رقم بھیج دیتا ہے کہ اس کی مزے میں
گذر بسر ہو جاتی ہے۔ بلال کو بھی کہیں بزنس میں لگانا چاہتا
ہے۔"
پھر کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ کلکتہ کے مضافات میں بلال اور
اس کے چھوٹے بھائی نے موٹر پارٹس کی دوکان کھولی ہے۔
کتنے سال اور بیت گئے۔
میں اپنے دفتری روز و شب میں الجھا ہوا تھا۔ ابا جان
اب مستقل گھر پر رہنے لگے تھے کہ اچانک ایک دن جلال
پہنچ گیا۔ اتفاق سے وہ اتوار کا دن تھا اور ہم سبھی لوگ
گھر پر موجود تھے۔
اب وہ مزے میں ہمارے ساتھ صوفے پر بیٹھتا اور

یوں لگتا وہ ہمارے حالات کا صحیح ادراک حاصل کرنے کے بعد اب ہمارے سامنے کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کرتا۔ البتہ آج بھی جب ابا جان اس کے سامنے آجاتے اور وہ سگریٹ پیتا ہوتا تو چپکے سے سگریٹ کو ایش ٹرے میں ڈال کر مسل دیتا۔

اس نے بتایا کہ بڑے لڑکے کے لئے اس نے یہاں موٹر پارٹس مارکیٹ میں ایک دوکان لی ہے۔ کل اس کا افتتاح ہے۔ اسی خوشی میں اس نے آج شام اپنے گھر پر محفل میلاد کا اہتمام کیا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا "دوکان کی پگڑی کتنی دی؟"

اس نے آہستہ سے شہادت کی انگلی اٹھا دی۔

میں نے کہا "ایک لاکھ"

اس نے آنکھوں کے اشارے سے 'ہاں' کہا۔

وہ جانے لگا تو اس نے ابا جان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

" بڑے صاحب چھوٹا منہ اور بڑی بات — آپ ہمارے گھر تشریف لائیے تو ہماری عزت بڑھے گی۔"

اور انھوں نے پھر اسی انداز میں کہا "ضرور ضرور"

شام ہوئی تو ابا جان نے کہا "بیٹا آج کی سب سے بڑی قدر ہے — تم لوگ چلے جاؤ میں کہاں جاؤں گا۔"

اس کا سسرالی مکان کافی بڑا دکھائی دیا۔ معلوم ہوا کہ آس پاس کے کئی ایک مکانات خرید کر اس نے اس مکان کی توسیع کرائی ہے۔

مکان مرکری ٹیوبوں اور سیریل بلبوں کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔

جلال مجھے کنارے لے گیا۔ "یہ سب سرکار مرحوم کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔"

اس کے بعد اس نے بلال سے ملایا۔ ہماری اترن پہنے والا اور پاؤں میں کھڑاؤں کھٹکھٹانے والا میلا کچیلا بلال آج خوبصورت سا سفری سوٹ زیب تن کئے تھا۔

تب ایک دن میں بس اسٹینڈ پر کھڑا بس کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک نئی جیپ وہاں پر آ لگی۔ جیپ سے بلال نے سر نکال کر کہا۔ " دفتر جا رہے ہیں تو آجایئے میں بھی ادھر ہی جا رہا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "نہیں آپ جایئے میں چلا جاؤں گا۔"

لیکن اس کے بے حد اصرار پر با لآخر مجھے جیپ پر بیٹھنا ہی پڑا۔

وہ اپنے کسی کاروباری دوست سے باتیں کر رہا تھا اور میں اس کے پورٹ فولیو میں گم تھا، جس پر 'سید بلال احمد' کا لیبل چسپاں تھا۔

اچانک اس نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"گپتا جی ان سے ملئے یہ ہیں میرے دوست یوسف صاحب۔ ان سے ہمارے خاندانی مراسم ہیں۔ ان کے والد بھی میرے والد کے دوست ہیں۔"

میں نے فی الفور ماضی کے سارے اوراق کو جلا کر خاک کر دیا اور گپتا جی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں ان کے والد میرے والد کے گہرے دوستوں میں ہیں۔"

بقیہ: اردو نثر اور اس کا تعمیری نصب العین

کے ذریعہ، اور شبلی نے سیرت النبیؐ کے ذریعہ انجام دی ہے اس سلسلے میں ایک اور نام کا اضافہ کر لیجئے۔ مولانا مودودی رح کی "تفہیم القرآن" کی نثر ہماری صدی میں اردو نثر میں ایک عہد ساز اضافہ ہے۔ اس نثر کو بنانے، سنوارنے اور سجانے کے لئے یا اس کو ایک خاص اسلوب عطا کرنے کے لئے اور اس میں بے پناہ اثر انگیزی پیدا کرنے کے لئے انھوں نے بہت زیادہ شعوری یا شعوری کوشش نہیں کی ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ نثر اندرون سے، باطن کے کسی سوتے سے پھوٹی ہے اور صفحۂ قرطاس پر نقش ہو گئی ہے، یہی وہ چیز ہے، وہ حقیقت ہے جو اردو نثر کا نصب العین بھی بنتی ہے اور اردو نثر نگاروں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اس کے لئے اس نوعیت کی ہی کوئی تعمیری نہج اختیار کریں۔

مسرور جہاں

مٹی کا مول

جمّا دادا اسکول کے سامنے نیم کے پیڑ کے نیچے بیٹھ گئے۔ بلین کا زنگ خوردہ بکس کھول کر پلاسٹک کی تھیلیاں نکالیں۔ ان میں کمپٹ، ٹافی اور لالی پاپ وغیرہ بھرے ہوئے تھے۔ زمین پر بچھے ہوئے کپڑے پر مٹھائیاں سجا کر وہ انٹرول کا انتظار کرنے لگے۔

جمّا دادا کا یہ روز کا معمول تھا۔ وہ انٹرول سے کچھ دیر قبل آجاتے تھے۔ اور اپنا سامان سجا کر انٹرول کا انتظار کرنے لگتے تھے۔ گھنٹی بجتی ——— تو ننھے منے بچے پھاٹک کھلتے ہی بھرّا مار کر باہر آجاتے اور انھیں چاروں طرف سے گھیر لیتے ——— اور پھر پیاری پیاری سریلی آوازیں دادا کے کانوں میں رس گھولنے لگتیں۔

"دادا ——— ٹافی"

"دادا ——— لالی پاپ"

"دادا ——— میرے اچھے دادا۔ کمپٹ دونا!"

جمّا دادا چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں سامان پکڑاتے جاتے اور خوشی خوشی سب کی فرمائش پوری کرتے ——— بچوں کے ہجوم اور شور و غل میں وہ کسی سے پیسے لینا بھول جاتے تو وہ خود ہی ان کے ڈبے میں پیسے ڈال دیتا۔ کوئی بچہ ادھار مانگتا تو دادا ایسا خوش ہوتے۔ جیسے وہ اپنا حق مانگ رہا ہو۔ کسی کے چہرے پر اداسی کی پرچھائیں دیکھتے تو خود ہی اس کے منہ سے ہاتھ میں لالی پاپ پکڑا دیتے ——— انٹرول ختم ہوتا، تو بچے اچھلتے کودتے ہنستے کھیلتے اندر بھاگ جاتے۔ پھاٹک بند ہو جاتا۔ اور دادا اپنا بکس بند کر کے وہیں لیٹ جاتے۔ نیم کی ٹھنڈی چھاؤں انھیں اپنے گاؤں کی یاد دلا دیتی۔ وہ آنکھیں بند کئے لیٹے رہتے اور ان کا تصور انھیں گاؤں لے جاتا۔ جہاں وہ ہرے بھرے کھیتوں، باغوں اور پگڈنڈیوں پر گھومتے۔ یار دوستوں سے گلے ملتے۔ اس فضا کی مانوس خوشبو کو اپنے اندر سمو لیتے ——— اور چند لمحوں کے لئے یہ بھول جاتے کہ وہ اپنے گاؤں سے دور ہیں۔

جمّا دادا کو دو چیزوں سے پیار تھا۔ ایک اپنے وطن سے اور دوسرے بچوں سے۔ اپنے بچوں کو تو وہ پاکستان میں خود ہی چھوڑ آئے تھے۔ اور اس پیار کو وہ اپنے وطن کے بچوں میں بانٹتے پھرتے تھے۔ ... کہ وہ انھیں بھی اپنا سمجھتے تھے۔ رہا وطن۔ تو اس کے لئے تو انھوں نے اب تک نہ جانے کتنے پاپڑ بیلے تھے۔

برسوں پہلے ان کے گھر کے سب لوگ پاکستان چلے گئے تھے۔ سوکھے اور سیلاب کی مصیبتوں نے انھیں بد دل کر کے ترک وطن پر مجبور کر دیا تھا۔ لڑکوں کے خطوط برابر آرہے تھے۔ وہ اصرار کر رہے تھے کہ وہ بھی چلے آئیں۔ وہ گئے تو ——— لیکن اس وعدے پر کہ چند ماہ رہ کر واپس آجائیں گے۔ دو تین مہینے تو وہ بہت خوش رہے۔ دونوں بیٹے اور بیٹیاں وہاں بے حد خوشحال تھے۔ اور ان کا خیال بھی بہت کر رہے تھے۔ لیکن جلد ہی اس چین آرام اور خاطر مدارات سے دل بھر گیا۔ وطن یاد آنے لگا گاؤں کی یاد ستانے لگی۔ یار دوستوں کی الفت تڑپانے لگی۔ کھیت باغ اور پھونس کا جھونپڑا بلانے لگا۔ تو انھوں نے واپسی کی تیاری کر لی۔ بیٹوں نے پیار محبت سے منع کیا۔ بیٹیوں نے آنسو بہائے پھر بھی وہ نہ مانے تو بیٹوں نے صاف صاف کہہ دیا "اب آپ پاکستانی شہری ہیں ——— ہندوستان سے آپ کا کوئی واسطہ نہیں رہا۔ آپ کو یہیں رہنا ہوگا۔"

جمّا دادا نے یہ سنا تو آپے سے باہر ہو گئے۔ لڑکوں کو

خوب باتیں سنائیں۔ جی بھر کے برا بھلا کہا۔ آخر خاموش ہو کر بیٹھ رہے سب نے اطمینان کی سانس لی کہ چلو وطن کا سودا سر سے اترا اب بڑے میاں آرام سے رہیں گے۔ اکیلی جان وہاں کہاں پڑے رہیں گے۔ ماں کب کی مر چکی تھیں۔ ایک باپ کا دم تھا وہ لوگ چاہتے تھے کہ ان کی خدمت کریں۔ اور انھیں آرام پہنچائیں کہ انھوں نے سب کے لئے کتنے دکھ جھیلے تھے چلچلاتی دھوپ گرم لو اور یخ بستہ شب و روز کا حساب کرنے بیٹھتے تو پتہ چلتا کہ باپ کی زندگی کا بیشتر حصہ اسی میں گذر چکا ہے۔ اب ان کا فرض تھا کہ بوڑھے باپ کو کوئی تکلیف نہ ہونے دیں۔ پوتے نواسے ہر دم ان کے پاس گھسے رہتے۔ کوئی کھانا لا کر سامنے رکھتا۔ کوئی حقہ بھر کے دیتا۔ اور جب وہ لیٹتے تو ننھے منے ہاتھوں سے ان کے پیر دبائے جاتے۔ اور کہانی سنانے کی فرمائش ہوتی۔ وہ بھی ان ننھے منے فرشتوں میں بہلے رہتے۔ رفتہ رفتہ سب کو اطمینان ہو گیا کہ اب وہ کبھی یہاں سے جانے کا نام نہیں لیں گے۔

ایک دن جما دادا چپکے سے گھر سے غائب ہو گئے سب نے ان کو بہت تلاش کیا۔ لیکن وہ نہ ملے۔ قصہ دراصل یہ تھا کہ انھوں نے چپکے ہی چپکے گنڈا سنگھ سے بات کر لی تھی۔ اس کا دھندا یہی تھا۔ وہ ناجائز طریقے سے ادھر کے لوگوں کو ادھر اور ادھر کے لوگوں کو ادھر کرتا تھا۔ دادا نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ وطن پہنچ کر اپنا کھیت اور گھر بیچ کر اس کا پیسہ ادا کر دیں گے۔ گنڈا سنگھ جانتا تھا کہ اس کا روپیہ دودھ پی رہا ہے اس کے آدمی وصول ہی کر لیں گے۔ اس کے ساتھ دھوکہ کرنے والوں کا انجام بھی برا ہوتا تھا۔ اس لئے وہ بے دھڑک کام کرتا تھا۔

جما دادا اپنے گاؤں میں داخل ہوئے تو مارے خوشی کے رونے لگے۔ آموں میں بور آچکا تھا۔ فضا میں بھینی بھینی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ باغوں میں کوئل اپنی سریلی آواز میں کوک رہی تھی۔ رہٹ کی رُوں رُوں جلترنگ سا بجا رہی تھی۔ کھیتوں کے بیچ سے گذرتے ہوئے انھوں نے نم مٹی کا ڈھیلا اٹھا کر سونگھا تو سوندھی سوندھی خوشبو سانس کے ساتھ اندر ان کی روح تک پہنچ گئی اور اس مہک سے ان کی روح ... انھوں نے مٹی کو آنکھوں سے لگایا۔ پھر بڑی عقیدت سے ایک کنارے ڈال دیا۔ اطمینان کی لمبی سانس لے کر وہ آگے بڑھ گئے۔ بستی نزدیک آ گئی تھی۔ کتنا اپنا پن تھا یہاں۔ پردیس میں تو زمین اور آسمان تک غیر اور پرائے سے لگتے تھے۔

حسب وعدہ انھوں نے اپنا کھیت اور مکان بیچ کر روپیہ گنڈا سنگھ کے آدمیوں کو دیدیا۔ اب نہ ان کے پاس ایک بھر زمین تھی۔ نہ سر چھپانے کے لئے ٹھکانہ تھا۔ پھر بھی وہ بہت خوش تھے کہ اپنے وطن میں ہیں غیر جگہ نہیں ہیں کہ فکر ہو۔ کبھی وہ مسجد میں پڑ رہتے۔ کبھی کسی یار دوست کے بروٹھے میں لیٹ رہتے۔ جس کے دو کام کر دیتے وہی ان کے کھانے پینے کا بندوبست کر دیتا۔ گاؤں کی بہو بیٹیوں کو ان سے بڑا آرام تھا۔ بازار۔ ہاٹ کرنا ہو یا بچوں کو سرکاری اسپتال دکھانا ہو۔ دادا ہر کام کے لئے تیار رہتے۔ گاؤں والے بھی انھیں سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ سبھی جانتے تھے کہ وہ عیش آرام چھوڑ کر صرف انھیں کی خاطر آئے ہیں۔ دن رات بے فکری اور اطمینان سے گذر رہے تھے۔ کہ ایک شام سندر سنگھ ان کو تلاش کرتا ہوا آ گیا۔ سندر ان کے پرانے یار مرحوم منور سنگھ کا بیٹا تھا وہ تھانے میں سپاہی تھا۔ اس نے دادا کو چپکے سے بتایا کہ ان کے نام کا وارنٹ ہے۔ الزام ہے کہ وہ پاکستانی شہری ہیں اور ناجائز طریقے سے یہاں رہ رہے ہیں۔

"بیٹا! تم تو جانتے ہو کہ میرے باپ دادا۔ اور ان کے بھی باپ دادا یہیں پیدا ہوئے۔ اور یہیں مر کھپ گئے۔ سارا خاندان یہیں کی مٹی میں دفن ہے۔ میں تو بس تھوڑے دنوں کے لئے پاکستان گیا تھا کہ سب کو دیکھ بھال کر چلا آؤں گا وہاں لونڈوں نے جانے کیا ہیر پھیر کی ـــــ کہ مجھے وہاں کا شہری کرا دیا۔ میں تو یہ سوچ کر وہاں سے بھاگ آیا تھا کہ ایک بار اپنے وطن پہنچ جاؤں تو دیکھتا ہوں میرا کوئی کیا بگاڑتا ہے؟ میں تو یہ سوچ کر وہاں سے بھاگ آیا تھا کہ ایک بار اپنے وطن پہنچ جاؤں تو دیکھتا ہوں میرا کوئی کیا بگاڑتا ہے؟

دادا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ سندر سنگھ بھی آبدیدہ ہوگیا۔ انھیں دلاسا دیتے ہوئے بولا۔

"چاچا! تم ایسا کرو کہ راتی رات یہاں سے نکل جاؤ۔ کل جب سالا تھانیدار آئے گا اور تمہیں غائب پائے گا تو آپ ہی رپورٹ دیدے گا کہ جمال عرف جما یہاں نہیں ہے۔

سندر اپنی بات کہہ کر ہنسنے لگا۔ جیسے وہ دل ہی دل میں تھانیدار کی ناکامی سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔ دادا بھی دھیرے سے مسکرا دیئے۔ پھر فکرمندی سے بولے سندر اس کے بعد کیا ہوگا؟ کیا میں اپنے گاؤں اور اپنے وطن سے نکال دیا جاؤں گا؟ کیا اسی کی خاطر میں نے اپنے بال بچوں کو اور عیش و آرام چھوڑا تھا؟ کھیت اور گھر قربان کیا تھا۔؟ اسی لئے ——

اسی لئے —— ؟

"چاچا! اتنا بڑا ملک ہے، پولیس سالی تم کو کہاں ڈھونڈے گی؟ ایک جگہ نہ ٹکنا۔ تھوڑے تھوڑے دنوں کے بعد جگہ بدل دینا۔"

"بیٹا! — اپنے ہی وطن میں چوروں کی طرح بھاگتے پھرنے سے تو اچھا تھا کہ غیر ملک میں رہ جاتا۔ یہ ذلت تو نہ اٹھانا پڑتی پولیس تھانے کا خوف تو نہ ہوتا۔ بھلے ہی وطن کے لئے رو رو کر مر جاتا۔ — دادا روہانسے ہوگئے۔ دربدری کے خیال سے ان کا دل بیٹھا جارہا تھا۔

"سارا کیا دھرا تو تمہارے بیٹوں کا ہے۔ سوچا ہوگا کہ اسی طرح پکڑ بلائیں۔"

"ہاں بھئی۔۔ وہ وہاں چار پیسے کمانے لگے ہیں۔ وطن کی روکھی سوکھی کا مزہ کیا جانیں —؟

سندر ان کو سمجھا بجھا کر چلنے لگا تو بے اختیار ان سے لپٹ گیا۔ دونوں رو رہے تھے۔ سندر نے ان کی جیب میں پچاس روپئے زبردستی ڈال دیئے۔ جما دادا سندر کے جانے کے بعد بھی روتے رہے۔ ان کے سامنے ایک ایک کرکے سارے منظر گذر رہے تھے۔ وارنٹ، گرفتاری۔ جیل سزا۔ اور پھر —— پھر جلاوطنی۔

دادا نے حسرت سے گاؤں پر نگاہ ڈالی اور پھر اندھیرے میں گم ہوگئے۔ گاؤں کے آخری چھور پر پہنچ کر انھوں نے تھوڑی سی مٹی اٹھا کر انگوچھے کے کونے میں باندھی۔ آنکھوں سے لگائی۔ اور مرے مرے قدموں سے آگے بڑھ گئے۔ ان کے پاؤں اس وقت من من بھر کے ہو رہے تھے۔ اور نظروں کے سامنے تاریکی کی دبیز چادر تنی ہوئی تھی۔ کہ دو قدم کے فاصلے کی چیز بھی نظر نہیں آرہی تھی۔

سندر سنگھ کی ہدایت کے مطابق وہ تھوڑے تھوڑے دنوں کے بعد جگہ بدل دیتے تھے۔ ہر جگہ زمین اتنی ہی مہکی مہکی تھی۔ جیسی گاؤں کی تھی اور ہر جگہ آسمان ویسا ہی وسیع۔ نیلا اور مہربان تھا۔ بول چال، رسم و رواج ضرور الگ تھے۔ لیکن ان دیکھی مضبوط ڈور نے سب کو ایک دوسرے سے باندھ رکھا تھا۔ یہ ڈور تھی — ہم وطنی کی۔ یہ رشتہ تھا زمین کا۔ اور یہ محبت تھی مٹی کی۔ جس کا مول چکانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی یہ تو کسی کسی کے مقدر میں ہوتا ہے۔

جما دادا اب تھک چکے تھے۔ ان کے حوصلے پست ہوگئے تھے۔ کب سے چل رہے تھے۔ آج یہاں کل وہاں۔ ان کو یہ جگہ بھا گئی تھی۔ اسکول کے بچوں میں جی لگ گیا تھا۔ وہ اپنے بچوں کو بھی بھول سے گئے تھے۔ جب کبھی گاؤں کی بہت یاد ستاتی تو وہ اپنے انگوچھے کے کونے میں بندھی ہوئی مٹی کو آنکھوں سے لگا لیتے۔ اور انھیں محسوس ہوتا کہ وہ اپنے گاؤں سے دور نہیں ہیں۔ کتنا سکون تھا مٹی کے اس حقیر سے ڈھیلے کے بس میں!

حسب معمول دادا نے نیم کی چھاؤں میں چادر بچھائی اور سستانے کے لئے لیٹ گئے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا نے تھپکیاں دیں۔ اور سرسراتی ہوئی ہواؤں نے لوریاں دے کر انھیں سلا دیا۔ ذرا دیر میں وہ خوب میٹھی گہری نیند کے مزے لینے لگے۔

دادا —— او دادا —— اٹھو ——

کسی نے ان کا بازو ہلایا۔ وہ جاگ پڑے۔ نھو چاٹ والا ان کے پاس کھڑا تھا۔ وہ ان کے ساتھ ہی اسکول کے سامنے چاٹ کا ٹھیلا لگاتا تھا۔ چند ہی دنوں میں اس سے اچھی خاصی یاری ہوگئی تھی۔

ننھو کے پاس ہی۔ عین ان کے سر پر تین سپاہی کھڑے تھے
خاکی وردی ——— ہاتھ میں موٹے موٹے ڈنڈے ——— اور گھنی
مونچھوں کے پیچھے چھپی ہوئی مکار ہنسی۔
بڑے شیطان لگ رہے تھے وہ تینوں۔
کیا بات ہے بھیا۔؟
دادا نے ننھو سے پوچھا۔
"منشی جی تھانے سے آئے ہیں۔ تم کو داروغہ صاحب نے بلایا ہے" ننھو نے اطلاع دی۔
"ہاں ——— ہمارے ساتھ تھانے چلو"
ایک سپاہی نے کرخت آواز میں بڑے رعب سے کہا"
ہمارا قصور کیا ہے بھائی۔ بوڑھے آدمی ہیں۔ دو پیسے کا دھندا کرتے ہیں نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں"
دادا نے ہاتھ جوڑ کر بہت نرمی اور لجاجت سے کہا۔
"تھانے چلو ——— سب معلوم ہو جائے گا۔"
دوسرے سپاہی نے خواہ مخواہ ڈنڈا لہرایا۔
دادا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ زنگ خوردہ بکس ننھو کے حوالے کیا کہ ایک وہی اس کا دوست تھا۔ اور سپاہیوں کے ساتھ ہو لئے۔ تھانے پہنچے تو داروغہ جی نے فردِ جرم بتائی۔
"تم پاکستانی جاسوس ہو"
"میں ——— میں ——— ارے صاحب میں تو ہندوستانی ہوں۔ سچنڈی گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ میرے پرکھے سب وہیں کی   میں دفن ہیں صاحب ——— میں بھی وہیں کی مٹی میں دفن ہونا چاہتا تھا صاحب ——— لیکن۔"
"تمہارے بال بچے سب کہاں ہیں؟"
"وہ تو ——— وہ تو سب پاکستان میں ہیں"
چا دادا ہکلائے ——— سچ بات آخر منھ سے نکل ہی گئی۔
"اور تم سالے ——— یہاں جاسوسی کرنے چلے آئے ہیں"
تھانیدار کے منھ سے گالیوں کا فوارا ابل پڑا۔
"نہیں نہیں سرکار ——— ایسا نہ کہئے۔ اپنے بال بچوں کو چھوڑ کر۔ چین آرام تیاگ کر میں وطن کی محبت میں آیا تھا

اپنے وطن سے غداری کی بات تو میں سوچ بھی نہیں سکتا صاحب ——— یہ مٹی اس کی گواہ ہے"
دادا نے انگوچھا آنکھوں سے لگایا۔ اور زار و قطار رونے لگے۔ پھر وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولے۔
"یقین مانئے سرکار۔ اس وطن کی خاطر در در کی ٹھوکریں کھا رہا ہوں"۔
تھانیدار نے ان کی ایک نہ سنی اور حوالات میں بند کرنے کا حکم دیدیا ——— اور پھر مقدمہ ——— عدالت ——— اور جیل سارے منظر دادا کی نظروں کے سامنے آ گئے۔
انٹرول ہوا تو بچے بھرا مار کر باہر نکلے اور دادا کے پاس جانے کے لئے ہنسی خوشی دوڑنے لگے۔ لیکن ——— نیم کے نیچے وہ جگہ سنسان پڑی تھی۔ دادا نہیں تھے سبھی بچے مایوس ہو کر ننھو چاٹ والے کے ٹھیلے کی طرف بڑھ گئے۔ اس کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی ——— اسی لئے تو اس نے تھانیدار کی مٹھی گرم کی تھی۔
چا دادا نے اسے اپنا ہم وطن، دوست اور بھائی سمجھ کر اپنی سلوی رام کہانی سنائی تھی ——— اور اب ——— وہ آہنی سلاخوں کے پیچھے بند تھے۔
مٹی کا مول ادا ہو چکا تھا۔
●●

انجم نعیم

آخری لمحہ کا منظر

خون کے دھبے صاف کئے جا چکے ہیں
اور صلیبیں ہٹائی جا چکی ہیں
قبرستانوں کے جسموں سے رستے ہوئے ناسوروں کی سڑاند
گلی کوچوں میں قہقہے لگاتی پھر رہی ہے۔
خالی ڈبہ، ٹین کا ڈبہ، کنستر کا شور۔ پر کٹے کبوتر۔ بلی کی میاؤں
میاؤں، سارے دودھ پی گئی۔ رات کے گھپ اندھیرے میں۔
خاموش رہو۔ بولنا گناہ ہے۔ صاحب آئے۔ صاحب آئے
ہزاروں برس پرانی تہذیب کا ملگجا سا چھوٹا سا ٹکڑا کالر میں تھی
ہے۔ گمان ہے صاحب ہیں۔
مجھے کیا پڑی ہے میں لوگوں سے پوچھتا پھروں۔
بھائی بن باس پرکھوں تلے ہوئے ہو۔ کیا تمہیں گیہوں کے
دانوں سے۔ بانس کی کونپلوں سے، اشوک کے پتوں سے،
بکریوں کے ممیانے سے، تاریک رات میں بھونکنے والے کتوں سے،
اچھا خیر کتوں کا ذکر چھوڑو یہ تو بھونکتے ہی رہتے ہیں۔
تو ہاں! بکریوں کے ممیانے سے۔ کھیت کھلیانوں میں
مادر زاد ننگے دوڑتے ہوئے چار، ساڑھے چار پانچ سال کے
لڑکوں کے قہقہوں سے۔
ارے بھائی کس کس سے اوب چکے ہو۔
مجھے کیا پڑی ہے کہ میں پوچھتا پھروں۔
میں تو بس یونہی سوچتا رہتا ہوں
کہانیاں اپنے پاؤں نہیں چلتیں، چلائی جاتی ہیں۔
کھیت کھلیانوں میں۔ کچی پکی سڑکوں پر، ریل کی پٹریوں
پر، ہواؤں میں، خلاؤں میں، سفید کاغذوں پر۔
کہانیاں اپنے پاؤں نہیں چلتیں، چلائی جاتی ہیں، بلکہ
دوڑائی جاتی ہیں۔
میں نے اونگھتے یکہ بان مظفر سے پوچھا:
میاں کبھی کچی ہڈیوں کو بے دردی سے چبائے جانے کا منظر
تم نے دیکھا ہے؟
کہنے لگا:
آپ کن کچی ہڈیوں کی بات کرتے ہیں؟ ان کی جن کے
ریشوں میں خون کی سرخی نہیں ہوتی؟ جن پر المونیم کے پرت
چڑھا کر مضبوط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے؟ جن کے منہ
سے دودھ کے بھبکے آتے ہیں؟ جن کی آنکھیں منتظروں، بس
منتظروں سے دور ہوتی ہیں یا جن کے ہاتھ پاؤں شاخ گل سے
بھی زیادہ نازک، ریشم کے تاروں سے بھی زیادہ ملائم ہوتے
ہیں؟
اور پھر ان پکی ہڈیوں کا آپ نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ جن کا
لعاب سوکھ چکا ہے، لوہے کی پتیاں جن کے پور پور کو جوڑے
ہوئے ہیں۔ جن کی آنکھوں میں خشک دریاؤں کے ریت کے
بڑے بڑے محل بنے اور ہواؤں کے جھکڑوں نے جنھیں ملبوں
میں تبدیل کر دیا۔ بغیر گارے چونے سے بنے ہوئے محل کی
حقیقت کتنی؟ کوئی ہوا تو چلے، برسات کی بڑھتی چڑھتی
طغیانی کا کیا ذکر۔ وہ تو گارے چونے سے بھی بنے
ہوئے محلوں کو اپنی گود میں سموئے اپنے پچھلے راستوں
پر لوٹ جاتی ہے۔
میاں آپ کن ہڈیوں کی بات کرتے ہیں، ہر ہفتے گھوڑے
کی ٹانگوں میں نئے نعل ٹھکواتا ہوں۔ ہر تیسرے دن سے
گھوڑے کی چال ڈھیل پڑنی شروع ہو جاتی ہے۔ ایک وہ

زمانہ تھا جبکہ الومیاں کے گھوڑوں کو نعلوں کی ضرورت نہیں پڑتی بس سرپٹ بھاگتے پھرتے تھے۔ اب تو لوگوں کی بو سونگھتے ہیں ـــــ کتنے بدبودار لوگ ہو گئے ہیں اب!

مظفر میاں بکتا ہے۔ اسے بکنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ اسے صرف اپنے گھوڑوں کی فکر ہے جو بغیر نال کے دو قدم بھی آگے بڑھنا نہیں جانتے۔

مجھے کیا پڑی ہے کہ میں سب کی پوچھتا پھروں۔

میں تو بس یونہی پوچھتا رہتا ہوں۔

تمہارے دو سال کے بیٹے کا پیٹ پھاڑ کر انھیں بانسوں پر لٹکا یا گیا ہے۔

تمہاری ماں بہنوں کی پستانوں پر زہر آلود ناخنوں کی خراشیں کتنی نمایاں ہیں۔

تمہارے کتنے کڑیل جوان بھائیوں کی رانوں میں دہکتی گرم لوہے کی سلاخیں پیوست کی گئی ہیں۔

تمہارے بوڑھے باپ کو کھردری سڑکوں پر گھسیٹ گھسیٹ کر کب مار دیا گیا ہے۔

رائفل بردار جوانوں کے بوٹ کی دھمک کتنی بستیوں گلی کوچوں میں آوارہ وار گھومتی پھری ہے۔

کتنی مسجدوں کے محرابوں کی کمانیں توڑ ڈالی گئی ہیں۔

تم تو اصول کی بات کرتے ہو۔ جہاں سے خلوص کی سرحد ختم ہوتی ہے وہیں سے اصولوں کی اونچی دیواریں نظر آنی شروع ہو جاتی ہیں۔ اتنی اونچی دیواریں جن پر سے حق و انصاف کے لرزیدہ بت چھلانگ لگا لگا کر خودکشی کرنے میں لذت محسوس کرتے ہیں۔

یہ نہ بھول جاؤ تاریخ ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔

بھائی یہ سب مجھے بھی معلوم ہے۔ میں بھی اپنی کھولی کے ٹٹیوں کی سوراخوں سے سارے منظر دیکھتا ہوں۔ تم کبھی ہڈیوں کے چبائے جانے کی بات کرتے ہو۔ ماں بہن کے جسموں کے نازک مقام پر زہر آلود ناخونوں کی خراشوں کی بات کرتے ہو، مسجدوں کے محرابوں کے روندے جانے کی بات کرتے ہو اور نہ جانے جنون میں کیا کیا بکتے ہو۔

میں بھی سب کچھ دیکھتا ہوں۔ میں بھی جوانوں کے سروں پر لوہے کی خود اور اس پر سبز پیتیوں کی بہار دیکھتا ہوں۔ میں بھی سڑکوں پر دہرائی جانے والی کہانیوں کو کان لگا کر رات بھر سننے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن پر لذت نغموں کے شور، آہوں اور کراہوں کو پھیلنے بڑھنے نہیں دیتے۔

اور پھر آہوں کراہوں میں دم ہی کتنا ہوتا ہے۔

اور پھر مجھے کیا پڑی ہے کہ میں سب کی سنتا پھروں۔ میں تو بس یونہی سنتا رہتا ہوں۔ روز ہی سنتا رہتا ہوں!

مجھے روز اخباروں کی سرخیاں پڑھنے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ ہر صبح ایسا لگتا ہے کہ خون سے بھرے گلاس اپنے خشک حلق میں انڈیل رہا ہوں۔ بڑا بدمزہ لیکن کڑوا نہیں آج تو میں نے سوچ لیا ہے کہ نہ اخبار کی سرخیاں ہی پڑھوں گا اور نہ اس کے ساتھ گھنٹوں بیکار موضوعات پر گفتگو ہی کر کے چالیس پیسے والی کم بخت کڑوی کسیلی چائے سے اپنے منہ کے مزے کو مزید خراب کروں گا۔

ہنھ: اسے یہ کیا ہے وفائی! اپنا ہی دوست ہے پڑھا لکھا، خیالات کے اونچے اونچے پل باندھتا ہے۔

کہہ رہا تھا:

ہم تم مل کر سارے بڑے تھن والی بکریوں کو مار ڈالیں گے۔ جو نہایت معصومیت کے ساتھ ہمارے ہرے بھرے کھیتوں سے اناج کی پھلیاں کھا جاتی ہیں اور ہم انھیں یہ سوچ کر معاف کر دیتے ہیں کہ یہ دودھ دینے والی بکریاں ہیں جن سے کتنے ہی ایسے بچے پلتے ہیں جن کی ماؤں کے دودھ باجرے کی خشک روٹیوں اور پیاز کی آنڈیوں کے کھانے سے چٹخ چکے ہیں۔

وہ اب بھی بڑا انقلابی معلوم ہوتا ہے۔ جب کبھی وہ اپنی پرانی کہانیاں سناتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ کسی ماورائی دنیا کا عجیب الخلقت انسان ہے جو بس پل بھر میں دو چار منتر پڑھ کر سارے کے سارے منظر بدل دے گا۔ اسے منظر بدلنے کے فن پر بڑا ملکہ ہے۔ اسے طرح طرح کی آوازیں بھی خوب نکالنی آتی ہیں۔ کتوں کی آوازیں، گدھوں کی آوازیں، جنگلی سوروں کی آوازیں، بیلوں کی آوازیں،

روتے ہوئے بچوں کی آوازیں، اونگھتے ہوئے مزدوروں کی آوازیں، بیٹھے گلے والے سرمایہ داروں کی آوازیں، مایوسانہ آوازیں، چیختی چلاتی آوازیں، طرح طرح کی آوازیں جو کبھی رلا دیتی ہیں، کبھی غصہ سے چہروں کو لال بھبوکا کر دیتی ہیں۔ بڑا ماہر فن ہے، بڑی خوش الحانی سے مرثیے اور رزمیے سناتا ہے۔

ایک دن اس نے مجھے ایک کہانی سنائی تھی:

"ویتنام کی پوری آبادی پر جب امریکی کتے اپنے تیز دانتوں سے پل پڑے تھے اور دیوانہ وار ہزاروں سیکڑوں جوانوں کی سرشت میں اپنے زہریلے لعاب کو داخل کر کے انھیں بھونک بھونک کر مرنے پر مجبور کر رہے تھے اور ملک جوان سورماؤں سے جب آہستہ آہستہ خالی ہو رہا تھا تو ملک کی ہزاروں جوان بیٹیاں افزائش نسل کی خاطر اپنے پچکے گالوں، سوکھی رانوں اور لرزتی پنڈلیوں کے ڈھلتے ننگے جگہ جگہ گھومتی پھرتی تھیں کہ اس سے پہلے کہ ملک کے تمام جوان امریکی کتوں کے تیز دانتوں کے شکار ہو جائیں، ہزاروں کی تعداد میں ایسے بچے جنے جائیں جو جلد سے جلد بڑے ہوتے ہوئے سپاہی سے اپنی قوم کا جھلسا ہوا علم لے کر پھر اپنی جگہ کھڑے ہو جانے کے لائق ہو سکیں۔

اور پھر دنیا نے دیکھ لیا کہ ویتنامیوں نے جنگ جیت لی۔ ہوچی منہ کی ہزاروں کنواری بیٹیوں کو ملک کی خاطر بے شمار بچے جننے پر مقدس ماں کے خطاب سے نوازا گیا۔ اور ان کے وہ بچے ملک کے اعلیٰ عہدوں پر فائز کیے گئے۔ دنیا کی تاریخ ان مقدس ماؤں کی قربانیوں کی ہمیشہ شہادت دے گی۔"

اور پھر اچانک میرے بیچ میں بول پڑنے کی وجہ سے وہ اپنی کہانی ختم کیے بغیر ہی چلا گیا۔ میں نے تو صرف اتنا پوچھا تھا کہ ناجائز بچوں میں کتنی طاقت ہوتی ہے؟ وہ کب تک لڑ سکتے ہیں؟ ——— آخر اس میں اس قدر غصے کی کیا بات تھی۔

مجھے کیا پڑی ہے کہ میں سب سے کہتا پھروں۔

میں نے تو بس یوں ہی کہہ دیا تھا۔

میں نے دوسرے ہی دن ملاقات ہوتے ہی بھید سے پوچھا:

پیارے اس میں بگڑنے کی کیا بات تھی۔ میں نے تو ایسے ہی بیچ میں ایک سوال کر دیا تھا۔ اور پھر کس کس سوال پر بگڑو گے۔ عجیب انقلابی ہو۔

وہ خاموشی بت بنا اپنے چھوٹے سے کمرے میں لکڑی کی مسہری پر پاؤں پھیلائے منہ لٹکائے بیٹھا تھا اور میں اس کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھا اس کے گراموفون پر چڑھے اس سائبریائی شاعر کے نغمے سن رہا تھا جس کے خون سے لکھے ہوئے نغموں کو آج گولڈن پلیٹ میں سجا کر ایوانوں میں سنایا جاتا ہے۔ اور پرولتاری درندے ہاتھ میں اخروٹ کی لکڑی کی چھڑی لے کر قصباتی رقص کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

یک بیک اس کی آنکھوں میں سرخی دوڑ گئی۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو گیا۔

اس کا چھوٹا سا تاریک کمرہ مادر زاد ننگے سانپوں کی رقص گاہ بن گیا۔ سانپ اپنے بلوں سے پھن مارے نکلے اور اڑنے لگے۔ جیسے انھیں پر لگ گئے ہوں۔ ایسے زہریلے سانپ جن کے منہ کی بھاپ سے سنگریزے پانی کے قطروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ایسے سانپ جو آستین نہیں پہچانتے۔ جو صرف بین کی آواز پر سر دھنتے ہیں۔ ایسے سانپ جن کے منہ میں رکھی ہوئی زہر کی پوٹلی نہ طاعون کے چوہوں کو بخشتی ہے اور نہ املی کے پیڑوں پر دوڑنے والی گلہریوں کو معاف کرتی ہے۔

مجھے اور نہ جانے ان جیسے کتنے، بڑی اچھی باتیں بولنے والے حشیش زدہ انقلابیوں کے گھروں سے ایسے بے شمار سانپ نکل نکل کر سڑکوں پر جب رینگنے لگتے ہیں تو پھر وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اس میں کون سائبریا کا وہ قصباتی شاعر ہے جس کے نغموں سے پرولتاری درندوں کے بھاری بھرکم بوٹ تھرکنے لگتے ہیں یا اس میں ہوچی منہ کی کنواری بیٹیوں کے کون مقدس بیٹے ہیں جو اسکولوں میں تمام

لکھواتے وقت اپنے باپ کا نام صرف اور صرف کامریڈ بتاتے ہیں۔

مجھے کیا پڑی ہے کہ میں سب سے کہتا پھروں
میں نے تو بس یوں ہی کہہ دیا تھا
بہت ہی بے ضرر سی بات!
ہماری نسل بھی عجیب نسل ہے۔

جب چاہتی ہے گاؤ تکیہ لگا کر بیٹھ جاتی ہے اور دن بھر لائبریریوں میں جاتے والی کتابوں کی کترنیں اگلنا شروع کر دیتی ہے۔ اور جب چاہتی ہے دو یا تین یا چار ہارس پاور کا موٹر اپنے پاؤں میں باندھ کر سڑکوں پر لنگڑاتی دوڑتی پھرتی ہے۔ نہ جانے کب تھکتی ہے اور نہ جانے کب تھکی ہوئی نظر نہیں آتی۔ کپڑوں میں گوشت پوست اور تیز تیز سانسوں کی دھونکنی والا ڈھانچہ بھی اپنے قد سے بڑے سائے لگاتا ہے اور کبھی اپنے سایوں کو خود کھا جاتا ہے۔

انور اور جمیلہ کالج میں ساتھ ساتھ پڑھتے ہیں، ساتھ ہی ساتھ رہتے ہیں۔

کلنڈر کے ساتھ دیواروں پر لٹکی ہوئی جوانیاں جو ہر روز تاریخ کے ساتھ ایک ایک دن میں ہزاروں سال کی مسافتیں طے کرتی ہیں اور بہت جلد کلنڈر کے بارہ مہینے کے ورقوں کی طرح ڈسٹ بن میں نوچ کر پھینک دی جاتی ہیں۔ آوارہ کتے ان پھٹے ہوئے بے جان اوراق پر اپنی بائیں ٹانگ اٹھا کر پیشاب کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ پھٹے ہوئے کلنڈروں کے اوراق بہت جلد چند قطرے پیشاب میں سڑتے گلتے، اینٹھتے اپنی جان گنوا دیتے ہیں۔

انور اور جمیلہ جو ہماری ہی نسل کی ابھرتی جوانیاں ہیں جن کے چہروں پر آج کے دن کے بے جان رنگ سوکھ رہے ہیں۔

فقیرا بابا کو نہ جانے ہماری نسل کی جوانیوں سے کیوں اللہ واسطے کا بیر ہے۔

کہتے ہیں:

میاں یہ پوری نسل ہمارے سامنے پیدا ہوئی لیکن مجھے بے حد حیرت ہوتی ہے کہ میں نے اپنے باپ دادا سے کبھی یہ نہیں سنا کہ کسی ماں نے ساٹھ سال کے بچے کو جنم دیا ہو جس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی، سانسیں پھولتی ہوئی۔ اور چہرے پر جھریوں سے سمٹ رہے ہوں۔ لیکن میں نے خود دیکھا کہ ایک وقت وہ بھی آیا جب ایک ہی وقت تمام ماؤں نے بوڑھے بچے جننے شروع کئے جن کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں، سانسیں پھول رہی تھیں اور چہروں پر جھریاں لٹک رہی تھیں۔ نہ جانے یہ کیسی مائیں تھیں کیسے بچے جنے۔ بالکل ماورائی۔

فقیرا بابا بکتا ہے، سو گھروں کی روٹیاں چبا کر ٹانگیں مضبوط کر رکھی ہیں جیسے خود کبھی بوڑھا ہی نہیں ہوگا۔ خیر اس سے ہمیں کیا سروکار۔

انور اور جمیلہ ہماری ہی نسل کی ابھرتی جوانیاں ہیں۔

کل چائے خانے میں چالیس پیسے کی کڑوی کسیلی چائے منگائی۔ مجھ سے کہنے لگے۔

ہمارے تمہارے جیسے ہزاروں نوجوانوں کی لکھی ہوئی تقدیروں کے سیکڑوں صفحے روزانہ چائے خانے کی اس بھٹی میں جلا دئے جاتے ہیں جس سے اس کالی چائے کی کڑواہٹ ہمارے نرخروں میں خراشیں پیدا کرتی ہے اور ہم خون تھوک تھوک کر دمہ اور ٹی بی کے مرض سے جان دیدیتے ہیں اب تو ظالم خدا بھی طاعون کی بیماریاں پھیلانے سے ڈرنے لگا ہے۔ اس کی آنکھوں پر لگی ہوئی عینک کے شیشے چمنیوں کی دھوئیں سے سیاہ ہوتے جا رہے ہیں جس سے اس پار کی کوئی چیز اسے نظر نہیں آتی۔

ہماری عمر کے لوگ چالیس پیسے کی کڑوی کسیلی چائے پی کر کیسی کیسی کڑوی کسیلی باتیں کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ کندھے اچکا کر بات کرنے والے یہ نوجوان اخباروں میں ماہر جنسیات کے پتے ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ اور پھر راتوں پر قطار اندر قطار لگائے کالی پیلی گولیاں کھا کر اپنے نفسیاتی خوف کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن پارک کے گھنیرے پودوں کی آڑ اور دریا کنارے کیفے اور ریسٹورانوں کے دھندلے لیمپ کی تاریکی بھی انھیں اس لائق نہیں بنا پاتی

کہ کاغذی گولیاں ان میں عارضی اعتماد بھی پیدا کر سکیں۔
انھیں کیا معلوم کہ گولیاں جان لیتی ہیں زندگی نہیں دیتیں ان کے سسکتے ہوئے چہرے [illegible] شیطانوں کے نیچے کچلے جسموں میں وہ برقی رو دوڑا دیتے ہیں جن سے [illegible] کے نازک تار بلبلا کر ٹوٹ سکتے ہیں قہقہے نہیں لگا سکتے۔

بک اسٹالوں پر ننگے جسم کب [illegible] دستیاب چلتے ہیں جیسے فوراً دوڑ دھائی دیتی [illegible] اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں کانپتے ہاتھوں سے چھپا لینے والے شکست خوردہ سپاہی چہرے سے دو چار قطرے پسینوں کے گرنے کو اگر عیش کوشی سمجھتے ہیں تو پھر بلا سے زمین کے ہونٹ خون آلود ہو جائیں۔ دریاؤں کے تیز بہاؤ میں ہزاروں [illegible] ہو جائیں۔ آہنی خود پہنے دندناتے جوانوں کے زہر آلود ناخن دوشیزاؤں کی شرمگاہوں کو کرید کرید کر زخم آلود کر دیں اور دو تین سال کے بچوں کو پیٹ پھاڑ کر بانسوں پر لٹکا دیا جائے۔ بوڑھے باپ کو کھردری سڑکوں پر گھسیٹ گھسیٹ کر مار دیا جائے۔ کڑیل جوان بھائیوں کی رانوں میں دہکتے گرم لوہے کی سلاخیں پیوست کر دی جائیں۔

انھیں تو بس چلتے ہوئے نوشتۂ تقدیر کے صفحوں پر گرم ہونے والی وہ کڑوی کسیلی چائے کی ایک چسکی کافی [illegible] جو چالیس پیسے میں مل جاتی ہے۔

نہ جانے کتنے انور اور جمیلہ جب چاہیں گے گاؤ تکیہ لگا کر بیٹھ جائیں گے اور دن بھر لائبریریوں میں چبائی جانے والی کتابوں کی کترنیں اگل اگل کر ڈھیر لگاتے رہیں گے۔

نہ جانے اپنی ذات سے اکتاہٹ کا یہ پودا کب تک سرسبز و شاداب رہے گا۔

برسوں پہلے کتب خانوں میں بیٹھ کر جدید فلسفے رٹتے گئے تھے پر آج بھی نہ جانے کتنے جمیلہ دان کے نازک بدن سے منہ لگا کر خون چوستے ہیں اور ہزاروں انور اور جمیلہ دمہ اور ٹی بی کے مرض سے خون تھوک تھوک کر جان دیتے رہتے ہیں
ایک دن وہ بھی آئے گا جب نہ جانے کتنی جمیلائیں ہوچی منہ کی بیٹیوں کی طرح اپنی قوم کے لئے ہزاروں ناجائز بچے جنیں گی اور تاریخ کے صفحے ان کے مقدس ماں ہونے کی شہادت دیں گے۔

مگر یہ بے بس جمیلائیں اپنے باطن کے اس خلا کو کیا کریں گی جس نے ان کے چہروں کو ویران کر دیا ہے۔ اور وہ انور اپنی رانوں میں پیوست ان دہکتی ہوئی سلاخوں کے کرب سے کیوں کر نجات پائیں گے جو ان سپاہیوں کے ہاتھوں میں مشتعل ہو کر انگارہ ہو رہی ہیں جن کے بڑے کوٹ کی اندرونی جیبوں میں عریاں سرورق والے رسالے روپوش ہیں۔

مجھے کیا پڑی ہے کہ میں لوگوں سے کہتا پھروں
لوگ خوب جانتے ہیں
خون کے دھبے صاف کئے جا چکے ہیں
اور صلیبیں ہٹائی جا چکی ہیں۔
قبرستانوں کے جسموں سے رستے ہوئے ناسور کی سڑاند گلی کوچوں میں قہقہے مارتی پھر رہی ہے۔

●●

بازغہ تبسم

وہ ایک چھوٹی سی بات

بے بی فاختہ کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ بیقراری سے کروٹ بدل کر وہ گھاس کے نرم بستر پر اپنا ننھا سا سر مار کر آنکھیں میچ لیتی۔ لیکن پھر سناٹے کو چیرتی ہوئی ایک آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگتی۔

بیٹے! کل صبح میں تمہیں ایک بات بتاؤں گی۔ وہ بات جو میں نے اس بوڑھی عمر کو پہنچ کر سیکھی ہے۔

دادی فاختہ نے رات کو بستر پر اس سے کہا تھا اور فوراً ہی اونگھنے لگی تھی اور بے بی فاختہ اسی وقت خوشی سے جھوم اٹھی تھی۔

چیں — چیں — چیں

اور دادی فاختہ نے جو گہری نیند میں پہونچ چکی تھیں اپنی سرخ سرخ آنکھیں کھول کر اسے گھورا تھا۔ باوجود کوشش کے بے بی فاختہ کی آنکھیں رات بھر جھپک نہ سکیں۔ وہ سوچتی رہی وہ کون سی ایسی بات ہے جو اس کی بوڑھی دادی صرف اسی کو سنانا چاہتی ہے۔

اور وہ بات دادی نے اس بوڑھی مینا کو بھی نہیں سنائی جو دادی کی گہری سہیلی ہے۔ جو ہر صبح سامنے کے پیڑ پر آکر خاموش بیٹھی رہتی ہے۔ اس کا گھر بہت دور ہے۔

وہ بہت بوڑھی ہو گئی ہے۔ اور اس کا رنگ گہرا سیاہ پڑ گیا ہے۔

اور وہ بہت ہی گہری گہری سانس لیتی ہے۔

اسی لئے بے بی فاختہ کو اس سے بہت چڑ آتی ہے۔

جب بھی اس کی دادی اور مینا سامنے کے پیڑ پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ باتیں کرتی ہیں وہ پیڑ کے ارد گرد زور سے چلاتی ہوئی گھومتی ہے۔ تاکہ بوڑھی مینا جھنجھلا کر بھاگ جائے لیکن مینا کو بھی تو دادی فاختہ کی باتیں بہت اچھی لگتی ہیں جیسے کہ خود دادی کی باتوں میں اسے لطف آتا تھا۔

صبح کے وقت جب ہر طرف خاموشی چھائی ہوتی ہے اور زندگی کے ہنگامے گہری نیند کے لحاف سمیٹے ہوتے ہیں اس وقت دادی پیڑ کی نچلی شاخ پر بیٹھ کر بہت ہی سریلا گیت چھیڑ دیتی ہے۔ اور اس کا پر کیف رسیلا گیت سن کر آس پاس کے تمام پرندے اس جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور پہاڑ کے اس پار چھوٹی سی جھونپڑی کی چھت میں رہنے والی وہ بوڑھی مینا بھی اپنے سیاہ پر پھڑپھڑاتی ہوئی اور گہری گہری سانسیں لیتی ہوئی آکر دادی فاختہ کے پہلو میں بیٹھ جاتی ہے۔

پھر دادی فاختہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جھپکا کر تمام پرندوں کو دیکھتی ہے۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آجاتی ہے۔

پھر وہ اپنے ساتھی پرندوں کے ساتھ بہت سی باتیں کرتی ہے۔

اپنے زمانے کی باتیں
ماضی کی یادیں
ہنسی مذاق!

اور سب ہی زور زور سے چہکنے لگتے ہیں۔

چیں — چیں — چیں

اچانک سامنے کی کھڑکی میں ایک جھنجھلایا ہوا نوجوان

نمودار ہوتا ہے اس کے بال شانے تک بڑھے ہوتے ہیں۔

دادی فاختہ کہتی ہے:

جب وہ بہت چھوٹی تھی (اس وقت بھی) انسان کے بال ایسے ہی لمبے ہوتے تھے اور یہ انسان جو آج مدلیسی کپڑوں میں اکڑتا پھرتا ہے پہلے اسے اپنی ہستی کا شعور بھی نہ تھا۔

ہم سب پرندے پہلے اس کی ہیئت پر بہت ہنستے تھے۔

دادی فاختہ جب بھی پہلے زمانے کے انسان کا خاکہ کھینچتی تھی تو بے بی فاختہ کے دل میں ایک خواہش پیدا ہوتی تھی۔

کاش میں بھی اس زمانے میں پیدا ہو کر انسان کی بے بسی اور کسمپرسی کو دیکھتی۔

اسے اس خیال میں غلطاں دیکھ کر دادی فاختہ دلاسہ دیتی۔

بیٹے غمگین نہ ہو۔ یہ نوجوان جسے تم دیکھ رہی ہو۔ غور سے دیکھو اس کے چہرے پر کھنچی ہوئی غم و یاس کی لکیریں، آنکھوں سے جھانکتا ہوا کرب، اس کا ململی لباس، اس کے خوبصورت بکھرے ہوئے لمبے لمبے بال، اس کے اندر کرب کی جو تصویر کھنچی ہے یہی خوفزدہ اور بے بس انسان کی شبیہہ ہے۔ جو آج بھی اس کے اندر چھپی ہوئی ہے۔ اور آج کا انسان اس سے چھٹکارا پانا چاہتا ہے۔ غور سے دیکھو اس کی آنکھوں کے راستے روح میں جھانک کر دیکھو۔

اور سب پرندے غور سے نوجوان کو تکنے لگے۔

اور بے بی فاختہ زور زور سے چیخنے لگی۔

چیں۔ چیں۔ ماضی سے فرار ناممکن ہے۔ زندگی کی غلط تاویل کر کے تم اپنی ذات کی نفی کرتے ہو یا خود اپنی حقیقت سے ناآشنا ہو۔ نہیں! بلکہ تم اپنی شکست کا اقرار کر رہے ہو۔

ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ ہا

وہ زور سے ہنس پڑی اور اس کے ساتھ ہی۔ تمام

پرندے ہنسنے لگے۔

صبح کی پراسرار خاموشی میں ایک ساتھ مختلف آوازوں کا شور سا اٹھا۔

جھنجھلایا ہوا نوجوان پھر کھڑکی میں آیا۔

اس نے اپنے شانے پر رکھے ہوئے تولیہ کو زور سے ہوا میں لہرایا۔

اس کے ہونٹوں سے بھیانک آواز نکلی۔

شوں۔ شوں

بے بی فاختہ سہم کر اڑ گئی۔

اور اس کے ساتھ ہی تمام پرندے آسمان کی وسعتوں میں گم ہو گئے۔

بے بی فاختہ نے گھاس کے نرم بستر پر کروٹ بدل کر اپنی دادی کی طرف دیکھا جو ایک اہم بات اپنی چونچ میں دبائے ابھی تک آنکھیں بند کئے پڑی تھی اور تاریکی کے تھکے ہارے سپاہی صبح کی سرحد کو چھو رہے تھے۔

بے بی فاختہ نے اپنے تاریک گھونسلے سے گردن نکال کر باہر جھانکا۔ کمرے میں اب بھی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کھڑکی اور دروازے بند تھے۔

سبز شیشے کے شفاف روشن دان کے پیچھے سبک سبک اجالا پھیل رہا تھا۔

بے بی فاختہ نے حیرت سے دیکھا۔

آہ! یہ اجڑا ہوا گھونسلہ

چھت کے قریب دیوار میں بنے اندھیرے سوراخ میں اس نے غور سے دیکھا۔

چیں۔ چیں۔ چیں

اندر سے آواز آئی۔

شاید نشیمن پھر سے آباد ہو گیا ہے۔

لیکن وہ ایک بات جو رہ رہ کر یاد آتی ہے۔ وہ بات جو میری ماں نے کبھی سنائی تھی۔ اور وہ جو میں کبھی اپنے بچوں کو سناؤں گی۔

وہ دل کو مسوس دینے والی بات کیسے بھلائی جا سکتی ہے؟

ایک روز بے بی فاختہ کی ماں نے اس سے کہا تھا:
بیٹے! جب میری شادی تیرے باپ کے ساتھ ہوئی ہوئی
تھی۔ تب اپنا گھر اس پیڑ کے تنے میں تھا۔ وہ گھر مجھے ذرا بھی
پسند نہ تھا۔ دن بھر پرندے آکر پیڑ پر بیٹھتے اور چیختے رہتے
تھے۔ اس پیڑ پر بڑی ایک کالی بلی آیا کرتی تھی۔ جس
کی گہری خون بھری سرخ آنکھیں مجھے اپنے پروں کے اندر
جھانکتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ میں اکثر تیرے باپ سے
نئی جگہ گھر بنانے کی ضد کرتی تھی۔ مگر اسے تو محنت کے نام
سے ہی نفرت تھی۔ مجھ پر ہر وقت نئے مکان کی تعمیر کی دھن
سوار رہتی تھی۔

ایک روز میری نظر سامنے مکان کی دیوار میں بنے اس
سوراخ پر پڑی۔

اور دوسرے ہی روز میں نے نئے مکان کی تعمیر
شروع کردی۔

میں نے اپنی چونچ سے چھت کی سخت لکڑی کو توڑ کر
سوراخ کو بڑا کیا۔

پھر دور دور سے گھاس پھونس کے تنکے جمع کر کے لاتی
اور اس سوراخ میں بچھاتی رہی اس طرح یہ آرام دہ مکان تیار
ہوگیا۔

تیرا باپ تو ہر وقت سامنے پیڑ پر بیٹھ کر اونگھا کرتا تھا۔
اس کی ماں نے فخریہ کہا۔

یہاں مکان بنانے کے لئے مجھے بڑی مشکلیں اٹھانی
پڑیں۔ اس مکان کی مالکن ہر روز اپنے نوکر سے اس سوراخ
سے میری لائی ہوئی گھاس کو پھنکوا دیا کرتی، لیکن تھوڑی ہی
دیر بعد میں دوبارہ تنکے وہاں جمع کر دیتی۔ آخر مالکن اور نوکر دونوں
تھک گئے۔ مگر وہ بوڑھا کھوسٹ!؟

اس کی ماں نے نفرت سے گردن جھٹکا کر چونچ اپنے
سینے پر ماری۔ بے بی فاختہ نے دیکھا اس کی ماں کی سخت
چونچ کھلی رہ گئی۔

یہ بے پناہ نفرت کا اظہار تھا۔
اس نے جلدی سے پوچھا

ماں! وہ بوڑھا کیا کرتا تھا۔ ماں!
اس کی ماں نے نفرت سے کہا:

چیں۔ چیں! وہ بوڑھا بیمار تھا۔ اس کے دونوں پاؤں
مفلوج ہوگئے تھے۔ دن بھر سامنے پلنگ پر بیٹھا وہ تسبیح
گھماتا رہتا تھا۔ مسلسل بیماری نے اسے چڑچڑا بنا دیا تھا
اور شاید اسے ہر وقت ختم ہونے والی زندگی کا کھٹکا لگا
رہتا تھا۔ سکون کے لئے وہ دیوانہ بن گیا تھا۔ چاہتا تھا
کہیں سے ایک لمحہ کا سکون مل جائے۔

چند سانسوں کی بھیک!

جب میں گیت گاتی تھی وہ ہاتھ لہرا کے مجھے اڑا دیتا۔
پھر اس نے ایک موٹا سا ڈنڈا اپنے پاس رکھ لیا تھا۔
لیکن میں پھر سے اڑ جاتی اور کبھی اس کے ہاتھ نہیں لگتی۔ اس
وقت مجھے بڈھے کی بے بسی پر بہت ہنسی آتی تھی۔

فاختہ ماں اس وقت بھی بے اختیار ہنس پڑی اور
بے بی فاختہ بھی ہنسنے لگی۔

چیں۔ چیں۔

ماں اب وہ مفلوج بڈھا کہاں ہے۔ نظر نہیں آتا۔

وہ تیری پیدائش سے دو ماہ پیشتر ہی بہت بیمار پڑ گیا
تھا۔ اس کا یہ نوجوان بیٹا باپ کی بیماری سے بہت مضطرب
رہتا تھا۔

ایک حکیم نے اسے مشورہ دیا:
مریض کو چڑیا کا گوشت کھلاؤ۔ اور اس کے جسم پر کبوتر
کے گرم لہو کی مالش کرو۔

پھر اس کا بیٹا مکان میں آنے والی ہر فاختہ پر نگاہ رکھنے
لگا تھا۔

اس کے چھوٹے بھائی بہن ہر وقت غلیل ہاتھ میں لئے
گھومتے رہتے۔

ایک روز میں نے جو منظر دیکھا۔ وہ مجھے دہشت زدہ
کر گیا۔ اسے میں جب بھی یاد کرتی ہوں کلیجہ منہ کو آتا ہے۔
ایک صبح ایک کالے بھدے آدمی نے، جو چہرے سے
خونی ڈاکو لگتا تھا، دو جنگلی کبوتر پکڑ لایا اور نوجوان نے سہمے

ہونے کبوتروں کو تیز چھری سے ذبح کر دیا۔
بڈھے نے ایک ہچکی لی اور دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔
اس روز مجھ پر ایک غشی سی طاری ہو گئی تھی۔
بے بی فاختہ نے محسوس کیا اس کی ماں کا نازک بدن ہولے ہولے کانپ رہا ہے۔ اور دل زور زور سے دھڑک رہا ہے۔
اس کی ماں بھرائی ہوئی آواز میں بولی:
شام ہونے لگی تھی کہ اچانک کسی فاختہ کے چلانے کی گھٹی گھٹی آواز آئی۔
میں نے ڈرتے ڈرتے دیکھا۔
آہ! اس وقت میں مر ہی جاتی تو اچھا تھا۔
تیرے باپ کو اس نوجوان نے بے دردی سے جکڑ رکھا تھا۔
تیرے باپ کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور نرم رنگین پر سارے کمرے میں پھیل گئے تھے۔
فاختہ ماں کرب کے احساس میں ڈوب گئی۔
بے بی فاختہ کے دل سے نفرت کی لہر اٹھی
ظالم۔ قاتل!!
روشن دان کے راستے سبز اجالے کی ایک ہلکی سی کرن اس کے گھونسلے میں در آئی۔
بوڑھی فاختہ نے کسلمندی سے آنکھیں کھولیں۔
بے بی فاختہ نے سوچا:
اب دادی کو [illegible] کی گنتی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔
لیکن [illegible] ذہن میں لمحے کا احساس جاگ پڑا ہے۔
جانے وہ کون سی بات ہے جو دادی مناسب وقت پر مجھ سے کہنا چاہتی ہے؟
چیں۔ چیں چیں!
بے بی فاختہ نے چہچہا کر دادی کو صبح بخیر کہا، اور پھر سے اڑ کر روشندان کے ٹوٹے ہوئے شیشے کی دراز سے نکل کر سامنے پیڑ کی سب سے اونچی شاخ پر جا بیٹھی۔
بوڑھی فاختہ بھی آہستہ سے پھدک کر پہلے روشندان کے ٹوٹے ہوئے شیشے پر بیٹھی پھر آہستہ سے اڑ کر پیڑ کی نچلی شاخ پر بیٹھ گئی۔
چوں چوں چوں
دوسرے ہی لمحے اس نے اپنا مخصوص سریلا گیت چھیڑ دیا۔
آس پاس کے اڑتے ہوئے پرندے پر پھڑپھڑاتے ہوئے آ کر ڈالیوں پر بیٹھنے لگے۔
دور سے کالے کوؤں کی پلٹن کائیں کائیں کرتی آئی اور قطار در قطار جھولتی شاخوں پر بیٹھ کر بوڑھی فاختہ کا سریلا گیت سننے لگی۔
ماحول بالکل پرسکون تھا۔ اور دور تک جاتی سڑک سونی تھی۔ کچھ دوری پر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کے پاس کڑ کڑ کرتی مرغیاں اپنے سوکھے پیروں سے کچرا بکھیر کر دانے تلاش کر رہی تھیں۔ سنہرے بالوں والا مرغ گھانس کے تنکے چونچ میں اٹھا کر کڑوں کڑوں کر کے مرغیوں کو بلا رہا تھا۔ قریب ہی ایک بکری اپنے پانچ خوبصورت میمنوں کے ساتھ چر رہی تھی۔
آسمان ٹی وی کے شفاف اسکرین کی طرح چمک رہا تھا۔ فطرت کی آنکھیں کھلی تھیں۔ اور انسان نیند کے دبیز لحاف میں غافل پڑا سو رہا تھا۔
چوں، چوں، چوں
بوڑھی فاختہ کی سخت چونچ سے سریلا گیت نکل کر فضا میں گونج رہا تھا۔ شائد وہ بوڑھی مینا کو بلا رہی تھی جو خلاف معمول آج ابھی تک نہیں آئی تھی۔
دور ایک درخت پر نوجوان مینا اکیلی بیٹھی تھی۔ غمگین اداس دکھ کی وجہ سے اس کا چہرہ سکڑا ہوا تھا۔
چیں چیں یہاں آؤ
بوڑھی فاختہ نے زور زور سے گردن ہلا کر اسے بلایا۔
نوجوان مینا خاموش اداس بیٹھی رہی۔
چیں چیں اے کالی مینا۔ یہاں آؤ۔ آخر تم اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہو، تم نے دادی کی آواز نہیں سنی؟
بے بی فاختہ نے اپنی دادی کی حمایت میں مینا کو آواز دی۔

اچانک دادی فاختہ شاخ پر زور سے پھدکی۔

چیں چیں چیں

وہ زور سے چلائی ــــ اور غصہ سے چونچ اپنے پروں پر مارنے لگی۔

اے ننھی فاختہ تیرے پر بہت خوبصورت ہیں اور رنگین بھی!! اور اس نوجوان مینا کے پر سیاہ ضرور ہیں۔ لیکن تونے ان سیاہ پروں کے اندر جھانک کر نہیں دیکھا۔ اس کا دل بہت سفید ہے اور حساس۔ بوڑھی فاختہ تھوڑی دیر کے لئے رکی اس نے نفرت سے اپنی پوتی کی طرف دیکھا۔

ادھر آؤ اے پیاری مینا!

بوڑھی دادی نے پھدک کر اپنا رخ دوسری طرف کر لیا۔

نوجوان مینا آکر بوڑھی فاختہ کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

بوڑھی فاختہ نے کہا:

اے ننھی فاختہ۔ غور سے دیکھ ان پروں کو قدرت نے اسے کتنی خوبصورتی سے سنوارا ہے۔ اور اس نے اپنی پرواز میں کتنا قرینہ اور تیزی پیدا کر لی ہے۔ اس کی آواز بھی بہت خوبصورت ہو گئی ہے۔

بوڑھی فاختہ نے گہری نگاہ سے نوجوان مینا کے صاف پروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

اے ننھی فاختہ تم اپنی پرواز پر نگاہ رکھو۔

بوڑھی فاختہ نے اپنے پہلو میں بیٹھی نوجوان مینا سے آہستہ سے پوچھا آج بوڑھی مینا کیوں نہیں آئی۔

نوجوان مینا نے کچھ دیر خاموش رہ کر کہا۔

وہ بوڑھی مینا بھی انسانی ظلم کا شکار ہو گئی۔ اس نوجوان نے اسے غلیل کا نشانہ بنا کر ہلاک کر دیا۔

بوڑھی فاختہ کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے دو شفاف قطرے آنسو ٹپکے۔

یہ رنگین پروں والی فاختہ کی طرف سے بوڑھی مینا کے لئے خراجِ عقیدت کا مقدس تحفہ تھا۔ جو موتی بن کر بے بی فاختہ کی آنکھوں میں چمک رہا تھا۔

نوجوان مینا کا چہرہ دکھ سے مرجھا گیا۔

تمام پرندے جیسے اپنی جگہ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔

بے بی فاختہ نے کہا۔ ظالم۔ قاتل۔

اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ زمین و آسمان گونج اٹھے۔ پھر سب ہی پرندوں نے اپنی اپنی آوازیں بلند کیں۔ ایک شور سا اٹھا سامنے کی کھڑکی میں وہ جھنجھلایا ہوا نوجوان پھر سے نمودار ہوا۔ اور میز پر رکھی کنکریاں اٹھا کر پرندوں کی طرف پھینکنے لگا

تمام پرندے ایک ساتھ اڑ گئے۔

لیکن بے بی فاختہ اور اس کی دادی دونوں پیڑ کی سب سے اونچی شاخ پر بیٹھی رہیں۔

بے بی فاختہ بدستور چیخ رہی تھی۔

چیں چیں چیں

نوجوان نے بڑا سا ایک کنکر اس کے کھینچ مارا۔

بے بی فاختہ اڑ کر اس کے سر کے اوپر کھڑکی کی سلاخ پر بیٹھ کر چلانے لگی۔

چیں چیں چیں

اس کی تیز آواز کمرے کی خاموشی میں ناگوار لگ رہی تھی۔

نوجوان اس کے پیچھے جھپٹا۔

بے بی فاختہ بجلی کی سی سرعت سے اندر تجربہ گاہ میں داخل ہو گئی اور میز پر رکھی کانچ کی نازک نلی کو چونچ کا ٹھونگا مار کر نیچے گرا دیا۔

ایک چھناکہ ہوا اور بے رنگ سیال فرش پر دور تک بہتا چلا گیا۔ اب نوجوان کی حالت خونخوار درندے سے بھی بدتر تھی۔ وہ جنونی انداز میں جھپٹا۔ اور کئی کنکریوں سے ایک ساتھ بے بی فاختہ پر حملہ کر دیا۔

وہ پھر سے اڑ گئی۔ جب وہ پیڑ کے قریب سے گزری تو بوڑھی فاختہ نے آہستہ سے کہا:

تم قدرت کو عاجز نہیں کر سکتے ہاں مگر اس سے انحراف کر کے تم اپنا ہی نقصان کرتے ہو۔

بے بی فاختہ نے غور سے سنا۔ کیا یہی وہ چھوٹی سی بات تھی جو دادی فاختہ صرف اس کو سنانا چاہتی تھی۔

بے بی فاختہ نے سوچا اور اس مقدس امانت کو پروں

بقیہ صفحہ … پر

نئی ادبی مطبوعات

کتاب: "چراغ پھولوں کے"
مصنفہ: مسرور جہاں
ناشر: کریسنٹ پبلشنگ کمپنی، عبد القادر مارکیٹ
جیل روڈ، علی گڑھ
قیمت: دس روپئے

ایک زمانہ سے مسرور جہاں ناول نگار کی حیثیت سے معروف رہی ہیں۔ لیکن تین سال پہلے انھوں نے اپنا پہلا افسانوی مجموعہ پیش کیا، اور اب دوسرا مجموعہ منظر عام پر آیا ہے۔ وہ ناول کے مقابلہ میں افسانہ کو زیادہ اہم تصور کرتی ہیں۔ شاید نثری تخلیقی اصناف میں اس کی حیثیت بھی ان کے نزدیک غزل سے کم نہیں۔ یہ مجموعہ پندرہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ اسے انھوں نے الیس آئی ایم کے شاہینوں کے نام "منسوب کیا ہے۔ توضیحی تحریر میں بڑا اخلوص اور درد ہے۔ اس مجموعہ پر مقدمہ یا پیش لفظ نوجوان ادیب ابن رسا نے لکھا ہے اور اسے نقطۂ نظر کا عنوان عطا کیا ہے۔ لیکن میں اسے زاویۂ نظر قرار دوں گا کیوں کہ انھوں نے افسانہ نگار کے مطالعہ کے لئے ایک زاویۂ نظر اختیار کیا ہے جس میں مسرور جہاں کے فنی مقام پر ان کے یہاں مقصدیت کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ ابن رسا نے بہت سی کام کی باتیں کہی ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مسرور جہاں اپنے افسانوں میں گداز (PATHOS) کو خاص اہمیت دیتی ہیں۔ کہانی پن نہ صرف ان کے یہاں نمایاں ہوتا ہے بلکہ بے حد رچا بسا ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف متوسط طبقہ کی زندگی کو پوری تفصیل کے ساتھ پیش کرتی ہیں بلکہ ان کرداروں کو ان کی اصل شکل میں اور جزویات کو باریک بینی کے ساتھ ضبط تحریر میں لاتی ہیں۔ ان کے یہاں ملوکی (فیوڈل) معاشرہ کی سسکتی تہذیب کی عکاسی ضرور ہے لیکن اس مسمار ہوتے ہوئے معاشرہ میں سے بھی وہ مثبت اور صالح معاشرہ کی نورستہ کونپلوں کو ڈھونڈ نکالتی ہیں۔ البتہ ہمیں اس وقت ایک دھچکا سا لگتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ مسرور جہاں فرسودہ رسوم اور ٹونے ٹوٹکوں کو توہم نہیں عقیدہ یا ایمان کا جزو تصور کرتی ہیں۔

مسرور جہاں افسانوں میں آزمائی ہوئی کلاسیکی تکنیک کی وفادارانہ پاسداری کرتی ہیں اور کلائمکس / عروج کی شدت اور حل کے غیر متوقع پن سے قاری کو مسحور کرتی ہیں۔ اس لحاظ سے وہ خاصی کامیاب ہیں۔ اور ان کی پختہ کاری اپنا اعتراف کرا لیتی ہے۔ اگر نئی نسل کے خوشبودار پھول ان سے نئے فنی تجربوں کی توقع رکھیں تو بے جا نہ ہوگا۔ (ابن فرید)

کتاب: "صدی مانگتی ہے نذرانہ"
مصنفہ: بازغہ تبسم
تقسیم کار: کریسنٹ پبلشنگ کمپنی، عبد القادر مارکیٹ
جیل روڈ، علی گڑھ
قیمت: پندرہ روپئے۔

نئی نسل کی تازہ کار افسانہ نگار خاتون کا یہ پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ جسے انھوں نے نئی دنیا کے نام معنون کیا ہے۔ اس کا پیش لفظ انجم نعیم نے لکھا ہے۔ انجم نعیم کی تحریر میں خاصی گھن گرج ہے۔ بڑے بڑے دعوے ہیں، اور نفی و اثبات کا ٹکراؤ ہے۔ لفظیات میں نئے پن اور جملوں کی ساخت میں جدت

انھیں ایک خاص موقف عطا کرتی ہے۔ بازغہ تبسم نے بھی دو صفحات میں اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کی کوشش کی ہے ان کے دیباچہ کا یہ آخری جملہ بڑا معنی خیز ہے: "میں صدیوں پر محیط ایک مٹتا لمحہ ہوں جو وقت کے عروج و زوال کی داستانیں سمیٹنے آتا ہے۔"

اس مجموعہ میں انیس افسانے شامل ہیں جن کے عنوانات میں نیا پن ہے۔ انداز تحریر میں بھی تازگی ہے۔ زیادہ اہمیت کہانی پن کو نہیں دی گئی ہے۔ بلکہ اس مرکزی خیال کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے جس نے افسانہ نگار کے قلم کو مہمیز کیا ہے۔ بازغہ تبسم نے چوں کہ پلاٹ کو خصوصی اہمیت نہیں دی ہے۔ اس لئے ان کے افسانے خود کلامی، تاثر انگیزی، تجریدی اور ایمائی بیان سے خاصے قریب ہو گئے ہیں۔ شائد اسی وجہ سے ان کے افسانے کافی مختصر بھی ہو گئے ہیں۔ البتہ کبھی کبھی وہ مربوط کہانی کی طرف بھی متوجہ ہو گئی ہیں۔

انھوں نے اپنے افسانوں میں مقصدیت کو غیر معمولی اہمیت دی ہے۔ بعض اوقات وہ اسے اس حد تک واضح کر دیتی ہیں کہ یہ افسانہ کے لئے بوجھل بن جاتی ہے۔ ان کے پیراگراف طویل ہوتے ہیں۔ نقطوں کے استعمال کا انھیں خاص شوق ہے مکالمات کو ڈرامائی انداز کے بجائے بیانیہ انداز میں پیش کرتی ہیں۔ زبان کی صحت کی طرف سے غیر محتاط ہیں۔ ان خامیوں کو دور کرنے کی اگر وہ کوشش کریں تو ان سے اچھی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

بازغہ تبسم کا حوصلہ بہر حال لائق ستائش ہے کہ انھوں نے اپنی صالح تخلیقی صلاحیتوں کی نشو و نما کے لئے قلم ہاتھ میں لیا ہے اور افسانہ کے فنی پیکر میں کچھ کہنے کی کوشش کی ہے

(ابن فرید)

کتاب : **خود کلامی**
شاعر : اظہر عنایتی
ناشر : اظہر عنایتی ایڈوکیٹ، محلہ شیخ کا پھر، رام پور (یوپی)
قیمت : پندرہ روپے

اس مجموعہ کلام کے گرد و پیش کے تمام اطراف اور اندرونی صفحات میں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، احسان دانش، پروفیسر ظفر احمد صدیقی، مالک رام، عرشی زادہ، ڈاکٹر شارب ردولوی، نازش نیازی، پروفیسر آفتاب شمسی اور پروفیسر سید نجم الدین نقوی کی موافقتی آرا اس طرح صف بندی کئے ہوئے ہیں کہ کچھ کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ واللہ اعلم، کہیں مبصر خود زد میں نہ آ جائے اور کسی بڑی رائے سے سر ٹکرا جائے بہر حال احتیاط شرط ہے۔

اظہر عنایتی نوجوان شاعر ہیں، اچھے شاعر ہیں، ان کی بنیادی تربیت کلاسیکی شاعری کی ہے، ان کی لفظیات میں بھی روایت کا رچاؤ کافی حد تک محسوس ہوتا ہے۔ اس لئے جب وہ اپنی اصل روش سے ہٹنے کی کوشش کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ نئے پن کے لئے سیلاب زدہ تالاب میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہوں۔

ان کے مجموعہ کلام "خود کلامی" میں اکثر اچھے اشعار مل جاتے ہیں۔

راستوں کا غبار شاہد ہے
ہم بھی گذرے ہیں آندھیوں کی طرح

وہ فاصلہ جو ہے گمنامیوں سے شہرت تک
شعور ذات سے پہلے کہاں نظر میں تھا

کیا عجب شخص تھا جس نے مجھے یہ ذہن دیا
یاد رکھنے کی ہر اک بات بھلا دی جائے

ہر ہر قدم پہ آئنہ بردار ہے نظر
بے چہرگی کو کوئی کہاں تک چھپائے گا

شکستِ خواب کی پرچھائیاں ہیں
مری آنکھوں میں ویرانی نہیں ہے

آب جو سے چاند آگے کیا بڑھا
ڈوب کر پانی میں منظر رہ گیا

لوگ پہچان لیا کرتے ہیں جانے کیسے
میری آواز کا قد بھی نہیں چہرہ بھی نہیں

کوئی تعبیر لاؤ اب تو اظہر
حسیں خوابوں سے میں اکتا گیا ہوں

ان ساعی کوئی وضع کا پابند نہ ہوگا
قدموں کو بھی آواز بدلنے نہیں دیتے

لاکھ تدبیر کریں ظلمتیں لانے والے
تیرگی سینۂ خورشید میں اترے کیسے

جلتا ہے تو جل جائے اجالوں کیلئے گھر
ٹوٹے تو کسی طرح اندھیروں کا یہ پندار

موسم کی طرح رنگ بدلتے ہوئے لوگو!
سورج کبھی ابھرا ہی نہیں سمت بدل کے

سورج ڈوبے کے خوش تھے بہت تیرگی پسند
اور یہ بھی تھا گماں ابھر کر نہ آئے گا

جس مجموعۂ کلام میں عجلت کے ساتھ تلاش کرتے ہوئے اتنے بہت سے اچھے اشعار مل جائیں اسے اچھا ہی کہنا چاہئے مجھے خوشی ہے کہ اظہر عنایتی کے کلام میں صالح، صحت مند اور تعمیری جہت خاصی نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنے ہم عصروں کی دل جمعی کے لئے بھی بہت سے شعر کہے ہیں، لیکن ان کا اپنا زندگی کا سفر روشنی کی جہت کی طرف ہی نشاندھی کرتا ہے۔

اظہر عنایتی کے یہاں ہمیں بعض کلیدی الفاظ بڑی کثرت کے ساتھ ملتے ہیں، جیسے بچپن، کھلونے، سفر، راستہ، چہرے، آئینہ، شجر، فاصلے، وقت، سورج، چاند اور خواب ان سب میں مرکزی حیثیت وقت، سفر اور مستقبل کو حاصل ہے۔ اگر ان تمام کلیدی الفاظ کو مربوط کیا جائے تو اظہر عنایتی کے کلام میں ایک خاص معنویت پیدا ہو سکتی ہے۔ مجموعہ کلام کی ابتدا میں حمدیہ غزل بہت اچھی ہے لیکن نعتیہ غزل کمزور ہے۔

بعض الفاظ اور ترکیبیں انگیز نہیں ہو پائیں۔ صفحہ ۲۹ پر "چو دھا" کانوں کو بھلا نہیں لگتا۔ صفحہ ۳۱ پر "کچھ کچھ" خلاف محاورہ ہے۔ صفحہ ۴۷ پر "السیل" غیر معمولی طور پر مقامی تخفیف کا شکار ہے صفحہ ۸۳ پر "زہر دں" قواعد کی رو سے غلط ہے۔ صفحہ ۹۹ پر "بچھڑا" کے بجائے "بچھڑے" ہونا چاہئے تھا صفحہ ۱۱۵ پر دوسرے شعر کا پہلا مصرع اس طرح درج ہے

"شب خون جس پہ مارنے میں بیٹھے ہیں چند لوگ" شاید یہ کتابت کی غلطی ہو۔ صفحہ ۱۱۶ پر مقطع کا پہلا مصرع اس طرح شائع ہوا ہے "اظہر! کسے صدائیں لگاتے ہو تم یہاں" میری ناقص رائے میں صدائیں لگانے کے معنی شائد بھیک مانگنے کے ہوتے ہیں۔ صدا دینا ممکن ہے زیادہ مناسب ہوتا۔

اظہر عنایتی نوجوان شاعر ہیں، ان کے اندر اچھی شاعری کے بڑے امکانات ہیں، اس لئے ہم انھیں خوش آمدید کہتے ہیں۔

(ابن فرید)

کتاب: سرِ محفل
مصنف: حسن البنا شہید
مترجم: محمد حنیف ایم اے
ناشر: کریسنٹ پبلشنگ کمپنی، عبد القادر مارکیٹ جیل روڈ، علی گڑھ
قیمت: چھ روپئے

۲۲۴ صفحات کی یہ کتاب حسن البنا شہید کے چند مختصر مقالات کا اردو ترجمہ ہے، جس میں فہم کی گہرائی اور دل کی دنیا کو زیر و زبر کر دینے والی تاثیر موجود ہے۔ مصنف شہید محتاج تعارف نہیں، موجودہ عالمی اسلامی تحریک کے سرخیل تیغ و قلم کے شہسوار اور قول و عمل کے دھنی تھے اپنی شب و روز کی جد و جہد کے نتیجے میں مشرق اوسط کی عظیم اسلامی تحریک الاخوان المسلمون کی تاسیس آپ ہی نے کی اور مصر و عالم عرب میں باطل قوتوں کے سامنے سینہ سپر ہو کر اسے زندگی بخشی۔ ناشر نے اس عظیم شخصیت کا مختصر تعارف کرا دیا ہے۔ تاکہ نو واردوں کو آسانی ہو اور اس عظیم مصنف کے مقام و مرتبت سے واقف ہو سکیں۔

یہ مقالے اپنے اندر جوش و ہوش، فکر و عزم اور نظریہ و تحریک رکھتے ہیں۔ اور پڑھنے والوں کے ذہنوں میں فکر کی یہی پختگی اور عزم کا یہی استحکام منتقل کر دیتے ہیں۔ حسن البنا شہید نے اسلام کا جو عملی خاکہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے، اور زندگی کے جس مثبت و صالح تصور کو پیش کیا ہے

وہ فرد کی تشکیل اور معاشرہ کے فروغ میں تعمیری جہت کو بالخصوص نمایاں کرتی ہے۔ ان کی تحریر کا سیل بے پناہ دلوں کو جیت لیتا ہے۔ اور ان کے استدلال کی توانائی ذہنوں کو مسخر کر لیتی ہے۔ یہ سب کچھ اس خلوص بے پایاں کا ثمرہ ہے جس نے انھیں اسلام کے لئے شہادت عطا کی۔

ترجمہ کی زبان شستہ و سلیس ہے۔ طباعت بہت زیادہ معیاری نہیں ہے۔ لیکن کتاب کی اہمیت اس عیب کو انگیز کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

وہ اذہان جو زندگی کو بے انجام تصور نہیں کرتے' اور جو صرف بقائے حیوانی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان کے لئے زندگی کی کوئی منزل مقصود بھی ہے' جو زندگی کی فعالیت کے حتمی طور پر قائل ہیں' ان کے لئے اس کتاب میں بے حساب بصیرتیں ہیں۔ بلکہ میں تو یہ سفارش کروں گا کہ کھلے ذہن کا ہر قاری اس کتاب کے مطالعہ کی طرف متوجہ ہو۔ صالح اور صحت مند بات دلوں کو جیت لینے والی خوشبو سے کم نہیں ہوتی۔ (عبید اللہ فہد)

دائرے : (ششماہی)
معرفت مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
قیمت : ۵ روپئے فی شمارہ

علی گڑھ کی سرزمین سے بزرگ ادیب 'الیس ابن شاہ' جواں سال افسانہ نگار 'طارق چھتاری' اور نئی نسل کے خوش فکر شعرا 'سعد بدایونی' 'منظور ہاشمی' کی زیر ادارت شائع ہونے والے ششماہی جریدہ "دائرے" کے پہلے شمارہ کو ہم خوش آمدید کہتے ہیں۔ اس کے مشمولات پر نظر ڈالتے ہی یہ احساس ہوتا ہے کہ مرتبین نے کافی محنت اور لگن سے یہ شمارہ تیار کیا ہے۔ انھوں نے ہندوستان اور پاکستان کے نمائندہ شاعروں اور ادیبوں کو ایک جگہ جمع کر کے قارئین کے لئے متنوع مواد مطالعہ فراہم کر دیا ہے۔

"فورٹ ولیم کالج کی تحریک" پر ڈاکٹر ابو سعید اور "منٹو اور روسی ادیب" پر پروفیسر سجاد شیخ کے مضامین کافی محنت سے تحریر کئے گئے ہیں۔ بدایوں کے گوشہ نشین شاعر عرفان صدیقی کی شاعری پر ڈاکٹر ابن فرید کا تنقیدی تبصرہ اپنے اندر ندرت بھی رکھتا ہے اور تجزیاتی مطالعہ کی ایک نئی جہت سے متعارف بھی کراتا ہے۔ قاضی عبدالستار، رشید امجد اور انور خاں کے افسانے نہ صرف معیاری ہیں بلکہ خاصے اہم بھی ہیں۔ بشر نواز، شہریار، توصیف تبسم، جلیل عالی، مظفر علی سید اور اقبال فریدی کی غزلیں اور بلکرشن اشک، محمد جمیل الرحمٰن اور محسن احسان کی نظمیں عصری ادب کی عمدہ تخلیقات ہیں۔

اگر اسی طرح 'دائرے' کو اردو کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں کا تعاون حاصل رہا اور کتابت، طباعت اور گٹ اپ کی طرف مزید توجہ دی گئی تو "دائرے" کی مقبولیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔ ہم بہر نوع اس جریدہ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ (انجم نعیم)

کتاب : ح خ
مصنف : غیور حسن
قیمت : پندرہ روپئے

ح خ مخفف ہے "حلئے خاکے" کا اور جو غیور حسن کی تازہ تصنیف کا نام ہے۔ جو چند معروف و غیر معروف بزرگوں اور دوستوں کی قلمی تصویروں پر مشتمل ہے۔ ان کی یہ کوشش اس لحاظ سے لائق توجہ ہے کہ انھوں نے امروہہ کی چند اچھی شخصیتوں کو اہل نظر کے لئے معروف بنا دیا ہے۔ خاکہ نگاری شخصیت کے گہرے مطالعہ و مشاہدہ کرتی ہے اس مطالعہ و مشاہدہ کے بعد جو تاثرات مصنف پر وارد ہوتے ہیں ان کو وہ ندرت تحریر کے ذریعہ دلکشی عطا کر دیتا ہے۔ غیور حسن اس کوشش میں کسی حد تک کامیاب رہتے ہیں۔ غیور صاحب نے طنز و مزاح کا سہارا لیتے ہوئے اپنے خاکوں میں چاشنی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن بعض اوقات لکھتے لکھتے کہیں کہیں بہک جانا ان کے خاکوں کو سپاٹ کر دیتا ہے۔ ان خاکوں کو پڑھنے

کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ جس شخصیت پر انھوں نے قلم اٹھایا ہے وہ ہر زاویے سے ان کی دیکھی بھالی ہے اور اس کی عادات و خصائص پر ان کی گہری نظر ہے۔ غیور حسن کے تحریر کردہ خاکوں کا یہ وصف لائق تحسین ہے کہ انھوں نے صالح شخصیتوں کو اپنا موضوع بنایا ہے اور زندگی کے تعمیری و مثبت پہلوؤں کو بالخصوص نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ قاری کا ذہن تخریب کے بجائے تعمیر کی طرف متوجہ ہو۔

ان کی خاکہ نگاری کا یہ عیب اکثر جگہ کھٹکتا ہے کہ ان خاکوں میں ان کی اپنی تصویر ہر جگہ کچھ زیادہ ہی نمایاں نظر آتی ہے جس کی وجہ سے اصل شخصیت عموماً پس منظر میں چلی جاتی ہے اور ان کی اپنی شخصیت پیش منظر میں آجاتی ہے۔

بارہ ادبی شخصیتوں، ایک فنی شخصیت، ایک سیاسی اور دو صنعتی اور کاروباری شخصیتوں کے خاکوں پر مشتمل دو سو سولہ صفحے کی یہ کتاب بتصویر صاف ستھری چھپی ہے جو پندرہ روپے کے عوض انجمن ترقی اردو شاخ امروہہ، تنویر بک ڈپو امروہہ، اور نشاط بک ڈپو دہلی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

(انجم نعیم)

گلوں کی خوشبو

جنوری و فروری کا مشترکہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ کتابت کی غلطیوں نے کافی مایوس کیا ہر دو چار سطر کے اندر ایک دو غلطی ضرور مل جائیں گی۔ بلا مبالغہ سیکڑوں غلطیاں ہیں۔ یہ صورتحال کافی افسوسناک اور مایوس کن ہے۔

غزلوں اور فن پاروں کو قبول کرنے اور شائع کرنے کے لئے آپ کا اپنا ایک معیار ہونا چاہئیے۔ نئے شاعروں اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کچے اور کھٹے پھلوں سے ٹوکری بھر لی جائے۔

اظہر کمالی بدایونی کی ایک غزل آپ نے نمایاں طور پر شائع کی ہے۔ حالانکہ یہ کوئی معیاری غزل نہیں ہے۔ ردیف و قافیہ کی پابندی تو ملتی ہے مگر خیالات میں نہ ندرت ہے نہ بلندی تیسرے شعر کا دوسرا مصرعہ ہے ؎

کیوں گئے ہم تن کے اجلوں، من کے کالوں کی طرف

اجلوں ہر لحاظ سے غلط ہے "اجلے" ہونا چاہئیے۔

اے مسافر خار صحرا کتنی امیدوں کے ساتھ
دیکھتے ہوں گے ترے تلووں کی چھالوں کی طرف

یہ بھی کوئی بات ہوئی۔

کوئی آخر کیسے رکھے تاب کے رکھے نگاہ!
آستینوں اور دامانوں کے بالوں کی طرف

کیا مطلب ہوا۔ یہ "بالوں" کیا ہے۔ داماں خود ہی دامن کی جمع ہے، یہ دامانوں کیا بلا ہے، پھر ایک ہی مصرعے میں تین تین جمعیں استعمال کی گئیں ہیں۔ اور تینوں نے ملکر بیچارے کی کمر ٹیڑھی کر دی ہے۔ یہ بھی کوئی غزل کی زبان ہوئی۔

وہ نگاہیں غار کی تہ کی خبر کیا لائیں گی
دیکھتی ہیں جو فقط مکڑی کے جالوں کی طرف

جناب شاعر کا اشارہ واقعہ ہجرت کی طرف ہے اور کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ظاہر بیں لوگ کسی چیز کی تہ تک نہیں پہونچ سکتے لیکن اس کے اظہار کے لئے کیا غزل کا شعر ایسا ہی ہونا چاہئیے۔ پھر واقعۂ ہجرت کی طرف غار اور مکڑی کے جالے سے اشارہ کرنا۔ غزل کی دنیا میں کتنا نامانوس اور غیر معروف ہے۔ الغرض پوری غزل قابل غور ہے۔ ایک شعر بھی متاثر کن نہیں ہے۔

اکرم دھولپوری کی غزل بھی قابل اصلاح ہے۔ پہلا مشورہ تو یہ ہے کہ غزل کی زبان شوخ ہوتی ہے۔ دادی اماں کی نصیحت والی زبان غزل کی زبان نہیں بن سکتی۔ اگر کوئی مضمون پہلے کے شاعروں نے بیان کر دیا ہو تو بعد میں اس کا ذکر اشعار میں اسی وقت قابل قبول ہوتا ہے جب کہ وہ اچھے اور انوکھے انداز سے کہے گئے ہوں۔ ان میں کسی جہت سے کوئی نرالاپن آگیا یا حالات سے اس کی مناسبت ہو۔ پھر وعظ اور نصیحت کے لئے نثر ہی زیادہ مناسب اور موثر ہوتی ہے۔ غزل کو نصیحت نامہ بنانا ضروری تو نہیں ہے۔

جگر خونیں عنادل لالۂ وگل خستہ و بسمل

و بسمل، معطوف علیہ جگر خونیں عنادل ہے۔ بیچ میں فصل ہے عربی زبان و شاعری میں تو یہ قاعدہ رائج ہے۔ لیکن اردو میں بہرحال معیوب ہے۔ محترم ایڈیٹر صاحب یہاں شاعر سے زیادہ شکایت آپ سے ہے۔ ایسی غزلوں کو "نئی نسلیں" میں جگہ ہی کیوں ملے۔

ایک قابل اصلاح غزل عشرت کرتپوری کی بھی ہے۔ پہلا شعر ہے دریائے زندگی پہ غضب کا چڑھاؤ ہے
اپنا اثاثہ ایک ہی کاغذ کی ناؤ ہے

"پہ" کی بجائے "میں" ہونا چاہئیے۔ چڑھاؤ کے بجائے بڑھاؤ زیادہ مناسب ہوتا۔ دوسرا مصرعہ چستی بندش سے عاری ہے۔

آؤ کسی قریب کے گاؤں میں جا بسیں

مصرعہ غلط ہے۔ یوں ہونا چاہئیے۔

آؤ کہیں قریب کے گاؤں میں جا بسیں

چوتھے شعر کا پہلا مصرعہ غلط ہے، یوں ہوتا تو صحیح ہوتا

کتنے ہی زخم وقت کے مرہم نے بھر دیئے

آخری شعر کا دوسرا مصرعہ ہے

اب جس جا پہ اہل خرد کا پڑاؤ ہے

"جا" کی بجائے جگہ ہونا چاہئیے۔ تعجب ہے کہ ایسی موٹی موٹی غلطیوں پر بھی آپ کی نظر نہیں پڑی اور غزل شائع ہو گئی۔ شیشۂ عقیدت تو بڑا نازک ہوتا ہے۔ اس کی شکست کے لئے تو آنچ ہی کافی ہوتی ہے۔ آپ نے تو اس پر پتھر کھینچ مارا)۔

خواجہ غلام السیّدین کی نظم کو اور مربوط ہونا چاہئیے تھا

ایک مصرعہ ہے

ہماری ماؤں کے آنچل اتارے جاتے ہیں

ایسا کیوں نہ ہوا کہ:۔

ہماری ماؤں کے آنچل کا استعمال ہوا

پھر ماؤں کے بجائے "بہنوں" میرے خیال میں زیادہ اچھا لگتا۔

جاوید اکرم کی غزل اچھی ہے

لوگ چلتے ہوئے ٹھہر جائیں
سونے رستوں پہ حادثہ رکھ دے

جی کہتا ہے یوں ہوتا تو خوب ہوتا:۔

چلتے چلتے ۔۔ یا ۔۔ چلنے والے ٹھٹھک، سنبھل جائیں
شاہراہوں پہ حادثے رکھ دے

امید ہے "خوب و ناخوب" کے صفحات میں میری ان گذارشات کو جگہ مل جائے گی۔ آج کل لوگ اپنے پرچوں پر تنقید شائع نہیں کرتے، لیکن آپ حضرات جن قدروں کے علمبردار ہیں اس سے امید ہے کہ میری تحریر کے ساتھ ایسا نہیں ہوگا۔ پرچہ وہی اونچا اٹھتا ہے جو اپنے قارئین کی بے جا تعریفوں سے زیادہ تنقیدوں اور مشوروں پر نظر رکھتا ہے

والسلام اصغر اعظمی، اعظم گڑھ

●

مکرمی و محترمی! سلام مسنون

نئی نسلیں کا ساتواں شمارہ موصول ہوا۔ اس پرچے سے مجھے اس قدر دلچسپی ہے کہ صفحۂ قرطاس پر نقش کرنے سے قاصر ہوں۔ ہر اگلے شمارہ کو دیکھنے اور مطالعہ کرنے کے لئے بے چین اور سرگرداں رہتا ہوں یہی واحد سبب ہے کہ جذبات سے مجبور ہو کر اس کا خریدار بننا پڑا۔ حقیقت ہے کہ اس پرچے سے مجھے ایک نظریہ ملا ہے۔ اور ابھارا اکسایا بھی ہے کہ ایک ادیب، مضمون نگار اور شاعر بنوں۔ اس پرچے کی جاذبیت اور کشش کا حال یہ ہے کہ حلقۂ ادب دیکھتے ہی اس میں غرق ہو جاتا ہے۔ دربار الٰہی میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کی مقبولیت میں اضافہ کرے۔

والسلام

ابوسفیان، مدرسۃ الاصلاح اعظم گڑھ

●

مکرمی سلام سلام و رحمت

جنوری کے نئی نسلیں میں تبدیلی ادارت اور نقل مکانی کا اعلان شائع ہوا ہے۔ پرچہ کے موجودہ معیار و انداز سے اکثر احباب نامطمئن تھے۔ اس سلسلے میں میں خود کئی بار دہلی اور شبنم صاحب کو خط لکھ چکا ہوں۔ عرصہ ہوا کہ شبنم صاحب کے خط سے ہی معلوم ہوا تھا کہ پرچہ کی ادارتی ذمہ داری آپ کے اوپر ڈالی جا رہی ہے۔ یہ رائے ہماری بالکل شروع سے تھی۔ رسالہ کو معیاری انداز سے کوئی ناقد ہی نکال سکتا تھا نہ کہ بے چارے نرے شاعر۔ بہرحال اب آپ نے اسے سنبھالا ہے۔ یہ بات رسالہ کے معیار و اعتبار اور وقار کی ضامن ہے۔ آپ کے ہاتھوں مرتب کردہ نئی نسلیں کا سخت انتظار رہے۔

گذشتہ چند مہینوں سے میں نے اسلام پسند ادیبوں اور فنکاروں کے تعارف و تجزیہ کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تحریری میدان میں آپ ہماری رہنمائی فرمائیں گے۔

والسلام

نیاز مند رشاد عثمانی۔ گیا۔

NUMAINDA
NAI NASLEN, Monthly
2448, BALLIMARAN DELHI-110006
REGISTERED WITH REGISTRAR OF NEWSPAPERS NO (N) 360
REGD. NO. D. (D) 910

صرف ٹائٹل دہلی آرٹ پریس دہلی میں چھپا

نمائندہ
ماہنا
A.182
17-10-81

تعمیری ادب کا

نمائندہ

نئی نسلیں

دہلی

بترتیب

ابن فرید

انجم نعیم

۱۰

بارہ شمارے : تیس روپے

ایک شمارہ : تین روپے

رابطہ

دفتر نمائندہ نئی نسلیں شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر

م۔ نسیم

۲۴۴۸، بارہ دری شیر افگن
بلیماران، دہلی ۱۱۰۰۰۶

دوسرا سال، تیسرا شمارہ — جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اداریہ

اپنی باتیں

۱ آزادی کے پندرہ بیس سال بعد اردو کے مستقبل سے مایوسی کے بادل دھیرے دھیرے چھٹنے شروع ہوئے۔ اور امید کی موہوم کرن رفتہ رفتہ روشن ہونے لگی۔ وہ رجحان کمزور پڑا کہ اردو سے معاشی مستقبل کو وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ خوف بھی ماند پڑنے لگا کہ اردو کی تعلیم (دینا یا روزی حاصل کرنا) خسارہ کا سودا ہے۔ چنانچہ ان نوجوانوں نے اس کے حصول تعلیم کو رضاکارانہ طور پر اختیار کیا جو اردو کے بجائے کسی اور مضمون میں داخلہ لیتے تو وہاں بھی اچھے طالب علموں میں شمار ہوتے۔ یہ نوجوان بڑے حوصلے کے ساتھ اس مضمون میں داخل ہوئے اور انھوں نے نہ صرف اپنی اچھی صلاحیتوں کا اظہار کیا بلکہ ان کی وجہ سے ادب کی جمود آسا فضا میں زندگی کی حرکت ہوئی۔ ان کے اعتماد نے تاریکیوں میں بھٹکنے والے بزرگوں کے سامنے ایک غیر متوقع چیلنج لا کھڑا کیا۔

اردو نے دوبارہ زندگی کی کروٹ لی۔ ڈوبتی، ہمکتی ہوئی دنیا نے دوبارہ ابھرنے کے لئے سعی و جہد شروع کر دی ــــ سعی و جہد کی اصطلاح میں وہ کشمکش ہمیشہ مضمر ہوتی ہے جو زندگی یا حصول حق کے لئے معاند قوتوں یا بے جان رکاوٹوں کے مقابلہ میں کی جاتی ہے۔

معاند قوتوں کی سازشوں کو اگر بے نقاب کیا جائے تو بہت سی سیاسی بحثیں طول کھینچ جائیں گی۔ یہ طوالت بحث بھی میں گوارہ کر لیتا اگر میں کسی ایسے نکتہ کو موضوع بحث بنا سکتا جو اب تک دوسرے اہل فکر کی نظروں سے اوجھل رہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے، اس کے علاوہ مجھے اپنی بے بضاعتی کا بھی احساس ہے۔

مجھے جو بات فکرمندی کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کرتی رہی ہے، وہ یہ ہے کہ جب اردو کی طرف باصلاحیت نوجوان متوجہ ہوئے تو ان کی موجودگی کے باوجود اردو وقتی توانائی کیوں نہ حاصل کر سکی جس کی اس سے توقع تھی۔ آخر ایسا کیوں ہے؟

اردو دنیا میں ایک روایت اردو پر پیتا پڑنے سے پہلے سے عام رہی ہے۔ ایک خاصے نام آور پروفیسر کے بارے میں یہ افواہ عام رہی ہے کہ انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ ان کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ ان کی تحریریں ان کے شاگردوں کا کارنامہ ہیں۔ اسی طرح ایک اور مشہور پروفیسر نے ایک بار سرکاری منصوبہ کے تحت اردو کی کتابیات کا مسودہ اپنے شاگردوں سے تیار کرایا اور اپنے نام سے جمع کر دیا۔ یہ ادبی بدعنوانیاں آزادی کے بعد "ملازمانِ اردو" میں بھی عام ہو گئیں، اور باصلاحیت نوجوانوں کا استحصال بزرگوں کے ہاتھوں عام ہو گیا۔ چنانچہ خوب جی بھر کر آسیبی تحریریں (GHOST WRITINGS) وجود میں آئیں۔ یہ طریقۂ کار "اہل پیشہ" میں اتنا عام ہوا کہ بے صلاحیت نوجوانوں نے بھی باصلاحیت ضرورت مندوں سے ترجمے کرائے اور اپنے نام سے شائع کئے۔

بحران کی یہ ایک جہت ہے، دوسری جہت اس سے بھی زیادہ عبرتناک ہے۔ جب بھی کسی صاحب مصلحت نے یہ محسوس کیا کہ کوئی تحریر اپنے نام سے چھپوانے میں بہت سے خطرات ہیں تو اس نے کسی باصلاحیت کو مہرہ بنایا اور اپنی تحریر اس کے نام سے چھپوا دی۔ اب عذاب و ثواب جو کچھ بھی رہا وہ سب اس کی گردن پر!

یہ صرف چند مثالیں ہیں پالیسی بوالعجبیوں کا ایک غیر مختتم دفتر ہے جسے کھولنے کی چنداں ضرورت نہیں۔
آپ بے شک یہ سوال کر سکتے ہیں کہ ادب کی دنیا میں ایسا کب نہیں ہوا؟ میں مانتا ہوں کہ یہ ہوا ہے اور ہمیشہ ہوا ہے۔ کتنے ہی امرا، رؤسا صاحبِ دیوان شاعر بن گئے۔ کتنے ہی سرقے اور جعلی کام ہوئے لیکن یہ سب حیثیتی علامت (STATUS SYMBOL) کے لئے ہوا جو جاگیردارانہ ماحول کی خاصیت ہے۔ کیا اسے اس دور میں بھی روا رکھا جانا چاہئے؟
پیٹ کے لئے بہت سے کام کئے جاتے ہیں۔ غرض مندوں کا استحصال طرح طرح سے ہوتا ہے۔ اس کے خلاف زندگی کے ہر شعبہ میں احتجاج کیا جاتا ہے اور کیا جا رہا ہے۔ مگر علمی و ادبی دنیا میں "سکوتِ مصلحت آمیز" لب کشائی کی اجازت نہیں دیتا۔ اس کے باوجود ہم باصلاحیت نوجوان ذہن کو جرأت مندی کی دعوت دیتے ہیں۔ ادب اعلیٰ ذہنی و فکری کام ہے۔ اس سے معاشرہ کی پائیدار اور لافانی قدریں صورت پذیر ہوتی ہیں۔ اس منزل میں وقتی مصالحتیں (COMPROMISES) عظیم مقصدِ حیات کو پسپا کر دیتی ہیں۔
عظیم مقصد ہمیشہ قربانیوں کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس لئے اب یہ فیصلہ کرنا نئی نسل کا کام ہے کہ وہ وقتی مفادات کے لئے ادب کو قربان گاہ پر چڑھائے یا ادب کے لئے اپنی صلاحیتوں کو اعتماد اور دیانتداری کے ساتھ بروئے کار لائے۔

(ابنِ فرید)

---

۲ مشہور جدید شاعر عمیق حنفی آج کل اخباروں اور افواہوں کی زد پر ہیں۔ ان پر اردو پرستی اور فرقہ پرستی کا الزام لگایا جا رہا ہے۔ عمیق حنفی آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ میں پروگرام ڈائرکٹر ہیں اور علمی و ادبی حلقوں میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور نیک طبعی کی وجہ سے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ شاید دشمنانِ اردو کو یہ بات اچھی نہ لگی ہو کہ ایک اردو والا آخر آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ پر چھا جائے۔ موصوف پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ انھوں نے تمام پروگراموں کا "اردو کرنٹ" کرنے کی مہم شروع کر رکھی ہے جس سے ان کی فرقہ وارانہ ذہنیت جھلکتی ہے۔ اس ہنگامے کو وہاں کے کچھ اخباروں نے شد و مد سے برپا کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض دوسرے ہتھکنڈے بھی استعمال کئے جا رہے ہیں۔
ہرچند کہ عمیق حنفی سے نہ پہلے ہمارا کوئی تعلق رہا ہے اور نہ اب ہے لیکن ان کے خلاف ناپاک سازشوں اور بے وجہ اردو دشمنی کی مذموم کوششوں کو ہم فرقہ وارانہ ذہنیت کی نفرت انگیز غلیظ حرکت تصور کرتے ہیں اور اس کی مذمت کرتے ہیں۔ ہم اردو دشمنی کی آگ میں جلنے والے ان نفسیاتی مریضوں کو بہرحال یقین دلاتے ہیں کہ وہ اپنی فرقہ پرستانہ حرکتوں سے سنجیدہ علمی ادبی حلقوں میں کسی طرح کی پراگندگی پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔
ہم منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ کے ذمہ داروں سے اس مسئلہ کی جانب توجہ مبذول کرنے اور عمیق حنفی کے ساتھ انصاف کرنے کی اپیل کرتے ہیں تاکہ حالات میں مزید ابتری نہ پیدا ہو۔

(انجم نعیم)

تمام اداری اور انتظامی امور کے سلسلہ میں علی گڑھ کے پتہ پر رابطہ قائم کریں

(منیجر)

ڈاکٹر احمد سجاد (رانچی)

اردو میں ترجمے کا سرمایہ

ادب و تہذیب کی تاریخ میں ترجموں کو ہر زمانے میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ کیونکہ یہی وہ سب سے بڑا ذریعہ ہے جس سے ایک قوم دوسری قوم کے علمی و ادبی اور روحانی سرمایوں سے بیش از بیش استفادہ کرتی ہے۔ صدیوں کے زمانی و مکانی بعد پر قابو پاکر اسی وسیلے سے دنیائے انسانیت نے چراغ سے چراغ جلایا ہے اور کڑی سے کڑی ملائی ہے۔

اردو چونکہ ایک ترقی یافتہ زبان ہے اس لئے ہر زمانے میں اہل اردو نے بھی اپنے حالات اور مذاق کے اعتبار سے ترجموں پر خاصی توجہ صرف کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم اور جدید اردو ادب کا دامن نت نئے تراجم سے مالا مال ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہندوستان میں بہت سی قدیم اور جاندار زبانوں کی موجودگی میں اردو ایک جدید اور نوعمر زبان ہونے کے باوجود پورے ملک میں سب سے آگے اس لئے بھی نکل گئی کہ اس نے تاریخ کے ہر انقلابی موڑ پر ترقی پذیر عوامل اور ادب کے ترجموں کو اپنے دامن میں سب سے زیادہ سمیٹنے کی کوشش کی ہے دو صدی قبل تک فارسی، دنیا کی سب سے ترقی یافتہ زبان سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ اردو نے آج سے صدیوں قبل اسی زبان و ادب سے سب سے زیادہ استفادہ کیا۔ اس دور کے معاً بعد جب انگریزی زبان و ادب کا ڈنکا بجنے لگا تو اردو نے اس چراغ سے بھی چراغ جلانے میں کبھی کوئی جھجک محسوس نہ کی۔ بلکہ انیسویں صدی میں انگریزی تراجم کی کثرت کو دیکھ کر مشہور فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے اپنے خطبات میں اردو ترجمین پر بار بار ناک بھوں بھی چڑھائی تھی اور انہیں دنیا کی دوسری بڑی زبانوں سے ترجمے کی ترغیب دی تھی۔

اردو میں ترجموں کا یہ سرمایہ خاصا متنوع اور مختلف الجہت ہے۔ نظم و نثر کی مختلف صنفوں اور علمی و سائنسی موضوعات کا شاید ہی کوئی گوشہ ہوگا جس میں ترجمہ کا کچھ نہ کچھ سرمایہ نہ ہو۔ یہ صحیح ہے کہ اردو کی مشرقیت اور مذہبی مزاج کی وجہ سے تراجم کی سب سے زیادہ تعداد مذہبیات میں ملتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اب تک تقریباً بیس ہزار مذہبی کتابوں کے تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں اسلام کے علاوہ ہندو دھرم، بدھ، جین، سکھ، مسیحی اور مختلف مذہبی تحریکات کے بارے میں ترجمے شامل ہیں۔ لہٰذا محدود صفحات میں اس پورے سرمائے کا نام گنانا بھی ممکن نہیں البتہ سرسری طور پر اس سلسلے کی چند باتیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ کیونکہ ان تمام ترجموں کا ہنوز تحقیقی و تنقیدی مطالعہ باقی ہے۔

سرسری جائزہ کے لئے اس پورے سرمائے کی درجہ بندی کے کام کو اولیت حاصل ہے۔ سہولت کی خاطر ہم پورے سرمائے کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) صنفی (۲) تخلیقی و غیر تخلیقی اور (۳) نثری و شعری

اردو ترجمے کا یہ قیمتی سرمایہ افراد، ادارے اور مختلف تحریکات کی صدیوں کی جگر کاوی کا ماحصل کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً اہم ترین ترجموں میں کلاسیکی عہد کے داستان نویسوں کے علاوہ نواب شمس الامرا (حیدرآباد) مولوی کمال الدین ملا[۱] (لکھنؤ رصدگاہ) سر سید احمد خاں، ولیم گلکرائسٹ، ڈپٹی نذیر احمد، عبدالحلیم شرر، شاہ رفیع احمدؒ، وحیدالدین سلیم، نظم طباطبائی، سجاد حیدر یلدرم، یوسف حسین خاں، ذاکر حسین خاں، ڈاکٹر عابد حسین، عزیز احمد،

---

[۱] لکھنؤ رصدگاہ کے مترجم جنہوں نے رصدگاہ کے ناظم کرنل ولکاک کی رہنمائی میں ایک درجن سے زائد سائنسی رسالے ترجمہ کئے۔

شاہد احمد دہلوی، مطلبی فرید آبادی، منشی ذکاء اللہ، عنایت اللہ دہلوی، خواجہ منظور حسین، ظ انصاری اور قرۃ العین حیدر وغیرہ مشہور ہیں۔

سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ، دلی کالج کے زیر اہتمام ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی (قیام ۱۸۴۱ء) اس کے تین سال قبل حیدرآباد میں نواب فخر الدین خاں شمس الامراء شافی کے سائنسی علوم کے ترجمے اور لکھنؤ کی رصدگاہ کے ترجمے اب گو کہ کمیاب ہیں مگر اردو ترجموں کی تاریخ انھیں فراموش نہیں کر سکتی اسی طرح نیشنل بک ٹرسٹ، ساہتیہ اکیڈمی، ترقی اردو بورڈ بعض یونیورسٹیوں اور حال فی الحال مختلف ریاستی اردو اکادمیوں کے کارناموں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مختلف قسم کی مذہبی تعلیمی اور ادبی تحریکات نے اپنے افراد اور اداروں کے ذریعہ ترجمہ کا جو وسیع سرمایہ چھوڑا ہے وہ ہنوز یادگار ہے مثلاً وہابی تحریک، سرسید کی علی گڑھ تحریک، انجمن ترقی اردو، دار المصنفین اعظم گڑھ، ندوۃ المصنفین دہلی، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، اردو اکیڈمی جامعہ ملیہ، جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت، جمیعۃ العلماء، دیوبند، ندوہ، بریلی، ملر با گنج، رامپور، دہلی، حیدرآباد، پٹنہ، کلکتہ، بمبئی اور بنارس نیز ترقی پسند تحریک اور حلقۂ ارباب ذوق وغیرہ کے افراد و اداروں نے بھی غیر معمولی کارنامے انجام دئیے ہیں۔

ان افراد اور اداروں نے نری ترجمہ نگاری پر بس نہیں کیا بلکہ اردو میں ترجمہ کے مسائل، اس کے اصول اور وضع اصطلاحات پر بھی سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ وقت، حالات اور ضروریات و مقاصد کے پیش نظر دلی کالج، فورٹ ولیم کالج، علی گڑھ، رصدگاہ لکھنؤ، دار الترجمہ حیدرآباد اور اب اردو اکادمیوں کے ترجموں کے اسالیب میں واضح فرق دیکھا جا سکتا ہے۔

دلی کالج پر انگریزیت کا غلبہ تھا تو دار الترجمہ حیدرآباد پر عربیت و فارسیت کا۔ اور سائنٹفک سوسائٹی پر سکولرزم دیکھیے تو کا رجحان نمایاں تھا۔ اپنے اپنے مقام پران سب کی خدمات نہایت وقیع ہیں، ان پر سطحی تنقید یا فقرے بازی کی ہرگز گنجائش نہیں۔ جیسا کہ کہیں کہیں دیکھنے میں آتا ہے۔ دار الترجمہ حیدرآباد نے ۱۹۱۷ء تا ۱۹۴۸ء ۴۶۵ نہایت اہم علمی، سائنسی اور انسانی علوم کی کتابوں کے ترجمے پیش کئے جس کے نتیجے میں جامعہ عثمانیہ میں ایم۔اے، ایم ایس سی میڈیکل، انجینیرنگ، فلسفہ اور بہت سے علوم و فنون کی اردو میں اعلیٰ تعلیم شروع ہو چکی تھی۔ یہ تاریخ کی ستم ظریفی ہی کہئے کہ آزادی سے پہلے جس ادارہ اور ذریعہ تعلیم پر مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو کو فخر و ناز تھا اس کو آزادی کے بعد مزید فروغ دینے کے بجائے ۱۹۵۰ء میں داستان پارینہ بنا دیا گیا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا دار الترجمہ نے ترجمے کے علاوہ فن ترجمہ نگاری اور اصطلاحات سازی میں بھی غیر معمولی کارنامہ یادگار چھوڑا ہے۔ اصطلاح سازی کے ایسے اصول وضع کئے، جن سے اردو کو علمی و سائنسی زبان بنانے میں کوئی دقت نہ ہوئی اور اردو لفظیات کے خزانے میں بڑی وسعت پیدا ہو گئی مثلاً محض ایک لفظ 'برق' کو لیجئے۔ سابقوں لاحقوں، نیم سابقوں اور نیم لاحقوں کا اضافہ کرکے اس لفظ سے ۱۲۰ سے زیادہ ترکیبیں اور اصطلاحیں بنائی گئیں مثلاً برق باشیدگی (ELECTROLYSIS) برقیرہ (ELECTRODE) اور برقی مقناطیس (ELECTRO MAGNET) وغیرہ وغیرہ، مگر افسوس ہے کہ اردو ترجموں کے اس قدر وقیع سرمائے کے معیار ان کی نوعیت درجہ بندی اور تقابلی مطالعے کی اب تک کوئی باضابطہ کوشش منظر عام پر نہیں آئی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ فارسی، عربی اور انگریزی کے علاوہ دوسری زبانوں کے ترجموں کی طرف عرصہ تک اتنی توجہ نہیں کی گئی مگر وائکہ بیسویں صدی سے فرانسیسی، روسی، ترکی اور ہندوستانی زبانوں کے ترجموں پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا جانے لگا۔ ناول و افسانوں میں موپاساں، تالستائی، چیخوف، ٹیگور، ہارڈی، شولوخوف ملیسٹر ناک، اور خلیل جبران وغیرہ کی تخلیقات کو اردو میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسی طرح رومانی و جاسوسی ناولوں کے ترجمے بھی خوب شائع ہوئے۔ تلگو افسانے، ملیالم افسانے، ایمیلی زولا، ڈکنس، البن، شیکسپیر اور برنارڈشا کی تخلیقات اہم تاریخی، ڈرامائی اور بچوں کی تصانیف بھی خاصی تعداد میں ترجمہ ہو کر شائع ہوئیں۔ قرآن، حدیث، فقہ، تاریخ، سیرت، اخلاقیات اور جملہ مسائل پر ہزاروں کتابیں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ بھگوت گیتا کے صرف آندھرا پردیش میں ۴۰ تراجم ہو چکے ہیں۔ ۱۶ نثر میں ہیں اور باقی منظوم۔

تخلیقی ادب بالخصوص شاعری کا ترجمہ، ترجمہ نگاری کی تاریخ میں ہمیشہ ایک پیچیدہ مسئلہ رہا ہے۔ لیکن تمام نزاکتوں اور پیچیدگیوں کے باوجود بہت سے مشرقی اور مغربی زبانوں کے مشاہیر شعرا کے کلام کا جزوی یا کلی حصہ اردو میں بھی منتقل کیا جاچکا ہے۔ ہندی کے علاوہ ہندوستانی زبانوں کی شاعری میں بیشتر کام تلگو اور تامل کے تراجم کے ذریعہ ہوا ہے۔ تنقید و تحقیق کے میدان میں انگریزی کے بعد سب سے زیادہ فارسی و عربی اور فرانسیسی و روسی تراجم منظر عام پر آئے ہیں۔ بودلیئر، سارتر، پال ویری، انتولوف (کہانی اور اس کا فن) اور ریلکے گینوں وغیرہ اردو میں خاصے مقبول ہو رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمیں اردو زبان و ادب کو اگر لطافت اظہار کے تنوع اور علوم کی وسعت سے مالا مال کرنا ہے تو ایلیٹ کے اس قول کو فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ:۔

> "جب ایک زبان دوسری زبان سے سبقت لے جانے لگتی ہے تو عام طور پر اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ زبان ایسے قواعد اپنے اندر رکھتی ہے، جو اسے آگے بڑھاتے ہیں اور جو نہ صرف اپنے اور غیر مہذب زبان کے درمیان فکر اور لطافتِ اظہار کے اعتبار سے امتیاز رکھتی ہے بلکہ احساس کے انتباہ سے بھی بلند درجہ رکھتی ہے۔"

●●

سید اسعد گیلانی (لاہور)

اقبال کے مذہبی افکار

اقبال کے مذہبی افکار کی دنیا میں سفر کرتے ہوئے فکری تحقیق کا مسافر جب اس مقام پر پہنچتا ہے کہ وہ جدید عہد کی ترتیب و تدوین کے لئے سخت مضطرب تھے اور اس کام کو سرانجام دینے کی خاطر مسلسل اور پیہم فراہمی اسباب کے لئے کوشاں رہے تو جہاں ان کے اخلاص اور تجدید و احیائے دین کے عمل صالح کے بارے میں مکمل اطمینان حاصل ہوتا ہے وہاں یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اسلامی نظام حیات جس کے لئے وہ ساری عمر تڑپتے رہے اور نفاذ کتاب و سنت جو ان کی زندگی کا حاصل تھا اس کی ترتیب نفاذ اور تدبیر کار میں ان کے ہاں کوئی فکری خلا ضرور موجود تھا۔ وہ فکری خلا کس نوعیت کا تھا اسے متعین کرنا انتہائی ضروری ہے اس لئے کہ اس کے بغیر ان کے تجدیدی کارنامے کا جائزہ لینا ممکن نہیں ہے۔

اگر کوئی محقق یہ بات کہے کہ ان افکار میں عدم مطابقت (INCONSISTENCY) پائی جاتی ہے تو اس سے اختلاف کیا جائے گا۔ البتہ فکری ارتقاء کا ایک مسلسل عمل ان کے فکری سفر میں موجود ہے۔ وہی ارتقائی عمل جو تارے کو رب قرار دینے، پھر چاند پر ٹھہرنے اور پھر سورج پر رک کر یہ کہنے سے سامنے آتا ہے کہ "یہ بڑا ہے یہی میرا رب ہے"۔ اور جب وہ بھی ڈوب جائے تو پکارنے والا پکار اٹھے کہ میں فنا پذیر چیزوں کا پرستار اور متوالا نہیں ہوں۔ میرا رب تو وہی ہے جو ان سب کا پیدا کرنے والا ہے۔

اقبال بھی اپنے افکار کی دنیا میں مسلسل سفر کرتا رہا ہے اور اس کا یہ سفر تلاش و جستجو اور حقیقی منزل تک پہنچنے کا سفر ہے چونکہ وہ روحانی طور پر وہ حضور اکرم ؐ کا دامن گرفتہ ہے اس لئے بہت جلد وہ وطنی قومیت اور علاقائی مسلم قومیت کے حیرت کدے سے گذر کر تطرف اسلامی قومیت، توحید، کتاب و سنت، رسول کریم ؐ کی قیادت انسانیت اور خلفائے راشدین کی مثالی خلافت تک پہنچ جاتا ہے اور پھر اسے انسانی زندگی کی قدیم و جدید ساری الجھنوں کا حل اس کتاب مبین میں مل جاتا ہے جو انسانوں کے مالک کی طرف سے اس کے بندوں کی طرف ہدایت نامہ اور کتاب انسانیت بنا کر بھیجی گئی ہے۔ اس طرح اقبال کو وہ محکم بنیاد مل جاتی ہے جس پر قائم رہ کر اس نے وہ کارنامہ سرانجام دیا ہے جسے ہم جزوی طور پر تجدید و احیائے دین کا کارنامہ قرار دے سکتے ہیں۔

پھر آخر وہ فکری خلا کیا ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں ان کے مجموعی کام پر نظر غائر ڈالنے سے وہ فکری خلا بہت نمایاں دکھائی دینے لگتا ہے۔

اقبال کے تخیل میں ایک اسلامی ریاست کا ہیولا موجود ہے جس کے خصائص انھوں نے جابجا بیان کئے ہیں اس لئے کہ ریاست کے بغیر کسی نظام زندگی کے نفاذ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہر نظام زندگی اپنے لئے ریاست کا مطالبہ کرتا ہے۔ اقبال کے افکار میں احیائے دین کا ایک پرجوش چشمہ لبریز ملتا ہوا دکھائی دیتا ہے جسے دیکھ کر انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ جس ریاست کا خواب دیکھ رہے ہیں اس کا مقصد یہی ہے کہ وہاں کتاب و سنت کا اجرا ہو اور خلافت راشدہ کا دور ثانی دنیا کے سامنے از سر نو نمودار ہو۔ اس مثالی ریاست

کے لئے تدوین قانون کے کام کے لئے بھی بے تاب اور مضطرب دکھائی دیتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ جدید و قدیم علماء و ماہرین پر مشتمل ایک ایسی جماعت تیار ہو جائے جو تدوین فقہ جدید کا کام سرانجام دے تاکہ اس مطلوبہ ریاست کی قلمرو میں جاری کرنے کے لئے اسلامی قانون تیار ہو جائے یہ سب کچھ اپنی جگہ پر درست، مطلوب اور احیائے دین کی کوششوں کے عین مطابق ہے۔

تجدید و احیائے دین و نفاذ دین کیلئے ایک ریاست کا قیام۔

تجدید و احیائے دین کی مخلصانہ خواہش —— اور اسکے لئے عملی جدوجہد۔

تجدید و احیائے دین کیلئے ایک مجموعہ قوانین کی ترتیب و تدوین۔

لیکن تحقیق و جستجو کے فکری مسافر کو جو خلاء دکھائی دیتا ہے وہ ایک اسلامی تحریک کا فقدان ہے، جو فرد اور اجتماع دونوں کے کردار و عمل کو اسلامی ریاست کے شہری بننے کے لئے تیار کرتی، دین کی اخلاقی ذمہ داریاں اٹھانے کا ارادہ پیدا کرتی اور اسلامی قوانین کو سہارنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے ایمانی قوت و برداشت اور اخلاقی حوصلہ و توانائی پیدا کرتی ہے۔ وہ اسلامی تحریک جو بحیثیت مجموعی بگڑے ہوئے مسلمان معاشرے میں ڈھالنے کا عمل سرانجام دیتی اور اسلامی ریاست کے لئے ایک باعمل صالح قیادت فراہم کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی کسی تحریک کے بغیر بے عمل معاشرے کا جمود نہیں ٹوٹ سکتا۔

ان کے سارے تجدیدی کارنامے میں یہ خلاء انسان کو بہت کھٹکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ اس میدان کے آدمی نہ تھے وہ فکری اور دماغی انسان تھے۔ فلسفہ اور شہپر جبریل کی مانند ان کا عظیم اور بلند تخیل انھیں تحریک اسلامی کی دعوتی تنظیمی عوامی اور عملی سرگرمیوں کے لئے وقت دینے کی گنجائش نہیں دے سکتا تھا لیکن واقعات کی دنیا میں اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ کسی اجتماعی اسلامی تحریک کے بغیر نظام اسلامی کے نفاذ کی امید رکھنا سراب سے پانی نچوڑنے کے مترادف ہے۔ ممکن ہے کہ ان کا ذہن امام ابوحنیفہ کی مجلس قانون کی عظیم کارکردگی کی طرف منتقل ہوا ہو لیکن اس مجلس قانون کا کارنامہ نبو عباس کی ملوکانہ میں تو کام آگیا اور اس سے ایک اعلیٰ پائے کا فقہی مسلک بھی وجود میں آگیا لیکن وہ مثالی حکومت وجود میں نہ آسکی جسے خلافت راشدہ کہا جاتا ہے اور جو اپنی حیثیت میں پورے عالم انسانیت میں منفرد اور مثالی ہوتی ہے۔ اس طرح عالمگیری مجلس قوانین نے فتاوی عالمگیری مرتب کر کے اس کے عرصۂ زندگی میں عدالتوں کا ایک نصاب تو فراہم کر دیا لیکن اس سے وہ اسلامی حکومت وجود میں نہ آسکی جس کے لئے عالم انسانیت ہمیشہ ترستا اور اس کے خواب دیکھا کرتا ہے۔ وہ اسلامی ریاست جو عالمگیر کے بعد بھی معاشرے کے گرد اسلامی حدود کا معیار قائم و ثابت رکھ سکتی۔

بہرحال علامہ اقبال کی تجدیدی کوششوں میں تدوین فقہ جدید کا ایک کام بھی شامل ہے جو اگرچہ سرانجام نہ پا سکا لیکن ان کے کارناموں کا تذکرہ کرتے ہوئے کوئی انصاف پسند آدمی بھی اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ان کے دلوں کی تپش اور ان کی شبوں کا گداز جہاں ان کے دوسرے کاموں میں دکھائی دیتا ہے وہاں یہ شعبہ بھی ان کی زندگی میں اس طرح ان کے دل کی دھڑکن بن کر رہ گیا تھا۔ وہ اس کام کے لئے مسلسل اور پیہم کوشاں رہتے تھے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ اسلامی نظام قانون میں ارتقاء کا عمل جاری رہا ہے اور وہ خلافت راشدہ کے دور سے لے کر عالمگیر کے دور تک کسی نہ کسی طرح تدریجی ارتقائی مراحل سے گذرتا رہا ہے۔ فقہا اور علماء نے اس کام کو ہر دور میں سرانجام دیا ہے لیکن جب سے ہند کے میخانے بند ہوئے تھے اسی وقت سے اسلامی قانون کے ارتقاء کا عمل رک کر ایک خلاء پیدا ہوا تھا انھوں نے غالباً اسی کی طرف اشارہ کرتے کہا تھا

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

علامہ کی نظر میں سب سے ضروری کام رسول اکرم کی سنت کا احیاء اور اسلامی قوانین کا نفاذ تھا۔ اس کام کے لئے ان کے نزدیک ایک تدبیر یہ بھی تھی کہ تین سو سال کے ارتقائی عمل کے خلاء کو پر کرنے کے لئے ایک مجلس قانون ساز بیٹھے اور اپنی فکری کاوشوں سے اس خلاء کو پر کر دے وہ مجلس ایک جدید ریاست

کی جدید ضروریات کے مطابق قانون اسلامی کو مرتب و مدون کرے اور موجودہ حالات میں اسے عدالتوں میں نفاذ کے قابل بنانے کیلئے دفعہ وار مرتب (CODIFY) کردے۔ بہر حال جو اسکیم بھی ان کے ذہن میں رہی ہو اس میں شک نہیں کہ اس اسکیم کو بروئے کار لانے کے لئے ان کے ذوق و شوق کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ بعض اوقات وہ اس سمت میں کوشش کرتے ہوئے تنکوں کا سہارا لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور یہی ان کے اخلاص عمل کی بہترین دلیل بن گئی ہے۔ انھوں نے فرمایا۔

"موجودہ دور میں اسلام کی سب سے بڑی ضرورت فقہ کی تدوین جدید ہے تاکہ زندگی کے ان سینکڑوں ہزاروں مسائل کا صحیح اسلامی حل پیش کیا جائے جن کو موجودہ دور اور بین الاقوامی اقتصادی معاشی اور سماجی ارتقاء نے پیدا کیا ہے۔" ۱ے

انھوں نے اپنے خطبہ صدارت آل انڈیا مسلم کانفرنس منعقدہ لاہور میں اپنی یہ تجویز پیش کی

"میری تجویز یہ ہے کہ علماء کی ایک جماعت قائم کی جائے جس میں ایسے مسلمان قانون داں بھی شامل ہوں جنھوں نے جدید علم قانون کی تعلیم حاصل کی ہو۔ مقصد یہ ہے کہ جدید حالات کی روشنی میں اسلام کے قانون کی حفاظت کی جائے۔ اسکو پھیلایا جائے اور بشرط ضرورت اس کی از سر نو تشریح کی جائے اس طرح سے کہ بنیادی اصولوں کی تہہ میں جو روح کارفرما ہے وہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔" ۲ے

ان کی اس تجویز سے اندازہ ہوتا ہے کہ دور حاضر میں علماء کی علمی تعبیر کے لئے اور انہیں محض علمی میدان سے نکال کر عملی زندگی میں لانے اور دوسرے نقطہ ہائے زندگی کے ہر پہلو پیش کرنے کے لئے ان میں کتنی تڑپ موجود تھی۔ وہ مولانا سید سلیمان ندوی کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں:

"یہ میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطہ نظر سے زمانہ حال کے اصول قانون JURISPRUDENCE (پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم وہی شخص ہوگا۔ یہ وقت عملی کام کا ہے کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہب اسلام گویا زمانے کی کسوٹی پر بار بار آزمایا ہے اور شائد تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔" ۳ے

مولانا سید سلیمان ندوی کے نام اس نوعیت کے مکتوب سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال حالات حاضرہ کے پیش نظر اسلام کے مستقبل کے بارے میں کتنے فکرمند تھے اور جدید سائنسی علوم جس نوعیت کا چیلنج اسلام کے سامنے رکھے ہوئے تھے اس چیلنج کا جواب دینے کے لئے ان میں کس قدر اضطراب پایا جاتا تھا۔ انھوں نے خود بھی فکر و نظر اور فلسفہ و کلام کے میدان میں اس چیلنج کا موثر جواب دیا لیکن قانون کے میدان میں اسلامی قانون کے اصولوں کی برتری ثابت کرنے کیلئے وہ ایک پوری مجلس کی ضرورت محسوس کرتے تھے جو اسلامی قانون کو دور حاضرہ کی تمام ضروریات پوری کرنے کے قابل بنادے اور اسلامی قانون انصاف میں دور حاضر کے ہر مسئلے کا حل موجود ہے۔ انہیں ضروریات دور حاضر کو سامنے رکھ کر وہ زندگی کے ہر میدان میں اسلام کو زمانے کے چیلنج کا بہترین جواب ثابت کرنا چاہتے تھے جس میں قانون کا شعبہ بھی شامل تھا۔ چونکہ ان کی چشم بصیرت دیکھ رہی تھی کہ مغربی تہذیب کی کوکھ سے نظریات کے جتنے فتنوں نے جنم لیا تھا وہ فطرت انسانی اور عقل انسانی سے ٹکرا ٹکرا کر ناکام ثابت ہوتے جارہے تھے اور اب زمانے کو کسی ایسے ہی نظام کی تلاش تھی جیسا نظام خود اسلام تھا انھوں نے سید سلیمان ندوی کے نام ایک اور خط میں لکھا:-

"اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے۔ اگر مولانا شبلی زندہ ہوتے تو میں ان سے ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا۔ ندوہ کے دیگر ارکان بالخصوص فارغ التحصیل طلباء کو جمع اپنے ساتھ ملائیے تاکہ اقوام اسلامیہ کو فقہ اسلامی کی حقیقت معلوم ہو۔" ۴ے

انھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کے لئے ایک تعلیمی سکیم پیش کرتے ہوئے اسی تدوین فقہ جدید کی ضرورت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:-

---

۱ے صحیفہ صفحہ ۱۶۱ ۲ے خطبہ صدارت آل انڈیا مسلم کانفرنس منعقدہ لاہور ۲۱ مارچ ۱۹۳۱ء ۳ے اقبال نامہ [illegible] ۴ے مکتوب بنام سید سلیمان ندوی اقبال نامہ حصہ اول صفحہ ۱۳۴

"ہمیں دیوبند اور لکھنؤ سے ایسے ذہین اور طباع لوگ منتخب کرنے چاہئیں جو قانون کا خاص ذوق رکھتے ہوں چونکہ قانون محمدی سراسر تعمیری تشکیل کا محتاج ہے ہمیں چاہئے کہ ہم انھیں اصول فقہ و قانون سازی کے اصولوں کی تعلیم دیں اور شائد اقتصادیات اور اجتماعیات کی جامع تعلیم دینے کی بھی ضرورت پیش آئے اگر آپ چاہیں تو ان کو ایل ایل بی بنائیں اور پھر ان سے کہا جائے کہ سیاسی نظریہ اسلامی اور اسلامی فقہ کا ارتقاء وغیرہ مضامین کے لیکچروں میں شریک ہوں بعض کو وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کی بھی اجازت دی جائے کچھ اپنے آپ کو قانونی ریسرچ کے لئے وقف کردیں اس ملک میں قانون محمدی جس طریقہ سے عمل میں لایا جاتا ہے وہ نہایت تاسف انگیز ہے اور بعض دشواریاں ایسی ہیں جو صرف مجلس قانون سازی کے قیام سے ہی دور ہو سکتی ہیں۔"[1]

علی گڑھ کی تعلیمی اسکیم کے تذکرے میں بھی اپنے دل پسند موضوع کا تذکرہ بتاتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ کام وقت کی پکار تھا۔ چنانچہ جو کچھ ان سے ہو سکا وہ علمی اور عملی سطح پر اس اسکیم کے لئے کام کرتے رہے ۱۹۳۲ء میں اپنے ایک خطبہ صدارت میں انھوں نے فرمایا:

"میں علماء کی اسمبلی کے قیام کا مشورہ دوں گا جس میں مسلمان وکلا بھی شامل ہوں جو فقہ سے واقف ہوں اس کا مقصد اسلام کی حفاظت اور تجدید ہے اس طور پر کہ اسلام کے بنیادی اصولوں کی روح قائم رہے اس جماعت کو دستوری سند حاصل ہو تاکہ ملکی قانون جو مسلمانوں کے پرسنل لا پر اثر انداز ہوتا ہو اس اسمبلی کی منظوری کے بغیر قانون نہ بن سکے۔ اس تجویز کے محض علمی فائدے کے علاوہ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ زمانہ الحاضر کو ابھی اسلام کے قانونی ادب کی بیش بہا قیمت کا اندازہ نہیں ہے خصوصاً سرمایہ دارانہ ذہنیت کی دنیا کے لئے جہاں اخلاقی اقدار اقتصادی مسائل سے الگ کی جا چکی ہیں اس قسم کی اسمبلی کا قیام اسلامی اصول سمجھنے کے لئے بہت مدد دے گا۔"[2]

اجتماعی طور پر تدوین فقہ کے کام کی اہمیت کا ان کے ذہن پر زبردست اثر تھا اور وہ اسے اپنی زندگی کے اہم ترین کاموں میں سے شمار کرتے تھے خطبات مدراس میں بھی انھوں نے اس کا تذکرہ کیا۔

"انفرادی اجتہاد کے مقابلے میں شورائی اجتہاد زیادہ مفید ہے۔ دور جدید میں اجماع کی یہی شکل سب سے زیادہ موزوں ہوگی یہ بھی ایک طریقہ ہے جس سے ہم اپنے نظام قانون کو جمود و تعطل سے نجات دلا کر اس میں زندگی کا نیا خون دوڑا سکتے ہیں۔"[3]

جہاں وہ اتحاد کے حامی تھے اور اسے اجتماعی بحث و تمحیص سر انجام دے کر قانون اسلامی کے چشمہ صافی جاری رکھنا چاہتے تھے وہاں وہ اس تجدد پسندی کے سخت مخالف بھی تھے جو اسلامی تصورات کو جڑ سے مٹا کر ان میں مغربی افکار و نظریات کو پیوست کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ چنانچہ اس کام کی اہمیت کے ایک دوسرے پہلو کو واضح کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا:

"اگر ہم اسلامی فکر میں کوئی صحت مند اضافہ نہیں کر سکتے تو کم سے کم صحت مند تنقید سے عالم اسلامی میں امنڈتے ہوئے تجدد پسندی کے سیلاب کو ضرور روک سکتے ہیں۔"[4]

ایک دوست کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

"ایک مدت سے ہم یہ سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے ——— لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادت انسانی کے لئے تمام موزوں قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوا ہے نیز جو جو قواعد و عبادات یا معاملات سے متعلق (بالخصوص مؤخر الذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں رائج ہیں اس پر قرآنی نقطۂ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دیکھا جائے کہ وہ باطل و ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے

۱؎ اسکیم برائے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، اقبال نامہ صفحہ ۲۴۰ جلد ۲۔ ۲؎ حرف اقبال صفحہ ۱۹۸ ۳؎ تشکیل الہیات جدید صفحہ ۱۷۱ ۴؎ تشکیل الہیات جدید صفحہ ۱۵

نوع انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی
میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطہ نظر
سے زمانہ حال کے جورس پروڈنس JURIS PRUDENCE
یعنی اصول فقہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنی
کی ابدیت ثابت کر دے گا وہی اسلام کا مجدد ہو گا
اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی
شخص ہو گا۔ [1]

انھوں نے مسلمان علماء کے جمود پر انتہائی رنج و الم کا اظہار کیا۔
ان جمود پسندانہ روش پر وہ سخت دل گرفتہ تھے:

"افسوس زمانہ حال کے اسلامی فقہا زمانے کے میلان طبیعت
سے بالکل بے خبر اور قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔
ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں
کہ اجتہاد کے دروازے بند ہیں۔ مذہب اسلام
تو زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے۔ تاریخ اسلام میں
ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔" [2]

ایک عالم دین کے بارے میں اپنے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے
کتنی دردمندی سے کہتے ہیں:

"کیا اچھا ہو کہ وہ شریعت محمدیہ پر ایک مبسوط کتاب تحریر
فرمائیں جس میں عبادات اور معاملات کے متعلق
قرآن سے استدلال کیا گیا ہو۔ معاملات کے متعلق
خاص طور پر اس قسم کی کتاب کی آجکل شدید ضرورت
ہے جس میں زمانہ حال کے جدید مغربی اصول فقہ کو
ملحوظ رکھ کر فقہ اسلامی پر بحث کی گئی ہو۔" [3]

علامہ ابن تیمیہ کو اس لئے بھی وہ پسند کرتے تھے کہ انھوں نے
اپنے دور میں جامد فقہ کی قطعیت کو تسلیم کرنے کی بجائے قرآن
و سنت سے استدلال کرنے کا طریقہ اختیار کر کے اجتہاد کے
حق کو تسلیم کیا تھا۔ اسی لئے علامہ فقہ کے چاروں مکاتب فکر
کا مطالعہ ضروری قرار دیتے تھے تاکہ طالب علم کا ذہن کھلے اور
اس میں رواداری اور علمی وسعت پیدا ہو۔

بہرحال تدوین فقہ جدید کے بارے میں ان کا ذوق و شوق
اس نسبت سے بھی تھا کہ اسلامی قانون ہی دور حاضر میں قائم ہونے
والی کسی بھی اسلامی حکومت کا بنیادی قانون بن سکتا ہے اور
اگر اسلامی قانون جدید تقاضوں اور ضروریات کے مطابق مرتب
اور مدون ہو جائے تو پھر دنیا کی کوئی مسلمان ریاست بھی جب
چاہے اس سے استفادہ کر سکتی ہے اور اسے اپنے ہاں رائج
کر سکتی ہے۔ اسی لئے علامہ کہا کرتے تھے کہ ہندوستان کے
مسلمان اگر اپنی زبوں حالی اور غلامی کے سبب دنیا کے دوسرے
مسلمانوں کو کوئی دوسری امداد نہیں پہنچا سکتے تو کم از کم انھیں
دماغی امداد ضرور پہنچا سکتے ہیں اور دماغی امداد سے ان کی مراد
اسلامی نظریے کی توضیح و تشریح۔ اسلامی ریاست کی خصوصیات
کی وضاحت اور اسلامی قانون کی ترتیب و تدوین کا کام تھا جو
اگر ہندوستان میں سرانجام پا جائے تو دنیا کے سارے مسلمان
اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

علامہ کی یہ بات بڑی حد تک قابل لحاظ تھی۔ اس میں کوئی
شبہ نہیں ہے کہ برصغیر ہند و پاک کے مسلمانوں نے دنیا کے دوسرے
مسلمانوں کیلئے، دین کے لئے دعوت، فہم، توضیح و تشریح اور تجدید
تحریک کا بارہا سامان کیا ہے۔ اور بالآخر دنیا کے نقشے پر اپنے
مذہب کے زور سے ایک جدید اسلامی ریاست کی نقشہ گری بھی
کی ہے۔ یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ علامہ دور حاضر میں علم
کی قوت اور دنیا کی رہنمائی کیلئے علم کی بادشاہی کی اہمیت کو خوب
سمجھتے تھے۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"میری آرزو یہ ہے کہ ہمارے نوجوان اپنے آپ کو
علم ریاضی، طبیعات، کیمیا، تاریخ اور فقہ کے مطالعہ
کے لئے وقف کر دیں۔ علم کی ان شاخوں کا مطالعہ
ہی دور حاضر کا تقاضہ ہے۔ صرف اسی طرح دور جدید
کے مسلمان جدید علم کی جڑوں سے آشنا ہو سکیں
گے اور ہم انھیں دور جدید کے مسائل کے مطالب
کو سمجھنے کے قابل بنا سکیں گے۔ کئی سال ہوئے میں
نے مسلم یونیورسٹی کو اسلامی علوم میں تحقیقی کام
کرنے والے علماء تیار کرنے کا منصوبہ پیش کیا تھا

---

[1] اقبال نامہ جلد اول ص ۵۰ [2] ص ۳۲ [3] خطبات اقبال ص ۶۳

لیکن بدقسمتی سے اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا"۔ [۱]

علامہ کی تدوین فقہ جدید کے بارے میں ذاتی کوششوں کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے افراد کو فرداً فرداً بھی توجہ دلائی اور جن سے توقع تھی کہ ہاتھ بٹا سکیں گے۔ انھیں اپنے پاس لاہور آکر ٹھہرنے اور اس عظیم کام میں شرکت اور تعاون کے لئے بھی لکھا۔ چنانچہ ڈاکٹر سید عبداللطیف کہتے ہیں :۔

"علامہ نے مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ میں ایک معتدبہ مدت کے لئے لاہور میں سکونت اختیار کر دوں تاکہ ایک طرف اسلامیہ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے ان کی کچھ خدمت کر سکوں اور دوسری طرف ان کے ایک منصوبے میں ان کی مدد کر سکوں۔ وہ منصوبہ یہ تھا:۔

انھوں نے اسلامی فقہ کی تجدید کے مسئلہ پر اپنی فکر کے نتائج کو نوٹس کی شکل میں قلمبند کیا تھا یہ نوٹس انگریزی میں تھے لیکن وہ محسوس کر رہے تھے کہ اپنی گرتی ہوئی صحت کے زمانے میں ان نوٹس کی ترتیب و تہذیب اور انھیں قطعی شکل دینا اور شائع کرنا ان کے لئے دقت سے خالی نہ تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ میں اس کام میں ان کا ہاتھ بٹاؤں"۔ [۲]

ڈاکٹر سید عبداللطیف کہتے ہیں کہ ہم نے حیدرآباد میں ایک ادارہ مسلم کلچرل سوسائٹی کے نام سے قائم کیا جو اہل علم اصحاب پر مشتمل تھا اور جس کے قیام کا مقصد اسلامی تہذیب کا تحقیقی مطالعہ تھا علامہ اس ادارہ کے قیام پر بہت خوش ہوئے تھے اور جب اس ادارہ نے اپنے پہلے "یوم اقبال" کی روداد اور رپورٹ ان کی خدمت میں ارسال کی تو علامہ نے اس پر اپنے اطمینان کا اظہار کیا کہ وہ اپنے بعد مستعد افراد کا ایک ایسا گروہ پیچھے چھوڑے جا رہے تھے جو ان کی جلائی ہوئی شمع کو روشن رکھ سکتا تھا۔

انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ نے ۱۹۳۷ء میں یوم اقبال منانے کا فیصلہ کیا تو اس وقت کے وزیر اعلیٰ پنجاب نے اس پروگرام کی تائید میں ایک بیان جاری کیا تاکہ اس تقریب کو پوری طرح کامیاب کیا جا سکے۔ انھوں نے اپنے بیان میں یہ تجویز بھی پیش کی کہ علامہ اقبال کی ملی خدمات کے طور پر ان کی خدمت میں تھیلی پیش کی جائے۔ سر سکندر حیات خان کی اس تجویز پر علامہ اقبال نے جو بیان جاری کیا وہ ان کے درد ملی، ایمان و اخلاق توکل علی اللہ اور فقر و درویشی کا نمونہ ہے۔ انھوں نے کہا:۔

"سر سکندر حیات نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ جو لوگ میرے کلام سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ سب مل کر مجھ کو ایک تھیلی پیش کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں ہماری قوم کی ضروریات اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کے سامنے ایک شخص کی ضرورتیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ فرد اور اس کی احتیاج بہرحال ختم ہو جانے والی چیز ہے لیکن قوم اور اسکی احتیاج ہمیشہ باقی رہے گی۔ آج وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اسلامی علوم کی تحقیق کے لئے لاہور کے اسلامیہ کالج میں ایک ادارہ "قائم کی جائے جہاں جدید طریقوں کے مطابق ریسرچ ہونی چاہئے۔ اب وقت آگیا ہے کہ اسلامی فقہ اور اسلامی طرز حیات کا بغور مطالعہ کر کے ہم عوام کو بتائیں کہ اسلام کا اصل مقصد کیا تھا اور اس مقصد کے مقابلے میں موجودہ اسلام کی روح کو کیوں کر مسخ کیا گیا ہے۔ ان پردوں کو اب اٹھانا چاہئے تاکہ نئی نسل کے نوجوان اسلام کی حقیقی شکل و صورت سے آگاہ ہو سکیں"۔

مسلمانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ غیر مسلموں کے لئے بھی یہ ادارہ بے حد مفید ثابت ہوگا کیوں کہ اسلام ایک طرف ایشیا کے باشندوں کی زندگی میں ایک زبردست عنصر کی حیثیت سے کارفرما رہا ہے تو دوسری طرف اس نے نوع انسانی کے ذہنی اور مذہبی انقلاب میں نمایاں حصہ لیا ہے

---

[۱] مکتوب بنام جناب فضل کریم صاحب از "اوراق گم گشتہ" ص ۳۹۰ [۲] اوراق گم گشتہ ۲۵۰

مجھے امید ہے کہ پنجاب کے وزیراعظم اس تجویز کو
کامیاب بنانے کی کوشش کریں گے۔ تاہم میں
ایک سو روپے کی حقیر رقم اس مجوزہ فنڈ کی
نذر کرتا ہوں"۔

غرض علامہ اقبال مسلمانوں کے علوم میں از سر نو تحقیق و
ریسرچ خصوصاً فقہ کی ترتیب و تدوین جدید کے بارے میں بہت
فکر مند تھے اور جہاں جہاں انھیں اس کا امکان نظر آتا تھا کہ وہاں
یہ کام کسی نہ کسی درجہ میں کیا جا سکتا ہے اس طرف وہ انتہائی توجہ
فرماتے تھے۔ انہی دنوں پٹھانکوٹ ضلع گورداسپور سے ایک مخیر
مسلمان زمیندار علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے جن کے
ہمراہ مشہور نو مسلم فاضل علامہ محمد اسد بھی تھے۔ یہ مخیر مسلمان
چودھری نیاز علی خاں تھے جنھوں نے پٹھانکوٹ کے قریب نہر کے
کنارے ایک سرسبز اور پر فضا دیہی علاقے میں ایک وقف قائم
کیا تھا جس کا مقصد خدمت اسلام تھا اور اب وہ علامہ اقبال
سے اسکی سرپرستی اس کے مقاصد کا تعین اور اس کے بہترین
مصرف کا طریقہ معلوم کرنا چاہتے تھے۔ وہاں اسوقت وقف
زمین پر اپنے ادارے کے لئے چند عمارات بھی بنانی شروع کر دی
تھیں۔ وقف، اس کے مصرف اور چودھری نیاز علی خاں کے
جذبۂ دین کو دیکھ کر علامہ اقبال کے دل میں اپنے تدوین فقہ جدید
کے منصوبے کے لئے سر و سامان پیدا ہوتا ہوا دکھائی دیا۔ چنانچہ
انھوں نے چودھری صاحب کو متعدد مشورے دیئے۔ اصل مسئلہ
ادارے کے لئے ایک ایسے شخص کی فراہمی تھی جو تعلیم و تربیت
اور تصنیف و تالیف کی پوری اسکیم کی نگرانی کرے اور ایک
طرف علم و فضل کی قوت سے دور حاضر کے مسائل کا جواب دے
اور دوسری طرف ایسے افراد تیار کرے جو عالم اسلام میں فکری
اور علمی انقلاب لانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ سید نذیر نیازی
نے اپنی کتاب "مجلس اقبال" میں ایک مجلس کا ذکر کرتے ہوئے
لکھا ہے:

"چودھری نیاز علی خاں جاوید منزل میو روڈ لاہور
تشریف لائے اور ان کے ہمراہ علامہ محمد اسد بھی
تھے چودھری صاحب نے حضرت علامہ کی خدمت
میں مزاج پرسی کے بعد عرض کیا کہ انھوں نے جمال پور
میں ایک وقف "دارالاسلام" کے نام سے قائم کیا
ہے تاکہ وہاں مسلمانوں کی اصلاح و تربیت اور انکی
تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ ان کی خواہش تھی کہ حضرت
علامہ اس کام میں ان کی رہنمائی فرمائیں اور جیسا ان
کا مشورہ ہو اس کے مطابق علماء دین کو دارالاسلام
آنے کی دعوت دی جائے۔ حضرت علامہ نے کہا
کہ سر دست ایک نام میرے ذہن میں آتا ہے۔ حیدرآباد
دکن سے ترجمان القرآن کے نام سے ایک بڑا اچھا رسالہ
نکل رہا ہے۔ مودودی صاحب اس کے ایڈیٹر ہیں
میں نے ان کے مضامین پڑھے ہیں۔ دین کے ساتھ
ساتھ وہ مسائل حاضرہ پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ ان کی
کتاب "الجہاد فی الاسلام" مجھے بہت پسند آئی
ہے۔ آپ کیوں نہ انھیں دارالاسلام آنے کی دعوت
دیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ دعوت قبول کریں گے"[۱]

پھر اسی سلسلے میں علامہ اقبال نے ایک خط جامعہ ازہر
مصر کے اس وقت کے شیخ علامہ مصطفی المراغی کے نام لکھا
جس میں انھوں نے چودھری صاحب کے ادارے کا تعارف کروا
کر اس کے لئے اعلیٰ علم و کردار والے عالم و فاضل اساتذہ
فراہم کرنے میں تعاون کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ انھوں نے لکھا:۔

"ہم نے ارادہ کیا ہے کہ پنجاب کے ایک گاؤں میں
ایک ایسا ادارہ قائم کریں جس کی نظیر آج تک
یہاں وقوع میں نہیں آئی ہے۔ ہماری خواہش ہے
کہ اس ادارے کو وہ شان حاصل ہو جو دوسرے
انی اور اسلامی اداروں کی شان سے بڑھ چڑھ کر ہو
ہم نے ارادہ کیا ہے کہ علوم جدیدہ کے چند فارغ
التحصیل حضرات اور علوم دینیہ کے چند ماہرین کو
یہاں جمع کریں۔ یہ ایسے حضرات جن میں اعلیٰ
درجہ کی ذہنی صلاحیتیں ہوں۔ ہم ان کے لئے ایک

---

[۱] اقتباس از مجلس اقبال از سید نذیر نیازی از اوراق گم گشتہ صفحہ ۸۶،۸۵

علمی اسلامی مرکز اور ہم ان کے لئے ایک لائبریری قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں ہر قسم کی نئی اور پرانی کتب موجود ہوں اور ان کی رہنمائی کے لئے ہم ایک ایسا معلم جو کامل اور صالح ہو اور قرآن کریم میں مہارت تامہ رکھتا ہو نیز انقلاب دور حاضرہ سے بھی واقف ہو مقرر کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی روح سے واقف کرے اور تفکر اسلامی کی تجدید یعنی فلسفہ، حکمت، اخلاق، سیاسیات اور اقتصادیات کے علوم میں ان کی مدد کرے تاکہ وہ اپنے علم اور تحریروں کے ذریعہ تمدنِ اسلامی کے دوبارہ زندہ کرنے کیلئے جہاد کر سکیں۔

اس تجویز کو منکشف کرنے کی چنداں ضرورت نہیں آپ خود بخوبی اس بات کو سمجھتے ہیں لہذا میری تمنا ہے کہ آپ ازراہ عنایت ایک روشن خیال مصری عالم کو جامعہ ازہر کے خرچ پر ہمارے پاس بھیج کر ممنون فرمائیں تاکہ یہ شخص ہم کو اس کام میں مدد دے سکے۔ چاہئے کہ یہ شخص علوم شرعیہ اور تاریخ تمدنِ اسلامی میں ماہر ہو۔ نیز زبان انگریزی پر بھی قدرت کامل رکھتا ہو۔ علاوہ ازیں مجھے مصری وفد کے اراکین سے جنھوں نے پچھلے دنوں ہمیں اپنی ریاست سے مشرف فرمایا تھا، معلوم ہوا تھا کہ جامع ازہر اپنے خرچ پر ہندوستان میں چند مبلغین مختلف مقامات پر بھیجنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ایک مرکز اسلامی کی بنا جیسا کہ میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے مقصدِ تبلیغ کے لیے مختلف مقامات پر مختلف مبلغین بھیجنے سے زیادہ اولیٰ و اقرب ہے۔ مجھے توقع ہے کہ دین حق کا نور اس مرکز سے ہندوستان کے تمام اطراف واکناف میں پھیلے گا۔

لیکن شیخ ازہر علامہ المراغی کی طرف سے نفی میں جواب آیا ان کے پاس ایسی صلاحیت کا آدمی موجود نہ تھا۔ علامہ اقبال نے چودھری صاحب کو اس جواب سے آگاہ کر دیا پھر انھوں نے چودھری نیاز علی خاں کو جو خط لکھا اس میں ملکی حالات کے پیش نظر مسلمانوں کی پسماندگی کو دیکھتے ہوئے ان کے دلی اضطراب اور قلبی پریشانی کا واضح نقشہ موجود تھا۔ علامہ نے لکھا:

”آپ تشریف لائیے میں آپ سے ادارہ کے متعلق گفتگو کروں گا۔ اسلام کے لئے اس ملک میں نازک زمانہ آرہا ہے جن لوگوں کو کچھ احساس ہے ان کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش اس ملک میں کریں۔ انشاء اللہ آپ کا ادارہ باحسن وجوہ اس مقصد کو پورا کرے گا۔ علماء میں مداہنت آگئی ہے۔ یہ گروہ حق کہنے سے گریز کرتا ہے اور ڈرتا بھی ہے۔ صوفیاء اسلام سے بے پروا اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور آجکل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی منفعت و عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں ہے۔ عوام میں جذبہ موجود ہے مگر ان کا کوئی بے غرض رہنما نہیں ہے۔“

پھر چودھری نیاز علی ایک خط میں لکھتے ہیں!

”میں حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے فرمایا کہ ہم نے آپ کے ادارے کیلئے ایک عالم تلاش کر لیا ہے میں نے پوچھا کون؟ تو انھوں نے فرمایا کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب جو آجکل حیدرآباد میں مقیم ہیں ان دنوں سید صاحب کی ترجمان القرآن کی وجہ سے شہرت ہو چکی تھی میرا خیال ہے کہ حضرت علامہ ایک کتاب فقہ اسلامی پر لکھنا چاہتے تھے اور اس کے لئے انھیں ایک اچھے صاحب علم عالم کی ضرورت تھی۔ اسکے بعد پھر میں نے بھی مولانا صاحب کی خدمت میں اپنے ادارے کے بارے میں خطوط لکھے۔“

چودھری نیاز علی خاں نے اپنے ادارے کا تعارف، اسکے مقاصد اور اسکے لئے مولانا مودودی صاحب جیسے صاحب علم شخص کی ضرورت کے بارے میں مولانا مودودی صاحب سے مراسلت کی۔ چنانچہ اسی مراسلت کے نتیجے میں علامہ اقبال اور چودھری نیاز علی خاں کے اصرار پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی حیدرآباد دکن سے دارالاسلام پٹھانکوٹ میں منتقل ہو گئے تاکہ اس ادارے کو ان خطوط پر چلا سکیں جو ان تینوں حضرات کے درمیان متفقہ طور پر طے پا گئے تھے۔ ●●

اوراق گم گشتہ صہ ۹۰

پروفیسر عبدالسلام
(کراچی)

تخلیق و تنقید

تخلیق و تنقید کے تعلق کا مسئلہ مرغی اور انڈے والے مسئلہ کی طرح ہے۔ "اسکاٹ جیمس" نے ایسا فیصلہ کرنے کی کوشش کی جس سے دونوں فریق خوش ہو جائیں۔ اس نے لکھا ہے کہ دنیا کے اس قدیم انسان نے جو غار میں رہتا تھا ٹیڑھے ترچھے خطوط میں انسان کی تصویر بنانے کی کوشش کی۔ اسے آپ فن یعنی تخلیقی فن کا اولین نمونہ کہہ سکتے ہیں۔

یہ تصویر انتہائی بھدی تھی مگر اس کے خطوط انسان کی کچھ امتیازی خصوصیات کو ظاہر کرتے تھے مثلاً اس کی سیدھی ٹانگیں جن پر کہ یہ کھڑا ہو سکتا تھا اور یہ بات اسے دوسرے حیوانات سے ممتاز کرتی تھی۔ اسکاٹ جیمس نے لکھا ہے کہ "انسان کی مکمل تصویر نہیں ہے اس میں بہت سی باتیں غائب ہیں مگر یہ ہمیں چند باتیں بتاتی تھی ہے اس کے ذریعہ دنیا کے اس اولین فن کار نے ہمارے سامنے انسان کا تصور پیش کیا ہے۔ انسان کی یہی امتیازی خصوصیات کو یادہ تنقیدی شعور ہے جو اس تصویر کو بناتے وقت اس کے ذہن میں موجود تھا۔ اس بحث سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ اولین تخلیق کے وجود میں آنے سے پہلے بھی تنقید کا ایک تصور چاہے وہ کتنا ہی دھندلا کیوں نہ ہو فن کار کے ذہن میں موجود تھا۔

اس نتیجہ سے انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں نظر آتی مگر یہ ضرور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ باقاعدہ فن کی حیثیت سے تنقید کافی بعد وجود میں آئی۔ محض اس دھندلے سے تصور کو تنقید نہیں کہا جا سکتا چند تخلیقی نمونوں کے وجود میں آ جانے کے بعد ہی تنقید کا وجود میں آنا ممکن ہے۔ ان نمونوں کا موازنہ کرکے ہی بہتر نمونے پیش کرنے کے بارے میں تنقید کچھ مشورے دے سکتی ہے۔ بہترین نمونوں کی بہترین باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اصولِ فن متعین کر سکتی ہے۔ قدیم یونانی ادب بھی اسی کی مثال پیش کرتا ہے۔ ہومر کی اوڈیسی میں بھی لوگوں نے کچھ تنقیدی اصولوں کی نشان دہی کی ہے۔ مگر افلاطون کے تنقیدی تصورات اور ارسطو کی بوطیقا کافی بعد میں وجود میں آئیں۔

تنقید اور تخلیق میں سے کسی ایک کو اہم تر ثابت کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ان دونوں کا وجود ایک دوسرے کے لئے ناگزیر ہے۔ تنقیدی صلاحیت کے بغیر کوئی ادیب اچھا ادب نہیں پیش کر سکتا۔ اسی طرح تنقیدی صلاحیت سے عاری نقاد کبھی اچھی تنقید پیش نہیں کر سکتا۔ تین چار نقادوں کی تحریروں کو سامنے رکھ کر کسی کی تائید اور کسی کی تردید کر دینا تنقید نہیں ہے۔ تنقید کے نام پر جو بہت سی تحریریں شائع ہوتی ہیں وہ تنقید نہیں بلکہ تنقید فروشی ہے۔

کئی صاحبان نے ٹی ایس ایلیٹ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب ایک تخلیقی ذہن دوسرے سے بہتر ہوتا ہے تو اسکی وجہ اکثر یہ ہوتی ہے کہ جو بہتر ہوتا ہے وہ تنقیدی صلاحیت زیادہ رکھتا ہے۔ اس قول کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں۔ اس کی مثالیں ادبیات عالم میں بھری پڑی ہیں۔ ہمارے قدیم شاعروں اور نثر نگاروں میں بدقسمتی سے تنقیدی شعور بہت کم تھا۔ تنقیدی شعور دراصل حقیقت بینی اور حقیقت نگاری پر مبنی ہوتا ہے اور ہمارے معاشرے میں یہ صلاحیتیں تقریباً مفقود تھیں۔

تمام بڑے شاعروں کے یہاں تنقیدی شعور کی شہادتیں دیسے تو مل جاتی ہیں۔ مثلاً غالب نے اپنے خطوط میں کئی جگہ اور اپنے کلام میں

کہیں کہیں اپنے فن شعر گوئی پر روشنی ڈالی ہے مگر ان میں سے بیشتر باتیں شعر گوئی کے ظاہر سے تعلق رکھتی ہیں۔ تخلیقی عمل کے بارے میں اشارے بہت کم ہیں۔

غالب کو کئی نقادوں نے گوئٹے سے تشبیہ دی ہے۔ گوئٹے کو بعض مغربی نقادوں نے یورپ کا عظیم ترین نقاد کہا ہے۔ تنقیدی شعور کے اعتبار سے ان دونوں کا موازنہ کریں تو آپ کو رات دن کا فرق نظر آئے گا۔

اقبال کے پاس مغربی ڈگریاں بھی تھیں اور مغربی ادبیات پر بھی ان کی نظر تھی۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے آپ انھیں دنیا کے بڑے شاعروں کی صف میں رکھ سکتے ہیں مگر اس پایے کے تنقیدی شعور کی تو کیا اس سے کافی کمتر درجہ کی مثالیں بھی ان کے یہاں بہت کم پائی جاتی ہیں۔

جب اردو کے دو عظیم ترین شاعروں کا یہ حال ہے تو اوروں کا حال تو بہت ہی افسوس ناک ہے۔ ہمارے شاعروں کے یہاں تنقید کو ایک مذموم چیز مثلاً تنقیص۔ عیب جوئی۔ حاسدانہ رویہ وغیرہ سمجھا جاتا ہے۔ جوش کا شمار بھی اردو کے بڑے شاعروں میں ہوتا ہے انھوں نے "نقاد" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اور تنقید نگاروں پر جو تبرا کیا ہے اس کی مثالیں اس کتاب میں دوسرے مقامات پر دی جا چکی ہیں۔ جوش میں جس پایہ کی تخلیقی صلاحیت ہے اس کے ساتھ اگر اعلیٰ درجہ کا تنقیدی شعور بھی ہوتا تو وہ بہت بڑے شاعر ہوتے مگر ان کی شاعری کا کافی بڑا حصہ محض لفظی صنعت گری ہو کر رہ گیا ہے۔ اور ان کی شاعری اپنے انقلابی نعروں کے باوجود اقبال کے مقابلے میں کافی چھوٹی نظر آتی ہے۔

خوش قسمتی سے موجودہ دور کے شاعروں اور نثر نگاروں میں تنقیدی شعور اپنے سابقین کے مقابلے میں کافی زیادہ نظر آتا ہے بعض شاعروں نے بہت اچھی تنقیدیں لکھی ہیں۔ اس دور کے بہت سے شاعر خاصے پڑھے لکھے اور معاصر عالمی ادب سے باخبر ہیں اور فن شعر گوئی کو سمجھ کر شعر کہتے ہیں۔

یورپ میں بہت سے بڑے شاعروں نے شاعری سے متعلق تقریباً اسی پایہ کی تنقیدیں بھی لکھی ہیں۔ انگریزی ادب سے بھی آپ کو اس سلسلے میں کافی مثالیں مل جائیں گی مثلاً کولرج، ورڈسورتھ، شیلے، اور ٹی ایس ایلیٹ۔ کچھ شاعر ایسے بھی ہیں جن کی تنقیدیں ان کی شاعری سے بہتر ہیں مثلاً میتھیو آرنلڈ۔ اسی طرح بعض بڑے ناول نگاروں نے ناول سے متعلق اعلیٰ درجہ کی تنقیدیں لکھی ہیں مثلاً ہنری جیمس اور ورجینا وولف، ای ایم فوسٹر کی تنقید کا مرتبہ غالباً ان کے ناولوں سے بہتر ہے۔

ہمارے ناول نگاروں میں سے صرف ڈاکٹر احسن فاروقی نے ناول نگاری سے متعلق اعلیٰ ترین تنقیدیں لکھی ہیں۔ انھوں نے بہت سے ناول بھی لکھے ہیں۔ وہ خود اپنی تنقیدوں کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں۔ مگر میری نظر میں ان کی تنقیدوں کا مرتبہ ان کے ناولوں سے کہیں بلند ہے۔

اس بحث سے یہ نتیجہ تو آسانی سے نکالا جا سکتا ہے کہ تخلیقی فن کار میں تنقیدی صلاحیت لازمی طور پر پائی جاتی ہے۔ کم یا زیادہ کا سوال ایک بات ہے مگر اس بحث کے دوسرے پہلو پر کم توجہ دی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر نقاد میں تخلیقی صلاحیت کا پایا جانا بھی ضروری ہے۔ آپ یہاں بجا طور پر یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ تخلیقی صلاحیت کتنے نقادوں کے یہاں پائی جاتی ہے۔ اس کا جواب یہی ہے کہ حقیقی نقاد وہی ہے جس کے یہاں تخلیقی صلاحیت بھی پائی جائے۔

آپ شاعروں پر کسی تنقید کا مطالعہ کرتے ہیں اگر وہ تنقید آپ میں شعر فہمی کی صلاحیت اور فن شعر کے بارے میں بصیرت پیدا کرتی ہے تو گویا اس نقاد میں شعر کہنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے ہو سکتا ہے کہ اس نے کبھی شعر نہ کہا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس میں شعر گوئی کی صلاحیت ہے تو ضرور مگر اس درجہ پر نہیں ہے کہ اسے شعر گوئی کی طرف مائل کرے۔ یہی حال دوسری اصناف کے بارے میں ہے۔

ناول یا افسانہ پر لکھی ہوئی تنقید اگر ان اصناف کو سمجھنے کی بصیرت پیدا نہ کر سکے تو وہ حقیقی نقاد نہیں ہے۔ ادھر ادھر سے رائیں جمع کر کے اور ان میں کاٹ چھانٹ کر کے انھیں بدلے ہوئے لباس میں پیش کر دیتا ہے۔ تنقید کے نام پر لکھی ہوئی بہت سی ایسی تحریریں ملی ہیں جنھیں تنقید سے کوئی واسطہ نہیں۔

کوئی پبلشر کسی استاد کے پاس جاتا ہے اور امتحانی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے اس سے کوئی کتاب لکھواتا ہے۔ فرض کیجیے

ایم اے کے نظم کے پرچے کے لئے چند بڑے شاعروں پر اس سے لکھواتا ہے۔ وہ موسم گرما کی تعطیلات میں کتاب گھسیٹ دیتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کتاب کے دیباچہ میں مصنف یہ بھی لکھ دے کہ یہ کتاب امتحان میں ۴۰ یا ۵۰ فیصد نمبروں کی ضمانت دیتی ہے۔ اس طرح لکھی ہوئی کتاب کو تنقید سے کوئی واسطہ نہیں یہ محض تجارت ہے، مزدوری ہے۔ آپ اسے جعلی تنقید کہہ سکتے ہیں۔

تنقید کی ایک قسم اور ہے جو مروّت میں لکھی جاتی ہے تبصرے اور پیش لفظ بعض اوقات اپنی طبیعت کے خلاف محض مروّت میں لکھے جاتے ہیں۔ اور ایسی تحریریں اچھے خاصے الٹرا نقادوں کو بھی لکھنی پڑتی ہیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ ایسی تحریروں کو لغیران کے مصنفین کے کہے عاق نامہ کیا جائے۔

بعض لوگوں میں تخلیقی اور تنقیدی صلاحیت دونوں اعلیٰ درجہ میں ہوتی ہیں اور وہ دونوں میدانوں میں اپنی صلاحیت کا ثبوت دیتے ہیں، بعض میں تنقیدی صلاحیت غالب ہوتی ہے اور وہ تنقید نگاری اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے برخلاف بعض پر تخلیقی صلاحیت کا اس قدر غلبہ ہوتا ہے کہ وہ تخلیقی ادب ہی پیش کرتے ہیں اور ان کی تنقیدی صلاحیت ہر وقت ان کی تخلیقات کی نوک پلک درست کرتی رہتی ہے۔

آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ بعض لوگ شعر بھی کہتے ہیں اور تنقید بھی لکھتے ہیں۔ بنیادی طور پر اس میں کوئی خرابی نہیں ہے بلکہ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ ان کی تنقیدیں نہایت اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہیں۔ مگر ان کی شاعری کو پڑھ کر آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ انھیں شعر کہنے کی کیا ضرورت آ پڑی تھی۔ صف اوّل کا نقاد اگر تیسرے درجے کی شاعری کرے تو وہ شاعر کی حیثیت سے تو شہرت حاصل نہیں کر سکے گا البتہ اپنی تنقیدی ساکھ کو بھی نقصان پہنچائے گا۔ یہ صاحبان دراصل اپنی شخصیت میں پھیلاؤ اور عظمت پیدا کرنے کی خاطر اس قسم کی غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں۔

قصہ مختصر تخلیق و تنقید دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں محض عیب جوئی، چودھراہٹ، حمایت کی خاطر لکھی ہوئی تحریروں کو تنقید سے واسطہ نہیں بلکہ حقیقی تنقید تو دراصل تخلیق کی رہنمائی کر کے بہتر تخلیق کے امکانات پیدا کر سکتی ہے۔ ●●

صلاح الدین پرویز
(ریاض)

محمد رسول اللہ

وہ اپنے گھر سے نکل پڑا تھا
سپید شب کی مسافری سے
سیاہ سورج کا غم اٹھا کر نے، وہ اپنے گھر سے نکل پڑا تھا
وہ شام ابرو، وہ رات گیسو
وہ تبسم چھایا، وہ چاند ماتھا
وہ آنکھ شمعیں، وہ ہونٹ صبحیں
سفید پھولوں کا باغ سیارا
اداس بچوں کا باپ پیارا
کہ جس کی آنکھوں میں ان کے غم
جگمگا رہے تھے
وہ رحمتوں کا عظیم والی
وہ برکتوں والا آسمانی
وہ جنتوں کا حسین مالی
دعاؤں کے راستے بناتا
زمیں کی گرمی پہ چل رہا تھا
وہ دشمنوں میں گھرا ہوا تھا
تمہاری آنکھوں کے بادلوں میں
تمہارے خوابوں کے جنگلوں میں
کئی رحمتیں [illegible]
تمہارا [illegible] کے منتظر ہیں
کہ اے میرے آسمان لوگو!
تمہاری راتوں میں بارشیں ہوں

تمہاری راتوں کی بارشوں میں
تمہارے جگنو چمک رہے ہوں تو
وہ اب پہاڑی پہ آگیا تھا
کہ منتہا تھی نہیلی اس کی
ہوائے دیکھا
تھکی ہوئی سانس کی تہوں سے
اسے پکارا
سمندروں کی غلاف آنکھیں!
صداؤں کی بے حباب سانسیں
سمٹ کے اس کے قریب آئیں
ہوا تھا لیکن ہوا نہیں تھا
صدا تھا لیکن صدا نہیں تھا
خدا نہیں تھا، خدا نہیں تھا
وہ میٹھے پانی کا ایک جھرنا
خدائے برتر کا آئینہ تھا
وہ جا چکا ہے
وہ جا چکا ہے
وہ موتیا جیسے پاؤں والا
وہ چمپئی چاند نور والا
وہ بیٹیا وہ میرا پیارا
اسے بلاؤ کہ لوٹ جاؤں میں اس کی آنکھوں میں نیند بن کے
اسے بلاؤ کہ پھوٹ جاؤں میں اس کے سینے میں بوند بن کے
وہ جا چکا ہے
وہ جا چکا ہے
وہ راہِ اسریٰ کا کبریائی
وہ شاہِ معراج وہ خدائی
وہ جا چکا ہے
مگر یہ گھر کیسا گھر ہے اس کا
یہ کیسا گھر ہے
مہک رہا ہے
یہ کیسا بستر ہے

جل رہا ہے
یہ اسپ ازحد مکاں والا
ابھی تلک سامنے کھڑا ہے
عبادتوں سے بنا پرندہ
ابھی تلک آنکھ مل رہا ہے
صدا صدا ، بے صدا فقیری
ہوا کے کاندھوں پہ چل رہی ہے
مگر بدن ڈر رہا ہے اس کا۔

صدا صدا ، بے صدا فقیری
ہوا ہوا ، بے ہوا سواری
بدن بدن ، بے بدن نمازی
خموش خاموش ہے خموشی
وہ جا چکا ہے

وہ جا چکا ہے
کواڑ کی نرم گرم دستک ابھی تلک اس کی منتظر ہے۔

سہیل احمد زیدی (الہ آباد)

آہنی دوپہر

عرب اسرائیل جنگوں میں روس اور امریکہ کے رویہ سے متاثر ہو کر

آہنی دوپہر جن کے درمیاں
ہر حقیقت ہر گماں
یہ گھڑی اور وہ گھڑی
روز و شب اور ماہ و سال
سب انھیں کے درمیاں
سرنگوں اور شرمسار
آہنی دوپہر جن کے درمیاں
موجِ خوں، صحرا، سراب
میرے لشکر، تیری فوج
غازی و بسمل، شہید
سب انھیں پیروں کے بیچ
بے حقیقت اور حقیر
آہنی دوپہر جن کے درمیاں
وادیِ سینا کی آگ
اس صدی کے معجزات
راستہ، پانی، عصا
بحر و بر، آتش، ہوا
با ادب بے اختیار
آہنی دوپہر جن کے درمیاں

گردنیں [illegible] کی کٹے چلتے رہو
ایڑیوں سے ایڑیاں لڑتی رہیں
کہنیوں سے پسلیاں چھلتی رہیں
دوستی، فتح و شکست
آہ، آنسو، قہقہے
سب انھیں کے درمیاں
آہنی دوپہر جن کے درمیاں

سہیل احمد زیدی (الہ آباد)

قصہ پانچویں درویش کا

سارا سب کچھ بے معنیٰ ہے
وقت کی کیا اوقات
یہ جنگل
یہ آگ
یہ شب
میرا اور تمہارا قصہ
جی بہلانے کی سب باتیں
اے درویشو، اے انسانو
میری پیدائش سے پہلے
میرے ماں اور باپ بہت مفلس تھے
کیلے کے چوڑے پتوں سے اپنا آپ چھپا لیتے تھے۔
لمحوں کی زنجیر سے ناواقف
اِدھر اُدھر پھرتے رہتے تھے
ٹھنڈی سوندھی، مٹی کی آغوش میں پڑ کر سو رہتے تھے
ماضی اور مستقبل سے بے پروا
جب جیسا موقع پڑ جاتا
ہنس دیتے تھے رو لیتے تھے
محفل اور آدابِ محفل
قسمت میں لکھے ہی نہیں تھے
پیڑوں اور پرندوں سے باتیں کرتے تھے
اے درویشو، اے انسانو

میں اذ، سیدھے سادے انسانوں کے دل میں
شعلہ بن کر لپکا
یک تمنا ایک ہوس بیدار ہوئی
شہر بسے
باغات اُگے
تہذیبیں ایجاد ہوئیں
دولت کے انبار لگے
محلوں کی دیواریں اٹھیں
انگوروں کے خوشے
بہتی، ٹھنڈی، نہریں
موتی جیسے بکھرے خادم

ڈاکٹر سید عارفی

فساد زدہ شہر

فسادات سے متاثر ہو کر

اداس کائنات
خوف
یہ ڈراؤنی سی شام!
اندھیرا
ایک غلیظ اندھیرا حکمراں
یہ شب پروں کے قہقہے
یہ خامشی کی سلطنت
یہ سائے ڈھلتے ہوئے
یہ حال خستہ زبوں
یہ سسکیوں کا ایک بحر بیکراں
یہ راستوں پہ خون کی لکیریں بولتی ہوئی
امانتوں کا بار دوش پر لئے
یہ راکھ میں چھپے ہوئے
پہاڑ جیسے گھر
کھڑے ہیں انتظار میں
مکین کے
چتائیں جل رہی ہیں
جنگلوں میں گیدڑوں کا ناشتہ بنی ہوئی
یہ نقش ہائے سوختہ
وہ کون ہے جو منزلوں کی سمت ان کو لے چلے

کوئی نہیں!
کوئی نہیں
کوئی نہیں
کوئی نہیں!

وارث رشید قدوائی (نئی دہلی)

سفر ہے شرط

[وارث قدوائی کے دو خطوط اپنے عزیز کے نام]

پہلا خط

فرینکفرٹ شیراٹن ہوٹل - فلوگہاوین (مغربی جرمنی)
۲۴ر نومبر ۸۳ء

برادرم - السلام علیکم

سندباد جہازی مرحوم نے سات بار سفر سے توبہ کی اور ہر بار توبہ توڑ ڈالی - دراصل توبہ شائد ہوتی ہی ہے توڑنے کے لئے ورنہ مرحوم نے جو کلفتیں اٹھائی تھیں ان سے اگر انسان سبق لیتا تو تمام موجودہ ہوائی کمپنیاں دیوالیہ اور یہ عظیم الشان جیب تراش ہوٹل بند ہو جاتے - ذوقِ سفر کی داد دیجے کہ مجھ جیسا کاہل الوجود شخص (جو بستر سے اتر کر غسل خانے کو بھی سفر سے تعبیر کر کے یہ خواہش رکھتا ہے کہ یہ فریضہ بھی اگر بیوی انجام دے دے تو عین مسافر نوازی ہو) بھی عازم سفر ہوا - میں نے آپ کو شائد پہلے بھی متنبہ کر دیا تھا کہ یہ ناشدنی واقعہ ہو گا ضرور - بہت ٹال مٹول کی مگر برطانیہ عظمیٰ میں نہ صرف سلطنت پر زوال آگیا ہے بلکہ عقلی دیوالیہ بھی نکل گیا ہے - چنانچہ علم و دانش کے جو موتی اقبال کو یورپ میں نظر آئے تھے شائد وہ یورپ میں ابھی در عشرہ ہیں اور انگریزی ظرافت کی یا ستم ظریفی کی داد دینے کو جی چاہتا ہے کہ اس سرقہ کا گمان اس ہیچمداں پر کیا گیا - ہم نے بھی کہا تو تم لوگ بھی کیا یاد کرو گے دو سو سال ہمارا خون چوسا ہے اب اگر ہم خون نہیں چوس سکتے تو بہکا تو سکتے ہی ہیں - چنانچہ ہم نے یونیورسٹی آف لیڈس کی دعوتِ تدریس قبول کر لی - طلباء کا جو حشر ہونا مقرر ہو گا وہ ہو گا -

۲۲ اور ۲۳ نومبر کی درمیانی شب میں کے ایل ایم کی فلائٹ سے بوقت نیم شب دہلی سے روانہ ہوا - جہاز دو گھنٹہ کراچی میں رکا - مسافروں کو لاؤنج میں بیٹھ جانے کی اجازت تھی ہم بھی بیٹھے رہے - باہر نکلنے اور کسی سے ملنے کی نہ تو فرصت تھی نہ اجازت - کسی کو اطلاع بھی نہیں تھی - گھر میں فون بھی نہیں ہے کہ فون کر کے بات کر لیتا - دل ضرور مچلتا رہا کہ اس قدر پاس ہو کر بھی کتنی دوری ہے - ڈھائی بجے جہاز نے لنگر اٹھایا (یہ ترکیب سندباد جہازی مذکور کی ہے) ہماری سیٹ کی سامنے والی سیٹوں پر دو خواتین بیٹھی تھیں - ان کے ہمراہ تین شیر خوار بچے بھی تھے جو اپنے اپنے پالنے میں آرام سے سو رہے تھے - مگر ہمیں تعجب اس پر تھا کہ ان سفید فام خواتین کے تینوں بچے کالے کالے ہندوستانی سے معلوم ہوتے تھے - ابھی ہم آنکھ بند کر کے نیند کی منت ہی کر رہے تھے (کیونکہ ہوائی جہاز یا ریل کے سفر میں نیند کو ہماری آنکھوں سے دشمنی نکالنے کا موقع وافر میسر ہوتا ہے) کہ اچانک ایک شیر خوار نے رونے میں اپنی مہارت کا ثبوت دینا ضروری سمجھا چنانچہ بلعلم ہم بھی گوش بر آواز ہو گئے اور ہم ہی کیا تمام مسافر متوجہ ہو گئے - صاحبزادے مذکور نے مشقِ سخن کو اس قدر طول دینا واجب سمجھا کہ نہ صرف ہم پڑوسی بلکہ جہاز کا عملہ بھی پریشان ہو گیا جہاز کی مسافر خواتین نے اپنے اپنے آزمودہ نسخے آزمائے مگر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی - اس ہنگامہ ہائے بین میں یہ عقدہ کھلا کہ درحقیقت یہ خواتین سویڈن کی فلاح عامہ قسم کی سوسائٹی کی کارکن ہیں اور اولاد سے محروم سویڈش خواتین کی امداد کے طور پر ہندوستان سے بچے برآمد کرتی ہیں - ہندوستان میں چونکہ افزائشِ نسل کی کثرت ہے اور اگھانی سنبے کی تدابیر بھی مطلب براری نہ کر سکیں اس لئے خواتین مذکورہ کو بقدر ضرورت بچے ہندوستان سے آسانی سے مل جاتے ہیں - مطلب ایں کہ تمام قانونی کارروائیاں ہندوستان میں مکمل کر کے جائز طور پر یہ تین بچیاں بعمر تین ماہ، چھ ماہ و ڈیڑھ سال ان خواتین نے حاصل کر لیں اور انھیں اپنے وطنِ عزیز لے جا کر تین اولاد سے محروم خواتین کی گود ہری کریں گے -

بات شروع ہوئی تھی رونے سے گمر رونے کا سلسلہ ایسا تھا کہ رکنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ ایک تجربہ کار خاتون نے ہلکا سا SEDATIVE دینے کا مشورہ دیا وہ بھی آزمایا گیا مگر کارگر نہ ہوا۔ ہمارا سر فخر سے اونچا ہو گیا کہ تان سین اسی ملک میں تو پیدا ہوئے تھے اور سنا ہے کہ دن بھر اور رات بھر ریاض کرتے رہتے تھے۔ اسی ملک کی ایک دختر نے اپنے پردلسٹ کا مظاہرہ جس شدومد سے کیا وہ قابل داد بھی لیکن ہماری نیند بھی اسی کی نذر ہو گئی۔ مسلسل آٹھ گھنٹے جہاز چلتا رہا اور بچی کا رونا جاری رہا۔ ٹیپ کا بند یہ ہے کہ جب فرینک فرٹ کا فاصلہ تقریباً ایک گھنٹہ رہ گیا تو بچی نے ہاتھ پھیلا کر میری طرف آنے کی کوشش کی۔ ہم نے بھی انسانی ہمدردی اور وطن پرستی کے جذبہ میں اسے گود میں لے لیا۔ اس کے بعد کا واقعہ ایسا ہے کہ تاریخ تربیت اطفال میں سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ یعنی ہوائیوں کہ بچی ہماری گود میں آتے ہی چپ ہو گئی —

ہماری نا اہلی دنیا والوں اور بالخصوص ہماری بیگم کی نظر میں کتنی ہی مسلم کیوں نہ ہو لیکن ہمیں یقین ہے کہ کے ایل ایم کے جمبو ۷۴۷ جہاز کے تین سو مسافروں کی نگاہ میں ہماری جو وقعت بڑھی وہ ناقابل بیان ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر ایک پھول مالا، ایک گلدان اور ایک میز کرسی کا انتظام سر دست ممکن ہو سکتا تو تمام مسافروں کی طرف سے ایک جلسہ تہنیت ضرور منعقد کر دیا جاتا۔ چونکہ یہ اشیائے ضروری فی الوقت میسر نہ آ سکیں اور کوئی جلسہ ہمارے اعزاز میں منعقد نہ ہو سکا اس لئے ہم نے بھی ان کی کس مپری کا خیال کرتے ہوئے اصرار نہ کیا۔ یہ امر یقینی ہے کہ خواتین مذکورہ نے اطمینان کی سانس لی جو ہم نے صاف صاف خود اپنے کانوں سے سنی۔ سویڈش زبان میں جو تقریر موصوفہ نے کی وہ غالباً بہ اظہار تشکر ہو گی۔ ہمارے ایک پڑوسی نے اندیشہ ظاہر کیا کہ جب فرینک فرٹ میں اتر جاؤں گا تو پس ماندگان کا امسٹرڈیم تک کیا حشر ہو گا۔ ہم نے تشفی کے الفاظ جو اس موقع پر عموماً مستعمل ہیں ادا کئے، مگر ممدوح کی آنکھوں اور بشرہ سے ظاہر ہوتا تھا کہ تسلی بقدر ضرورت نہ تھی۔ ہمیں تو ان کے بار بار اندیشہ ظاہر کرنے سے یہ شبہ بھی ہوا کہ کہیں موصوف اپنی عافیت کی خاطر امسٹرڈیم تک میرا سفر جاری رکھنے پر مصر نہ ہو جائیں....

فرینک فرٹ سفر کی پہلی منزل تھی یہاں کام کچھ بھی نہیں تھا کے ایل ایم کی مہربانی سے ان کے خرچ پر ایک دن قیام تھا۔ فرینک فرٹ کا ہوائی اڈا کیا ہے، ایک جہاں آباد ہے اس خرابے میں، ریستوران، بازار، سنیما، ریل کا اسٹیشن، بس اسٹیشن، ہوٹل، غرض سبھی کچھ موجود ہے۔ نہ جانے کتنے تہ خانے ہیں۔ میں تو شمار بھی نہ کر سکا۔ شیرٹین ہوٹل بھی اسی کا ایک حصہ ہے۔ اگر یہاں اپنے خرچ پر قیام ہوتا تو یقیناً اختلاج قلب ہونے لگتا کیونکہ بھئی ایک ہزار روپیہ یومیہ کمرہ کا کرایا ہے اور صرف کافی یا چائے کی پیالی DIN 13-50 یعنی تقریباً ساٹھ روپے کی۔ مینو کارڈ میں ہم نے فہرست مضامین پر نگاہ ڈالی اور پھر مایوسی اور حسرت سے آب و دانہ کی تلاش میں نکلے — ہوائی اڈا پر بھی بے شمار خوانچے ہیں۔ وہاں ایک پیالی کافی اور ایک سینڈوچ کھا کر پیٹ کی آگ سرد کی۔ قیمت کا ترجمہ کیا تو ۲۷ روپیہ خرچ ہو چکے تھے۔

اتوار کا دن ہے پورا شہر بند ہے۔ نہ میوزیم کھلے ہیں نہ دوکانیں شام کو شہر کا گشت لگا کر اس کی نبض دیکھنے کی کوشش کی۔ ٹیوب ٹرینیں بہت آرام دہ ہیں۔ کچھ حصہ دیکھا باوجود اتوار کے روشنیوں سے شہر میں رات بھی دن معلوم ہوتی تھی۔ نظر پڑی ایک ترکی ریسٹوران پر اور داخل ہوئے تو سامنے ایک دیوار پر کلمہ طیبہ آویزاں تھا جی خوش ہو گیا۔ سامنے سیخ کباب لگ رہے تھے۔ ہم نے سیخ کباب کا آرڈر دیدیا۔ اسے وہ "اصلی عدنا کباب" کہتے ہیں۔ تھے بہت لذیذ ایک پلیٹ میں چار سیخ کباب اور کچھ پیاز وغیرہ تھے۔ نان مفت میں ملتی ہے۔ یہ نسخہ یہاں کے حساب سے زیادہ مہنگا نہیں رہا۔ کیونکہ صرف ۱۴ مارک دینے پڑے۔ ہندوستانی سکہ میں ترجمہ کرنے کے لئے $4\frac{1}{2}$ سے ضرب دیدیجئے۔

لوگ انگریزی کم جانتے ہیں مگر پھر بھی کوئی زحمت نہیں ہوتی ہے زندگی بہت ORGANISED ہے۔ ہر جگہ صفائی، فنی مہارت اور تندہی اور چستی نظر آتی ہے۔ لوگ اجنبی کو مدد دینے میں بہت فراخدل ہیں زبان نہ جاننے کے باوجود کسی سے کچھ پوچھئے تو مقدور بھر مدد ضرور کرے گا۔

یہ خط ذرا بحر طویل میں پڑ گیا۔ اب لندن کے سفر کا وقت آ گیا اس لئے اب اسے میں پوسٹ لندن جا کر ہی کروں گا۔

بھابھی سے آداب کہئے بچوں کو دعا۔

فقط وارث

دوسرا خط

کریسنٹ ہوٹل
الکلے۔ یارکشائر (انگلینڈ)
۸ر دسمبر ۱۹۸۰ء بروز اتوار

برادرم السلام علیکم

ایک خط میں نے فرینک فرٹ سے لکھا تھا جو وہاں سے حوالۂ ڈاک نہیں کیا جا سکا تھا اور لندن سے روانہ کیا تھا۔ امید ہے کہ مل گیا ہوگا۔ داستان منزل ہفت خواں کا باب اول بھی تمام نہ ہوا تھا کہ خط پوسٹ کر دینا پڑا۔ فرینک فرٹ کا جزوی حلیہ درج کر چکا ہوں تفصیلی حلیہ کا جائزہ ہم خود نہ لے سکے کیونکہ اتوار کا دن تھا تمام بازار بند تھے بس یونہی شاہراہ شہر کے بڑے بازار کا لگا لیا تھا کہ کہنے کو تو ہو جائے کہ فرینک فرٹ بھی دیکھا۔ ریستوران اور نائٹ کلب کھلے ہوئے تھے یورپ میں تہذیب جدید اور شخصی (یا جنسی آزادی) کے منظر یہاں ہر بازار میں سیکس شاپس کی کثرت ہے۔ ان دوکانوں میں ہماری تدروں کے مطابق فحش تصاویر، کیسٹ، فلمیں، کتابیں، جنسی لذت بڑھانے کی ادویہ، خود لذتی کے سامان کھلے عام دستیاب ہوتے ہیں۔ ہم نے بھی ایک آدھ دکان کے اندر جھانک کر دیکھا۔ اخلاق اور ایمان دشمنی کے تمام سامان مہیا تھے۔ ہر چند دوکانیں تماشبینوں سے بھری ہوئی تھیں مگر جرمن لوگ کم اور ٹورسٹ زیادہ نظر آئے۔ بالعموم عمر رسیدہ لوگ دکھائی دیئے۔ جوانوں کو عمل سے کہاں فرصت کہ کتابوں اور فلموں میں وقت خراب کریں۔ کھلے بازار میں راہ چلتے ٹورسٹوں کو مہ جبینانِ فرنگ دعوت وصل دیتی ہیں۔ ہماری شکل سے نہ جانے ان عفت مآب خواتین کو کیا اندازہ ہوا کہ کسی نے ہم سے کوئی کام کی بات کرنا مناسب نہ جانا۔ چنانچہ ہمارے اخلاق پر کوئی مضر اثرات مرتب نہ ہو سکے۔ واپسی میں ٹیوب اسٹیشن پہنچے تو تمام نشانات اور عبارتیں چونکہ جرمن زبان میں ہیں۔ اس لئے یہ سمجھنا کہ ایرپورٹ کیلئے ٹیوب ٹرین کس پلیٹ فارم سے ملے گی ایک مسئلہ بن گیا۔ ریلوے کے ایک ملازم سے پوچھا۔ وہ انگریزی سے نابلد نکلا مگر بڑی انسانیت کے ساتھ اس نے اشاروں میں سمجھایا۔ اس کے اشارہ کے مطابق تہ خانہ بہ تہ خانہ طے کرتے ہوئے ایک پلیٹ فارم پر وارد ہوئے تو پھر سوال یہ اٹھا کہ مشرق کی طرف جانے والی گاڑی منزل مقصود کو لے جائے گی یا مغرب کی طرف جانے والی؟ ایک شریف صورت مسافر سے سوال کیا۔ موصوف بھی ہماری زبان نہ سمجھے مگر لفظ ایرپورٹ سمجھ گئے اور از راہ کرم ہمیں ساتھ لے کر ٹائم ٹیبل کو پڑھ کر پلیٹ فارم کی نشاندہی ہی نہیں کی بلکہ صحیح جگہ کھڑا کر کے اپنی جگہ واپس گئے۔ اللہ ان کا بھلا کرے۔ ٹرین آئی اور اس میں ہم بے دھڑک داخل ہو گئے۔ جب گاڑی چلدی تو اندازہ ہوا کہ غلطی سے فرسٹ کلاس میں آ گئے ہیں۔ بہرحال اسی کو غنیمت جانا اور ایرپورٹ پر اتر کر اپنے ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ دوسرے دن ہم لندن کے لئے روانہ ہوئے۔ ایک گھنٹہ کا سفر برٹش ایرویز کا تھا۔ برطانوی جہاز میں بیٹھ کر ایسا لگا کہ جیسے ہم جانی بوجھی جگہ پر ہیں۔ کیونکہ لوگ زبان سمجھتے تھے۔ ہیتھرو ایرپورٹ اب کافی بہتر ہو گیا ہے۔ گذشتہ بار جب ہم آئے تھے تو زیر تعمیر تھا۔ ہم نے برٹش امیگریشن کے بہت سے قصے سنے تھے کہ کالے آدمیوں کو بہت دق کرتے ہیں۔ مگر ہماری شکل سے موصوف نے اندازہ لگا لیا کہ یہ شخص یہاں ٹھہرنے والا نہیں ہے۔ بس ایک منٹ میں مہر لگا دی۔ یہاں کسٹم نہ ہونے کے برابر ہے۔ لوگ گرین چینل سے بس گزرے چلے جاتے ہیں۔ جب ہم گذرے تو کسٹم افسر نے روکا اور سامان کھولنے کی فرمائش کی۔ ہمارے پاس کون سامان تھا۔ ہم نے کہا "بخوشی تلاشی لیجئے" اور تو کچھ ان کو ملا نہیں پان کی ڈبیا اور بٹوہ کافی غور سے ملاحظہ فرماتے رہے آخر ہم نے ان معلومات عامہ میں اضافہ کیا۔ اور اس کی ترکیب استعمال سمجھائی تو ممدوح نے معذرت کرتے ہوئے انگلستان میں اچھا وقت گذرنے کی امید ظاہر کرتے ہوئے باہر جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

ٹیوب ٹرین لے کر ویسٹ کنسنگٹن (WEST KENSINGTON) پہنچے جہاں ایک ہوٹل میں کمرہ بک کرا لیا تھا۔ یہ ہوٹل بھی کیا ہے اس کو سرائے بلکہ بھٹیار خانہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ایک معمولی سا گھر تھا جس کو ایک ہندی نژاد ایسٹ افریقی مسمی نورالدین نے ہوٹل بنا دیا ہے۔ سات پونڈ یومیہ کرایہ ہے۔ مسافروں میں زیادہ تر

وہ لوگ ہیں جو بے روزگار ہیں یا بوڑھے ہیں اور حکومت کے خرچ پر مقیم ہیں۔ انگلستان میں SOCIAL SECURITY بھی خوب چیز ہے۔ بوڑھے اور لاچار اور بے روزگاروں کو حکومت رہنے اور کھانے کے لئے خاصا وظیفہ دیتی ہے۔ یہ اس قدر ہوتا ہے کہ کام کر کے بھی اتنا ہی کمایا جا سکتا ہے۔ ایک نوجوان لڑکا ملا وہ بھی سوشل سیکورٹی کے خرچ پر ہوٹل میں مقیم ہے۔ ہم نے پوچھا کہ صاحبزادے جوان آدمی ہو کام کیوں نہیں کرتے۔ جناب نے الٹا ہم سے سوال کیا آپ ایک بھی معقول وجہ بتا دیجئے کہ کیوں کام کریں؟ ظاہر ہے ہم لاجواب ہو گئے۔ اور حکومت برطانیہ کو دل سے دعائیں دیں۔

دس دن لندن میں قیام رہا زیادہ وقت مختلف میٹنگوں کی نذر ہو گیا۔ دوکانیں سامانوں سے بھری ہوئی ہیں۔ کرسمس کا تہوار قریب ہے اس لئے سجاوٹ قابل دید ہے۔ مگر ہمارے لئے دور کا جلوہ ہے کیوں کہ قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ ۴ سال پہلے ایک وقت کا کھانا کسی معمولی ریستوران میں ایک پونڈ میں ہو جاتا تھا۔ اب ۴، ۵ پونڈ سے کم نہیں لگتے۔ کوئی ترکاری ½ ۱ پونڈ فی کلو سے کم نہیں ہے۔ گوشت دو ڈھائی روپے فی کلو ہے۔ سوٹ جو پہلے ۲۵ ۔ ۳۰ پونڈ کے مل جاتے تھے اب ۶۰ پونڈ سے کم کے نہیں۔ غرض افراط زر اس قدر ہے کہ ہمیں تو اختلاج ہونے لگا کسی چیز کو ہاتھ لگانے کی ہمت نہیں ہوتی ہے۔ مگر یہاں قیمتوں کے ساتھ آمدنی بھی بڑھی ہے۔ لوگ دوکانوں پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔ کرسمس کی خریداری زوروں پر ہے۔

منسٹر آف اوورسیز ڈیولپمنٹ کی ایک میٹنگ میں ایک بزرگوار سے ملاقات ہوئی وہ ہندوستان میں دس سال پولیس کی ملازمت کر چکے تھے۔ جونپور، مرادآباد اور لکھنؤ میں ایس پی رہ چکے تھے۔ انھوں نے اپنی یادیں تازہ کرنی شروع کیں۔ بڑی پر لطف صحبت رہی۔ دوسرے دن کھانے پر بھی مدعو کیا۔

۲ دسمبر کو ہم لیڈس پہونچ گئے۔ یہاں ہمارے بہت سے انگریز دوست ہیں۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے جیسے اپنے گھر آ گئے، ہر شخص مجسم تواضع ہے۔ ڈپارٹمنٹ آف منیجمنٹ اسٹڈیز کے ہیڈ پروفیسر بٹروَرتھ ہمارے قریبی دوست ہیں۔ انھوں نے نوازش و اکرام اور مہمان نوازی کی انتہا کر دی۔ شہر سے ۳۰ میل دور ایک گاؤں ILKLEY میں رہتے ہیں وہیں ایک ہوٹل میں ہمارے لئے بھی انتظام کر دیا۔ یہ گاؤں کا ہوٹل ہے مگر ہمارے کسی بڑے سے بڑے ہوٹل سے کم نہیں۔ ۱۵ پونڈ یومیہ کرایہ ہے جو پروفیسر موصوف اپنی جیب سے ادا کر رہے ہیں۔ جب سے ہم یہاں آئے ہیں کھانے کی دعوتیں روز ہوتی ہیں۔ ایک دن بھی الگ کھانا کھانے کی نوبت نہیں آئی۔ لکچر جو دینے تھے وہ دے دیئے۔ اللہ کی مہربانی سے سرخروئی ہوئی۔ ایک اور دوست جان والٹس نے یہ مہربانی کی کہ دو دن اپنی کار میں لے کر مختلف مقامات کی سیر کرائی۔ الکلے سے تھوڑی دور پر HAWAPTH ایک گاؤں ہے جہاں شارلٹ اور ایملی میر لنتے (BRONTE SISTERS) رہتی تھیں۔ انہی وادیوں میں وہ سیر کے لئے نکلا کرتی تھیں۔ ان کا مکان اسی طرح محفوظ ہے اور ان کے استعمال کی تمام اشیا مع فرنیچر، کتابیں، سینے پرونے کا سامان، کپڑے سب اسی طرح رکھے ہیں جیسے وہ ڈیڑھ سو سال پہلے تھیں۔ بلکہ ایسا لگتا ہے کہ جیسے ابھی کہیں اٹھ کر چلی گئی ہوں۔

یہاں سے تھوڑے فاصلے پر ایک اور گاؤں HAROGATE ہے جہاں گندھک کے چشمے بہتے ہیں۔ پرانا قصبہ ہے پہلے لوگ یہاں ان چشموں کا پانی پینے اور نہانے کے لئے آیا کرتے تھے۔ ہم نے بھی یہ امرت نوش جان کیا۔

کل اتوار تھا یارک کا مشہور شہر دیکھا۔ جہاں رومن فاتحوں نے شہر کی دیوار تعمیر کی تھی۔ پوری فصیل اب بھی موجود ہے جو ۵۵ ق م کی تعمیر شدہ ہے۔ یہاں کا گرجا انگلستان میں دوسرے درجہ پر گنا جاتا ہے۔ جو بارہویں صدی میں تعمیر ہوا تھا۔ انگلستان میں گاؤں اور شہر میں فرق بہت کم ہے۔ یارک شائر کاؤنٹی کا علاقہ پہاڑی ہے بڑی خوبصورت وادیاں ہیں۔ سرسبز پہاڑ، صاف شفاف دریا، ہرے بھرے جنگل، غرض چاروں طرف قدرتی حسن بکھرا ہوا ہے۔ یارک (YORK) خاصا بڑا شہر ہے۔ ہمارے لکھنؤ کے چوک کی طرح تنگ گلیاں ہیں جن کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے تین سو اور چار سو سال پرانے مکانات اب بھی اسی طرح موجود ہیں جس طرح پہلے رہے ہوں گے۔ سوائے بجلی کی روشنی کے سارا ماحول چودھویں یا پندرہویں صدی کا معلوم ہوتا ہے۔ گرجے میں جو کھڑکیاں ہیں ان میں منقش شیشے بے مثال ہیں۔ گرجے کی وسعت اس قدر ہے کہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔ جب ہم

پہونچے تو ARCHBISHOP OF YORK سروس ادا کر رہے تھے۔ اس کے بعد ان کا جلوس بڑے کرّ و فر سے نکلا تمام راہب بڑی خوشنما کار چوبی عبائیں پہنے ہوئے تھے عصا بردار آگے آگے چلتا تھا، پھر صلیب بردار پھر مختلف راہبوں کا جلوس سب سے آخر میں سفید عبا پہنے ہوئے آرک بشپ تشریف لائے بڑا دلچسپ نظارہ تھا۔

ایک ریستوران میں چاۓ پی جو چار سو سال پرانی عمارت میں تھا۔ انگریزوں کو آثار قدیمہ سے اس قدر عشق ہے کہ وہ اپنے پرانے آثار کو بڑی محبت سے درست حالت میں محفوظ رکھتے ہیں۔

یہ خط اب بہت لمبا ہو گیا۔ انگلیاں لکھتے لکھتے دکھ گئیں اس سے پہلے کہ خوں چکاں ہوں، خط ختم کرتا ہوں۔

۹ کو MANCHESTER سے امسٹرڈیم کے لئے روانہ ہوں گا۔ دو دن ہالینڈ میں، پھر ایک دن استنبول میں اور تین دن کراچی میں ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔ انشاء اللہ ۱۶ دسمبر کو دلّی پہونچ جاؤں گا۔

خدا حافظ

آپکا وارث

ڈاکٹر وزیر آغا (سرگودھا)

اگر تارہ سحر کا جل بجھا ہے
یہ آنسو سا تری پلکوں پہ کیا ہے؟
درختوں کو تو چپ ہونا تھا اک دن
پرندوں کو مگر کیا ہو گیا ہے
زمیں پر صورتیں ہی صورتیں ہیں
فلک پر آئینوں کا سلسلہ ہے
مری ہر سانس میں ہے زہر اس کا
کہوں کیسے کہ وہ مجھ سے جدا ہے
دھنک دیوار ہے رستے میں حائل
دگرنہ جست بھر کا فاصلہ ہے
اسے بند آنکھ سے میں دیکھ تو لوں
مگر پھر عمر بھر کا رت جگا ہے
کریں ہونے کی اب کیا آرزو ہم
جو ہونا تھا سو وہ تو ہو گیا ہے

ابوالمجاہد زاہد (رامپور)

سفر حضر میں رہے، گھر میں انجمن میں رہے
تمام عمر ہم اپنے ہی پیرہن میں رہے

خوشی کے ساتھ ہجومِ غم و محن میں رہے
خدا گواہ! کہ ہم رام بن کے، بن میں رہے

جو میں ارادہ کروں تیرے در سے اٹھنے کا
نہ اس سے پہلے ہی تاب و تواں بدن میں رہے

جو تو نسیم سحر ہے تو پھیل جا ہر سمت
جو بوئے گل ہے تو پھر قید کیوں چمن میں رہے

خدا بچائے خوشامد پسند امیروں سے
ہم ان کی بزم میں جب تک رہے گھٹن میں رہے

انھیں کا نام لکھا ہے خزاں پرستوں میں
جو بن کے روحِ بہارِ چمن، چمن میں رہے

یہی علاج ہے ہر دور کے مصائب کا
کہ بندہ 'بندگیِ ربِّ ذوالمنن میں رہے

زمین کوچۂ قاتل ہے اب تمام زمین
جو "عیدگاہ" بھی جائے کوئی، کفن میں رہے

کوئی بھی رنگ ہو، کوئی بھی نام ہو زاہد
ہر ایک پھول کا حق ہے کہ وہ چمن میں رہے

نشتر خانقاہی (مرادآباد)

فضا بے طلب، سایہ بادل کا اک
خدا، آدمی، پیڑ جنگل کا اک

سفر اور یہ اک ارضِ سیلاب برد
سمندر دھویں سے بھرے جل کا اک

گیا اور جانے کا دکھ دے گیا
وہ لمحہ عذابِ مسلسل کا اک

چھپی ہے صدا زیرِ زنجیرِ در
نشاں ہو یہ جیسے گئی کل کا اک

گزر آئے تھے جن زمینوں سے ہم
سنو! اب وہ خطہ ہے دلدل کا اک

تعاقب میں اپنے ہے آتش بہ پا
تماشہ یہ کس کا ہے، پاگل کا اک

نہ میری زباں پر نہ لب پر ترے
زمانہ وہ گنتی کے دو پل کا اک

عرفان صدیقی
(لکھنؤ)

اک نہ اک دیپ سے روشن رہی کالی دنیا
میں بجھا تو مرے بچوں نے اجالی دنیا

دام تو آج کے بازار میں لگتے تھے بہت
میں نے کل کے لئے تھوڑی سی بچالی دنیا

آگ سے کھیلتے رہنے کا نتیجہ دیکھا؟
اپنے ہاتھوں کی طرح تم نے جلالی دنیا

جب اسے سکۂ زرجان کے پھیلایا ہاتھ
جانے کس شخص نے مٹھی میں چھپالی دنیا

لے گئے سارے دیئے اگلے زمانے کے بزرگ
اور ہم لوگوں نے طاقوں میں سجالی دنیا

تو وہی ہے مرے اجداد کی ٹھکرائی ہوئی
مجھ سے اقرار وفا مانگنے والی دنیا

تو انھیں یاد آئے گی اے جوئبار اگلے برس
اب تو لوٹے گی پرندوں کی قطار اگلے برس

اور کچھ دن اس سے ملنے کے لئے جاتے رہو
بستیاں بس جائیں گی دریا کے پار اگلے برس

پہلے ہم پچھلی رتوں کے درد کا کرلیں حساب
اس برس کے سارے زخموں کا شمار اگلے برس

تم تو سچے ہو مگر دل کا بھروسہ کچھ نہیں
بجھ نہ جائے یہ چراغ انتظار اگلے برس

میں نئے موسم میں برگ تازہ بن کر آؤں گا
پھر ملیں گے اے ہوائے شاخسار اگلے برس

اپنے ہاتھ اس بار پھر اپنے گریبانوں پہ تھے
چاک کیا ہوگی قبائے شہریار اگلے برس

جلیل عالی (پاکستان)

سپرد ہیں ہر کسی کو احوال اپنے اپنے
اٹھائے پھرتے ہیں ہم مہ و سال اپنے اپنے
نفس نفس وقت کے بگولوں کی قید کاٹے
لئے پھریں ہر کسی کو جنجال اپنے اپنے
کسی کو کیا فیض دے یہاں رہبری کسی کی
نظر نظر راستوں اشکال اپنے اپنے!
نشاط لمحوں کو صید کرنے کی آرزو میں
بچھائے بیٹھے ہیں سب یہاں جال اپنے اپنے
الگ الگ ہر کسی کی پرواز کا زمانہ
ہوا، فضا، آسماں، پر و بال اپنے اپنے
جو دوسروں کی نگاہ کے آئینے نہ ہوتے
تو دل کہاں ڈھونڈتے خد و خال اپنے اپنے

منظور ہاشمی (ریاض)

خواہش اس کے لئے ہی سب کی تھی
بات کچھ شدت طلب کی تھی
دوست میرا نہ ہو سکا وہ کبھی
دشمنی اس کو جانے کب کی تھی
کیسے پہچانتا میں قاتل کو
ایک سی شکل ان میں سب کی تھی
جس سے روشن رہا مرا ہر دن
وہ رفاقت بس ایک شب کی تھی
ورنہ لفظوں میں جان کیا پڑتی
ساحری صرف اس کے لب کی تھی
ہر کھلونے پہ دل مچل اٹھا
پر گرانی بڑے غضب کی تھی

انور مسعود (پاکستان)

ہر کوئی ظلم کا بڑھتا ہوا لشکر دیکھے!
کون منقارِ ابابیل میں کنکر دیکھے!

کان بیتاب کہ رنگوں کی صدا بھی سن لیں
آنکھ بےچین کہ خوشبو کا بھی پیکر دیکھے

اپنی ہستی کا شناسا نہیں دیکھا کوئی
ورنہ دیواروں پہ آئینے تو گھر گھر دیکھے

اتنے پرہول بھلا خواب کہاں ہوتے ہیں
جاگتی آنکھ نے کیا کیا نہیں منظر دیکھے

ان دنوں سیرِ گلستاں کی ہوس ہے کس کو
کون شاخوں کا اترتا ہوا زیور دیکھے

دل کو کھینچے ہے یہ دو رنگ رویہ اُس کا
سامنے آنکھ چرائے مجھے چھپ کر دیکھے

ماجد صدیقی (پاکستان)

باغ میں ایسا کوئی منظر نہیں
جس کے رخ پر گرد کی چادر نہیں

خشک سالی چشم کا آشوب ہے
دل وگرنہ اس قدر بنجر نہیں

اس کا ہونا اور نہ ہونا ایک ہے
جس قبیلے میں کوئی بوذر نہیں

جب سے دیوانہ مرا اس شہر میں
پاس بچوں کے کوئی پتھر نہیں

سنگ کو جو شکل دے اور نطق بھی
مہرباں اتنا کوئی آذر نہیں!

کم نہیں کچھ اس کی خو کا دبدبہ
ہاتھ میں قاتل کے گو خنجر نہیں

بے حسی ماجد یہ چھٹ جائے گی کیا
آپ کہہ لیں پر ہمیں باور نہیں

قمر مراد آبادی (مراد آبادی)

اک بات دل میں چبھتی ہے اکثر کہے بغیر
مجھ سے خفا ہوئے وہ ستم گر کہے بغیر

عرضِ نیازِ شوق کو دوہرائے جائیے
بنتی نہیں ہے بات مکرّر کہے بغیر

ہرچند انھیں حسین کہوں دلربا کہوں
سمجھے گا کون فتنۂ محشر کہے بغیر

ہوتے رہے ہیں عرصۂ محشر کے تذکرے
آیا نہ لطف کوچۂ دلبر کہے بغیر

اک بار شکوہ کر کے پشیماں ہوں آج تک
کتنی اڑی یہ بات مکرر کہے بغیر

خورشید پر ہوں یا مہ و انجم پہ تبصرے
سب ناتمام ہیں رخِ انور کہے بغیر

تالیفِ قلب چاہئے ہر حال میں قمر
رہزن بہت اداس تھا رہبر کہے بغیر

افتخار بخاری (راولپنڈی)

دشتِ بے سمت میں رکنا بھی سفر ایسا تھا
زندگی بھاگتے گذری مجھے ڈر ایسا تھا

سانپ لپٹے ہوئے شاخوں سے ثمر زہر بھرے
جس کے سائے میں لگی آنکھ شجر ایسا تھا

رات بھر آگ برستی ہے ہوا جلتی ہے
سوچتا ہوں مرے خوابوں کا نگر ایسا تھا

عکسِ امید بھی ملتا نہ تھا صحراؤں میں
آنکھ ترسی تھی سرابوں کا سفر ایسا تھا

ڈھونڈتا ہوں اسے نیند سے تہی راتوں میں
ہائے وہ شخص کہ جو خواب سحر ایسا تھا

اب لوٹا ہوں بخاری تو ہوں بیگانہ سا
مرا اس شہر سے جانا تو خبر ایسا تھا

طارق چھتاری (علی گڑھ)

تین سال

علی جان کو اپنے ماتھے پر بندھی سہرے کی لڑیاں لوہے کی زنجیروں سے بھی زیادہ وزنی اور خوفناک لگ رہی تھیں۔ وہ پھولوں میں منہ چھپائے کچھ اس طرح سہما ہوا بیٹھا تھا جیسے چڑیا کا بچہ اپنے سر پر باز کو اڑتے دیکھ کر سہم جاتا ہے۔

جب اس نے دیکھا کہ مرزا مجید اپنے ساتھ گاؤں کے پردھان، داروغہ جی اور کچھ سپاہیوں کو لے کر اس کے گھر میں داخل ہو رہے ہیں تو وہ کانپ اٹھا۔ "مرزا جی ...... مرزا جی ...... میرا لال، علی جان میرا بچہ ...." اس کی ماں کی چیخ اس کے کانوں میں دیر تک گونجتی رہی اور پھر اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔

منھ پر پانی کی چھینٹیں پڑتے ہی اس نے آنکھیں پھڑپھڑائیں اور گردن گھما کر دیکھنے لگا۔ بیگم مرزا سرہانے بیٹھی پنکھا جھل رہی تھیں۔ مرزا مجید اس کے اوپر جھکے کھڑے تھے اور کہہ رہے تھے۔

"بیٹے آنکھیں کھولو ...... شاباش ——"

پھر اس کی کلائی پکڑ کر بخار دیکھنے لگے۔ بیگم بولیں ——

"اتنا محنتی بچہ ہے، ذرا کام بتا دو پھر دیکھو، لو ہو یا بارش پر مگر وہ پورا کر کے ہی دم لیتا ہے۔ اب دیکھو نا لکڑی اوپر ڈالنے کو کہا تھا دن بھر اسی میں لگا رہا —— لو لگ گئی نہ آخر۔"

علی جان آنکھیں کھول کر دالان کی چھت کو گھورنے لگا مگر اسے چھت نظر ہی نہ آئی۔ محسوس ہوا کہ دور تک آسمان پھیلا ہوا ہے اور سفید سفید بادل کے ٹکڑے اِدھر اُدھر اڑ رہے ہیں۔

بادل ......؟

نہیں یہ تو کاغذ کے ٹکڑے ہیں۔ تاگے سے بندھے کاغذ کے ٹکڑے ...... ہاتھ سے بنائی ہوئی پتنگیں ...... اور تاگے ...... مرزا مجید کے لحاف گدوں سے نکالے ہوئے تاگے ....

ایک روز جب بیگم مرزا نے لحاف گدے دھوپ میں ڈالنے کے لیے ٹانڈ سے اتارے تو ان میں ڈورے غائب تھے۔ مرزا نے علی جان کو ڈانٹا مگر بیگم فوراً ہی بول پڑیں۔

"کیا ہوا اگر ڈورے نکال لیے، بچہ ہی تو ہے۔ ویسے بھی سردیوں میں روئی بدلوانی ہے نئے ڈورے پڑ جائیں گے ——"

بہت دیر تک پتنگیں اڑتی رہیں ...... پھر اسے لگا کہ ساری پتنگیں ایک جگہ جمع ہو گئی ہیں اور وہ سب سیاہ ہوتی جا رہی ہیں —— کچھ دیر بعد وہاں ایک بھی پتنگ نہیں تھی ۔ اس کی نظروں کے سامنے مرزا مجید کے دالان کی کڑیوں سے پٹی چھت تھی جسے وہ گھورے جا رہا تھا —— آہستہ آہستہ اس کی نظریں دالان کی چھت سے سرکتی ہوئی بڑے سے آنگن میں رینگنے لگیں۔ ایک کونے میں چوکی پر بیٹھی بیگم مرزا دوپٹے میں سنہرے گوٹے کی گوٹ ٹانک رہی ہیں۔ اسے سچا گوٹا کتنا اچھا لگتا ہے۔ وہ اکثر بیگم مرزا کی تلے دانی سے گوٹا نکال کر اپنے کرتے کے دامن پر رکھ کر بار بار دیکھتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ بیگم مرزا ایسا کرتے دیکھ بھی لیتی ہیں تو بھی کچھ نہیں کہتیں۔ کہیں بھی کیسے اسے تو انھوں نے اپنی اولاد کی طرح پالا ہے۔ ان کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے مگر اولاد سے محروم ہیں۔

علی جان سچے گوٹے کو اپنے ہاتھ کی کلائی سے لپیٹ لیتا ہے

اور اپنے ہاتھ کو غور سے دیکھنے لگتا ہے۔

ہتھکڑی ـــ ـــ ـــ ـــ ۔۔۔!

داروغہ جی نے اس کے ہاتھ میں بندھی رسی کو جھٹکا دے کر کھینچا اور رسی ایک سپاہی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولے۔

"سے رام داس! اس حرام زادے کو چوکی لے کر چل۔ میں مرزا جی کے ساتھ آتا ہوں۔"

مرزا جی ـــ ـــ ـــ ۔۔۔!

مرزا جی گھرانہ گاؤں کا معتبر گھرانا تھا۔ ان کا مکان گاؤں کے دوسرے گھروں کے مقابلے میں بڑا اور خوبصورت تھا۔ آنگن اور برآمدے کے فرش کے علاوہ زینے کی سیڑھیاں اور بیت الخلاء کے قدمچے بھی پکی اینٹوں کے بنے ہوئے تھے باقی پورا مکان کچی اینٹوں کی چوڑی چوڑی دیواروں پر قائم تھا۔

کچی اینٹوں پر چکنی مٹی کا لیپ اور اس پر چونے کی پتائی یوں محسوس ہوتا جیسے مٹی کے ڈھیلوں کے بیچ کوئی چاندی کا کٹورا پڑا ہو۔ بالائی منزل پر دو بڑے بڑے کمرے جن کے سامنے والی چھتیں بھوسے کی گوڑی ملی چکنی مٹی سے لھسی ہوتیں۔ مرزا صاحب کی جائداد کا کافی حصہ بک گیا تھا۔ اب ان کی آمدنی کا ذریعہ کچھ زمین جو بٹائی پر دے رکھی تھی اور ایک آم کا باغ تھا جس سے پورے سال کی ضروریات پوری ہو جاتیں۔

اولاد کوئی تھی نہیں، محلے کے بچوں کو قرآن پڑھانے میں بیگم مرزا کا دن کٹ جاتا۔ علی جان بھی بیگم مرزا سے قرآن پڑھنے آیا کرتا۔ اس کا باپ میواتی رسول خاں علاقے کا نامی ڈکیت تھا ــ جو کئی سال سے جیل میں ایک قتل کی سزا کاٹ رہا تھا۔ علی جان کا گھر مرزا جی کے مکان سے بالکل ملا ہوا تھا۔ اس کی ماں کھجور کی ڈلیں اور پنکھے بُن کر گھر کا خرچ چلا لیتیں۔ بیگم مرزا بھی علی جان کے گھر کا پورا خیال رکھتیں۔

علی جان لڑائی جھگڑے، چوری چکاری سے دور بھاگتا ہے۔ اس کا دل پڑھنے لکھنے کی طرف زیادہ مائل ہے۔ کئی سپارے شوق سے ختم کر چکا ہے۔

اب رسول خاں کی سزا ختم ہو گئی اور وہ رہا ہو کر گھر واپس لوٹا تو اس نے علی جان کو پڑھنے سے اٹھا لیا۔

"بزدل بنے گا کیا ان مرزاؤں کی صحبت نے تجھے کسی دین کا نہیں چھوڑا۔ بہادری سے جی ۔۔۔۔۔۔ عورتوں کی طرح چوڑیاں پہن کے کوئی میواتی جیا ہے کبھی؟ اور تو ہے کہ میری ناک کٹوانے پر تلا ہوا ہے ۔۔۔۔ حرام زادے ۔۔۔۔"

علی جان لرز گیا۔

رسول خاں کے دوست، اس کے گروہ کے آدمی علی جان کو زبردستی پکڑ کر جنگل کی طرف لیجا رہے ہیں۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہے۔ بادل گرجتے ہیں تو علی جان کی رگوں میں خون جم جاتا ہے۔۔۔۔۔ اچانک ایک گڈھے میں اس کا پیر پڑ گیا۔ علی جان چیخنے لگا ــ

"نہیں ۔۔۔۔۔۔ نہیں ۔۔۔۔ مجھے چھوڑ دو ــ"

کلے خاں نے اس کی گدّی پر ایک مکا جمایا اور وہ لڑکھڑا کر گرنے ہی والا تھا کہ رسول خاں کی کڑک دار آواز اس کے کانوں میں آئی ــ!

"سیدھا چل حرام زادے ۔۔۔۔۔ بہت عیش کی کاٹ لی۔"

وہ گرتا پڑتا آگے بڑھ رہا ہے۔ چاروں طرف گھور اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ اس نے دیکھا سفید سفید کپڑے پہنے کئی آدمی ایک کھیت میں لیٹے ہوئے ہیں ــ

رسول خاں کے دوست کالے خاں نے اس کے ہاتھ میں ایک لڑھکا دے دیا ــ

"یہ لے ۔۔۔۔ اور ان سب کو ایک طرف سے ختم کر دے۔"

"ایں ۔۔۔۔ نہیں ۔۔۔۔"

"نہیں کے بچے ــ" رسول خاں نے دونوں ہاتھوں سے اس کے بال پکڑ کر زمین پر گرا دیا اور گھسیٹنے لگا اور ان سفید پوش انسانوں کے قریب لا کر کھڑا کر دیا۔ علی جان نے غور سے دیکھا مرزا جی ایک نہیں پچاسوں مرزا جی سفید سفید کپڑے پہنے کھیت میں لیٹے ہوئے تھے۔

"نہیں ۔۔۔۔ نہیں بابا ۔۔۔۔ میں مر جاؤں گا ۔۔۔۔ نہیں ۔۔۔"

وہ اتنی زور سے چیخا کہ اسے محسوس ہوا اس کے گلے کی تمام نسیں پھٹ گئی ہیں۔ اور اس کی چیخ رکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ وہ چیختا ہی رہا بہت دیر تک ــ کہ رسول خاں نے اسے زور سے جھنجھوڑ دیا ــ

"کیوں مرا جا رہا ہے ۔۔۔۔ اٹھ ــ"

اس کی ماں کھڑی رو رہی ہیں۔ رسول خاں نے ماں کی طرف لال لال آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو شک ہے کہ اس کی رگوں میں میرا ہی خون ہے یا کسی اور کا ——"

پھر رسول خاں اپنے ماتھے کو پکڑتے ہوئے زمین پہ اکڑوں بیٹھ گیا جیسے اس کے سارے جتن بے کار چلے گئے ہوں اور بولا۔

"اچھا تو ایسا کر —— کل سے ابراہیم لوہار کی دکان پر کام کرنے جایا کر۔ وہ کل ہی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ تھوڑا پیٹنے کو ایک لڑکے کی ضرورت ہے۔"

گرمی بہت ہے۔ اس کے پورے بدن سے پسینے کے فوارے چھوٹ رہے ہیں۔ ابراہیم لوہار کی چھینی پر ہتھوڑے کی چوٹیں مارتے مارتے اس کے دونوں بازو شل ہو گئے ہیں۔

پسینہ خشک ہو رہا ہے۔ بیگم مرزا کو پسینہ آتا بھی ہے۔ وہ ان کے سرہانے بیٹھا پنکھا جھل رہا ہے۔ بیگم نے کروٹ بدلی اور آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔

"سوتا کیوں نہیں علی جان .... جا برآمدے میں سو جا اچھا یہ کنگن اور ہار لے جا کر تحویل میں رکھ دے۔ کم بخت گرمی میں زیور پہننا بھی عذاب ہے۔"

چابی کا گچھا اور زیور علی جان کے حوالے کر کے بیگم نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ علی جان نے تحویل میں کنگن اور ہار رکھ کر چابی کا گچھا بیگم کے سرہانے رکھ دیا۔

"تو نے سنز النسی کہاں رکھی ہے علی جان؟"

"آپ کے سرہانے ——"

"ایں .... ؟" ابراہیم لوہار چونک پڑا۔

ایک ڈکیتی کے جرم میں رسول خاں کو پھر تین سال کی سزا ہو گئی علی جان کو موقع مل گیا۔ اس نے لوہار کو سلام کیا اور مرزا کے گھر آن پہنچا دالان کے در سے چپٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اور انگلیوں پر کچھ حساب لگانے لگا ——

"تین سال ... یعنی چھتیس ۳۶ مہینے .... !" پھر خوش ہو کر بیگم مرزا سے پوچھ بیٹھا ——

"چاچی کیا تین سال میں قرآن ختم ہو جائے گا ——؟"

"کیوں نہیں بیٹا ...... اگر تم محنت سے پڑھو گے تو دو سال میں ہی ...."

اب تو وہ اچھل اچھل کر ناچنے لگا ——

"دو سال میں قرآن مجید ختم؟ بجا ایک سال ... ایک سال میں تو کوئی یا دہرا کر پکا کر لوں گا۔"

سپاہی نے اس کے ہاتھ میں بندھی رسی کو زور سے کھینچا۔

"تیز تیز چل .... یہ اونگھ کیوں رہا ہے؟"

اس کا حلق بالکل خشک ہے، بہت زور کی پیاس لگی ہے۔ دھوپ بہت تیز ہے۔

دھوپ دیوار میں بنی گھڑونچی سے ہو کر منڈیر تک پہنچ گئی ہے۔ علی جان بالٹی میں پانی بھر کر چھت پر چڑھ گیا ہے۔ دن بھر کی تپتی ہوئی چھت، پر جب اس نے چھڑکاؤ کیا تو مٹی سے سوندھی سوندھی خوشبو اٹھنے لگی۔ جب زمین کی تپش کم ہوئی تو اس نے کمرے سے دو چارپائیاں نکال کر بچھا دیں۔ اور وہیں ایک چارپائی پر لیٹ کر ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے لیتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد نیچے اترا اور گھڑونچی سے ایک گھڑا اٹھا لایا اور اس پر پیتل کا کٹورا ڈھک کر چھت پر رکھ دیا۔ چھت کی قد آدم منڈیریں بارش سے ڈھل ڈھل کر بالکل ختم ہو چکی تھیں اور محلے کی تمام چھتیں مل کر ایک میدان سا بن گیا تھا۔ مرزا اور بیگم گرمیوں میں چھت پر سوتے گاؤں میں چوپالیں اور بڑے بڑے میدان ہونے کی وجہ سے چھت پر سونے کا رواج نہیں تھا، اس لئے محلے کی دوسری چھتیں سونی سونی پڑی رہتیں۔ مرزا چھت کی منڈیریں اونچی نہ کرانے کی یہی وجہ بتاتے تھے۔

سورج غروب ہونے کے بعد بیگم پان کی ہنڈیا لے کر چھت پر ہی آ جایا کرتیں۔ محلے کی تمام عورتیں اپنی اپنی چھتوں سے ہو کر بیگم مرزا کے پاس آ بیٹھتیں۔ بیگم ان کی خاطر پان سے کیا کرتیں۔ عورتیں چپڑ چپڑ پان چبا کر دیں پیکوں کے ڈھیر کر دیتیں اور علی جان منڈیر پر چپ چاپ بیٹھا پیکوں کو دیکھ کر کڑھتا رہتا۔ جیسے ہی مرزا دروازے کی کنڈی بجاتے وہ بھاگ کر دروازہ کھول دیتا۔ تمام عورتیں چلی جاتیں۔ مرزا اوپر ہی کھانا کھاتے اور کھانے سے فارغ ہو کر خبریں سنا کرتے۔ علی جان بھی منڈیر پر بیٹھا غور سے

ریڈیو سنتا اور اس طرح سر ہلاتا جیسے وہ سب کچھ سمجھ رہا ہے، اچانک بیگم مرزا کی آواز اسے چونکا دیتی "جاؤ بیٹا بہت رات ہو گئی ہے تمہاری اماں راہ دیکھ رہی ہوں گی۔" اور علی جان بسم اللہ کی چھت سے اتر کر چلا جاتا لیکن صبح مرزا اور بیگم کے اٹھنے سے پہلے ہی بیلے کے پھول باغ سے توڑ کر لے آتا اور ان کے ہار بنا کر سارے گھڑوں کی گردنوں میں پہنا دیتا۔ کچھ پھولوں کے گجرے بنا کر بیگم کے لئے رکھ دیتا۔ بیگم اٹھتیں تو کانوں میں گجرے پہن لیتیں یہ اس کا روز کا معمول تھا۔

——— "تیز تیز چل۔" سپاہی نے پھر علی جان کے ہاتھ میں بندھی رسی کو زور سے کھینچا۔ علی جان جیسے کھنچتا ہی جا رہا ہے۔ اس کی عمر تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اب وہ انیس سال سے اوپر نکل چکا ہے۔ اس کے باپ کا انتقال ہوئے کئی سال گذر چکے ہیں۔ ماں سمجھاتے سمجھاتے گونگی ہوتی جا رہی ہیں۔ "اب تو کہیں جا کر کما نگوڑے۔ اب تو جوان ہو گیا ہے۔ مرزا جی کے پاس بھی اتنا کہاں ہے جو تیرے لئے کچھ کر سکیں۔ تو ہے کہ مٹا کتا پھرے ہے کمانے کے نام پر ڈھیر۔ سے میواتیوں میں شادی بیاہ کا الٹا رواج ہے۔ لڑکے والے کو پیسے دینے پڑے ہیں لڑکی لینے کے لئے۔ تجھ سے دو ہزار کی مانگ ہے۔ میرے پاس کہاں رکھ کر دھری ہے جو گونا کرا لاؤں گی۔ تیرے بابا تو چھوٹے خاں کی لونڈیا کے سنگ لگائی کر کے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مجھے طعنے سننے پڑے ہیں۔ دو دو کوڑی کی لگائیاں کہتی پھریں ہیں کہ لگتا ہے سگائی توڑنی پڑے گی۔ اور تیرے کان پہ جوں تک نہ رینگے ہے ———"

اس کی ماں بڑبڑاتی ہی رہیں اور وہ اٹھ کر چل دیا مگر اب وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ اس کی ماں کی باتیں ہر وقت اس کے پیچھے لگی رہتی ہیں اسے اپنے اندر ایک انجانی سی کھلبلی کا احساس ہوا۔ مریم چھوٹے خاں کی بیٹی مریم ...... دو ہزار روپیوں کی مانگ ———

جب اس کے چھوٹے چچیرے بھائی کی شادی ہوئی تو اسے لگا کہ مریم اس کے دل میں ادھر سے ادھر بار بار کروٹ بدل رہی ہے۔ اس کا دل بیٹھنے لگا ——— مریم ——— شادی ——— دو ہزار روپئے ......۔ اس کی گانٹھ میں تو دو دمڑی بھی نہیں تھیں ——— جاڑوں کی سیاہ رات تھی، وہ گاڑھے کی رضائی میں سر چھپائے سو رہا تھا۔ چچیرے بھائی کے بستر سے پیدا ہونے والی کھسر پسر کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ کان لگا کر میاں بیوی کی باتیں سننے لگا۔ اسے اپنے جسم کے ہر حصے میں ان کی باتیں جذب ہوتی محسوس ہوئیں۔ کھسر پھسر کی آوازیں تیز ہو گئیں۔

مریم ——— ......!

اسے بار بار لگتا کہ مریم دلہن بنی اس کے سامنے کھڑی ہے اور وہ سینہ تانے اس کی طرف بڑھ رہا ہے مگر اچانک ہی اس کے کندھے جھک جاتے جیسے کسی نے دو ہزار روپیوں کی گٹھڑی اس کے کندھوں پر لاد دی ہو۔ وہ پھر کان لگا کر کوٹھری میں گونجتی آوازیں سننے لگتا۔ رضائی کے اندر اس کا دم گھٹنے لگا۔ تو اس نے اپنے منھ سے رضائی ہٹا کر پھینک دی۔ کوٹھری میں سرسوں کے تیل کا دیا جل رہا تھا۔ اس نے گردن اٹھائی اور ٹاٹ کے پھٹے ہوئے پردے سے جھانک کر اپنے چچیرے بھائی کے بستر کی طرف دیکھا اس کی جورو اس سے چپٹی ہوئی لیٹی تھی اور اپنی بھاری بھرکم ران اس کے پیٹ کے اوپر رکھے ہوئے تھی۔ علی جان نے منھ ڈھانپ لیا اور اپنی ہونے والی جورو مریم کا تصور کئے رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ بخدا خدا کر کے جاڑوں کی رت بیت گئی اور اسے کھسر پھسر کی آوازوں سے چھٹکارا مل گیا۔ اب وہ اپنی کھاٹ آنگن میں بچھا کر سوتا۔

آج علی جان کے دل کی طرح موسم میں بھی کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ اندھیری رات اور اس پر بادل کی گرج کے ساتھ بجلی کی چمک۔ علی جان کے جسم میں بھی بجلی چمک رہی ہے ...... اسے اپنے اندر بار بار گرج سی محسوس ہوتی ہے۔ اس کا بدن سلگ رہا ہے، بادل گرج رہے ہیں اور موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ جب علی جان بارش میں بھیگ گیا اور جاڑے سے کپکپانے لگا تو اس نے اپنی کھاٹ چھپر کے نیچے کھینچ لی۔ چھپر میں لٹکی ہوئی لالٹین سے اپنے بدن کو سینکنے لگا لیکن وہ لالٹین اس کے جسم کو گرم نہ کر سکی، اسے تو مریم کی گرمی چاہیے تھی اور مریم کو پانے کے لئے جیب کی گرمی ——— وہ رات بھر چھپر کی ٹھنکیا سے لگا کانپتا رہا۔ اور چھپر کے پھٹنے کی دعا مانگتا رہا۔

اس کے سر سے سہرے کی لڑیاں ٹوٹ کر زمین میں گر پڑی تھیں۔ اس کے چاروں طرف بہت سے لوگ جمع تھے جو سپاہی کو گھیرے کھڑے تھے اور اس سے کچھ پوچھ رہے تھے۔ اس نے دیکھا لوگ جوتوں سے بیلے کے پھول مسلتے ہوئے گزر رہے ہیں۔

بیلے کے پھول...... ! وہ حسب معمول بیلے کے پھولوں کے گجروں کی گرد نوں میں پہنا چکا تھا۔ مرزا ناشتے کے بعد باہر جانے ہی والے تھے کہ کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی۔ علی جان بھاگ کر دروازے پر پہنچا اور کواڑیں کھول دیں۔

"کون...... ؟ نتھو چاچا آم لے کر آئے ہیں ؟"

نتھو رام نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"مرزا جی گھر میں ہیں ؟ باغ کے پیسے دینے ہیں۔"

مرزا مجید نے آواز دی — "کون ہے علی جان اندر بلا لو۔"

نتھو رام اندر آ گئے اور مرزا کے ہاتھ میں سو سو کے بیس نوٹ تھما کر بولے۔

"لو مرزا جی دو ہزار ہیں۔ ایک ہزار پیشگی آ گئے تھے جو سب باقی —"

نتھو رام اٹھ کر چلے گئے — مرزا مجید کے ہاتھ میں دو ہزار روپوں کی گڈی ہے۔ علی جان کو لگا کہ مرزا مجید کے پیچھے کہیں مریم بھی کھڑی ہے۔ وہ بار بار مرزا مجید کی طرف اچٹتی سی نظر ڈالتا مگر اس کی نظر بری طرح کانپنے لگتی۔ مرزا مجید بیگم کو گڈی تھما کر باہر چلے گئے بیگم نے نوٹ گنے اور اپنے ازار بند سے چابی کا گچھا کھول کر علی جان کو دیتے ہوئے کہا۔

"لو بیٹے یہ چابی لو اور روپئے تحویل میں رکھ دو۔ سنبھال کر رکھنا پورے سال کا خرچہ ہے۔"

علی جان نے نوٹوں کی گڈی کو اپنی مٹھی کی مضبوط گرفت میں جکڑ لیا — چابی کا گچھا لے کر تحویل کی طرف بھاری بھاری قدموں کو ڈھکیلتا ہوا بڑھا لیکن اس کے قدم مرزا کے گھر کی دیواروں کو پھلانگ جانا چاہتے تھے۔ اس نے تحویل کے تالے میں بڑی سی چابی گھمائی لیکن چابی تالے میں نہیں اس کے ذہن میں گھوم رہی تھی اور اس کے ذہن کی وہ خاندانی کواڑیں کھل گئیں جو پیدائش سے اب تک بند تھیں۔ وہ اپنے ذہن پر جمی ہوئی اس میل کی پرت کو کھرچ کر پھینک دینا چاہتا تھا جسے اب تک وہ ایمانداری اور وفاداری کا مقدس دوشالہ سمجھتا آیا ہے۔ تحویل کے دونوں پٹ کھل گئے، وہ بھی اس کی جیب کی طرح خالی تھی۔ وہ نوٹوں کی گڈی کو تحویل میں رکھتے رکھتے رک گیا۔ اب اسے چھوٹے خاں کی پھیلی ہوئی جھولی نظر آ رہی تھی...... وہ جھولی جو اس سے نوٹوں کی شکل میں اس کی وفاداری اور ایمانداری کے خون کی بھیک مانگ رہی ہے۔

چھوٹے خاں کی بہو کے طعنے، اس کی بوڑھی ماں کی عزت، چچیرے بھائی کی جورو کی بھاری بھرکم ران......

"کیا وہ نوٹوں کی گڈی چھوٹے خاں کی جھولی میں ڈال دے؟"

اس نے جلدی سے گڈی کو اپنے تہہ بند میں اڑس لیا۔

"لو بیٹے یہ لو...... سنبھال کے رکھنا پورے سال کا خرچہ ہے۔"

اسے لگا کہ تہہ بند کی گانٹھ ہولے ہولے کھلتی جا رہی ہے۔

"ہے بیٹے...... میں نے تیرے لئے کرتا سیا ہے — اور وہ باہر چھینکے پر کھیر رکھی ہے اپنی اماں کے لئے لیتے جانا۔"

اچانک اس کی تہہ بند کی گانٹھ کھل گئی اور گڈی فرش پر گر پڑی۔ گڈی کی ہلکی مگر خوفناک آواز نے اس کے جسم میں لرزا پیدا کر دیا۔ اس نے جھک کر گڈی اٹھائی اور اپنے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کمرے کی دیوار پر لگی مرزا کی تصویر اسے گھور رہی تھی وہ اس تصویر سے آنکھیں نہ ملا سکا اور سہم گیا۔

وہ نوٹوں کی گڈی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر غور سے دیکھنے لگا۔ اسے اپنے ہاتھ کالے نظر آنے لگتے تو اس کی نگاہیں تحویل کی جانب اٹھتیں مگر جب مریم کے ہاتھ پیلے نظر آتے تو اسے تہہ بند کی گانٹھ ہی دکھائی دیتی۔ کبھی پیلے اور کبھی کالے ہاتھوں کو دیکھتے دیکھتے اس نے پھر ایک بار مرزا کی تصویر کو دیکھا مگر اسے اب ان کی آنکھوں میں اپنے مرحوم باپ کی تصویر نظر آ گئی جو اس کی ہمت افزائی کر رہی تھی۔ علی جان نے ہمت کی اور اپنے تہہ بند میں نوٹوں کو رکھ کر مضبوطی سے گانٹھ باندھ لی اور چابی کا گچھا بیگم کو واپس کر کے چلا گیا۔ دوسرے دن مرزا نے پوچھا — "بیگم آج علی جان نہیں آیا...... کیا بات ہے؟" بیگم نے کہا۔ "آیا تھا، کچھ طبیعت خراب تھی، اس لئے چلا گیا۔"

کئی روز تک علی جان نہیں آیا۔ بیگم مرزا پریشان ہونے لگیں —

"کہیں طبیعت زیادہ خراب تو نہیں ہو گئی۔؟"

وہ بسم اللہ کی چھت سے اتر کر علی جان کو دیکھنے گئیں۔ انھوں نے دیکھا کہ علی جان کے گھر میں کچھ لوگ جمع ہیں اور وہ دولہا بنا ہوا ہے۔ انھیں ایک انجان سی خوشی کا احساس ہوا — "مگر مجھے مدعو کیوں نہیں کیا گیا...... ؟ مجھے اطلاع تک نہیں اور یہاں...

آخر علی جان پر میرا بھی تو کوئی حق ہے۔"

انھیں لگا کہ ان کے سامنے چھوٹے چھوٹے بہت سے سانپ رینگ رہے ہیں۔ "مگر میواتیوں کے رواج کے مطابق۔۔ شادی کے لیے لڑکے والوں کو ایک رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ راتوں رات علی جان کے ہاتھ یہ رقم کہاں سے لگ گئی؟"

اب ان کی آنکھوں کے سامنے بہت موٹا سا اژدہا پھن پھیلائے کھڑا تھا۔ پھر انھیں یاد آیا کہ انھوں نے کچھ دن پہلے دو ہزار روپئے علی جان کو تحویل میں رکھنے کے لئے دیئے تھے۔ کہیں وہی تو نہیں۔۔۔۔۔؟

"نہیں۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔۔ میں اسے بچپن سے جانتی ہوں اس نے کبھی گھر کی ایک کیل بھی ادھر سے ادھر نہیں کی۔ سر میں تو زیور، روپیہ پیسہ سب اسی سے رکھواتی تھی۔"

بیگم مرزا یہ سوچ ہی رہی تھیں کہ علی جان کی نظر بھیڑ کو چیرتی ہوئی ان پر پڑی اور وہ چونک کر رہ گیا۔ اس نے سر پر بندھے سہرے سے اپنا منھ ڈھک لیا۔ اس کے منھ پر تو پردہ پڑ گیا مگر بیگم مرزا کی آنکھوں پر پڑا ہوا پردہ آہستہ آہستہ سرکنے لگا۔ انھیں محسوس ہوا کہ آج وہ پھول جو علی جان برسوں سے ان کے گھڑوں کی گردنوں میں پہناتا چلا آیا ہے سمٹ کر اس کے سہرے کی لڑیوں میں آ گئے ہیں۔ وہ الٹے پاؤں گھر آئیں اور لگیں تحویل کھکھوڑنے۔ تحویل خالی تھی۔۔۔ ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی اور چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اتنے میں مرزا جی بھی آ پہنچے۔ "کیا بات ہے بیگم، تم پریشان کیوں ہو۔۔۔؟"

بیگم نے تحویل بند کی اور کہا۔ "کچھ بھی تو نہیں۔۔۔۔۔" مگر مرزا نے تحویل کو کھول کر دیکھا، وہ خالی تھی۔۔۔۔

سپاہی نے گاؤں کے لوگوں کو دھتکارا۔۔۔۔۔۔ "بھیڑ کیوں لگا رکھی ہے چلو اپنا کام کرو۔۔۔" اور علی جان کو دھکے مار مار کر لے جانے لگا۔ علی جان کی ماں پچھاڑیں کھاتی ہوئی آئیں اور بلک بلک کر رونے لگیں۔ "میرے لال۔۔۔ میرے بچے۔۔۔ ارے میرے لال کو کہاں لے جا رہے ہو۔۔۔ اس نے کیا کیا ہے۔۔۔؟"

سپاہی نے تڑختے ہوئے کہا۔ "کیا کیا ہے۔۔۔؟ یہ تو تب پتا چلے گا جب تین سال جیل میں چکی پیسے گا۔۔۔۔۔ پورے تین سال۔۔۔"

جب علی جان گلی میں مرزا مجید کے گھر کے سامنے سے گزرا تو بیگم مرزا کواڑ کی آڑ میں کھڑی جھانک رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ علی جان رک گیا اور انگلیوں پر کچھ حساب لگانے لگا۔ "تین سال۔۔۔۔ یعنی چھتیس مہینے۔"

بیگم مرزا نے نفرت سے منھ سکوڑا اور دھڑ سے دروازہ بند کر لیا۔ ●●

ابن فرید

تجزیہ

یہ کہانی بیانیہ ہوتے ہوئے بھی ارتسامی تکنیک پر لکھی گئی ہے اس کی ابتدا انجام سے شروع ہوتی ہے۔ علی جان، جس کی شادی کا واقعہ افسانہ کے اختتام پر پیش کیا گیا ہے، وہ آغاز میں سہرا باندھے اور ہتھکڑیاں پہنے نمودار ہوتا ہے۔ افسانہ کا پورا پلاٹ نکاح کے وقت سے لے کر مرزا مجید کے گھر کے سامنے پہنچنے تک پر محیط ہے۔ صرف اتنا فاصلہ جو دو ہمسایہ کے مکانوں کے درمیان ہوتا ہے۔ طارق چھتاری نے اس مختصر ترین فاصلہ کو ارتسامات خیال (ASSOCIATIONS OF IDEAS) اور بازآفرینیوں (REMINISCENCES) کے ذریعہ اتنا وسیع کر دیا ہے کہ اس میں علی جان کے بچپن سے لیکر جوانی تک کہانی آگئی ہے۔

اس تکنیک کی سب سے بڑی نزاکت یہ ہوتی ہے کہ ایک خیال یا واقعہ سے اگلے خیال یا واقعہ کی طرف قاری کے ذہن کی منتقلی بالکل فطری انداز میں ہو، اور کہانی میں اس کی دلچسپی نہ صرف یہ کہ قائم رہے بلکہ اس میں اضافہ اور تجسس میں مزید شدت پیدا ہو۔ اس کے برخلاف، اگر یہ گریز شعوری ہو اور دو متصل بیانات میں فاصلہ زیادہ بڑھ جائے تو قاری کے ذہن کو دھچکا سا لگتا ہے، اور کہانی بکھر جاتی ہے۔ طارق نے اس نزاکت کو خوبی کے ساتھ ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ مختلف واقعات، جو کبھی ماضی سے متعلق ہوتے ہیں اور کبھی حال سے، اس طرح ایک دوسرے سے مرتسم ہوتے رہتے ہیں کہ افسانہ میں کسی نوعیت کا غیر فطری ارتقاء نہیں ہونے پاتا۔ دلیل کے طور پر میں صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

"جب اس نے دیکھا کہ مرزا مجید اپنے گاؤں کے پردھان، دارو غہ جی اور کچھ سپاہیوں کو لے کر اس کے گھر میں داخل ہو رہے ہیں تو وہ کانپ اٹھا۔ "مرزا جی ......مرزا جی... میرا لال، علی جان،.... میرا بچہ ...." اس کی ماں کی چیخ اس کے کانوں میں دیر تک گونجتی رہی اور پھر اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔

منھ پر پانی کی چھینٹیں پڑتے ہی اس نے آنکھیں پھڑپھڑائیں اور گردن گھما کر دیکھنے لگا۔ بیگم مرزا سرہانے بیٹھی پنکھا جھل رہی تھیں۔ مرزا مجید اس کے اوپر جھکے کھڑے تھے اور کہہ رہے تھے۔

"بیٹے آنکھیں کھولو...... شاباش ــ"

پھر اس کی کلائی پکڑ کر بخار دیکھنے لگے۔"

کس قدر تیز رفتاری کے ساتھ اور غیر محسوس طور پر حادثات اپنا

تجزیہ نئی نسل کا مستقل فیچر ہوگا۔ ہر شمارہ میں جو کہانی مجھے اپنی کسی خصوصیت کی بنا پر متوجہ کرے گی میں اس کا تجزیہ پیش کروں گا۔ اس کے لئے یہ ضروری نہیں وہ اس شمارہ کی سب سے اچھی کہانی ہو۔ (ابن فرید)

منظر بدلتے جا رہے ہیں، اور خیالات کی روان کا ساتھ دیتی جا رہی ہے۔ اس کا اندازہ اس تجسس سے کیا جا سکتا ہے جو "یہ کیوں ہوا اور کیسے ہوا؟" کا اضطراب قاری میں پیدا کر دیتا ہے۔

علی جان ایک ناپختہ ذہن ہے جو مختلف سانچوں میں ڈھل جانے کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ وہ قرآن پڑھے یا جاہل رہے۔ وہ زندگی کے صالح رخ کو اختیار کرے یا گمراہی، بدکاری اور بہیمیت کے تحت الثریٰ میں گر جائے۔ یہ اس کا ڈائلیما (DILEMMA) ہے، دوہری مشکل ہے۔

بنیادی طور پر وہ صالح فطرت ہے۔ اسے دیانت داری، راست بازی، دین داری سے عشق ہے، جس کا اظہار بیگم مرزا سے والہانہ تعلق کے ذریعہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے باپ کی جاہلانہ گمراہی یا بہادری سے متاثر ہو جاتا ہے۔ باپ اسے اس راستہ پر لگانا چاہتا ہے لیکن وہ احتجاج کرتا ہے، یہاں تک کہ جب باپ ایک بار گرفتار ہوتا ہے تو وہ اسے اپنے لئے خوش قسمتی سمجھتا ہے کہ یہ عرصہ نہ صرف قرآن ختم کر لینے کے لئے کافی ہوگا بلکہ اس اسے کئی بار دوہرا کر یاد بھی کر لیا جائےگا۔

طارق نے بغیر اپنے کرداروں کے عمل میں مداخلت کئے یہ ثابت کر دیا ہے کہ رسول خان جس ضلالت کو میواتیوں کی شان قرار دیتا ہے وہ ان کی فطرت نہیں ہے کیوں کہ علی جان کی فطرت اسے قبول نہیں کرتی۔

پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ علی جان نے وہی راستہ کیوں اختیار کیا جو اس کے باپ کا راستہ تھا؟

علی جان پختہ عمر کو پہنچ چکا ہے، لیکن اس کے جائز جذباتی تقاضوں کی تکمیل کی راہ میں رواجی پابندیاں، بھیانک محرومی بن کر حائل ہو جاتی ہیں۔ یہاں انسانی فطرت کے فطری بہاؤ میں غیر فطری رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔

علی جان اپنے چچا زاد بھائی کی کوٹھری میں 'ازدواج کے لمحات خلوت میں' جھانک کر دیکھتا ہے۔ فطرت کے معمول کے بہاؤ کو روکنے والا یہ پتھر دھارے کو دوسری طرف موڑ دیتا ہے۔ جو یقیناً اس کا سیدھا راستہ نہیں ہے۔ ابراہیم اور مریم کی تنہائی میں خلل اندازی اس کی پہلی چوری تھی جس نے اس کے جذبات کو غیر معمولی طور پر برانگیختہ کر دیا۔ اس جلتی پر "گونے" کے لئے دو ہزار کی رقم کا مطالبہ

تین ہزار [illegible] ہے۔ اور وہ بیگم مرزا مجید کے اعتماد کو ٹھیس لگا کر دو ہزار کی رقم چوری کر لیتا ہے۔ یہ دوسری چوری وہ اپنے باپ کی دی ہوئی "تعلیم" کے مطابق نہیں کرتا ہے۔ بلکہ اس کے لئے ابراہیم اور مریم کا قرب غلط کاری کے مہیج کو مہمیز کرتا ہے۔ پھر وہ ماحول جو اس کے باپ نے اسے فراہم کیا ہے وہ اس صالحیت کو پارہ پارہ کر دیتا ہے جو بیگم مرزا کی تربیت نے اسے فراہم کیا تھا۔

علی، ان اپنی فطرت صالح کی شکست کے بعد پستی کی اس انتہا تک گرتا ہے کہ تین سالوں کے چھتیس مہینوں کی وہ گنتی جو اس نے اپنی انگلیوں پر قرآن ختم کرنے کے لئے شمار کی تھی، وہی گنتی اسی طرح وہ اپنے جرم کے لئے شمار کرتا ہے۔ اس کا یہ عمل اس قدر کریہہ ہے کہ:

بیگم مرزا نے نفرت سے منہ سکوڑا اور دھڑ سے
دروازہ بند کر لیا۔!!

کہانی کا یہ انجام موثر فنکارانہ برتاؤ ہے۔ اس کے ذریعہ کہانی صرف چوری کی واردات تک محدود نہیں رہتی ہے بلکہ ایک ہی عمل کو جو کبھی تعمیر کے لئے کیا گیا تھا، اسے تخریب اور بدکاری کے لئے استعمال کرنے کے خلاف ردِ عمل کو نمایاں کرنے کی طرف بھی موڑ دیتی ہے۔

آخر میں طارق سے ایک بات مشورۃً بھی کہنا چاہتا ہوں۔ نقطوں اور لکیروں کا فراوانی کے ساتھ پچاس پچپن سال پہلے "ادبِ لطیف" میں استعمال ہوتا تھا۔ یہ اسلوب تحریر فرسودہ ہو چکا۔ اسے دوبارہ زندہ کرنے سے کہانی میں کوئی حسن پیدا نہیں ہوتا۔ امکانی حد تک اسے ترک کر دیجئے تو زیادہ اچھا ہو۔ ●●

بقیہ: نئی مطبوعات

ناولٹ گمشدہ ستارے ہے۔ نوائے فرنگ انگریزی کی مشہور نظموں کا اردو ترجمہ ہے جسے نصیر واحدی نے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ اس شمارہ میں ابو یوسف کا ترجمہ "آدمی نصیبوں والا ہے" جو برنارڈ شا کے ڈرامہ کا اردو عکس ہے۔

اس شمارہ میں اٹھارہ نظمیں، غزلیں اور تقریباً ۲۰ کہانیاں، افسانچے، اور احمد ہمیش کے دو سفرنامے بھی شامل ہیں۔

ظاہری اور معنوی دونوں لحاظ سے نخاہیم کا ۱۹۸۰ ادب نمبر ایک قابل قدر کوشش ہے جس کی پذیرائی ہونی چاہئے۔

انجم نعیم

احمد جاوید
(اسلام آباد)

ـــــ اور پھر خودکشی

[احمد جاوید پاکستان کے ابھرتے ہوئے نوجوان افسانہ نگار ہیں۔ اس افسانے میں کچھ ادارتی دست درازی سے کام لیا گیا ہے امید ہے کہ وہ اسے گوارا کر لیں گے ـــــ ابن فرید]

وہ خود ویسے کا ویسا ہی تھا جیسا اسے بنایا گیا تھا اور باقی ہر شے بدل رہی تھی۔
وہ اپنے بارے میں سوچتا ـــ
یا ایسا کرے یا ویسا۔
ایسا ہو کہ مجھے کچھ سنائی نہ دے، دکھائی نہ دے، بھوک لگے نہ پیاس، کسی کو روتا دیکھوں نہ ہنستا ـ نہ غصہ آئے نہ رنج ہو ـ نہ جھلاؤں جھنجھلاؤں ـــ ہاں ایسا ہو جائے کہ جیسے پہاڑ یا سمندر، جیسے تنکا یا سڑک یا کلنڈر پر چھپی ہوئی تصویر ـــ
ہاں ایسا ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ـ کچھ بھی ہو جائے کوئی فرق نہیں پڑتا ـ میرے لئے کوئی فرق نہیں نہ سنائی دے نہ بھوک لگے نہ پیاس! ـــــ مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔
وہ ایسا نہ بن سکا ـ بہت دن ایسا نہ ہو سکا اور ویسا ہی رہا جیسے کہ ہم آپ ہیں ـــ بس جھلایا ہوا جھنجھلایا ہوا۔
اس کے آنکھیں بھی تھیں جیسے ہمارے آپ کی ہیں ـ سو اسے دیکھنا پڑتا تھا ہر اس منظر کو جیسے ہم آپ دیکھتے ہیں یا ہیں (ہر چند کہ دیکھنا نہیں چاہتے)
کان بھی تھے جو سنتے تھے ـ جو سننے پر مجبور تھے ـ تقریریں نعرے، گالیاں، کوسنے، چیخیں، کراہیں ـــ
ـــ اور پیٹ بھی جیسے عمر و عیار کی زنبیل ـ بھرتا ہی نہیں۔
ـــ اور پاؤں بھی کہ جنھیں جوتیاں چٹخانی پڑتی تھیں صبح و شام

ـــ تو صبح و شام ـــــ
گھر سے دفتروں کے چکر کاٹتے کاٹتے اور انکار میں بھینگی مسکراہٹیں سمیٹتے سمیٹتے اسے بہت کچھ دیکھنا پڑتا۔
سڑکیں، بسیں، موٹریں، شوروم، مکان، آسمان، جنگل پہاڑ، سمندر ـــــ اور ان کے درمیان ـ
سانپ، بچھو، کتے، بھیڑیئے، مچھر، چیونٹیاں اور وہ خود ـــ
وہ خود اور اس جیسے سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں۔
تو وہ کروڑوں جیسا کیوں بنایا گیا ہے ـ بنایا ہی جانا تھا تو مچھر، سانپ، بچھو یا کتا ہی بنا دیا گیا ہوتا کہ جس سے کچھ فرق تو پڑتا ہے مگر بہت زیادہ نہیں! ـــ جو دیکھتے ہیں، سنتے ہیں مگر کڑھتے نہیں ـــ جن کی بیویوں کے کوسنے ان کے معدے میں السر نہیں بناتے ـ جن کے بچوں کی بھوک انھیں ٹی بی میں مبتلا نہیں کرتی۔
تو اس سے فرق پڑتا تھا ـــ بہت پڑتا تھا ـ کہ اس کے اندر گدھ بیٹھے تھے جو اسے لہولہان کرتے رہتے تھے ـ تو جب اسے تکلیف ہوتی تو وہ چیختا بھی تھا ـ کراہتا بھی تھا ـ شور بھی مچاتا تھا ـ
تو تب وہ اپنے لئے سوچتا ـــ
مجھے ایسا کر دے کہ جیسے درخت ـ جس پر پھل آئے نہ آئے، کوئی سائے میں بیٹھے نہ بیٹھے ـــ کوئی کاٹے یا آگ میں جھونکے ـــ اسے کچھ خبر نہیں ہوتی۔
اسے کچھ پتہ نہیں چلتا۔

یا سڑک کردے — کہ کوئی اپنے قدموں سے روندتا پھرے — اور ٹریفک دندناتی گذرے — مگر مجھے کچھ علم نہ ہو — کچھ خبر نہ ہو — کچھ کردے — مگر ایسا کردے — کہ میں بے خبر ہو جاؤں ہر شے سے بے گانہ ہو جاؤں — بے نیاز ہو جاؤں۔

تو جب وہ یہ سوچتا تو اسے محسوس ہوتا کہ جیسے کوئی اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور اس پہ ہنستا ہے، اس کی سوچوں پہ مسکراتا ہے — تو وہ جھلا جاتا، جھنجھلا جاتا —

تو جب وہ جھنجھلایا ہوا گھر میں داخل ہوتا — تو گھر میں اسے اس کی بیوی اس سے بھی زیادہ جھنجھلائی ہوئی ملتی — تو تب اسے معلوم ہوتا کہ ایسا اس کے اختیار میں نہیں ہے جیسا وہ ہو جانا چاہتا ہے — تو پھر وہ ویسا بننے کی کوشش کرنے لگتا جیسے ہم آپ ہیں۔

مگر اس کے پاس پاؤں تھے جو جوتیاں چٹخاتے تھے۔
اور پیٹ تھا جس میں گڈھ بیٹھے تھے۔
اور بیوی تھی جسے آٹے دال کی حاجت رہتی تھی۔
اور بچہ تھا جسے دودھ پینے کی لت پڑی تھی۔
اور جواب میں اس کے پاس —
اس کے پاس دفتروں میں بیٹھی ہوئی نو ویکنسی (NO VAC-ANCY) کی بھینگی مسکراہٹیں، جو نہ پاؤں میں پہنی جا سکتی تھیں، نہ پیٹ پہ باندھی جا سکتی تھیں اور نہ حلق میں انڈیلی جا سکتی تھیں۔

تو ایسا نہیں ہو سکتا تھا جیسا وہ چاہتا تھا کہ بن جائے — تو تب ایک روز اس نے نہایت دکھ سے سوچا کہ نہ سہی وہ تو ویسا ہی رہے کہ جیسا ہے مگر کاش اس کی بیوی اور بچہ ہی ویسے ہو جائیں جیسے تنکا، جیسے سمندر، جیسے درخت، جیسے سڑک — کہ جنھیں نہ بھوک لگتی ہے نہ پیاس —

گر وہ پھر خود ہی ہنسا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟
لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ ہر لحہ بدلتی اس دنیا میں ہوتا وہی ہے کہ جس کا گمان بھی نہ ہو —

تو یوں ہوا — کہ اس روز جب وہ گھر میں داخل ہوا تو بیوی اس کے قریب آئی جیسا کہ وہ روز آتی تھی اور حسب معمول کوسنے دینے لگی جیسا کہ وہ روز سنتا تھا — تو وہ حیران ہوا کہ اچانک اس کی بیوی کی آواز ڈوبنے لگی — وہ جو کوسنوں اور جلی کٹی باتوں سے لبریز آواز تھی — ڈوبتی گئی — ملی دبتی گئی — ہر چند کہ اس کے ماتھے پر شکنیں بھی سجی تھیں — ہاتھ بھی زور شور سے ہلتے تھے اور لب بھی — مگر آواز نہ آتی تھی —

تو تب اس نے اپنے بچے کی طرف بھی دیکھا کہ جو صحن میں ایک پلنگڑی پر پڑا ہاتھ پاؤں مارتا تھا، گویا دودھ کے لئے مچل رہا تھا، مگر اس کے لبوں سے چیخنے اور چلانے کی آوازیں باہر نہیں آ رہی تھیں — پہلے تو اس نے انھیں حیرت سے دیکھا پھر آپ ہی آپ ہنس پڑا کہ شاید وہ دونوں ویسے ہی ہو گئے تھے جیسا اس نے ان کے لئے سوچا تھا مگر پھر خود کو دیکھا تو پریشان ہوا کہ وہ خود تو ویسے کا ویسا ہی تھا جیسا اسے بنایا گیا تھا — مگر وہ زیادہ دیر پریشان نہ رہا کہ یہ اطمینان بھی بہت تھا کہ بارے اس کی کچھ تو سنی گئی — وہ اپنے بیوی اور بچے کو دیکھتا تو خوب ہنستا کہ جو بہت دیر سے کچھ کہہ رہے تھے، غوغا کر رہے تھے، مگر لاعلم تھے کہ ان کی آوازیں تو ہیں ہی نہیں پھر کوئی سنے گا کیا؟

تب وہ ہنستا، قہقہے لگاتا، گلی گلی سڑک سڑک گھومنے لگا اور جھومنے لگا کہ باہر کا منظر بھی گھر سے جدا نہ تھا کہ لوگ حرکت میں تو تھے مگر ان کے لب آواز سے عاری تھے — کہیں چیخ پکار نہ تھی، آہ و بکا نہ تھی — ہر طرف چپ تھی، ہو کا عالم تھا — بس ایک وہ تھا اور اس کے قہقہے جو سناٹے میں گونج رہے تھے — اور لوگوں کا ہجوم، جو اسے حیرت سے دیکھتا چپ چاپ گذرتا چلا جا رہا تھا —

— وہ نہال ہو گیا کہ اب اس کے اعصاب پر سکون تھے، مگر یہ سکون بھی زیادہ دیر نہ رہا کہ جب غور کیا تو کھلا کہ عالم تو وہی ہے، مناظر وہی ہیں — بس ایک آواز ہی تو ہے جو کہیں سے نہیں آتی۔

تو کچھ ایسا تھا کہ لوگوں کے چہرے اب بھی کھلی کتاب کی طرح سامنے تھے — ماتھے کی شکنیں وہی — بھینگی مسکراہٹیں وہی — کہ جو ہماری آپ کی طرح اب بھی اسے دیکھنے پڑ رہی تھیں — تو وہ مایوس ہوا اور اس کا سارا مزا کرکرا ہو گیا۔

تو وہ گھر لوٹ آیا کہ اب وہ کچھ زیادہ مطمئن بھی نہ تھا — گھر میں داخل ہوا تو اس سے اپنا گھر دیکھا نہ گیا — اس کی بیوی اور بچہ اب بھی مچل رہے تھے اور بلک رہے تھے — تو اک کرب کا عالم تھا کہ ان کے لفظ آواز سے عاری تھے — یوں جیسے کسی نے ان کا گلا دبا رکھا ہو — اس کے اندر اب بھی کوئی چیخ چیخیں مار رہا تھا اور لہولہان کر رہا تھا —

وہ اتنا لہولہان ہوا کہ اس رات خون تھوکتے تھوکتے بے یقینی کی نیند سو گیا۔

سوتے میں خواب دیکھنا اس کی ایسی ہی مجبوری تھی جیسے بیماری آپ کی! — تو خواب میں اس نے خود کو درخت کی شکل میں دیکھا کہ جس پر پرندے چین کی نیند سو رہے تھے — سائے تلے مسافروں کا بسیرا تھا۔

اس نے خود کو دریا پایا کہ جس کے اندر چھوٹی چھوٹی مچھلیاں ادھر اُدھر دُمیں لہرائیں، ایک دوسرے سے چہلیں کرتی پھر رہی تھیں اور اور کنارے پہ چرند پرند اور تھکے ہارے پیاسے انسان اپنے لبوں کو تر کرتے جاتے تھے اور خدا کا شکر بجا لاتے تھے — اور پھر وہ سڑک بھی بن گیا جو لوگوں کو تیزی سے اپنی منزلوں کی جانب سفر طے کرا رہی تھی — تب اس نے اپنی بیوی اور بچے کو بھی دیکھا کہ جو ایک خوبصورت تصویر بنے دیوار پر آویزاں تھے —

وہ نہ جانے اور کیا کیا دیکھتا کہ صبح ہو گئی — اور اسے جاگنا پڑا کہ روز صبح ہوتی تھی اور روز اسے جاگنا پڑتا تھا۔

تو جب وہ جاگا تو حیران ہوا کہ آج خواب اور تعبیر میں کوئی فاصلہ نہ تھا۔ اس کی حیرت بجا تھی — کہ آج گھر میں نہ بیوی تھی، نہ بلکتا ہوا بچہ تھا اور نہ دیوار پر وہ کلنڈر تھا کہ جس پر اسکی بیوی کی تصویر چھپی تھی کہ جس کی گود میں بچہ تھا کہ منہ جس کا کھلا تھا اور چہرے پہ کرب کہ جیسے کچھ مانگتا ہو مگر اس نے سوچا کہ یہ تو تصویر ہے اور تصویر کو کسی شے کی کیا حاجت — اس بات نے اس کے اندر گدگدی کی اور وہ ہنستا، رقص کرتا گھر سے باہر چل دیا۔ باہر نکل کر وہ کچھ اور مسرور ہوا۔

— کہ آج گلیاں، مکان، سڑکیں سب ویران تھے اور جگہ جگہ اخباروں، کلنڈروں، کاغذوں کے جھکڑ چل رہے تھے کہ جن پر تصویریں چھپی تھیں جلسہ گاہ میں لیڈر نہ تھا — تصویر تھی — بہت بڑی تصویر اور اسکے ساتھ نیچے ایک ہجوم — مکھیوں اور مچھروں کے برابر جن کے سر — مگر محض تصویر — وہاں کہیں بھی کچھ نہ تھا مگر کلنڈر، تصویریں، بسیں کہ جن میں انسان نہیں تاریخیں ٹھنسی ہوئی تھیں — سب مہینے کی آخری تاریخیں — اور ڈپوؤں کے سامنے چیونٹیوں کی قطار تھی اور اندر کلنڈر پر چھپی ہوئی آٹے کی بوریوں کی تصویریں —

— مگر وہ کچھ دیر ہی خوش پھرا، پھر رنجیدہ ہوا کہ وہ بہت جلد رنجیدہ ہو جانے والوں میں سے تھا کہ سب کچھ تو بدل گیا — ویسا ہو گیا جیسا اس نے اپنے بارے میں سوچا تھا — مگر وہ خود ویسے کا ویسا ہی رہا۔

پھر خیال کیا ہو سکتا ہے — وہ — وہ نہ ہو [illegible] درخت ہو، سمندر ہو، تنکا ہو، کلنڈر پر چھپی ہوئی تصویر [illegible] ہو اور اسے علم نہ ہو —

تو اس نے یہ جاننے کے لئے کہ وہ کیا ہے خود کو درخت کی طرح پھیلا دیا مگر شہر تو ویران تھا کون اس کے سائے تلے بیٹھتا۔ پھر اس نے دریا بننا چاہا — مگر بنتے بنتے رک گیا کہ اس کی نظر قریب آتی ایک بس پر پڑی کہ جس میں تاریخیں ٹھنسی تھیں — سب مہینے کی آخری تاریخیں — تو اس نے قہقہہ لگایا اور سڑک سے ایک اور سڑک بغل گیر [illegible] کی طرف بہر حال بڑھتا تھا۔

پھر وہ حیرت جاگی جو بے یقینی کی ابدی نیند سوتا ہوئی ادھ کھلی آنکھوں میں سے جھانک رہی تھی، لیکن آتے جاتوں کو نظر نہیں آتی تھی — وہ حیرت ان آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کہ وہ آوازیں جو سنائی نہیں دے رہی تھیں انھوں نے الفاظ کے پیکر اختیار کر لئے تھے، اور وہ صدائیں جو بے آواز تھیں ان میں معنی پیدا ہو گئے تھے — وہ تصویریں جو کلنڈروں سے اتر کر بسوں میں جامد تاریخوں کا لوٹتا ہوا آخری سرا بن گئی تھیں، ان میں کروٹ لینے اور اپنی گردنیں اٹھا کر آگے دیکھنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے — اور بس کے ونڈ اسکرین (WIND SCREEN) کے شیشے شفاف ہو گئے ہیں — اور انسانوں کو کلنڈر کی مردہ تاریخوں میں تبدیل کرنے والے مفلس اپنے قدموں پر سے اکھڑ رہے ہیں — کہ ایک نہ ایک دن ایسا ہی ہونا تھا اور یہی ان کا مقدر تھا۔ ○○

نجمہ شہریار
فیصل ولا
سرسید نگر، علی گڑھ

مشک کی خوشبو

فضاؤں میں مشک کی مہک بسی ہوئی تھی ۔ دور تک پھیلے ہوئے سبزہ زار میں کسی کا پتہ نشان نہ تھا ۔
ایک سادھو کا ادھر سے گزر ہوا ۔ اس مہک نے اس کو بے خود سا کر دیا کتنی ہی دیر تک وہ بے حس و حرکت کھڑا اسے خود میں جذب کرتا رہا !
اس کی روح سرشار ہوتی رہی ....
اسی طرف سے کچھ لوگ گزرے اور سادھو کی کیفیت دیکھ کر وہیں ٹھٹھک گئے ۔ ان میں سے ایک بولا ۔
"یہ ناگوار سی مہک کہاں سے آ رہی ہے ؟ (کیسی ہے؟)"
"یہ مشک کی خوشبو ہے ...." سادھو دکھ سے بولا ــــ "ناگوار لگ رہی ہے تمہیں ؟"
"اُف .... اتنی بدبو ہے کہ ناک نہیں دی جا رہی ہے" ان میں سے دوسرے نے کہا ۔
"تو پھر یہ کہنا بیکار رہی ہوا کہ مشک اپنی مہک خود دیتا ہے ۔ یہ تو سونگھنے والے پر ہے بچے کہ وہ اس سے بے خود ہوتا ہے یا نہیں"...
سادھو نے رنجیدگی سے کہا ۔
"واقعی یہ بو ناقابل برداشت ہے" ان میں سے کوئی اور بولا ۔ اور تیزی سے قدم بڑھا لئے ۔
سادھو نے ہمدردی کی نظر سے ان سب کی طرف دیکھا ...... اور بہت نرمی سے کہا .... "تم سب جان رہے ہو کہ یہ مہک مشک کی ہے ۔ تم کو یہ بے حد پسند بھی آ رہی ہے ۔ تم بے خود بھی ہو رہے ہو ۔ لیکن تم کو یہ سکھایا گیا ہے کہ اس کو خوشبو کہنے کے بجائے بدبو کہو ..... کیوں کہ تم دنیا دار بچے ہو ۔ تمہارا فائدہ اسی میں ہے ۔
...... ہم تو سادھو ہیں بھائی ۔ خوشبو کو خوشبو ہی کہتے ہیں ۔ چاہے یہ کہنے میں ہمارا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو جائے ۔
لیکن ایک دن آئے گا جب تم اس مہک سے بے خود ہو کر پکار اٹھو گے کہ
"مشک اپنی مہک خود دے رہا ہے ۔"

انجم نعیم

سلسلہ سفر کا

کالکا میل تیزی سے اپنی منزل کی طرف دوڑ رہی ہے۔
میں اپنے کمپارٹمنٹ میں بیٹھا کھڑکی سے پیچھے چھوٹنے والے
تمام مناظر کو اپنی آنکھوں میں سمیٹتا جا رہا ہوں۔ چھوٹے چھوٹے اسٹیشن
بڑی حسرتوں سے اس تیز رفتار گاڑی کو لمحہ بھر دیکھتے ہیں اور پھر خاموشی
سے پٹریوں پر اپنا سر رکھ کر کسی پسنجر ٹرین کی آمد کا انتظار کرنے لگتے
ہیں۔

پٹریوں کے بدلنے کی کھٹاکھٹ کی آوازیں کبھی کبھی میری فکر
میں ارتعاش پیدا کر دیتی ہیں اور میں کھڑکی سے نظر ہٹا کر کمپارٹمنٹ میں
بیٹھے ہوئے مسافروں کی طرف دیکھنے لگتا ہوں جو کبھی سیاسی باتوں اور
کبھی کھیل کود کی خبروں پر تبصرہ کرتے نظر آتے ہیں ان کی گفتگو میں نہ
کبھی پٹریوں کے بدلنے کی آوازیں نہ چائے کافی بیچنے والوں کا شور
خلل انداز ہوتا ہے۔ گاڑی چلنے کی بے ہنگم آواز اور مسافروں
کے تبصرے کا شور مجھے پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ لیکن
کتنی دیر! شام ہوتے ہی سارے منظر تاریکی کی چادر میں منہ لپیٹ
کر سو گئے۔ کہیں کہیں جلتے بجھتے قمقمے یہ احساس دلا دیتے ہیں کہ یہ
علاقہ بنجر زمین کا حصہ نہیں ہے بلکہ یہاں لوگ پائے جاتے ہیں جو
دن بھر سیکڑوں قصے سننے اور ہزاروں واقعات سنانے کے بعد
اب گھر لوٹے ہوں گے اور گھر کے پرشور ماحول میں دو چار ریڈیوں
کے انتظار میں کمرے سے باہر کسی کرسی یا چارپائی پر بیٹھے کبھی اپنے
ماضی کی یاد اور کبھی اپنے مستقبل کی فکر میں آنکھیں [illegible] گاڑے
خلاؤں کا سفر کرنے میں مشغول ہوں گے۔
کالکا میل تیزی سے اپنی منزل کی طرف دوڑ رہی ہے۔

مجھے اپنے عظیم الشان شہر کلکتہ کے چھٹنے کا قطعی افسوس نہیں
مجھے اس کی شکل بھی نظر نہیں آ رہی ہے۔ اس کے چہرے کی شکنوں
میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ انسانوں کا یہ سمندر اپنے
بازو میں بے شناخت لوگوں کو سمیٹے صبح چار بجے نہایت تیزی سے
دوڑنا شروع کرتا ہے اور رات ایک بجے تک اس کی رفتار میں کوئی
کمی نہیں آتی۔ جب ذرا تھکتا ہے تو دو تین گھنٹے ہانپتے کانپتے قدموں
سے چلتا ہوا تھوڑی دیر کسی جگہ رک کر آرام کر لیتا ہے اور پھر تیزی
سے اپنی انجان راہوں پر دوڑنے لگتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی کے
بیس سال اس شہر میں گزارے اور اس بیس سال کے اندر کسی بہت
بڑی تبدیلی کا کبھی کوئی احساس نہیں ہوا لیکن جب ذرا رک کر سوچنا
شروع کرتا ہوں تو حیرت ہونے لگتی ہے کہ ایک عظیم تبدیلی نے
اس شہر کے رقبے میں دو گھنٹے کا اضافہ کر دیا ہے ہر شخص درگا دیوی
کے اس شہر میں درگا کی طرح آٹھ دس ہاتھوں کا مالک نظر آتا ہے
جو بیک وقت آفس کی کرسیاں بھی سیدھی کرتا ہے اور ٹریڈ یونین
کے جھنڈے بھی اڑائے پھرتا ہے۔ فٹ بال کے ٹکٹ کے لئے ٹوٹنے
والے ہاتھ کارخانوں کی مشینوں پر بھی چلتے نظر آتے ہیں۔ دو آنکھوں
سے دیکھنے اور دو کانوں سے سننے والا ہر شخص بیک وقت آٹھ
دس زبانوں سے گفتگو کرتا ہے اور آدھی رات گئے تک مارکس
وادی اور لینن وادی نغموں کی دھنوں پر سر دھنتا نظر آتا ہے۔ پاس
سے گزرنے والی گاڑی اپنے ہارن سے بے ہنگم آوازیں جب
نکالنا شروع کرتی ہیں تو ان آوازوں پر راستے پر چلنے والا کوئی
مسافر چونکتا نہیں اور نہ بموں کے پھٹنے اور بوتلوں کے برسٹ کرنے

کی آوازیں انھیں اپنا سمتِ سفر بدلنے پر مجبور کرتی ہیں۔ کلکتہ کی طرح
وہ بھی اپنی شناخت کھو چکے ہیں۔ انھیں نہیں معلوم کہ ان کا اصلی چہرہ
اور ان کے اصلی ہاتھ کون سے ہیں۔ مجھے اپنے عظیم الشان شہر کلکتہ
کے چھننے کا قطعی افسوس نہیں۔ اس نے میرے لئے اپنی کوئی
شناخت نہیں چھوڑی ہے۔ ہاں اپنے دوست مجھے بہت یاد آ رہے
ہیں۔ ان کے چہرے کلکتہ کے وسیع انسانی سمندر سے اب اوپر ابھر
رہے ہیں —— پرویز، مظہر، فاروق، حمید شہیر، اور پھر اپنا فلسفی
دوست توحید — ان سب کی آنکھیں اب مجھے واضح طور پر نظر آ رہی
ہیں۔ مجھے توحید سے ہمیشہ شکایت رہی کہ وہ اس شہر کلکتہ میں بھی
رہ کر شہر خموشاں کا ہی باشندہ بنا رہا۔ نہ جانے اسے شہر کے اس ہنگامے
سے اتنی دہشت کیوں ہوتی ہے۔ وہ اس میں گم ہو جانے سے کیوں
کتراتا ہے۔ اس پر کھو جانے کا خوف کیوں طاری رہتا ہے۔ میں
نے آتے وقت اس کے بارے میں پرویز سے پوچھا تھا کہ آخر کل تمہاری
اس سے کیا بات ہوئی؟ تم نے اس سے کیا کہا تھا کہ کل رات وہ
اس قدر ملول نظر آیا۔

"میں اور کیا کہتا۔ جو کچھ کہہ سکتا تھا کہنے کی کوشش کی۔ اگلی
پچھلی تمام باتیں اس کے سامنے رکھیں۔ لیکن وہ بندۂ خدا چپ چاپ
بیٹھا ساری باتیں سنتا رہا اور تمام باتوں کو سگریٹ کے مرغولوں میں
اس طرح اڑاتا رہا جیسے یہ ساری باتیں اس سے پوری دنیا بار بار کہہ
چکی ہے اور وہ ان باتوں کو عقل سے قطعی دور سمجھتا ہے۔ اسے تو بس
نہ جانے کیسی عجیب و غریب دھن ہے کہ رات بھر جاگ جاگ کر
سگریٹ کے ڈبے خالی کرتا ہے اور سڑکیں ناپتا پھرتا ہے۔ نہ جانے
وہ کون سی شئے گم ہو گئی ہے جس کی تلاش اسے رات بھر سونے نہیں
دیتی —— کم بخت۔ کاہل الوجود۔ اگر اپنا دوست نہ ہوتا تو کسی
دن میں اس کے گلے پر چھری پھیر دیتا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تب بھی
وہ کسی طرح کا بھی احتجاج نہ کرتا۔ نہ جانے اس کی زبان کہاں کٹ
گری ہے۔ نالائق۔ بے حس!

میں نے کہا یار تم تو خواہ مخواہ جذباتی ہوتے جا رہے ہو۔
میں نے تم سے کبھی یہ تو نہیں کہا کہ اس کی گردن پر چھری پھیرتے
پھیر دیا اس سے رومانی غزلیں اور راگ ملہار سننے کے لئے ہر
وقت بے تاب رہا کرو۔ اتنا یاد رکھنا وہ اپنا ہی دوست ہے جس
کی زبان ابھی گنگ نہیں ہوئی ہے۔ بس ذرا خاموش طبع ہے اور ہر وقت
بستے رہنا اچھا نہیں سمجھتا۔ آخر فلسفہ اور منطق کا طالب علم رہا ہے
کوئی معمولی لڑکا سمجھ رکھا ہے اسے؟ بھائی میری نظر میں تو توحید کی
بڑی عزت ہے۔ سڑکوں پر چلتے ہوئے گلے پھاڑ پھاڑ کر چلاتا نہیں
پھرتا۔ بم بارود گولی، لاٹھی چارج اور زخمی لاشوں پر بے وجہ آنسو
نہیں بہاتا۔ اور پھر کب تک خواہ مخواہ جذباتی بنا رہے اس تیز رفتار
شہر میں جذباتی ہونا انسان کے لئے ایک عذاب ناک سانحہ ہے جسے
ہم جیسے لوگ تو برابر برداشت کرتے رہتے ہیں لیکن جو توں کے
گرنے کی آواز پر چونک جاتے ہوں جو ہر آہٹ اور ہر سایہ کو پہچانتے
ہوں انھیں کلکتہ بڑی اذیتوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔

ایک خفیف سے جھٹکے سے گاڑی کسی جنکشن پر رکی اور میرے
خیالوں کا تانا بانا گرم سموسے والے کی آواز پر اس طرح بکھرا کہ میں
چند منٹوں کے لئے یہ بھول گیا کہ میں اپنے عظیم الشان شہر سے اکتایا ہوا
بہت دور جانے کی کوشش کر رہا ہوں اور میرے یار انھی یادوں کی
زنجیر سے گاڑی کے پہیوں کو جکڑنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔

لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ نہ موقع محل دیکھتے ہیں۔ اور نہ ماحول
کا کچھ خیال کرتے ہیں۔ اب بھلا بتایئے ٹرین کے اس کمپارٹمنٹ، جس
میں خود ایک منہگا مہر وقت بیمار رہتا ہے، ریڈیو بجانے کی کیا تک ہے۔

میرے بھائی ذرا اس ریڈیو کو تو بند کرنا۔ نہ جانے چار پیسے کی
بیٹری سے اس کو کتنی طاقت آ جاتی ہے کہ دن بھر چیختا چلاتا رہتا ہے
ابھی غالب کی غزل جگجیت سنگھ نے ختم نہیں کی کہ بچے کم پیدا
کیجئے اور نرودھ استعمال کیجئے کے اشتہار، فلم انگڑائی کے دھنسناک
ڈائلاگ، رونا لیلیٰ کا دما دم مست قلندر، پھر صابری برادران کی نعتیہ
قوالیاں، برج موہن کے گائے ہوئے میرا کے بھجن۔ سیلاب میں
ڈوب مرنے والوں کی خبریں، حکومت کی امداد، پرنس چارلس کے
ہنی مون کے دلکش واقعات اور روز روز کی جنگ کی خبریں اور میں
تو کم بخت اس روز روز کی جنگی خبروں سے عاجز آ گیا ہوں۔ اب تو
ایسا لگتا ہے کہ نہ جانے کس دن ایٹم بم آ کر سیدھا مجھ پر گرے گا اور
میں روئی کے گالے کی طرح ادھر ادھر بکھر جاؤں گا کچھ بھی نہ رہوں گا۔

جنگوں میں کتنے لوگ مارے جاتے ہیں؟ ہزاروں مارے جاتے
ہوں گے، سیکڑوں کی لاشوں کا پتہ بھی نہیں چلتا ہو گا۔ کتنی لاشیں چیل

نہیں جا سکتیں۔ کتنے جنگی قیدی پکڑے جاتے ہوں گے؟ سیکڑوں جنگی قیدی پکڑے جاتے ہوں گے۔ مار مار کر جنگی راز اگلوائے جاتے ہوں گے، ناخن کھینچ لئے جاتے ہوں گے۔ الکٹرک شاک لگا کر ناکارہ بنادیا جاتا ہے جسم کے نازک عضوں کو سگریٹ سے داغا جاتا ہے۔ کس قدر ظلم ہوتا ہے۔ لیکن بہت تیز بھاگنے کے لئے یہ جنگ بھی ضروری ہے۔ جو خود بہت تیز بھاگتی ہیں وہ اوروں کو بھی تیز بھاگتے دیکھنا چاہتی ہیں چاہے ناخون کھینچ لئے جائیں چاہے بدن کے نازک حصوں کو سگریٹ سے داغا جائے۔

کلکتہ بھی بہت تیز بھاگ رہا ہے۔ اس کی جھلک بھی مشکل سے دکھائی دیتی ہے۔ کتنے روز مرتے ہیں، کتنوں کی لاشوں کا پتہ نہیں چلتا کتنی لاشیں پہچانی نہیں جاتیں۔

مجھے اپنے عظیم الشان شہر کلکتہ کے چھٹنے کا قطعاً کوئی افسوس نہیں ہے۔ میں وہاں کچھ بھی تو نہیں کرسکتا تھا ــــ خاموشی گناہ! چیخنا عظیم تر گناہ!

منی بہت اچھی لڑکی ہے۔ مجھے بہت مانتی ہے۔ میں بھی اسے بہت مانتا ہوں۔ اس نے اپنی پڑھائی نامکمل چھوڑ دی لیکن آج بھی گھنٹوں بیٹھی پڑھتی رہتی ہے مختلف نصابی غیر نصابی کتابیں، افسانے، ناول اور شاعری۔ خود بھی کہانیاں لکھنے لگی ہے۔ مجھ سے اپنی کہانیوں پر اصلاح لیتی اور مختلف سوالات کرتی ہے۔

یہ حرف یہاں کیوں نہیں ہونا چاہئے؟

یہ لائن آپ نے کیوں کاٹ دی؟

آپ نے تو میری کہانی کا کلائمکس ہی بگاڑ کر رکھ دیا۔

بھلا بغیر زوردار کلائمکس کے کہانی میں کیا مزہ رہ جائیگا۔

اسے کلائمکس کی بڑی فکر رہتی تھی۔ وہ ہر کہانی کو ایک عجیب چونکا دینے والے کلائمکس پر ختم کرنا چاہتی تھی۔ مجھ سے اکثر کہتی:

آپ کی کہانیاں بڑی پھس پھسی لگتی ہیں۔ کوئی زوربیان ہی نہیں ہوتا۔

کہانی بن تو آپ واقعہ میں پیدا کرنا ہی نہیں جانتے۔ اور پھر کہانی کہاں سے شروع ہوئی اور ختم کہاں ہوجاتی ہے کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔

اسے میری کہانیوں کے کلائمکس کی بھی بڑی فکر رہتی ہے۔

مجھ سے چلتے وقت کہنے لگی:

جا تو رہے ہیں لیکن یاد رکھئے یہ شہر بہت یاد آئے گا اپنے وہ دوست بھی یاد آئیں گے جو آپ کی کہانیوں کے کردار بنا کرتے ہیں جن کی ہنسی اور غم آپ کی کہانیوں کو رنگنے کی ہمت عطا کرتے ہیں۔

آپ میرے سب سے اچھے دوستوں میں سے ہیں۔

مجھے آپ کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

مجھے اپنے کلائمکس کے لئے کہانی چاہئے اور کہانی کے لئے مجھے آپ کی ضرورت ہے۔

میں نہیں جانتا میں کس کے سب سے اچھے دوستوں میں سے ہوں۔ بہت سے میرے دوست میرے بارے میں یہی خیال رکھتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی مجھے بھی یہ احساس ہوتا رہا ہے کہ واقعی منی کو کہانیوں کے لئے اب بھی میری بہت ضرورت ہے۔ اس کی کہانیوں کے کلائمکس کو میں بار بار بدلتا رہا اور وہ صرف معمولی سا احتجاج کرکے رہ جاتی رہی۔ وہ تو صرف کہانیاں بنتی تھی اور میں اسے ہمیشہ انھیں اسی طرح چھوڑ کر اس کے کلائمکس اپنی جیب میں رکھ کر اپنے گھر لے آتا اور رات رات بھر بیٹھ کر اپنی کہانیاں بنتا رہتا اور اپنی کہانیوں کے آخر میں اس کے کلائمکس کو جوڑنے کی کوشش کرتا پھر بھی جب صبح جاکر اسے اپنی رف پیپر پر لکھی ہوئی کہانی سناتا تو وہ اسے یہ کہہ کر نامکمل کہہ دیتی کہ:

ابھی کہانی کا خاتمہ ٹھیک سے نہیں ہوا ہے۔ اسے ایک بار ری رائٹ کرلیجئے تو بہتر ہے۔

میں روز اپنا بیگ اپنے کندھے پر لٹکائے اپنی کہانی کے کلائمکس کی تلاش میں سر شام گندی بستیوں، سڑکوں گلیوں میں مرنے والے بھکاریوں، کوڑھیوں، فاقہ کش انسانوں کے درمیان سے گذرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے رنگے چہرے والی عورتوں کو لڑکھڑاتے جوانوں کو نگل جانے کا منظر دیکھتا رہا ہوں۔ لیکن آج تک منی کو یہ نہ بتا سکا کہ میری کہانیاں بے جان کیوں ہوتی ہیں اور مجھے ان کا کلائمکس کیوں نہیں ملتا۔ آخر میں اسے کیسے بتادوں کہ میں کہانیاں گڑھتا نہیں، بنتا نہیں، سنتا نہیں۔ صرف دیکھتا ہوں اور پھر اس شہر میں کہانیاں بہت سی ہیں، لیکن اپنے بے شناخت انسانی سمندر کی طرح کلائمکس سے محروم! یہاں خاموشی گناہ ہے اور چیخنا گناہ عظیم۔

میں نے آتے وقت منی سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ تمہارا یہ
خیال قطعی غلط ہے کہ میں تمہارا سب سے اچھا دوست ہوں اور
تمہیں اور تمہاری کہانیوں کو میری بہت ضرورت ہے۔ تم بے حد
جذباتی لڑکی ہو۔ شاید اسی لئے تم اپنی لستی سے صرف کلائمکس لے
کر آئی ہو جس کے لئے اب تک کلکتہ تمہیں کوئی کہانی نہیں دے رہا ہے
کیوں کہ خود اس کی کہانی کھو چکی ہے۔ اس کے اپنے انتہائی پھیلاؤ میں
انسانوں کے بے سمت ہجوم میں۔

میں قصداً اپنی کہانیوں کا خاتمہ بے جان رکھتا ہوں اور تم اپنی
کہانی کے کلائمکس میں پورا خلوص صرف کر دیتی ہو ـــــ تم اس شہر
میں ابھی نئی نئی آئی ہو اور مجھے پورے بیس برس گذر چکے ہیں۔ نہ جانے
کتنی کہانیاں آج بھی ادھوری پڑی ہیں۔ میں نے انھیں اس خوف سے
پورا نہیں کیا کہ ہر کہانی کا انجام ایک سا ہونے جا رہا تھا، بالکل ایک
بھیڑ کا سا انجام!

"کیا سوچ رہے ہیں انکل"

اچانک سامنے سیٹ پر بیٹھی ہوئی ایک جوان عورت کے بچے
نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔

"اوں۔ ہوں۔ کچھ بھی تو نہیں۔"

"کچھ بھی تو نہیں کیسے۔ کچھ تو ضرور سوچ رہے ہیں۔ بتائیے نا
انکل کیا سوچ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں بیٹے۔"

"تو پھر کیا کھڑکی سے چندا ماما کو دیکھ رہے ہیں؟"

"ہاں بیٹے۔ میں تمہارے چندا ماما کو ہی دیکھ رہا تھا۔"

"تو کیا اس میں بڑھیا نانی آپ کو نظر آئی۔"

"نہیں بیٹے۔ بڑھیا نانی تو مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔"

"آئے گی کہاں سے۔ میری امی کہتی ہیں کہ بڑھیا نانی روٹھ
کے اپنے پوتے کے گھر چلی گئی ہے ــــ کیا یہ صحیح بات ہے انکل کہ
بڑھیا نانی روٹھ کر اپنے پوتے کے یہاں چلی گئی ہے؟"

"اب تمہاری امی کہتی ہیں تو ٹھیک ہی کہتی ہوں گی۔"

"انکل یہ بڑے بڑے پیڑ کس چیز کے ہیں؟ میری امی کہتی ہیں کہ
ان پر بڑے بڑے بندر رہتے ہیں۔ کیا تمام بڑے بڑے پیڑوں
پر بندر رہتے ہیں؟"

"ہاں بیٹے۔ ان پیڑوں پر بہت بڑے بڑے بندر رہتے ہیں۔"

"ہنومان سے بھی بڑے ہوتے ہیں؟"

"ہاں بھئی، ہنومان سے بہت بڑے ہوتے ہیں۔"

"انکل بندروں والی ایک کہانی سنائو نا!"

"بیٹے مجھے کہانیاں نہیں آتیں۔"

"آپ کو کہانیاں نہیں آتیں؟ کیا آپ چمپک نہیں پڑھتے؟"

"نہیں بھائی میں چمپک نہیں پڑھتا۔"

"ارے تو آپ کیسے انکل ہیں! چمپک بھی نہیں پڑھتے۔ کہانی
بھی نہیں کہتے۔"

جوان عورت نے اپنے بچے کو اپنے پاس بلاتے ہوئے مجھ سے
کہا:

"معاف کیجئے گا بڑا پریشان کرنے والا لڑکا ہے۔ بہت
جلد لوگوں سے گھل مل جاتا ہے۔ اسے کہانی سننے کا بڑا شوق
ہے۔ بڑا شریر ہو گیا ہے۔ ہر وقت تنگ کرتا رہتا ہے۔"

"اس میں شرارت کی کوئی بات نہیں ہے۔ ایسے بچے گھر کی
رونق ہوتے ہیں۔ بچہ ایسا ہی ہونا چاہئے۔ کچھ تو شوق ہو کہانی
سننے کا یا کہانی کہنے کا۔ بغیر کہانی کے بہت سے لوگوں کا دل ہی
نہیں لگتا۔ اور پھر یہ تو بچہ ہے۔"

مجھے فوراً اپنے چھوٹے بھائی کی یاد آ گئی۔

بچے خواہ مخواہ عجیب وغریب سوالات کیا کرتے ہیں۔

میرے ابا جب صبح اخبار پڑھ پڑھ کر گھر میں لوگوں کو سناتے
رہتے تھے تو میرا چھوٹا بھائی ناظم مجھ سے اکثر ایسے ہی بے تکے سوالات
کرتا رہتا تھا:

"بھیا یہ نکسل پارٹی کس کی پارٹی ہے؟ اس میں کون لوگ
رہتے ہیں؟"

"یہ پائپ گن کیا ہوتا ہے؟" "یہ تصادم، گھائل اور ہلاک
کے کیا معنی ہوتے ہیں؟"

"یہ کرفیو کیا ہوتا ہے؟ یہ دفعہ ۱۴۴ کیا ہوتی ہے؟"

"یہ کیا ہوتا ہے؟ وہ کیا ہوتا ہے؟"

میں غصہ ہو کر اسے ڈانٹنے لگتا: "ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی عمر
ہے اور پورا اخبار سمجھ لینے کا شوق پیدا ہو گیا ہے۔ جو کام کی بات

ہو وہ کیا کرو اور پوچھا کرو۔ ہر بات میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں۔"
نہ جانے ایسے کتنے سوالات ہیں جو میرے ذہن میں بھی ہر وقت
گردش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اس ڈر سے کسی سے نہیں پوچھا کہ کہیں
وہ ڈانٹ کر یہ نہ کہہ دے کہ ہر بات میں ٹانگ اڑایا نہیں کرتے۔ جو
کام کی بات ہے وہ کیا کرو۔ اور پھر کچھ بزرگ ازراہِ ہمدردی کہہ گئے
کہ بڑا شریر ہو گیا ہے۔ ہر وقت تنگ کرتا رہتا ہے۔

سوالات ہماری زندگی کا جزو بن گئے ہیں۔ بلکہ تمام لوگ سوالیہ
نشان کے شکنجے میں کسے ہوئے ہیں اور جوابوں کے پیچھے بھاگنے کی پوری
کوششوں میں مصروف ہیں۔ لیکن میری بہت سی کہانیاں ادھوری
پڑی ہوئی ہیں — اور کلکتہ غیر محسوس طور پر پھول کر پھیلتا جا رہا ہے۔
پرویز جواب چاہتا ہے۔ توحید کو سوالوں سے چڑ ہے۔ گاڑی
تیزی سے بھاگ رہی ہے۔ اور جنگ کے شعلے بجھے بجھے دوڑتے چلے
آرہے ہیں۔ منی اپنی کہانی کے کلائمکس کی تلاش میں مجھے ہر روز نئی
کہانیاں گڑھنے پر مجبور کرتی ہے اور میں کیسا انکل ہوں کہ کہانیاں
بھی کہنا نہیں جانتا۔

کالکا میل سیکڑوں میل کا سفر طے کر کے اپنی منزل سے بہت قریب
آچکی ہے۔ لیکن مجھے اپنے عظیم الشان شہر کے چھٹنے کا قطعاً کوئی افسوس
نہیں —

لیکن پھر مجھے کچھ ایسا لگتا ہے کہ اس سفر کی ضرورت بھی کیا تھی۔
سفر کوئی اچھی چیز تو نہیں — میں کس کھوج میں کلکتہ کے سمندر
سے نکل پڑا ہوں۔

پٹریوں کے بدلنے کی آواز نے مجھے ایک بار پھر چونکا دیا۔ گاڑی
آہستہ آہستہ پلیٹ فارم میں چپکے چپکے داخل ہو رہی تھی۔ علی گڑھ بہت
چھوٹا سا ایک شہر ہے۔ اور اس کا اسٹیشن بھی چھوٹا سا ہے۔ میں اپنا
بیگ سنبھالے گاڑی سے اتر کر سیدھا رکشہ اسٹینڈ کی طرف بڑھتا ہوں۔
گاڑی کافی تیز چلنے کے باوجود کئی گھنٹے لیٹ ہو چکی تھی۔ رات کی
سنسان تاریکی میں رکشا والے نے سرگوشی کے انداز میں مشورہ
دیا:

"صاحب چپ چاپ جا کر پلیٹ فارم پر سو جائیے۔ رات کو
یہاں کوئی نہیں بولتا صرف کتے کے بھونکنے کی آواز اور سپاہیوں
کے بوٹوں کی دھمک کو فضاؤں میں گردش کرنے کی اجازت ہے۔
شاید آپ کچھ نئے معلوم ہوتے ہیں۔"

"مجھے اپرکوٹ جانا ہے۔"

رکشہ والا تولیہ میں منہ دبا کر زور زور سے ہنسنے لگا:

"اپرکوٹ — اپرکوٹ جائیں گے کرفیو میں؟ — ہی ہی ہی
صاحب اپرکوٹ جائیں گے — اپرکوٹ۔

"پاگل کہیں کا۔ میں اسے نفرت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہوا
پلیٹ فارم کی طرف لوٹ آیا۔ میں تھوڑی دیر کھڑا سوچتا رہا پھر مجھے ایسا
لگا کہ پورا شہر پلیٹ فارم پر آکر کسی ڈاؤن ٹرین کا انتظار کر رہا ہے۔
ان چہروں کو دیکھتے ہی خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ان
کے چہروں پر ان کی شناخت بہت صاف نظر آرہی تھی۔ اور وہ اس سے
گھبرا کر اس سمندر میں ڈوب جانا چاہتے تھے۔ جس کی کہانی میں
کوئی کلائمکس نہ ہو۔ اور اس کے لئے کوئی پہچانا نہ جا سکے۔ میں ان تمام
لوگوں کے بیچ کھڑا اپنی نئی کہانی پھاڑ پھاڑ کر ریلوے لائن پر پھینک
رہا ہوں اور کاغذ کے ٹکڑے ہوا میں ادھر ادھر بکھرتے جا رہے ہیں اور
میں دور جاتے ہوئے ایک ایک ٹکڑے کو غور سے دیکھ رہا ہوں۔ ان
کاغذ کے ٹکڑوں کو ہوا اپنے دوش پر اٹھائے ہوئے نہ جانے کہاں
کہاں لے جائے گی۔ لیکن یہ کبھی آپس میں مل کر کوئی کہانی نہ بنا سکیں
گے۔

میں نے سوچا تھا کہ مجھے یہاں اپنی کہانی کا کلائمکس مل جائے
گا۔ ہر چھوٹا شہر اپنا کلائمکس بڑے شہر کی کہانی میں ضم کر دیتا ہے
— لیکن اگر منی کو میری وہ کہانیاں جو کلکتہ نے مجھے دی تھیں
پھس پھسی نظر آتی ہیں، تو رات کے کرفیو کے سناٹے میں مجھے یہ کلائمکس
کتنا بھیانک نظر آرہا ہے۔

اف یہ خوف! یہ چہرے اپنی پہچان سے کس قدر ہراساں ہیں۔

"صاحب آپ اتنی دیر سے کھڑے کیوں ہیں تشریف رکھئے
کہاں سے آئے ہیں۔ اتنی دیر سے آنے کی کیا ضرورت تھی — شاید
ٹرین لیٹ ہو گئی ہو گی۔ یہ ٹرینیں بھی کتنی لیٹ ہو جاتی ہیں۔ دن زمانہ
کا بھی خیال نہیں کرتیں۔

— آپ بیڑی پیتے ہیں؟

"جی نہیں شکریہ"۔ میں نے بیٹھتے ہوئے انکساری سے کہا۔ لیکن
کلکتہ میرے اندر سے چیخ رہا تھا "تم مجھے اس قدر کیوں پہچان

رہے ہو۔ میں دو نیم ہو جاؤں گا۔ عین اس لمحے پرویز، معز، فاروق، مجید، شیر اور توحید کی شکلیں واضح ہونے لگیں۔ وہ میرے قریب سے قریب تر ہونے لگے۔

"چلو اچھا ہے اب رات آسانی سے باتوں میں کٹ جائیگی"۔

"کیا یہاں بھی راتیں بات کرتے ہوئے کٹتی ہیں؟"

میرے پاس بیٹھے ہوئے مسافر نے میری طرف خاموش نگاہوں سے دیکھا۔ جیسے کہنا چاہتا ہو کہ صاحب رات گو بات کرکے کاٹنے کے لئے ہی بنائی گئی ہے۔

اس نے اشارہ سے دو کپ چائے منگوائی اور مسکراتے ہوئے ایک کپ خود لی اور دوسری مجھے دی۔ اس کی دونوں آنکھیں چائے کی پیالی میں ڈوب گئیں۔ میں چائے کی پیالی لئے خالی آنکھوں سے دور جاتی ہوئی پٹریوں پر کچھ تلاش کرنے لگا۔ کہانی کے پھٹے ہوئے اوراق کے ٹکڑے اب کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

منی کو شائد اب بھی چونکا دینے والے کلائمکس کی فکر ہو، لیکن میں اپنی کہانی کھو چکا ہوں۔ ●●

ابن فرید

وہ ایک بستی تھی

وہاں اب بھی ہری بھری گھاس ہے اور رنگ برنگ کے پھول، نیچی نیچی وادیاں ہیں اور اونچی اونچی پہاڑیاں، سورج کا طلوع و غروب ہے اور چشموں کی پرشور روانی۔ لیکن اکیلے سلامت کے نہ ہونے سے ایسا لگتا ہے جیسے ریت پر پڑے ہوئے گلاب کے پھول کو اٹھا لیا جائے اور ریت کی بدنمائی دوبارہ نمایاں ہو جائے۔ سلامت کی گرفتاری سے پوری بستی بالکل اسی طرح ویران ہو گئی تھی۔ جس چیز کو بھی دیکھئے بس ایک دم خالی خالی سی نظر آ رہی ہے۔ بالکل اجاڑ سی محسوس ہو رہی ہے۔ چند دنوں سے یہ کیفیت پوری بستی کے لئے بڑی صبر آزما ہو گئی تھی، اور خاص طور سے وہ لوگ جو سلامت سے انتہائی وابستگی رکھتے تھے وہ سب ایسے لگتے تھے جیسے ان کا نہ معلوم کیا کھو گیا ہو اور وہ خود کھوئے کھوئے سے نہ جانے کیا تلاش کر رہے ہوں۔

جب سلامت کو پولیس کے سپاہی ہتھکڑیاں پہنا کر لے جا رہے تھے تو گاؤں کے بچے، بوڑھوں، عورتوں اور جوانوں کا ایک چھوٹا موٹا جلوس گاؤں کے باہر تک اسے الوداع کہنے آیا۔ ان سب پر اداسی اس طرح چھائی ہوئی تھی جیسے ان کے ہاتھوں سے ان کی کوئی بہت ہی قیمتی چیز جا رہی ہو اور وہ بے چارگی کی حالت میں محض دیکھتے رہ جانے پر مجبور ہوں۔ سلامت تین سپاہیوں اور ایک تھانہ دار کے حلقہ میں گھرا ہوا پہاڑی نالے کی وادی میں اترتا جا رہا تھا اور بہت سی آنکھوں میں آنسو ابر بزدل کی طرح تھرتھرا اٹھے، اور کسی کمزور دل کے ہونٹوں سے باوجود ضبط کے ایک چیخ نکل گئی اور سب چونک کر اس کی طرف گھورنے لگے۔ پھر کتنے ہی لبوں سے آہ نکل گئی اور سب خاموش اور افسردہ سے گاؤں واپس آ گئے۔ ساری بستی پر جیسے مردنی چھا گئی تھی۔

ان کے دل سلامت کی تمنا کر رہے تھے، ان کی نگاہیں سلامت کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ لیکن وہ ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہہ رہے تھے۔ پیپل کے پیڑ کے نیچے ایک بچی مٹی کے تودے بنا رہی تھی۔ لیکن اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کچھ اداس سی ہے۔ اس کا دل کھیل میں نہیں لگ رہا ہے۔ اس کی نظریں خلا میں کچھ تلاش کر رہی ہیں، شاید سلامت کو! ——— جو اگر ابھی آتا تو وہ اس کی ٹانگوں سے چمٹ جاتی۔ سلامت پیار سے اس کے گالوں کو تھپتھپاتا اور کندھے پر چڑھا لیتا، پھر پیپل کے پتے کی سیٹی بنا کر اسے دیتا اور کھیتوں کی سیر کرانے لے جاتا۔ ہرے ہرے شاداب کھیتوں کی تازہ ہوا ننھے سے سینے میں فرحت پیدا کر دیتی اور سلامت سرکنڈے کی تیلیوں کی چڑیاں طوطے اور اونٹ بنا کر اس کے دامن میں بھر دیتا اور خلوص کے ان "بیش قیمت" تحفوں کو پا کر بچی خوشی سے چہچہا اٹھتی، اور سلامت اسے ننھی ننھی ہلکی پھلکی کہانیاں سناتا ہوا گاؤں واپس لے آتا لیکن آج وہ بچی اس دلچسپ سیر سے محروم تھی اور اکیلی وہیں بچی کیا، گاؤں کے تمام بچے ان مانوس بازوؤں اور آرام دہ کندھوں سے محروم تھے۔ ان کی سواری ان کا کاریگر، ان کا قصہ گو اب ان سے بہت دور جا چکا تھا، اور بچی حسرت سے خلاؤں میں تک رہی تھی۔

پہاڑی چشمے کے کنارے، سنگلاخ چٹان پر عورتیں پانی سے بھری اور خالی گاگریں لئے یوں بیٹھی ہوئی تھیں، جیسے وہ اداس ہوں، جیسے وہ کسی بڑی فکر میں کھو گئی ہوں، جیسے ان کی آوازوں کی کھنک اور ان کے لہجوں کے ساز کو کسی بے رحم ہاتھ نے توڑ پھوڑ کر پھینک دیا ہو، اور جب وہ کچھ بولتی ہوں تو خالی گاگروں سے نکلنے والی آواز کی طرح ان کی

اپنی آواز میں کوئی حلاوت نہ ہو۔ جب چلتی ہوں تو ان کے قدم آندھیوں
کے بگولوں میں پڑتے ہوں اور وہ بار بار لڑکھڑا جاتی ہوں۔ انھیں کچھ عجب
طرح کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ ان لمبے سپاٹ دنوں پر پھر ایک بار آسیب زدہ
سناٹا چھا گیا تھا، زندگی دوبارہ کسی گہرے غار کے کنارے آکر ٹھہر گئی
تھی، اور اس کے اندر سے طویل عرصہ سے منہ چھپائے ہوئے درندہ
نما انسان پھر سے جھانکنے لگے تھے۔

اب وہ حصار ٹوٹ چکا تھا جو سلامت نے ان کے گرد کھینچ رکھا
تھا، اور جس کے اندر وہ بے خوف و خطر جدھر چاہیں جا سکتی تھیں،
انھیں کبھی کھٹکا محسوس ہوتا تو وہ پکار اٹھتیں اور سلامت آموجود ہوتا۔
انھیں کسی مدد کی ضرورت ہوتی تو وہ سلامت کی طرف دیکھتیں اور
سلامت خود کو پیش کر دیتا، لیکن سلامت نے کبھی ان کی طرف بھوکی
نظروں سے نہ دیکھا۔

شروع شروع میں وہ ان کے درمیان بہت بدنام رہا۔ چشمے
کے کنارے، سنگلاخ چٹانوں پر بیٹھ کر جب وہ بستی کے سارے جوانوں
پر تبصرہ کرتیں تو سلامت کے نام پر ایک حقارت آمیز قہقہہ لگاتیں۔

"اجی وہ تو پتھر ہے، بے جان پتھر!"

اور پھر وہ پتھر کی چٹان پر اپنی ایڑیوں کو اس طرح مارنے لگتیں
کہ ان کی جھانجھنوں کا ساز بڑے پیارے آہنگ کے ساتھ تڑپ اٹھتا
لیکن ایک دن ان کی ایڑیاں چشمے کی چٹان پر جمی کی جمی رہ گئیں اور وہ
حیرت بھرے سکتے میں سلامت کا منہ تکتی رہ گئیں۔

وہ نازو کے سامنے اس قدر افسردہ کھڑا ہوا تھا کہ اس کے
ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں، اس کی آنکھوں کے گوشوں میں نمی
خشک ہو رہی تھی اور اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"تم نے یہ کیا کیا؟"

(نازو اسکی بہن نہیں تھی۔ گاؤں کی عام لڑکیوں میں سے وہ بھی
ایک تھی۔)

"ذرا سوچو تم نے کیا کھو کر کیا پایا؟"

اور چشمے کے کنارے گاگریں بھرنے والی لڑکیوں کو ایسا محسوس
ہوا کہ جیسے ان کے قدموں کے نیچے پڑی ہوئی چٹان میں یکایک جان
پڑ گئی ہے اور وہ کروٹ لے کر کھڑی ہونے والی ہے، اور سلامت کا
بے فکر اور سدا مسکراتا ہوا چہرہ ان کے لئے پہاڑیوں کی اوٹ سے
ابھرنے والا سورج بن کر روشن ہو گیا۔ پھر ان کے قدموں سے پیدا
ہونے والے آہنگ کی پیاس بھری گونج میں لاج پیدا ہو گئی۔ اب
انھیں طمانیت محسوس ہوتی تھی، زندگی کی اہمیت نظر آتی تھی، لیکن
ایک بار پھر سلامت کے چلے جانے کی وجہ سے ان جانے خطرات
نے سر نکالنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے گرد جو حصار کھنچا ہوا تھا وہ
ٹوٹ چکا تھا۔ بہت سے شکاریوں کے درمیان کھلے میدان میں پناہ
تلاش کرنے والی ہرنیوں کے دل بری طرح دھڑک رہے تھے، اور
وہ اداس تھیں۔

اور انھیں کی طرح وہ بوڑھیاں بھی اداس تھیں جو نیم کے درخت
کے نیچے بیٹھی ہوئی چرخے پر سوت نکال رہی تھیں، پرانے کپڑوں میں پیوند
لگا رہی تھیں، یا چھاجوں میں اناج لئے ہوئے صاف کر رہی تھیں۔ ان
کے چہرے دل کی جھریاں اور بھی زیادہ نمایاں ہو گئی تھیں اور آنکھوں پر
دھندلاپن اور بھی زیادہ چھا گیا تھا۔ ان کے لبوں پر سکوت کی مہر لگ
گئی تھی۔ ان کے برتاؤ میں عجب روکھا پن سا پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اپنے
ذہنوں پر لاکھ زور دیتیں لیکن ان کی سمجھ میں یہ نہ آتا کہ سلامت بغیر
کسی قصور کے کیوں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اور جب انھیں یہ نہیں معلوم تھا
تو وہ کیا بولتیں اور کیا کہتیں۔ وہ اپنے کاموں میں لگی ہوئی تھیں اور
ان کے تصورات میں سلامت ننھے سے معصوم بچے کی طرح مسکراتا ہوا
ابھر آتا، اور ان کا دل چاہتا کہ وہ اسے سینے سے لگا لیں۔ وہ سب
ہی جانتی تھیں کہ جب وہ شام کے دھندلکے میں کھیتوں سے واپس
ہوتیں تو ان کے سر پر چارہ کا بوجھ یا ایندھن کا گٹھا ہوتا۔ دن بھر کی
محنت کے بعد ان کی سانسیں پھول رہی ہوتیں، تھکن سے ان کی
ٹانگیں کانپ رہی ہوتیں اور قدم ڈگمگا رہے ہوتے۔ عین اسی وقت
سلامت کھیتوں کی منڈیروں کو پھلانگتا ہوا دوڑتا آتا اور بوجھ چھیننے
لگتا۔ بوڑھی عورت بوجھ کو مضبوطی سے پکڑ لیتی۔ لیکن سلامت کے آگے
اس کا بس نہ چلتا:

"لا ماں، میں لے چلوں"۔ سلامت کہتا

"رہنے دے میں خود ہی لے جاؤں گی"۔ بوڑھی عورت پیار سے
جھڑکتی۔

"نہیں ماں، میں تو نہ لے جانے دوں گا۔"

سلامت ضدی بچوں کی طرح مچل جاتا اور راستہ روک کر

کھڑا ہو جاتا ۔ بوڑھی عورت مجبوراً اسے بوجھ دے دیتی اور سلامت
آگے آگے تیز تیز چلنے لگتا ۔

"جلدی چل ماں، تو تو بہت دھیرے چل رہی ہے ۔ دیکھ
اندھیرا ہوتا جا رہا ہے نا"۔ سلامت شوخی سے کہتا ۔

"ایسی ہی جلدی ہے تو تو جا، میں دھیرے دھیرے آتی ہوں"
بوڑھی عورت محبت بھرے انداز میں بگڑ جاتی ۔

اور پھر سلامت آہستہ آہستہ چلنے لگتا ۔ بوڑھی عورت سے سجانے
کیا کیا پوچھ ڈالتا ۔ بوڑھی عورت اپنے دودھ پیتے ناتی پوتوں سے لے کر
گائے بکریوں تک کا حال اسے سنا ڈالتی ۔ پھر اس کی حیرت کی انتہا نہ
رہتی جب وہ کچھ دنوں بعد دیکھتی کہ سلامت نے اس کی بہت سی خواہشوں
کو اسے بتائے بغیر پورا کر دیا ہے ۔

لیکن اب ان کے درمیان وہ شوخ لڑکا نہیں تھا جس کی طرف
اگر وہ دیکھتیں تو ان کے سینے کے اندر کلیاں چٹکنے لگتیں ۔ جو انھیں
پیار بھرے انداز میں چھیڑتا تو وہ اسے مسکراتے ہوئے جھڑک دیتیں ۔
وہ ان کے درمیان کیوں نہیں تھا، وہ سوچنے سے قاصر تھیں ۔ اور اسی
لئے اپنی فطرت کے خلاف وہ خاموش تھیں، بالکل بے جان سی!

مگر چوپال پر بیٹھنے والے مردوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں
عنایت ایک طرف کونے میں بیٹھا ہوا ناریل کا حقہ گڑگڑا رہا تھا ۔ اور
خلاؤں میں تک رہا تھا ۔ شاید وہ کل کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ
اب وہ کھیت میں اکیلے کیسے کام کر سکے گا ۔ چڑیوں کی چہکار سے پہلے
ہی سلامت اس کے جھونپڑے کے واحد دروازے کی کنڈی کھٹکھٹاتا
اور جب وہ باہر نکلتا تو دیکھتا کہ بیل چارہ کھا کر تیار کھڑے ہیں
اور سلامت کے کندھے پر ہل ہے ۔ وہ شرمندہ ہو جاتا، آخر وہ
اس بے دام کے مزدور کی مزدوری کیسے چکائے گا؟

ایک مرتبہ دن ڈھلے جب وہ کھیت میں ہل کی مٹھیا پکڑے
ہوئے ہرائی کو گھورتا ہوا آہستہ آہستہ بیلوں کو ہانک رہا تھا تو سلامت
نے ہرائی پوری کرتے ہوئے اس کے پیچھے اپنے بیلوں کی گوئی لگا دی
اور آوازہ کسا:

"عنایت بھیا کیا گر گیا ہے؟"

"کچھ نہیں، کچھ نہیں"۔ عنایت چونک پڑا ۔

"میں سمجھا شاید تمہارا گر گیا!" سلامت مسکرانے لگا ۔

"نہیں تو"۔ عنایت نے جھینپتے ہوئے یونہی کہہ دیا ۔

"ارے تو پھر کون سی جوڑ توڑ کر رہے ہو تم؟"

"تمہاری مزدوری کی!"

"وہ تو میں پائی پائی وصول کر لوں گا!" سلامت نے زوردار قہقہہ لگایا ۔

لیکن پھر فصلوں پر فصلیں گذر گئیں لیکن عنایت کیا، اس جیسے
کتنے ہی پریشان حال کسانوں کے پاس سلامت مزدوری وصول کرنے
کی غرض سے صورت بھی دکھانے نہ گیا ۔ اور یہی وہ چیز تھی جس نے
عنایت کو تفکرات کے سمندر میں غرق کر دیا تھا ۔ اس کا سلامت، اس
کا بازو، ٹوٹ گیا تھا ۔

تب ساہوکارہ میں بڑا مہاجن اپنی پیتل کی چمکتی ہوئی گڑگڑی کے
کش لگاتا ہوا چھوٹے ساہوکارہ کی گدی پر گیا ۔ ان دونوں کے پاس
بات کرنے کو کوئی بات نہ تھی، لیکن پھر بھی انھوں نے ایک دوسرے کی
طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا، اور چپ رہے ۔ چپ تو وہ بہت
دنوں سے تھے لیکن اب وہ بوجھ سینے پہ نہ تھا جس کے تلے وہ دبتے
اور پچکتے جا رہے تھے ۔

"کہو جی، اب کی سایت (ساعت) کیسی رہے گی؟" بڑے
مہاجن نے پوچھا ۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا لالہ!" چھوٹے مہاجن نے فکرمندی کے
ساتھ کہا ۔

"اب بھی کچھ نہیں کہہ سکتے؟"
بڑے مہاجن نے طنز بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور اٹھ
کر بے فکری کے انداز میں گڑگڑی کے کش لگاتا اپنی گدی کی طرف
چل دیا ۔

بہت دنوں کے بعد چاچے نے جب سورج نکلنے سے پہلے
پہلے اپنی بیٹھکی کا دروازہ کھولا تو احاطہ کا آنگن جیسے چمک رہا تھا ۔ کوڑے
کرکٹ کا کہیں نام و نشان نہ تھا ۔ چوکیوں اور بنچوں پر دھول گرد سے
پاک صاف تھیں، خالی گھڑوں اور چھوٹے پتیلوں کو جمع کرنے کے لئے
کونے میں رکھا ہوا ڈرم تازہ تارکول کے رنگ سے چمک رہا تھا ۔ اس
کے باوجود جب چاچے بیٹھکی میں اندر داخل ہوا تو اس نے کندھے پر
سے نئے انگوچھے کو اتار کر پہلے چوکی اور بنچوں پر ایک ہاتھ مارا پھر

پھر عادتاً مسند جھاڑ کر اس پر بیٹھنے ہی چلا تھا کہ اسے دروازہ پر قدموں کی چاپ محسوس ہوئی اور اس کا دل شدتِ جذبات سے دھڑک اٹھا۔

اس نے عجلت کے ساتھ مڑ کر دیکھا۔ آنے والا اس کا چاکر کلوا تھا۔

"اب اب آ رہا ہے جب سورج سر پہ چڑھ آیا ہے۔"

چاچے نے انتہائی غضب ناک لہجے میں گرجتے ہوئے کہا۔ (ابھی سورج کی ابھی پہلی ہی کرن پھوٹی تھی)

"چاچے معافی دو، اتنے دن میں عادت چھوٹ گئی۔"

"عادت چھوٹ گئی! بڑا آیا ہے لاٹ صاحب کا بچہ۔ اب یاد رکھ اب نہیں چلے گی حرام خوری۔"

"چاچے وہ تو میں بھی سمجھتا ہوں، اب آگے شکایت کا موقع نہ دوں گا۔"

کلوا مستعدی دکھاتے ہوئے رنگ برنگی بوتلوں اور شیشیوں پر یونہی جھاڑن پھیرنے لگا۔

نمبردار نے اس صبح کھلی ہوا میں ٹہلنے کی امنگ محسوس کی۔ اس نے برآمدے کے کونے سے اپنی جریب اٹھائی، کپڑے سے اس کی گرد پونچھی، چھپر کھٹ کے نیچے سے جوتے کھینچے، کھڑاویں اتار کر ایک طرف ڈال دیں اور جوتے پہن لئے۔ پھر جب وہ اپنے سر پر پگڑی جمانے لگا تو اندر سے نمبردارنی باہر آ گئی۔

"کہاں چلے سویرے سویرے؟"

"کہیں نہیں! سوچا لاؤ ذرا کھلی ہوا میں ٹہل آؤں۔"

"دیکھو کہیں اٹک نہ جانا صبح صبح، ورنہ میں روٹی لئے بیٹھی سوکھتی رہوں گی۔"

نمبردار لطف لینے والے انداز میں مسکرا دیا۔

"تم بھی نادان بنتی ہو۔ جانتی ہو کہ اس اٹکنے کے لئے مجھے کتنی بھاگ دوڑ کرنی پڑی ہے۔ پھر بھی انجان بنتی ہو۔"

کھلے کھیتوں کی مینڈوں پر سے جب وہ گذر رہا تھا تو اس نے جان بوجھ کر چمن اور خیر محمد کو نظر انداز کر دیا۔ وہ آزمانا چاہتا تھا کہ وہ دونوں اس کے ادب لحاظ میں اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں یا نہیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ یہ مرحلہ آتا اس کے کانوں سے ایک جملہ ٹکرایا:

"تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ سلامت تو بے قصور ہے۔"

یہ چمن تھا جو خیر محمد سے الجھ رہا تھا۔

"تو یہ کب میں کہتا ہوں کہ وہ واقعی قصوروار تھا۔"

یہ خیر محمد کا جواب تھا جو نمبردار کے کانوں سے ٹکرایا۔

نمبردار ناگواری کے ساتھ وہیں سے لوٹ لیا۔

اس نے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے نظر اوپر اٹھائی تو احساس ہوا کہ سورج کی روشنی میں تیزی آ چکی ہے۔ اسے نمبردارنی کی تاکید یاد آ گئی اور اس نے اپنے قدم اور تیز کر دیئے۔ آبادی کے مکانات رفتہ رفتہ قریب ہوتے جا رہے تھے اور ان کے بیچ مسجد کے مینار فریاد رسا ہاتھوں کی طرح پھیلے ہوئے آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔

نمبردار نے پگڑی کے سرے سے اپنے چہرے کا پسینہ پونچھا اور قدم اور تیز کر دیئے۔

●●

گلوں کی خوشبو

نئی نسلیں کا تازہ شمارہ مل گیا۔ آپ کا اداریہ پڑھا۔ آپ نے خوب کھری کھری سنائی ہیں۔ یہی صورت حال یہاں ہے۔ عقیل صاحب سے کہوں گا کہ اسے جسارت میں نقل کریں۔

مشفق خواجہ (کراچی)

نئی نسلیں کا تازہ شمارہ مل گیا ہے۔ بہت اچھی کوشش ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا (سرگودھا)

"نئی نسلیں" کا تازہ شمارہ بابت مارچ، اپریل، مئی، جون ۸۱ء موصول ہوا تو آپ کی یاد بھی ذرا زیادہ زور سے آئی۔ یہ پہلا شمارہ ہے جو آپ کے زیر ترتیب منظر عام پر آیا ہے اور بلاشبہ رسالے میں ایک بہتر تبدیلی کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ اتفاق سے مجھے اس کا مطالعہ کرنے کا موقع بھی مل گیا لہٰذا چند سطریں اپنے تاثرات کے طور پر ذیل میں درج کر رہا ہوں۔

اداریہ فکر انگیز ہے اور مبنی بر حقائق۔ مقالات و منظومات کا حصہ قابل ذکر نہیں، سوا آپ کے مضمون "اردو نثر اور اس کا تعمیری نصب العین" کے چند خیال انگیز جملوں کے۔ غزل کا حصہ بالکل مایوس کن بلکہ بیزار کن ہے۔ کم از کم دو تین اچھی غزلیں پورے صفحے کی بعض اچھے شعرا سے حاصل کر کے ہر شمارے میں آنی چاہیں اور اگر ایک اچھی پابند نظم بھی کسی موضوع پر مل جائے تو غنیمت ہو گی جذبی سے تو آپ غزل و نظم دونوں ہی لے سکتے ہیں، جو کچھ ان کے اندر رہ گیا ہے اسے نچوڑ لیجئے اور محفوظ کر دیجئے، عطر شاعری اب مفقود ہوتا جا رہا ہے، اس لئے کچھ ذخیرہ دور جدید کا بھی ہو جائے تو ہم لوگ کم از کم کبھی کبھی اس سے مشام جاں معطر کر لیں۔

اس لے دے کر افسانوں کی دنیا رہ جاتی ہے اور زیر نظر شمارے کی خاص چیز یہی ہے، چار میں تین افسانے بہت خوب اور ایک سے ایک ہیں، گرچہ احمد یوسف کا دلچسپ افسانہ غالباً مطبوعہ ہے۔ بہرحال مسرور جہاں کا "مٹی کا مول" نہایت حسین فنی تخلیق ہے اور کلاسکی قسم کا مختصر افسانہ ہے۔ بازغہ تبسم کی "وہ ایک چھوٹی سی بات" درحقیقت بہت بڑی بات ہے جو بڑے موثر اور دل کش انداز میں کہی گئی ہے۔ م۔ نسیم صاحب کا "سفر نامہ" یقیناً دلچسپ ہے اور "نئی دنیا کی کھوج میں" انھوں نے کولمبس کے نقش قدم پر جو سیاحت کی ہے بلکہ وہ کر رہے ہیں اس کے احوال و مقامات کی مزید روداد کے لئے ہمارا تجسس برقرار رہے گا۔ بس ان سے ایک استدعا ہے کہ جملہ بازی میں تھوڑی کمی کر دیں، تاکہ ان کی ذہانت کی بجلیاں ان کی سیاحت کی دلچسپیوں اور قارئین کے درمیان ہو کر لگاتار چکا چوند نہ پیدا کریں۔

کتابت مہین باریک اور طباعت ذرا ہلکی ہو تو رسالہ زیادہ دیدہ زیب ہو جائے گا۔ سرورق عمدہ ہے۔ برادر عزیز انجم نعیم صاحب کو سلام کے بعد کہیے کہ افسانہ لکھیں یا پھر سیدھے سیدھے انشائیہ نگاری کریں۔

والسلام ڈاکٹر عبدالمغنی پٹنہ

"نئی نسلیں" نئی آب و تاب سے منظرِ عام پر آ گیا، شکریہ۔ ابھی ورق گردانی ہی کر پایا تھا کہ ہاتھوں ہاتھ گھوم رہا ہے۔ تازگی کا احساس تو ضرور ہوا مگر توقع سے کم تر پایا۔ پتہ نہیں کیا اسباب ہیں۔ سرورق پر ایسا محسوس ہوا کہ دو ڈانڈے دینے والی بطخیں بیٹھی ہیں۔ کیا علی گڑھ میں اب ایسے ہی آرٹسٹ رہ گئے ہیں؟

نوٹ: میں نے عجلت کی وجہ سے صرف ٹائٹل پر تبصرہ کر دیا تھا۔ مندرجات میں آپ کے تیکھے اداریے کے علاوہ کئی تحریریں بہت پسند آئیں۔ اس کا یہ مطلب کہاں ہوا کہ پورا رسالہ میں نے ناپسند کیا۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ شمارے بہتر سے بہتر ہوں گے۔

ڈاکٹر احمد سجاد (رانچی)

"نئی نسلیں" بہت پسند آیا۔ اب اس میں ادبی رنگ غالب ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ یہ جریدہ کسی مکتب فکر کی نمائندگی کرتا ہے۔ اسے اسٹال پر دیکھ کر خریدا جا سکتا ہے۔ اس میں ایک عام شریف شہری بھی اپنی بنیادی اخلاقی ضرورت کو پورا کرنے کا سامان پا سکتا ہے۔ اگرچہ اس میں آغازِ کار روائی "ابتدائیت" موجود ہے جو درجہ بدرجہ پختگی کا رنگ اختیار کر کے بالآخر ایک مکتب فکر بنے گی۔ لیکن کونپل میں تناور درخت کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔

مجلس ادارت میں آپ نے ایک پورا جلسہ منعقد کر لیا ہے شاید ان سب کی نظرِ کرم سے نئی نسلیں بہتر پرورش پائیں گی۔ مضامین کا معیار بہت عمدہ ہے۔ افسانے ابھی ارتقائی حالت میں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ نئی نسلیں نے اب وہ ادبی بنیاد رکھ دی ہے جس پر اسلامی ادب کا قصر بلند ہو سکے گا۔ آپ کی تربیت اور مجلس ادارت کی سرپرستی میں انشاء اللہ نئی نسلیں پہلے سے بہتر نتائج دے سکے گا۔

سید اسعد گیلانی (لاہور)

رسالہ ماشاء اللہ ظاہری و معنوی اعتبار سے پسند آیا۔ پہلے اداریہ دیکھا۔ نہایت دلچسپ موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے۔ بڑے بڑے ادب کے سجادہ نشین و خرقہ پوش ان سطور پر چیں بجبیں ہوں گے۔ براہ کرم ایک ایک کاپی جملہ صدر شعبہ ہائے اردو کو بھی بھجوا دیں۔ بقول خواجہ میر درد

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

شمس الرحمٰن فاروقی والی بات مناسب ہے مگر وہ اتنی اہم نہیں تھی کہ اداریہ کا موضوع بنے۔ ماشاء اللہ آپ کی تحریروں میں خاصی رشید احمد صدیقیت آ گئی ہے۔

افسانوں کا معیار خاصا بہتر ہے اور تعمیری ادب کے اس کمزور پہلو کے بارے میں اب یہ امید ہو چلی ہے کہ انشاء اللہ صحت مند قدروں پر مشتمل اچھے افسانے عالم ظہور میں آ سکیں گے۔ شعریات کا پہلو کمزور ہے۔ آپ اس معاملے میں اپنے مقامی معاونین پر زیادہ اعتبار نہ کریں۔ بہتر ہے کہ اس میدان کو دوسرے آشفتہ سروں کے لئے چھوڑ دیں۔

پروفیسر شبنم سبحانی (سلطانپور)

جہاں تک "نئی نسلیں" کے تازہ شمارہ کا تعلق ہے، وہ بلاشبہ حسین و جمیل تخلیقات کا مرقع ہے۔ یہ نمبر خیال افروز مضامین، اپنے معیار، مطالعہ کے لئے جمع کئے ہوئے وقیع مواد اور دیگر کئی اعتبار سے ایک اہم ادبی دستاویز ہے، آپ نے رسالہ کی ترتیب و تہذیب کا جو مشکل ترین ذمہ اپنے سر لیا ہے یہ نمبر اس سلسلے کی اولین پیشکش ہے جس کے لئے آپ کی مساعیٔ جمیلہ لائق داد اور قابل صاد ہیں۔ یہ مسلّمہ امر ہے کہ نقش اول سے "فن کار" کا نقش ثانی بہتر ہوتا ہے۔ نئی نسلیں کے بارے میں بھی میں ایسا ہی سوچ رہا ہوں۔

"اپنی باتیں" کے تحت آپ نے جس دل سوزی کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے وہ ہر اہلِ نظر کے لئے غور طلب ہے۔ ماہنامہ "شانِ ہند" نئی دہلی نے بھی اپنے شمارہ بابتہ جون ۱۹۸۱ء میں اردو سے متعلق تلخ حقائق کو اپنے مخصوص اور کھرے انداز میں موضوعِ بحث بنایا ہے۔

عروج زیدی

اب راست انداز میں رسالے کے متعلق کچھ باتیں کر لی جائیں۔ آپ نے گفتگو اداریے سے شروع کرتے ہیں، میرے خیال میں یہی زیادہ مناسب بھی رہے گا۔ محترم ابن فرید صاحب نے اپنے دونیم

اداریے کے پہلے حصے میں بڑی جراٴت مندی کے ساتھ "ملازمانِ اردو" کی خبر لی ہے جس کا سبھی کو قائل ہونا پڑے گا لیکن میں بڑے ادب و احترام کے ساتھ اس سلسلے میں ابنِ فرید صاحب سے اختلاف کرنا چاہتا ہوں۔ ابن فرید صاحب نے بعض باتیں ایسی تحریر فرمائی ہیں جو بحث طلب ہیں اور جن سے اختلاف کی داخلی گنجائش موجود ہے۔

اگر ہم غیر جانب دار ہو کر اپنے زمانے کی عالمانہ اور دانشورانہ صورت حال کا جائزہ لیں تو اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہمارا عہد مجموعی طور پر علم و دانش کے زوال کا عہد ہے۔ اس کا ایک بنیادی سبب ہمارا موجودہ نظام تعلیم بھی ہے جس میں علم حاصل کرنا مقصود بالذات نہیں ہوتا بلکہ اس کے وسیلے سے معاشی حالت بہتر بنانا مطمح نظر ہوتا ہے۔ فی زمانہ صرف اردو زبان و ادب کی درس و تدریس میں ہی نہیں بلکہ دوسرے علوم کی تدریس میں بھی زوال آیا ہے۔ ابنِ فرید صاحب کا یہ فرمانا کہ گذشتہ تیس برسوں میں اردو زبان و ادب کو موضوعِ مطالعہ کے طور پر منتخب کرنے والے ناکام لوگ تھے جن کو شعبہ جات اردو سے متعلق افراد اپنی روٹی روزی کے تحفظ کی خاطر گھیر گھار کر داخلے دلاتے رہے میرے نزدیک مناسب نہیں۔ جہاں تک اچھے اور برے طالب علموں کا سوال ہے تو وہ کہاں نہیں پائے جاتے؟ کیا دوسرے علوم کی درس و تدریس سے متعلق تمام اساتذہ اور طلبا اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں؟ کیا وہاں غبی اور اوسط درجے کی ذہنی صلاحیت رکھنے والے اساتذہ اور طلبا نہیں پائے جاتے؟ ان سوالات کا جواب اگر نفی میں ہے (جو یقیناً نہیں ہو سکتا) تب ابن فرید صاحب کا ارشاد بجا ہے لیکن اگر اثبات میں ہے تو پھر صرف "اردو والوں" پر یہ لعن طعن کیسی؟ میں زیادہ پرانی بات تو نہیں جانتا البتہ گذشتہ دس بارہ سالوں کے بارے میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اردو پڑھنے والوں کی ایک خاصی بڑی تعداد ایسی رہی ہے جو کسی بھی موضوع کا مطالعہ کے لیے انتخاب کرنے کے بعد بہترین ذہنی صلاحیت کا مظاہرہ کرنے پر قادر تھے اور میں محترم ابن فرید صاحب کی خدمت میں بڑے احترام کے ساتھ عرض کرنا چاہوں گا کہ "ہام دہم) اردو والے" لاکھ کودن" سہی لیکن ان "گدھوں" سے بدرجہا بہتر ہیں جو محض اس خوف سے اردو نہیں پڑھتے کہ اس سے وابستہ ہو جانے کے بعد معاشی طور پر آسودہ ہونے کے امکانات کم سے کم ہیں۔ رہا سوال اس کا کہ شعبہ جاتِ اردو سے متعلق افراد (ملازمانِ اردو) نے کوئی نمایاں کارنامہ انجام نہیں دیا" اور وہ اپنے وقت کا صحیح استعمال نہیں کر سکے اور صرف مناصب حاصل کرنے میں لگے رہے تو جناب ذرا آپ ہی بتائیے کہ یہ سب کس شعبہ میں نہیں ہوتا؟ اگر اس کی کوئی مثال ابن فرید صاحب پیش فرمائیں تو میں ان کا ممنونِ احسان ہوں گا ——— اس مسئلے کا ایک دوسرا رخ بھی ہے اور وہ یہ کہ جو لوگ شعبہ جاتِ اردو سے وابستہ افراد کے ناکارہ ہونے کا شکوہ کرتے ہیں وہ بذاتِ خود جب کبھی شہرت کا ذائقہ چکھنا چاہتے ہیں تب ہماری اردو کی طرف ہی متوجہ ہوتے ہیں۔ ایسے تمام حضرات سے میں بڑے ادب کے ساتھ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ وہ خود جن علوم سے وابستہ ہیں ان میں انھوں نے کون سے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں؟ اور وہاں ان کی کیا حیثیت ہے؟ ان کی جو کچھ بھی عزت یا شہرت رہی ہے وہ اردو ہی کی بدولت ہے اور اردو والوں ہی کی دکھائی ہوئی ہے ——— حالت یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے بارے میں تحقیق کی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ آپ کا اصل موضوع تو کچھ اور ہے جس کے ادنیٰ ماہرین تک آپ کے نام نامی سے واقف نہیں اور شہرت اردو میں شاعری کر کے، افسانے یا تنقید لکھ کر کماتے ہیں۔ جناب! اگر اردو والے اپنے پیشے سے وفادار نہیں تو آپ تو اپنے پیشے کے وفادار بن کر ایک اچھی مثال قائم کیجیے آپ "ملازمانِ اردو" کی صحبت بد کا اثر کیوں قبول کرتے ہیں۔ اب رہا سوال "زرد" اور "سرخ" رنگ کی حمایت یا مخالفت کا تو یہ تو اپنی اپنی پسند اور ناپسند کا مسئلہ ہے ——— کوئی اپنے لئے "زرد" رنگ کا انتخاب کرتا ہے، کسی کو "سرخ" رنگ پسند ہے اور کسی کو "کالا" یا "سبز" رنگ مرغوب ہے۔ رنگوں کا انتخاب کسی کی بھی رسوائی کا سبب بن سکتا ہے ——— ویسے تو یہ تمام لوگ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے معلوم ہوتے ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے تبادلے کے سلسلے میں ابن فرید صاحب نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے میں اس کی تائید کرتا ہوں اور ابنِ فرید صاحب کو مبارک باد دیتا ہوں کہ انھوں نے اس اہم مسئلے کی طرف توجہ دی۔

اداریئے کے متعلق میرے خیال میں اسی قدر کافی ہے۔ اب آیئے مضامین کا جائزہ لیں۔ مضامین میں بھی اتفاق سے پہلا مضمون ابنِ فرید صاحب ہی کا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ ان کی تقریر ہے جسے ٹیپ کی مدد سے مضمون کی شکل دی گئی ہے۔ اسی وجہ سے اس میں مضمون کی شان پیدا نہیں ہو سکی۔

مضمون کے عنوان (اردو نثر اور اس کا تعمیری نصب العین) اور اس کے بعد تمہیدی حصے کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابنِ فرید صاحب "مذہبی علمی نثر" کی اہمیت کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں اور اس قسم کی نثری تحریروں کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ مضمون کا آغاز ان جملوں سے ہوتا ہے۔

"اردو نثر جب سے ضبط تحریر میں آئی ہے اس وقت سے اب تک اس کا غالب سرمایہ تبلیغِ اسلام یا فروغِ دینِ اسلام سے متعلق رہا ہے۔"

یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے اس ضمن میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، شاہ میرانجی اور شاہ عبدالعزیز اور دوسرے حضرات کے جو حوالے دیئے گئے ہیں وہ بھی بجا ہیں۔ آگے چل کر ابن فرید صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس تمہید کی روشنی میں اردو نثر کے بارے میں پورے اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے تشکیلی دور سے ہی اس کے سامنے ایک تعمیری نصب العین رہا ہے اور اس نے ہر دور میں بڑے وسیع پیمانے پر تعمیری خدمات انجام دی ہیں۔"

ان جملوں سے ایسا لگتا ہے کہ فاضل مضمون نگار نثر کے تعمیری نصب العین سے مراد تبلیغ دین کے لئے اس کے استعمال سے لیتے ہیں اس لئے کہ اب تک جو بھی گفتگو کی گئی ہے وہ مذہبی علمی نثر کے حوالے سے ہی کی گئی ہے۔ آگے چل کر وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"نثری اور تعمیری نصب العین سے میرا مقصد یہ ہے کہ تحریر خواہ کسی بھی نوعیت کی ہو اور اس سے چاہے ہمیں نظریاتی اختلاف یا اتفاق ہو اس میں ایک نصب العین بہرصورت مستور ہوتا ہے"

ان سطور تک پہنچتے پہنچتے اس خیال کو مزید تقویت ملتی ہے کہ فاضل مضمون نگار نثر کے مقصدی ہونے کے قائل ہیں اور تعمیری نصب العین سے مراد کسی نظریہ کی پیشکش سے لیتے ہیں لیکن جب وہ یہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"چنانچہ نثر کی تعمیری خدمات اگر کچھ ہو سکتی ہیں تو وہ تنظیم و تہذیب و حسن کاری و نزہت ہو سکتی ہے جس سے آراستہ ہو کر اگر کوئی تخلیق ہمارے سامنے آئے تو ہم واقعتاً اسے ادب پارہ قرار دے سکیں۔"

تو معاملہ ذرا پیچیدہ ہو جاتا ہے اس لئے کہ اب تک جو کچھ بھی گفتگو ہوئی وہ مذہبی علمی نثر کے حوالے سے ہوئی لیکن اس جگہ پہنچ کر گفتگو کا رخ تخلیقی یا ادبی نثر کی طرف مڑ جاتا ہے اور فاضل مضمون نگار نے تعمیری نصب العین کا جو مفہوم شروع میں متعین کیا تھا وہ بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ اس ضمن میں جو مثالیں پیش کی گئی ہیں وہ انیس اور دبیر کی ہیں ظاہر ہے ان دونوں باکمالوں کے تمام تر کارنامے شاعری کے ذیل میں آتے ہیں ان دونوں شاعروں کی مثال یہاں کچھ بے جوڑ سی معلوم ہوتی ہے اس کے فوراً بعد حالی، شبلی اور مولانا مودودی کی نثر کی مثال پیش کی گئی ہے۔ (حالی کے مقدمہ شعر و شاعری، شبلی کی تصنیف سیرت النبیؐ اور مولانا مودودی کی تفہیم القرآن کے درمیان تعمیری کوئی رشتہ قائم کرنے سے قاصر ہوں) میرا خیال ہے کہ آپ نے یہ مضمون چھاپنے سے قبل ابنِ فرید صاحب کو نہیں دکھایا ورنہ اس کی شکل یقیناً تھوڑی مختلف ہوتی۔

انور صدیقی صاحب کے مضمون (ادب میں انحطاط کا مفہوم) کا عنوان بہت اچھا اور چونکانے والا ہے۔ یہ مضمون معلوماتی ضرور ہے لیکن عنوان پڑھنے کے بعد جو توقعات دل میں پیدا ہوتی ہیں وہ پوری نہیں ہو پاتیں۔ یہ مضمون بعض تاریخی حقائق کی مدد سے لکھا گیا ہے لیکن اس میں کوئی گہرائی پیدا نہیں ہو پائی۔ یہ کہنا کہ

"ادب میں انحطاط یا ادب میں صحت مندی تہذیب کی صحت مندی یا انحطاط کی جانب اشارے کرتی ہے۔"

ادبی نقطۂ نظر سے غلط ہے۔ جب ہم ادب میں انحطاط کی بات کرتے ہیں تو اس لفظ کے معنی وہ نہیں ہوتے جو اخلاقیات یا مذہب مراد...

لیتا ہے۔ ادب میں انحطاط کے معنی بالکل مختلف ہیں۔ کسی فن پارے میں کس قسم کی اخلاقیات کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ ادب کا مسئلہ نہیں۔ ادب تو صرف یہ دیکھتا ہے کہ کسی فن پارے میں فنی اور ادبی قدروں کا کس حد تک پاس رکھا گیا ہے اور یہ کہ اس نے ایک اچھے فن پارے کی شکل اختیار کی یا نہیں؟ بہت ممکن ہے کہ تہذیب کے عین عروج میں حد درجہ معمولی اور گھٹیا فن پارے وجود میں آئیں اور ایک زوال آمادہ تہذیب کے پروردہ فن کار بہت اچھا ادب تخلیق کریں ـــــ اور یہی بیشتر ہوا بھی ہے ـــــ دنیا کے بہترین ادب کا غالب حصہ تہذیبی انتشار اور پامالی کے زمانے ہی میں پیدا ہوا ـــــ اس کی مثال اردو ادب سے بھی دی جا سکتی ہے لیکن اسے جانے دیجئے فرانس ہی کو لیجئے (جس کا حوالہ انور صدیقی صاحب نے بھی دیا ہے) اس کا بہترین ادبی سرمایہ ہیجان پرور دور کا علیہ ہے۔ فرانس میں خود کو "زوال پسند" کہنے والے ادبا اور شعرا درحقیقت عام اور سطحی معنوں میں زوال پسند نہیں تھے بلکہ یہ ان لوگوں پر ایک طرح کا طنز تھا جو زوال آمادہ ہوتے ہوئے بھی خود کو زوال آمادہ ماننے کیلئے تیار نہیں تھے (اس بات کی طرف فاضل مضمون نگار نے بھی اشارہ کیا ہے۔)

میراجی کے متعلق یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ انھوں نے شاعری اور زندگی دونوں میں فرانسیسی شعرا کی کورانہ تقلید کی اس خیال کو فرانسیسی شعرا سے میراجی کی غیر معمولی دلچسپی سے تقویت بھی ملتی ہے۔ لیکن اگر حسن ظن سے کام لیتے ہوئے سوچا جائے تو یہ بھی ممکن ہے کہ میراجی اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے فرانسیسی شعرا کی طرف متوجہ ہوئے ہوں اور اس میں تقلید کے بجائے ایک طرح کی ذہنی ہم آہنگی اور رفاقت فرانسیسی شعرا سے ان کی دلچسپی کا سبب بنی ہو۔ یہاں ایک بات اور بھی قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ کہ "بودلیئر" اور "ایڈگر ایلن پو" پر میراجی نے جو مضامین لکھے ہیں ان کے مطالعہ کے بعد کہیں یہ تاثر قائم نہیں ہوتا کہ میراجی ان کی ذاتی زندگی کی "خباثتوں" کو ہمدردی سے دیکھ رہے ہیں بلکہ اگر دیکھا جائے تو یہ مضامین ایک طرح کے SELF CRITICISM کی اچھی مثال بنتے ہیں۔

اس موضوع پر اخلاقیات سے دامن چھڑا کر خالص ادبی نقطۂ نظر سے ایک مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ کام ذرا ٹیڑھا ہے اس لئے اگر اس کا ذمہ انور صدیقی صاحب ہی لیں تو اچھا ہے۔ ویسے اس شمارہ کا سب سے بہتر مضمون انور صدیقی صاحب ہی کا ہے آپ ان سے برابر لکھوانے کی کوشش کیجئے۔

محسن انصاری صاحب کا مضمون (شعر و ادب میں بے یقینی) ہزار کوشش کے باوجود پورا نہیں پڑھ سکا۔ اس لئے اظہار رائے سے بھی قاصر ہوں ویسے ایک گذارش ہے کہ براہ کرم اس قسم کے کمزور مضامین سے رسالے کو اگر پاک رکھیں تو زیادہ بہتر ہے۔

خط لکھنے بیٹھا تھا لیکن اب پتہ چلا کہ یہ تو چھوٹا موٹا مضمون تیار ہو گیا ـــــ معاف کیجئے گا ـــــ لیکن اب زیادہ کچھ لکھنا بھی نہیں ہے۔ شاعری کے متعلق تو بس اسی قدر عرض ہے کہ بہت کمزور ہے۔ اکا دکا شعر بھی اچھا تلاش نہیں کر سکا۔ فی زمانہ کاغذ کافی گراں ہے اس قدر کمزور شاعری چھاپنے سے نہ چھاپنا بہتر ہے۔ ویسے بھی ہم لوگوں کو خدائے بزرگ و برتر نے اسراف سے منع فرمایا ہے۔

افسانوں میں آپ کا افسانہ (آخری لمحہ کا منظر) کئی کہانیوں کا مرکب معلوم ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ کے ذہن میں کئی کہانیاں موجود تھیں جن میں سے کوئی بھی بلوغت کی منزل کو نہیں پہنچ سکی اور جب یہ تمام کہانیاں ایک مرکب کی شکل میں نمودار ہوئیں تو ایک انشائیہ نما شئے وجود میں آگئی جسے نہ تو کہانی کہا جا سکتا ہے اور نہ انشائیہ میری ذاتی رائے ہے کہ آپ اس مرکب کو اگر دوبارہ لکھیں تو شاید کوئی بہتر تخلیق وجود میں آ سکے۔

مسرور جہاں اور احمد یوسف کے افسانے (مٹی کا مول اور اترتی چڑھتی زلفیں) ٹھیک ٹھاک ہیں لیکن بارغہ تبسم کا افسانہ ختم کرنے کے بعد مایوسی ہوئی۔ کہانی شروع کرنے کے بعد اچھے انجام کی توقع بندھتی ہے لیکن انجام تک پہنچتے پہنچتے مایوسی کا شکار ہونا پڑتا ہے۔

آخیر میں م۔ نسیم صاحب کے سفرنامے (نئی دنیا کی کھوج میں) کا ذکر خصوصیت سے کرنا چاہتا ہوں جو بہت خوبصورت ہے اس سلسلے کو جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ ان سے میری طرف سے گذارش کیجئے کہ طنزیہ اور مزاحیہ مضامین لکھنے کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں ـــــ [illegible] (جہلم)

نئی نسلیں کا پچھلا شمارہ زیر مطالعہ ہے ۔ اداریہ 'اپنی باتیں'
بہت اچھا لگا خاص کر یہ جملے :-

"یہ ملازمان اردو، بالعموم اپنے اختیارات کو استعمال
کرنے میں بڑے مستعد ہوتے ہیں ۔ ان کی نظر اس پہلو پر نہیں
ہوتی کہ ادب سے کس کو دلچسپی ہے ۔ کون سنجیدگی کے ساتھ
اسے اپنا وقت دیتا ہے ۔ کس نے اپنی صلاحیتوں کو اس
کی خدمت کے لئے صرف کیا ہے ۔ ان کے پیش نظر تو صرف
یہ امور ہوتے ہیں کہ کون ادب کے بجائے ان کی حمایت
کرتا ہے .... کون ان کو ادب کا کوہ گراں قرار دیتا ہے ۔"

"اترتی چڑھتی رونقیں" احمد یوسف کی یہ کہانی وہی پرانی گرتی
دیواروں کی کہانی ہے ۔ کیا ہم اپنے افسانوں کو ہاتھ سے پھسل جانے
والی جاگیروں اور بٹوارے کے المیوں سے نجات نہیں دلا سکتے ؟
آخر کب تک یہ ماتم ۔ اب تو اردو کہانی کو BLAST FURNACE کی
پگھلا دینے والی گرمی کا سامنا کرنا چاہئے ۔ سگریٹ کو انھوں نے تذکیر لکھا
ہے ۔ انگریزی الفاظ کے لئے تذکیر و تانیث کی رعایت ملنی ہی چاہئے ۔ مگر
عام طور پر سگریٹ جلتی بجھتی ہے ۔ جلتا بجھتا نہیں ہے ۔ احمد یوسف
ذہنی طور پر خود کو ماضی سے الگ نہیں کر پائے ہیں ۔ لہٰذا ایک نوکر
کا اپنے نام کے آگے سید لگا لینا یا خود کو مالک (سرکار) کا دوست
بتانا ہمارے سماج کا زبردست المیہ ہے (احمد یوسف کے لئے) اور
یہ المیہ ان کو افسانے لکھنے پر مجبور کرتا ہے ۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ محرومی
تاریخی اور سماجی حقیقتیں نہیں ہیں اور اس پر افسانے نہیں لکھے جا سکتے
مگر اردو کہانیوں کا اس موضوع سے چپک جانا اردو کہانیوں کی ترقی
کو روک دینے کے مترادف ہے ۔ اب تو خواتین افسانہ نگار بھی ایسے
موضوعات سے کتراتی ہیں ۔ حیرت احمد یوسف پر ہے ۔ کہانی "آخری
لمحہ کا منظر" اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ احمد یوسف کے بعد کی
پیڑھی 'بڑے سرکار' 'باحضور' کو پس پشت ڈال کر نئی جہتیں
تلاش کر رہی ہے ۔ مسرور جہاں کی کہانی بھی وہی مہاجروں کی
کہانی ہے ۔ صرف اتنا ہی نہیں بہت سپاٹ بھی ہے ۔ وہ ایک
چھوٹی سی بات بھی اچھی کہانی ہے ۔ اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں
کہ "بڑے نام" معمولی کہانیاں لکھ رہے ہیں ۔

مخلص انیس رفیع (کلکتہ)

نئی ادبی مطبوعات

نام کتاب : **خوشۂ گندم**
نام مصنف : بیگ احساس
قیمت : ۱۲ روپے
ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، بمبئی، علی گڑھ

خوشۂ گندم بیگ احساس کی بارہ کہانیوں کا پہلا مجموعہ ہے جس کا پیش لفظ اقبال متین نے اور تعارف گیان چند جین اور رام لعل نے تحریر کئے ہیں۔ اور ان تینوں حضرات نے یہ توقع ظاہر کی ہے کہ بیگ احساس چونکہ کہانی لکھنے کے فن سے واقف ہیں للٰہذا آئندہ ان سے بہت ساری امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

۷۰ء کے بعد ابھر کر سامنے آنے والے افسانہ نگاروں کے بیشتر نام نظروں کے سامنے کسی نہ کسی نوعیت سے اپنے وجود کا احساس تو دلاتے رہے ہیں لیکن ان کا المیہ یہ رہا ہے کہ ان کا شاید ہی کوئی افسانہ قاری کے ذہن میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوا ہو اس کی بڑی وجہ ان کی تجربہ باتی جرأتیں ہیں جو گونگی بہری کہانیوں کے ردعمل کی صورت میں سامنے آئی ہیں۔ اقبال متین صاحب کا خیال ہے کہ بیگ احساس اس قبیلے سے اپنا دامن بچا کر لکھتے رہے ہیں۔

حسن و عشق اور جنسیات کے موضوع پر رنگین زبان اور دلکش انداز بیان میں موثر افسانے لکھ کر بے شک بیگ احساس نے ان نئی نسل کے افسانہ نگاروں سے خود کو دور رکھا ہے مستقبل میں ان سے مزید اسی دوری کی امید کی جا سکتی ہے جو حسن و عشق اور جنسیات سے ہوتی ہوئی سماجی شعور اور انسانی نفسیات کے مطالعہ تک پہنچی ہے۔

لیتھو پر چھپی ہوئی ۱۶۰ صفحہ کی ۲۰×۳۰/۱۶ سائز پر یہ کتاب بارہ روپے میں اردو افسانے کے قارئین کے لئے یقیناً مہنگی ہے، جبکہ اس مجموعے کی طباعت میں اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کا مالی اشتراک شامل رہا ہے۔ امید ہے اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں اس کا خیال رکھا جائے گا۔

(انجم نعیم)

ماہنامہ : **مفاہیم**
مرتب : سرور عثمانی
قیمت : ۳۵ روپے
ملنے کا پتہ : اثر پبلی کیشنز، کریم گنج، گیا۔ بہار

سر زمین گیا سے ماہنامہ ندیم اور سہیل جیسے مشہور و معروف رسالے نکلتے رہے ہیں، (سہیل تو اب بھی نکلتا ہے لیکن اب نہ مشہور ہے نہ معروف) پچھلے دو سالوں سے سرور عثمانی صاحب ماہنامہ "مفاہیم" نکالنے کی جرأت کر رہے ہیں اور سب سے خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ اس مختصر مدت میں تقریباً ساڑھے تین سو صفحات کا 'جدید کہانی نمبر' اور اتنے ہی صفحات کے ۱۹۸۰ ادب نمبر قارئین کی خدمت میں پیش کر چکے ہیں۔ ان کے حسن ذوق کو دیکھتے ہوئے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ مستقبل میں بھی اپنے پروگرام کے مطابق پڑھنے والوں کو بہترین مواد فراہم کرتے رہیں گے۔

مرتب نے ادب کی بیشتر مروج اصناف پر تخلیقات یکجا کر دینے کی کوشش کی ہے۔ شروع میں پانچ مکمل کتابیں ہیں، پہلی کتاب 'وزیر آغا' کی مشہور نظم 'آدھی صدی کے بعد' ہے اس کے بعد حسین الحق کا جدید

بقیہ صد ۴۳ پر

Numainda

NAI NASLEN, Monthly

2448 Ballimaran Delhi 110006

Registered with Registrar of Newspapers No.

Regn. No.

خالدہ

ترتیب

ابن فرید
انجم نعیم

۱۱

بارہ شمارے : ۳۰ روپے   ایک شمارہ : تین روپے

اڈیٹر پرنٹر پبلشر
م. نسیم
۴۲ بارہ دری شیر افگن
بلیماران دہلی ۱۱۰۰۰۶

دارالطبع
دفتر نمائندہ نئی نسلیں شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

ترتیب

دوسرا سال چوتھا شمارہ — نومبر، دسمبر، جنوری، فروری ۱۹۸۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اپنی باتیں

۱ تصنیفی و تحقیقی کام کی ہمت افزائی کے پس پشت محرک یہ رہا ہے کہ باصلاحیت اہل قلم اور اہل فکر کو ان کی محنت و خدمت کا جائز حق فراہم کیا جائے لیکن ہمارا کمال یہ ہے کہ ہم ہر رکاوٹ کو عبور کرنے کا راستہ تلاش کر لیتے ہیں۔ اگر ہم سدِ راہ کو اس کے اوپر سے کود کر پار نہیں کر سکتے تو اس کے نیچے سے سیٹ کر رینگ کر نکل جاتے ہیں۔ ہمارے بہت سے علمی ادبی کاموں کی نوعیت کچھ موخر الذکر انداز کی ہی ہے۔ ملازمتوں میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کام کس معیار کا ہے بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ مقدار میں کتنا ہے۔ وظائف کے لئے طلبا نے تحقیق بھی مجبور ہوتے ہیں کہ وہ اپنی مطبوعات کی تعداد بڑھائیں نہ کہ اپنی نگارشات کے معیار کو بلند کریں کیونکہ موخر الذکر کام میں ان کا مالی مادی خسارہ ہے۔ یہ روش آج کل ہمارے ملک کے ہر شعبۂ علم میں عام ہے۔ بعض اوقات تو یہ تجربہ بھی کیا گیا کہ کسی نے کسی کا تحقیقی مقالہ اڑا لیا، کسی نے کسی کا مضمون سرقہ کر لیا، کسی نے کسی کی تحقیق کو اپنا کارنامہ بنا کر پیش کر دیا۔ غرض یہ میدان حشر ایسا ہے کہ اس میں اہل اردو بھی اپنا دامن نہ بچا سکے۔

یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ میری نظر میں اس خرابی کا اصل سبب علم و ادب کو تجارتی بنا دینا ہے۔ ادب ایک مال ہے جسے حسب ضرورت خریدا اور فروخت کیا جا سکتا ہے۔ لکھنے والا جتنا زیادہ لکھے گا، جتنا زیادہ چھپے گا اور جتنی زیادہ اس کی تشہیر ہوگی یا اس کا اشتہار چھاپا جائے گا وہ اتنا ہی بڑا فنکار اور صاحب قلم ہوگا۔

ہمارے زمانے میں پروپیگنڈا بڑا ترقی یافتہ فن ہے۔ اس کے لئے انتہائی اعلیٰ اور موثر تکنیکیں ایجاد ہو چکی ہیں۔ ہم نے ادب میں بھی ان سے خاصا فائدہ اٹھایا ہے۔ ہم ان سارے وسائل کو استعمال کر رہے ہیں جو ہماری تشہیر کو موثر ترین بنا سکیں۔ مثلاً ہم نے انتہائی بکواس کتاب لکھی، فائدہ کی لالچ دے کر اچھے سے پبلشر سے چھپوائی، سمینار، تہنیتی، مجلس تقریرات کی رنگینیت کی تشویق دلا کر مبالغہ آمیز تقریظیں یا رائیں لکھوائیں، مضامین میں اس کتاب کا ذکر ہوا، نصاب میں اسے شامل کیا گیا، انعامات کا مستحق اسے قرار دیا گیا۔ انجام کار اس نوعیت کی کتابیں بڑی مشہور ہوتی ہیں اور ہر ایک کی زبان پر ان کا نام ہوتا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ اہل نظر اندھے نہیں ہوتے۔ اس سلسلہ میں میں یہ عرض کروں گا کہ گوئبلز نے جھوٹ کے بارے میں بڑی سچی بات کہی ہے: "جھوٹ کو اتنی بار دہراؤ کہ وہ سچ ہو جائے"۔ مشہور ماہر نفسیات سر سرل برٹ نے نفسیات کے ساتھ اسی جھوٹ کو آزمایا تھا۔ اس کی زندگی میں کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ کوئی یہ کہہ سکے وہ ساری تحقیقات اپنی مطالعہ کی میز پر ہی کر لیا کرتا ہے۔ اپنی ادبی دنیا میں بھی ایسے سرل برٹ اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کی نشاندہی کرنے کی کوئی بھی ہمت نہیں کر سکتا، اور اگر ایسا کرے گا تو؟ —— دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔

بہت سے محققین کے حوالے دوسروں سے مستعار لئے جاتے ہیں، بہت سے ناقدین مصنفوں اور کتابوں کے نام یہاں تک کہ نظریات کے بارے میں علم بالواسطہ حاصل کر لیتے ہیں مگر ان کے تبحرِ علمی پر علم نہیں آتا۔ چراغ سے چراغ جلانا اچھی بات ہے،

لیکن دوسروں کے چراغ چرانا بری حرکت ہے۔ نقلی یا جعلی مال بازار میں سستا بکتا ہے۔ اس میں منافع کی گنجائش بھی خاصی ہوتی ہے مگر اس سے بازار کا اعتبار بھی گھٹ جاتا ہے یا ختم ہو جاتا ہے۔

اس سوال کا جواب کہ اعلیٰ معیاری ادب کیوں عالم وجود میں نہیں آرہا ہے، کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہماری علمی و ادبی دنیا میں گھٹیا مال والے بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ایک صحیح جملہ نہیں لکھ سکتا، ایک صحیح املا نہیں لکھ سکتا۔ ایک موزوں شعر نہیں پڑھ سکتا، ایک صحیح اردو نہیں بول سکتا۔ مگر اپنے سر رشتہ کا پیر مغاں وہی ہے کیوں کہ اس کے پاس سند اختیار ہے۔ اس نے طویل عرصہ اردو کی ملازمت کی ہے اور اپنے نام سے اردو میں کچھ نہ کچھ چھپوا بھی رکھا ہے۔ بنیادی تقاضے اس طرح پورے ہو جاتے ہیں۔ اب کمی کس چیز کی ہے!

اس صورت حال کا مداوا کیا ہے؟ اس کے علاوہ کچھ اور نہیں کہ ہم اپنی اخلاقی حس کو زندہ کریں۔ اپنے مادی اور ذاتی مفادات پر اردو کو قربان نہ کریں۔

ہم مانتے ہیں ادب کو اولاً اور اصلاً ادب ہونا چاہئے۔ لیکن اگر یہ اخلاقی اقدار سے تہی ہو جائے تو ہر مرحلہ پر خسارہ کا نشانہ بنتا ہے۔

ابن فرید

---

۲ اخبارات کے ذریعہ یہ معلوم ہوا کہ اس بار اردو کی کسی کتاب کو ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ نہیں مل سکا۔ گویا کمیٹی کے ممبران نے کسی مصنف کو اس لائق نہیں سمجھا کہ اس کی تصنیف کو اس "عظیم انعام" سے نوازہ جائے۔ اور شاید اس کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ آپسی عدم اتفاق نے کسی فیصلہ تک پہنچنے سے باز رکھا۔ ورنہ کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ گذشتہ تین سالوں میں اردو ادب اس قدر تہی دامنی کا شکار رہا ہو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پچھلے تین سالوں میں صف اوّل کے تقریباً سبھی افسانہ نگاروں، شاعروں اور ناقدوں کی بڑی اچھی تصنیفات منظر عام پر آئی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اچھی کتابوں کی عدم اشاعت کا بھی رونا نہیں رویا جا سکتا تھا۔ یہ قاعدہ یہ ہے کہ تین ممبران میں سے اگر دو ممبران بھی کسی ایک کتاب پر اتفاق کریں تو وہ کتاب انعام کے قابل سمجھی جاتی ہے لیکن اگر ہر ممبر اس نام پر اڑا رہے جو اپنی جیب میں لے کر گیا ہے تو پھر نتیجہ وہی ہوتا ہے جو اس بار ہوا۔ اگر واقعی انعام کا طریقہ یہی ہے اور ایسی افسوسناک رویے کی وجہ سے اردو کتابیں ذاتی خواہشات کی نذر ہو جاتی ہیں تو یہ اردو مصنفین کی بدقسمتی نہیں بلکہ انعام دینے والوں کی بد توفیقی ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو لیکن حقیقت یہی ہے کہ انعام دینے والوں کی اپنی بدتوفیقی سے پانچویں یا چھٹی بار پھر ایوارڈ سے اردو والوں نے اردو کو محروم کر دیا۔

انجم نعیم

تمام ادارتی اور تنظیمی امور سے متعلق علی گڑھ کے پتہ پر رابطہ قائم کیجیے۔

(منیجر)

سیّد عبدالباری

اودھ کے نوابی عہد میں ادب، ثقافت اور معاشرہ

اودھ کی اخلاقی پستی کے واقعات اس میں شک نہیں کہ انگریزی دور کے مؤرخین نے بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیے ہیں اور اس سلسلے میں حکمرانوں کی ذاتی زندگی کو سند و دلیل کے طور پر پیش کیا ہے اور اس سے عام نتائج اخذ کیے ہیں۔ لیکن یہ اس دور کا نہایت ناقص اور یک رخا مطالعہ ہے۔ لکھنؤ کا عہد میں متداولہ علوم کے معاملہ میں اپنے نقطۂ عروج پر تھا فرنگی محل میں ملّا نظام الدین کا خاندان علم و فکر کی شمعیں روشن کر رہا تھا اور اسی لکھنؤ میں خاندان اجتہاد میں عالی دماغ لوگ پیدا ہو رہے تھے۔ ان علمی اداروں کی وجہ سے تعلیم یافتہ طبقہ کے علاوہ عوام بھی فلسفیانہ اصطلاحات اور منطقی اسلوب گفتگو کے عادی ہو گئے تھے فلسفہ و منطق کی گرم بازاری کا اثر اس عہد کے ادب پر بھی پڑا۔ چنانچہ تمثیلی انداز کی مقبولیت لکھنؤ میں منطق و فلسفہ کی مقبولیت اور تعلیم و تدریس میں اس کی عمومیت کی غماز ہے۔ چنانچہ عبدالسلام لاری اس صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں "یہ منطق و فلسفہ کی تعلیم کا دور شباب تھا اس لیے لوگ خواہ مخواہ اس دقیق و پیچیدہ مضمون آفرینی کی طرف مائل تھے جس میں ناسخ کو ید طولیٰ حاصل تھا اور جو شاعری سے زیادہ منطقیانہ دلائل سے مناسبت رکھتی تھی ... ناسخ اپنے زمانے میں حقارت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے بلکہ ان کی وجہ لکھنؤ کا رنگ دلی پر چھا گیا تھا"

لیکن یہ علمی ماحول بھی اس معاشرہ کے عام مزاج کے سانچے میں ڈھل گیا تھا۔ اس عہد میں علماء کی ساری پرواز منطق و فلسفہ، علم معانی و بیان اور ہیئت و نجوم میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔ علماء عوام کو اپنی علمیت سے مرعوب کر سکتے تھے مگر اپنی فکری تہی دامنی کے سبب پیش آمدہ معاشرتی و ثقافتی گتھیوں کو سلجھانے کی اہلیت نہ رکھتے تھے وہ عوام کی ذہنی و فکری قیادت سے کنارہ کش تھے اور اس عہد کے سیاسی و ثقافتی زوال کے تدارک کا کسی کے پاس کوئی نسخہ نہ تھا۔ فرنگی محل اور خاندان اجتہاد بھی لکھنؤ کے مخصوص مزاج کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور دیگر نمائشی اداروں کی طرح علمی طمطراق کے اظہار کی ایک علامت بن گئے تھے۔ علم بھی دیگر فنون کی طرح ایک فن تھا جس کو زیادہ سے زیادہ پیچیدہ و دقیق بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ افراد کے کردار میں وہ ثقافتی حرارت پیدا کرنے سے قاصر تھا جو سماج کو اپنے ماضی سے ورثہ

میں رہا تھا۔ یہ اقدار کی ہم آہنگی کا شعور اور اصول کے
لئے ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا کرنے سے عاری تھا
اس لئے منطقی لغت دان اور معانی و بیان میں مہارت
رکھنے والے تو بہت پیدا ہو رہے تھے لیکن لمحاتی
ہیجان و عارضی تحریکات کے بالمقابل اقدار و معیار
کی بالاتری کا پیغام دینے والے اور قدیم معاشرتی اقدار
کی ڈٹ کر وکالت و ترجمانی کرنے والے لوگ اس
حلقے میں خال خال تھے۔ چنانچہ اسی عہد کا علمی حلقہ
اس دور کی ثقافت کو توانا بنانے اور اس کے
صحت مند احتیار کی آبیاری کرنے کے بجائے اس کے
زوال و انتشار کو خاموش تماشائی کی حیثیت سے
دیکھ رہا تھا۔ یہی کیفیت اس عہد کے ادب سے بھی
مترشح ہوتی ہے جو صرف فارغ البال طبقہ کی ذہنی
آسودگی کا ایک سامان تھا۔ چنانچہ آل احمد سرور
لکھتے ہیں:

"لکھنؤ کی شاعری کی تمام اصناف سخن نے
فارغ البالی طبقہ کی علم تہذیبی قدروں کو ہر طرح باقی
رکھنے اور مستحکم بنانے کی سعی کی۔ غزلوں کے ذریعہ
ذہن کو بہلا کر مرثیہ کے ذریعہ خواب دکھا کر اور اچھی
اخلاقی قدروں سے زبانی ہمدردی کر کے پھر دونوں
میں نفیس، دلکش، مرصع، چست اور رچی ہوئی زبان
استعمال کر کے عام لوگوں کو اس نزاکت اور لطافت
کا عادی اور شیدا بنا دیا۔"[1]

اودھ میں انیسویں صدی کے وسط تک آتے
آتے ثقافتی اتھل پتھل کا عمل بہت تیز ہو گیا۔ خاص
طور پر غازی الدین حیدر کے زمانے سے یہ سلسلہ وسعت
اختیار کرتا گیا۔ غازی الدین حیدر انگریزی طرز
رہائش کے قدردان تھے۔ ان سے بر سر عام بہت
سی ایسی باتیں رو بہ ظہور آئیں جنکی وجہ سے پرانی
روایات اور عوامی طریقوں پر ضرب پہونچی نئی روایت
ایجاد کرنے میں خود دربار پیش پیش تھا

یہ نئی روایتیں اگرچہ مقبول عام نہ ہو سکیں لیکن ان کے
خلاف کوئی عوامی ردعمل بھی ظاہر نہ ہوا۔ غازی الدین
حیدر نے انگریز حکومت کو زرکثیر دے کر بادشاہت کا
لقب حاصل کیا اور انگریزوں ہی کی خوشنودی
کے لئے ایک یوروپین خاتون سے شادی کر لی۔ پھر
خورد و نوش رہن سہن اور زندگی کی روزانہ
کی استعمال کی چیزوں کے معاملہ میں انگریزوں کے ذوق
کی اتباع کرنے لگے۔ انکی خاص محل بادشاہ بیگم نے
مذہب میں نئی نئی بدعتیں داخل کیں۔ اور بقول شرر
انکی وجہ سے صرف اسی قدر نہیں ہوا کہ بادشاہوں اور
امیروں میں طرح طرح کی طفلانہ مزاجیاں پیدا ہو گئیں
بلکہ لکھنؤ کی شیعیت ساری دنیا کی شیعیت سے نرالی
ہو گئی۔ شرر لکھتے ہیں:-

"سب سے پہلے بیگم صاحبہ نے امام صاحب العصر کی چھٹی
کی رسم قرار دی جس میں اگر یہ ہوتا کہ کسی محفل میں امام
ممدوح کے حالات بیان کر کے ثواب حاصل کر لیا جاتا
تو مضائقہ نہ ہوتا مگر نہیں۔ یہاں ہندوؤں کے جنم اشٹمی
کے رسوم کے موافق بعینہ زچہ خانہ مرتب کیا جاتا۔ اس
کے بعد یہ ترقی ہوئی کہ صحیح النسب سیدوں کی خوبصورت لڑکیاں
لیکر ائمہ عشر کی بیبیاں قرار دی گئیں جن کا نام اچھوتیاں
رکھا گیا جب وہ اماموں کی بی بیاں تھیں تو پھر ان
کے وہاں اماموں کی ولادت بھی ہوئی اور بارہ اماموں
کی تقریبیں بڑے کروفر کے ساتھ منائی جانے لگیں"

اس کے بعد نصیر الدین حیدر کا عہد نئی رسموں اور
نئے نئے رواجوں کے نقطۂ نظر سے اور آگے نکل گیا
شرر اس عہد کے دربار کو طفلانہ مزاجی کا دربار قرار
دیتے ہیں۔ اس عہد کے پاس اقدار کا جو سرمایہ تھا وہ
اگرچہ اس کی اجازت نہ دیتا تھا کہ مرد عورتوں کے سب
عادات و اطوار لباس اور چال ڈھال اختیار کریں۔

---

[1] مسرت سے بصیرت تک: آل احمد سرور، مکتبہ جامعہ نئی دہلی

لیکن نصیر الدین حیدر کے اندر بقول شرر عورتوں میں
رہتے رہتے اس درجہ زنانہ مزاجی پیدا ہو گئی تھی کہ
عورتوں کی سی باتیں کرتے اور عورتوں ہی کا لباس پہنتے
زنانہ مزاجی کے ساتھ مذہبی عقیدت نے یہ رنگ اختیار کیا
کہ ائمہ اثنا عشر کی فرضی بیبیاں و چھوچھیاں اور ان کی
ولادت کی تقریبیں، جو ان کی ماں نے قائم کی تھیں انھوں نے
اور زیادہ ترقی دی یہاں تک کہ ائمہ کی ولادت کی تقریبوں
میں خود حاملہ عورت بن کر زچہ خانہ میں جا بیٹھتے اور چہرے
کی حرکات سے وضع حمل کی تکلیف ظاہر کرتے اور پھر
ایک فرضی بچہ جنتے وغیرہ وغیرہ۔ یہ تقریبیں اس قدر زیادہ
تھیں کہ سال بھر بادشاہ کو انہیں سے فرصت نہیں
ملتی۔ یہاں یہ بات دلچسپ نفسیاتی مطالعہ کا موضوع
ہو سکتی ہے کہ اس نسوانی مزاج کے باوجود وہ نہایت
ظالم بھی تھے اور ان کے مظالم کا شکار زیادہ تر عورتیں
ہوتی تھیں۔ اس عہد میں محل کی بیگمات کے اثرات
معاشرہ پر پڑنے لگے اور بادشاہ کے مندرجہ
بالا اطوار سے ماحول نے خاصا اثر قبول کر لیا۔ انھیں
اطوار کا نتیجہ تھا کہ واسوخت اور ریختی ترقی یافتہ
اصناف سخن کی حیثیت سے اس عہد میں ابھر کر سامنے
آئی۔

انیسویں صدی کے نصف اول میں اودھ میں انگریزوں
کا عمل دخل اگرچہ کافی بڑھ گیا تھا لیکن عوام انگریزی تمدن
کی فکری بنیادوں کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے
حکمرانوں کو بھی صرف انگریزی باجوں انگریزی طعام
شراب اور انگریزی فرنیچر اور سامان آرائش سے دلچسپی
تھی۔ کائنات کی تسخیر کا وہ ولولہ جس نے یورپ میں
سائنس کی انقلاب آفریں قوت کو جنم دیا تھا اور
جس طاقت کے بل بوتے پر انگریزوں نے ایشیا
کے شیشہ اقتدار کو پاش پاش کر دیا تھا۔ اس کی
جانب لوگوں کی توجہات نہیں تھیں۔ اودھ کے تعلیم
یافتہ طبقہ کے انداز فکر پر ابھی عقلیت کی شعاعیں
نہیں پڑی تھیں۔ عوام انگریزوں سے کچھ سیکھنا تو در
کنار ان کے سائے تک سے بدک رہے تھے۔
ان کی نگاہ میں انگریز کی حیثیت ایک غاصب و لٹیرے
کی تھی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندوستانیوں کے
سامنے اس عہد میں انگریزوں کے کردار کا نہایت
مکروہ اور بھیانک پہلو سامنے آیا تھا۔ اس وقت انگلینڈ
کے معاشرہ کا جو عنصر ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم ہو کر یہاں
آیا تھا وہ اپنی ملک و قوم کی بڑی بھیانک تصویر لوگوں
کے سامنے پیش کر رہا تھا۔ آزادی مساوات اور
لبرلزم کا درس دینے والی اور فطرت کے معصوم حسن
کی شیدا یہ قوم ہندوستان میں کچھ دوسری نفسیات
کے ساتھ آئی تھی اور انگلینڈ کے لٹیرے تاجروں
کی ایما پر کام کرنے والے پر فریب ایجنٹ سے زیادہ
ان کی کوئی حیثیت نہ تھی یہی وجہ ہے ہندوستان کے
عوام اور یہاں کے علماء و اہل نظر انگریز قوم کے اکتسابات
سے فیضیاب ہونے کے لئے تیار نہ تھے۔ پورے اودھ
میں کہیں انگریزی تعلیم کا کوئی ادارہ عالم ظہور میں نہ آیا
نہ انگریزوں کے ادب اور فکر کا ذخیرہ یہاں کی زبانوں
میں منتقل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس عہد میں
انگریزوں اور عیسائیوں سے ہندوستانیوں کی نفرت
کا یہ عالم تھا کہ انگریزی بینڈ باجے کو بجانے والے
مہتروں کے سوا کوئی اور نہ تھے۔ چنانچہ شرر[۵]
لکھتے ہیں۔

"یہ خالص انگریزوں کا لایا ہوا باجا ہے جو ان
سے پیشتر مطلق نہ تھا۔ لکھنؤ میں خدا جانے
کیوں اس کے بجانے والے صرف مہتر ہی
تھے۔ جو پائخانہ صاف کرنے کے علاوہ
اس کام کو بھی کرتے ہیں۔ غالباً اس کی وجہ

---

۵ گذشتہ لکھنؤ۔ عبدالحلیم شرر۔ نسیم بکڈپو لکھنؤ۔ ص ۲۲۶

یہ ہو کہ ابتداً ہندو مسلمان گروہوں کو عیسائیوں سے ایسی سوشل نفرت تھی کہ اگر وہ کسی برتن کو ہاتھ لگا دیتے تو ہمیشہ کے لئے اچھوت ہو جاتا اور اس باجا کو انگریز سے سیکھنا اور اسے اپنے منہ لگانا پڑتا اس لئے سوا جہتروں کے اور کسی کو اس کے اختیار کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

انگریزی سرمایہ فکر و تہذیب سے یہ وحشت و تنفر عام تھا ایسی حالت میں انگریزوں کے فکر اور ادب کے وہ اثرات جو سرسید کے عہد میں اردو ادب پر مرتب ہوئے اس عہد میں ان کی کہیں دور دور کوئی پرچھائی محسوس نہیں ہوتی۔ سائنس کی صداقتوں اور کائنات کی بسیط حقیقتوں کی طرف کون توجہ کرتا۔ یہاں تفریحی مشاغل کی کثرت کے سبب فرد کو اس کی فرصت میسر نہ تھی کہ وہ خود اپنے سرمایہ اقدار اور معیارات و تصورات کے ورثہ کی گہرائیوں میں اتر کر دیکھے کہ وہ ان پر کس حد تک اپنے مستقبل کی عمارت تعمیر کر سکتا ہے۔ یورپ کے صنعتی کارناموں اور مادی اکتشافات کا بہت کم لوگوں کو علم تھا۔ یہاں قوت عمل اور قوت غور و فکر اس قدر مفقود تھی کہ روحانی و مذہبی اقدار پر قصص و روایات، توہمات و تقلید جامد کا غبار جم گیا تھا اور اس کو صاف کرنے کا کسی کے اندر داعیہ پیدا نہ ہوتا تھا۔

اس عہد میں انیسویں صدی کے وسط میں ہندوستان کے فکری انتشار کو بڑھانے اور اس کو اپنے عقیدہ سے برگشتہ بنانے کے لئے نیز اس کی غربت و پریشان حالی سے فائدہ اٹھانے کے لئے عیسائی مشنریاں بھی پوری طرح سرگرم عمل تھیں۔ وہ خصوصیت کے ساتھ اسلام کے خلاف کیچڑ اچھال رہی تھیں انیسویں صدی اسی اعتبار سے ہندوستانیوں کی تاریخ میں اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں پہلی بار ہندوستان میں اسلام کو ایک زبردست نظریاتی چیلنج کا سامنا کرنا پڑا چنانچہ مولانا حالی "حیات جاوید" میں لکھتے ہیں:

"اس وقت ہندوستان میں اسلام تین خطروں میں گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف مشنری اس کی گھات میں لگے ہوئے تھے سب سے زیادہ ان کا دانت مسلمانوں پر تھا ان کی منادیوں میں اخباروں میں اور رسالوں میں زیادہ تر لے دے اسلام پر ہوتی تھی۔ اس کی برائیاں اور بانی اسلام پر نکتہ چینی اس کی تقریر و تحریر کا موضوع تھا اور بعض جاہل و مفلس مسلمان ان کے دام میں آ جاتے تھے۔ دوسرے مسلمان اس نظر سے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلش قوم نے مسلمانوں سے لی تھی ہمیشہ حکمران قوم کی نگاہ میں کھٹکتے تھے اور انگریز مسلمانوں کے مذہب کو بغاوت و فساد کا سرچشمہ اور امن و عافیت کا دشمن خیال کرتے تھے۔ تیسرے مذہب اسلام کو انگریزی تعلیم اور مغربی علوم و فنون سے خطرہ تھا اور جو روز بروز ہندوستان میں پھیلتے جاتے تھے۔ اس نظریاتی کشمکش کو اودھ کے معاشرہ میں ابھی محسوس نہیں کیا جا رہا تھا اس لئے کہ یہاں مشنریوں کی ریشہ دوانیاں ابھی تیزی سے شروع نہیں ہوئی تھیں مزید برآں اس معاملہ میں دربار انگریزوں کے جذبات کو ٹھیس پہونچانے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا اور ادیب و فنکار دربار کے مصالح کو نظر انداز کر کے ایک قدم آگے نہیں چل سکتا تھا۔

عمرانیات کے ایک طالب علم کے لئے اس عہد کے ادب کا یہ پہلو حیرتناک نہیں کہ اس میں معاشرہ کے صرف خوشحال اور

سر برآوردہ طبقہ کو نمائندگی دی گئی ہے۔ باقی ایک بڑا
طبقہ اس عہد کے ادب میں منعکس نہیں ہو پا رہا ہے
آئن واٹ کے بقول ہر دور میں دربار کے زیر
اثر تخلیق کئے جانے والے ادب میں امراء کو بہت
زیادہ بلند اور مثالی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے
اور قصبات و دیہات کے کرداروں کو حقارت
کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ چنانچہ اس عہد ادب
میں عوام الناس کے جذبات اور آدرشوں کی ترجمانی
میں جمہور کی زندگی کا صرف اتنا ہی پہلو سامنے آتا
ہے جو دربار کے ذوق و مزاج سے ہم آہنگ ہے
اس عہد کے ادیب کی نگاہ میں دولت کی فراوانی
کے مظاہر گلیم فقیر سے زیادہ پرکشش ہیں
وہ طمطراق ٹھاٹ باٹ نمود و نمائش (OSTENTATION)
کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور معمولی محنت کشوں، کسانوں
کاریگروں اور ملازمت پیشہ لوگوں کی امنگوں، مجبوریوں
اور آرزوؤں کو مرکز توجہ نہیں بناتا۔ اس کا جذباتی
تعلق ان لوگوں سے ہے جو تعیشات کے حصار میں
بند ہیں اور عوامی مسائل سے بے نیاز ہو کر آرام کی
زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں لیکن ان حقائق کے باوجود
اس عہد کا اہل قلم جب اپنے ضمیر کو عقل و ارادہ کی گرفت
سے آزاد کر دیتا ہے تو فوراً اس کے دامن میں محفوظ
تجربات و اقدار کا سرمایہ اسے آواز دینے لگتا ہے
جسے اس کا شعوری طور پر ماحول نے اختیار کیا ہے وہ دولت
کی تحقیر۔ مادی مظاہر کی تذلیل اور اس دنیا کی
کی فانی اشیاء پر نگاہِ تنقیص ڈالنے سے گریز نہیں
کرتا جستہ جستہ ایسے لمحات ہر فنکار کے تخلیقی عمل
کے دوران آتے ہیں جب اس کے اور اس کے سرمایہ
اقدار کے درمیان کوئی حجاب نہیں رہتا۔ یہ اس بات
کی طرف اشارہ ہے کہ اس عہد میں اہل قلم کی شخصیت
کے دو رخ ہو گئے تھے۔ ایک رخ کسی دربار
کے زیر اثر پر تصنع ماحول کی تصویر کشی کرتا ہے اور
دوسرے رخ سے وہ اپنے تابناک ماضی سے خود کو جوڑنے
کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی کبھی یہ دوسرا رخ نہایت
توانا ہو جاتا ہے۔ موضوع خواہ کچھ بھی ہو اس دور کا
تقریباً ہر فنکار مسلمہ اقدار زبان زد اقوال اور معاشرے
کو بیان کئے بغیر نہیں رہتا وہ اپنے مواد کی پرواہ کئے
بغیر وہ ایک بار پلٹ کر اپنے درخشاں ماضی کو سلام
ضرور کر لیتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ حقیقت بھی سامنے
رکھنی چاہیئے کہ اس عہد میں تعلیم و تربیت کا پورا نظام
منطق فلسفہ اور ہیئت کی گرانباری کے باوجود اخلاقی
تعلیمات ہی کے ستون پر استوار تھا۔ چنانچہ ان تعلیمات
کے جگنو خواہ کتنی ہی تاریکی موضوع و مواد کے اعتبار
سے محیط ہو فضا میں بار بار چمکتے نظر آتے ہیں۔ میر
حسن کی اس مثنوی میں جس پر انشاء کرنے پر مغز معنی
کے ذریعہ یہ تبصرہ کروایا ہے کہ یہ مثنوی نہیں کھی ہے
سانڈے کا تیل بیچ رہے ہیں اس طرح کے اشعار
جا بجا ہیں ؎

کسی پاس دولت یہ رہتی نہیں
سدا ناؤ کاغذ کی چلتی نہیں
سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

اسی طرح غزلوں میں بھی انشاء سے رندو صبا
تک "کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے
ہیں" کا موڈ جگہ جگہ کارفرما نظر آتا ہے۔ بوسٹرانڈر کے
بقول فنی اوصاف ادب کی معاشرتی اہمیت کا مطالعہ
کرتے وقت نہایت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں اور
یہ کسی معاشرے کی ترجمانی میں نہایت اہم و راست
رول ادا کرتے ہیں۔ میتھیم بھی اس خیال کی تائید کرتا
ہے کہ ادب کے خیالات کا فنی پیکر اس کے معاشرتی اور
ثقافتی رجحانات سے گہرے طور پر متاثر ہوتا ہے الفاظ
اصطلاحات کو معنویت انھیں کے ذریعہ ملتی ہے اور دو
کے معاشروں میں جس ادب کی تخلیق ہو رہی تھی

اس میں بالعموم الفاظ کی پیکر تراشی، تراکیب کا شکوہ، محاوروں کی میناکاری اور اسلوب ادا کی لطافت پر بے پناہ زور دیا گیا جس طرح اس عہد کی زندگی پر تکلفات کا دبیز و خوش رنگ غلاف چڑھا ہوا تھا۔ اسی طرح اس عہد کے ادب و آرٹ کے اسالیب اظہار پر بھی تکلفات کا رنگ غالب ہے۔ اس عہد کا ادب اور زندگی دونوں باطن سے زیادہ ظاہر اور مغز سے زیادہ پوست کے شیدائی ہیں۔ فطری سادگی یہاں اس لئے عزیز نہیں کہ وہ نگاہوں کو مبہوت کر دینے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ صنعت گری اس لئے پسند ہے کہ وہ پرفریب و دلربا ہے۔ واقعیت و سادگی کے مقابلہ میں مبالغہ آرائی اور تشبیہ و استعارہ کی دور از خیال پرواز پہ لوگ جان چھڑکتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ نشہ کی سی کیفیت طاری کر دیتے ہیں۔ اس دور میں ز ہیر ابن سلمی کے بقول اچھے شعر کا یہ معیار کہ جب پڑھا جائے تو لوگ کہہ اٹھیں سچ کہا ہے، نہیں باقی رہا۔ بلکہ اب یہ معیار قرار پایا کہ اس کو سننے پر لوگ شوکت الفاظ حسن تراکیب اور چستی ادا کی داد دیں معاشرہ کا سر برآوردہ طبقہ اس سے محظوظ ہو۔ زبان کو متروکات اور غیر فصیح الفاظ سے پاک کر دیا جائے اور اردو شاعری کو فارسی شاعری کے ہم پلہ و ہم مرتبہ بنا دیا جائے۔ اصولی اعتبار سے لوگ ضرور اس کے قائل ہیں کہ شاعر کو خوش فکر بھی ہونا چاہیئے اور شاعری فقط قافیہ پیمائی کا نام نہیں ہے۔ اور موزوں طبع ہونا یا مضمون کو نظم کر لینا ہی شاعر کے لئے کافی نہیں نیز شاعری کے مضامین محدود نہیں ہونے چاہئیں لیکن اس طرح کی باتوں پر عمل کی دنیا میں توجہ نہیں دی گئی۔ اس لئے کہ فکر و نظریہ ہی اس دور میں وہ شے تھی جو سب سے زیادہ نایاب تھی۔ صفائی شعر و تلاش لفظ تازہ، جدت تراکیب لذات نشابیہ چستی ادا کا لپکا شاعر کو بے ساختہ انھیں وادیوں میں گھسیٹ لے جاتا ہے جہاں الفاظ و تراکیب کی ملمع گری اور بیان کی ملمع کاری ہر شے پر فوقیت رکھتی تھی۔ اسی مخصوص فنی رجحان سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ ہر زمانے کا ادب مواد اور فارم دونوں پہلوؤں سے اپنے عہد کی ثقافت و معاشرہ کا انعکاس ہوتا ہے۔

اس عہد کے مطالعہ میں ایک سوال اور ابھرتا ہے کہ اودھ کے اہل قلم کی بڑی تعداد اور معاشرہ کے اس طبقہ سے تعلق رکھتی تھی جو امراء و نوابین کے قصر طرب سے دور معمولی زندگی بسر کرتا تھا اور جس کے رہن سہن کے انداز امراء سے قطعاً مختلف تھے اور جس کے جذبات وامنگیں مسائل اور مشاغل امراء سے الگ تھے پھر کیا سبب ہے کہ وہ اپنے ابتدائی گروپ سے ٹوٹ کر جب دربار کے حلقۂ اثر سے آ ملتا ہے تو اپنے ابتدائی تجربات اور روابط (ASSOCIATION) کو فراموش کر دیتا ہے۔ اس امر میں ماہرین علم سماجیات کا یہ خیال ہے کہ جب ادیب اس گروپ سے ٹوٹ کر جس میں اس کی ذہنی پرورش و پرداخت ہوئی ہے معاشرہ کے کسی دوسرے گروپ سے منسلک ہو جاتا ہے کہ یہ نیا رابطہ اس کی ابتدائی نشوونما سے تعلق رکھنے والے اداروں اور طبقات اس کی تخلیقی کاوشوں پر فیصلہ کن اثر ڈالے بغیر نہیں رہتے ہیں اودھ میں تنکا یا اہل قلم معاشرہ کے متوسط و پست طبقات سے بڑی تعداد میں ابھر کر دربار کے حلقہ میں داخل ہوئے تھے امراء کے حلقہ میں رسائی اور دربار سے تعلق انکی ذہنی مرعوبیت کا سبب ہوا۔ اور ان کے ابتدائی روابط کمزور ہو گئے۔ مزید برآں جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے اس عہد میں برسر اقتدار طبقہ معاشرہ کے ہر طبقہ کے لئے آئیڈیل کی حیثیت رکھتا بالخصوص ادب و فن میں اس کا ذوق حرف آخر کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس عہد کا نظریہ فن شاعری یا ادب کو پیغمبری کا جزو سمجھتا نہیں تھا۔ بلکہ ادب برائے نشاط کا نظریہ

کار فرما تھا۔ اقبال کے الفاظ میں "عبادت چشم شاعری
کی ہے۔ تمناک دیکھنا اس عہد کے فنکار کا شیوہ نہ تھا
پھر جب معاشرہ کے جملہ ادارے افزائش انبساط میں
مصروف ہوں تو پھر ادب کیوں پیچھے رہے۔ زبان و
بیان کو اس عہد کے صناعوں نے اس طرح بنا "گویا
برگ گل اور قطرۂ شبنم کی طرح لطیف و نازک بن
گئے۔ انہیں کبھی کسی سیاسی و معاشرتی انقلاب کا آلہ
کار بنانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ ملک و قوم میں فکری
بیداری اور نظریاتی بصیرت و دور اندیشی کے فروغ کا
اسے ذریعہ بنانا وہ زبان و فن کے ساتھ زیادتی تصور
کرتے تھے۔ نظریہ کا بوجھ ان کے خیال میں ادب کے
نازک شانوں پر ڈالا ہی نہیں جا سکتا تھا۔

کاڈویل کا خیال ہے کہ فن ایک زلزلہ پیما کی مانند ہے
جس کی سوئی نقطۂ اعتدال سے ذرہ برابر فرق کی بھی
نشاندھی کئے بغیر نہیں رہتی اور اس کے ذریعہ روح عصر
ایک محسوس پیکر حاصل کرتی ہے۔ اودھ کے زیر مطالعہ
عہد میں روح عصر اور نقطۂ اعتدال کا تعین کرنا نہایت
دشوار ہے۔ اس لئے کہ اس معاشرہ میں بیک وقت متضاد
عناصر مخالف سمتوں میں سرگرم عمل نظر آتے ہیں کسی مشترک
نصب العین کے فقدان کے سبب ثقافت کا بندھن
ڈھیلا اور اس کے اجزا موقوف ہو گئے ہیں نظریاتی
مزاج کے سبب معاشرہ کے پاس کوئی نقطۂ اشتراک
اگر ہے تو فقط یہ کہ لمحۂ رواں کو زیادہ سے زیادہ
خوشگوار بنایا جائے اور ماضی کے تلخ تجربات اور
مستقبل کے اندیشناک تصور سے نجات حاصل
کی جائے۔ حکمراں طبقہ طاقت کے حقیقی سرچشمے سے
محرومی کے بعد اب طمطراق کے ذریعہ اپنی انا کو
تسکین پہنچانا چاہتا ہے۔ سماج کے دیگر طبقات
حکمرانوں سے زیادہ تنگ دست ہیں اور اس عیش و نشاط اور
طمطراق کے مظاہر کے خاموش تماشائی ہی نہیں
اس میں جوش و خروش سے حصہ لے رہے ہیں۔ عوام
امراء و رؤسا کی بساط عیش و نشاط کو بچھانے اور اسے
زیادہ سے زیادہ خوش رنگ بنانے میں ہمہ تن مصروف
ہیں۔ اس بجھی ہوئی آگ میں بظاہر کوئی چنگاری نہیں
نظر آتی اگر کسی کو خزاں کی دھمک سنائی پڑتی ہے
اور اس احساس کی وجہ سے اس کی صدا میں درد و اضطراب
پیدا ہوتا ہے تو قہقہوں کے درمیان یہ صدا دب کر
رہ جاتی ہے۔ تخیلات و تصورات ایسے گل بوٹے کھلانے
میں مصروف ہیں کہ کسی کو خزاں کا دور دور تک احساس
نہ ہو۔

سماج کا وہ طبقہ جو سب سے زیادہ حساس ہوتا
ہے اور حالات و حوادث کے ارتعاش کو شدت کے
ساتھ محسوس کرتا ہے یعنی اہل قلم۔ وہ زیادہ تر اس
عہد میں جیسا کہ ذکر آ چکا ہے۔ امراء کے نقطۂ نگاہ
سے اپنے زمانے کے مسائل پر غور کرتا ہے۔ اس عہد
کے معمولی انسان کو ذلیل کا خطاب دیا
گیا تھا اور وہ توجہ کا مستحق تھا۔ جسمانی محنت کو قدر
کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ اہل علم سے زیادہ
طائفہ رامش و رنگ کی قدر و منزلت تھی۔ ارباب
دولت کی ادب کی قلمرو پر بھی حکمرانی تھی اور یہی
ثقافت کے سانچے بھی ڈھالتا تھا جو حسب ضرورت
ڈھلتے اور ٹوٹتے تھے۔ مستقبل کے بارے میں کسی کو
خواب دیکھنے کی فرصت نہیں۔ چنانچہ ادب بھی مستقبل
کے بارے میں آرزوؤں خوابوں اور تمناؤں سے تہی
ہے اور اس کے ایک بڑے حصہ کو ہم مصنوعی ادب
( ) کہہ سکتے ہیں یہ
مصنوعی ادب ان دیکھی دنیاؤں کی سیر کرانے اور جذبات
کو سلانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اسے حقیقی و
عملی دنیا سے بہت کم سروکار ہے۔ اس لئے کہ اس عہد
کے حقائق بیحد تلخ اور جادۂ عمل بے حد دشوار ہے
لوگ شعوری و عقلی تجربات سے دور رہنا چاہتے ہیں
ضمیر کی خلش اور داخل کے تقاضوں پر قہقہوں

اور مسکراہٹوں کا دبیز غلاف ڈال دیا گیا ہے اور عقل و
دانش کی ہر [illegible] کو ناکام بنانے کے لیے تضحیک و تسخیر
کے ہتھیاروں سے معاشرہ کا ہر فرد لیس نظر آتا ہے
ثقافت کی مادی سطح غیر مادی سطح پر حاوی ہے۔ داخل
پر خارج کی حکمرانی ہے۔ خارجی مظاہر میں بھی فطرت کے
جلال و جمال کے بجائے نسوانی حسن اور جسمانی خد و خال پر
زیادہ توجہ مرکوز ہے۔ اٹھارہویں صدی کے انگلینڈ کے
ادب کی مانند اس عہد کے ادب پر بھی نسوانیت کا
غلبہ ہے۔ سلطنت روما اور یونان کے حسن پرستوں اور
جنس کے شیدائیوں کو بھی اس معاملہ میں مات دے دی
گئی ہے۔ موضوع خواہ کچھ بھی ہو خرام آب رواں اور پیچ
و خم کاکل کی یاد آ ہی جاتی ہے۔ مادی اداروں کے
غیر معمولی شغف نے ثقافت کے غیر مادی سرمایہ کو حالت
تعلیق میں ڈال دیا اور یہی اس ثقافت اور اس عہد کے
ادب کی بنیادی کمزوری ہے۔ ایک مضبوط معاشرہ
اور توانا ثقافت میں غیر مادی ادارے ترقی یافتہ ہوتے
ہیں اور افراد معاشرہ کی جملہ ذہنی پیچیدگیوں کو حل کرنے
کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اسی دور میں غیر مادی اداروں
سے اگر تعلق ہے بھی تو رسمی نوعیت کا چنانچہ افراد معاشرہ
کو جب آرائش خم کاکل اور ذکر ساعد و ساق سیمیں
سے فرصت ملتی ہے تو لوگ مرثیہ کی محفلوں میں اپنے تابناک
ماضی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں لیکن تابناک ماضی
ان کے لیے روشنی کے ایک جزیرے کے مانند ہے جسے وہ
اپنے حالات سے قریب لا کر دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ وہ اپنے
اور ماضی کے درمیان ناقابل عبور خلا محسوس کرتے ہیں اس
خلا کو پُر کرنے کے لیے جس ذہنی بالیدگی کی ضرورت ہے وہ
موجود نہیں۔ اس لیے اس عہد کے [illegible] کو مقابل کا ایک
حصہ لیے اور سے متعلق تھا لیکن وہ [illegible] کو اپنانے کے
لیے تیار نہ تھے اگر وہ اپنے مشاغل عیش و عشرت کو اخلاقی
جسم سمجھتے تو زندہ کس طرح رہتے شعر و سخن ان کے
[illegible] ایک حقیقت تھی سلطنت

دلو آبادیاتی قوتوں کا قہر و جلال ان کے ذہن پر ایک کابوس کی
طرح مسلط تھا اس کابوس کو نگاہوں سے محو رکھنے کے
لیے ساغر و مینا اور شاہد رعنا کا ذکر اذکار ضروری
تھا۔ مشاہدہ حق کی گفتگو وہ اگر چھیڑتے تو انھیں اپنا
پورا وجود پوری تہذیب اور اپنا پورا ماحول ایک
سوالیہ نشان محسوس ہوتا اور اس خوفناک احتساب
کا وہ سامنا کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ انھوں نے اپنی
ثقافتی زندگی کی زمام مادیت کے ہاتھوں کو سونپ
تو دی تھی مگر وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ انکی شخصیت کا
ضمیر اخلاق و روحانیت سے اٹھا اور ان کا معاشرتی و
ثقافتی ورثہ مکمل طور پر غیر مادی ہے، اسی کشمکش کا کبھی
کبھی [illegible] کلیسا میں آ گئے، کا علاج انھوں نے یہ
تلاش کیا کہ مادیت کو فلسفہ و نظریہ بنانے کے بجائے
اسے وقتی مشغلہ کے طور پر زیب داستان بنایا جائے
یہ بات دیگر تھی کہ یہ وقتی ہنگامی مشغلہ دھیرے دھیرے
پوری زندگی پر حاوی ہوتا چلا گیا اور اخلاق و روحانیت
کے آبگینے زیب طاق نسیاں بنتے چلے گئے۔
اگر یہ معاشرہ آزادی کی نعمتوں سے ہمکنار رہتا تو
صورت حال کچھ اور ہوتی پھر امراء کی خوشنودی کے لیے خیالی
پلاؤ پکانا ادیب و فنکار کے لیے باعث ننگ و عار ہوتا۔
اس طبقہ کے داہموں کو اپنے فن میں جگہ دینا وہ قابل
فخر کارنامہ سمجھتا۔ اگر اس کا دائرہ فکر و خیال سماج کے
خواندہ طبقات اور شہری ماحول کے جذبات و آرزوؤں
تک نہ ہوتے۔ بلکہ وہ سواد اعظم سے جذباتی و فکری
رشتے استوار کرتا تو اس کے مجموعی کردار اور اس
کے ادب میں زیادہ توانائی پیدا ہوتی۔

عقیل احمد
شعبۂ اردو، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی

لونجائنس کا نظریۂ ادب

ادب کی تنقید میں ارسطو کی "بوطیقا" اور ہوریس کی "فن شاعری" کے بعد لونجائنس کی تصنیف "ON THE SUBLIME" (علویت) کا نام آتا ہے۔ اس تصنیف کو فرانسس روبرٹیلی نے سنہ ۱۵۵۴ء میں پہلی بار ادبی دنیا کے سامنے متعارف کرایا۔ اس سے پہلے لوگ اس تصنیف سے ناواقف تھے۔

اس بارے میں اختلاف رائے ہے کہ 'لونجائنس' کون تھا۔ آیا یہ وہی مشہور فلسفی لونجائنس تھا جو ملکہ زنوبیا کے دربار میں اس کا گریک سکریٹری تھا اور جس کی مہر وشک داستانیں اب بھی تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں یا کوئی اور تھا؟ مشہور یونانی فلسفی لونجائنس تیسری صدی عیسوی میں موجود تھا۔ اگر یہ وہی ہے تو یہ تصنیف تیسری صدی کی قرار پائے گی۔ لیکن کچھ مورخین کا خیال ہے کہ یہ وہ لونجائنس نہیں تھا جو تیسری صدی میں موجود تھا۔ اس لئے کہ اس تصنیف میں جن کتابوں کے حوالے ہیں وہ "اگستن" کے زمانے تک کے ہیں اس لئے یہ تصنیف پہلی صدی کی ہے۔ خیر جو کچھ ہو، ہمیں یہ مان کر چلنا چاہئے کہ اس کا مصنف لونجائنس تھا۔

ارسطو نے اپنی تنقید کی بنیاد ماضی کے ان شاہکاروں پر رکھی جن کو وہ عظیم سمجھتا تھا۔ اس نے ان شاہکاروں کی روشنی میں کچھ اصول وضع کئے۔ جو زیادہ تر ادب کے مقصد اور طریق کار (MANNER) سے تعلق رکھتے تھے۔ زبان یا وسیلۂ اظہار کو وہ کس قدر اہمیت دیتا تھا، زیادہ واضح نہیں ہے۔ ٹریجڈی میں اس نے پلاٹ کو اس کے اجزا میں سب سے زیادہ اہم مانا اور زبان وبیان کی بحث کو اس نے سب سے آخر میں پیش کیا۔ سوال یہ نہیں ہے کہ اولیت کس بحث کو ملنی چاہئے اب البتہ یہ حقیقت ضرور سامنے آتی ہے کہ وہ آرٹ کے لئے مقصد، وسیلہ اور طریق کار کو باہمی امتیاز کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ وہ ادب میں موجود مختلف عناصر کے مابین درجہ بندی کو تسلیم کرتا تھا جس طرح سے اس نے ٹریجڈی کے مختلف اجزا کی درجہ بندی کی ہے۔ اس درجہ بندی میں وہ زبان وبیان کو مقام دیتا ہے۔ اس طرح کی درجہ بندی سے یہ ثابت ضرور ہوتا ہے کہ ارسطو فن کو اس کی وحدت اور اکائی میں نہیں دیکھتا تھا۔

لونجائنس کی تنقید کا معیار اسلوبیاتی ہے۔ شاعری کو اس کے اسلوب کے معیار پر پرکھنے کی سب سے پہلی کوشش اسی نے کی۔ اس نے شاعری میں "علویت" کو ضروری قرار دیا۔ اس نے بتلایا کہ "علویت" طرز ادا یا طرز اظہار کی مخصوص خوبی اور امتیازی وصف ہے اور یہی وہ سرچشمہ ہے کہ جہاں سے عظیم ترین شعرا اور مورخین نے دائمی فضیلت اور شہرت حاصل کی۔ اس لئے ضروری ہے کہ شاعر اپنے کلام میں اسی سرچشمہ کو جگہ دے۔ لونجائنس نے ارسطو کی طرح شاعری کی تعریف نہیں کی اس لئے یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اس کے نزدیک شاعری کی تعریف کیا تھی؟ البتہ وہ شاعری کی الہامیت سے واقف معلوم ہوتا ہے۔ افلاطون نے اگر ایک طرف شاعروں کو جلا وطن کر دینے کا حکم دیا تھا تو دوسری طرف وہ شاعروں کی الہامی قوت سے واقف تھا۔ اس لئے کہ وہ خود شاعر تھا۔ وہ شاعروں کو DEVENELY INSPIRED سمجھتا تھا۔ اس کے خیال میں شاعروں کا تعلق براہ راست دیوتاؤں یا فوق الفطرت عناصر سے تھا۔ اس لئے

شاعر ہمیشہ الہامی باتیں کرتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف افلاطون کو
اس کی "عینی ریاست" اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ
ایسے عناصر کو اپنی مملکت میں قبول کر لیتا جو اس کی عینیت کے راستے
میں حائل ہوتے۔ لونجائنس نے افلاطون کی اس بات سے اتفاق
کیا کہ شاعری اپنی خوراک مافوق الفطرت عناصر سے لیتی ہے۔ علویت
کے پانچ مخارج اس نے شمار کرائے ہیں۔ دوسرا مخرج اس کے
نزدیک "الہامی قوت" کو تسلیم کرنا تھا لیکن شاعری یا ادب کے مقصد
میں وہ افلاطون اور ارسطو دونوں سے مختلف رائے رکھتا ہے۔ افلاطون
نے شاعری کا مقصد یہ بتلایا کہ وہ جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے۔ ارسطو
نے شاعری کا مقصد فرحت و انبساط بہم پہنچانا بتلایا۔ ہوریس نے
کہا کہ شاعری کا مقصد "تعلیمی اور انبساطی" ہے۔ لونجائنس نے ان
سب سے الگ بات کہی۔ اس کے نزدیک ادب کا مقصد "علویت"
حاصل کرنا ہے اور علویت کا مقصد سامعین میں جوش و خروش اور
حیرت و استعجاب پیدا کرنا ہے، ان کو ایسی فضا میں لے جانا ہے
"جہاں وہ اپنے آپ میں نہ رہیں" - (LIFTING OUT
ONESELF -) ارسطو نے شاعری کے مقصد کے حصول کے
لئے مواد پر زور دیا۔ البتہ ہوریس جس نے ارسطو کے ہی خیالات
پیش کئے فن میں وحدت کا قائل تھا لیکن لونجائنس نے اس
مقصد کے حصول کے لئے زبان و بیان یا طرز ادا کو ذریعہ ٹھہرایا۔

"کیونکہ اعلیٰ زبان و بیان کا یہ اثر نہیں ہے کہ وہ
سامعین کو ترغیب دے بلکہ ان کو محو کر دے اور ہر دور
میں اور ہر طرح سے جو چیز ہمیں وجد میں لا کر استعجاب
میں ڈال دے مقابلۃً اس زبان کے جو ہمیں ترغیب یا
تسکین دے، زیادہ موثر و پرزور ہوتی ہے۔ ہمیں
کس حد تک ترغیب دی جا سکتی ہے یہ بات عام طور
پر ہمارے قابو میں ہوتی ہے، مگر یہ علوی حصے زبردست
قوت دلربائی و فن کمال سے اپنا گہرا اثر چھوڑتے ہیں
اور سامعین کو اپنی مٹھی میں لے لیتے ہیں۔ اختراعی قوت و
مہارت صحیح ترتیب اور مواد کی تنظیم صرف چند اچھے
اشاروں میں ظاہر نہیں ہوتی بلکہ ساری تصنیف
کے باطن میں سرایت کئے ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ
سامنے آتی ہے۔ برخلاف اس کے علویت کا ایک
برمحل اشارہ ہر چیز کو بجلی کی کڑک گرج کی طرح بکھیر دیتا
ہے اور آناً فاناً ان باتیں بولنے والے کی پوری قوت کو ظاہر
کر دیتا ہے"۔ (دوسرا باب)

یعنی ادب کا مقصد وجد میں لانا ہے، حیرت و استعجاب میں ڈالنا
ہے، کسی قسم کی کوئی ترغیب نہیں ہے۔ یہ "علویت" لونجائنس کے
نزدیک دلائل سے حاصل نہیں کی جا سکتی بلکہ ادب میں الہامی تاثر پیدا
کر کے حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس بیان سے لونجائنس نے رومانوی
تحریک کی راہیں کھولیں۔ رومانوی تحریک سے وابستہ لوگوں نے بھی
ادب کا مقصد یہی ٹھہرایا۔ لیکن لونجائنس نے رومانوی تحریک کی طرح
مابعد الطبیعاتی مسائل کو نہیں پیش کیا جس کے ذریعہ اس تحریک نے ادب
میں حیرت خیزی (SENSE OF WONDER) اور استعجاب
(MYSTERY) پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے سیدھے سادے
طور پر اپنے مقصد کے حصول کے لئے طرز ادا کو وسیلہ قرار دیا۔ لونجائنس
نے یہ کہہ کر کہ "اعلیٰ زبان و بیان کا یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ سامعین
کو ترغیب دے" ادب کو خطابت سے الگ شے قرار دیا کیونکہ
خطابت کا مقصد ترغیب دینا اور مقصد کے لئے آمادہ کرنا ہوتا ہے۔
دوسری طرف لونجائنس کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ادب
میں جو شے بنیادی طور پر اہم ہے وہ زبان بیان کا استعمال ہے
اس لئے کہ ادب کا مقصد اس کے نزدیک ترغیب و تسکین دینا نہیں
تھا اس لئے کہ ترغیب و تسکین "عام طور پر ہمارے قابو میں ہوتی
ہے"۔ یعنی وہ ادب میں اس روحانی رفعت کا قائل تھا جو قاری
کو بے خود و بے اختیار کر دے۔

اسی طرح اس نے ارسطو اور ہوریس کے اس خیال کو ٹھکرا دیا۔
کہ ارسطو کے مطابق ٹریجڈی کا مقصد "خوف و ترحم کے جذبات کو
ابھار کر ان کی تسکین کرنا ہے"۔ اور ہوریس کے نزدیک شاعری کا مقصد
انبساطی تو ہے ہی، ساتھ ہی تعلیمی بھی ہے۔ اس طرح لونجائنس
نے ادیب کے جذبۂ تخلیق میں قاری کو بھی برابر کا شریک کر لیا ہے۔
لیکن کیا لونجائنس نے مواد کو کوئی اہمیت نہیں دی؟ ایسا
نہیں ہے۔ اس نے مواد کو اسی طرح اہمیت دی۔ اس کے نزدیک
عظیم خیالات ہی عظیم اسلوب کا بوجھ برداشت کر سکتے ہیں۔ اگر خیالات

عظیم نہ ہوں اور محض طرز ادا ہی پر زور دیا جائے تو یہ "بے جا لفاظی" اور "تصنع پسندی" ہے۔ اس کے خیال میں ایسا وہی لوگ کرتے ہیں جن کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے:۔

"اسی طرح ہمیں شاعری اور ادب میں بھی کامل طرز کے بارے میں غور کرنا چاہیے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ کچھ حصے شان و عظمت کا اثر محض بے مقصد آرائش تو قائم نہیں کر رہے ہیں اور اگر اس آرائش کو الگ کر دیا جائے تو وہ محض لفاظی بن کر تو نہیں رہ جائیں گے؟"

(ساتواں باب)

دوسری جگہ وہ لکھتا ہے کہ:۔

"بے جا لفاظی فاش غلطی ہے جس سے بچنا چاہیے کیونکہ کسی نہ کسی طرح وہ سب لوگ جو کمزوری اور خشکی سے بچنے کے لئے شاندار الفاظ استعمال کرتے ہیں قدرتی طور پر اس غلطی کا شکار ہوتے ہیں۔"

(تیسرا باب)

"بے جا لفاظی علویت کو حد سے زیادہ حاصل کرنے کی خواہش سے پیدا ہوتی ہے۔"

(تیسرا باب)

گویا کہ لونجائنس ایسے شاعروں اور ادیبوں کو پسند نہیں کرتا جو "کھوکھلے جذبات" کو پیش کر کے محض طرز ادا کی بدولت علویت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے وہ لکھتا ہے:

"ایسے حصوں کی تعریف کرنے کی بجائے انہیں رد کرنا بہتر ہے کیونکہ علویت کسی پوشیدہ قوت سے ہماری روحوں کو بلند کرتی ہے۔ ہمیں ایک قابل فخر بلندی اور خوشی محسوس ہوتی ہے، بالکل ایسے گویا وہ تخلیق ہم نے خود کی ہے جسے ہم سن رہے ہیں۔"

(ساتواں باب)

لونجائنس نے ادب کے لئے علویت کو ضروری قرار دیا اور "علویت" جب طرز ادا کی خاص صفت کا نام ہو تو یہ سوال کہ علویت کا حصول کیسے ممکن ہے؟ اس نے جواب دیا کہ اس کے لئے بعض اصولوں کو اپنانے اور ان پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ چیز اکتسابی ہے۔ گویا کہ وہ اس تصور کے خلاف تھا جس پر اقبال نے یہ کہا ہے کہ:

تری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

اس نے کہا کہ نہیں ایسا نہیں ہے کہ "فطرت ہی وہ فن ہے جو اسے پیدا کرتی ہے۔" اس نے تسلیم کیا کہ "فطرت ہی تمام عوامل میں پہلا سبب اور بنیادی تخلیقی عمل ہے لیکن ایک نظام کا منصب یہ ہے کہ ہر عمل کے لئے صحیح لمحہ اور درجہ مقرر کرے اور استقلال و عمل کے لئے واضح ترین اصول بنائے۔" اس طرح لونجائنس نے اپنے آپ کو کلاسیکی اصول پسندی کے مزاج سے قریب کر لیا۔

"علویت" کے حصول کے لئے فنی اصول کیا ہو سکتے ہیں؟ لونجائنس نے علویت کے لئے پانچ مخارج (SOURCES) بتائے۔

پہلا مخرج "عظیم تصورات کو تشکیل دینے کا ملکہ ہے"۔ یعنی تصورات بہر حال عظیم ہونے چاہئیں۔ اس لئے کہ عظیم تصورات ہی عظیم طرز ادا کے حامل ہو سکتے ہیں۔ عظیم تصورات اس وقت تک ادیب کے ذہن میں پیدا نہیں ہو سکتے جب تک اس کی روح میں رفعت اور بلندی نہ ہو اور یہ روح کی رفعت و بلندی کوئی اکتسابی صفت نہیں ہے پھر بھی ہمیں اپنے دماغ کو عظیم خیالات کی پیدائش کے لئے جہاں تک ممکن ہو تیار کرتے رہنا چاہئے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم مستقل طور پر اپنے ذہنوں کو اعلیٰ الہام سے سیراب کرتے رہیں۔"

(نواں باب)

یہ ضروری نہیں ہے کہ سارے عظیم تصورات تشکیل کے بعد علویت کا مقام حاصل کر لیں۔ اسی لئے لونجائنس کے نزدیک یہ ضروری ٹھہرا کہ ایسے تصورات کا انتخاب کیا جائے جو علویت کی شان دوبالا کر سکیں۔ اس لئے اس نے کہا کہ:

"ہمیں علویت کا ماخذ ان عناصر کے سب سے زیادہ دلکش حصے کے صحیح انتخاب اور ان عناصر کو ایک دوسرے سے اس طرح پیوست کرنے کی صلاحیت میں ملے گا جن سے ایک متحد زندہ وجود پیدا ہو سکے۔"

گویا لونجائنس فن کی وحدت کو تسلیم کرتا ہے۔ اس کے لئے اس نے سیفو کی مثال دی اور بتایا کہ اس نے اپنی شاعری میں وہی جذبات

پیش کیے جو اظہار کی شکل میں آکر "علویت" کی شان میں ڈھل گئے اور ایک "منفرد زندہ وجود" بن گئے۔

علویت کا دوسرا مخرج پرزور اور دل میں اتر جانے والا "الہامی جذبہ" ہے۔ لونجائنس نے دوسرے مخرج کی وضاحت نہیں کی لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ افلاطون کی طرح شاعری کی الہامی حیثیت کا قائل تھا۔

علویت کا تیسرا مخرج اس نے صنائع کے استعمال کو قرار دیا، ساتھ ہی اس نے یہ ضروری قرار دیا کہ صنائع کا استعمال اس چابکدستی سے کیا جائے کہ قاری کا ذہن صنائع کی طرف مائل نہ ہو اور وہ تاثر قائم ہو جائے جو صنائع کے ذریعہ ادیب پیدا کرنا چاہتا ہے:

"صنائع اس وقت موثر ہوں گے جب اس بات کا پتہ نہ چلے کہ وہ صنائع ہیں۔"

چوتھا مخرج "اعلیٰ طرز ادا کی تخلیق" ہے جو انتخاب الفاظ امیجری کے استعمال اور اس اسلوب سے "جو محنت سے بنا کر مکمل کیا گیا ہو، پیدا ہوتا ہے۔"

پانچواں مقصد "واحد تاثر" قائم کرنا ہے۔

پچھلے دو مخارج کے علاوہ باقی سبھی زبان کے مختلف پیرایۂ استعمال سے تعلق رکھتے ہیں۔ البتہ مجموعی طور پر علویت کے پانچوں مخارج قدرت زبان و بیان ہی کے حصے ہیں جن پر "علویت" کا مدار ہے۔

لونجائنس نے ادب کے لئے "علویت" کو ضروری قرار دیا اس کے لئے مختلف اصول بنالئے اور ان اصولوں پر مثالوں کے ذریعہ بحث کی۔ اس نے اپنی توجیہہ میں جن مثالوں کو پیش کیا اس کے انتخاب میں بڑی فنی مہارت کا ثبوت دیا۔ بعض جگہوں پر اس نے دو مختلف فنکاروں کی تحریروں کے درمیان موازنہ بھی کیا، کبھی اس نے فنکاروں کی اپنی ہی دو تخلیقوں کے درمیان موازنہ کیا جیسا کہ اس نے ہومر کی "اوڈیسی" اور "ایلیڈ" کے درمیان کیا۔ اور ایک جگہ اس نے دو مختلف زبانوں کے فنکاروں کے درمیان تقابلی مطالعہ کیا جیسے اس نے سسرو (رومن) اور دیموستھنیس (یونانی) کے درمیان کیا اور اس طرح اس نے پہلی بار تقابلی مطالعے کی بنیاد ڈالی۔ نہ صرف اس نے تقابلی مطالعے کی بنیاد ڈالی بلکہ اس نے بعض ایسے بھی خیالات پیش کیے جو آج بھی اپنی ادبی حیثیت رکھتے ہیں اور خود لونجائنس کے لئے رہبر ہو گئے۔ لونجائنس کا خیال تھا کہ ادب زمان و مکان کی حدود سے بے نیاز ہے۔ اس نے جب "علویت" کی پہچان کے لئے یہ طریقہ بتلایا کہ اصل علویت یہ ہے کہ پڑھنے والا اسے بار بار پڑھے اور ہر بار اسے وہی حظ ملے یا اس سے زیادہ جو اس نے شروع میں حاصل کیا تھا۔ ایسا نہ ہو کہ دوبارہ پڑھنے سے وہ جذبہ دھیما پڑ جائے جو پہلے پیدا ہوا تھا۔ یہ حقیقی علویت کے منافی ہے۔

"اگر کوئی ذہین آدمی کسی حصے کو بار بار سنے اور اگر وہ حصے علویت کے احساس کے ساتھ اس کی روح کو متاثر نہ کریں یا اس کے ذہن میں غور و فکر کے لئے مواد نہ چھوڑیں بلکہ غور سے مطالعہ کرنے پر ان کی اثر انگیزی زیادہ سے زیادہ کم ہوتی جائے تو اسے ہم حقیقی علویت کی مثال نہیں کہہ سکتے۔ یقیناً نہیں کہہ سکتے اگر وہ ایک دفعہ پڑھنے کے بعد بے اثر ہو جائیں کیونکہ کوئی حصہ اسی وقت علوی کہلایا جائیگا اگر وہ بار بار کا امتحان برداشت کر سکے اور اگر اس کے اثر سے بچنا مشکل بلکہ ناممکن ہو اور وہ پوری قوت سے اپنے انمٹ نقوش حافظہ پر ثبت کر دے۔" (ساتواں باب)

یا یہ کہ حقیقی علویت وہی ہے جو فکر و آگاہ کا موقع فراہم کرے۔ گویا کہ لونجائنس کے نزدیک فن کا وہ معیار جس پر تخلیق کی پرکھ ہو، علویت تھی۔ اس کے نزدیک کسی فن کی کامیابی کے لئے اس میں علویت کا موجود ہونا ہی کافی تھا۔ اس نے کلاسیکی رجحان کی طرح علویت کے اصولوں کو اپنانا ضروری سمجھا لیکن دوسری طرف کلاسکیت کے برخلاف اس نے بعض نقائص کو نظر انداز بھی کیا۔ اس کا خیال تھا کہ نقص ہر ادیب میں ہوتا ہے۔ اگر علویت موجود ہے تو نقص کو نظر انداز کر دینا چاہئے پھر یہ نقص فطری ہے۔ یہ تو بڑے فنکار کی لاپرواہی کا نتیجہ ہے۔ اس نے بڑے پتے کی بات کہی کہ بڑا فنکار فطری طور پر لاپرواہ ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فنکار کی پوری شائستگی اچھی تخلیق سے روکتی ہے۔ اس حقیقت کو لونجائنس نے بہت پہلے سمجھ لیا تھا گو کہ یہ اس کے کسی حد تک رومانی مزاج کا نتیجہ تھا۔

بقیہ صـ ۲۹ پر

اسعد بدایونی
علی گڑھ

نعت

بیاضِ جاں میں وہ اسمِ اعظم لکھا ہوا ہے
کہ جس سے اب تک مجھے بھی جینے کا حوصلا ہے
مجھے صداقت کے سائباں کی اماں عطا ہو
ضمیر میرا گنہ کی بارش میں بھیگتا ہے
اجاڑ راتوں کو روشنی سے نواز میری
کہ میرے چاروں طرف اندھیرا بہت گھنا ہے
تیری محبت رگوں میں خوں بن کے دوڑتی ہے!
تیری قناعت سے میرا دل بھی بھرا ہوا ہے
زوال آمادہ ساعتوں میں خیال تیرا
مثالِ بادِ بہار کلیاں کھلا گیا ہے
گناہ میرے بڑے ہیں لیکن یہ سوچتا ہوں
کہ تیری رحمت کا سلسلہ ان سے بھی بڑا ہے

اقبال صلاح الدین
لاہور

نعت

ادا ــــــ حسن ہے
دلکش و دلربا نہر کی لہر ہے
خوبی و خوشنمائی کا اک شہر ہے
ہاں محبت کا نوریں وجود ــــ اس سے ہے
اور جبینوں کو شوقِ سجود ــــ اس سے ہے
پھول کی زیب و زینت
کلی کی صباحت
نسیمِ سحر کا خرامِ حیات آفریں ــــ اس سے ہے
یہ گل اور بلبل کا سارا جہاں
گلستاں ــــ گلستاں
خالقِ دو جہاں کی ــــ
ہزاروں ہزاروں اداؤں کا اظہار ہے
جنت اہل ابصار ہے
جس سے کیف و نشاط و سرور دلاں ــــ
اسی ــــ ہاں اسی خالقِ دو جہاں کی ــــ
اسی حسن احسن کی ــــ
لاریب ــــ ساری اداؤں میں افضل ادا
اس کی دلکش اداؤں کی سرتاج و سردار ادا
اپنی ساری وجاہت، لطافت لئے
ہے محمدؐ کی صورت میں جلوہ نما
اس پہ لاکھوں درود
اس پہ لاکھوں سلام

نجمہ شہریار
فیصل ولا
سرسید نگر، علی گڑھ

پانی کی دیواریں

سطحِ آب پر
جہاز پتے کی طرح ڈول رہا ہے
نگاہ جدھر بھی اٹھتی ہے
صرف نیلے پانی کی دیواریں ہیں
ہر طرف جھاگ ہی جھاگ ہے
اور اس پر تیرتی ہوئی
بے شمار کشتیاں!
ایسی ہی پانی کی دیواروں کے بیچ ہو کر
بہت پہلے کبھی
کسی فرعون سے بچنے کو
کسی موسیٰؑ کے لئے
سمندر نے اپنی آغوش کو
وا کیا ہوگا ....
ان ہی دیواروں پر
اپنی کشتی تیراتے ہوئے
نوحؑ نے جانداروں کی نسل کو
برقرار رکھا ہوگا! ......
وہی پانی کی دیواریں
اب میرے سامنے ہیں
میں نے ایک چھوٹی سی کشتی بنائی ہے۔
اور چپکے سے اس پر
اتر آئی ہوں ......

تو کیا میں تو سا ہوں؟؟؟
مگر ——
کشتی خالی کیوں ہے؟
وہ سب کدھر گئے
جنھیں میرے ساتھ
ان گرد دن اونچی
پانی کی سربلند دیواروں کی
آخری حد تک پہنچ کر
آسمان کو چھونا تھا
تو ——
کیا میں اکیلی ہی اس سمت کو چلوں
لہروں کا شور بڑھ رہا ہے.......
میری کشتی پانی کی اس دیوار کے
آخری سرے پر ہے
اور نگاہیں
اس سمندری کائنات
کے ہر چہار سو دیکھ رہی ہیں
متلاشی ہیں
منتظر ہیں
شاید وہ سب ادھر آجائیں
وہی جو مجھے عزیز ہیں
وہی جو میرے بہت قریب ہیں
مگر ——
بے سود......
اور اب تنہا ہی
میں پانی کی اس دیوار کے آخری سرے پر
پہنچ چکی ہوں.......
اور میں نے تنہا ہی
اک بجھے ہوئے دل سے
آسمان چھو لیا ہے!
اور ——

میرا پورا وجود
اس نیلگوں سمندری کائنات کا
ایک حصہ بن چکا ہے!

خلش

طالب زیدی

نہ پتھروں سے شکایت نہ دستِ ظالم سے
نشانِ سنگ کا کوئی گلہ جبیں کو نہیں
نہ یہ خیال کہ ہر چہرہ آشنا کیوں تھا
خلش تو یہ ہے کہ اے کاش میرے ہاتھوں نے
گلوں کو پھینک کے پتھر اٹھا لئے ہوتے
کہ میری داستاں اوروں سے مختلف ہوتی

کنواں

افتخار بخاری (راولپنڈی)

سیڑھیاں چڑھتا ہوں یا شائد اترتا ہوں میں
سیڑھیاں جن کا کوئی انت نہیں
دور اک روشنی کا زرد نشاں
جس کی خواہش کی کشش
جیسے جادو کا اثر رکھتی ہے
مجھ کو مجبورِ سفر رکھتی ہے
نیلی وسعت میں کھلے چاند کا منظر ہے یا
نیچے تہہ خانے میں شائد کوئی جلتا ہے چراغ
کھوج میں جس کے کئی برسوں سے
سیڑھیاں چڑھتا ہوں شائد اترتا ہوں میں
سیڑھیاں جن کا کوئی انت نہیں

ابوالخطیب
(لندن)

میری نوٹ بک کے چند صفحے

لندن: ۲۸ جون ۱۹۷۹ء ـــ

آج SPRING ہولی ڈے کی چھٹی ہے۔ بادل آسمان پہ تلے ہوئے کھڑے ہیں۔ ہوا آہستہ آہستہ چل رہی ہے لیکن اس میں ہلکی سی خنکی ہے HAMPSTEAD کے ایک مشہور کیفے THE-PROMPT.CORNAR

پرومٹ کورنر میں اداس اور بیزار بیٹھا ہوں موسم ہی جس کو بڑا متاثر کن ہے کہیں کہیں بدن میں ہلکا سا درد ہے طبیعت بوجھل۔ اور کاہلی کہر کی طرح اعصاب پہ چھائی ہوئی ہے۔ اس وقت اس کیفے میں کافی لوگ بیٹھے ہیں یعنی اپنی بیزاری سے تنگ آ کر یہاں سے جا رہے ہیں لیکن میری طرح اکثر اداس اور بیزار۔

لندن کے اس جنت نشاں مقام ــ جہاں ہر طرف ہریالی، گھروں کے سامنے والے چھوٹے چھوٹے بغیچوں میں رنگ برنگے پھول۔ خوبصورت دیدہ زیب قدیم عمارتیں چھوٹی چھوٹی گلیاں ان کے کونوں پر چھوٹے چھوٹے کیفے اور شراب خانے PROMPT.CORNER سے ذرا فاصلہ پر تالاب اس میں تھرکتی ہوئی تتلیوں کی طرح عمارتوں کے سامنے کشتیوں کی طرح ڈولتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ پرومٹ کارنر خود ایک دنیا ہے جیسے انگریزی کے مشہور ناول نگار جارج اورویل نے بنائی تھی۔ جن دنوں یہ انگریزی ناولسٹ ہیمپ سٹیڈ میں رہتا تھا اس کیفے میں اس کی کتابوں کی دکان تھی۔ اب وہاں وہ اس کی کتابیں تو نہ رہیں۔ البتہ انگریز قوم نے اس کی خدمات کے پیش نظر اس کے نام کی تختی اور اس پر چھوٹا سا اس کا چہرہ ضرور نصب کر دیا ہے لیکن جو لوگ یہاں چائے پینے اور شطرنج کھیلنے آتے ہیں وہ اسے کچھ بھولتے جا رہے ہیں لگی ہوئی شبیہ دیکھتی ضرور رہتی ہے۔ جیسے خود جارج انسانی زندگی کو فاصلہ سے دیکھا کرتا تھا۔

اس خوبصورت کیفے میں شطرنج کا کھیل ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔ وہ کھلاڑی جو زندگی کو کھیل سمجھ کر اس میں بازی ہار گئے وہ اس شطرنج کے کھیلوں میں بازیاں خوب جیتتے ہیں لیکن چھٹی کے دن وہ بھی ایک دوسرے سے بے تعلق ہو کر اداس اور بیزار بیٹھے ہیں۔ کبھی کبھی ریستوران میں جو شیشے لگے ہوئے ہیں ان سے راہ گیروں کو دیکھتے رہتے اور سگریٹیں پیتے۔ ریستوران میں بیٹھے ہوئے انہی بیقرار لوگوں میں قبرص کا ایک یونانی ادھیڑ عمر آدمی پرانے اخبار کے صفحے الٹ کر اپنا وقت کاٹ رہا ہے۔ سیاہ قمیض اس پر چیتلی روایتی انگلش کوٹ (جیکٹ) اس کے جسم پر اس وقت کچھ ایسے لگ رہے ہیں جیسے یہ چیزیں اس وقت اس پر چسپاں کر دی گئی ہیں اس دن گھر سے وہ بن ٹھن کر چھٹی کے دن کا لطف لینے نکلا تھا۔

ریستوران میں میری سیٹ کے سامنے جو سیٹ ہے اس پر ایک خوبصورت عورت بیٹھی ہے۔ اس کے

کپڑے ٹھیک نہیں لیکن اس کی آنکھوں میں کاجل کی طرح
ابھرا ہوا انتظار موجود ہے۔ یہ خوبصورت عورت اس
ریستوران میں اکثر آتی ہے لیکن کسی سے بولتی نہیں
کبھی کبھی اپنی خاموشی سے گھبرا کر وہ شطرنج کے کھیل
کو ضرور دیکھ لیتی ہے۔ قبرص کا یونانی ادھیڑ عمر کا آدمی
اپنی سیٹ سے اٹھا اور دوسری ٹیبل سے انگریزی
کا مشہور عوامی اخبار DAILY MAIL اٹھایا اور سب
سے بے تعلق ہو کر اخبار پڑھتا رہا۔

اس کیفے میں سب لوگ اسے جانتے ہیں اور
TONY کے نام سے اسے پکارتے ہیں۔

ٹونی جب اس کیفے میں داخل ہوا اس کا اپنا اخبار
مڑا ہوا کوٹ کی جیب میں رکھا ہوا تھا۔ اور سر کے
بکھرے خشک بال ہوا سے ہل رہے تھے۔ یہ بڑا خاموش
آدمی ہے اپنی بربادی اور بڑھتے ہوئے بڑھاپے کا اسے
شدید احساس جوئے نے برباد کر کے رکھ دیا۔ اس
عمر میں اب وہ جوئے کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن اب
وہ خود جوا نہیں کھیلتا بلکہ دوسرے عادی جواریوں کو
ریس کے گھوڑوں کے نمبر بتاتا رہتا ہے۔

جواری اس کے بتائے ہوئے نمبروں پر داؤں
لگاتے ہیں کافی جیت بھی چکے ہیں۔ جس سے اس کی
ساکھ یہاں اور بڑھ گئی ہے لیکن ریس کے گھوڑوں
پر جواریوں نے جو رقم جیتی اس میں سے اسے کچھ نہ
دیا لیکن ٹونی کو اس کی پرواہ نہیں۔ نمبر بتانا اب
خود اس کا مشغلہ بن چکا ہے اور یہ یقین اس میں
جڑ پکڑ گیا ہے کہ وہ روحانی قوت کا مالک ہے۔ کیفے
کا مالک بھی قبرص کا یونانی ہے اس کی اس "روحانی"
قوت کی وجہ سے اس کی بڑی عزت کرتا ہے اور توقع
رکھتا ہے کہ اسے بھی ٹونی سے کوئی نمبر مل جائے جس پر
بڑی رقم لگا کر قبرص چلا جائے، یہاں کی برسات اور بادلوں
سے وہ تنگ آ چکا ہے۔ لندن میں سورج کی روشنی
کی شدت سے ضرورت محسوس کرتا ہے۔

کبھی کبھی اس کیفے میں خریداروں کی اتنی بھیڑ ہوتی
ہے کہ یہاں جگہ حاصل کرنے کے لئے قطار لگانا پڑتی
ہے جب کیفے میں کاروبار کا یہ عالم ہوتا ہے تو ٹونی اس
وقت مالک کی مدد کرنے باورچی خانے میں چلا جاتا ہے
اور اس کے جھوٹے برتن دھوتا رہتا ہے۔ اس کام
کی مالک سے اسے سوائے چائے   کے کوئی
اجرت نہیں ملتی، ٹونی کو اس کی بھی شکایت نہیں
لیکن چائے کے ساتھ سگریٹوں کی بھی تو اسے ضرورت
رہتی ہے جو وہ اپنے پیسوں سے خریدتا ہے۔ یہ پیسے
ہر ہفتہ اسے حکومت سے ملتے ہیں۔ ٹونی لندن میں تقریباً
۲۰ سال سے رہ رہا ہے۔ ایک معصوم شرمیلی انگریز عورت
سے اس نے محبت بھی کی۔ تھوڑے عرصہ بعد اس محبت
نے بھی جان دے دی۔ لیکن اس محبت کے طفیل دو بچے
اسے ضرور ملے TONY کو ان بچوں سے بڑی محبت ہے
جب یہ دونوں بچے اپنی ماں کے ساتھ ہوتے ہیں تو ٹونی
انھیں کچھ نہ کچھ خرید کر ضرور دیتا ہے۔ جب وہ اپنی ماں کے
ساتھ چلے جاتے ہیں تو ٹونی پھر اس کیفے میں سب سے
الگ تھلگ بیٹھ کر سر جھکائے سگریٹیں پیتا رہتا ہے۔
جب سگریٹ نوشی سے اس کا دل بھر جاتا ہے تو پھر
وہ اونگھنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی اونگھتے ہوئے وہ چونک
پڑتا ہے۔ آنکھیں کھول کر اپنے چاروں طرف دیکھتا
ہے اس کے بعد پھر اخبار تلاش کر کے اسے پڑھنے
لگتا ہے اور دنیا جہان کی ساری خبریں پڑھ جاتا ہے
کہ جس دنیا میں وہ اس طرح رہ رہا ہے وہاں کیا ہو رہا
ہے۔ سگریٹوں کے لمبے کش لگا کر وہ کھانستا بھی خوب
ہے۔ کبھی زکام سے اس کی ناک بند ہو جاتی ہے۔ اس
دن ٹونی کو اداس اس کے بعد اونگھتا ہوا چھوڑ کر
میں کیفے سے نکل کر HAMPSTEALHEATH کی طرف
چلا گیا جہاں آج میلہ لگا ہوا تھا۔ اس میلے میں طرح طرح
کے کھیل سب سے زیادہ جوئے کا کھیل۔ اس کے بعد بجلی سے
چلنے والی موٹریں کھانے پینے کا استعمال لیکن میں

نظر یں نیلے کے ہر چیز کو چھوتی ہوئی پرانی کتابوں اور پرانی چیزوں کی دوکان پر آکر ٹھہر گئیں یہاں سے کچھ چیزیں میں نے خریدیں دل خوش ہوا۔ نہ جانے کیوں پرانی چیزوں سے میرا دل اتنا کیوں خوش ہوتا ہے۔

اس کے بعد میں خوشی کے متعلق سوچتا رہا۔ جس کی مغرب کے معاشرے میں سب کو ضرورت ہے۔ لیکن خوشی ہے کیا اس کا سراغ میں ابھی تک نہ لگا سکا اس خوشی کو تلاش کرنے کے لئے کبھی کبھی میں اپنی مختلف کیفیتوں کو یاد کرنے لگتا ہوں ان یادوں میں مجھے وہ کیفیت بھی مل جاتی ہے جس سے میرا جسم اور روح ایک قسم کا انبساط محسوس کرتا ہے وہ ہے نماز جس میں ہر روز خدا سے میں عہد کرتا ہوں کہ اس دنیا میں کیوں آیا اور کیا کرنا ہے۔ نماز کے بعد میری تخلیقات جو صفحات پر رنگوں کی طرح پھیل جاتی ہیں۔۔ انبساط اس سے بھی ملتا ہے لیکن نماز کے سرور سے مختلف پھر مناظر قدرت۔ تالاب۔ دریا۔ سمندر میں دھوپ اور کبھی چاندنی میں چمکتی ہوئی پانی کی لہریں۔ اس سے بھی دل کو بڑی فرحت ملتی ہے۔ انھیں یادوں میں میری بیوی میرے بچوں کی یادیں بھی تصویر کی طرح میرے تصور میں ابھر آتی ہے۔ میرے فنکار بننے کی سب سے بڑی قیمت انھوں نے ادا کی۔ میری فنکاری کے لئے میرے ساتھ بہت سی قربانیاں دیں۔ میری زندگی کے ساتھ قربانیوں کا یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے جس کے لئے برابر شکایتیں ہیں لیکن اس کے ساتھ میرے لئے دعائیں بھی۔ اسی خوشی میں تھوڑا سا احساس جرم بھی شامل ہو جاتا ہے۔

یہ ساری قربانیاں میری فنکاری کا کچھ سہارا سا بن گئی ہیں۔ لیکن اس وقت میری قوم کو اس فنکاری کی ضرورت نہیں اسے کچھ اور چاہیے۔

(لندن ۲۴ جون ۱۹۷۹ء)

جون کے مہینہ کا لندن میں ہمیشہ انتظار رہتا ہے اس مہینے میں چاروں طرف ہریالی روشنی کی طرح پھیل جاتی ہے۔ پارکوں اور باغوں میں رنگ برنگے پھول لوگوں کے شگفتہ چہرے، پرندوں کے گیت دھوپ اس میں روپ لوگوں کی خوش مذاقی۔ لیکن اس مرتبہ جب جون کا مہینہ آیا تو ہمیں ٹیڈ میں یہ سارے دل فریب مناظر خواب وخیال بن کر رہ گئے۔ بادل ہر وقت آسمان پہ منڈلاتے رہتے ہیں۔ بوندا باندی۔ وہ بھی روز کا معمول بن گئی ہے۔ ان بادلوں اور مینہ کی پھوار کا کتنا انتظار رہتا ہے لیکن روز کی بارش نے اس انتظار کو وحشت ناک بنا دیا ہے۔ اب تو موسم کی بات کرنے سے ہی کوفت ہوتی ہے۔ موسم کی وجہ سے طبیعت گری گری سی رہتی ہے۔ سوائے سونے کے کسی چیز کے لئے جی نہیں چاہتا۔ چیزوں اور لوگوں کو دیکھنے اور برتنے سے بھی دل و دماغ میں کوئی خیال اور احساس نہیں ابھرتا لوگوں سے بے تعلق ہو کر خاموش رہنے سے طبیعت میں کبھی کبھی گھٹن سی پیدا ہونے لگتی ہے تو سہارے کے لئے نبی مکرم و محترم صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ان یادوں سے طبیعت سنبھلتی ہے۔ تو اپنی ملازمت پہ چلا جاتا ہوں۔ کام کی مصروفیت ۸ گھنٹے تک ذہن و جسم کو مصروف رکھتی ہے۔ اس وقت سوائے کاہلی کے کسی قسم کا درد محسوس نہیں کرتا۔ دفتر واپس آکر سیدھے اپنے بوسیدہ فلیٹ میں آتا ہوں۔ اور کھڑکیوں سے آسمان کو دیکھتا رہتا ہوں۔ آخر اس تنہائی میں اس آسمان کو کب تک تکتا رہوں بستر سے اٹھ کر ذرا ٹہلتا ہوں تو بدن میں کاہلی کے ساتھ اپنے پیر میں ہلکا ہلکا درد محسوس کرنے لگتا ہوں تو پیروں کو فرش پر پیٹ کر سارے بدن میں حرکت کی ضرورت اس حرکت کو محسوس کر کے گھر سے نکل کر لوگوں کی موجودگی محسوس کرنے کے لئے قریب کے ریستوران کی راہ لی

جاتا ہوں لیکن یہاں جو بیٹھتے ہیں میری طرح اداس اور
بیزار۔ جب ان سے طبیعت اکتا جاتی ہے تو پھر
HEATH کا چکر لگا کر پھر بستر پر لیٹ جاتا ہوں۔ نیند
کب آ گئی یہ مجھے یاد نہیں۔ صبح سویرے آنکھ کھلی حسب
معمول بستر چھوڑنے سے پہلے بستر پر پڑے پڑے سورۂ
فاتحہ شعور کو مخاطب کر کے پڑھنا شروع کیا۔ آرام اور
نیند سے طبیعت میں جو تازگی کا سا احساس پیدا ہو گیا
تھا۔ سورۃ کو زبان سے ادا کرنے سے اس آیت کا
مفہوم ذہن میں شدید روحانی فرحت کا احساس
میٹھے رس کی طرح میرے وجود میں تیرنے لگتا ہے کلام اللہ
(قرآن مجید) کی یہ سورۃ میری مونس و غم گسار ہے
اسے دہرانے سے میرے اندر اللہ کی محبت اور رجائیت
ابھرنے لگتی ہے۔ اس محبت اور رجائیت کو قوت کی
طرح محسوس کر کے جلدی سے بستر چھوڑا۔ تھوڑی
دیر لیٹا رہا گیا۔ اس کے بعد فجر کی قضا نماز ادا کی نماز کے
قضا ہونے کا احساس، احساس جرم کی طرح تھا۔ نماز
سے فارغ ہو کر ناشتہ تیار کیا۔
دو انڈے۔ براؤن ڈبل روٹی پر چیز کے ٹکڑے
ان پر شہد آدھا سیر گرم گائے کا دودھ۔ جب اس
ناشتے سے پیٹ بھر گیا تو اسے ہضم کرنے پھر گھر سے
ٹہلنے کے لئے نکل گیا۔ جلدی سے واپس آیا کیونکہ ریڈیو
سے صبح کی خبریں سننا تھیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے خصوصاً
مسلم ممالک اور ہندوستان اور پاکستان میں ریڈیو
کی خبریں ۱۵ منٹ میں ختم ہو گئیں تو ریڈیو پر دوسرا پروگرام
شروع ہوا جو مجھے پسند نہ آیا۔ دوسرا اسٹیشن سننا
چاہا وہاں پوپ موسیقی ہو رہی تھی، جہاں چیخنے چلانے
اور
کے مجھے کچھ نہ ملا۔ ریڈیو بند کیا ٹیلی
ویژن کھولا۔ اس کے پروگرام سے بھی طبیعت کو کچھ
نہ ملا۔ چھٹی کا دن تھا پھر HEATT کی سیر کو نکل
گیا۔

ہیمپسٹیڈ میں جس گلی میں میرا گھر ہے اس سے
ملی ہوئی گلی میں انگریزی کے مشہور شاعر KEAT
کا گھر ہے جو اب لائبریری اور میوزیم میں تبدیل کر دیا
گیا ہے۔ میں نئی کتابوں کی تلاش میں اس لائبریری
میں بھی گیا۔ کوئی نئی کتاب نہ ملی تو لائبریری کے باہر آیا
تو برسات کی پھوار شروع ہو گئی لیکن موسم سرما کی خوشگوار
ہوا تھی اس کے جھونکے کھا کر سیدھا کی طرف
چل دیا ہیتھ کا تالاب KEAT کے گھر سے دور نہیں
وہاں پہنچ کر تالاب کے ٹھہرے ہوئے پانی میں جو
بوندیں پڑ رہی تھیں۔ اس سے لہریں چھوٹی چھوٹی مچھلیوں
کی طرح اچھلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اور انھیں
لہروں کے قریب بطخیں تیر رہی تھی۔ پیڑ بھی سر
جھکائے کھڑے تھے۔ ہوا کے جھونکوں سے وہ بھی
کبھی کبھی لہرانے لگتے۔ تالاب کے کنارے کچھ کبوتر
اور چڑیاں اپنے پیروں کو پھیلائے اس بوندا باندی
سے لطف لے رہے تھے، اس منظر سے بڑا لطف
اٹھایا اور اس لطف کی خاطر وہیں مینہ میں بھیگتا
رہا۔ تھوڑی دیر بعد تالاب کے کنارے کنارے
ٹہلنا شروع کیا۔ راستے میں مجھے دو کتے ملے۔ اس
وقت وہ بھی موج میں تھے۔ دل بہلانے کی خاطر دونوں
میری طرف آئے ان کے بھیگے بالوں سے اپنے کپڑے
ضرور بچائے کیونکہ مجھے ظہر کی نماز ادا کرنا تھی۔ لیکن
یہ دونوں کتے دوستی کا جذبہ لے کر میرے قریب آئے
تھے۔ میں نے ان دونوں کے سروں پر ہاتھ پھیر کر انھیں
پیار کیا تو وہ دُم ہلا کر مجھ سے چمٹنے لگے تو اپنے کپڑے
کو میں نے ان کے بھیگے ہوئے بالوں سے پھر بچایا اور
انکی زبان سے اپنے ہاتھ کو بچا کر اس کے سروں کو
تھپتھپاتا رہا۔ ذرا فاصلے پر ان دونوں کتوں کی انگریز
ادھیڑ عمر کی مالکہ محبت کے اس کھیل کو بڑی توجہ سے
دیکھ رہی تھی۔ جب کتوں کے لپٹنے چمٹنے سے میں نے
خود کو بچایا تو مالکہ کو بڑا ناگوار گذرا لیکن ان دونوں
کتوں نے میری محبت کو محسوس کر لیا تھا اس لئے آداب "

کو سننے کے باوجود زبانیں نکالے مجھے دیکھتے رہے مالکہ
کی دور کی آواز پھر آئی تو دونوں نے اپنی مالکوں کو دیکھا
میں نے پھر ان کے سروں پر آخری بار ہاتھ پھیرا اور وہ
انسانی محبت کے آخری لمس کو محسوس کر کے چھلانگیں
لگاتے ہوئے اپنی مالکہ کے پاس پہنچ گئے۔

(۱۲ جولائی ۱۹۷۶ء)
ہمپسٹیڈ فنکاروں کی بستی ہے انگریزی
زبان کے مشہور شاعروں ادیبوں اور مصوروں نے
یہاں اپنی دنیا بسائی ہے بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک کے
مشہور دانشوروں اپنا وقت گذار چکے ہیں۔ کارل
مارکس کی قبر اسی بستی سے نکھوا دیے ہے۔ رابندر ناتھ
ٹیگور۔ ڈی۔ ایچ لارنس بھی اسی محلہ کی گلیوں میں
رہے ہیں۔ اسی بستی کے چھوٹے چھوٹے کیفے اور شراب
خانے ان دانشوروں اور فنکاروں کی آماجگاہ
بنتے رہتے ہیں۔ ہمپسٹیڈ کے انہی مشہور ریستورانوں
KUKURUZ ریستوران بھی خاص اہمیت رکھتا ہے
اس ریستوران کی اہم خصوصیت کا نام MAT: POMATZE
ہے۔ آسٹریا کے کیک اور کافی اس کا مالک اس ایک
خوبصورت شہری بڑے دلچسپ ہیں ادیب
شاعر، صحافی، مصور، دانشور پروفیسر، موسیقار
اداکار سب ہی شامل ہیں۔ سہ پہر یہاں بڑی دلفریب
ہوتی ہے۔ ان ری شخصیتوں میں ایک بزرگ مصور
MR: DACHINGER زرد تباہوا رنگ۔ نہایت
ملنسار، مسکراہٹ ان کے چہرے پر ہلکی دھوپ کی طرح
پھیلی رہتی ہے۔ ہمپسٹیڈ کی بہت سی خوبصورت
لڑکیوں کے یہ محبوب ہیں۔ وہ ساری خوبصورت لڑکیاں
جن کے بوسوں کے لیے یہاں نوجوان ترستے رہتے
ہیں۔ وہ اس ریستوران میں داخل ہوتے ہی
MR. DACHINGER کو چومتی ہیں۔ اس وقت اگر
ان کا موڈ اچھا ہوا تو ان میں سے کسی لڑکی کو منتخب کر

کے اس کی تصویر بناتے رہتے ہیں۔ لیکن اس تصویر کو وہ
فروخت نہیں کرتے۔ انکی تصویروں کی نمائش آسٹریا
کے شہر GMUNDEN (جہاں وہ پیدا ہوئے) میں
ہوتی ہے اس کے علاوہ لندن میں بھی مسٹر ڈاخنگر کی بیوی
بھی مصورہ ہیں لیکن انھیں پھولوں اور ترکاریوں سے
دلچسپی ہے (بلکہ عشق کہیئے) پھول کو وہ ایک عورت
کی نظر سے دیکھتی ہے اور اس کی تصویر بنا کر اس پھول
کو زندوں میں شامل کر دیتی ہے۔ لیکن مسٹر ڈاخنگر
کو انسانی چہروں سے دلچسپی ہے۔ چہروں پر کیفیات
کا مطالعہ تصویروں میں ان کا موزوں ہوتا ہے ویسے
تو ان کی کئی کامیاب تصویریں ہیں لیکن ان ساری
تصویروں میں ایک کلاسیکی حسن رکھنے والی آسٹریا
کی لڑکی MISS CLAUDIA کی تصویر شاہکار کی
حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا جسم اس پر ڈھیلا ڈھالا سادہ
لباس، صورت و سیرت میں فرشتوں کی سی معصومیت
اس حسین عورت کا جمال وجلال سائیوں کی طرح اس
کے چہرے پر نمایاں ہے۔ بڑی نیک طبیعت مضبوط قوت
ارادی کی مالک خاتون مگر ذرا الجھی ہوئی جس کی وجہ
سے گہری اداس آنکھوں میں جھیل کی سی گہرائی۔ جب
کبھی وہ خوش ہوتی تو اس کی قہقہوں میں جل ترنگ کے
ساز بجنے لگتے اور گہری آنکھوں میں گرمیوں کے
خوبصورت آسمان کی سی وسعت پیدا ہو جائے لیکن خوشی اس کے
حصہ میں بہت ہی کم آتی ہے کیونکہ اسے ابھی تک معلوم
نہ ہو سکا کہ وہ زندگی سے کیا چاہتی ہے۔ ان دنوں
ہمپسٹیڈ کے اکثر دانشور اور فنکار بیکاری کی
وجہ سے اپنا زیادہ وقت خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ
گزارتے ہیں MR: PETER. SINCLAIR
جنھوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں
ایم۔ اے کیا۔ اس کے علاوہ دس زبانوں کے ماہر ایک
مشہور صحافی کے لخت جگر۔ اچھے شاعر، عمدہ موسیقار
عورتوں کے شوقین نہایت فیاض ملنسار اور زود حس۔

اپنی محبوباؤں کے خطوط اور اپنی بیاض اکثر کھوتے رہتے
ہیں لیکن انکی وہ ڈائری جس میں انکی محبوباؤں کے فون نمبر
ہیں وہ ضرور ان کے ساتھ رہتی ہے۔ اگر کبھی ان کا کوئی
دوست ان کے گھر چلا جائے تو ان کی نیک طینت والدہ
مہمان کے لئے چائے اور اپنے ہاتھ کا بنا ہوا کیک ضرور
پیش کرتی ہیں۔ مسٹر پیٹر بھی ہمپسٹیڈ کے اس سرکل
کی ایک اہم شخصیت ہیں۔ مسٹر ڈاخنگر نے انھیں بھی اپنے
آرٹ کا موضوع بنایا ہے۔

ہمارے بزرگ مصور کی عمر اس وقت ۷۱ برس کی
ہے لیکن پابندی سے اپنے مقررہ وقت پر وہ اس ریستوران
میں داخل ہوتے ہیں جو جاننے والے ہیں وہ انھیں سلام
کرتے ہیں۔ وہ ان سارے سلاموں سے خوش ہو کر
اپنی مخصوص سیٹ پر بیٹھ جاتے ہیں لوگوں کا جائزہ
لیتے ہیں جو چہرہ انھیں متاثر کرتا ہے اس کے قریب
جاکر نہایت شائستگی اور اپنائیت سے اس کی تصویر
بنانے کی درخواست کرتے ہیں۔ یورپ میں ایک آدھ لڑکی
کا موڈل بننے سے کون انکار کر سکتا ہے۔ خصوصاً خوبصورت
عورتیں کیونکہ یہ تو یہاں ایک طرح کا اعزاز ہے۔ اپنے
مخاطب کی تصویر بنانے سے پہلے وہ اسے کچھ پینے کی
پیش کش کرتے ہیں۔ اس کے بعد اپنی تخلیق میں مصروف
ہو جاتے جب وہ اپنا قلم اٹھاتے ہیں تو سوائے اپنے
موضوع کے کسی اور طرف دھیان نہیں دیتے۔

لوگوں کے چہروں میں انکی اصل شخصیت کو تلاش
کرنے کا انھیں سلیقہ ہی نہیں بلکہ ملکہ حاصل ہے لیکن جو اب
کی شخصیت کی تحقیق میں جس شفقت اور انسان دوستی
کا وہ ثبوت دیتے ہیں وہ انکی ذات کا حصہ ہے۔ انکی
شرافت نیک طینت مخاطب کی کریہہ صورت میں
وہ تاثر جو اس کے افعال اور خیالات سے اس کے
چہرے اور حرکات میں پیوست ہو گئی ہے۔ اس
کا اظہار بھی بڑی شفقت سے کرتے ہیں۔ مسٹر ڈاخنگر
ان دنوں بڑے بیمار رہے جسم کے مختلف حصوں میں
کرب ناک درد رہتا ہے۔

اس وقت اس درد سے گھبرا کر وہ موت کو ترجیح دیتے
ہیں کہ کاش انھیں اس وقت موت آجائے تو انھیں
اس درد سے نجات ملے۔ جب یہ درد دور ہو جاتا
ہے تو اسے بھول کر پھر کیفیے میں آجاتے ہیں۔ اس وقت
ان میں تصویر بنانے کی سکت ہوتی ہے تو اپنی تخلیق
میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اگر اس کے قابل نہیں
ہوتے تو اپنے جاننے والوں سے گفتگو کر کے زندہ
رہنے کا لطف لیتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں۔

"جب تک زندہ رہو زندگی کا لطف حاصل کرو"

ڈاخنگر صاحب کو کینسر ہے ڈاکٹر نے انھیں صرف زندگی
کے ۲ مہینے اور دیئے ہیں لیکن اس قلیل مدت کی انھیں
فکر نہیں انھیں موت سے زیادہ درد سے ڈر لگتا ہے
ان کے مثانے میں کینسر تھا اس کا آپریشن ہوا اس
آپریشن سے جو درد اور تکلیف انھیں ہوئی اسے
برداشت کیا۔ وہ تجربہ ان کے ذہن میں ابھی تک زندہ
ہے۔ بیمار پھر پڑے۔ ڈاکٹر نے انھیں پھر آپریشن
کا مشورہ دیا جسے انھوں نے قبول نہ کیا۔ درد ہوتا ہے
تو بستر پر پڑے رہتے ہیں جب اس سے نجات ملتی ہے
تو درد اور موت دونوں کو بھول کر اپنے مقررہ وقت
پر اس ریسٹورینٹ میں آجاتے ہیں۔ اور کچھ تصویریں
بنا کر شام کو ٹھیک ۷ بجے ریستوران کو چھوڑ کر اپنے
گھر چلے جاتے ہیں۔ انکی بیوی شام کو کھانا پکا کر گھر پر
ان کا انتظار کرتی ہے دونوں باورچی خانے میں بیٹھ
کر کھانا کھاتے ہیں۔ اس کے بعد ٹیلی ویژن دیکھتے
ہیں۔

اس   میں انھیں نیند آجاتی ہے دوسرا
دن پھر شروع ہوتا ہے وہ پھر یہاں آجاتے ہیں۔ ان
دنوں ہمپسٹیڈ کی حیثیت بالکل جزیرے کی سی ہو کر رہ
گئی ہے۔ فنکار اور دانشور یہاں برسوں سے رہتے ہیں
انگریزی کے مشہور شاعر KEAT

بورج اور ویل مشہور روسی رقاصہ PAVLOVA
ڈی ایچ D-H . LAWRENE - ہندوستان کے مشہور
شاعر رابندرناتھ ٹیگور کا گھر بھی اسی بستی کے ایک کونے
میں ہے۔
ان دنوں خوابوں اور روحان سے دلچسپی رکھنے والے
لوگ جو یورپ کی مصروف زندگی سے گھبرا کر یہاں
آتے رہتے ہیں۔ اس بستی کے ماحول اس کے لوگ اس
کے کیفے انکی دیواروں پر بدھ مت۔ ہندو مت، یوگا۔
صوفی لوگوں کے پیغامات کے اشتہارات اور یورپ
میں موسیقی کی تقریبات کی اطلاع وغیرہ۔ انڈو پاکستان
کھانوں کے بھی یہاں کافی ریستوران ہیں جہاں سالن کی تیز تند
اور خوشبو اس کے ساتھ مشرق کا ماحول۔ محرابوں میں
قندیلیں۔ دیواروں پر تاج محل اور دوسری مشہور عالم تاریخی
عمارتوں کی تصویریں۔ قندیلوں کی دھیمی روشنی۔ شیلوں
پر سرخ کپڑے۔ مغربی آدمی کے لئے ایسے ماحول میں
بیٹھ کر بریانی تنوری روٹی، بھنا ہوا گوشت کھانا
ایک ایسا تجربہ ہے جو عرصہ تک اس کے ساتھ سائے
کی طرح رہتا ہے۔ عموماً ہمارے کھانے یہاں انگریز
اور دوسرے تعلیم یافتہ لوگ اور فنکار کھاتے ہیں۔
میں کہیں کہیں دیسی ریستورانوں
میں مغربی لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے ان دنوں یورپ
اور امریکا میں چینی اور انڈو پاکستانی کھانے مغربی تعلیم
یافتہ طبقے کے کھانے بن چکے ہیں لیکن بڑے مہنگے اس
کے علاوہ عرب کی عورتوں کے لباس۔ مشرقی زیورات
انگریزی اور یورپی جدید تعلیم یافتہ عورتوں کا محبوب
لباس بن چکا ہے۔ ذہنی سکون اور مرنے کی تلاش
کے لئے یوگا۔ صوفی ازم، بدھ مت گرمیوں کے زمانے
میں موسم سے لطف اندوز ہونے کے لئے عربی لباس
اور کرتے ہیمپس ٹیڈ میں یہ ساری چیزیں آپ کو
ملیں گی۔ گرمیوں کے زمانے میں ہفتے اور اتوار کے
روز ہیمپس ٹیڈ کے تالاب کے کنارے آرٹ اور

کرفٹ کا میلہ لگتا ہے۔ فنکار اپنی بنائی ہوئی
تصویریں، مجسمے، زیورات اور دوسری چیزیں بنا کر
فروخت کرنے کے لئے ہیمپس ٹیڈ کے اس میلے میں
آتے ہیں۔ آرٹ اور کرافٹ کے شیدائی فراخدلی سے
ان چیزوں کی قیمت ادا کر کے اپنے گھروں کی سجاوٹ
کے لئے لے جاتے ہیں۔
اس مادّی تحفظ اس کی پیدا کردہ تنہائی کے زمانے
میں ہیمپس ٹیڈ HAMPSTEAL HEATHE کی
بستی جواب بدل کر صرف ایک جزیرہ ہی نہیں بنی بلکہ ان
دنوں اس کی حیثیت ایک گھر کی سی ہو گئی ہے۔ اور
یہ چھوٹے چھوٹے کیفے اور شراب خانے اس ایک پرانی حویلی
کی مختلف کھڑکیاں بن کر رہ گئی ہیں۔ جدید مغربی
زندگی میں کیفے ہوٹل، شراب کی زندگی بڑی اہمیت
رکھتی ہے ہمارے زمانے کے صنعتی نظام نے خاندان
اور گرہستی کے تصوّرات کو جس طرح پارہ پارہ کیا ہے
اس کی علامات یہاں بڑی نمایاں ہیں۔ ان دنوں یہاں
گھروں سے زیادہ یہ طرح طرح کے خانے آباد ہیں۔
انہی ہنگاموں اور روشنیوں میں یہاں کی نسل کے ساتھ
ہمارے کھاتے پیتے گھروں کے لوگ بھی پروان چڑھے
جو مغرب میں تعلیم کی غرض سے آئے تھے۔ اس تعلیم نے ان
کو نسی تخلیقی کی اہمیت کو ابھار کر پروان چڑھا یا وہ
تو مجھے ڈھونڈے سے بھی نہ ملی۔ البتہ ان کے غرور اور
نوکرشاہی ذہنیت سے جو نقصان ہمیں اپنے وطن
میں اٹھانا پڑا اس کی یادیں تاریخ میں محفوظ ہی نہیں
بلکہ وہ ہماری اجتماعی زندگی میں ابھی تک ہمارا سائے
کی طرح تعاقب کر رہی ہیں لیکن ہم تو بہت سی ناانصافیوں
کی طرح اس کو بھی سہنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ البتہ ہمارے
قومی شاعر اکبر الہ آبادی کو اس نسل کے یہ چھن بالکل پسند
نہ آئے تو اپنے احتجاج کا شعر میں اس طرح اظہار کیا ہے

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر

اس شعر میں اس کا آغاز ہی نہیں انجام دردناک انجام بھی موجود ہے۔ لیکن جس تہذیب میں یہ سفر شروع ہوا اس کے انجام کا ابھی پتہ نہیں۔ معیار زندگی بڑھ چکا ہے گھروں میں عیش وعشرت کے ساتھ کشادگی بھی آچکی ہے لیکن اس کے باسیوں کے دلوں کی طرح خوبصورت چیزوں اور عشرتوں سے سجے ہوئے گھروں کی طرح یہاں کے لوگوں کے دلوں کی طرح ویران ہیں۔ اس ویرانی کو وہ جتنا دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کوششوں سے اور بڑھنے لگتی ہے۔ اس لئے گھر اور دل کی ویرانی گھبرا کر وہ جنگلوں کھیتوں اور شراب خانوں کی طرف بھاگتے ہیں۔ ہمیں ٹیڈ میں یہ ساری چیزیں موجود ہیں۔

آج مغرب کی مادی تہذیب سے اکتائے ہوئے لوگ پھر ایسے گھر جانے اور بسانے میں مصروف ہیں جہاں دوسری انسانی شکایتیں اور غم تو ہوں لیکن تنہائی اور انسانی بے تعلقی نہ ہو۔

ایک دن مسٹر ڈاخنگر KUKURU کے ریستوران میں نہ آئے اپنے مقررہ وقت پر نہ آئے بلکہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر لندن کے قریب ایک جنگل میں ڈھونڈنے چلے گئے ریستوران میں ان کا بڑا انتظار رہا۔ ان انتظار کرنے والوں میں MSS AOLA بھی تھیں۔ انتظار کی کوفت جب انھیں ستانے لگی تو مجھ سے مخاطب ہوئیں "میرا خیال ہے اگر میں بیمار پڑی تو MR JAME-S-HAMILTON اور مجھے دیکھنے ضرور آئیں گے لیکن اس وقت اپنے دل کی بات کہتے ہوئے جو اعتماد ان کے الفاظ میں تھا وہ محترمہ کی آنکھوں اور لب لہجہ میں نہ تھا۔

۱۹۸۳ء کے اوائل میں ہم

نمائندہ نئی نسلیں

کا

عصری ادب مسائل نمبر

پیش کرنے کا اعلان کرتے ہیں

صرف ادب ہی نہیں۔
ادب کے محرک مسائل بھی ہیں —
آیئے ہم ان پر غور کریں

توصیف تبسم (اسلام آباد، پاکستان)

تھا پسِ مژگانِ تر اک حشر برپا اور بھی
میں اگر یہ جانتا شائد تو روتا اور بھی

پاؤں کی زنجیر گردابِ بلا ہوتی اگر
ڈوبتے تو سطح پر اک نقش بنتا اور بھی

آندھیوں نے کر دیئے سارے شجر بے برگ و بار
ورنہ تب پتے کھڑکتے دل لرزتا اور بھی

روزنِ در سے ہوا کی سسکیاں سنتے رہو
یہ نہ دیکھو ہے کوئی یاں آبلہ پا اور بھی

ہر طرف آواز کے ٹوٹے ہوئے گرداب ہیں
روشنی کم ہے مگر چلتا ہے دریا اور بھی

صرف تو ہوتا تو تیرا وصل کچھ مشکل نہ تھا
کیا کریں تیرے سوا کچھ ہم نے چاہا اور بھی

آرزو غم کی مسافت ہے تو تنہا کاٹیے
دن کے محشر میں تو ہو جائیں گے تنہا اور بھی

مرتے مرتے روشنی کا خواب تو پورا ہوا
بہہ گیا سارا لہو تن کا تو دن آدھا ہوا

راستوں پر پیڑ جب دیکھے تو آنسو آ گئے
ہر شجر سایہ تھا تیری یاد سے ملتا ہوا

صبح سے پہلے بدن کی دھوپ میں نیند آ گئی
اور کتنا جاگتا میں رات کا جاگا ہوا

شہرِ دل میں اس طرح ہر غم نے پہچانا مجھے
جیسے میرا نام تھا دیوار پر لکھا ہوا

زیست کے پُر شور ساحل پر گئے لمحوں کی یاد
جس طرح سایہ ہو سطحِ آب پر ٹھہرا ہوا

گم ہوئے وہ آشنا چہروں کے آئینے کہاں
شہر ہے سارے کا سارا دھند میں ڈوبا ہوا

وصل کے بادل ذرا تھم حسنِ قامت دیکھ لوں
پیاس کا صحرا تو ہے تا چشمِ تر پھیلا ہوا

مجھ کو آشوبِ حکائت جان لینے کی ہوس
اور یہ تیرا بدن اک داستاں کہتا ہوا

غم جو ملتا ہے تو اے توصیف سینے سے لگا
کس نے لوٹایا ہے یوں مہمان گھر آیا ہوا

نثار ناسک
(راولپنڈی)

پرائے لوگوں نے طے کر لیا ہے سفر میرا
کہ میرے پاؤں سے لپٹا رہا ہے گھر میرا

میں عمر بھر کا سکوں دے کے بھی رہا مقروض
وہ سود خورِ محبت ہے یا ہے سر میرا

میں تیری عمر کے ہر روپ کی امانت ہوں
کہ پل رہا ہے تری سیپ میں گہر میرا

وہ بے ستوں بھی مری ذات جو تیرے تھے ہیں
مجھے اجاڑ گیا تیشۂ ہنر میرا

وہ میرا ہو کے بھی ظاہر نہیں ہوا مجھ پر
یہ اختلاف رہا اس سے عمر بھر میرا

راشد متین
(اسلام آباد)

مرے حروف مرے چارہ گر نہ ہونے پائے
مرے خیال مرے ہم سفر نہ ہونے پائے

اک اژدہام دعاؤں کا میرے ساتھ چلا
مگر وہ لفظ وہ لمحے امر نہ ہونے پائے

تمام شہر پہ اتری قبول کی آیت
یہ اور بات ہمیں باخبر نہ ہونے پائے

اسی لئے مرے گھر کے چراغ روشن ہیں
کہیں یہ شام الم دربدر نہ ہونے پائے

ترے گذر کے لئے کہکشاں بچھائی گئی
دفورِ شوق میں ذرے قمر نہ ہونے پائے

یہ چاندرات ستارے پہن کے نکلی ہے
خدا کرے کہ کئی دن سحر نہ ہونے پائے

جو برگ قتل ہوئے تھے نئی رتوں کے لئے
وہ فرش ہی پہ رہے معتبر نہ ہونے پائے

عارف شاہد
(راولپنڈی)

جسموں کے اوراق پہ لکھے راز وہ عریاں کر جائیں گے
جو مقتل کے سائے سائے آخر اک دن مر جائیں گے

خون سے بوجھل ایسا بادل دیس کی مٹی پر برسے گا
جلتے بجھتے بام دریچے اک دلدل میں اتر جائیں گے

چوکھوں پر سناٹا ہوگا صحنوں میں ویرانی ہوگی
بازاروں میں گھومنے والے لوٹ کے جس دم گھر جائیں گے

ہونٹوں پر جب تالے ہوں گے اور پابندی تحریروں پر
کاٹ کے کورے کاغذ پر ہم اپنی زباں دھر جائیں گے

اس کے بھرم کا مینارہ تقسیم نہ ہوگا ذروں میں
اپنا کیا ہم تو شاہد اس کاوش میں مر جائیں گے

مغنی تبسم
(حیدر آباد)

میں اپنے قدموں کی آہٹیں لو رہا ہوں لوگو
جو ہو سکے تو مری صدا کا عذاب سہہ لو
گزر چلوں میں یہاں سے جس دم، مرے رفیقو!
ہوا سے میرے نفس نفس کا حساب مانگو

چمن میں اب ہے نشاطِ بے دامنی، فراغت
ہوا ہے کس درد کا یہ انجام مجھ سے پوچھو
تمام گردش ہے میری آنکھوں کی دیکھتا ہوں
تم اس کو چاہو تو وقت کے نام سے پکارو
عجیب پرچھائیاں سی نظروں کے سامنے ہیں
اشارہ کر کے مجھے بلاتی ہیں، پاس آؤ
سنا رہا تھا میں اک کہانی کہ نیند آئے
چلو اسے بھول جاؤ اور اپنے آنسو پونچھو

عروج زیدی

ظلمت کا اعتبار بڑھائے ہوئے ہیں لوگ
دن میں ابھی چراغ جلائے ہوئے ہیں لوگ
ظاہر خلوص کار ہے باطن تباہ کار!
کچھ اپنی آستیں میں چھپائے ہوئے ہیں لوگ
گو زخم زخم ہیں ذرا تیور تو دیکھئے!
مقتل میں کیسی دھوم مچائے ہوئے ہیں لوگ
ذرّے ہیں اور ذرّے بھی درِ دشتِ ہوا یہ ہیں
ہر کس کو آسمان بنائے ہوئے ہیں لوگ
بربادیٔ سکوں کی شکایت بھی جرم ہے
سورج کی روشنی کے ستائے ہوئے ہیں لوگ
یہ ننگِ زیست مرگِ مسلسل سے کم نہیں
بارِ غمِ حیات اٹھائے ہوئے ہیں لوگ
ماحول پر نظر ہے نہ رفتارِ وقت پر
یعنی فریبِ ذات میں آئے ہوئے ہیں لوگ
یہ مرگِ ناگہاں کو تعجب کی بات ہے
کاندھوں پہ خود صلیب اٹھائے ہوئے ہیں لوگ
شہرت نصیب ہو کے یہ کہتا ہوں میں عروج
ذرے کو آفتاب بنائے ہوئے ہیں لوگ

عزیز بگھروی

اٹھے تو تھے ارباب ستم سوچ سمجھ کے
سب مل گئے مٹی میں بھرم سوچ سمجھ کے

ہر چند ہے کانٹوں سے بھری راہ ہماری
ہم نے بھی اٹھائے ہیں قدم سوچ سمجھ کے

یہ کاکل پیچاں تو نہیں ہیں کہ سنور جائیں
بل وقت کے ماتھے پہ ہیں خم سوچ سمجھ کے

ہر لمحہ وہی درد وہی سوز کا عالم
ہوتے نہیں کچھ زخم بھی کم سوچ سمجھ کے

اٹھتا ہے اگر درد نکل پڑتی ہیں چیخیں
کرتے نہیں اظہار الم سوچ سمجھ کے

ملتا ہی کہیں نقش رفاقت دل ناداں
کھا ترکِ تعلق کی قسم سوچ سمجھ کے

شکوہ نہیں یہ وقت کی سوغات ہے یارو
اب خود سے بھی ملتے ہیں تو ہم سوچ سمجھ کے

جذبات کو دیکھے کہ وہ آداب کو دیکھے
دوراہے پہ ہے دیدۂ نم سوچ سمجھ کے

رکھا ہے بھرم ہم نے عزیز اس کے ستم کا
روداد الم کی ہے رقم سوچ سمجھ کے

احمد رئیس

لوگ سب پتھر بنے تھے کوئی جھنکاریں نہ تھیں
اسقدر گم صم کبھی اس گھر کی دیواریں نہ تھیں

بھیڑ تھی اب بھی وہی رستوں پہ لیکن دور تک
دوستوں کی جانفزا مانوس للکاریں نہ تھیں

چھین کر سب لے گیا ظالم ہماری روشنی
اس طرح پہلے ستم گاروں کی یلغاریں نہ تھیں

جس طرح پھیلا ہے اک آسیب سا اس شہر میں
اس طرح سہمی ہوئی پہلے یہ دیواریں نہ تھیں

اک نئی منزل کی جانب میں رہا ہر دم رواں
میرا رستہ روکتیں ایسی تو دیواریں نہ تھیں

عرض کرتے کس کے آگے اپنے دل کا ماجرا
ہم سے واقف شہر والوں کی یہ سرکاریں نہ تھیں

کس طرح رکھتا بچا کر اپنا پیکر میں رئیس
شہر میں محفوظ جب لوگوں کی دستاریں نہ تھیں

رفعت سروش

بستی بستی سناٹا ہے، دریا دریا تشنہ لبی!
یہ معراج تمدن کی ہے، یہ تہذیب کی بوالعجبی
عالی ہمت لوگوں نے تسخیر کیا اک عالم کو
سر کو تھامے ہانپ رہی ہے گھر بیٹھی عالی نسبی
ہر قطرہ سے لہو کے قاتل قاتل کی آتی ہے صدا
مقتل مقتل لئے پھرتی ہے مجھ کو میری ایذا طلبی
مصطفوی اقوال لبوں پر، چہروں پر نور ایمان
دل کے کسی گوشے میں لیکن اب بھی چھپی ہے بولہبی
سارے چمکتے دن ان کے ہیں جن کے دل تاریک بہت
ہم نے چراغ فکر جلائے، کم نہ ہوئی پر تیرہ شبی!
شہرت ایسا تاج جس کی خاطر گھر کو پھونک دیا
بے سر و سامانی میں لیکن بے معنی ہے خوش لقبی!
اس دنیا کی عدالت میں کس طرح زباں کھولوں میں سروشؔ
جھوٹ سے مجھ کو نفرت ہے اور سچ کہنا ٹھہرا بے ادبی

کبھی ہیں لطف و محبت کبھی ہیں جاہ و جلال
نگاہ ہو تو پرکھ میری زندگی کا جمال!
ترے سوال کو سن کر میں اس لئے چپ ہوں
جواب دونگا تو پیدا کروں گا لاکھ سوال
نہ جانے قید ہوا کب ہوس کے زنداں میں
نہ جانے کس نے بنا میرے گرد مکر کا جال
نہ جانے کب سے کھڑا ہوں میں دل کے صحرا میں
غم فراق، رم جستجو، نہ شوق وصال
چہار سمت نگاہیں بچھائے بیٹھا ہوں
کوئی تو راہ ملے جو نہ ہو ابھی پامال
سروشؔ درد کے نشتر رگوں میں پنہاں ہیں
مگر لبوں پہ ہنسی، ہائے زندگی کا کمال

فاروق شفق

زرد کرتی ہوئی پھولوں کو خزاں گزرے گی
اب جو رُت آئیگی بے نام و نشاں گزرے گی

دن میں تو گلیاں بھی آباد تھیں گھر آنگن بھی
شہر والوں پہ مگر رات گراں گزرے گی

تم سے ممکن ہو تو دیوار پہ لکھا پڑھ لو
میں کہوں گا تو مری بات گراں گزرے گی

رات کے خواب ان آنکھوں میں سجاؤں کیسے
دن ہی جب گزرا نہیں رات کہاں گزرے گی

سر پہ چھت گرتی ہے دیواریں دباتی ہیں شفق
گھر کا یہ حال ہے تو کیسے یہاں گزرے گی

رئیس رامپوری

دوستی کی علامتیں ہیں بہت
ان کو مجھ سے شکایتیں ہیں بہت

خط جو آج اس نے مجھ کو بھیجا ہے
اس میں لفظی رعایتیں ہیں بہت

دوستی دشمنی سے مشکل ہے
دوستی کی نزاکتیں ہیں بہت

میرے اپنے تباہ کرنے کو
میری اپنی ہی عادتیں ہیں بہت

دل، کہ ہے بے نیازِ سود و زیاں
اور بڑوں کی ہدایتیں ہیں بہت

وقت ناساز گار ہو تو رئیس
چھاؤں میں بھی تمازتیں ہیں بہت

عبدالصمد
(پٹنہ)

مہمان

سبھی تھے گھر میں۔ ماں باپ، چار بھائی، دو بہنیں، چاروں بھائیوں کی بیویاں، دونوں بہنوں کے شوہر، ان کے بچے، باپ کا روز افزوں ترقی پر گامزن بزنس، پھر دو بڑے بھائیوں کے بزنس کے سلسلے کی مصروفیات، تیسرے کی اعلیٰ سرکاری نوکری، چوتھے کو تعلیم، بہنوں کے شوہروں کے الگ الگ بزنس اور ان کی مصروفیات، چھ کاریں، دو جیپ، چار اسکوٹر، چار گائیں، دو بھینسیں، چار کتے، دو بلیاں، دو طوطے، جو گڈ مارننگ اور گڈ نائٹ کہنا نہیں بھولتے تھے، یہ اور بات تھی کہ اپنے مالکوں کی طرح وقت کی پہچان ان میں بالکل نہیں تھی۔ وہ کبھی صبح میں گڈ نائٹ کہہ دیتے اور رات میں گڈ مارننگ، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ ان کے مالکان کو وقت کا خوب پتہ تھا۔

باپ سویرے اٹھ کر ضروریات، شیو، اخبار اور غسل ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر نکل جاتے تو پھر ان کی واپسی رات ہی میں ہوتی جس کے بعد سوائے سونے کے ان کے پاس اور کوئی چارہ نہیں رہ جاتا تھا۔ یوں بھی وہ واپسی میں اپنی تفریح کا سامان کلب میں بہم پہنچا آتے۔ دونوں بھائی اکثر ٹور پر رہتے اور اگر گھر پر رہتے بھی تو اس قدر مصروف اور بھاگ دوڑ رہتی کہ یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہو جاتا کہ وقت پر وہ سوار ہیں یا وقت ان کی سواری کر رہا ہے۔ تیسرے کے اوقات سرکار نے خرید لئے تھے جس کے بدلے میں اسے جو چیزیں ملی تھیں وہ کبھی وقت کے اعتبار سے بہت قیمتی معلوم ہوتیں کبھی بہت حقیر، اگرچہ یہ بات بھی دور کا جلوہ والوں کے لئے تھی۔ خود اس کے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ ان فضولیات میں پڑتا۔ جو تھا اتنا ذہین اور شوقین واقع ہوا تھا کہ کتابوں سے اس نے اپنی زندگی کا رشتہ کر لیا تھا اور جو بہت مشکل سے اس کے پاس کچھ وقت نکلتا بھی تھا تو وہ اسے کھیل کود اور تفریح میں اتنا احتیاط سے خرچ کرتا کہ اس کا حساب کتاب ہمیشہ برابر رہتا۔ بہنوں کے شوہروں کے اپنے الگ بزنس اور علیحدہ مصروفیات تھیں اور وہ کبھی کبھار ادھر آ بھی نکلتے تو ان کے پاس کہنے اور سننے کو اتنی باتیں ہوتیں کہ وقت ہمیشہ انھیں مختصر دکھتا ——— پھر بیگمات کی اپنی زندگیاں تھیں۔ اوّل تو گھر کی سجاوٹ بناوٹ سے ہی انھیں کم فرصت ملتی اور جو ملتی بھی تو شاپنگ، کلب، تفریح اور دوسری سماجی مصروفیات نے انھیں اپنے شکنجے میں اس طرح جکڑ رکھا تھا کہ ان کے پاس بھی وقت جیسی چیز عنقا ہو کر رہ گئی تھی۔ اگر کبھی کبھار ان لوگوں کے پاس کہیں سے اتفاقاً کوئی وقت نکل آتا تو اسے نگلنے کے لئے بہت سی ایسی ضروریات چاروں طرف سے منہ پھاڑے رہتیں جو لیوں تو کبھی نظر بھی نہیں آتی تھیں لیکن نظر آتیں تو ان کے چہرے کبھی اجنبی نظر نہیں آتے تھے۔

ایسے میں جب اس گھر میں ایک خط پہنچا جس میں یہ اطلاع تھی کہ ایک ٹریننگ کے سلسلے میں ایک ایسا فرد کچھ عرصہ کے لئے اس خاندان میں آ رہا ہے جس کے خاندان سے اس گھرانہ کے بہت ہی دیرینہ تعلقات ہیں جنھیں کسی قیمت پر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تو سبھی لوگ سخت فکر اور پریشانی میں گھر گئے۔ پرابلم یہ نہیں تھی کہ اسے کہاں ایڈجسٹ کیا جائے، اس کی تو کوئی کمی تھی ہی نہیں اگر درجن بھر بھی فاضل افراد چلے آتے تو بھی پتہ نہیں چلتا، اصل مسئلہ یہ تھا کہ ان لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اس میں کسی طرح بھی کسی اور کو سما سکتے اور یہ مسئلہ بھی اس لئے پیدا ہوا تھا کہ ان لوگوں کے کاندھوں پر سماجی احساسات کے جو بوجھ تھے اس سے وہ اچھی طرح واقف تھے اور یہ بات تو کوئی ڈھکی چھپی ہے نہیں کہ جب چوٹ برابر کی پڑتی ہے تو احساسات

بھی اسی رفتار سے بیدار ہوتے ہیں۔ لیکن تمام باتوں کے باوجود یہ بات اپنی جگہ اٹل تھی کہ وہ مہمان آرہا تھا اور اسے اس خاندان کے ساتھ محض اس لئے کچھ عرصہ گزارنا تھا کہ ہوٹل بہت اچھا ہونے کے باوجود گھر جیسا نہیں تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے تو اس کے قیام کی مناسب جگہ تجویز کی گئی اور دوسرے انتظامات کے سلسلے میں مشورے کئے گئے۔ حالانکہ مشورے کی میز پر بھی گھر کے سبھی افراد موجود نہیں تھے، لیکن جو موجود تھے انھوں نے اس کے لئے بھاری قیمتیں ادا کی تھیں لیکن سماجی ذمہ داریاں بہرحال انھیں عزیز تھیں۔

مہمان آیا تو خاندانی روایات کے مطابق اس کا استقبال کیا گیا۔ اس وقت سبھی لوگوں نے کامیاب کوششیں کی تھیں کہ کسی نہ کسی طرح گھر پر موجود رہیں کیونکہ تمام تر قسم کی مصروفیات کے ساتھ ساتھ سماجی احساسات کا توجہ بھی انھیں جنبش نہیں لینے دیتا تھا۔ مہمان بھی اپنے آپ سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ ان سے بھی اچھی طرح واقف تھا اس لئے اس نے آتے ہی یہ بات واضح کر دی کہ وہ صرف روایات کا پاس کرتے ہوئے ان کے ساتھ قیام کر رہا ہے ورنہ وہ خود بھی اس قدر مصروف رہے گا کہ شائد یہاں سونے ہی کا موقع اسے میسر آسکے۔ یہ سن کر اندر ہی اندر مہمان کی عزت اور اس کے احترام کا جذبہ ان میں شدید ہو گیا تھا لیکن اس کے باوجود اخلاقی تقاضے تھے جو انھیں مجبور کر رہے تھے کہ وہ اپنے مہمان کے آرام و آسائش کا اتنا خیال رکھیں کہ اسے گھر یاد نہ آئے کہ آخر اس گھر میں قیام کرنے کا کچھ تو مقصد پورا ہونا چاہئے لیکن مہمان تھا کہ وہ برابر اس کوشش میں مصروف تھا کہ کسی پر بھی بار نہ بنے۔ ہلکا پھلکا بنا رہے، کسی کو بھی اس کی ذات سے زحمت نہ ہو۔ اور ہوا بھی یہی اس کے اس رویئے کی وجہ کر سبھوں نے اپنے اپنے طور پر راحت محسوس کی اور اس بات سے انھیں خاصا اطمینان نصیب ہوا کہ وجہ کر ان کے معمولات اور ان کی مصروفیات میں کوئی فرق نہیں آنے کا اور یہ کہ ان کو مکمل اور ہر طرف سے قلعہ بند زندگی میں دراڑ پڑنے کا کوئی اندیشہ نہیں لیکن پھر بھی زندہ قوموں کی طرح احساسات تو ان کے اندر زندہ تھے ہی اور پھر سماجی ذمہ داریاں، خاندانی روایات، رکھ رکھاؤ اور اقدار و آداب کی ایک طویل فہرست تھی جسے وہ تعویذ کی طرح قیمتی دھاتوں میں محفوظ کر کے اپنے پاس رکھے ہوئے تھے اور کچھ محسوس ہو یا نہ ہو اس کا بوجھ تو اپنی جگہ ایک اٹل حقیقت تھا جس سے انکار کی گنجائش نہیں تھی۔

یوں تو مہمان سے ان کی ملاقات بہت کم ہی ہو پاتی کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ وہ اس گھر میں رہنے کے لئے نہیں آیا ہے اُسے صرف اپنے کام سے کام رکھنا ہے اسلئے اس نے کبھی اس خاندان میں خود کو ایڈجسٹ کرنے کی کوشش ہی نہیں کی پھر بھی وہ رات میں سوتا نہیں تھا اور صبح کی چائے کے وقت خاندان کے اکثر افراد اس کے ساتھ ہوتے۔

باپ جب اپنی تمام مصروفیات ختم کر کے گھر واپس آ رہے ہوتے تو ان کے ذہن میں اپنا مہمان در آتا جو ان کے ایک زبردست کا بیٹا تھا چنانچہ وہ اس کے لئے پھل ٹافی اور کیک وغیرہ لیتے آتے۔ اگر وہ جاگ رہا ہوتا تو اس سے دو باتیں ہو جاتیں، خیریت دریافت کی جاتی اور پھل وغیرہ کی پلیٹیں اس کی میز پر سجا دی جاتیں، دونوں بڑے بھائی اگر چند لمحوں کے لئے بھی گھر میں ہوتے تو اس میں سے چند چھوٹے لمحے مہمان کے لئے ضرور نکال لیتے اور باہر سے آتے وقت وہ اس کے لئے چھوٹی بڑی چیزیں تحفے کے طور پر لانا نہ بھولتے، تیسرا مہمان کو گڈ مارننگ کہہ کر ہی گھر سے نکلتا کیونکہ وہ بھی بہت دیر سے گھر چھوڑ دیتا تھا، چوتھا مہمان کے لئے اخبارات اور رسالے وغیرہ اس کے کمرے میں رکھ آتا اور اس کے آنے پر اسپورٹس نیوز سنانا نہ بھولتا۔ بہنوں کے شوہر بھی اگر ادھر آنکلتے تو مہمان کے کمرے میں جھانکنا نہ بھولتے۔ ماں نے اپنا یہ اصول بنا لیا تھا کہ وہ صبح کو اہتمام کے ساتھ مہمان کو چائے بھجوا دیتیں۔ بھائیوں کی بیویاں اس کے کمرے کے گلدان میں رنگ برنگے پھول سجاتی رہتیں۔ گھر کی دوسری عورتیں بھی مہمان کی چھوٹی سی چھوٹی ضروریات کا پورا خیال رکھتیں اور تو اور گھر کے جانور بھی مہمان کو اچھی طرح پہچان چکے تھے۔ چنانچہ اسے دیکھتے ہی پیروں میں لوٹنے لگتے بلیاں اس کی گود میں آکر بیٹھ جاتیں، طوطے گڈ مارننگ، گڈ نائٹ کہنا نہ بھولتے، گائیں اور بھینسیں تو اس کی خاطر کرتی ہی رہتیں اور گاڑیوں کا یہ حال تھا کہ ایک گاڑی تو مستقل اس کے استعمال میں تھی ہی۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ایک وقت وہ آگیا جب

بقیہ صفحہ پر

صفیہ ملک
(کراچی)

اعتراف

وہ بے چینی سے پینڈولم کی طرح مسلسل ٹہل رہا تھا۔۔۔ خیالات کا ایک ہجوم تھا جو اس کے تعاقب میں چلا آ رہا تھا۔ بدنامی اور ذلت کے پھنکارتے اژدہے منہ پھاڑے اسے نگلنے کو کمربستہ نظر آ رہے تھے۔

اس کے تصور کے کینوس پر ایک چہرہ نمودار ہوتا، حقارت کی ایک زہر بھری نظر ڈال کر غائب ہو جاتا۔۔۔ پھر ایک چہرہ ابھرتا۔ ایک تمسخر آمیز قہقہے کے ساتھ ڈوب جاتا۔ آوازوں کے نشتر بڑھے چلے آ رہے تھے۔

"ہونہہ! تو یہ تم ہو کمال احمد بی کام۔ ایل ایل بی"۔
"کم بخت! بنتا کتنا تھا!۔۔۔ رشوت نہیں لوں گا حرام ہے"
"کیا بناوٹ تھی اللہ اللہ۔ کہتا تھا آنکھیں کس طرح بند کر لوں اس میں محکمے کا نقصان ہے۔"

ان آوازوں سے گھبرا کر کمال احمد نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے ہتھیلیوں پر سخت دباؤ ڈالا لیکن آوازیں بدستور آتی رہیں۔ یہ تو اس کے اندر کی آوازیں تھیں نا!۔

آخر بے دم ہو کر وہ صوفے پر نڈھال سا گر پڑا۔ چند لمحے یونہی سرک گئے بے نام سے۔۔۔ پھر خواہش سے مغلوب ہو کر اس کے ہاتھ پتلون کی جیبوں میں گئے۔ کاہلی سے ادھر ادھر ہاتھ مار کر سگریٹ ماچس ڈھونڈ نکالی۔ سگریٹ سلگایا اور دیر تک ماچس کے ننھے شعلے کو گھورتا رہا جب تک شعلہ بھڑکتا رہا اس کی توجہ اسی پر مرکوز رہی اور جب تپش انگلیوں کو چھونے لگی تو تیلی ایش ٹرے میں پھینک کر ایک طویل کش لگایا اور پھر یکے بعد دیگرے کئی کش لگا لئے کچھ دیر بعد اسے یوں لگا جیسے اس کے اعصاب قابو میں آنے لگے ہوں۔ اب اس کے ذہن نے کام کرنا شروع کر دیا۔

ٹھیک ہے میرا برسوں کا صاف ستھرا ریکارڈ خراب ہو گیا ہے وہ بھی ایک ذرا سی بے احتیاطی کے نتیجے میں!۔۔۔ لیکن اب بھی وقت ہے!۔۔ ابھی کچھ تو کیا جا سکتا ہے!! ایسا بندوبست کر کہ راز نہ کھلے۔ بات نہ نکلے۔۔۔ اپنا بھرم بھی قائم رہے۔ ٹھیک ہے صدیقی صاحب سے بات کر لینے میں کیا حرج ہے۔

وہ کچھ مطمئن سا ہو گیا اور اپنی کنپٹی پر ہاتھ پھیرا جہاں سفید بال چاندی کے تاروں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ ان تاروں کی جگمگاہٹ نے پھر اسے سوچ کی وادی میں پہنچا دیا۔

دفتر کے لئے تیار ہوتے ہوئے پہلی بار جب ان بالوں پر اس کی نظر پڑی تھی تو ذہن کو ایک عجیب سا جھٹکا لگا تھا۔ یوں لگا جیسے چند نامعلوم ہاتھ غیر محسوس انداز سے زندگی کی بساط کو لپیٹنے لگے ہوں۔ پھر اس نے سر جھٹک کر اس تصور سے اپنا پیچھا چھڑا لیا۔۔۔ ابھی میری عمر ہی کیا ہے اور پھر بڑھاپا تو ایک احساس کا نام ہے۔ بے اختیار اس کے کانوں میں حفیظ جالندھری کے اشعار ملکہ پکھراج کے ہونٹوں سے بہتے ہوئے پہنچے۔ اور وہ
ابھی تو میں جوان ہوں، ابھی تو میں جوان ہوں" گنگناتا ہوا کچن میں پہنچا۔

"آج تو بڑے موڈ میں ہیں آپ"!

"ہاں۔۔۔ آج میں نے بڑھاپے کے عفریت کو پہلے قدم پر ہی کچل ڈالا ہے"۔

"مطلب"؟

"مطلب یہ کہ ایک ذرا شاندار سا ناشتہ کراؤ"۔

"تو یہ ہے ایک ذرا سی بات کے لئے اتنی لمبی تمہید"
رشیدہ خاتون نے مسکراتے ہوئے کمال احمد کو ناشتہ کروایا
اور وہ معمول سے زیادہ پرسکون ہو کر دفتر کو روانہ ہو گیا۔

کمال احمد ایک معمولی کلرک سے بڑھتے بڑھتے ایک سینئر افسر
کے عہدے پر پہنچا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کا ایک امیج بنتا گیا۔ وقت کے
تیز رفتار بہتے دریا کے جھاگ نے اس کے بالوں کو نئی چمک اور چہرے کو
نئی تازگی بخش دی تھی۔ جس پر دیانت اور امانت کی چھاپ بڑی نمایاں
تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب محکمے نے اسٹور انچارج کو معطل کیا گیا تو کمال
احمد کا گذشتہ صاف ستھرا ریکارڈ دیکھتے ہوئے ایگزیکٹو کی ایک میٹنگ
میں متفقہ فیصلہ کیا گیا کہ اسٹور کا چارج اب کمال احمد کے حوالے کر دیا
جائے۔ جب اسے چارج دیا گیا تو اسے یوں لگا جیسے تیزی سے سفید
ہوتے ہوئے بالوں نے بھی اس کی سفارش کی ہو۔

کمال احمد نے عہدے کا چارج لینے کے بعد ریکارڈ اور فائلوں
کی جانچ پڑتال کی تو ساری صورت حال اس کے سامنے آگئی۔ لیکن
اب اسے ایک نئی مشکل کا سامنا تھا۔ پہلے پہل تو لوگوں نے انتظار
کیا کہ شاید کمال خود پہل کرے۔ لیکن وہ اپنی جگہ ڈٹا رہا۔ انتظار کی
تاب ضرورت مند لوگوں میں کہاں؟ بھلا ہو مہنگائی اور بڑھتی ہوئی
ضروریات کا کہ کوئی ایک سر پر کفن باندھ کر اس کے پاس چلے آئے۔ بڑی
رازداری سے اسے نئے عہدے کے ظاہری و باطنی فوائد سے آگاہ کیا
تو کسی نے مبارکباد کے انداز میں کہا۔

"لیجئے کمال صاحب! اب آپ کے دن بھی پھر جائیں گے ۔۔۔
اب دیکھیں نا! آج کل سوکھی تنخواہ میں بھلا گزر کہاں ہوتا ہے۔ بس اب
بسم اللہ میرے کام سے ہی کیجئے۔"

جواب میں کمال احمد کی خونخوار آنکھوں اور پھنکارتے لہجے نے
تواضع کی تو مقابل کو دم دبا کر بھاگتے بنی۔

ان سب کا ساتھ اتنا پرانا تھا کہ بہت سے منچلے اس
وقتی خفگی کو سوڈا واٹر کے جھاگ کی طرح بہلے جاتے۔ وہ بھی اس
بات کو اپنی حد تک رکھتے ہوئے ان لوگوں کی شکایت افسرانِ بالا
تک نہ لے جاتا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اب لوگ پہلے سے زیادہ اس
سے محبت کرنے لگے تھے۔ لیکن مخالفت بھی زور دار پڑتی کہ مفاد
۔۔۔ سے آتا تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی عیاں ہوتی جا رہی تھی کہ اس
لینے دینے کے چکر میں بہت سے افسرانِ اعلیٰ کے ہاتھ بھی رنگے
ہوئے تھے۔ اور ان کے اہلکار انہی کے اشاروں پر اسے یہاں سے
ہٹانے کے در پے ہو رہے تھے لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔

شاید ہر قطرہ قطرہ مستقل مزاجی سے گرنے والا پانی بھی سوراخ
کر جاتا ہے ۔۔۔ یا منظور احمد کی درخواست کا انداز ہی نرالا تھا۔ یا پھر
یہ بات تھی کہ گذشتہ کئی روز سے اس کا پریشان پریشان ذہن قوتِ
فیصلہ کھو چکا تھا ۔۔۔ پائی پائی جمع کر کے خریدے ہوئے پلاٹ پر
اب نیلام کے آرڈر آ گئے تھے ۔۔۔ جس کی رو سے مالک کو زمین
بیچنا تھی یا مکان کی تعمیر شروع کرنا تھی۔ کئی ہفتوں کی کوشش کے باوجود
وہ ہاؤس بلڈنگ کارپوریشن سے قرضہ حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔
اور آج کل تین روز باقی تھے۔ گھر پر رہنا تو بیوی کی تلخ کلامی کو سہنا
پڑتا۔ بچوں کی سوال کرتی نظروں کا سامنا کرنا پڑتا۔

"پاپا کیا ہم کبھی اپنے مکان میں نہیں رہیں گے؟"

"کیا ہم ہمیشہ کرائے کے مکان میں رہیں گے؟"

اور اس کے پاس سوائے خاموشی اور شرمندگی کے کچھ نہ تھا
پھر ایسی صورت میں گھر بیٹھنا چہ معنی؟ ۔۔۔ وہ رسم پوری کرنے کے
انداز میں دفتر چلا آیا ۔۔۔ لنچ ٹائم میں منظور احمد نے اسے پکڑ
لیا۔ اس کے بعد اپنی سیٹ پر آیا تو نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے
بغیر دیکھے منظور احمد کے بل پر دستخط کر دیئے ۔۔۔ اور پھر کئی سرخ
سرخ نوٹ اس کی جیب میں چلے آئے ۔۔۔ چند لمحوں تک
تو وہ سن ہو کر رہ گیا۔ تب منظور احمد نے تسلی دی اور چپ رہنے
کا اشارہ کیا۔ اور پھر ۔۔۔ اس کی جھجک رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی۔
لیکن ایک کھٹک ایک چبھن ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ بعض اوقات
تو وہ پریشان ہو کر سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جاتا۔

"الٰہی میں کس دلدل میں پھنس گیا ہوں ۔۔۔ نکلنا چاہتا ہوں
لیکن نجات نہیں ملتی۔ خدایا میری مدد کر۔"

لیکن خدا نے اس کی کوئی مدد نہیں کی ۔۔۔ آخر اس نے ایک
فیصلہ کیا۔ اور اس پر عمل درآمد کا سختی سے پابند ہونے کا اپنے آپ
سے وعدہ بھی کر لیا۔

"ٹھیک ہے ۔۔۔ چھت پڑ جائے تو پھر ایک پائی بھی سور کے گوشت

برابر ہوگی۔"

لیکن سور کے گوشت نے پیچھا نہ چھوڑا۔

یہ اس کی احتیاط پسندی تھی یا قسمت کہ بہت کم لوگ اب بھی دوبدو اس کے سامنے آتے تھے۔

پھر ایک دن لاعلمی میں منظور احمد نے ایک بڑے آئٹم پر ہاتھ صاف کر دیا۔ کمال کو علم ہوا تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ منظور احمد سے سختی سے بازپرس کی تو وہ سچے سے ہی اکھڑ گیا۔ بغیر مانگے اس کا مقررہ حصہ اس کے حوالے کر دیا — لیکن جانے کیا لمحہ تھا کہ کمال احمد نے رقم اس کے منہ پر دے ماری۔ جواب میں منظور بھی دھمکی دے گیا۔ "سمجھ لوں گا — میرا نام منظور احمد ہے"!

منظور کی دھمکی نے اس کے چھکے چھڑا دیئے۔ تھک ہار کر سوچا سارا معاملہ خود صدیقی صاحب کے علم میں لے آئے لیکن ہمت نہ ہوئی — اس طرح تو اگلا پچھلا سارا حساب چکانا پڑتا — یہیں آکر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ پھر جانے کیسے اس بات کی خبر صدیقی صاحب کو ہوگئی۔

صدیقی صاحب ایگزیکٹیو بورڈ کے سینئر ممبر تھے، معاملے کے کھرے — طبیعت میں کھردرا پن — لیکن اپنے جونیئرز کی ہمت افزائی کرنا اور ان سے کام لینے کا ڈھنگ خوب جانتے تھے۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ کام پیارا ہوتا ہے آدمی نہیں۔ انھوں نے اپنے برتاؤ سے جہاں ایک رعب و دبدبہ قائم کر رکھا تھا وہاں ان کے لئے لوگوں کے دلوں میں جگہ بھی بہت تھی — جب ایسا آدمی کسی بدعنوانی سے آگاہ ہو جائے تو کیا وہ کسی کو بخش سکتا ہے؟ ایسا آدمی کسی سے کیا دب سکتا ہے جبکہ اس کی کوئی کمزوری کسی کے ہاتھ میں تھی ہی نہیں۔

صدیقی صاحب کے آگے تو ایک ہی سفارش چل سکتی تھی اور وہ تھی محنت، کام کی لگن، ایمانداری — شومئی قسمت کمال ان سے محروم ہو چکا تھا۔ بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی — یہ تو ظاہر تھا کہ واقف حال لوگوں نے ہی اس کی چغلی کھائی ہوگی۔ آخر کون ہو سکتا ہے؟ لیکن اسے کوئی سراغ نہ ملا۔

یہ شاید اس کے گذشتہ صاف ستھرے ریکارڈ کا اثر تھا کہ صدیقی صاحب نے بورڈ آف ایگزیکٹیو کے سامنے اس کا کیس پیش کرنے سے پہلے اس سے علیحدگی میں بات کرنا چاہی تھی۔

آفس ٹائم ختم ہو چکا تھا، لیکن وہ اب تک اپنے کمرے میں بیٹھا سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جا رہا تھا — آخر کئی گھنٹوں کی پیچ بچار کے بعد وہ صدیقی صاحب کے سامنے جا موجود ہوا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد صدیقی صاحب اصل مسئلے پر آ گئے۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے گلے میں پھندے پڑ گئے ہوں۔ بہت کوشش کی لیکن اپنی صفائی میں کوئی مضبوط دلیل پیش نہ کر سکا تب صدیقی صاحب نے اسے کچھ دیر بعد بنگلے پر آنے کو کہا جو دفتر کی عمارت کے احاطے میں ہی واقع تھا۔

کمال احمد دفتر سے اٹھا ادھر ادھر گھومنے کے بعد جھٹپٹے کے وقت صدیقی صاحب کے بنگلے پر پہنچ گیا جہاں وہ تنہا ہی رہتے تھے۔ میز کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ دفتر سے اٹھ کر انھوں نے صرف کپڑے ہی بدلے ہوں گے — اور اس وقت سے ان فائلوں سے برسر پیکار ہیں۔

"ہاں! تو تم کیا کہتے ہو؟"

"سر! میں بالکل بے قصور ہوں!"

"وہ تو اب مجھے معلوم ہو ہی گیا ہے کہ تم کتنے بے قصور ہو — اس وقت مجھے تم سے صرف یہ کہنا ہے کہ تمہاری ان حرکتوں پر ملازمت سے علیحدہ کئے جانے کے ساتھ ساتھ سزا بھی ہو سکتی ہے۔"

جملہ تھا کہ دھماکہ! — اس کے حواس بھک سے اڑ گئے اسے یوں لگا جیسے ذہن کے ہیروشیما پر ایٹم بم پھینکا گیا ہو۔ زمین سے آسمان تک دھوئیں کا ایک سیاہ بادل تھا جس نے اس کا ماضی حال مستقبل سب چھپا لیا تھا۔

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا!" اس نے جنونی انداز میں چلا کر کہا۔

"ایسا ہی ہوگا۔ مجھے افسوس ہے" کہتے ہوئے صدیقی صاحب بات ختم کرنے کے انداز میں مڑے — اور پھر جانے کیسے — بجلی کی تیزی سے اس کا ہاتھ پیتل کے بھاری گلدان تک گیا — پھر اسے کچھ خبر نہ رہی — اسے تو اس وقت ہوش آیا جب صدیقی صاحب کا سر ایک کراہ کے ساتھ میز سے جا لگا۔

ہر انسان کے اندر ایک شیطان چھپا بیٹھا ہوتا ہے جسے انسان مسلسل تشخیص و تلقین کے ذریعہ سلا دیتا ہے — لیکن — کسی

بھی کمزور لمحے میں شیطان انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتا ہے اور انسان کی نامحرم کردہ بڑی بڑی اونچی مضبوط فصیلوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔

صدیقی صاحب کے ناک اور منہ سے بہتے ہوئے خون نے کمال احمد کے اندر کا شیطان بیدار کر دیا۔ اس کا ذہن پوری سفاکی سے متحرک ہو گیا۔ اس نے بالکل پیشہ ور قاتلوں کی طرح جیب سے رومال نکالا اور بڑی احتیاط سے ایک ایک جگہ سے اپنے ممکنہ انگلیوں کے نشانات مٹا دیئے۔ ریڈیو آن کیا۔ اپنے کیس متعلق تمام اہم فائلیں دبائیں کمرے کو تالا لگایا۔ اور برآمدے میں آ کر اطمینان سے ادھر ادھر محتاط انداز میں دیکھنے لگا۔ پھر کمپاؤنڈ میں ٹہلنے کے انداز میں چلتا ہوا مین گیٹ سے باہر ہو گیا۔ وہ یوں پرسکون تھا جیسے چیونٹی اس کے قدموں تلے آ کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی ہو۔

بڑی سڑک پر پہنچ کر وہ دوڑنے کے انداز میں چلنے لگا۔ سامنے سے گزرتی ہوئی ٹیکسی کو ہاتھ دیا۔ ڈرائیور شاید اچھے موڈ میں تھا۔ اس لئے مطلوبہ مقام تک اسے پہنچانے کے لئے تیار ہو گیا ۔۔۔ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر اس نے نشست کی پشت سے کمر لگائی۔ اور سگریٹ سلگا کر دھوئیں کے مرغولے بناتا رہا۔ اس کا ذہن تیزی سے پرواز کر رہا تھا۔ جلد ہی وہ اردگرد سے بے خبر ہو گیا ۔۔۔ بھیانک مستقبل منہ پھاڑے اسے نگلنے کو تیار تھا۔ پھانسی کا پھندا بہت تیزی سے قریب آتا نظر آ رہا تھا ۔۔۔ پھندا قریب آتے آتے اس کے گلے میں آ گیا۔ اور اس کا حلقہ تنگ ہوتا گیا۔ اس کی آنکھیں دھندلانے لگیں ۔۔۔ بیوی بچوں کی شکلیں اس دھند میں گڈمڈ ہو گئیں ۔۔۔ ایک سناٹا، پر ہول سکوت طاری ہو گیا۔ چاروں طرف پھیلا اندھیرا قبر کے اندھیارے سا تاریک تھا۔ اسے منکر نکیر کی آمد کا انتظار تھا۔ اچانک اسے ایک آواز سنائی دی۔

یہ کیسی آواز ہے؟ اس کے ذہن نے اجنبیت سے سوچا۔ ایک شدید جھٹکا لگا۔ اور اس کا سر کسی چیز سے ٹکرایا۔ شاید ٹیکسی کسی گڑھے پر سے گزری تھی ۔۔۔ تب اچانک اس کے حواس بیدار ہو گئے۔

اوہ کیسا بھیانک خواب تھا۔ اس نے گھبرا کر جھرجھری لی۔ اب اسے ڈرائیور کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ پوچھ رہا تھا۔

"کدھر جانا ہے صاب؟"

کدھر جانا ہے مجھے؟ ۔۔۔ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا ۔۔۔ پھر اک دم اس کے ذہن نے کام کرنا شروع کر دیا ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ پہلے کیفے ڈی فرانس میں کچھ وقت گزارنا ہے۔ پھر منور کے گھر تاش پارٹی میں شرکت کرنا ہے ۔۔۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں اس نے سوچا اور پھر اطمینان سے اس نے جواب دیا۔

بس یہ کیفے ڈی فرانس کے مین گیٹ پر روک دو۔

کیفے کے کاؤنٹر پر وہ دیر تک قصداً کھڑا رہا۔ پھر کاؤنٹر کے مقابل والی میز پر ہی اس نے ڈیرہ جما دیا ۔۔۔ پہلے کافی منگوائی پھر کھانا ۔۔۔ اور بڑے مطمئن انداز میں دھیرے دھیرے لقمے اتارتا رہا۔ اس کے چہرے اس کی حرکات اس کے انداز سے کسی قسم کی گھبراہٹ ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔ آخر کھانا ختم ہوا۔ اس نے بل ادا کیا اور بیرے کو معقول ٹپ بھی دی۔ خوش خلقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اچھی سروس پر بیرے کے کندھے تھپتھپائے۔

کیفے ڈی فرانس سے نکل کر وہ منور کے گھر پہنچا جہاں سٹرڈے نائٹ پارٹی کے طور پر تاش کی محفل جما کرتی تھی ۔ کمال احمد کبھی کبھار ہی شریک ہوا کرتا تھا۔ کافی عرصے سے وہ اس پارٹی سے غائب تھا۔ اس وقت جب ان لوگوں نے اسے آتے دیکھا تو ہیپ ہیپ ہرے کے نعرے کے ساتھ استقبال کیا ۔۔۔ تھوڑے سے پس و پیش کے بعد وہ کھیل میں شریک ہو گیا اور رات گئے گھر کے لئے روانہ ہوا۔

وہ ساری رات اس نے آنکھوں میں کاٹی۔ صبح ہوئی ہاکر لڑکا اخبار ڈال گیا۔ اس نے بے تابی سے اخبار الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر تپائی پر ڈال دیا۔ اطمینان کا ایک لمبا سانس کھینچا۔ تو اخبار والوں کو خبر نہیں ہوئی یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ لیکن آخر کیوں؟ ایسی بھی کیا بے خبری

"ہوش کی دوا کرو کمال احمد! تم اپنے ہی خلاف جا رہے ہو۔"

اس کے اندر کے شیطان نے جھڑکا۔

ہاں ٹھیک ہی تو ہے بلکہ بہت اچھا ۔۔۔ بہت ہی اچھا یہ تو میرا کارنامہ ہے کہ صدیقی یوں ختم ہوا جیسے ہاتھی کے پاؤں تلے چیونٹی مسلی گئی ہو۔

لیکن سنو! کسی کمزوری کا اظہار کیا تو تمہاری خیر نہیں۔ خبردار تمہارے رویئے میں کوئی چونکا دینے والی بات نہ ہو۔ سارے کام حسب معمول کرتے رہو۔ ایک خرانٹ سی آواز نے تنبیہ کی۔

"ہاں! بالکل ایسا ہی ہوگا"۔ وہ گنگنایا۔

چھٹی کا دن تھا اس لئے سب نے اکٹھے اور معمول سے قدرے دیر سے ناشتہ کیا۔ بچے اس سے باتیں کرتے رہے وہ ان کا مناسب جواب دیتا رہا۔ لیکن اسی دوران اس کا ذہن بچوں کے مستقبل کے بارے میں مسلسل غلطاں رہا۔ تقریباً سارا دن اس نے گھر میں گزارا۔ شام کو کچھ دیر کے لئے پڑوسیوں کے پاس جا بیٹھا۔ گپ شپ ہوتی رہی اور اندھیرا پھیلنے پر گھر چلا آیا۔ پھر سونے سے قبل تک وہ بچوں کے ساتھ ہنستا بولتا رہا۔۔۔ کبھی کبھی اسے احساس ہو جاتا کہ وہ آج بہت بولے جا رہا ہے۔ بلا ضرورت باتوں کو طول دے رہا ہے۔ تب وہ یکدم خاموش ہو جاتا ۔۔۔ لیکن یہ خاموشی بھی اس کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتی ۔۔۔ اسے سناٹا سا محسوس ہوتا۔ وہ اس سکوت سے گھبرا جاتا۔ پھر باتیں شروع کر دیتا۔ اسی دھوپ چھاؤں میں دن غروب ہو گیا۔

صبح طلوع ہوئی ۔۔ آج وہ معمول سے بہت پہلے اٹھ گیا۔ شاید سویا ہی نہ تھا۔ ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری تھا۔ انتظار سا انتظار تھا۔ لگتا تھا ٹائم بم کے پھٹنے کا وقت قریب ہو اور گھڑی کی ٹک ٹک میں موت کی قدموں کی آہٹ ہو ۔۔ بڑے جان لیوا انتظار کے بعد اخبار آیا۔ اس نے یوں جھپٹ کر اخبار اٹھایا اور الٹ پلٹ کر دیکھا جیسے کوئی طالب علم اخبار میں اپنا رول نمبر تلاش کر رہا ہو۔ جلد ہی اس کی نظریں ایک خبر پر جم گئیں۔

"۔۔۔۔۔۔ کے حیف ایگزیکٹو مختار صدیقی کا قتل"

"احاطے کے چوکیدار شریف اور ملازم جبرا کو حراست میں لے لیا گیا۔ نامعلوم مجرم کی تلاش جاری ہے"۔

وہ سانس روکے پڑھتا رہا۔ خبر پڑھنے کے بعد اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دل ڈوبا جا رہا ہو۔ وہ اندھی کھائی میں اترا جا رہا ہو۔ اندر ہی اندر نیچے ہی نیچے تحت الثریٰ سے پرے۔ لیکن پھر مدافعت کی ایک زبردست لہر اٹھی۔ حواس قابو میں آئے۔

"کیا بے وقوفی ہے کمال احمد! اپنا کھیل بگاڑنا چاہتے ہو؟" اندر کے شیطان نے ڈانٹ پلائی۔

"ہاں اور کیا ۔۔۔ ٹھیک ہی تو ہے۔ کیا ثبوت ہے؟ خواہ مخواہ کی کمزوری لوگوں کو شک میں مبتلا کر سکتی ہے"۔

اور کیا۔ بالکل!

اپنے آپ کو نارمل کر کے اس نے رشیدہ کو جگایا۔ جلدی جلدی اسے مختصراً خبر سنائی اور تیزی سے ناشتہ تیار کرنے کی ہدایت کی۔ پھر خود بھی جلدی سے تیار ہوا اور دفتر کو چل دیا۔

حسب توقع دفتر کے سارے لوگ یکجا ہو کر اسی خبر پر تبصرہ کر رہے تھے۔ کمال احمد بھی نارمل انداز میں شامل ہو گیا ۔۔ دس منہ دس باتیں ۔۔۔ ہر کوئی اپنے انداز میں اس واردات پر روشنی ڈال رہا تھا لیکن قتل کی کوئی معقول وجہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ سب ہی کو اتنے اچھے آدمی کی موت پر صدمہ تھا ۔۔ اب صدیقی صاحب کے ایکھ ذہن میں بھی شیرینی کا احساس ہو رہا تھا۔ توقع کے مطابق پولیس کا تفتیشی عملہ بھی دفتر پہنچ گیا۔ سب کے بیانات فرداً فرداً قلمبند کئے گئے ۔۔ کمال احمد نے پورے اطمینان و سکون اور بظاہر بے پروائی لیکن پوری ہوشیاری سے جوابات دیئے۔

پولیس افسران کے جانے کے بعد کافی دیر تک قتل اور تفتیش ہی سب کا موضوع رہا۔ پھر سب اپنی اپنی سیٹوں پر چلے گئے۔ تنہائی پائی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ "وہ" نہیں کوئی اور ہے ۔۔۔ اسے سب سے زیادہ اپنی کامیاب اداکاری پر حیرت ہو رہی تھی۔ لگتا تھا وہ بہت اونچا اداکار ہو۔ اسے اپنی اس صلاحیت کا پہلی بار احساس ہوا۔

"کیا کروں دوست! سخت مجبوری تھی"۔ اس نے سامنے کی دیوار پر نمودار ہونے والے کسی غیر مرئی چہرے سے مخاطب ہو کر کہا "دیکھو یار، اتنا کرم کرو کہ یوں اب دوبارہ میرے سامنے نہ آنا"۔

وہ غیر مرئی چہرہ غائب ہو گیا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا

صدیقی صاحب کے قتل کے شبہے میں چوکیدار شریف اور ملازم جبرے کو گرفتار تو کر لیا گیا تھا۔ اور تحقیقات بھی جاری تھیں لیکن کوئی حل نہیں مل رہا تھا۔ صبح کے ثقہ اخبارات تو سنجیدگی سے اس کیس کی رپورٹنگ کر رہے تھے۔ لیکن شام کے "زرد صحافت" کے سارے اخبارات ایک ذمہ دار افسر کے قتل کے مقدمے کی رپورٹنگ بھی حسب دستور رنگین حاشیہ آرائی کے ساتھ کر رہے تھے۔ ملکی حالات کے نام پر کبھی اس قتل کے ڈانڈے کسی اندرونی سازش سے تو کبھی بین الاقوامی سازش سے ملائے جاتے۔ کبھی اس کی

تبہ میں کسی عورت کی جلوہ آرائیاں تلاش کی گئیں۔ یہ صرف اس وجہ سے تھا کہ صدیقی صاحب کے گھر سے کچھ تصویریں ملی تھیں۔ صدیقی صاحب کے رشتہ داروں نے ان تصویروں کی شناخت بھی کرلی اور وضاحت کی گئی کہ یہ تصویریں ان کے عزیزوں اور ان کی چند ماہ کی بیاہتا بیوی کی ہیں جو "سقوطِ ڈھاکہ" میں لاپتہ ہو گئے تھے۔ رفتہ رفتہ معاملہ ٹھنڈا پڑتا گیا۔ عام لوگوں کی دلچسپی کی باتیں نہ تھیں۔ اس لئے خبریں کم ہونے لگیں۔

کمال احمد کو اس سے پہلے اخبارات سے ایسی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ لیکن اب وہ روزانہ بڑی باقاعدگی سے صبح سے رات تک شہر میں شائع ہونے والے تقریباً تمام اخبارات جمع کرتا۔ رات گئے تک انھیں پڑھنے کے بعد باقاعدہ ان کی فائلیں تیار کرتا۔ پھر ان خبروں پر لوگوں سے تبصرہ کرتا۔

اخبار پڑھنا ۔۔۔ اور ہر کسی کو پکڑ کر قتل کی خبروں پر تبصرہ کرنا اور ان پر نئے نئے زاویوں سے روشنی ڈالنا اب کمال احمد کا دلچسپ مشغلہ بن گیا تھا۔ اس کی سوچوں کا مرکز یہی موضوع تھا۔ معاملہ تازہ تازہ تھا اس لئے لوگ اس کی گفتگو میں بڑی دلچسپی سے شریک ہوتے اگر کبھی وہ چپ سادھ لیتا تو لوگ از خود اس کے پاس نئی خبر کی تلاش میں آتے۔ بلکہ اب تو یوں لگتا تھا جیسے دفتر والوں نے اعزازی طور پر اسے یہ کام سونپ دیا ہو۔ اور وہ بھی دلجمعی سے یہ خدمت انجام دے رہا تھا۔ رفتہ رفتہ لوگوں کی دلچسپی کم ہوتی گئی اور اب ۔۔۔ لوگوں نے اپنے طور اس کیس کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ تو کمال احمد سے پوچھ کر ہی بری الذمہ ہو جاتے تھے۔ حسب دستور کم ہوتے ہوتے لوگوں کی دلچسپی ختم ہو گئی ۔۔۔ لیکن کمال احمد کی دلچسپی کسی طرح کم نہ ہوئی بلکہ بڑھتی ہی رہی۔

پھر وہ وقت آیا کہ لوگ اس موضوع سے کترانے لگے۔ لیکن کمال احمد کو اس تبدیلی کا احساس نہ ہوا۔ وہ خود گھیر گھیر کر لوگوں سے اس قتل پر گفتگو کرتا۔ بعض اوقات تو نوبت یہاں تک آجاتی کہ وہ آستین چڑھا کر اونچی آواز میں بولنے لگتا۔ آنکھیں سرخ ہو جاتیں گردن کی رگیں پھول جاتیں۔ اس دیوانگی کے بار بار مظاہروں نے تو اب لوگوں کو اس کی صورت سے بیزار کر دیا تھا۔ وہ اس کی شکل دیکھ کر کونے میں منہ دے لیا کرتے کہیں اس کا لانگ پلے شروع

نہ ہو جائے۔ گھر آتا تب بھی اس کی مصروفیات یہی رہتیں۔ اور کوئی نہ ملتا تو وہ بیوی کو ہی گھیر لیتا۔ کچھ روز تک تو وہ اس نئے تماشے کو برداشت کرتی رہی۔ لیکن ایک روز چیخ کر بولی ۔۔۔

"ان فضولیات کو اپنے تک محدود رکھیں۔ مجھے گھر کے اور بہت سے ضروری کام کرنے ہیں"۔

وہ مایوس ہو کر اپنے کمرے میں چل دیا جہاں اخباروں کا انبار اس کا منتظر تھا۔

مقدمہ چلتا رہا۔

شریف کو رہا کر دیا گیا لیکن غریب جبرے کی شامت آگئی۔ حالات اس کے خلاف جا رہے تھے مختلف چیزوں پر اس کے انگلیوں کے واضح نشانات ملے تھے ۔۔۔ اس نے اپنے صفائی میں کہا کہ اس کے ذمہ صبح کو صاحب کا ناشتہ بنا کر دینا اور گھر کی صفائی بھی تھی۔ جو وہ صاحب کے دفتر جانے سے پہلے ہی کر دیا کرتا تھا اور اس کے بعد دن بھر اس طرف نہیں آتا تھا۔ لیکن اس کی شنوائی نہیں ہو رہی تھی۔

قریب تھا کہ مقدمہ کمزور پڑتے پڑتے ختم ہو جاتا کہ صدیقی صاحب کے چچا نے اس میں دلچسپی لینا شروع کی۔ ان کے اصرار پر نئے سرے سے تحقیقات شروع ہوئی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ مرحوم کے معدے میں پائے جانے والے چاول پر ابھی ہاضمے کا عمل بھی شروع نہیں ہوا تھا۔ اس لئے موت کھانے کے تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اندر واقع ہوئی تھی۔ اور اس وقت صرف جبرے کی آمد ہی متوقع تھی۔

صدیقی صاحب کے چچا کا بیان تھا کہ تین بجے انھوں نے میرے یہاں کھانا کھایا تھا اور فوراً اپنے بنگلے روانہ ہو گئے تھے۔ ظاہر ہے گھوم پھر کر بات پتلی گردن والے جبرے پر آپڑی جس میں نگرانی کرنے کی بھی سکت نہ تھی جو مقدمہ لیتے ہی اس سے گارنٹی پر ہیں کہ قتل کے الزام سے بری کروا دیں گے۔

ادھر کمال احمد نے مقدمے کی تاریخوں پر باقاعدہ عدالتی کارروائی سننے کا بھی دستور بنا لیا۔

آج صدیقی مرحوم کے قتل کے مقدمہ کا فیصلہ سنایا جا رہا تھا۔ بھلا کمال احمد کیسے شرکت نہ کرتا ۔۔۔ دفتر سے گول

ہو کر وہ عدالت کی پچھلی نشستوں پر جا بیٹھا۔ میلے کپڑے، بکھرے بال، پپڑی جمے ہونٹوں سے وہ دم سادھے کارروائی سننے میں محو تھا۔ ہر لفظ اس کی سماعت پر ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا۔ سانس یوں دھونکنی کی طرح چل رہا تھا جیسے منوں وزن پیٹھ پر لاد کر وہ کسی اونچے پہاڑ پر چڑھ رہا ہو۔ کبھی کبھی وہ ایک اچٹتی سی نگاہ کٹہرے میں کھڑے جیرے پر بھی ڈال لیتا تھا۔ زرد چہرے اور اضطرابی کیفیت میں گردش کرتی نمناک آنکھوں کے ساتھ جیرا مجسم سوال تھا۔

فیصلہ سنایا گیا۔ جیرے کو سزا ہو گئی۔

اس وقت جیرے کے چہرے پر غم و غصہ اور دکھ سے زیادہ نفرت و حقارت کی پرچھائیاں تھیں — جیرے کو جیل لے جایا گیا — اور کمال احمد گھر واپس آ گیا۔

گھر آ کر وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں بند ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں جیرے کا غم و غصہ اور شدید نفرت و حقارت سے تنا ہوا چہرہ گھومتا رہا۔ وہ اپنی اخبارات کی فائلیں کھولے بیٹھا تھا۔ اخبارات کے صفحات، کمرے کی دیواروں پر، میز، کرسی، بستر ہر چیز پر جیرے کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ ہر چہرے پر کئی کئی آنکھیں ابھر آئی تھیں۔

موٹی موٹی سرخ انگارہ بنی گھورتی آنکھیں۔

اس پر تھوکتی آنکھیں۔

اس سے نفرت کرتی آنکھیں۔

اس کے سینے میں اترتی آنکھیں۔

اس کا راز اگلواتی آنکھیں۔

اس پر ملامت کرتی آنکھیں۔

وہ چلا چلا کر کہہ رہی تھیں، تم قاتل ہو۔

تم قاتل ہو اقرار کیوں نہیں کر لیتے۔

تم بزدل ہو، اعتراف کیوں نہیں کر لیتے۔

اب تو بچ گئے ہو، دوسرے جہاں میں کیسے بچو گے؟

خدا کے غضب سے کس طرح بچو گے؟

تم قاتل ہو، خونی ہو!!

اور پھر وہ ان بہت سی گھورتی آنکھوں کے ہجوم کے آگے بے بس ہو گیا۔

"میں قاتل ہوں، میں قاتل ہوں"

جیرا بے گناہ ہے — یہ سب جھوٹ ہے جیرا بے گناہ ہے۔

وہ اخبارات کے پرزے اڑاتے ہوئے حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ اس کے منہ سے کف جاری تھا۔ آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ اور پھر اس کی آنکھوں سے پھوٹتی وحشت کے سائے سارے گھر پر چھا گئے۔

••

نغمہ تبسم
(کلیان)

وہ چھریرے بدن والی لانبے قد کی عورت آج بھی تیز تیز چلی جا رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کے بائیں ہاتھ میں چمڑے کی پرانی گندی تھیلی تھی۔ اور قدم بڑھاتے وقت وہ دوسرے ہاتھ کو اس طرح آگے پیچھے زور زور سے حرکت دے رہی تھی کہ اس کے جسم کو ایک دلفریب جھٹکا سا لگتا تھا جیسے وہ اپنے ناتواں وجود سے ایک بے حد ناگوار بوجھ اتار پھینکنا چاہتی ہو۔

کانوں میں خوبصورت آویزے، گلے میں سیاہ موتیوں کا چمکتا ہار، ناک میں باریک کیل، کلائیوں میں پلاسٹک کی باریک باریک چوڑیاں اور انگلیوں میں انگوٹھیاں —— وہ ہمیشہ آراستہ رہتی تھی۔ فٹ پاتھ کی دکان سے خریدے پچیس پچاس پیسوں کی ان سوغات سے اس نے اپنی نسوانیت کو بہلا لیا تھا یا پھر غیرت کو!

اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ کر وہ تھوڑی دیر کے لئے رُکی اس نے پلٹ کر دور تک جاتی ہوئی سڑک پر بکھرے لوگوں کو دیکھا۔ کرب، دکھ، درد، بے بسی ——؟ اس کی ایک نظر میں نہ جانے کیا کیا تھا کہ جلتا ہوا سورج پہاڑ کی اوٹ میں چھپ گیا۔ دور سڑک پر لوگ آ جا رہے تھے ...... ہاں! لوگ آ جا رہے تھے۔ اپنی اپنی فکروں، اپنی اپنی عشرتوں کا انبار سنبھالے۔ اپنی ذات کے عرفان کا طلسم لئے لوگ اس کی آنکھوں کے سامنے چھائے دھندلکے میں ڈوبتے چلے گئے۔

عورت نے دھیرے سے اپنے سر کو جھکا لیا۔ ساڑی کا پھٹا ہوا پلو کمر میں اڑس کر —— اور چمڑے کی پرانی چھوٹی ہوئی تھیلی کو تھام کر وہ جوں ہی گھر کے اندر داخل ہوئی اس کا شوہر لپک کر اس کی طرف بڑھا جیسے بہت دیر سے وہ انتظار کی جس گھڑی پر بیٹھا تھا اب اس گھڑی نے اسے زور سے اچھال دیا تھا۔

"نکال آج کتنی کمائی ہوئی" اس کے شوہر نے تہہ بند کو کستے ہوئے کہا۔

"چھن" ! چند سکے، پان کے سوکھے پتے، سپاری کے کچھ ٹکڑے اور تمباکو کی ڈبیہ زمین پر گر پڑی۔ عورت نے آہستگی سے چمڑے کی تھیلی کو الٹتے ہوئے کہا۔

"آج کہیں بھی کام نہیں ملا۔ صرف ایک گھر میں تھوڑے سے برتن مانجھنے کا کام ملا تھا۔ بس"۔

اس نے زمین پر پڑے تیس پیسے کے سکے اٹھا کر شوہر کی طرف بڑھائے۔

"اور اس تھیلی میں کیا ہے؟ جلدی بتا، ...... ورنہ"

اس کے شوہر نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔ اور اس نے چمڑے کی پھوٹی ہوئی خالی تھیلی کو ایک بار پھر خاموشی سے زمین پر جھٹک دیا۔ وہ حیرت سے دیکھتی رہی۔ زندہ بلبلاتے ہوئے کیڑے تھیلی کے اندر سے نکل کر زمین پر رینگ رہے تھے۔ ذلت، بے غیرتی، آوارگی کے کیڑے —— اور وہ دیکھتی رہی۔ ایک ایک کر کے سارے کیڑے اس کے شوہر کے جسم میں داخل ہو کر رگ و پے میں دوڑنے لگے۔ وہ آہستہ سے پیچھے ہٹ گئی پیچھے اور پیچھے —— اور پیچھے! اس کے شوہر دیوانہ وار اسے مارنے کے لئے بڑھا۔

"نکال پیسے۔ کہاں رکھے ہیں۔ شہر میں یار دوستوں کے ساتھ گھومتی رہی خوب کما کر لائی ہوگی آج تو۔ نکال پیسے"۔

"قسم سے آج کوئی کام نہیں ملا۔ صبح سے ایک ایک گھر گھومتی رہی"۔

اس نے آہستہ سے کہا اور جھولتی ہوئی کھڑی کھاٹ میں دبک گئی۔

"چٹاخ"۔ اس کے شوہر نے بھرپور ہاتھ اس کی کمر پر رسید کیا۔

"اٹھ کتیا، میرے لئے باٹلی لے آ، جا جلدی جا۔ ورنہ تجھے جان سے مار دوں گا" جنونی انداز میں وہ بیوی کی ساڑی کا پلو کھینچتا رہا۔

چر، چر، چر ...... پرانی بوسیدہ ساڑی پھٹنے لگی۔ پھر اس نے بیوی کے جھکے ہوئے لاغر جسم پر گھونسوں اور مکوں کی بارش کردی۔ وہ ٹھری کھاٹ کے جھولے میں دبکی رہی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ مرگئی ہے۔ اور تاریک قبر میں اتار دی گئی ہے۔ پھر وہ مزے سے قبر میں سوئی رہی۔ اور بڑے بڑے زہریلے سانپ، بچھو اس کی قبر سے نکل کر اس کے شوہر کے جسم کو ڈستے رہے۔ اس عجیب و غریب خواب کے ساتھ ہی خوشی کی ایک لہر اس کے بدن میں دوڑ گئی۔ اس نے دھیرے سے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ زمین پر اس کا شوہر نشے میں دھت بے خبر پڑا تھا۔ قریب ہی شراب کی خالی بوتل تھی۔ اس نے کچھ دکھ، کچھ بے بسی اور کچھ نفرت سے اپنا چہرہ دیوار کی طرف پھیر لیا۔

دوسری صبح جب وہ اٹھی تو شہر جانے کے خیال سے پہلے یہ خیال اس کے ذہن میں سانپ کی طرح رینگ گیا کہ دو بوتلوں کی قیمت آج پھر ادھار ہے۔ گھر سے نکلتے ہوئے وہ ذرا ٹھٹھکی اور ستون پر لٹکے ہوئے آئینے کے ٹکڑے میں اس نے اپنا چہرہ دیکھا ـــ اجڑا ویران چہرہ، سیاہ بالوں میں سفید تار، سامنے کے دو دانت ٹوٹے ہوئے، چہرے پر تین بار فالج کے حملے سے ہونٹ بائیں طرف گھوم گئے تھے۔ اور بائیں آنکھ غیر ارادی طور پر بار بار پھڑکتی رہتی تھی ـــ حالات، وقت اور شہر کی گلی گلی، نکڑ نکڑ گھوم کر جو چہرہ خرید کر اس نے اپنی گردن پر رکھا تھا۔ اس کے ایک بھی نقش کو وہ پہچان نہیں پا رہی تھی۔

باہر دنیا جاگ چکی تھی ـــ دوڑتی ہوئی ٹریفک کا شور، راہگیروں کے قہقہے، گفتگو اور قدموں کی آوازیں۔ اسے محسوس ہوا کہ جیسے ہر شخص نے اپنے سارے دکھ درد اور غم کی صلیب اتار کر تنہا اس کے سینے پر رکھ دی ہے۔ اس کا سینہ دھنستا گیا۔ اندر ہی اندر، چمڑے کی پرانی تھیلی اٹھا کر وہ بے خبر سوئے ہوئے اپنے چاروں بچوں اور بے سدھ پڑے شوہر پر ایک نظر ڈال کر باہر نکل گئی۔

اس شام دس گھروں میں کپڑے دھونے کے بعد جب وہ اپنے گھر کی طرف تیز تیز چلی جا رہی تھی، سنسان سڑک پر اسے دور سے ایک عورت آتی دکھائی دی۔ سفید ملگجے دوپٹے میں لپٹی وہ عورت جب اس کے قریب پہنچی تو وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔ اس نے غور سے دیکھا وہ زینب تھی اس کے بچپن کی سہیلی۔ اس کے دونوں ہاتھ پانی میں مسلسل کام کرتے رہنے کی وجہ سے سڑ گئے تھے۔ شلوار کے پائنچے گھٹنوں تک پانی میں بھیگے ہوئے تھے۔ اس کے بائیں ہاتھ میں چمڑے کی دو پرانی گندی پھولی ہوئی تھیلی تھی۔

"کام ہوگیا کیا؟ اب گھر جا رہی ہو؟" اس نے مصنوعی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے زینب سے پوچھا۔

"ہاں! کام آدھو گیا۔ اب بجار (بازار) جا رہی ہوں۔ بچوں کے لئے شام کے کھانے کا انتجام (انتظام) کرنا ہے۔ بڈھا تو دن بھر گٹر کا پانی پیتا ہے، ان بچوں کے لئے ہی تو گلی کوچے گھومنا پڑتا ہے جی۔ اکیلی ہوتی نا تو کبھی کا اس بڈھے کو ٹھکرا کر گھر سے نکل جاتی۔ بچوں کے لئے اتنے سال اس کے پاس نکالے ہیں۔ ایک دن بھی اسے گٹر کا پانی نہ ملے تو پیسے کے لئے مارنے لگتا ہے۔ مرتا بھی نہیں کہ یہ پاپ کٹے۔" زینب نے کہا اور تھیلی کھول کر اندر جھانکا۔

"سچ بہنا! میں بھی بچوں کے لئے ہی یہ ساری مصیبت اٹھاتی ہوں۔ پینے والوں کے دن تو تھوڑے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ عذاب تو ہمیں جھیلنا پڑتا ہے۔ میں اب ایسی اکتا گئی ہوں کہ کیا کروں سمجھ میں نہیں آتا۔ ایک دن کی بات ہو تو آدمی برداشت کرلے۔ روز روز کا روگ لگ گیا ہے جی کو۔" اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

گھر میں قدم رکھتے ہی اس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ دروازے سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ دیوار کا سہارا لیا۔ اس کے گلے میں پڑے منگل سوتر کا کچا دھاگا ٹوٹ گیا۔ اور کالے منکے کوٹھری میں چاروں طرف بکھر گئے۔

اس کا شوہر ابھی تک اسی کونے میں اسی جگہ سویا ہوا تھا۔ اس کا سارا بدن نیلا پڑ گیا تھا۔ وہ مردار بھینس کی طرح اکڑ گیا تھا۔ پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں اور منہ کھلا ہوا تھا۔ اس کے میلے گندے دانت باہر جھانک رہے تھے۔ قریب ہی شراب کی خالی بوتل پڑی تھی ـــ

اس نے جھک کر بوتل اٹھائی۔ زہریلا جادو جو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ اس آواز کو کون سنے گا کون سنے گا اب یہ آواز ... سنسنی اس کی کانپتی آواز در و دیوار سے ٹکرا کر واپس لوٹ آئی۔ گرم گرم آنسو

اس کی آنکھوں میں تیرنے لگے، اور تیرتے آنسوؤں کے عدسے کے اس پار ریل کے شیشے میں اس نے اپنی شبیہہ دیکھی —— اجڑا ویران چہرہ، سیاہ بالوں میں سفید تار، سامنے کے دانت ٹوٹے ہوئے، باتیں آنکھ غیر ارادی طور پر بار بار پھڑک رہی تھی —— پھر اس کے تصور کے آئینے میں ایک تصویر ابھر آئی، رنگی نویلی گداز بدن والی دوشیزہ کی تصویر، جس کے انگ انگ میں زندگی کا رس، اور رگ رگ میں خوشی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اجالے اور اندھیرے کا یہ فاصلہ —— آرزوؤں، تمناؤں اور خواہشات کے وہ سنہری خواب —— کون لوٹائے گا اس کے سہانے شب و روز کو؟

کھڑکی سے باہر سڑک کے کنارے دھواں اگلتی بھٹی کی طرف، وہ ایک ٹک دیکھتی رہی اور پھر آہستہ سے غیر ارادی طور پر نگاہوں کا زاویہ بدل گیا۔

کچھ دور گہرے رنگ کی عظیم الشان بلڈنگ کے سامنے پھیلے وسیع سرسبز و شاداب لان میں بچھی آرام کرسی پر "موسٹی دار و والے" مل کے سوٹش ورکر کے ساتھ بیٹھے بات چیت کر رہے تھے۔ کوئی گرما گرم سنجیدہ موضوع زیر بحث تھا۔ "موسٹی دار و والے" کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کیاریوں میں مہکتے خوش رنگ پھولوں کے بوسے لے رہی تھیں۔ اور معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ پھیلے ہوئے اس کے بھدے ہونٹوں سے اگلتا ہوا سگریٹ کا دھواں اوپر ہی اوپر اڑ رہا تھا۔ وہ ایک ٹک دیکھتی رہی۔ دھوئیں کے چھوٹے چھوٹے مرغولے آہستہ آہستہ ایک لمبا سفر طے کر کے بھٹی کے اوپر پھیلے ہوئے دھوئیں کے سیاہ طوفان میں مدغم ہو رہے تھے۔ اچانک دھوئیں کے سیاہ بادلوں میں تیز بجلی سی کوند گئی اور اس کی آنکھیں چندھیا گئیں ہنسی اس کے ہونٹوں کے کنارے سے بہہ نکلی۔

"کون لوٹائے گا وہ میرے سنہرے دن؟

کون! وہ جنھوں نے میری آرزوؤں اور تمناؤں کے سارے اجالے چھین کر اپنی دنیا کو تابناک بنایا ہے۔ تابناک ...... ہا ہا ہا"

جنونی انداز میں اس نے گھور کر دیکھا۔

دور سڑک کے کنارے پرانی بھٹی دھواں اگل رہی تھی اور دھوئیں کے بھیانک سیاہ بادلوں میں خون میں لتھڑی ہوئی انگنت صلیبیں لٹکی ہوئی تھیں۔ اور ان صلیبوں پر ہزاروں معصوم تڑپتے ننگے [illegible]

بچے مصلوب تھے۔ ان میں اس کے اپنے بچے بھی شامل تھے۔ اس کے جنونی قہقہے بتدریج بلند ہوتے گئے۔ اور جھونپڑے کی پرانی تھیلی پھولتی ہی جا رہی تھی۔ ●●

بقیہ : لونجائنس کا نظریہ ادب

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو لونجائنس کا معیار ادب ایک طرف ارسطو اور ہوریس کے خیالات کی تشکیل نو بھی ہے اور دوسری طرف اس میں اضافہ بھی۔ آج کے فنی اصولوں کی روشنی میں لونجائنس کے پورے معیار کو یکساں طور پر اپنانا خطرہ سے خالی نہیں ہے لیکن تنقید شعری کی کائنات میں لونجائنس کے خیالات کو غیر اہم نہیں مانا جا سکتا۔ ادب میں، آج کے سارے معیارات ان ہی کلاسیکل نقادوں سے ایک یا دوسری سطح پر کہیں نہ کہیں ٹکراتے ضرور ہیں۔ لونجائنس اگر ایک طرف رومانی تحریک کا پیش رو تھا (ادب کے مقصد کے لحاظ سے) تو دوسری طرف وہ ادب کی پرکھ کے معیار میں جمالیاتی نقادوں سے بھی قریب تھا جن کے نزدیک طرز ادا کو خاص مقام حاصل ہے۔ ●●

بقیہ : مہمان

مہمان کو ان لوگوں سے رخصت ہونا تھا کیوں کہ اس کے آنے کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ آخر وہ ایک مہمان تھا جو ہمیشہ کے لئے ان کے ہاں نہیں آیا تھا۔ چنانچہ جب وہ چلا گیا تو گھر کے سبھی افراد نے —— کیا انسان، کیا جانور، کیا پرندے اور کیا گاڑیاں —— سبھوں نے اپنی اپنی زندگیوں میں ایک اجنبی قسم کی کمی محسوس کی، ایسا لگا جیسے ان کی قلعہ بند زندگیوں میں ایک دراڑ پڑ گئی ہو —— جیسے وہ مہمان اپنے ساتھ ان کی زندگیوں کا ایک اہم موڑ لے کر چلا گیا ہو۔ ●●

خورشید احمد بھٹی
خانپور ۔ پاکستان

امیدیں

میں اس شہر میں نووارد تھا اور جہاں میں پہلی بار اترا تھا تو وہاں سے شہر میں اپنی لیلیٰ کو تلاش کرنے کے لئے ایک سڑک پر چلنے لگا۔ اس سڑک پر میں بہت دیر تک اور بہت دور تک چلتا رہا۔ بہت زیادہ دور تک لیکن جب اتنی طویل مسافت طے کر کے میں نے دم درست کرنے کی ضرورت محسوس کی تو میں سڑک کے فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ بیٹھے بیٹھے میں نے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا تو مجھ پر اچانک انکشاف ہوا کہ میں جہاں سے چلا تھا وہیں آ بیٹھا ہوں۔ اس حقیقت کے علم کے ساتھ ہی میں نے خود کو عجیب قسم کے ششش و پنج میں اور کسی قدر خوف میں بھی محصور پایا جیسے وہ سارا شہر اس بازار میں محصور تھا جو دائرہ کی صورت میں اس کے اردگرد پھیلا ہوا تھا۔ ششش و پنج تو آسانی سے سمجھ آجانے والی بات تھی مگر خوف —— یہ اس وجہ سے تھا کہ جہاں میں بیٹھا تھا وہیں سامنے ایک دکان تھی جس پر پھانسی کے پھندے بک رہے تھے "ہر سائز کی گردن کے لئے موزوں پھانسی کے مضبوط پھندے یہاں سے خریدیئے"۔ یہ الفاظ اس دکان کی پیشانی پر نہایت جلی حروف میں لکھے تھے اور میرے لئے صرف یہی بات خوف کی بنیاد نہ تھی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی اس خفی احساس میں شامل تھی کہ لوگ، بچے، جوان، بوڑھے اور عورتیں اس دکان سے دھڑا دھڑ پھانسی کے پھندے خرید رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو رضاکارانہ طور پر مرنے والے تھے معلوم نہیں کیوں؟ شاپنگ کی دوسری دکانوں سے زیادہ رش یہاں تھا۔ بہرحال ۔ اس صورت حال سے گھبرا کر میں وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا اور دوبارہ چلنے لگا لیکن چلتے چلتے پھر وہیں آ پہنچا۔ جہاں سے چلا تھا جہاں وہ دکان تھی، ایسے میں میں نے خود کو اس شہر کی طرح محصور پایا۔ تھوڑی سی دیر کے لئے اپنی لیلیٰ کو بھول کر باہر نکلنے کے لئے گلی ڈھونڈنے لگا لیکن گلی تھی کہ نظر ہی نہیں آرہی تھی۔ اتنا آنا تو بعد کی بات ہے ۔ تو کیا؟ یہ سب لوگ اسی حبوست کی وجہ سے پھانسی کے پھندے خرید رہے تھے؟ جیسی میں محسوس کر رہا تھا لیکن میں تو قطعاً ایسی موت مرنے کے لئے تیار نہ تھا مجھے تو ابھی پیدا ہوئے ہی تھوڑا سا عرصہ ہوا تھا یعنی شہر میں آئے ہوئے! اور پھر رضاکارانہ موت مرنے والے لوگ قطعاً میرے جیسے نہیں تھے۔ میں ان سب سے مختلف تھا۔ اس لئے علیحدہ بیٹھا رہا اور سوچتا رہا کہ کیوں کر اس حصار میں سے نکلا جا سکتا ہے؟ نہ جانے کتنی دیر میں سوچتا رہا کہ دن ڈوب گیا اور دکان پر مجمع بھی کافی حد تک کم ہو گیا تو مجھے پہلی بار وہ شخص نظر آیا جو پھندے بیچ رہا تھا جو اس دکان کا پروپرائٹر تھا۔ ایک بوڑھا آدمی! —— لیکن اس بوڑھے آدمی کو زیادہ دیر تک دیکھتے رہنے کی بجائے میری آنکھیں دکان کی بغل میں سے نکلنے والی گلی کی طرف پھر گئیں اور پھر کچھ زیادہ سوچے بغیر —— میں اس گلی میں چلنے لگا، گلی میں کچھ زیادہ دور نہیں چلا تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ میرے آگے آگے ایک خوبصورت عورت جا رہی ہے، اکیلی تنہا نوجوان اور حسین ——! یہ سب کچھ میں نے ایک لمحہ میں جان لیا اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی جان لیا کہ میں اس انجانے میں اسے لیلیٰ سمجھ کر دل دے بیٹھا ہوں! میں نے ذرا تیزی سے چل کر اس کے قریب پہنچ کر بغیر کسی تمہید کے اس کے کان میں کہہ دیا!

"بی بی جی —— میں آپ کے عشق میں مبتلا ہو گیا ہوں!"

"مجھے دیکھ کر تمہاری جوانی بھی جاگ اٹھی ہے کیا؟"

"جی —— جی!"

"لیکن میری جمالیاتی حس تو کہا، تمہیں دیکھ کر تو میری عام حسیت میں بھی ذرا سی جنبش پیدا نہیں ہوئی۔"

"پلیز ایسا نہ کہئے۔"

"تو تمہیں دھوکہ دینے کے لئے کہہ دوں کہ مجھے بھی تم سے عشق ہو گیا ہے!"

"مگر میں مر چکا — آپ پر مٹ چکا!"

"مجنوں معلوم ہوتے ہو مگر تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں تمہاری لیلیٰ نہیں بلکہ ہیر ہوں اور — اپنے رانجھے کی منتظر!"

میری پہلی امید ٹوٹ گئی — لیکن اس کے ساتھ ہی ذہن و دل کے نہاں خانوں سے ایک اور قد آدم امید برآمد ہوئی۔ وہ جس شاندار کوٹھی میں داخل ہوئی تھی میرا دل بے اختیار چاہا کہ میں بھی اس میں ہوں اس کے بیڈ روم میں نہیں تو سرونٹ کوارٹر میں ہی سہی۔ میں نے اس سے کہا!

"محترمہ! — آپ اپنے دل (اینڈروم) میں نہیں تو کوٹھی کے کسی سرونٹ کوارٹر میں تو جگہ دے سکتی ہیں؟"

"تو کیا تم میرے سرونٹ بننے کے لئے تیار ہو؟"

"ہاں — لیکن سرونٹ کوارٹر میں رہنے کی حد تک! — مجھے آپ سے امید —"

"نہیں تمہاری یہ امید بھی پوری نہیں ہو سکتی — ہماری کوٹھی کے کیا؟ ہمارے سارے شہر کے ہر قسم کے کوارٹرز اتنے بھرے پڑے ہیں کہ مزید ایک آدمی کی قطعاً گنجائش نہیں!"

میری دوسری امید بھی چکنا چور ہو گئی مگر اس کی آواز سے ایک اور امید جاگ پڑی، وہ سوٹ لئے جا رہی تھی، میں نے یہ دیکھ کر کہ وہ مردانہ سوٹ ہے اور کم و بیش میرے ہی سائز کا ہے میں نے اس سے کہا!

"مس — یہ سوٹ تو آپ مجھے آسانی سے دے سکتیں ہیں؟"

"تمہیں اور یہ سوٹ — ؟ ایڈیٹ! تم یہ سوٹ پہن کر رانجھا تو نہیں بن جاؤ گے، گو کہ سوٹ میں نے خرید آنے والے رانجھے کے لئے ہی ہے مگر تم تو مجنوں ہو — کیا تم میری خاطر اپنی ذات سے، لیلیٰ سے غداری کر سکتے ہو؟"

"ہاں — ہاں۔"

"مگر میں نہیں کر سکتی، خاص طور پر اب — پہلے میں تمہیں یہ سوٹ دے بھی دیتی اور اس کے ساتھ سب کچھ! مگر یہ جان کر کہ تم اپنی ذات اور لیلیٰ کے ساتھ بھی مخلص نہیں ہو تو میرے ساتھ کیا اخلاص برت سکو گے؟ — میں ایسا قطعاً نہیں کر سکتی؟"

اس کے "قطعاً" کے ساتھ میری اس امید کی بھی تقطیع ہو گئی مگر یہ امید اس زچہ کی طرح تھی جو دردِ زہ سے خود تو مر گئی ہو مگر ایک خوبصورت بچی کو جنم دے کر — اس کے ہاتھ میں کھانے کا ایک ڈبہ تھا اور میرا عشق دل و دماغ اور مثانے سے ہوتا ہوا آنتوں میں آ گیا۔

"— آپ مجھے اپنا حسن اور مکان اور لباس نہ دیں مگر کھانا تو دے سکیں گی؟ میں دوسرے شہر سے آیا ہوں، اپنی کھوئی ہوئی لیلیٰ کی تلاش میں، وہ نہیں مل رہی، یہ دنیا کا آخری شہر ہے اور میں اس شہر میں بے حسن و بے مکان و بے لباس و بے خوراک ہوں۔"

"مگر یہ کھانا تو صرف ایک آدمی کے حصے ہے، ایک لنچ بکس میں صرف ایک ہی آدمی کا کھانا آ سکتا ہے نا؟ زیادہ کا ہرگز نہیں — صبح سے اس ڈوبتے سورج تک دفتر میں کام کرتے کرتے مجھے خود اتنی بھوک لگ چکی ہے کہ ایک لقمہ بھی تمہیں نہیں دے سکتی، تم ایک دم عاشق سے گداگر بن گئے کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہمارے شہر میں گداگری جرم ہے!"

جرم کا الزام ایسی دودھاری تلوار تھا جسے اس نے اب کے میان میں سے نکال کر صاف صاف میری آنکھوں کے آگے لہرا دیا جس سے اس نے ایک ایک کر کے میری تمام چھوٹی بڑی امیدوں کو قتل کرنے کا جرم کیا تھا۔

"مجرم تم ہو — میری کتنی ہی امیدوں کو قتل کرنے کی جرم — میں تمہیں قتل کر دوں گا۔!" میں نے ایک تہیہ کے ساتھ فیصلہ کرتے ہوئے خود سے کہا! اور کوٹھی سے نکل کر واپس گیٹ پر آ گیا۔ گیٹ پر لگا ہوا بلب فیوز ہو چکا تھا، یہ میرے منصوبہ کی تکمیل کے لئے نیک شگون تھا۔ میں گیٹ کی اوٹ لے کر مزید گہرے اندھیرے میں کھڑا ہو گیا تاکہ محفوظ رہ سکوں اور نہایت حفاظت کے ساتھ اس سے اپنی مقتول امیدوں کا بدلہ لے سکوں، آدھی رات تک میں وہیں کھڑا رہا، جب سکوت اور ہُو کا عالم طاری ہو گیا تو میں گیٹ کی اوٹ سے نکل کر دوبارہ کوٹھی میں داخل ہو گیا۔

اور سیدھا اس کے بیڈروم میں جا گھسا جہاں وہ گہری نیند سو رہی تھی، میرا خیال تھا کہ اس نے حفاظت کے لئے اپنے تکیہ تلے ریوالور رکھا ہوگا بس اسی کو کام میں لاؤں گا۔ مگر وہاں تو ریوالور کی جگہ اس کی گردن کی سائز کا پھانسی کا پھندہ رکھا تھا، یہ بھی اچھی بات تھی لیکن وہ خود گہری نیند سو رہی تھی اور غالباً یہ کسی اور وقت استعمال کرنے کے لئے خرید لائی تھی مگر وہ وقت میں نے انتقام کے جوش میں گردشِ زمانہ سے چھین کر فوراً اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھانسی کا پھندہ اٹھا کر اس کی گردن میں ڈالنا ہی چاہتا تھا کہ مجھے اپنے کندھے پر کمزور ہاتھ کا بوجھ محسوس ہوا۔ میں نے مڑ کر دیکھا —— دکان والا بوڑھا پروپرائٹر! وہ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر بولا!

"اجنبی! یہ میری بیٹی ہے اور اپنی مرضی سے رضاکارانہ موت مرے گی تم کیوں ——؟"

"بوڑھے بابا — میں نے اس سے امیدیں وابستہ کی تھیں، حسن کی، مکان کی، لباس کی اور خوراک کی مگر ان سب کو ایک ایک کر کے اس نے قتل کر دیا! میں اسے رضاکارانہ موت نہیں مرنے دوں گا بلکہ قتل کر دوں گا! یہ میری مجرم ہے!"

"بیٹا یہ تمہاری مجرم نہیں — دراصل تم آپ اپنے مجرم ہو —— تم نے اس سے امیدیں وابستہ نہیں کی تھیں بلکہ اپنی ذات سے یہ سب امیدیں باندھی تھیں کہ تمہاری ذات اسے اور اس کے ساتھ سب کچھ حاصل کر لے گی، مگر تمہاری ذات ایسا کرنے میں ناکام رہی — اس کے دشمن تم خود ہو —— تمہاری بے صلاحیت ذات —— میری بیٹی نہیں —— سوچ کر بتاؤ کیا میں نے درست نہیں کہا؟"

"ہاں درست کہا ہے، خود سے علیحدہ ہو کر تمہاری طرح سوچوں تو واقعی میں نے یہ سب امیدیں اپنی ذات سے وابستہ کی تھیں مگر میں اپنی امیدوں پر پورا نہ اتر سکا، مجھ میں یہ سب حاصل کر لینے کی صلاحیت ہی نہیں — میں اپنا مجرم آپ ہوں!" میں نے کہا اور جلدی سے اس کی گردن کی سائز کا پھانسی کا پھندہ اپنے گلے میں ڈالنے لگا۔ تو بوڑھا بابا بوکھلا گیا!

"نہیں! نہیں!! یہ نہیں — اسے تم نے استعمال کیا تو میری بیٹی کی اپنی ذات سے وابستہ امیدیں ٹوٹ جائیں گی کیونکہ یہی پھانسی کا پھندہ صرف اس کی گردن کی سائز کا ہے — اسے رہنے دو —— آؤ دکان پر چلتے ہیں —— وہاں میں تمہیں تمہاری گردن کی سائز کا پھانسی کا پھندہ مفت دیتا ہوں!" یہ سب باتیں اس نے دھیمے لہجہ میں کیں تاکہ وہ نیند میں ڈسٹرب نہ ہو۔

"چلو —!" میں نے کہا اور ہم دونوں رات کی تاریکی میں اس دکان کی طرف چل دیئے جہاں دن کو بھی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ ●●

گلوں کی خوشبو

آپ کا تازہ شمارہ پچھلے شمارے کے مقابلے میں، معنوی اور صوری دونوں اعتبار سے خوبصورت ہے۔ مشمولات کو بھی آپ لوگ بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

میرے افسانے کے سلسلے میں عبدالمغنی صاحب کو سہو ہوا ہے، وہ افسانہ تو میں نے آپ ہی کی فرمائش پر لکھا تھا اور وہ بالکل ہی تازہ افسانہ تھا۔

ٹی ایس ایلیٹ نے کہیں کہا ہے کہ جو لوگ اپنی روایات سے چشم پوشی کرتے ہیں ان کو تہذیب یافتہ نہیں کہا جا سکتا۔ ان کی حیثیت وحشیوں کی سی ہوتی ہے۔

اور یہ افسانہ تو ان بڑی سماجی تبدیلیوں کے متعلق ہے جسے ہماری جنریشن کے لوگوں نے دیکھا اور جھیلا ہے۔ PETTY زمینداروں کا ذکر یوں آیا ہے کہ افسانے کو ایک پس منظر کی ضرورت تھی۔

اگر انیس رفیع افسانے کے ابتدائی جملے غور پڑھتے تو شائد انھیں کنفیوژن نہ ہوتا۔

"وہ جو زینے سے اتر رہا ہے اور وہ جو زینے پر چڑھ رہا ہے، دونوں کی کسی نہ کسی مقام پر مڈبھیڑ ہو ہی جاتی ہے۔ اور تب ہی یہ ہوتا ہے کہ ٹھیک سٹیک کے بعد ایک اوپر چلا جاتا ہے اور دوسرا نیچے"۔

ان ابتدائی جملوں کا افسانے سے گہرا تعلق ہے۔

جہاں تک موضوع کا سوال ہے، میں نے ماضی کو بھی افسانے کا موضوع بنایا ہے، حال کو بھی اور مستقبل کو بھی۔

احمد یوسف (پٹنہ)

اردو ادب سے پرانی دوستی کے تعلق سے نئی نسلیں کی نوید مژدۂ بہار کی مانند تھی! اپنے لئے یا نئی نسلیں کے لئے کسی بھی کارِ خدمت سے مطلع کیجئے، میں لمحہ لمحہ حاضر ہوں۔

اقبال منہاس (صفا، شمالی یمن)

اکاڈمی کی لائبریری میں نئی نسلیں دیکھنے کا موقع ملتا ہے آپ کی سرپرستی میں یہ رسالہ اردو کا بہترین رسالہ بن سکتا ہے، اس کا مجھے یقین ہے۔

رام لعل (لکھنؤ)

اس خط کا محرک دراصل "نئی نسلیں" کا تازہ شمارہ ہے۔۔۔۔ یہ پرچہ اپنی ظاہری زیب و زینت اور آرائش کے لحاظ سے پہلی ہی نظر میں اپنی طرف متوجہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ پرچے کے اندر جو کچھ ہے اس کا جال چلن البتہ مجھے اچھا نہیں لگا۔ تعمیری ادب کا اعلان شائع کرنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ ہم۔۔۔۔۔ تو اب تک یہی پڑھتے اور سنتے آئے ہیں کہ ہر اچھا اور معیاری ادب تعمیری ہوتا ہے۔ ہاں! آپ لوگوں کی نظر میں اس سے ہٹ کر اگر تعمیری ادب کی کوئی تعریف ہو تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ (یا آپ کا کیا کر سکتا ہوں) میرے خیال میں رسالے پر ایک مخصوص چھاپ لگا کر اسے ایک مخصوص نظریئے کا پابند بنا کر سکیڑ دینا کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ پھر بھی تعمیری ادب کے نام پر جو منظومات آپ نے شائع کی ہیں ان میں سے کئی چیزیں پسند آئیں۔ غزلوں میں وزیر آغا اور عرفان صدیقی خصوصیت سے پسند آسکے۔

فاروق شفق (کلکتہ)

خوش ہوں کہ اب آپ اس کے صرف صلاح کار نہیں رہے اور آپ کی نگرانی اور ادارت میں نکلنے کا نتیجہ ہے کہ "نئی نسلیں" پہلے سے بے حد سنورا ہوا نظر آتا ہے۔ خدا نظر بد سے بچائے رکھے!

"نئی نسلیں" شمارہ ۱۰ کے افسانوں میں صرف "مشک کی خوشبو" پسند آیا۔ ہے تو چھوٹا سا، مگر خوب ہے۔ کبس زیادہ سے زیادہ ایسے ہی افسانوں کو جگہ دیجئے۔ جب سرخ زدہ ترقی پسندوں نے مارکسی کوڑے کرکٹ سے ادب کو بھر رکھا ہے تو آپ لوگ کردار ساز تخلیق کو پیش کرنے سے کیوں شرماتے ہیں..... آپ اپنے لیے ہی افسانوں کو ہم تک پہنچایئے جن میں صالح کردار کے ساتھ ندرت اور جدت بھی ہو۔ آپ کی اس تخلیق (وہ ایک بستی تھی) میں صالح کردار تو ہے مگر ندرت نہیں ہے۔ مضامین کے حصے میں اسعد گیلانی اور عبدالسلام صاحبان کی کاوشیں پسند آئیں، خاص طور پر اسعد گیلانی صاحب کا مضمون عمدہ ہے۔ نظمیں بھی عمدہ ہیں۔ لیکن اب اس طرح کے اشعار کہاں پڑھنے کو ملتے ہیں۔

جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

مغنی صاحب نے حضرت جذبی سے رجوع کرنے کے لئے کہا ہے میں بھی ان کی بات دہراتا ہوں آپ کے نام جناب وارث رشید قدوائی کے دونوں خطوط معلوماتی اور دلچسپ ہیں۔ خطوط کے بعض جملے اور اشارے پڑھ کر انجم مانپوری اور رشید احمد صدیقی یاد آ گئے۔ ان سے کہئے وہ اسی تجربے سے "نئی نسلیں" کو کچھ دیدیا کریں۔ اس زحمت کے لئے کوئی ان کا شکر گزار ہو نہ ہو لیکن میں تو ہوتا رہوں گا۔

"نئی نسلیں" کو چند مضامین چند افسانے اور چند نظموں کے حصار میں مت رکھئے۔ آج آدمی مسکرانے تک کو ترس گیا ہے۔ اس کا بھی مداوا پیدا کرتے رہئے! اور اس کے لئے "قدوائی قبیلہ" کے لوگوں کو دعوت دیتے رہئے۔ اللہ بھلا کرے گا آپ کا۔

تعمیر پسند جریدوں کے حال سے واقف ہوں، پھر بھی کوشش کیجئے "نئی نسلیں" کو نہ دو مہینے پر تین مہینے پر تو ضرور شائع کریں زندگی تیز رفتار ہو گئی ہے محترم، اس کا ساتھ دیجئے۔

نشاط الایمان
(کلکتہ)

نئی نسلیں کا تازہ شمارہ مل گیا ہے۔ اب کے آپ نے اداریے میں اشاروں سے کام لیا ہے۔ ذرا تفصیل سے بتایئے کہ نوجوانوں کا استحصال کرنے والے کون بزرگ ہیں؟

مشفق خواجہ (کراچی)

مجھے امید ہے کہ علی گڑھ سے نکلنے والا نیا رسالہ پڑھنے کا موقع مل جائے گا۔ ہماری لائبریری میں نہیں آتا۔

لنڈا وینٹک (ڈسکن، امریکہ)

نئی نسلیں میری آواز ہے۔ جو کام میرے سپرد کرد گے میں انشاء اللہ اسے انجام دوں گا..... میں ہر صورت تم سے تعاون کروں گا..... ہماری اسلامی ادبی تحریک کو نئے خون کی بڑی ضرورت ہے۔ لندن کانی لکھنے والے اور لکھنے والیاں مل سکتی ہیں جن کی تخلیقات میں دینی قدروں کا احترام ملتا ہے ہمیں ان سب کو جمع کرنا چاہئے۔ تمہارا پرچہ مل جائے تو لندن یونیورسٹی میں لوگوں کو دکھاؤں گا اور "نئی نسلیں" کے لئے مواد حاصل کروں۔ "نئی نسلیں" کا ٹائٹل بڑا جدید ہونا چاہئے اور یہی اہتمام اس کی دوسری چیزوں میں ہونا چاہئے۔

ابوالخطیب (لندن)

آپ کے صاحبزادہ صاحب نے "نئی نسلیں" ازراہ لطف عنایت فرمائے ہیں۔ اس کے لئے انتہائی مشکور ہوں، ہم نے انجمن (انجمن اردو کینیڈا) میں دیگر احباب ذوق کو بھی پرچے پڑھنے کو دیئے ہیں کچھ حضرات کی نگارشات بھیج رہا ہوں۔ اگر پسند خاطر ہوں تو وقتاً فوقتاً اپنے رسالے میں شائع کرتے رہئے۔ یہ غزلیں، نظمیں، افسانہ انجمن کے جلسوں میں پڑھی گئی ہیں اور ان پر رد و قدح بھی ہوئی ہے۔ ہمیں آپ کے ساتھ تعاون کرکے اور آپ کے ادارہ کا تعاون حاصل کرکے دلی مسرت ہوگی اور کینیڈا کی انجمن اردو اور علی گڑھ سے ایک رابطہ بھی قائم ہوگا...... ہم کوشش کریں گے کہ کچھ خریدار یہاں بھی بنائے جائیں۔

محمد حفظ الکبیر (اونٹاریو، کینیڈا)

میں چند روز ہی میں ایک مفصل خط پیش کروں گا جس میں انجمن اردو کنیڈا کے متعلق مختصر سا تعارف ہوگا۔ یہ عریضہ جلدی میں لکھ رہا ہوں۔

میں انجمن کا لٹریچر ابھی ارسال کر رہا ہوں۔ آپ کی عنایت ہوگی کہ جب ہمارا تعارف شائع کریں تو اس کے ہمراہ کیجئے۔

(کرنل) انوار احمد (سکریٹری انجمن اردو کنیڈا)

آپ کے پرچے کا دسواں شمارہ ملا تعمیری ادب کا "نمائندہ نئی نسلیں" بہت خوبصورت ہے۔ آپ کا اداریہ نوٹ قابل توجہ ہے۔ آپ نے وقت کے اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ ادبی بد عنوانیوں کو زندہ رکھنے کا سہرا آج بھی کرسی نشین ادیبوں کے سر ہے، آپ اس موضوع پر ذرا وضاحت سے لکھنے چاہیے کچھ پردہ نشینوں کے نام آجائیں۔

رفعت سروش (دہلی)

آپ کا ترتیب دیا ہوا "نئی نسلیں" کا پہلا شمارہ جب مجھے ملا تو اس کے ادبی معیار کے سلسلے میں توقع تو ضرور بندھی لیکن تاثرات خوب و ناخوب کے درمیان ملے جلے تھے۔ اس لئے فوری تاثرات کا اظہار نہیں کیا، اور نقش ثانی کا منتظر رہا۔ نقش ثانی نقش اول سے بہرحال بہتر ہے۔ صوری اور معنوی دونوں ہی حیثیتوں سے۔ آپ کے دونوں ہی اداریئے بڑے تیکھے ہیں۔ میرے خیال میں "ملازمانہ اردو" [illegible] سلسلہ ہویا" سارقانِ تصنیف و تالیف کا، یہ ادبی مسائل نہیں ہیں۔ آپ اپنے اداریوں میں ادبی مسائل اور موضوعات کو چھیڑئیے۔ آج اردو ادب کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ جدیدیت اور ترقی پسندیت کے نام پر جو انتہا پسندی ادب میں آئی ہے اس کے نتیجے میں اردو شعر و ادب اپنی روایات اور تہذیب دونوں سے کٹ گیا ہے۔ اس کی واضح مثال آج کا تخلیقی ادب، شعر و افسانہ ہے۔

"نئی نسلیں" کا تازہ شمارہ پیش نظر ہے، شعری حصہ میں سہیل احمد زیدی کی نظمیں، اتنی جدید ہیں کہ میرے اور سہیل احمد زیدی کی دونوں نظموں کے درمیان ذہنی فاصلے کافی بڑھ گئے ہیں۔ حالانکہ میں قدیم و جدید کو حدیثِ کم نظری سمجھتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ مجھے "صنوبروں کا شہر" والے سہیل احمد زیدی چاہئیں۔ اسی طرح جب غزلوں پر نگاہ ڈالتا ہوں تو نگاہیں حفیظ میرٹھی کو تلاش کرتی ہیں کلیم عاجز کو ڈھونڈتی ہیں کلیم ہوں یا حفیظ۔ ان کی غزلیں دلوں کو چھوتی اور ذہنوں کو مسرت بخشتی ہیں۔ فیض احمد فیض سے چاہے جتنا نظریاتی اختلاف ہو، فیض کی شاعری کے نظریاتی نعروں سے ہٹ کر، ان کی شاعری کی خوبیاں اردو شاعری کی تہذیبی روایات کی مرہونِ منت ہیں ہمیں اعتراف کرنا چاہیئے کہ اردو کا کوئی جدید شاعر فیض کے قد سے قد ملا کر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح افسانوں کو لیجئے طارق چھتاری کا افسانہ "تین سال" اور آپ کا افسانہ "وہ ایک بستی تھی"، اچھے افسانے ہیں۔ انجم نعیم کے دونوں افسانے "آخری لمحہ کا سفر" اور "سلسلہ سفر کا" اور احمد جاوید کا افسانہ "اور پھر خودکشی" کو مسرت و بصیرت سے یکسر خالی، صرف ایک ذہنی رو ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہنے کا مدعا یہ ہے کہ اتنا جدید بھی نہ بنائیے کہ رسالہ غالب کے اس شعر کا مصداق بن جائے:

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

میں سمجھتا ہوں، ان مسائل و موضوعات کو اداریوں میں چھیڑنا چاہئے اور "گلوں کی خوشبو" میں اظہارِ خیال کے لئے اپنے قارئین کو دعوت دی جاسکے۔

مقالات دونوں شماروں کے اچھے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالمغنی اور جناب انور صدیقی سے تنقیدی مقالے لکھوائیے اور جناب انور صدیقی، شاید وہ مجھے بھولے نہ ہوں، تو میں ان سے کہوں گا کہ مجھے تو آپ کی شاعری بے حد پسند تھی۔ ادھر توجہ کیجئے۔ انور صدیقی میں تخلیقی و تنقیدی دونوں صلاحیتیں اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ کاش وہ ان کو کام میں لاتے۔

ایک بات آخر میں یہ عرض ہے کہ مجلس ادارت میں میرے جیسے کچھ غیر ضروری نام بھی ہیں۔ ناموں کی یہ طویل فہرست اچھی نہیں لگتی مجلس ادارت ہو یا مجلس مشاورت شروع کے چار نام ڈاکٹر عبدالمغنی سے جناب ابوالمجاہد زاہد تک کافی ہیں، ہاں ایک نام پروفیسر حکیم

سہمانی کا اضافہ کیجئے۔ اس طرح پانچ کی یہ مجلس مشاورت اچھی رہے گی۔

طیب عثمانی (گیا)

"نئی نسلیں" میں "گلوں کی خوشبو" پاکر جی چاہا میں بھی کچھ پیش کروں۔

سرِ دست اداریہ نظمیں، غزلیں، "سفر ہے شرط" اور "مشک کی خوشبو" پڑھ پایا ہوں۔ ابوالمجاہد زاہد صاحب، نشتر خانقاہی صاحب، عرفان صدیقی صاحب اور قمر مرادآبادی صاحب کی غزلیں بہت خوب ہیں۔

"سفر ہے شرط" پڑھ کر خاصا لطف آیا اور معلومات میں بھی اضافہ ہوا۔ قدوائی صاحب نے اپنے دوسرے خط میں فرینک فرٹ (مغربی جرمنی) کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ تحریر کیا ہے:-

"کھلے بازار میں راہ چلتے ٹورسٹوں کو مہ جبینانِ
فرنگ دعوتِ وصل دیتی ہیں، ہماری شکل سے نہ جانے
عفت مآب خواتین کو کیا اندازہ ہوا کہ کسی نے ہم سے کوئی
کام کی بات کرنا مناسب نہ جانا۔"

ہائے، مجھے بھی ان کی اس کج فہمی اور بدذوقی پر دکھ ہوا۔ ظالموں نے صرف شکل سے اندازے پر قدوائی صاحب کا دل توڑ دیا۔ ابھی خط کے آخر میں "آپ کا وارث" پڑھا، مزید لطف آیا۔ پلٹ کر پہلے خط کا آخر پھر دیکھا تو "فقط وارث" پایا۔ چلئے، آپ کا وارث میرے علم میں بھی آیا۔ شکر ہے آپ لاوارث نہیں۔

"مشک کی خوشبو" اس لئے بھی پسند آیا کہ مختصر تھا۔

ہاں، حضرت! یہ "ننھا منا سا نئی نسلیں" ماہنامہ سے سہ ماہی کیسے ہوگیا؟

رئیس رامپوری (رامپور)

نوازش نامہ ملا تو دل خوش ہوگیا۔ اس لئے کہ ساتھ ہی تازہ پرچہ "نئی نسلیں" بھی ملا جو بلاشبہ محاورے کی زبان میں نقشِ ثانی بن کر آیا ہے اور اب اس میں جامعیت اور طمانیت کی دونوں کیفیتیں موجود ہیں۔ اس کے انداز سے یہی محسوس ہوتا ہے کہ قدم بہ قدم اس نے آگے کی طرف سفر کرنا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ایک خالص ادبی جریدہ مصالح افکار کا حامل وجود میں آگیا ہے۔ ہماری دعائیں تو

ہر لمحہ اس کے ساتھ ہیں باقی ادبی دوا دارو کا بھی اہتمام کرنے کی کوشش کریں گے۔

سید اسعد گیلانی (لاہور)

فارم ۴

مقامِ اشاعت: ۲۴۴۸، بارہ دری شیر افگن بلیماران دہلی ۶

میعادِ اشاعت: ماہنامہ

طابع، ناشر و ایڈیٹر: م نسیم

پتہ: ۲۴۴۸ بارہ دری شیر افگن، بلیماران، دہلی ۶

ملکیت: م نسیم

میں م نسیم اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کی حد تک درست ہیں۔

دستخط - م نسیم -

تازہ واردانِ ادب

کتاب : چہرہ پس چہرہ

مصنف : ابن فرید
ناشر : ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
قیمت : پچیس روپئے۔

ابن فرید اردو تنقید میں عمرانی مطالعہ ادب کے لئے معروف ہو چکے ہیں۔ اسی مطالعے پر مشتمل ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ "میں، ہم اور ادب" تھا اور اب دوسرا مجموعہ "چہرہ پس چہرہ" ہے۔ وہ اس کو "بین العلومی مطالعہ" کہتے ہیں، جس کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ یہ "نہ کوئی تحریک ہے، نہ رجحان، نہ فلسفہ"۔ اس سلسلے میں حقیقت پسندی اختیار کرتے ہوئے وہ یہ اقرار بھی کرتے ہیں کہ یہ مطالعہ "نہ فنی تنقید کا بدل ہے نہ مدمقابل، بلکہ یہ ایک علمی رسائی (APPR OACH) ہے۔ بہرحال، انھیں اپنے پسندیدہ بین العلومی مطالعے کی سنجیدگی و ذمہ داری اور اردو میں اس کی کمیابی کا شدید احساس ہے۔ "روبرو" کے عنوان سے "چہرہ پس چہرہ" کے پیش لفظ کا آغاز وہ اس طرح کرتے ہیں: ۔

> "یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ اردو زبان و ادب کے علمی و فنی مطالعہ کی طرف سنجیدگی سے توجہ دی جانے لگی ہے۔ اب چلتے کلموں اور مہمل اصطلاحی کرتب بازی کی فیشن پرستی کم ہوتی جا رہی ہے۔ "صفا پرست" نقاد جالاں کہ اب بھی دوسروں کے دخل در معقولات پر شکن در جبیں ہو جاتے ہیں، لیکن اتنی مروت اب وہ بھی برتنے لگے ہیں کہ دوسرے علوم سے آگاہی کی نمائش کر دیا کرتے ہیں۔ بات جب اس مرحلے تک پہنچ گئی ہے تو ہمیں تھوڑا سا حقیقت پسند ہونا پڑے گا۔ جس طرح تنقید ایک فن ہے اور اس کے تقاضوں کو وہی صاحب نظر پورا کر سکتا ہے جسے اس کی سلیقہ مندی ہو، اسی طرح ادب کے لسانیاتی، عمرانی، معاشیاتی، ثقافتی، تاریخی مطالعہ کے لئے ان علوم کی تربیت لابدی ہے۔"

علوم و فنون کی اس فہرس میں ابن فرید نفسیات کا نام لینا بھول گئے ہیں، جب کہ ان کے بین العلومی مطالعہ ادب میں عمرانیات کے ساتھ جس عنصر کا سب سے زیادہ دخل ہے وہ نفسیات ہی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ان دونوں "علوم کی تربیت" انھوں نے حاصل کی ہے اور اس معاملے میں وہ ایک "صاحب نظر" کی سلیقہ مندی" رکھتے ہیں۔ جب کہ ان کی تنقید میں ثقافتی عنصر ایک اخلاقی تصور کی شکل میں موجود ہے۔ وہ "چلتے کلموں اور مہمل اصطلاحی کرتب بازی کی فیشن پرستی" میں قطعاً مبتلا نہیں ہیں۔ جو بات کرتے ہیں کافی واقفیت اور غور و فکر کے ساتھ کرتے ہیں اور ایک اعلیٰ مقصد و مطمح نظر کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

ادب کے بین العلومی مطالعہ کے لئے ابن فرید کی صلاحیت کا بین ثبوت ان کے دوسرے مجموعے میں شامل پہلے ہی دو مضامین "علامت کا تصور زمانی و مکانی" اور "دیومالا اور علامت" سے مل جاتا ہے۔ پہلے مضمون میں علامت کے زمانی و مکانی عناصر پر ماہرین کی رایوں کا محاکمہ کر کے ایک "زیادہ جامع حقیقت" کا انکشاف کرنے کے لئے ابن فرید نے اپنے ہی الفاظ میں "ایک نیا نظریہ کے پیش کرنے کی جرات" کی ہے۔ بجائے خود یہ جرات اردو

تنقید میں ایک خوش آئند کوشش اور اس کے لئے نیک فال ہے
یہ محض جرأتِ رندانہ نہیں ہے بلکہ ایک عالمانہ و مبصرانہ اجتہادِ فکر
ہے جس کی شدید ضرورت نیز قلت اردو تنقید میں ہے۔ کافی بحث و
استدلال کے بعد عناصرِ علامت کے متعلق زیادہ جامع و حقیقت پر
مشتمل جو نیا نظریہ ابن فرید نے پیش کیا ہے وہ یہ ہے۔

"گویا علامت کے امکان کے تعین کے لئے اس
کے طبعی ماحول، تہذیب و معاشرہ اور افراد تینوں کو
ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا۔ جو علامت ساز ان میں سے کسی
ایک جہت سے بھی چشم پوشی کرتے ہیں یا کسی بھی عنصر کی
اہمیت کو نظر انداز کرتے ہیں وہ حقیقتاً علامت کے مزاج
اور عناصر ترکیبی سے ہی ناآشنا ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے
ان کی علامت میں گہرائی و گیرائی ہوتی ہے اور نہ اسے
قبولیت عام حاصل ہوتی ہے۔"

اس نظریئے کے مضمرات سے بجا طور پر وہ یہ ادبی و فنی نتیجہ بھی اخذ
کرتے ہیں

"فرد اپنے تجربات صرف اپنی ذات تک کبھی محدود
نہیں رکھتا۔ وہ ان میں ہمیشہ دوسروں کو شریک کرنا چاہتا
ہے... لیکن جب فرد یہ طے کرلے کہ علامت اس کی
ذاتی میراث ہے تو پھر وہ صرف خود کلامی ہی کر سکتا
ہے، ابلاغ و ترسیل نہیں، اور یہ خود کلامی، کسی بھی نوعیت
سے اپنے اندر علامت کے جراثیم نہیں رکھتی۔"

اس طرح علامت نگاری کے موضوع پر اردو ادب میں جو مباحثہ پچھلے
چند برسوں میں ہوتا رہا ہے اس پر ابن فرید نے ایک قولِ فیصل بہت
ہی موثر ماہرانہ انداز میں پیش کر دیا ہے اور یہ جدید اردو تنقید میں ان
کا ایک کارنامہ ہے۔

اردو تنقید کے نظریاتی مباحث میں اس اضافے کے علاوہ
ایک اور اضافہ ابن فرید کے زیر نظر مجموعے میں شامل مضمون "اقبال
کا عمرانی تصور" سے عملی تنقید میں ہوتا ہے۔ اس موضوع پر سب سے
پہلے تو مصنف نے اقبال کے ایک مقالے کا گویا انکشاف کیا ہے،
جو انھوں نے ۱۹۱۰ء میں ایم او اے کالج کے اسٹریچی ہال میں
"ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے عنوان سے پڑھا تھا۔ اس
سلسلے میں ابن فرید نے ابن خلدون اور دوسرے ماہرین عمرانیات
کے عمرانی تصورات پر بحث کرنے کے بعد اقبال کے مقالے کا تجزیہ
کیا ہے اور مستند استدلال کے ساتھ نتیجہ نکالا ہے:۔

"معاشرتی تبدیلی کے بارے میں اقبال ایک
واضح نظریہ رکھتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اس
عمل سے متعلق نامیاتی زاویۂ نظر کو اہمیت دیتے ہیں
اور عمرانی نظام کو جسمانی یا نامیاتی نظام سے مماثل قرار
دیتے ہیں، لیکن معاشرہ کے وجود سے زوال تک کے
ہر مرحلے کو دوائری نہیں مانتے.... اقبال کا معاشرتی
تبدیلی کا تصور ٹائن بی، پیریٹو، اسپنگلر، وِکو، سوروکن
وغیرہ کی طرح دوائری نہیں ہے۔ اور نہ وہ احیائی نوعیت
کے مبلغ ہیں۔ ان کا اپنا ایک علمی نظریہ ہے جس کو وہ
استقبالیت کی اصطلاح سے موسوم کرتے ہیں۔ ان کے
نزدیک عمران رکتا نہیں ہے، اپنے مرکز پر واپس نہیں
آتا ہے بلکہ اپنی منزل کی طرف ہمیشہ گامزن رہتا ہے
جسے خالقِ کائنات نے متعین کر دیا ہے۔"

اقبال کے اس عمرانی تصور کے عناصر ابن فرید کے خیال میں
تین ہیں، جب کہ یہ تصور اصولاً اسلامی ہے۔ اول یہ کہ "مظاہر کائنات
کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات
ہم سب کو ترکے میں پہنچی ہیں وہ بھی ہم سب کے لئے یکساں ہیں" یہ اقبال
کے الفاظ ہیں جن کا مطلب ابن فرید کے نزدیک یہ ہے کہ "اقبال
مروجہ صفات کو معاشرہ کی اساس نہیں مانتے بلکہ عرفِ عام میں مذہب
یعنی دین کو صفتِ اولیں قرار دیتے ہیں"۔ دوم، اقبال کے تخیل
میں "قومی زندگی سے مطابقت کے لئے قلب ماہیت" جو ابن فرید
کے لفظوں میں "اس عظیم ترکہ سے ملت کو میسر آئی ہے جو ہمہ گیر
خیال کی صورت میں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی رہتی ہے۔ یہ خاصیت
معاشرے میں بنیادی فکر کے سیاق میں مختلف ثقافتوں اور
تہذیبوں کے اختلاط و امتزاج سے وجود میں آتی ہے۔" اس
سلسلے میں ہندوستان کے اسلامی تمدن کے متعلق اقبال کے
یہ الفاظ نہایت خیال انگیز ہیں:۔

"ہمارا اسلامی تمدن، سامی تفکر اور آریائی

تخیل کے اختلاط کا ماحصل ہے۔ اس کی نزاکت اور دل ربائی
اسے اپنی آریہ ماں کے بطن سے اور اس کا وقار و متانت
اسے اپنے سامی باپ کے صُلب سے ترکہ میں ملا ہے۔"
سوم، ضبط نفس، جو متذکرہ بالا دونوں صفات کی روشنی میں
معاشری عمل و تعامل میں اعتدال و توازن کا متقاضی ہوتا ہے۔"

اقبال کے اس عمرانی تصور کی روشنی میں ابن فرید بجا طور پر یہ ناقدانہ تبصرہ کرتے ہیں کہ "اگر اقبال عمران کی صفات اسلام کے اساسی تصور سے ہم آہنگ کر کے بیان کرتے ہیں تو وہ تبلیغی روش اختیار نہیں کرتے بلکہ علمی تصور پیش کرتے ہیں"۔ اسی طرح ابن فرید کا یہ تبصرہ بھی جس پر ان کا زیر بحث مضمون ختم ہوتا ہے بہت ہی حقیقت افروز ہے۔

"ان سب کو جب ہم کلی نظام میں منسلک کریں
گے تب ہی معاشرہ یا بقول ابن خلدون عمران بحیثیت
کلی نظام عالم وجود میں آئے گا، اور کلی نظام ہی اقبال
کے سماجی مطالعے کے کلی تناظر کے لئے سودمند ثابت
ہوگا۔"

مجموعے کے دوسرے چند مضامین کے موضوعات یہ ہیں۔ میر کی شاعری میں شخصیت، غالب کی شاعری میں شخصیتی کش مکش، رشید احمد صدیقی بحیثیت نقاد، محمد حسن عسکری: تخاذر مشرق، فیض کی شاعری سے چند فنی پہلو، خالد کی منظوم تمثیلیں۔ ان میں عسکری کے ذہنی ارتقا کا دستاویزی مطالعہ خاص کر ان لوگوں کو دعوتِ فکر دیتا ہے جو انہی جدیدیت پرستی کے لئے عسکری کے تصورات کو سند کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں عسکری کی اسلام پسندی پر ابنِ فرید کے اس تبصرے سے میں کامل اتفاق کرتا ہوں کہ "انھیں بار بار یہ احساس ہونے لگا کہ مغرب عالم نفس اور روح کے فرق کو نہیں سمجھ سکا ہے"۔ لہذا "انھوں نے اس نظام حیات کو حبل المتین کی طرح پکڑ لیا جس نے انھیں اخلاقیات، اقدار اور جمالیات کا ایک مربوط ضابطہ فراہم کر دیا"۔

یہی وہ نظام حیات اور تصور ادب ہے جسے میں اپنی تنقید وں میں پچھلے بیس پچیس سال سے پیش کرتا ہوں اور اس کی روشنی میں تمام ادبی موضوعات و مسائل کا مطالعہ و تجزیہ کرتا رہا ہوں۔ زیر نظر مجموعے میں ابن فرید کے عالمانہ مضامین میرے تنقیدی موقف کی تائید و تقویت کا باعث ہیں۔

بس ان مضامین میں مجھے ایک کمی کا احساس کئی مواقع پر ہوا وہ یہ کہ ادبی تنقید کے ترکیبی عناصر تین ہیں: موازنہ، تجزیہ، فیصلہ اور ابن فرید موازنہ و تجزیہ تو بہت خوب کرتے ہیں، مگر فیصلہ کرنے میں انھیں تامل ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے، یہ صورت حال علی گڑھ کے اس اسلوب تحریر کو پسند کرنے کے سبب ہو جس کی تحسین ابن فرید نے رشید احمد صدیقی کی تنقید نگاری پر اپنے مضمون میں کی ہے۔ لیکن یہ اسلوب تحریر آل احمد سرور کے اس انداز نگارش سے بہت قریب ہے جس کو ابن فرید ناپسند کرتے ہیں۔ چناں چہ رشید احمد صدیقی پر مضمون میں ابن فرید نے آل احمد سرور کے طرزِ تنقید کو جو اپنے ممدوح کے طرز سے مختلف بتایا ہے وہ صحیح نہیں، دونوں بزرگ ناقدین ایک ہی قسم کی شگفتگی بیان میں اسیر ہیں جو بعض وقت اس آشفتہ بیانی تک پہنچ جاتی ہے جس کا اقرار رشید احمد صدیقی نے اپنے ایک مقالے کی عنوان بندی سے کیا ہے۔ علی گڑھ اگر کوئی مکتب فکر ہے تو اس کے نمائندہ رشید احمد اور آل احمد دونوں ہیں، گرچہ واقعہ یہ ہے کہ علی گڑھ تنقید ادب کی دنیا میں صرف ایک مدرسۃ العلوم یا جامعۃ العلوم کا نام ہے۔

عبدالمغنی۔
(آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے نشر ہوا)

کتاب: یادگارِ شبلی
مصنف: ڈاکٹر شیخ محمد اکرام
ناشر: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور
قیمت: ۳۰ روپے

مرحوم شیخ محمد اکرام اردو دنیا میں ناقابلِ فراموش ہستی رہے ہیں ان کی ہر تصنیف نے دنیائے علم و ادب میں بحث و مباحثہ کی گرما گرمی پیدا کی۔ بہتوں نے ان سے اتفاق کیا اور بہتوں نے اختلاف پھر بہر بار علمی مباحث کے سرد پڑنے سے پہلے انھوں نے ایک نیا باب کھول دیا۔ وہ پہلے صاحب نظر تھے جنھوں نے "آثار غالب" کے ذریعہ ۱۹۲۳ء میں غالب کا نفسیاتی مطالعہ پیش کیا اسی طرح انھوں

نے "شبلی نامہ" لکھ کر شبلی کی حیات اور کارناموں پر نئے زاویے سے اوسط
حجم کی کتاب لکھی جس میں انھوں نے ڈاکٹر وحید قریشی کے اتباع
میں شبلی کی رنگین زندگی کو اس حد تک نمایاں کیا کہ مرحومہ عطیہ فیضی نے
اس کے لئے ایک ضمیمہ لکھا جس میں اپنی معصومیت اور لاعلمی کا اعلان
اور شبلی سے اپنی نفرت کا اظہار اس انتہا تک کیا کہ شبلی کو خبیث قرار
دیا۔ ایک عرصہ تک عاشقی کا الزام شبلی کے سر رہا۔ ۱۹۶۰ء میں مجھے
یہ خیال آیا کہ "اردو کے عناصر خمسہ" میں شبلی کو غیر معمولی طور پر یا شاید
ارادی طور پر نظرانداز کیا جا رہا ہے۔ تو میں نے "ادیب" (علی گڑھ) کا
شبلی نمبر شائع کیا اور ان کی حیاتِ معاشقہ پر لکھنے کا بیڑا خود اٹھایا۔ یہ
مضمون شائع ہوا اور اس نے خصوصیت کے ساتھ اے اے اے
فیضی اور ڈاکٹر وحید قریشی کو متوجہ کیا۔ مرحوم فیضی صاحب نے تو اپنے
اتفاقِ رائے کا زبانی اظہار مرحوم ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی سے کیا،
لیکن ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے براہ راست مجھے لکھا کہ وہ اپنی
تصنیف "شبلی کی حیاتِ معاشقہ" پر نظرثانی کرنا چاہتے ہیں، البتہ
شیخ صاحب کی طرف سے کوئی خیر خبر نہ آئی۔ میں نے سوچا وہ
ناراض ہو گئے ہوں گے کیوں کہ ان کے لئے میرا لہجہ قدرے سخت تھا
لیکن اچانک مئی ۱۹۶۹ء کی ایک شام آٹھ بجے وہ علی گڑھ میں
میری کوٹھی پر وارد ہوئے۔ مجھ پر بے پناہ حیرت آمیز مسرت طاری
ہوئی۔ مرحوم نے فرمایا کہ اس بار وہ علی گڑھ مجھ سے ہی ملنے کی
غرض سے آئے ہیں، چنانچہ پانچ دن تک ان سے بڑی تفصیلی
ملاقاتیں رہیں۔ شبلی اور ان کے منجھلے بھائی محمد مہدی حسن کے
بارے میں تفصیلی گفتگوئیں ہوئیں۔ ان گفتگوؤں کے دوران ہی انھوں
نے یہ مژدہ سنایا تھا کہ وہ "یادگارِ شبلی" کے عنوان سے ایک مفصل
سوانحی کتاب لکھ رہے ہیں، پاکستان جاتے ہی وہ اسے مکمل
کر کے اشاعت کے لئے دے دیں گے۔ وہ واپس گئے تو تیسری
ہند و پاک جنگ چھڑ گئی۔ ابھی تعلقات استوار بھی نہ ہو پائے
تھے کہ وہ ۱۹۷۳ء میں انتقال فرما گئے، (اللہ تعالیٰ انھیں غریقِ
رحمت کرے) پھر اس کے بعد ان کی خبر نہ آئی۔ میں

اب ۱۹۸۱ء میں، پورے دس سال بعد، ان کی مذکورہ تصنیف
ہاتھ آئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی ان کی طرف
سے سرد مہری کا رویہ اختیار کر لیا گیا ہے۔ نہ کہیں اس کتاب پر کوئی
تبصرہ نظر سے گذرا، اور نہ کسی نے اس کا حوالہ دیا۔ وائے اردو
تیری بدتوفیقی!

"یادگارِ شبلی" کے سرورق پر ذیلی عنوان کے طور پر یہ عبارت درج
ہے: "شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی کے تفصیلی حالاتِ زندگی اور
ان کی تصانیف اور کارناموں پر سیر حاصل تبصرہ"۔ یہ سوانح ڈیمائی سائز
کے ۵۶۴ صفحات پر محیط ہے، اور تیرہ ابواب میں منقسم ہے۔ شیخ
صاحب نے شبلی کی زندگی کے مختلف مراحل کے ساتھ ساتھ ہی ان
کی تصانیف کا تعارف بھی کرایا ہے، ان پر علمی سنجیدگی اور گہرائی
کے ساتھ بحث بھی کی ہے۔ بارہواں باب البتہ خصوصیت کے ساتھ
سیرت النبی پر ہے۔

اس تصنیف میں شیخ صاحب مرحوم کا رویہ "شبلی نامہ" سے
قطعاً مختلف ہے، ان کی تعریف مداحی نہیں اعتراف ہے، ان
کی گرفت عصبیت نہیں تنقید ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ صاحب
مرحوم نے اس بار اپنے ذہن میں تحفظات نہیں رکھے ہیں بلکہ
کھلے ذہن کے ساتھ شبلی کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ میرے لئے
یہ خوشی ہی کی نہیں اعزاز کی بات ہے کہ میری ان کی بالمشافہ گفتگو کی
جھلک اس کتاب میں بعض جگہوں پر نظر آتی ہے۔ اور یہ بھی میرے لئے
مزید باعثِ افتخار ہے کہ شبلی کی حیاتِ معاشقہ کے سلسلے میں انھوں
نے اپنے پچھلے زاویۂ نظر پر نظرثانی کی ہے اور میرے موقف کو اختیار
کیا ہے۔

شبلی سے متعلق لٹریچر میں "یادگارِ شبلی" گراں قدر اضافہ ہے۔
علاوہ ازیں شیخ صاحب مرحوم کی آخری تصنیف ہونے کی حیثیت
سے اہل علم کے لئے بیش قیمت علمی دستاویز ہے۔

ابن فرید

کتاب: **جستجو**

مصنف: **پروفیسر تحسین فراقی**

ناشر: مکہ کمبس، بیرون موچی دروازہ، لاہور

قیمت: ۳۶ روپے

بات ہندوستان پاکستان کی تخصیص کی نہیں، اردو تنقید کی ہے
اور بلاشبہ تحسین فراقی سنجیدہ، پراعتماد تجزیاتی تنقید کا سب سے جواں سال

نام ہے جس کا ثبوت ان کا پہلا تنقیدی مجموعہ "جستجو" ہے۔ اور اس جستجو میں بلند معیار تخلیقی تجربوں کو دیانتدارانہ انداز میں تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ درسی تنقیدی نظریے کی سہمی میں جنم لینے والی نئی نسل کے بیچ اس تحسین فراقی کے فراستِ علمی کا آغاز ہے جو اپنے نفس سے فتویٰ اور قلب سے گواہی لیتا ہے اور جو اپنے باضمیر قارئین کے سامنے اپنی پہچان کیلئے حیلے نہیں تلاش کرتا۔ خدا کا شکر ہے کہ اردو تنقید، اشتراکی ناقدوں کی ڈاگماوانی تنقید اور بعض غیر مہذب جدید ناقدوں کے ہوائی گھوڑوں پر سوار ابہام کے دھندلکوں میں بھٹکتی ہوئی تنقیدی تجربوں سے ادھر اُدھر دامن بچاتی ہوئی اب ایک ایسی راہ پر آنے کی کوشش کر رہی ہے جس میں اعتدال اور توازن نشانِ راہ بن کر منزل کی واضح نشاندہی کر رہے ہیں۔

۲۲۰ صفحات کے اس مجموعے میں اردو ادب میں اسلامی اقدار کی پیشکش اردو تنقید کے دس سال، بھٹائی اور اس کی شاعری علامہ اقبال اور ثنائے خواجہ، اقبال اور ابوالعلاء المعری، اکبر الٰہ آبادی، محمد حسن عسکری یا درجدیدیت، بشنو از نے چوں حکایت مے کند جیسے آٹھ موضوعات پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور اردو ادب میں اسلامی اقدار کی پیش کش کے مسئلہ کے علاوہ ہر موضوع کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ مجموعہ کے اس پہلے مضمون کی کوئی اہمیت نہیں، بلکہ میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک گہرے دینی احساس رکھنے اور اسی سیاق و سباق میں ادب کی بنیادی قدروں کو دیکھنے والے تحسین فراقی کو یہ لازم نہیں تھا کہ اس وسیع المطالعہ موضوع کو صرف یہ کہہ کر کہ جہاں یہ ضروری ہے کہ عدل و انصاف اور تقویٰ کی اسلامی اقدار کو ادب کے عروق میں اتار اجائے وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ الفاظ و اقدار کے پیوند سے اعلیٰ جمالیاتی ادب تخلیق ہو۔" انتہائی اختصار سے تین صفحات میں قلتِ نفطی کا شکار کر دیتے۔ جب وہ یہ فرماتے ہیں کہ تمام شکر ہے کہ اردو کے ادیب اپنا قبلہ درست کر رہے ہیں اور اب ان کا قافلہ ایک مخصوص اور متعین سمت کی طرف مڑ گیا ہے تو لوگوں کو استفسار کرنے کا یہ موقع ہاتھ آتا ہے کہ وہ کہاں کے اور کون سے ادیب ہیں جو اپنا قبلہ درست کر رہے ہیں اور وہ متعین سمت کون سی ہے جس کا دعویٰ ہے۔ ظاہر ہے اس کا جواب اثبات میں موجود ہے لیکن سمت کے تعین اور قبلہ کی کرنے والے واضح اشارات اور اس کی پیمائش کے میزان اب بھی ہماری طرف سے واضح شکل میں پیش نہیں کئے جا سکے ہیں اور الفاظ و اقدار کے پیوند سے اعلیٰ جمالیاتی ادبی تخلیق کی شناخت کا مسئلہ ہنوز توجہ کا طلب گار ہے جہاں تحسین فراقی تو حسن عسکری جیسے نقاد کے اس فیصلہ پر تعجب ہے کہ فحش نگاری کا مسئلہ شمالعتاً مغرب کی پیداوار ہے وہیں بہت سارے ادب کے قارئین اپنا قبلہ درست کرنے والے عسکری کی یہ بات بھی سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ان کے نزدیک میراجی کی افضلیت کا کیا جواز ہے۔ تحسین صاحب سے امید کی جاتی ہے کہ اپنے کسی دوسرے تفصیلی مقالے میں اعلیٰ جمالیاتی ادبی تخلیق کی شناخت کے مسئلہ پر اپنے ڈیٹ منٹ سے گہری جذباتی وابستگی کی روشنی میں اظہار خیال فرمائیں گے۔

اس مجموعے کا دوسرا انتہائی اہم مقالہ ۷۰ صفحات پر مشتمل پاکستان کی دس سالہ تنقیدی تخلیق کا تجزیہ "اردو تنقید کے دس سال" ہے جس کے بارے میں سراج منیر کی رائے ہے کہ یہ مضمون تحسین کی پوری شخصیت کے بنیادی پہلوؤں کو واضح کرتا ہے اور اس کے بارے میں خود تحسین کا خیال ہے کہ یہ مضمون بیشتر ہاتھوں کی شکن آلودگی کا باعث بنا۔ میرے خیال میں بے شک یہ مضمون بیشتر ماتھوں کی شکن آلودگی کا باعث بنا ہوگا کیونکہ سکہ بند ناقدوں اور "مستقبل پرست" مصلحت کوشوں کے درمیان اعتماد اور بے باکی کی اس تحریر سے اور دوسرے اثرات مرتب ہی کیا ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس پورے مضمون میں مجھے یہ شائبہ احساس ہوتا رہا کہ ہمارے اس جلیل سال ناقد نے جہاں کہیں بھی فتح محمد ملک کے علاوہ ترقی پسندوں کا ذکر کیا ہے وہ اپنا انداز چھوڑ کر ترقی پسندوں کے انداز میں گفتگو کرتے نظر آتے ہیں اس نقل کفر میں سکہ بند ترقی پسند سجاد ظہیر، اختر حسین رائے پوری اور محمد علی صدیقی وغیرہ کے ساتھ ممتاز حسین اور احتشام حسین بھی دار کی زد پر پورے پورے اتر گئے۔ کچھ تو رحم کیا ہی جا سکتا تھا۔

آج ہماری تنقید کا المیہ یہ بھی ہے کہ عدم مطالعہ اور حیلے حوالے کا سہارا لینے کی سطحی کوششوں سے نپٹنے والے نقاد ادب کی مہار اپنے ہاتھوں میں لئے سمتیں متعین کر رہے ہیں۔ ایسی فضا میں یقیناً ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جن کا مطالعہ وسیع ہے اور دوسرے علوم و فنون پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ تحسین بھی ان ہی لوگوں میں سے ایک ہیں۔ جن کی عربی فارسی اور دوسری زبانوں نیز فلسفہ نفسیات و

سماجیات پر بھی نظر ہے۔ اٹھارویں صدی کے سندھی زبان کے مقبول صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی اور بنو عباس کے تیسرے دور کے آخری شاعر ابوالعلاء المعری کی شاعری پر تفصیلی مضمون اور پھر ابوالعلاء المعری اور اقبال کے یہاں بعض فکری مماثلت کی طرف نشاندہی بہر حال تحسین کی مختلف زباں دانی اور تصوف و فلسفہ سے رغبت کی تصدیق کرتی ہیں۔

"علامہ اقبال اور ثنائے خواجہ" میں نعت گو شعرا کے نعتیہ خصائص کے اجمالاً جائزہ کے بعد بڑے خوبصورت اور والہانہ پیرائے میں علامہ اقبال کی نعت گوئی کے محاسن پر بحث کی گئی ہے۔ تحسین کا خیال ہے کہ اقبال کے کلام کی روحِ رواں حضور اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ اور ان کی حیات انگیز حیاتِ مطہرہ ہے۔ ان کے اس دعوے کی بہترین دلیل خود ان کا یہ مضمون ہے۔

اکبر الٰہ آبادی پر بہت دنوں کے بعد ایک خاص انداز سے قلم اٹھایا گیا ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اکبر کو ماورائے ظرافت دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے بقول ناقد معروف نقاد خواجہ محمد ذکریا کی کتاب اکبر الٰہ آبادی اس مضمون میں ان معروضات کی محرک بنی ہے۔ جسے تحسین نے اپنے مطالعہ کے لئے منتخب کیا ہے۔

"محمد حسن عسکری اور جدیدیت" اور "انتظار حسین کے فن پر "ستواز چوں حکایت می کند" کے عنوان سے دو مضامین میری نظر میں اس مجموعے کے نہایت اہم مضامین ہیں۔ ان دونوں مضامین کی اہمیت کے پیشِ نظر ان پر الگ سے ایک مبسوط تجزیاتی تبصرے کی ضرورت ہے جو ان صفحات میں ممکن نہیں۔

"جستجو" ہماری نظر میں جدید تنقید میں اپنی اہمیت کے اعتراف کی متقاضی ہے۔

انجم نعیم

کتاب : ادب کی تعمیری جہت

مرتب : انجم نعیم

ناشر : کریسنٹ پبلشنگ کمپنی، عبدالقادر مارکیٹ، علی گڑھ

قیمت : ۲۰ روپے

اس وقت میرے مطالعہ کی میز پر جو کتاب سب سے نمایاں نظر آرہی ہے اس کا نام ہے "ادب کی تعمیری جہت" بجائے خود یہ نام چونکانے والا ہے، سوال اٹھتا ہے، جدید اردو ادب میں ترقی اور تجدید کے نعرے تو ترقی پسندی اور جدیدیت کے صدقے اکثر سننے میں آتے ہیں، یہ تعمیری جہت کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا تعلق تعمیر پسندی کے تصور سے ہوگا۔ تب دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک طرف ترقی کے سامان ہو رہے ہیں اور دوسری طرف تجدید کے تو اب یہ تعمیر کا سامان کیا معنی رکھتا ہے؟ زیر نظر کتاب کے مضامین اسی سوال کا جواب دیتے ہیں، جو چند عنوانات سے ہی عیاں ہو جاتا ہے، مثلاً:

ہم عصر افسانے میں اقدار کی اہمیت

جدید افسانے میں مادیت اور روحانیت کی کشمکش

آج کے افسانے میں مادیت اور روحانیت کی کشمکش

اردو افسانوں میں اخلاقی قدریں۔

اردو افسانہ — اخلاقی اور تعمیری اقدار کی روشنی میں۔

بلاشبہ یہ سب عنوانات افسانہ نگاری سے متعلق ہیں۔ لیکن ان سے معلوم ہو جاتا ہے کہ افسانے جیسی مقبول عام صنفِ ادب کے متعلق مذکورہ بالا مضامین ترقی و تجدید کے مروجہ نعروں سے ہٹ کر ایک نیا زاویۂ نگاہ پیش کرتے ہیں جس کا موضوع اقدار و اخلاق ہیں اقدار و اخلاق سے بحث کرنے والے مضامین ظاہر ہے کہ محض ترقی یا محض تجدید کے طلسم سے نکل کر بلکہ اس کو توڑ کر ایک ہمہ جہت اور متوازن تعمیر پسندی کے اصول پیش کرنے والے ہوں گے۔ پہلا مضمون راقم السطور کا ہی ہے جس میں اقدار کے مفہوم و مضمرات کی تشریح کے بعد ان کا مقابلہ مسائل کے ساتھ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ زندگی، ادب اور فن کے لئے اصل اہمیت مسائل کی نہیں ان اقدار کی ہے جو انسانی عمل کا معیار و محور ہیں۔ اس بحث سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ اقدار اعلیٰ اخلاق کا دوسرا نام ہے اور اخلاق عقائد کے بغیر محکم نہیں ہو سکتے، لہٰذا تہذیب اور اس کے فنونِ لطیفہ بالخصوص ادب کے لئے اخلاقیات کے ساتھ ساتھ ایمانیات کی بھی اہمیت ہے اور ہم عصر افسانے میں اس اہمیت کا احساس اس کے وجود کی بجائے فقدان سے ہوتا ہے، اس لئے کہ آج کا اردو افسانہ مسائل میں اس درجہ الجھا ہوا ہے کہ اقدار اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔

دوسرا مضمون جناب ابوالکلام قاسمی کا ہے "ان کا خیال

انہی کے لفظوں میں یہ ہے کہ "جدید افسانے میں غالب رجحان روحانی زوال، اخلاقی ابتذال اور روحانی الجھنوں کے سمجھنے اور سمجھانے کا ہے"۔ لیکن وہ خود اقرار کرتے ہیں کہ یہ معاملہ کشمکش اور ٹکنیک سے آگے نہیں بڑھتا۔ بہر حال، وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔

"ہمارے عہد کا افسانہ جس حد تک روحانیت اور مادیت کی کشمکش کی پہچان بن گیا ہے کسی اور دور میں اس حد تک کشمکش کا یہ احساس اور روحانیت اور مادیت کے درمیان مابہ الامتیاز خطوط کا شعور کم از کم افسانے میں عام نہیں ہوا تھا۔"

کشمکش کی حد تک بات صحیح ہے لیکن اس کشمکش کا احساس اور روحانیت اور مادیت کے درمیان مابہ الامتیاز خطوط کا شعور جدید افسانوں میں محل نظر ہے۔ کشمکش کا عکس تو ایک جبر زمانہ ہے، جو شخص آج کے انسان کی کہانی لکھے گا اسے کشمکش سے دوچار ہونا ہی ہے اور اس کی تخلیقات میں عصر حاضر کا طلسم پیچ و تاب ہوگا ہی، اس لئے کہ موجودہ دور انتشار کا ہے اور پراگندگی روح عصر ہے۔ لیکن بہت ہی اہم سوال یہ ہے کہ کیا دور جدید کا افسانہ لکھنے والوں کو اس کیفیت حتی الکہ روحانیت و مادیت کے درمیان مابہ الامتیاز خطوط کا شعور بھی ہے؟ اس سوال کا جواب اثبات میں دینا دشوار ہے جو لوگ سرے سے زندگی کے کسی نقطۂ نظر کے ساتھ وابستگی -COMMI-TMENT- ہی کا انکار کرتے ہوں ان کے یہاں کسی احساس و شعور کا سراغ کہاں؟

تیسرے مضمون کے مصنف ڈاکٹر احمد سجاد ہیں۔ انھوں نے ترقی پسندی سے جدیدیت تک کے ادوار کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے اپنا مضمون اس معنی خیز سوال پر ختم کیا ہے:

"اگر زندگی میں خیر، حسن اور صداقت کے کچھ معنی ہیں، اگر انسانی زندگی شر کے مقابلے میں خیر باطل کے مقابلے میں حق اور مادیت کے مقابلے میں روحانیت سے سنورتی اور نکھرتی ہے تو مستقبل کا قاری اور ناقد اپنے ہر ادیب اور فنکار سے یہ سوال ضرور کرے گا کہ وہ کون ادیب ہے جس نے انسانی شرف کا اثبات کیا، جس نے انسانی کمزوریوں کو مان کر ثبات و استحکام کا حوصلہ دلایا، جس نے زندگی کو اشرف اور اعلیٰ انسانیت سے روشناس کرایا، جس نے اجتماعی اور سماجی غم کے باوجود فرد کے قلب و روح سے دلچسپی لی جس نے حیوانی جبلتوں سے جنگ کی اور تمدنی معاونت اور انسانی مفاہمتوں کو تقویت بخشی، نیز یہ کہ انسان کو اس کی اعلیٰ منزلوں تک لے جانے اور انسان کے مستقبل میں امید پیدا کرنے کی کتنی سعی کی؟"

یہ سوال بالکل بجا ہے لیکن مصنف نے بعض جدید افسانہ نگاروں سے جو توقعات قائم کی ہیں وہ بہت مشتبہ ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں ہی سے وابستہ افسانہ نگاروں نے کم از کم مادیت اور روحانیت کی کشمکش میں عمومی طور پر روحانیت کے لئے اپنی ترجیح واضح نہیں کی ہے، اس لئے کہ وہ عقائد و اخلاق کا کوئی متعین تصور رکھتے ہی نہیں جس کے بغیر روحانیت کا تخیل محض ایک گورکھ دھندا ہے۔ رہ گئے بعض تعمیر پسند فنکار تو ابھی انھیں عمومی طور تعمیر پسندی کے ساتھ ساتھ فن کاری کا کافی ثبوت دینا باقی ہے جس کے بغیر وہ مستقبل کی امید نہیں بن سکتے۔

چوتھے مضمون کے مصنف جناب پرواز اصلاحی نے چند تعمیر پسند افسانہ نگاروں کی فہرس پیش کرکے تبصرہ کیا ہے۔

"یہ وہ فنکار ہیں جنھوں نے اسلامی اقدار حیات پر اپنے فن کی بنیاد ڈالی ہے، مجہول رومانیت اور سستی جذبات پرستی کے بجائے حقائق کو اپنے سینے سے لگایا ہے، ان فن کاروں میں زندگی، کائنات اور تمام بین الاقوامی مسائل کو سمجھنے کا ایک پرخلوص آفاقی جذبہ ملتا ہے، انھوں نے یہ محسوس کیا کہ اخلاق انسانی کے نوامیس عالیہ کی صرف حفاظت ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان عوامل کو بھی ختم کرنا ہے جن سے تخریب و فساد اور ذہنی لگاڑ کی جڑوں کو استحکام حاصل ہوتا ہے۔"

فکر کی حد تک بات صحیح ہے مگر فن کا وصف اور حجم کیا ہے؟ میرے خیال میں افسانہ نگاری کی تعمیر پسند فکر کا فنی وصف و حجم ابھی اس معیار پر نہیں پہنچا ہے کہ اس کا وزن جدید رجحانات پر موثر طور سے پڑے اور دنیائے ادب کو معلوم ہو کہ ادب کی تعمیری جہت ہی مستقبل کی

فنی ترقیات کی ضمانت دار ہے۔

آخری مضمون نگار جناب بدنام رفیعی نے پریم چند کے بعد ابھرنے والے افسانہ نگاروں کے متعلق یہ رائے قائم کی ہے:

"اس میں شک نہیں ان افسانہ نگاروں نے زندگی کی تلخ حقیقتوں کا جائزہ تو لیا اور اپنے ماحول کی ہو بہو عکاسی تو کی لیکن زندگی کی پیچیدگیوں اور الجھنوں کا کوئی حل نہ پیش کر سکے۔"

یہ رائے اپنی جگہ صحیح ہے، اس کے باوجود کہ بعض ترقی پسند افسانہ نگاروں نے کچھ کچے اشتراکی خیالات پیش کر کے ایک حل کی طرف اشارے کئے، لیکن اوّل تو یہ اشارہ ایک نظام فکر کا بدل نہیں ہو سکتا تھا، دوسرے اشتراکی حل بجائے خود ایک مسئلہ ہے، کسی مسئلہ کا حل نہیں۔ اسی صورتِ حال کی طرف اشارہ مجموعے کے پہلے مضمون "اردو افسانے میں ہیئت اور تکنیک کے تجربے" میں ڈاکٹر ابن فرید نے کر دیا جب انھوں نے یہ کہا کہ "افسانے کا موضوع منفی قدریں اسی وقت بنتی ہیں جب معاشرہ فکری بحران یا اجتماعی انتشار کا شکار رہتا ہے۔"

اس طرح زیر بحث مضامین اور دوسرے مندرجات پر مشتمل "ادب کی تعمیری جہت" کا یہ مجموعۂ مضامین ایک ایسے نقطۂ نظر کی نشان دہی کرتا ہے جو ترقی پسندی اور جدیدیت کی انتہا پسندیوں اور بے اعتدالیوں کے درمیان ایک جادۂ اعتدال ہے اور اس کے معیار و اقدار کے تحت ادب بالخصوص افسانہ نگاری کی تشکیلِ جدید کا رخ اور انداز معلوم ہوتا ہے۔ کتاب کے مرتب انجم نعیم صاحب ہیں اور قیمت آٹھ روپے، ملنے کا پتہ کریسنٹ پبلشنگ کمپنی، جیل روڈ، علی گڑھ ہے۔

عبدالمغنی

(آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے نشر ہوا)

کتاب: ریگِ رواں

مصنف: صادق نسیم

ناشر: التحریر، کبیر اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور

قیمت: ۲۰ روپے

تیز ہواؤں کے قافلے چلتے ہیں تو اپنے ساتھ ریت کے ذرّوں کو اڑاتے ہوئے لے چلتے ہیں۔ پھر یہ ذرے ہوا کا ساتھ نہیں دے پاتے اور راہ میں ہی بیٹھنا شروع ہو جاتے ہیں یہ جمع ہوتے ہیں تو ٹیلے بن جاتے ہیں، لیکن پھر جھونکوں کی شکل میں اٹھتے ہیں تو آگے بڑھ جاتے ہیں وقت کے تیز رو قافلے بھی اسی صورت زندگی کے عناصر کو ذرّہ ذرّہ اپنے ساتھ لئے لئے آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ یہ سب اس قدر غیر محسوس اور غیر ارادی طور پر ہوتا ہے کہ جب ہمیں خیال آتا ہے تو ہم حیرت زدہ ہوتے ہیں کہ

برگِ خزاں نصیب ہوں صرصر کے دوش پر
پرواز میں ہوں اور شکستہ پروں میں ہوں

سفر صادق نسیم کے لئے مشغلۂ حیات ہے۔ اس موضوع کو انھوں نے اس کثرت کے ساتھ برتا ہے کہ شاید ہی کوئی غزل ایسی ہو جس میں اس سے متعلق کوئی شعر نہ ہو۔ ان کی کیفیت تو یہ ہے کہ:

تمام دن کی مسافت گذار کر سرِ شب
لگے جو آنکھ تو خوابوں میں بھی سفر دیکھوں

جمیل جالبی نے لکھا ہے "ریگِ رواں صادق نسیم کا پہلا مجموعۂ کلام ضرور ہے، لیکن یہ کسی نو عمر یا نئے شاعر کا کلام نہیں ہے۔ یہ ایک ایسے پختہ ذہن شاعر کا کلام ہے جو برسوں سے شعر کہہ رہا ہے"۔ شاید اسی وجہ سے ان کے یہاں پہاڑی چشمہ کا سا جوش نہیں ہے بلکہ اس پہاڑی جھیل کی سی کیفیت ہے جو احتیاط کے اونچے اونچے پہاڑوں سے چاروں طرف سے گھری ہوئی ہے، اور جس کا ٹھہرا ہوا شفاف پانی اس کی بے پایانی کو آئینہ کر رہا ہے۔

وہ شاعر جو عمر کی نصف صدی گذار کر اپنا پہلا مجموعۂ کلام پیش کرے گا، اس کے یہاں ضرورت سے زیادہ حزم و احتیاط ہو گی۔ اس محتاط شاعری کے چند نمونے یہ ہیں

اک نغمۂ رنگیں ہوں لبِ سازِ مژہ پر
میں رنگ کا آہنگ ہوں تصویر صدا ہوا

زنداں میں کوئی روزنِ زنداں تو ہو کہ لوگ
جس حال میں دیکھیں ہمیں زندہ کہہ سکیں

کہاں سے روح میں یوں رنج گیا ہے سناٹا
نوائے تارِ نفس سے بھی کانپ اٹھتا ہوں

اس لو میں کوئی تارہ تو منزل کی سمت جائے

خود کو لگاؤ آگ کہ رستہ دکھائی دے
طے کی ہیں گرد و باد کی مانند منزلیں !
شعلہ فشاں تھا دستِ وفا جیسے کہاں
صادق ہوائے تجدد بھی بے ستوں رہی
وہ لوگ کیا ہوئے جنھیں دعویٰ وفا کا تھا
ہمراہ وقت صورتِ ریگِ رواں چلوں
خود اپنی ذات شیشۂ ساعت لگے مجھے

صادق نسیم کا شعری مجموعہ "ریگ رواں" اپنے جلو میں مطالعہ کے لاتعداد پہلو رکھتا ہے۔ اس کی طباعت، کاغذ، جلد اور تزئین لائق تحسین ہے۔ —— ابن فرید

کتاب : مٹی کا دیا
مصنف : میرزا ادیب
ناشر : سنگ میل پبلیکیشنز، چوک اردو بازار، لاہور۔
قیمت : پچاس روپے۔

میرزا ادیب ہمارے بزرگ ادیبوں میں سے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف بہتوں کی تخلیقات کا انتخاب کر کے اپنے (زیر ادارت) رسائل میں شامل کیا ہے بلکہ بہت سے ذہنوں کو متاثر کیا ہے۔ بہتوں کو فکر و تخلیق کی تحریک دی ہے۔ اور بہت سے نوواردوں کے لئے مثال و دلیل بنے ہیں۔ لیکن خود وہ کون ہیں؟ اس راز سے صرف وہی آگاہ رہے ہیں جنھوں نے میرزا صاحب کو قریب سے دیکھا اور جانا ہے۔

آج میرزا صاحب اپنا مٹی کا چراغ لے کر خود شہرِ ادب میں نکل آئے ہیں کہ اپنے بارے میں اور اپنے عہد پر ضو فشانی کریں۔ روشنی ہوئی تو ہم نے دیکھا اور ہم حیرت میں پڑ گئے کہ یہ صحرا نورد جو اپنے رومان، اپنے خطوط، لطیف و موثر انداز میں ہم تک پہنچاتا رہا ہے وہ تو زندگی کے بڑے خشک، بے آب و گیاہ، چٹیل صحراؤں میں برہنہ پا بادیہ پیمائی کرنے والا سخت جان سا عام انسان ہے۔ وہ کسی متمول خاندان میں پیدا نہیں ہوا، اس نے آسودہ حال زندگی نہیں دیکھی، اس کے اہلِ خاندان دو وقت روٹی سکون سے حاصل نہ کر سکے۔ وہ خود والدین کی تنگ دست زندگی میں بچپن کے آرزو مندانہ خواب دیکھتا رہا، تخیل و تصور کے پردوں پر اونچی اونچی اڑانیں اڑتا رہا۔ پھر خود اپنی جوانی کی حقیقت کی زندگی میں قلیل آمدنیوں پر اصول و اقدار کی محرابیں سجاتا رہا اور آسودہ حال کم صلاحیت لوگوں کو اپنے سینوں پر تمغہ ہائے افتخار سجانے کے مواقع فراہم کرتا رہا۔ وہ میرزا جو بڑے بڑے رومان لکھ کر تقریباً نصف صدی سے اپنے قارئین کو اس حسین فریب میں مبتلا کئے رہا کہ وہ پنجاب کا کوئی بہت بڑا مغلِ اعظم ہوگا۔ جب اپنی روشنی میں خود منور ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ تو در حقیقت SELF-MADE آدمی ہے۔ اس نے اپنی تعمیر خود کی ہے۔ اس نے لاسمت میں آنے کی جی توڑ جدوجہد کی ہے۔ اور اب جو کچھ وہ ہے وہ دنیائے علم و ادب میں اپنی تخلیق ہے۔

"مٹی کا دیا" میرزا ادیب کی خود نوشت ہے۔ یہ سچ بولنے اور سچی خود نوشت لکھنے کی عدیم المثال تخلیق ہے۔ میرزا نے شمہ برابر بھی کوشش نہیں کی ہے کہ وہ مادی طور پر خود کو اونچا اٹھائیں۔ انھیں یہاں تک تکلف نہیں ہوا ہے کہ اپنے گھر کی زبوں حالی کے ساتھ بے عملی کا بھی برملا ذکر کر دیں۔ انھوں نے اپنے گرد و پیش اور تعلقات کے لوگوں کو اسی حال میں پیش کیا ہے جس حال میں وہ تھے بجائے اس کے کہ وہ بڑے بڑے "نامور" لوگوں سے اپنے تعلقات جتانے کی کوشش کرتے اس صدقِ بیان کی وجہ سے انھوں نے ان عام لوگوں کو حیاتِ جاوداں عطا کر دی ہے جو ہمارے دور کی معاشرتی تاریخ کی سچی نمائندگی کر سکیں گے۔ میرزا ادیب بننے کے لئے اپنے طلسم میں اپنی دنیا آپ آباد کرنے والے بچے کو کن کن آزمائشوں سے گذرنا پڑا، اس سرگذشت سے جب ہم آگاہ ہوتے ہیں تو ایک طرف ہمارے دل دکھ سے بھر جاتے ہیں اور دوسری طرف تعظیم سے ہمارے سر خم ہو جاتے ہیں کہ میرزا صاحب نے اپنے مقامِ بلند کو حاصل کرنے کے لئے بڑی قربانیاں دی ہیں۔

"مٹی کا دیا" کے اسلوب میں بڑا اچھوتا پن ہے اس نثر میں قدرے افسانویت، قدرے انشائیہ کی سی خود کلامی اور غالب طور پر تجسس کا فنکارانہ اہتمام اسے اعلیٰ ادبی تصنیف بنا دیتا ہے۔

یہ صرف میرزا ادیب کی خود نوشت ہی نہیں ہے بلکہ اردو کی ایک ایسی صنف میں گراں قدر اضافہ بھی ہے جس کا سرمایہ بہت قلیل ہے۔

—— ابن فرید

Numainda

NAI NASLEN, Monthly

2448, Ballimaran Delhi-110006

Registered with Registrar of Newspapers No. (N) 360

Regd No. D. (D) 910

دین میں امامت صالحہ کس طرح قائم کی جا سکتی ہے • معاملات دُنیا میں زمام کار کی اہمیت • اسلامی اخلاق کی خصوصیات اور اس کے اثرات ایمان، اسلام، تقویٰ اور احسان کی مفصل تشریح • دین کا حقیقی اور گہرا شعور بخشنے کے لیے بے مثال کتاب۔

عبادات کے جاہلی اور اسلامی تصورات کا فرق • اسلام میں عبادات کا حقیقی مقام • اسلام کا فلسفہ عبادت نماز کی حقیقت اور اس کے زندگی پر اثرات • روزہ کی اہمیت اور اسلامی زندگی میں اس کا مقام • دین سے آگہی اور اس کا شعور حاصل کرنے کیلئے ایک بیش قیمت کتاب۔

اُمتِ مُسلمہ کا مقصد زندگی کیا ہے؟ • اُمتِ مُسلمہ کا حقیقی مقام کیا ہے؟ فریضۂ امر بالمعروف نہی عن المنکر کی اہمیت • اس فریضہ کو ادا نہ کرنے کے نقصانات • ایک انقلاب آفریں عالمانہ پیش کش۔

تعمیری ادب کا

نمائندہ

نئی نسلیں

ترتیب

ابن فرید

انجم نعیم

۱۲

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر

م۔ نسیم
۲۳۴۸، بارہ دری شیر افگن
بلیماران، دہلی - ۱۱۰۰۰۶

بارہ شمارے: ۳۰ روپے — ایک شمارہ: ۳ روپے

رابطہ

دفتر نمائندہ نئی نسلیں شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

ترتیب

مارچ، اپریل ۱۹۸۲ء

دوسرا سال پانچواں شمارہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اپنی باتیں

اردو کے نام پر بہت سے سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری ادارے قائم ہیں۔ ان کے بارے میں بہت سے بلند بانگ دعوے کیے جاتے ہیں جن میں سے ایک مشترک دعویٰ یہ ہے کہ یہ ادارے اردو کی ترویج و ترقی اور اشاعت و مقبولیت کے لیے قائم کیے گئے ہیں۔ لیکن جب ہم ان دعووں کے باطن کو کھنگالتے ہیں تو اصل حقیقت کچھ اور ہی نظر آتی ہے۔ مثلاً اتر پردیش کی اردو اکیڈمی وزارت تعلیم سے نہیں وزارت قومی یک جہتی سے منسلک ہے۔ یہی نوعیت فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی کی بھی ہے۔ قومی یک جہتی کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں کہ اس کا مقصد و مطمح نظر سیاسی ہے۔ اس سے اگر اردو اکیڈمی وغیرہ کو منسلک کیا جائے تو ان کے پس پشت محرک بھی علمی و ادبی خدمت نہیں سیاسی مقصد برآری ہوگی۔ کچھ اسی نوعیت کی صورت حال دوسرے پردیشوں میں بھی ہے۔ وہاں اگر اکیڈمیوں کو وزارت تعلیم سے منسلک رکھا بھی گیا ہے تو عہدہ داروں کا انتخاب سیاسی نقطۂ نظر سے کیا جاتا ہے۔ مثلاً آندھرا پردیش نے دو سالوں سے دس ہزار روپیے کے بڑے انعام کا اعلان کرنا شروع کیا۔ اور دونوں بار نظر انتخاب کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے معتبر ترین افراد پر پڑی۔ مغربی بنگال اردو اکیڈمی کا رویہ اس سے کچھ ذرا بھی مختلف نہیں۔

مرکز کے اداروں کے بارے میں ہم اس سے قبل بھی متوجہ کرا چکے ہیں۔ ترقی اردو بورڈ میں تبدیلی سیاسی گٹ بندی کی وجہ سے ہوئی۔ ساہتیہ اکیڈمی کے بارے میں ہم نے لکھا ہی تھا کہ پرچہ پریس سے باہر آنے سے قبل ہی پارلیمنٹ میں حیرت انگیز انکشافات ہونے لگے۔ سب سے زیادہ عبرت انگیز انکشاف یہ تھا کہ انعامی کمیٹی کے بعض ارکان نے چند مواقع پر خود اپنے آپ ہی کو انعام کا مستحق قرار دے لیا۔ اردو کے ارکان انعامی کمیٹی سے مجھے یہ توقع نہیں ہے کہ انھوں نے ایسا کیا ہو۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے اگر ساہتیہ اکیڈمی میں ایسا نہیں ہوا تو ہمارے یو پی اور دوسری اکیڈمیوں میں ایسا ہو چکا ہے۔ بہر حال جہاں کہیں بھی ہو چھوٹی بات اور چھوٹی حرکت ہے۔

سیاسی جماعتیں اور سیاسی جماعتوں کی سرپرستی میں کام کرنے والی اکیڈمیاں اور ادارے خواہ کسی نیت سے قائم کیے گئے ہوں۔ لیکن ہمیں اگر ان سے کوئی بھی تعمیری یا مثبت کام کرنے کا موقع میسر آیا ہے تو کم از کم اردو کی فلاح و بہبود کے لیے ہمیں ہاتھ آئے موقع کو نہیں کھونا چاہیے۔ مگر ہماری کم سوادی یہ ہے کہ اپنے ذاتی مفادات کے لیے ہم بڑے مقاصد کو قربان کر دیتے ہیں۔ کون پروفیسر کس پروفیسر کے کام آئے گا۔ اکیڈمی سے باہر کون کس کی حمایت کرے گا۔ کون ممتحنی کے مواقع فراہم کرے گا۔ کون کسے کس کمیٹی کا رکن بنوائے گا۔ سیاسی پہلوان اپنے اکھاڑے کی بات کرتے ہیں۔ مقامی گٹ بندیاں اپنے ہاتھ پیر دکھاتی ہیں۔ مذہب و فرقہ کی دہائی دے کر اپنا الو سیدھا کرنے

والے بنے مذہب اپنے ہتھکنڈے دکھاتے ہیں مثلاً ایک اکیڈمی کے ایک صدر نے مجھ پر رعب جمانے کے لئے کہا کہ وہ سیکولر، انقلابی اور ترقی پسند ہیں۔ لیکن جب میں نے کہا کہ آپ کی حالیہ تصنیفات تو آپ کا توشۂ آخرت ہیں، تو انھیں یہ بات بہت ناگوار گذری۔ اس سارے "فسانۂ عجائب" میں بے چاری اردو فراموش ہوکر گم ہو جاتی ہے۔ ان اداروں میں بڑے بڑے غبن ہو جاتے ہیں۔ تقررات میں بے انصافیاں ہوتی ہیں۔ غریبوں کے ہمدرد عوام پرور اپنے الاونس اور مراعات میں اضافے کے لئے جی توڑ کوشش کرتے ہیں۔ لیکن کوئی "پروردگاری" حاکم نہ ہو پڑ رہا، کلرکوں چپراسیوں اور اردلیوں کو بنیادی حقوق دلانے کے لئے پریشان نہیں ہوتا۔ کاتب کو دو روپے فی صفحہ سے تین روپے فی صفحہ اجرت بڑھا کر دینے کو بڑا کارنامہ تصور کیا جاتا ہے لیکن غریب پرور حاکم یہ نہیں سوچتا کہ اس صفحے کے نیچے کاتب کے اہل وعیال دبکے ہوئے ہیں۔ غریب شعراء و ادباء کی جس طرح مالی مدد کی جاتی ہے وہ بھی غیرت دلانے والی ہوتی ہے۔ اردو کی ترویج واشاعت کمیٹی رقم میں زیادہ اور اس سے باہر کم ہوتی ہے۔ ہر مرحلہ پر بدعنوانیاں، جانب داریاں، ان اداروں کا بنیادی کردار بن چکی ہیں اور اردو سے بے غرض محبت کرنے والے ان کی طرف سے مایوس اور بے اعتنا ہوتے جا رہے ہیں۔

یہ سب کیوں ہو رہا ہے اور اس کا ذمہ دار کون ہے؟ اردو کی خدمت کے نام پر ذاتی اغراض کی تکمیل کیا اردو دشمنی نہیں ہے؟

(ابن فرید)

سید احمد شمیم
(جمشید پور)

پھول کو خوشبو، شفق کو جامۂ احمر دیا
میری آنکھوں کو سہانی شام کا منظر دیا
بے حسی پتھر کو بخشی، آگ کو سوز و تپش
موجِ دریا کو روانی، سیپ کو گوہر دیا
دے کے میرے دل کو اس نے ایک دردِ بے اماں
میرا دامن جگمگاتے موتیوں سے بھر دیا
وحشتِ صحرا مجھے دے کر نوازا اس طرح
اک در و دیوار سے آزاد مجھ کو گھر دیا
وہ ہے میرا کون کہ جس کے تصور نے شمیم
تازگی اسلوب کو، الفاظ کو پیکر دیا

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی
(لاہور)

دانائے راز

مسافر کی ناتمام سرگزشت

چہ رفت خویش بر بستم ازیں خاک
ہمہ گفتند با ما آشنا ... بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر
چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

چاہے جانے اور یاد کئے جانے کی آرزو فطری ہے۔ اقبال نے ان اشعار میں انسان کی اسی نفسیاتی ضرورت کا خوبصورت اظہار ملتا ہے ——— لیکن غور کیجئے تو "ہمہ گفتند با ما آشنا بود" میں ایک طنز ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ شکوہ بھی کہ "مسافر" سے آشنائی کا دعویٰ رکھنے والے "مسافر" کے احوال و افکار سے بے بہرہ و ناواقف ہیں

"مسافر" کو اس خاک دروں سے رخت سفر باندھے چالیس برس سے کچھ اوپر عرصہ گذر چکا ہے۔ اس عرصہ میں اسکی شخصیت شاعری، فکر و فلسفہ اور اس کے شعری و فکری اور علمی کارناموں پر سیکڑوں اور ہزاروں نہیں، لاکھوں ہی صفحات لکھے جا چکے ہیں۔ قریب قریب دنیا کی دو درجن زبانوں میں اس کے اشعار و افکار کے تراجم ہوئے۔ اور ملفوظات و ارشادات کے مجموعے مرتب ہو کر چھپ چکے ہیں۔ اس کی یاد میں اندرون و بیرون ملک متعدد ادارے اور قائم ہیں۔ اقبالیات کو ایک مستقل شعبہ کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے ——— اور اگرچہ "چہ گفت و با کہ گفت" کی تشریح و تعبیر مکمل طور پر نہ سہی، ایک حد تک ہو چکی ہے مگر "از کجا بود" والی بات بدستور تشنہ ہے اور صراحت و وضاحت کی محتاج ——— شاعری اور افکار کی توضیحات تو ہو چکیں۔ لیکن اقبال کی شخصیت اور سوانح پر خاطر خواہ طور سے قلم نہیں اٹھایا گیا۔ جنھوں نے قلم اٹھایا، وہ اقبال سے اپنی آشنائی کا کوئی قابل قدر نمونہ، کوئی اچھا ثبوت پیش نہیں کر سکے۔

اقبال کے حالات پر سب سے پہلا مضمون منشی ابن فوق کا ہے جو ۱۹۰۹ء میں کشمیری میگزین میں شائع ہوا تھا ——— اقبال کی اکثر سوانح نگاروں نے اسی مضمون کو بنیاد بنایا ہے۔ چراغ حسن حسرت اقبال کے پہلے سوانح نگار ہیں۔ انھوں نے فوق کے متذکرہ بالا مضمون کے علاوہ "شیرازہ" کے اقبال نمبر کی روشنی میں "حیات اقبال" تیار کی ہے جس میں دستیاب اور معلوم و موجود لوازمہ نقل کرنے پر ہی اکتفا کیا گیا۔ اور نئے مواد کے حصول یا تلاش کی کوشش نہیں کی گئی حالانکہ بہت سے واقعات حسرت کے سامنے رونما ہوئے تھے۔ حسرت، اقبال کے ہم عصر تھے۔ ان کے لئے اقبال کی زندگی سے متعلق نئے مواد کا حصول کچھ زیادہ مشکل نہ تھا وہ دنیائے صحافت سے متعلق تھے۔ اگر وہ چند برس پہلے کے اخبارات ہی نکال کر دیکھ لیتے تو انھیں سوانح اقبال سے متعلق بہت سا ایسا مواد مل جاتا جو انھیں اخبارات کے حوالے سے آج سامنے لایا جا رہا ہے ——— حسرت کی سہل نگاری کی ایک مثال یہ ہے کہ ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء میں اقبال نے دوسری اور تیسری گول میز کانفرنسوں میں شرکت کے لئے

دو مرتبہ یورپ کا سفر کیا۔ پہلے سفر میں وہ اٹلی، مصر اور فلسطین گئے[1] دوسری مرتبہ ہسپانیہ ——— "حیات اقبال" کے مؤلف نے ان دو الگ سفروں کو ملا کر ایک ہی سفر بنا دیا ——— اس ضمن میں وہ بتاتے ہیں کہ علامہ انگلستان سے واپسی پر ہسپانیہ، اٹلی اور مصر گئے۔ فلسطین کا سرے سے ذکر ہی نہیں ——— حالانکہ دو الگ الگ سفروں کی تفصیل "انقلاب" میں تفصیل کے ساتھ چھپ چکی تھی۔

"حیات اقبال" (۱۹۳۸ء) کے چند ماہ بعد، جنوری ۱۹۳۹ء میں پروفیسر محمد طاہر فاروقی کی "سیرت اقبال" شائع ہوئی۔ پانچ سو سے زائد صفحات پر مشتمل اس کتاب میں سوانحی حصہ صرف ۳۰، ۳۵ صفحات پر محیط ہے۔ اور اس میں بھی مؤلف نے کسی تردد میں پڑے بغیر، مختلف واقعات و حالات جوں کے توں نقل کر دیے ہیں۔ اور سہل نگاری کا اعلیٰ نمونہ یہ ہے کہ واقعات کے بیان میں ترتیب زمانی کا بھی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ چنانچہ اس کتاب کے مطابق اقبال نے ۱۹۳۰ء میں پنجاب مسلم لیگ کے صدر مقرر ہونے کے بعد ۱۹۲۸ء میں دکن کا سفر اختیار کیا ——— وعلیٰ ہذا القیاس۔

دس برس بعد ۱۹۴۸ء میں اعظم گڑھ سے عبدالسلام ندوی کی "اقبال کامل" شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ایک بڑے علمی ادارے کی تالیفی تربیت کی جھلک موجود ہے۔ اور مؤلف کی بہتر سلیقہ مندی بھی۔ مگر اس میں کسی تحقیقی کاوش کے آثار نظر نہیں آتے۔ عبدالسلام ندوی نے واقعات کی چھان بین یا تحقیق کے چکر میں پڑنے سے گریز کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ واقعات کے بیان میں ان سے بھی وہی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں جن کا ارتکاب اقبال کے اولین سوانح نگار کر چکے ہیں۔ اس اعتبار سے محمد طاہر فاروقی اور عبدالسلام ندوی کی یہ کتابیں، اقبال کے سوانحی ذخیرے میں قابل لحاظ حیثیت نہیں رکھتیں۔

البتہ نسبتاً اہم کتاب سالک کی "ذکر اقبال" ہے ——— خیال تھا کہ یہ سوانح بطور خاص اور بہ فرمائش لکھوائی گئی ——— مصنف عبدالمجید سالک کو اقبال کے حلقۂ ارادت مندان میں اہمیت حاصل تھی۔ "ذکر اقبال" میں اقبال کی زندگی پر بہت سا نیا مواد فراہم کیا گیا ہے اور سوانح اقبال کے سلسلہ میں یہ کتاب بہرحال ایک پیش رفت کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی یہ ایک مایوس کن کتاب ہے ——— سالک ایک منجھے ہوئے قلم کار تھے۔ پھر انھیں اقبال کی قربت حاصل رہی مگر ذمہ داری اور تحقیقی مزاج کی کمی آڑے آئی اور "ذکر اقبال"، اقبال کی مطلوبہ سوانح عمری کا درجہ حاصل نہ کر سکی ——— واقعاتی غلطیوں سے قطع نظر، سالک کے یہاں دو خامیاں بہت نمایاں ہیں۔

اوّل حیات اقبال کے مختلف ادوار سے متعلق حالات و واقعات ایک دوسرے سے مربوط نہیں، بلکہ ہر باب اور ہر فصل اور بعض اوقات ہر فصل سے ضمنی عنوانات کے تحت بیان کردہ معلومات ایک دوسرے سے الگ الگ نظر آتی ہیں۔

دوم مختلف واقعات کے ماہ و سنین متعین کرنے کے بجائے اس طرح کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔

"انھیں دنوں کا ذکر ہے ....."

"اسی زمانے کا واقعہ ہے ....."

لیکن سیاق و سباق سے "انھیں دنوں" یا "اسی زمانے" کا تعین ممکن نہیں ہوتا۔ سالک صاحب کی خود نوشت "سرگزشت" اور ان کے خاکوں کے مجموعے "یاران کہن" میں بھی ان کا انداز بیان یہی ہے ——— سالک صاحب کی اس کتاب میں بے شمار تاریخی اور واقعاتی غلطیاں موجود ہیں ——— حیات اقبال کے بعض اہم واقعات کا سرے سے تذکرہ ہی نہیں کیا گیا ——— پھر جگہ جگہ ان کے ذاتی معتقدات و تعصبات بہت نمایاں نظر آتے ہیں، مثلاً قادیانیت سے سالک کی ہمدردانہ دلچسپی، اسی طرح ان کا یونینسٹ ذہن۔ اور اس کے نتیجے میں اقبال کے سیاسی رجحانات پر کہیں کہیں چھپا طنز ——— وغیرہ ——— یوں اقبال کی پہلی قابل ذکر سوانح ہونے کے باوجود "ذکر اقبال" ایک ناکام سوانح عمری ثابت ہوئی۔

اس کی تلافی کی ایک کوشش ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کے یہاں نظر آتی ہے ــــ اگرچہ "سرگذشت اقبال" بھی ایک فرمائشی کاوش ہے۔ تاہم اس میں مصنف نے سابقہ سوانح نگاروں کی لغزشوں سے بچ نکلنے کی کوشش ہے۔ مگر ان کے یہاں کچھ دوسری خامیاں نمایاں ہو گئی ہیں۔ "سرگذشتِ اقبال" کو اقبال کی سیاسی زندگی کا ایک سرسری سروے کہا جا سکتا ہے۔ "سیاست داں" اقبال باقی تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔ اس میں حیاتِ اقبال کے بہت سے اہم واقعات کا تذکرہ تک نہیں ملتا۔ اقبال کیا تھے؟ ان کے معمولات، معاشرت، اعلیٰ اطوار، نشست و برخاست، اندازِ شعر گوئی، مطالعہ، طعام و کلام، سفر و حضر، عائلی زندگی، وکالت، بحیثیت ایک استاذ ذاتی پسند و ناپسند ــــ کسی چیز کا بھی پتہ نہیں چلتا، بس کہیں کہیں سرسری اشارے ملتے ہیں۔ نہ تلاش، نہ تحقیق، نہ تفحص، نہ کوئی نیا مواد، نہ کسی بات کی چھان پھٹک، حتیٰ کہ حیاتِ اقبال کی عام طور پر موجود و معلوم تواریخ و سنین بھی مندرج نہیں کئے گئے ــــ عبدالسلام خورشید صاحب کے یہاں طویل اقتباسات کی کثرت بہت کھٹکتی ہے جسے انھوں نے بلا ضرورت ضخامت بڑھانے کی کوشش کی ہے۔

اقبالیاتی ادب کے سوانحی ذخیرے میں متذکرہ بالا کتابوں کے پس منظر میں اقبال کے ایک دیرینہ نیاز مند اور رفیق جناب نذیر نیازی کی نئی سوانحی کاوش "دانائے راز" کے نام سے شائع ہوئی ــــ اقبال اور اقبالیات سے سید نذیر نیازی کا تعلق محتاجِ وضاحت نہیں ــــ ان کی تصانیف "اقبال کا مطالعہ"، "مکتوباتِ اقبال" اور "اقبال کے حضور" اس تعلق کی دلآویز داستان پیش کرتی ہے۔

۱۹۷۷ء میں تقریباتِ اقبال صدی کے موقع پر اقبال کی سوانح عمری لکھوانا کا مسئلہ درپیش ہوا تو اقبال سے ہمہ پہلو قربت کے سبب ہی نیشنل کمیٹی نے یہ کام جناب نذیر نیازی کے سپرد کیا تھا۔ مگر اپنی پیرانہ سالی اور بعض دیگر وجوہ سے وہ بروقت اس کام کو مکمل نہ کر سکے تھے۔ اب وہ موعودہ سوانح گرامی منظرِ عام پر آئی ہے۔

ساڑھے چار سو سے زائد صفحات پر مشتمل اس کتاب کے آغاز میں عنوانات کی کوئی فہرست یا ابواب کی تفصیل درج نہیں جس سے کتاب کے مباحث و موضوعات یا مندرجات کا اندازہ ہو سکے ــــ اس سے قاری الجھن محسوس کرتا ہے مگر بہ نظرِ غائر کتاب کی ورق گردانی کے بعد پتہ چلتا ہے کہ "دانائے راز" دو فصلوں پر مشتمل ہے۔ ایک سو نو صفحات پر محیط فصل اوّل میں آغاز سے ۱۸۹۵ء تک کے حالات و واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ جب کہ دوسری فصل میں ۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۵ء تک اقبال کی سرگرمیوں کا احوال درج ہے۔ ہر فصل کے تحت متعدد ضمنی عنوانات ہیں مثلاً محمد اقبال ــ خاندان، تعلیم و تربیت، طالب علمی، پدر و مرشد اقبال۔ استاذِ اقبال۔ نوجوان اقبال، شاعر اقبال۔ ازدواج ــــ ان عنوانات کے تحت نیازی صاحب نے متعلقہ موضوع و مبحث پر بھرپور بحث کی ہے ایسی بھرپور کہ کہیں کہیں تو غیر ضروری طولِ کلام کا احساس ہوتا ہے ــــ ان کے خیال میں ۱۸۹۵ء تک کا دور، حیاتِ اقبال میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے، مگر اقبال کے اکثر سوانح نگاروں نے اس سے بے اعتنائی کی۔ وہ لکھتے ہیں:

"سیالکوٹ میں محمد اقبال کی تعلیم و تربیت کا وہ دور ہے جس میں ان کے دل و دماغ کی تربیت ہوئی۔ سیرت و کردار اور ایمان و یقین کی پرورش کے ساتھ ساتھ ایک عظیم شخصیت جنم لے رہی تھی، لیکن افسوس ہے کہ محمد اقبال کی زندگی کے اس تشکیلی دور کی اہمیت کو بہت کم سمجھا گیا۔ کچھ بے سبب بے توجہی، کچھ معلومات کی کمی اور کچھ اس وجہ سے کہ محمد اقبال، جو کچھ بنے، ان کی تعلیم و تربیت کا آغاز جس خوبی سے ہوا، اس کے مدارج جس کامیابی سے طے ہوئے، بعینہٖ انگلستان روانگی سے پہلے سیالکوٹ اور لاہور میں ان کی علمی اور ادبی کاوشوں کی جو صورت تھی، شاعری جو رنگ اختیار کر رہی تھی، یورپ سے واپس آ کر انھوں نے اپنی دعوت اور پیغام کو جس خوبی سے پیش کیا، یہ سب وہ باتیں ہیں جن پر نفسیاتی اعتبار سے کبھی غور ہی نہیں کیا گیا۔ محمد اقبال کی زندگی کے اس تشکیلی دور کو باعتبار ان کی تعلیم و تربیت اور ذاتی سعی

وکاوش کے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ جو کچھ کہا گیا کبھی ایک کبھی دوسرے نقطۂ نظر سے حالانکہ سیالکوٹ ہو یا لاہور، ان کے ذہن نے جو رخ اختیار کیا، اس میں ایک تسلسل ہے، ایک باقاعدگی، ایک ربط، جس میں ان کے خیالات اور تصورات کی کڑیاں ایک دوسرے سے نہایت خوبی سے مل جاتی ہیں۔"
(ص ۱۰۱ - ۱۰۲)

چنانچہ سید نذیر نیازی نے حیات اقبال کے اس تشکیلی دور پر اس مربوط انداز میں نظر ڈالی ہے کہ ان کا ذہن اور شاعرانہ ارتقاء واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔ اس ضمن میں وہ اقبال کے والدین، ان کے استاذ علامہ سید میر حسن، شہر سیالکوٹ اور اس کے علمی و ثقافتی ماحول اور اس کی تعلیمی روایات کو زیر بحث لائے ہیں۔ حیات اقبال کے اس تشکیلی دور میں دو عنوانات ایسے ہیں جن کی طرف اقبال کے دیگر سوانح نگاروں کے برعکس، نیازی صاحب نے بطور خاص توجہ دی ہے، اول یہ کہ اقبال کو کبوتروں سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اس ضمن میں نیازی صاحب، اقبال کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "جب میں کبوتروں کو پہنائے فضا میں پرواز کرتے دیکھتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں جیسے میں بھی ان کے ساتھ آسمان کی وسعتوں میں اڑ رہا ہوں، افلاک کی سیر ہو رہی ہے۔"

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے نیازی صاحب لکھتے ہیں:
"معلوم ہوتا ہے کبوتروں کی اڑان اور آسمان پروازی محمد اقبال کی شاعرانہ اور فلسفہ پسند طبیعت کو بڑی مرغوب تھی۔۔۔۔ کبوتروں سے ان کا ذہن وحوش وطیور کی طرف منتقل ہو گیا وہ ان کے عادات و خصائل کا مطالعہ کرنے لگے تا آنکہ یوں انھوں نے ایک ایسا نظام علامات وضع کر لیا جو ان کے خیالات و تصورات کے ابلاغ کا نہایت موثر ذریعہ ثابت ہوا۔" (ص ۶۸ - ۶۹)

دوسرا موضوع اقبال کی پہلی شادی کا ہے ــــ یہ معلوم ہے کہ اقبال کی پہلی شادی کامیاب ثابت نہیں ہوئی نیازی صاحب نے جس جامعیت و اختصار کے ساتھ اور متوازن انداز میں اس موضوع کو سمیٹا ہے، وہ اقبال کے کسی اور سوانح نگار سے ممکن نہیں ہوا۔ لکھتے ہیں:

"محمد اقبال کی اس شادی کے بارے میں طرح طرح کی افسانہ طرازیاں کی گئیں جو سب کی سب غلط ہیں۔ بیشک یہ شادی ناکام رہی لیکن اس کی ایک ہی وجہ تھی، اور وہ طبائع کی عدم مناسبت علیٰ ہذا خاندانی حالات میں تفاوت۔ میں سمجھتا ہوں رشتہ عجلت میں طے ہوا۔ طرفین نے اس معاملہ میں احتیاط سے کام نہیں لیا۔ محمد اقبال نے لاکھ کوشش کی کہ نباہ کی کوئی صورت نکل آئے مگر بات نہ بنی ایک تو والدۂ آفتاب کا انداز طبیعت، دوسرے آفتاب اقبال کی روش، حالات بگڑتے چلے گئے۔ ڈاکٹر سید محمد حسین شاہ کی کوشش بھی کہ اصلاح احوال کی کوئی صورت نکل آئے ناکام رہیں۔ محمد اقبال چونکہ اس معاملہ میں حق بجانب تھے لہذا شاہ صاحب، اور ان کے دوستوں نے ان کی انصاف پسندی کو دیکھتے ہوئے پھر کبھی اس میں دخل نہیں دیا۔"
(ص ۹۶ - ۹۷) ــــ شاید یہ بات نیازی صاحب کے علم میں نہیں تھی ورنہ وہ یقیناً اس کا تذکرہ بھی کر دیتے اور اس سے اقبال کی پوزیشن اور زیادہ واضح ہو جاتی کہ تا حین وفات، اقبال اپنی پہلی بیوی کو گذارے کے لئے ماہ بہ ماہ ایک مقررہ رقم باقاعدگی کے ساتھ بھیجتے رہے۔ اقبال کے رجسٹر آمد و خرچ سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے تو پچاس روپے ماہوار بذریعہ منی آرڈر روانہ کیے جاتے تھے مگر والدۂ جاوید کی وفات کے بعد اس میں کمی کر کے تیس روپے بھیجے جانے لگے۔

فصل دوم (ص ۱۱۰ ــــ ۱۵۴) کے ضمنی عنوانات اس طرح ہیں۔

گورنمنٹ کالج، آرنلڈ، پروفیسر اقبال، علمی مشاغل، علم الاقتصاد، حلقۂ احباب، ارباب سخن، انجمن حمایت اسلام، مخزن، شاعری، وطنیت ــــ ان میں سے بیشتر مباحث غیر ضروری طور پر بے حد طویل ہیں۔ شاید اپنے مخصوص مزاج کے سبب نیازی صاحب کے لئے اس طوالت سے بچنا ممکن نہ تھا۔ مگر اس سے قاری کو بار بار

اکتاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ "حلقۂ احباب" کے ضمن میں ان اکابر کا ذکر کرتے، جن سے اقبال متاثر ہوئے، نیازی صاحب نے اقبال کے نیاز مندوں اور عقیدت مندوں کی فہرست مفصل بھی مرتب کر ڈالی، جس کے نتیجے میں یہ حصہ ۴۴ صفحات پر پھیل گیا۔ اسی طرح "علم الاقتصاد" کا تعارف بھی غیر ضروری تفصیل و تبصرے پر مشتمل ہے ـــــ مجموعی اعتبار سے فصل دوم میں ربط و جامعیت اور استنباطِ نتائج کی وہ صورت مفقود ہے، جو فصل اول میں نظر آتی ہے۔

نیازی صاحب نے "دانائے راز" کی تیاری میں اقبال کے سوانحی ذخیرے کے ساتھ ساتھ ذاتی یادداشتوں سے بھی مدد لی ہے، چنانچہ کئی مقامات پر مختلف حضرات سے ملاقاتوں کے حوالے ملتے ہیں، اسی طرح زیر طبع "اقبال کے حضور"، جلد دوم کا بھی کئی جگہ حوالہ دیا گیا ہے ـــ پھر بھی بعض مقامات پر نیازی صاحب کو تسامح ہوا ہے۔ صرف دو مثالیں۔

• شیخ طاہر الدین کے متعلق یہ بات درست نہیں کہ جب اقبال نے وکالت ترک کی تو منشی صاحب نے تنخواہ لینا ترک کر دی۔ صحیح یہ ہے کہ آخری زمانے تک، حساب کتاب کا اندراج و اہتمام منشی صاحب کے ذمے تھے مگر یہ بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ ان خدمات کے عوض، اقبال انھیں پچاس روپے ماہوار تنخواہ دیتے تھے، جسے بعد میں کم کر کے تیس روپے کر دیا گیا۔

• یہ بات غلط فہمی پر مبنی ہے کہ بشیر ضیائی کی تیار بیاض ہی کو بعد میں مہر مرحوم نے عبداللہ قریشی صاحب کے مزید اضافہ کے ساتھ "سرِ دِرِ رفتہ" کے نام سے شائع کیا (ص ۲۱۱-۱۴۰) ـــــ اول تو متذکرہ کتاب کا صحیح "سرودِ رفتہ" ہے نہ کہ "سرِ دِرِ رفتہ" ـــــ دوسرے یہ کہ "سرودِ رفتہ" کی ترتیب میں عبداللہ قریشی صاحب نہیں بلکہ رفیق علی دلاوری مولانا غلام رسول مہر کے ساتھ شریک تھے۔ عبداللہ قریشی نے جو کتاب مرتب کی، وہ "باقیاتِ اقبال" ہے اور اس میں ان کے سید عبدالواحد معینی، ان کے شریکِ ترتیب تھے۔ مزید یہ کہ "سرودِ رفتہ" واضح طور پر مرتبین کی اپنی مرتبہ کاوش ہے۔ اس کی بنیاد بشیر ضیائی یا کسی اور کی قلمی بیاض پر نہیں ہے۔

نیازی صاحب نے اس کتاب کے بارے میں دیباچے میں لکھتے ہیں: "راقم الحروف بوجوہ اس سے مطمئن نہیں۔ اس جزو کی تحریر و تسوید حسب منشا نہ ہو سکی۔ کچھ ایک حصہ نہج پر لکھا، کچھ اس خیال سے کہ اب پابندیٔ وقت کی قید نہیں، دوسری نہج پر ـــــ گو اساساً اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ـــ یوں متن میں کچھ ناہمواری سی پیدا ہو گئی ہے بعض عبارتیں شاید غیر مربوط یا غیر متوازن سی معلوم ہوں گی کہیں ہے۔ کہیں بمقابلہ اس کے طوالت۔ یہ تو راقم الحروف کا ذاتی احساس ہے۔ نہیں معلوم قارئین اس پر کس کس پہلو سے گرفت کریں۔ ان کے نزدیک شاید کئی معلومات تشنہ ہوں گی۔ کئی مفروضے خود ساختہ، کئی بیانات محلِ نظر۔" (ص ۸) ـــــ نیازی صاحب نے یہ سب کچھ بجا لکھا ہے۔ مگر یہ خیال رہے کہ انھوں نے یہ سارا کام تنِ تنہا انجام دیا ہے جس میں ان کے بقول: "دشواریاں بہت تھیں" (ص ۷) اس سبب سے بھی اور ان کی پیرانہ سالی اور مخصوص حالات کی بنا پر بھی انھیں کسی قدر رخصت دی جا سکتی ہے۔ یہ کام "نیشنل کمیٹی برائے صد سالہ تقریبات" کی فرمائش پر ہوا اور اقبال اکیڈمی کے اہتمام سے یہ کتاب طبع ہو کر منظرِ عام پر آئی۔ راقم کے نزدیک یہ ان دونوں اداروں کی ذمہ داری تھی کہ وہ اشاعت سے پہلے اس کی مناسب ایڈیٹنگ کراتے، نامکمل اور ادھورے حوالے مکمل کیے جاتے۔ ابواب بندی ہوتی، اسی طرح آغاز میں ایک مفصل فہرستِ مباحث اور آخر میں اشاریے کا اضافہ کیا جاتا۔ یوں یہ کتاب بہتر علمی انداز میں سامنے آتی اور اس سے استفادہ کرنا زیادہ آسان ہوتا ـــ

نذیر نیازی صاحب "دانائے راز" کو مکمل کرنے سے پہلے ہی سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئے۔ اقبال کی سوانح پر ان کا یہ کام گو ادھورا ہے، مگر پھر بھی غنیمت ہے ـــ ان کے زیرِ نظر ادھورے کام کی از سرِ نو تسوید و ترتیب اور پھر بولائی

بقیہ ص ۱۲ پر

ڈاکٹر احمد سجاد

جدید شاعری کی پہچان

کسی چیز کی واقعی پہچان کے لئے عام طور سے چند باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اولاً یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس شئے کا ظاہر کیا ہے، دوسرے یہ کہ اس کے باطن کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں، تیسرے یہ کہ وہ کس ماحول اور وقت کی پیداوار ہے، مزید یہ کہ اس کے معنی و تبیح کیا ہیں۔ جدید شاعری کوئی ٹھوس چیز تو ہے نہیں مگر پھر بھی اس کا ایک ظاہر بھی ہے اور باطن بھی نیز یہ ایک مخصوص وقت اور حالات کی پیداوار بھی ہے۔

یوں کہنے کو تو جدید شاعری کا سلسلۂ نسب کچھ لوگوں نے غالبؔ اور ان کے شاگرد حالیؔ سے بھی ملایا ہے۔ اس میں ایک گونہ حقیقت بھی ہے مگر آجکل "جدید" بمعنی "جدیدیت" کے لئے جا رہے ہیں اس لئے ہم آزادی کے بعد اس عہد کے شاعری سے بحث کرنا چاہتے ہیں، جب کلاسکیت، رومانیت، اور ترقی پسندیت اور اس قسم کے تمام ادبی نعروں اور فارمولوں کا بھرم ختم ہو چکا ہے۔ جب نت نئے نظریات، تجربات اور دعوے کھوکھلے ثابت ہو چکے تو ان کے بطن سے کرب و اضطراب، تنہائی و فریب شکستگی اور خوف و تشکیک نے جنم لیا۔ ایسا ہونا فطری تھا عصر حاضر تقریباً دو صدیوں سے یورپی افکار اور نظریات کے زیر اثر پل بڑھ رہا ہے۔ خود یورپی افکار کا یہ حال رہا کہ مذہبی ٹھیکیداروں اور پاپائی مظالم سے تنگ آکر بالآخر اس نے مابعد الطبیعاتی حقائق سے ہی انکار کر دیا اور سیکولر نیز مادہ پرستانہ فکر و خیال کو بتدریج اپنا ایمان بنا لیا حقیقت سے اس فرار نے سائنس اور اعلیٰ تحقیق کے نام پر پورے مغرب کو تقریباً بے لگام بنا دیا۔ ان تحقیقات نے بے شک جزوی فائدے پہنچائے لیکن انسانی مسائل پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتے چلے گئے۔ یہ بیپیدگی فکر کجروی کی براہ راست پیداوار تھی۔ ڈارون کی تحقیقات کا ماحصل یہ نکلا کہ انسان اصلاً حیوان ہے۔ مارکس نے اسے شکم پرست حیوان ثابت کیا میکڈوگل نے اسے حیوانی جبلتوں کا غلام بتایا اسی طرح فرائڈ نے مغلوب الشہوات ثابت کیا تو ایڈلر نے اسے خود پرست اور یونگ نے تنہا تی بنایا۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ:

ڈھونڈھنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا
(اقبالؔ)

یہ اقبال کی آئیڈیلزم نہیں بلکہ خود اردو ادب کی ایک تاریخی صداقت ہے۔ ۱۸۵۷ء کی شکست کے بعد سرسید و حالی نے "پیروی مغرب" کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھا تو ہمیں اصلاحی شاعری کا تحفہ ملا۔ جلد ہی اس سے طبیعت اکتا گئی تو رومانیت، پھر شتر بے مہار کی سی کیفیت سے نکلنے کے لئے مارکسی ترقی پسندی کو اختیار کیا گیا مگر اس کی ہنگامی اور تجرباتی شاعری سے جلد ہی طبیعت بیزار ہو گئی۱۹۴۷ء میں آزادی کے دیوی کو بڑے ارمانوں سے خوش

آمد بہا گیا مگر اس داغ داغ اجالے نے ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کے درمیان موجودہ جدید شاعری کو جنم دیا تو پھر وہی روحانی اضطراب اور کشمکش اور ذہنی انتشار، خود فراموشی، وجود کی نفی، جھنجھلاہٹ اور ذہنی جمناسٹک کا آغاز ہوا۔ چنانچہ ایلیٹ[1] نے مغرب کے اس المیے پر جن تاثرات کا اظہار کیا تھا وہ حرف بحرف اردو ادب پر بھی صادق آیا یعنی :

"ہوشمندی کے انقطاع کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جس کی ہم کبھی بھی اصلاح نہیں کر سکے۔"

کیونکہ یہ جدید شاعری عقائد، اخلاق اور اقدار و معیار کو رد تو کر سکتی ہے مگر ان کی جگہ کوئی اپنا نظام اقدار نہیں دیتی نہ دے سکتی ہے۔ نظام اقدار جو پوری انسانی زندگی کا انفرادی اور اجتماعی تجربہ ہے، جو جبر نہیں بلکہ عین زندگی ہے۔ مگر مغرب سے مرعوب جدید ذہن کے انحراف کا یہ حال ہے کہ اسے اس حیاتی قدر سے ہی الرجی ہو گئی ہے۔ چنانچہ جدید نظم و غزل کے محبوب کی وہ ساری ماورائیت ختم ہو چکی جس کا سلسلہ کبھی حسن ازل سے ملتا تھا اور جس کی آفاقیت مسلم تھی۔ اب بقول شخصے "عشق ازلی توفیق کے بجائے لمحاتی صداقت" بن چکا ہے کیوں کہ عاشق کی طرح معشوق نے بھی مارکس اور فرائڈ کا مطالعہ کیا ہے۔ اب عاشق کو عشق کے علاوہ بھی بہت سے کام درپیش ہیں۔ مسائل کی پیچیدگی نے خود اس کے عشق کو بھی مشکوک بنا دیا ہے :

مجھے یہ ڈر ہے تیری آرزو نہ مٹ جائے
بہت دنوں سے طبیعت مری اداس نہیں (ناصر کاظمی)

غم حیات و غم دوست کی کشاکش میں
ہم ایسے لوگ تو رنج و ملال سے بھی گئے (اعزاز احمد آذر)

جیسے ساحل سے چھڑا لیتی ہیں موجیں دامن
کتنا سادہ ہے ترا مجھ سے گریزاں ہونا
(جمیل الدین عالی)

بھلا ہوا کہ کوئی اور مل گیا تم سا
وگرنہ ہم بھی کسی دن تمہیں بھلا دیتے (خلیل الرحمن اعظمی)

کوئی صدا میرے صبر و سکوت سے نہ اٹھی
کوئی سزا تیرے قول و قرار نے نہ دیا۔
(ظفر اقبال)

یہ پیروی مغرب کا ہی شاخسانہ تھا کہ ترقی پسندوں نے عرصہ تک ماضی کے ادب کو جاگیردارانہ سماج کی پیداوار سمجھ کر حقارت سے ٹھکرا دیا۔ غزل کی قدامت پسندی کی علامت قرار دیا۔ تو حلقۂ ارباب ذوق کے بہت سے شاعروں نے لاشعور اور تحت الشعور کی بھول بھلیوں، اسلوبی جدتوں اور آزاد نظم کی ترنگوں میں خود کو مست رکھا اور اب جدیدیت کے بہت سے متوالے سارتر اور کامیو کے ادھ کچرے خیالات اور نثریت کو شاعری کی معراج ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور اس طرح کے اشعار کہہ رہے ہیں ؎

تن توڑ نقب ناز جنر خام قفل قرش
جسم جوڑ کفر قفل ظلم رنگ ظفر واں

جدید شاعری کا ایک بڑا حصہ "فلمیت اور واقعیت زندگی" کا بھی شکار ہوا ہے۔ کیونکہ جدید زندگی ان دونوں مظاہر سے خاصی متاثر بھی ہے۔ روایت سے بغاوت خالص مادی اور زر پرستانہ ماحول نے بہت سے جدید شاعروں کو محض حواس خمسہ کی شاعری پر آمادہ کر دیا ہے۔ حسیت پر ضرورت سے زیادہ زور نے "ادراک" کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ اس لئے سلیم احمد اگر یہ الزام لگاتے ہیں تو کیا غلط کرتے ہیں۔

جدید غزل ایک بے کلچر معاشرے کی پیداوار ہے ہم اپنا پرانا کلچر گم کر چکے ہیں اور نیا ہم نے ابھی پیدا نہیں کیا۔ اس لحاظ سے جدید غزل صرف ایک خلا میں سانس لے رہی ہے۔ ہمارے پاس حسیات ہیں، محسوسات ہیں، تجربات ہیں مگر وہ کیمیا کہاں ہے جو اس مس خام کو زر خالص بنا دے۔[2]

چونکہ جدید ذہن تمام قدروں سے مشکوک اور متنفر ہو گیا ہے اسلئے شائستگی اور جمالیاتی تسکین کے فقدان کی وجہ سے

---

[1] ادھوری جدیدیت ص ۶۳

تنہائی اور عدم تحفظ کا جذبہ روز افزوں ہے۔ اس کھردرے پن نے بہتوں کو نثری شاعری تک کے فریب میں مبتلا کر دیا۔ الفاظ کے توڑ مروڑ موزونیت و ہم آہنگی سے چشم پوشی، آزاد نظم ہی نہیں آزاد غزل پر اصرار، مختصر ترین نظموں کی بھرمار، من مانی علائم سازی، برہنہ گفتاری اور اکہری شاعری وہ مظاہر ہیں جو جدید شاعری میں آج عام طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ یونگ اور فریزر کی تقلید نے ارضیت اور اساطیریت کی لے اس قدر بڑھائی کہ انفرادیت نے بے چہرگی و بے سمتی تک پہنچ کر دم لیا۔ اب ایذرا پاؤنڈ کے حوالے سے خود کفیل مصرعوں اور احساس کے موتی مدوجزر کی تاکید کے ساتھ توصیفی ترکیب، ترادفات، پابند شاعری کی تلمیحات اور لفظی ترکیبوں سے بھی پرہیز کرنے اور ارد گرد کی اشیاء اور مظاہر سے رشتہ استوار کرنے کی تلقین بھی ہو چکی ہے اور کوشش یہ ہے کہ مرئی میں غیر مرئی کی آمیزش نہ ہو۔ بہر حال جدید شاعری کی ایک اہم پہچان اس کی ہری بھری علامت سازی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اب ایک اور پہلو سے اس کی پہچان پر غور کریں۔ موجودہ جدید زندگی اب جس وجہ سے اور جیسی کچھ بھی ہو جدید شاعری نے اس کی بھرپور عکاسی کی ہے اور کئی لحاظ سے اس نے پرانی شاعری پر سبقت بھی حاصل کی ہے۔ ادھر چند برسوں میں بغاوت اور تشدد کی لے میں کچھ کمی بھی آئی ہے۔ اب بے سمتی کا میلان ختم ہو رہا ہے۔ مسلسل ٹھوکروں نے بہتوں کو سنبھلا دیا ہے اور اعتدال پسندوں کے فن میں مزید نکھار بھی آیا ہے۔ جدید شاعروں نے چونکہ فکر و فن کے بگے بندھے انداز کو غلط باور کیا اس لئے ان کے فن کی انفرادیت نے انہیں کسی لیبل بازی سے الگ رکھا۔ بیشتر اچھے شعراء کا ایمائی اور رمزیاتی انداز ان کے اپنے ڈھب کا اور منفرد ہے۔ غالب نے عشق کو دماغ کا خلل بتایا تھا۔ عہد جدید نے اس کی مرکزیت اور اولیت ہی کو ختم کر دیا۔ چنانچہ یگانہ و فراق کی حقیقت پسندی اپنے اپنے انداز میں جدید شاعروں کے یہاں بھی بخوبی دیکھی جا سکتی ہے۔

ٹھہری ہے تو اک چہرہ پہ ٹھہری رہی برسوں
بھٹکی ہے تو پھر آنکھ بھٹکی ہی رہی ہے

(وحید اختر)

سائے کو تو سائے میں گم ہوتے تو دیکھا ہوگا
یہ بھی دیکھو کہ تمہیں ہم نے بھلایا کیسا

(سلیم احمد)

سرائے دل میں جگہ دے تو کاٹ لوں اک رات
نہیں یہ شرط کہ مجھ کو شریک خواب بنا

(حسن نعیم)

اس طرح کے اشعار میں حسن و جمال سے بیزاری نہیں بلکہ انسانی فطرت کے ازلی لگاؤ کا پتہ ملتا ہے مگر خلیل الرحمن اعظمی کے لفظوں میں "نہ صرف حسن و عشق بلکہ زندگی اپنی تمام تر وسعتوں کے ساتھ آج کے شاعر کے ہاتھ میں ایک الجھے ہوئے دھاگے کی طرح ہے جسے وہ سلجھانا چاہتا ہے" مگر معاملہ سلجھنے کے بجائے اور الجھتا ہی جاتا ہے۔ وہ ذات اور کائنات کے رشتے اور اس کے حدود کو بھی سمجھنا چاہتا ہے تاکہ وہ اپنے داخل و خارج کی دنیا میں کچھ دیر کیلئے سکون تو حاصل کر سکے۔ اس سعی میں وہ اپنے ماحول، فطرت اور اس کے مظاہر کو طرح طرح سے علامتوں میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ یہ سعی جمالیاتی اور فنی حدود میں رہتی ہے تو تخلیقی تمانیت کا احساس دے جاتی ہے۔

میں بکھر جاؤں گا زنجیر کی کڑیوں کی طرح
اور رہ جائے گی اس دشت میں جھنکار مری

(ظفر اقبال)

نہ اتنا تیز چلے، سرپھری ہوا سے کہو
شجر پہ ایک ہی پتا دکھائی دیتا ہے

(شکیب جلالی)

تنہائی کی یہ کون سی منزل ہے رفیقو
تا حد نظر ایک بیاباں سا کیوں ہے

(شہریار)

چونکہ جدید شاعری میں جدید تر ذہنی کیفیات اور طرز احساس

کی کارفرمائی نظر آتی ہے اس لئے شعراء نے روائتی علامتوں اور استعاروں کی جگہ اپنے ماحول اور فطرت سے نئے نئے امیجز اور علامتیں بنائی ہیں یوں جدید نظم و غزل میں ایک نئی فضا، نئے مزاج اور نئے کیف کا احساس ہوتا ہے۔ ہندی کے نرم و شیریں اور رسیلے الفاظ سے کام لے کر عجمیت کی آنچ بھی کم کی گئی ہے۔

دھوپ نکلی دن سہانے ہو گئے
چاند کے سب رنگ پھیکے ہو گئے
اب تو خوش ہو جائیں ارباب ہوس
جیسے وہ تھے، ہم بھی ویسے ہو گئے

(ناصر کاظمی)

رات کی کوکھ سے پھوٹا ہے اک سونا بزم خیالوں کا
دن ہوتے ہوتے یہ کس کس دھارے میں مل جائیگا

(جمیل الدین عالی)

جدھر اندھیرا ہے، تنہائی ہے، اداسی ہے
سفر کی ہم نے وہی سمت کیوں مقرر کی

(شہریار)

کوئی صورت مجھے دے دو کہ ترستا ہوں میں
میری تعمیر کی مٹی ابھی نم ہے، دیکھو

(شاذ تمکنت)

اس میں شک نہیں کہ جدید شاعری نے اپنی جدت اور اپج سے فن کی کئی منزلیں طے کرلی ہیں مگر مزید بلندیوں کو طے کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی جڑیں ماضی کی صحت مند قدروں میں پیوست ہوں، روایت سے ناطہ توڑ کر اسے کٹی ہوئی پتنگ سے بچنا ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ "ہر اچھا ادب روح عصر کی پیداوار ہوتے ہوئے ماورائے عصر بھی ہوتا ہے" مگر ماورائے عصر ہونے کیلئے ضروری ہے کہ اپنے حصار سے نکل کر تقلیدی انداز کے بجائے اجتہادی انداز سے اسے کسی بلند نظام اقدار کو اپنی اساس بنانا ہوگا۔ اس کے بغیر ریزہ خیالی اور پراگندہ فکری سے نجات ممکن نہیں اور یہ نظام اقدار چند ساطیری علائم و استعاروں اور تلمیحات سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے کچھ اور جرأت اور کوشش و کاوش اور مزید خون جگر صرف کرنے کی ضرورت ہے۔

بقیہ داناۓ راز

کے باقی حصہ کی تکمیل، ہمارے اقبالی اداروں اور اقبالیین کے لئے ایک علمی چیلنج ہے۔

میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ سرسید احمد خاں ایک خوش قسمت انسان تھے کہ ان کی مفصل بیاگرافی، حالی نے ان کی زندگی ہی میں لکھ کر شائع کردی ــــ اقبال کو نہ تو کوئی باسویل، ملا اور نہ حالی ــــ تو کیا اقبال ایک بدقسمت شخص تھا ــــ ؟ یا پھر شاید ہم ہی ایک بدقسمت قوم ہیں ــ :

عتیق الرحمٰن قاسمی

قاضی عبدالستار کے دو ناول

شب گزیدہ ——— دارا شکوہ

قاضی عبدالستار کا ادبی رویہ، تکنیک اور اسلوب ناول نگاری میں بڑھتی ہوئی بے راہ روی اور ادب کے نام پر کچھ نئی مبہم قسم کی تخلیقات، یا تنقیدات کے دعویداروں کے لئے اس بات کی آگاہی ہے، کہ معیاری تخلیقات روایا سے وابستہ رہ کر براہ راست بھی کی جاسکتی ہیں۔ اس کے لئے ابہام، اہمال، پیچیدہ بیانی یا زبردستی کا الجھاؤ ضروری یا ناگزیر عمل نہیں ہے۔ وہ اس بھیڑ چالی عہد میں بھی نقالی یا فیشن زدگی کے مضر اثرات سے بے نیاز ہو کر، اپنے لب ولہجہ، رویہ، طور طریقے اور اسلوب میں اس لسانی روایت کے امین ہیں، جو میر امن، شبلی، محمد حسین آزاد، شرر اور پریم چند کی ہم تک پہنچی ہے۔ اسی لئے ان کے یہاں بے اعتدالی سے اجتناب، ناول کے اجزا کا التزام یا اس کا احساس ملتا ہے جن کو انھوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ برتا اور نبھایا ہے۔ اسی باعث وہ ناول نگاری کے فن میں اپنے منفرد انداز اور اسلوب کی وجہ سے ہجوم سے الگ نظر آتے ہیں، ان کے یہاں لمحہ بھر کے لئے بھی ناول کو چیستاں بنانے کا عمل یا موضوع کی ندرت اور تکنیک کی جدت کے نام پر ناول کو بوجھل کرنے کا شعوری یا غیر شعوری احساس نہیں ملتا واضح انداز بیان اور دو ٹوک ادبی رویہ ہی قاضی صاحب کا فن اور ان کی پہچان ہے جس نے ان کو اعتبار کا درجہ دیا اور وہ ایک صاحب طرز ادیب کے نام سے پہچانے گئے۔

شب گزیدہ، میں انھوں نے تہذیبی کشمکش اور نئے پرانے طرز احساس کو بڑی فنکاری اور توازن کے ساتھ پیش کیا ہے اور "دارا شکوہ" میں وہ اپنے اسلوب اور انداز بیان کی انتہا پر ہیں، ان دونوں ناولوں کے موڈ اور پیش کش سے ہی قاضی صاحب کا فن بڑی وضاحت کے ساتھ قاری کو مختلف جہتوں سے متاثر کرتا ہے۔ جذبہ کی یہ صداقت اور اظہار کا یہ خلوص اردو کے بہت کم ناول نگاروں کو نصیب ہوا ہے۔ شب گزیدہ تو ان کا مکمل ناول ہے۔ دارا شکوہ اور صلاح الدین میں ان کے اسلوب اور زباں دانی کا بہاؤ، کچھ شدت اختیار کر گیا ہے، ان کو پڑھتے وقت قاری ایک لمحہ کے لئے اپنے گرد وپیش سے بے نیاز ہو کر بار بار زبان کی داد دیتا رہ جاتا ہے تاہم ڈرامائیت، چھوٹے چھوٹے جملوں کی ساخت، استعارے اور تشبیہات ان کے اسلوب کی واضح نشانیاں ہیں اور اردو ناول نگاری کا زبردست قیمتی سرمایہ، ان دونوں ناولوں کے تجزیوں میں، اس کی نشاندہی جگہ جگہ کی گئی ہے۔

شب گزیدہ

اس ناول میں تہذیبی اعتبار سے ایک عبوری دور دکھایا گیا ہے، جہاں ناول نگار اودھ کی بکھرتی اور ٹوٹتی ہوئی تہذیب کے شدید احساس کے ساتھ نئی تہذیب، نئے ذہن اور قدروں سے آگاہ بھی کرتا ہے۔ اس ناول میں قاضی صاحب نے ناول نگاری کے فن پر دسترس، کہانی کہنے کے سلیقہ اور منفرد اسلوب کے ذریعہ اس کا اعادہ کر دیا کہ ناول ایک بیانیہ صنف ہے جو اپنے تقاضے اور کچھ مطالبات بھی رکھتی ہے۔

یہ ناول جاگیردارانہ عہد کے سخت گیر، رومان زدہ، ضدی

وضعدار حاکموں اور اس سے وابستہ رعایا اور سماج کا ایک ایسا بیان ہے جو اپنی تجرباتی اساس رکھتا ہے۔ اس ماحول میں حاکمانہ تمدن یا اس کا احساس بڑا اہم ہے۔ بغاوت احکامات کی تعمیل میں تاخیر، روگردانی یا پس وپیش کو وقار کا مسئلہ بنا کر عزیز از جان اولاد کو بھی مارڈالنے سے گریز نہیں کیا جاتا بشرطیکہ اس سے ریاست کی گرتی ہوئی دیواریں رک سکیں یا ریاستی مزاج کے لئے وجہ سکون بن سکے۔

"شب گزیدہ" جام نگر کے سیدھے تعارف اور اس کے تاریخی وجغرافیائی پس منظر سے شروع ہوکر "جمی" کی موت پر ختم ہوجاتا ہے، اس ناول کے ذریعہ تعلقہ اردن، میر و مرزاؤں کے تسلط، رسوم ورواج کی جکڑبندیوں، سازشوں، مقابلہ آرائیوں اور خانگی سے لے کر سرکاری امور میں تیسرے آدمی کی غیر معمولی اہمیت اور اس کے مضر اثرات سے بھی قاری روشناس ہوتا ہے اور زندگی کے بارے میں دو مختلف زاویائے نظر اور رویے بھی کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ یہ روایتی اور نئے ذہن کی کشمکش ہی باپ بیٹے کے درمیان اختلاف کی بنیاد بنی۔ جمی، گھوڑوں بے ضرورت عورتوں اور ہاتھیوں کو نہ صرف ناپسند کرتا تھا بلکہ اس زیر بار سے بچ کر اخراجات کو کم کرنے کی صلاح دے کر نئے وسائل، جدید ٹریکٹر اور کراکری وغیرہ کی فراہمی پر زور دیتا ہے جب کہ اول الذکر چیزیں مرزاجی کے نزدیک وجہ مقبولیت اور حاکمانہ شان کی علامتیں سمجھی جاتی تھیں۔

اس ناول کے ذریعہ ہم متوسط طبقے کی تہذیب، امارت کے ساتھ جام نگر جو سیتاپور کی تحصیل ہے وہاں کی گفتگو، رسم ورواج اور ماحول سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ جام نگر کے مرزاجی جو خود کو بڑے سرکار کہلایا کرتے تھے ایک روایتی زمیندار تھے ان کا لڑکا "جمی" پڑھ لکھ کر جب گھر پہنچا تو "چھوٹے سرکار" کہلانے لگا گو کہ یہ ریاست اپنی کچھ قانونی مجبوریوں کی وجہ سے اس کے نام پہلے ہی منتقل کرادی گئی تھی۔ "جمی" ریاست کے روایتی آداب کو غیر ضروری سمجھتا تھا، تعلیم نے اس کا ذہن بدل دیا تھا۔ وہ اکثر ان تبدیلیوں کے بارے میں بھی سوچتا رہتا تھا، جو ابھی تک آئی تو نہیں تھیں مگر ناگزیر تھیں وہ اپنی ریاست میں ایک زبردست انقلاب اور طور طریقوں میں اصلاح کا خواہاں تھا مگر کچھ ایسے افراد نے جو اس نئے ذہن سے براہ راست متاثر ہو سکتے تھے اس کوشش میں آنا رنے کی تمام کوششوں کی ناکامی کے بعد وہ "بڑے سرکار" کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کے کان بھرنے شروع کر دیئے، روایتی لوگ کانوں کے یوں بھی کچے ذرا کچے ہی ہوتے ہیں وہ "جمی" سے شاکی ہو گئے، محرم کی پہلی تاریخ کو شکار کھیلنے کی بے معنویت پر بھی وہ چونکے اور جب ان کو یہ یاد دلایا گیا کہ اس بہانے سے صاحبزادے سکندر پور گئے تھے تو وہ خفگی کے عالم میں بہت کچھ کہہ گئے۔

لیکن مرزاجی کی خفگی یا رضا سے زیادہ اہم ریاست کی گرتی ہوئی دیواریں تھیں۔ وہ خوش فہمیوں کے خول میں بند ہوکر، خوشنما عورتوں کے چہروں کو دیکھ کر خوش ہو لینے کی جگہ، حالات سے نبرد آزما ہونے کے لئے مدافعتی تدابیر کے ساتھ ہی خاتمہ زمینداری کے بعد کی صورتحال پر بھی نظر گاڑے ہوئے تھا جس کا ذکر یا تصور ہی مرزاجی کی ہولناکی کے لئے کافی تھا۔ وہ سکندر پور والے پھوپھا سے تعلقات سدھارنا چاہتا تھا جن سے مرزاجی کی لڑائی چلی آرہی تھی۔ ہوسکتا ہے پھوپھی زاد بہن زبیدہ سے اس کی بڑھتی ہوئی دلچسپی بھی کوئی وجہ رہی ہو، تاہم وہ پھوپھا کو سرکاری اور نجی معاملات میں ہمدرد اور مددگار سمجھتا تھا۔ بلاشبہ انھوں نے جمی کے کہنے پر اس وقت مرزاجی کی مدد بھی کی تھی۔ جب بڑے سرکار اور "بھارت سنگھ" کی سواریاں آمنے سامنے اکڑ کھڑی ہوگئی تھیں اور کوئی بھی لیکھ چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا۔ جمی نے پھوپھا جان کے ذریعہ تھانے والوں پر دباؤ ڈال کر اس قضیہ کو ختم کرا دیا تھا۔

"جمی" رحمت علی خاں "مختار عام" کے بڑھتے ہوئے اثرات، اور دوغلے رویہ کو پہچان چکا تھا، مرزاجی اس پر بے حد اعتماد کرتے تھے لیکن یہ شخص گھن کی طرح ریاست کو کھا رہا تھا جمی اس کی چالاکیوں کو سمجھ گیا تھا جس کو مرزاجی اپنی جنسی مجبوریوں اور اس کے رازہائے سربستہ سے جو رحمت علی خاں کے پاس تھے، اس کو انگیز کر رہے تھے۔ مرزاجی کی اس کمزوری سے جمی بھی واقف تھا۔

دکھ بھال ٹھاکر اکو دو بچے بیٹا لگیا ہاں جانتے ہیں، وہ کبھی فیاض سرکار کو علم تھا!"[1] یہاں یہ نفسیاتی نکتہ بھی سمجھ میں آسکتا ہے کہ باپ اور بیٹے میں اختلاف کا سبب جذبہ رقابت بھی تھا، جس کا احساس بڑا لبیط ہے، جمی خود بھی سلمان پسند تھا؛ ورنہ بڑے سرکار تو عورتوں میں خاصے بدنام تھے، چندا، بہرن، شیو، کئی نام ان سے وابستہ تھے، یا پھر امی کے لئے جذبہ ہمدردی۔

لیکن رحمت علی، ان مرزاجی کی جنسی آسودگی کا وسیلہ تھا اس لئے اس کے خلاف وہ کچھ سننے کیلئے آمادہ نہیں تھے اور مختار رام، منصوبہ بند طریقہ سے اس خلیج کو بڑھا رہا تھا، لہٰذا اس نے شادی کا مشورہ دیا، جمی نے انکار کیا جس پر مرزاجی کو غصہ آیا اور بات اس کی امی کی طلاق تک پہنچ گئی اور پھر اس کو اسی گہری سازش کے تحت زہر دیدیا گیا۔ اور کہانی مکمل ہو گئی۔

لیکن اس کہانی کی بنت میں کئی چھوٹی چھوٹی کہانیاں اور واقعات کبھی بڑی فنکاری کے ساتھ سمو دیا گیا ہے۔ جام نگر کے ساتھ سکندر پور کی رشتہ داری ... اور تفصیلات بھی قاری کے سامنے آجاتی ہیں ... سے جو جا چیوڑ کے چودھری، ڈمٹے شاہ کا اکھاڑا الگ ہوتے ہوئے بھی کہانی کا ایک حصہ ہیں۔ اختر بھائی کا وجود بھی کھپت گیا ہے۔ بیباک باغی نوجوان تھا جس کی اپنی الگ ... ہے مگر رحمت چچا کی مخبری کی بدولت اس کو گرفتار ہونا پڑا، مولوی صاحب کا ... ریاکاری اور دہری زندگی کی علامت کے طور پر ابھرتا ہے جس سے توہم پرستی کی بھی نشاندہی ہوتی ہے، اور توہم پرستی یا عیاری کی دوسری مثال وہ معجزہ ہے جو جمی نے عباسی علم مغون کی دعا دیکھ کر بلیس بریا کے دیکھا آیا تھا جسکو اختر بھائی جیسے روشن خیال کے بلیڈ گیس کی روشنی کے

رُخ کا مرہون منت بنا گیا۔

پھر ملکو اہیر کی لڑکی "رویا" کے بارے میں الگ تفصیلات فراہم کرکے بختاور اور اسکی ماں کے ذریعہ اس کی نگہداشت کے بارے میں بتایا گیا ہے، اور ٹھاکر بھارت سنگھ کی دشمنی کو اس سے جوڑ دیا، اس کو ہندو مسلم منافرت کا مسئلہ بنا کر جب کچھ ہندو روح آباد جو بڑے سرکار کا آبائی قبرستان تھا اس میں گھس آئے تو یہ مرزاجی کو ناگوار ہوا، اور تان جمی پر اور اسکی اماں پر ٹوٹی۔

اس طرح سے چھوٹے بڑے واقعات سے ایک گتھا ہوا پلاٹ تعمیر ہوا جس سے ایک مکمل کہانی بن گئی، مربوط مسلسل اور چونکا دینے والی کہانی۔

قاضی صاحب کردار کے پیش کرنے میں بھی بڑی چابکدستی کا ثبوت دیا ہے جمی کا کردار بڑا اہم ہے، وہ خالص زمیندارانہ ماحول میں پلنے اور کانونٹ میں پڑھنے والا جمی روایت سے بغاوت کرتا ہے اور ایک نئی تہذیب اور نئے حالات کو آتا ہوا دیکھتا ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہے تو ہر چیز اور ہر شخص دوہرا معلوم ہوتا ہے، وہ زبیدہ سے محبت کرتا ہے مولوی صاحب کی سرزنش بھی، چندا اسکے پیچھے پڑی ہوئی تھی، اس کے لئے مولوی صاحب سے تعویذ کرانے بھی گئی تھی۔ لیکن محل میں جمی کے کردار کی تعریف کی جاتی تھی، غرضیکہ زندگی کے سارے معاملات میں اس کا رویہ اور اپروچ سائنٹفک تھا۔ وہ موٹر خریدنے پر اصرار کرتا ہے۔

"اس لئے کہ آپ کو موٹر کی ضرورت رہتی ہے اور آپ سیتاپور پالکی یا فٹن پر جاتے ہیں اس طرح تکلیف بھی ہوتی ہے اور وقت بھی زیادہ صرف ہوتا ہے"[1]

"موٹر کے اندر بیس بائیس موٹریں ہیں (یعنی ہارس پاور) ... جا رہا دیجئے ... تو کام زیادہ خوش

۱۔ نقوش ۹۵ جون ۱۹۶۳ء، ص ۱۹۲

۱۔ نقوش ۱۹۶۳ء ۲۔ ایضاً ص ۲۳۳

اسلوبی سے انجام دیا جاسکتا ہے۔ ؎

وہ سکندر پور والے پھوپھا کو بھی ناگزیر سمجھ کر غیر ضروری
ناراضگی کو ختم کر کے تعلقات سدھارنا چاہتا تھا، اس کی پھوپھی
اس کے لئے نہ صرف نرم گوشہ رکھتی تھیں بلکہ اپنے خون کا
ایک حصہ سمجھتی تھیں، یہی وجہ ہے کہ تبع پور سے واپسی پر
جب اس کے تیر لگنے کی خبر سنا تو وہ بھاگی چلی آئیں اسی طرح
سے وجاج پور کے چودھری کو بھی اپنا دوست سمجھتا تھا البتہ
رحمت خاں جو گڑھی کے معاملات میں اوقات سے زیادہ
دخیل تھا اسکو نقصان دہ سمجھتا تھا، جمی اس سے چار سال کا
حساب مانگ کر ذلیل کرتا ہے، صرف چار سال کا اس لئے کہ
چار سال سے چیف کورٹ کے ذریعہ ریاست اس کے نام منتقل
کر دی گئی تھی۔ لیکن برسوں کی بگڑی ہوئی مختار عام کی عادت
پر یہ جواب طلبی گراں گذری۔ وہ تو کئی سال سے سرکاری خزانے
اور اسلحہ جات کو خرد برد کر رہا تھا۔ رام چرن سے لیکر دکھے شاہ
تک موج اڑا رہے تھے۔ لیکن جمی نے جب اس طرف توجہ
کی تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ بڑے سرکار کو ورغلایا گیا۔ مگر
جمی کا انقلاب پر آمادہ تھا، وہ گھوڑوں ہاتھیوں اور عورتوں
کی تعداد کم کرنے پر بضد تھا لیکن بڑے صاحب ہاتھیوں کو
شان امارت اور عورتوں کو اپنی ضرورت سمجھتے تھے، وہ بیٹے
کو تو الگ کر سکتے تھے، لیکن ہاتھیوں یا عورتوں کو نہیں، وہ
اپنے باپ کی حرکتوں سے بیزار تھا اور ماں کو کڑھتا ہوا دیکھ
کر غمزدہ ہو جاتا تھا۔

اسی لئے اس نے اس فینس کو آگ لگوا دی جو کبھی
اماں کو باہر نکلوانے کیلئے آئی تھی، وہ اپنی شادی کے مسئلہ
پر بڑے سرکار سے الجھ پڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو زہر دیدیا گیا۔

اختر بھائی بھی ایک علامتی حیثیت کا ایک اہم
کردار ہے۔ ایک سرکش جمی ہی کی طرح ہے یہ جمی کا خالہ زاد
بھائی ہے جو کلکٹر ہو۔ بھٹکنے کے لئے سرکار کی ملازمت ہے۔

بیچ کر جہانگیر چلا آیا تھا، سیاسی حالات سے واقف تھا اور
اخبار بینی اس کا مشغلہ تھا، وہ جمی کو ریاستی امور میں کچھ مشورے
بھی دیتا ہے، توہم پرستی کے خلاف تھا، اور محرم کی آٹھویں
تاریخ کو "عباسی علم" پر جب خون کی لکیر بن جاتی ہے تو وہ
اس کا سائنٹفک سبب دریافت کرتا ہے۔

"یہ معجزے وغیرہ ہیں۔ یہ سب پندرھویں صدی کی
پیداوار ہیں، سنا تم نے؟ اس خیال کو اپنے ذہن سے نکال
دو۔ ۔ ۔ یعنی مجھے اگر میر صاحب چھونے دیتے تو میں
گیس کا رخ بدل دیتا اور معجزہ خود بخود ختم ہو جاتا"۔ ؎۱
اسی طرح سے قلعہ والی مسجد میں رات گئے کیا ہوتا ہے اس
بارے میں بھی اس کا ذہن صاف تھا، اور اس نے اس کا
تجربہ بھی کرا دیا تھا۔ وہ ایک نیا سائنسی آدمی تھا، لیکن یہ
سیاسی باغی انسان اس وقت پہلی بار خطرہ محسوس کرتا ہے
جب ایک اجنبی شخص اسے سلام کرتا ہے۔ پھر یہ نیم سا اسٹیشن
کی طرف بھاگتا ہے۔ لیکن لالہ کی پرچون کی دکان سے یہ خبر ملتی
ہے، کہ اختر بھائی پکڑ لئے گئے، اس طرح سے اس ناول میں
لالہ کی دکان کی موجودگی بھی سمجھ میں آ گئی۔ جمی پھر اس خبر کی تصدیق
کے لئے تھانے جاتا ہے، جہاں اس کو پتہ چلا کہ اختر بھائی کو گرفتار
کرانے میں رحمت علی خاں کا ہاتھ تھا۔

رحمت علی خاں - ملیح آباد سے گڑھی آ کر معمولی ملازم ہوا تھا
رفتہ رفتہ مختار عام بن کر ریاستی امور میں دخیل ہو گیا۔ یہ ملیح آباد کے
ایک قدیم خاندان میں شادی کر کے اپنی سالی عیدا کو بھی ساتھ
لے آیا تھا۔ جو بڑے سرکار کے دربار میں پذیرائی کا عمدہ وسیلہ
تھی اور ضرورت پڑنے پر اپنی بیوی مہرن کو بھی پیش کر دیا کرتا تھا،
اس طرح سے اس نے بڑے سرکار پر مکمل قبضہ کر لیا تھا۔ یہ
ایک بڑا سازشی اور خود غرض انسان تھا، جمی کے ہاتھوں اپنی
درگت ہوتے دیکھ کر بڑے سرکار کے کان بھرتا رہتا تھا اور وہ
اس سے اس قدر بیزار ہو گئے تھے کہ اسکو زہر دیدیا تھا۔

پورے خزانے میں رحمت علی خاں کا قبضہ تھا کیونکہ وہ بڑے سرکار کا مازدار تھا، رام چرن اور ذکّے شاہ اس کے حواریوں میں تھے۔

قاضی صاحب کے کرداروں میں آباد اندرونی دنیا سے بھی قاری واقف ہو جاتا ہے، اور خارج کے ساتھ ان کا باطن بھی نظر آنے لگتا ہے۔ رحمت جیجا، جمی، اور اختر بھائی تینوں کرداروں کے بارے میں ناول نگار کا کمال یہ ہے کہ ان کی داخلی زندگی بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے، کہ یہ کس طرح سوچتے ہیں۔ جمی کے پھوپھا جان کا کردار صرف اتنی سی بات سے ظاہر ہو جاتا ہے۔

"بھائی جان میرے بزرگ ہیں۔ وہ اگر بلائیں گے تو میں سر کے بل آؤں گا لیکن تم بچے ہو، تمہارے کہنے سے میرا جانا کس قدر نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔"[1]

اسی طرح سے جمی جب جاج پور کے چودھری کے پاس جاتا ہے، اور چودھری اس کے تنہا بغیر سپاہیوں کے آنے پر تعجب کرتا ہے تو جمی کہتا ہے ؟

"ہاں! مجھے تم سے کوئی خطرہ نہیں ہے"۔

چودھری کو اس جملے سے بوتل کا سانپ ہو گیا، ضلع کے سب سے بڑے تعلقے کا اکلوتا وارث اس پر اتنا بھروسہ کرتا ہے۔ اس کی نگاہوں میں اپنی شخصیت بہت اہم ہو گئی، اس نے گھوم کر دیکھا۔ بیوی بچے کو لیکر جا چکی تھی، اسے افسوس ہوا کاش وہ بھی چھوٹے سرکار کا یہ جملہ سن لیتی۔ اس نے بڑی تمکنت سے کہاروں کو دیکھا جو جمی کو کھانا کھلانے کیلئے دست بستہ کھڑے تھے۔[2]

اس سے ایک متوسط طبقہ کے آدمی کا احساس اور اس کی اندرونی کیفیت بڑی وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہے وہ کیا سوچتا ہے، اور کس طرح سے وہ دوسروں کو متاثر کرنا یا رعب ڈالنا چاہتا ہے۔

ان ہی کرداروں کے حوالے سے اودھ کی تہذیب اور مسلم معاشرے کے زوال پر بھی روشنی پڑتی ہے، اور دو مختلف فرقوں کی تہذیبوں کا تقابلی مطالعہ بھی قاری کر لیتا ہے۔ اور مسلم معاشرے کی گراوٹ کا پتہ بھی چلتا ہے۔

"کوئی چھوٹی کچی دیواروں کے پیچھے مجبور و محزون مغل آباد تھے، تنگ و تاریک کوٹھریوں میں بانس کے گول گول مونڈے بچھے تھے ان میں رفو کئے ہوئے تن زیب کے کرتے کاڑھے ہوئے پلے اور جامانی کی ایک آدھ شیروانی دفتی تھی یہ نوکری نہیں کر سکتے تھے کیونکہ جاہل تھے۔ یہ مزدوری نہیں کر سکتے تھے اس لئے کہ ان کے باپ دادا زمیندار رہے تھے۔"[3]

اس طرح سے زوال آمادہ مسلم معاشرے کی اچھی اور سچی تصویر قاضی صاحب نے کھینچ دی ہے۔

یہ ناول بیانیہ تکنیک میں لکھا گیا ہے ایک کامیاب ناول کیلئے یہ قطعاً ضروری نہیں کہ اس میں کوئی پیچیدہ تکنیک برتی گئی ہو بلکہ یہ ضروری ہے کہ مواد، اسلوب، اور تکنیک میں ہم آہنگی ہو، ممتاز شیریں کا خیال ہے :۔

"گو تکنیک کسی فن پارے کے حسن کا ایک نہایت ضروری جزو ہے لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ محض تکنیک ہی کسی افسانے کو اچھا بنا سکتی ہے جب تک مواد، اسلوب اور تکنیک میں ہم آہنگی نہیں ہوتی، افسانہ فن پارہ نہیں بنتا۔"[4]

قاضی صاحب کے اس ناول میں یہ تینوں اجزا ہم آہنگ ہو رہے ہیں، اور ناول کسی بھی طرح کی بے اعتدالی سے محفوظ ہے۔ یہ ناول بڑے واضح موڈ میں لکھا گیا ہے۔ پوری کہانی کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اور کئی چھوٹی چھوٹی کہانیاں اور واقعات اسکے درمیان شامل ہو گئے ہیں جو اصل کہانی کا ایک ضروری حصہ بن گئے۔ یہ ناول نگار کا کمال ہے جس کردار کا بھی ذکر ہے، صاف لفظوں میں اس کا ذکر

حقائق ہے، اس کو تاریخی سلسلہ بھی بتا دیا جاتا ہے۔ چچا رحمت کے ذکر میں ملیح آباد کی آمد سے لیکر بعد تک اس کی شادی اور اس کے سسرال کے خاندان کے بارے میں تفصیلی ذکر ہے۔ اسی طرح سے مولوی صاحب کے ذکر میں ان کا شجرہ اور ملازمت گاہ کا جغرافیائی بیان بھی ملتا ہے بلکہ ان کی لڑکی زینت کے اغوا ہونے کی کہانی سن کر مولوی صاحب کا کردار کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ اسی طرح اختر بھائی یا سکندر ریلوے کے حالات بالتفصیل ملتے ہیں یہاں تک کہ "آندھی" کے بارے میں بھی بتا دیا گیا ہے کہ یہ کہاں سے آیا تھا۔ اس طرح سے یہ ایک مربوط اور مسلسل کہانی بن گئی ہے۔

کہیں کہیں کردار کی سوچ یا خواب و خیال کے ذریعہ بھی اسکی اندرونی کیفیت کا پتہ چلتا ہے۔

"دوجی اخبار پڑھتے پڑھتے اپنے خوابوں کی دنیا میں چلا گیا، اس نے دیکھا کہ جاڑوں کی برفیلی رات میں طوفانی جھکڑ چل رہے ہیں۔ وہ طلائی زرہ بکتر پہنے مرصع خود لگام جام نگر کے شیش محل کی سیڑھیاں اتر رہا ہے۔" (۱)

"دوجی کو محسوس ہوا جیسے خاں صاحب کمرے میں قہقہہ لگاتے آئے۔ اس کی اداس صورت پر نظر ڈالکر اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور زہر میں ڈوبے نشتر اسکی سماعت میں اتار دیئے۔" (۲)

کچھ مقامات پر خود کلامی کے ذریعہ بھی قاضی صاحب نے اپنے کردار کے احساس کو ظاہر کیا، لیکن یہ سب اتنا فطری اور حقیقی ہے کہ بھرتی کی چیز نہیں معلوم ہوتی بلکہ جب ضرورت ہوا ہے۔ یا خود کلامی یا خیالی کیفیات کا اظہار معلوم ہوتا ہے۔

"دوجی تو میں کروں کیا؟ ... کیا کروں؟ ... کردیں کہ بساط کی بساط ہی الٹ دو۔۔۔۔ اچھا ابو؟ ... تم ابو کے اکلوتے بیٹے ہو بھائی! تم کو پھانسی تو نہیں لگا دیں گے ... تم کو گولی تو نہیں مار دیں گے ....."

کہیں انداز اشاراتی بھی ہوگیا ہے، مثلاً

"جو چبوترے کی ٹوٹی ہوئی سیڑھیوں پر سنبھل سنبھل کر چلتے ہوئے ان کی نگاہ اٹھ گئی، دروازے کے قریب بڑی راس کا گھوڑا چمڑے کی کاٹھی میں کسا کھڑا تھا اختر بھائی کا ذہن ایک ہی لمحے میں جبا تو کی ساری داستان کا چکر کاٹ کر واپس آگیا۔"

اس طرح کے اور بھی کچھ نشانات ملتے ہیں جو تکنیک کے ذریعہ بالکل حقیقی انداز سے ناول میں آگئے ہیں۔ ان سے کسی منصوبہ بند طریقہ یا کسی ڈرامے سازی کا شبہ نہیں ہوتا یہی ناول کی کامیابی ہے۔

قاضی صاحب کا اسلوب بھی جداگانہ ہے، زبان پر ان کو مکمل قدرت حاصل ہے، کردار کے درجہ اور معیار کے مطابق زبان استعمال کرتے ہیں، ایک جگہ "امی سے کہو" اور "امی سے کہئے" کے فرق کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے، وہ لسانی نزاکتوں کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے زبان بھی تخلیقی استعمال کرتے ہیں۔ تشبیہات اور استعارے بھی ان کے اپنے ہوتے ہیں۔

"زبیدہ اپنے پاؤں کے کبوتروں کو مخمل کی گرگابیوں میں چھپائے ہوئے چوکی کے کونے پر بیٹھ گئی۔"

یا "چندا" کے خون ایسے ہونٹ کھنچ گئے"۔

اس طرح کی بہت سی تشبیہات مل جاتی ہیں اور کچھ ایسے جملے بھی جو اپنا کچھ پس منظر یا پیش منظر رکھتے ہیں، اور احساس بھی۔

"اس گڑھی کے باہر مجھے کوئی خطرہ نہیں"

یا "چھوٹے سرکار کے لئے چند آبلے نسپانے بھجوائے تھے"

اس طرح کے جملے اصل کہانی سے بڑا گہرا ربط رکھتے ہیں یوں ہی بے خیالی میں نہیں نکل گئے۔ اسکے علاوہ، محاکاتی نثر میں پیکر تراشی، اور تمثیلی انداز پیدا کرکے تاثیر کی شدت میں اضافہ کرنا بھی قاضی صاحب کے اسلوب کی شناخت ہے اور انفرادیت بھی۔

دارا شکوہ

یہ ناول شب گزیدہ سے بالکل الگ موڑ میں لکھا گیا ہے۔ تاریخ کے حوالہ سے ناول لکھنا خاصا دشوار مسئلہ اس لئے بن جاتا ہے کہ ناول نگار کو ایک محدود دائرے میں رہتے ہوئے، اپنی بات کہنی ہوتی ہے وہ وقوع پذیر تاریخی واقعات کے بیان کو احساس کی شدت تخیل کی آمیزش اور لب و لہجہ کی انفرادیت سے ناول بناتا ہے کہانی کا تمام مواد اس کو تاریخ سے مل جاتا ہے۔

دارا شکوہ، تاریخ ہند کا ایک متنازع فیہ سرکار کردار ہے جس نے کئی رخ سے یہاں کی تہذیب، ثقافت سیاست اور معاشرت کو متاثر کیا، قاضی صاحب نے اس کی شخصیت کا رنامحوں، اور نظریات کو بنیاد بنا کر یہ ناول لکھا ہے اور اس کے مثبت رویہ کے تحت اردو ناول کو ایک توانا کردار عطا کیا ہے۔

تاریخی ناول میں تاریخ اور واقعہ کی صحت بڑی اہمیت رکھتی ہے، لیکن پیرایہ اظہار جزئیات نگاری تفصیلی بیان، ڈرامائیت اور منظر کشی سے تاریخ ناول بن جاتی ہے۔ جو رخ تاریخی صداقتوں اور خارجی زندگی سے سیدھا واسطہ رکھتا ہے۔ جبکہ ناول نگار انسانی ابدی سچائیوں اور کردار کے اندرون میں پیدا ہونے کے خالص داخلی جذبات کو موضوع بناتا ہے۔ تاریخ نگار "لوۂ لالہ" کے حسب نسب اور تاریخی وجود پر روشنی ڈال کر اپنا فرض ادا کر دیتا ہے۔ لیکن ناول نگار کی نظروں میں اس کی خوبصورتی اور جمال سے سید جعفر جیسے اور کتنے لوگ متاثر ہوتے ہیں اور قندھار کی مہم بھی وہ ایک رومانی کردار بنی رہتی ہے اور ناول کے حقیقی کردار کی اس وقت تکمیل ہوتی ہے، جب وہ ایک درویش کے روپ میں بڑے ڈرامائی انداز سے ناول کے آخر میں اکبر ثانی اور خود دارا شکوہ کو حیرت میں ڈال دیتی ہے ظاہر ہے یہ تاریخی واقعہ نہ بھی ہو تب بھی ناول کا ایک اہم حصہ ضرور ہے۔

روشن آرا اور زیب کی طرفداری تھی، ناول نگار صرف اس دو ٹوک جملہ پر ہی بس نہیں کر سکتا بلکہ اسکے لئے ضروری ہے کہ وہ روشن آرا کی دلی کیفیت اور اندرونی احساس کی پرت کھولدے۔ قاضی صاحب نے دارا شکوہ کے قندھار کی مہم پر روانہ ہوتے وقت دارا کے لئے روشن آرا کی زبانی سے جو دعائیہ کلمات کہلوائے ہیں، وہ قاضی صاحب کے فن کا نمونہ ہیں۔

"خدا آپ کے ہاتھ سے سلطنت مغلیہ کو محفوظ رکھے"

سلیمان شکوہ اس کا مفہوم سمجھ کر تڑپ اٹھا۔

اسی طرح سے دارا شکوہ جب سرمد کے پاس دعا کے لئے جاکر ان سے دعا کی درخواست کرتا ہے۔ تو سرمد اسکے جواب سے شاید باخبر کس خوبصورتی سے اس درخواست کو قبول نہ کرکے اپنی دعا کو ناکامی سے بچا لیتے ہیں۔

"بادشاہ فقیروں کی دعاؤں سے بے نیاز ہوتے ہیں"

دارا شکوہ کے خلاف عوامی اور اجتماعی احساس
کی وہ پوری فضا جو قاضی صاحب نے تخلیق کی ہے، ناول
کو تاریخ سے ممتاز کر دیتی ہے۔ جامع مسجد پر دارا کے
خلاف اشتہار، عوام الناس کی ناراضگی کا اظہار اور ان کا
ایک عذر باقی مسئلہ تھا، اذان کی آواز بند ہو جائے گی،
مسجدیں ویران اور مندر آباد ہو جائیں گے، بہت سے خدشات
کا بیان قاضی صاحب نے بڑے افسانوی انداز میں کیا
ہے۔ ڈُلّن باورچی کی دکان پر آکر ایک شخص کہتا ہے

"ڈلن میاں الو دھیلے کا ہریسا آج اور کھلا دو۔"
یہ آج کی کیا شرط لگا دی میاں جی۔ اللہ چاہے گا
تو ڈلن کے مرنے کے بعد بھی کھاتے رہو گے۔
"کس خواب خرگوش میں پڑے ہو ڈلن میاں؟
کل اگر دارا جی مہاراج سنگھاسن پر براجے گئے تو برسوں
سے گوشت کا قصہ ختم سمجھو۔"

یا اس اشتہار کو دیکھ کر بادشاہ بیگم کو جو شدید احساس
ہوا اور انھوں نے دارا شکوہ کو جو اسرار رموز حکومت
سمجھائے، وہ اپنی جگہ بہت اہم ہے۔

"بادشاہ بیگم ولیوں کی سی پاک اور تسکین
آفریں آواز میں مخاطب ہوئیں۔
"جائز بادشاہ کو تخت پر بیٹھنے سے روکنا آسان
لیکن ناجائز بادشاہ کے نیچے سے تخت گھسیٹ لینا
مشکل ہے ... بہت مشکل ہے"

افسانے اور حقیقت کے اس فرق نے ہی قاضی
صاحب کے فن میں بلندی بخشی ہے، یہی فرق اس ناول
میں جا بجا ملتا ہے۔ تاریخ کا اتنا واقعہ ہے کہ دارا
نے ہندو یاتریوں کا ٹیکس معاف کر دیا تھا، لیکن
قاضی صاحب نے اس کو زبردست ڈرامائی انداز میں
دکھایا ہے۔

"صاحب عالم کی ہندو پرجا کے سیکڑوں من آنسو
ہزاروں من آہیں اور لاکھوں چتائیں اپنے لیے لاد کر لایا ہوں
.... چور چور ہو گیا ہوں"
"ہم سمجھنے سے قاصر ہیں"
"جب سوریہ کے سامنے دیا جلتا ہے تو اندھیرا
جاتا ہے ... مغل سمراٹ کا مہا کوی اپنے آپ کو
صاحب عالم کی سرکار میں گونگا پاتا ہے۔ من میں لہریں
لیتے جوالا ساگر کو ان پوتر چرنوں میں انڈیل دینے کا
ساہس (ہمت) نہیں ہوتا"
"سرسوتی بھول جاؤ کہ تم آل تیمور کے جلیل الشان
ولی عہد کے حضور میں ہو ... یاد رکھو کہ تم اس دارا کے
سامنے ہو جو علم کا عاشق اور عالموں کا خادم ہے ...
بے جھجک بیان کرو۔"

ادب کے قاری کو اس سے زیادہ بحث نہیں کہ دارا کا
یہ عمل مصلحت وقت یا آداب سلطنت کے کس حد تک
منافی تھا۔ اس پر فیصلہ صادر کرنا تاریخ دان کا کام ہے
ہمیں تو اس شدید احساس اور رویہ کو دیکھنا ہے جس نے
اس کو ناول کا روپ دے دیا، اس کیفیت اور احساس
ہی کو قاضی صاحب نے بیان کیا ہے، جب شاہجہاں، دارا
کو اس ٹیکس معاف کرنے کی تمام نزاکتوں کو سمجھا چکا
اور دارا بدستور اپنی بات پر اصرار کرتا رہا تو شہنشاہ کی جو
حالت تھی اس کا نقشہ قاضی صاحب نے کھینچا ہے۔

"شہنشاہ نے اس کے بازو چھوڑ دیے اور آہستہ
آہستہ گردن ہلاتے ہوئے دالان میں گئے، مطلّی محرابوں
میں زربفت کے پردے بندھے ہوئے تھے۔ فانوسوں نے
سورج کی روشنی چرا لی تھی۔ طلائی سہانی شیر دہانے کی

جو کی پر مسند سے الگ کر بیٹھ گئے ہاتھ سے اشارہ
کر کے داراکو سنہری کرسی پر بٹھا دیا اور مسند کی پشت
کو دیکھا۔"

قندھار کی مہم ناکام ہوئی، اورنگ زیب کا رول
کیا تھا؟ غداروں نے کیوں اور کیسے غداری کی توپ
خانے میں آگ کس نے لگائی، داراکے کیمپ میں غدار
کون کون تھے، اور وہاں تک اورنگ زیب یا
ایرانیوں کی رسائی کیسے ہوگئی، اس کا ٹھوس جواب
تو تاریخ کی مستند کتابوں میں ملے گا۔ ناول میں تو
صرف ایک ماحول ملتا ہے، اور پیچیدہ صورتحال بھی
جس میں بڑے ڈرامائی انداز سے حضرت "میاں میر"
کا نام لیتا ہوا ایک شخص آتا ہے، وہ کچھ پیش گوئیاں کرتا
ہے، اور پھر سید جعفر اور "لال" کو لے کر چلا جاتا ہے
یہ پوری فضا افسانوی ہے جس میں ہلکا سا تجسس بھی
پیدا ہوگیا۔ یہی ناول کی خوبی ہے۔

داراشکوہ میں جو خصوصیات تھیں ان کی موجودگی
میں وہ تاریخ کی جگہ ناول ہی کا زیادہ بہتر اور کامیاب
کردار بن سکتا ہے۔ رائے رایاں جب سیاست کا
تقاضہ سمجھاتے ہوئے اس سے کہتا ہے، کہ صاحب عالم
کے خلاف مسلمانوں کے جذبات برانگیختہ ہیں۔ اس لئے
وہ آج اپنا ایسا لباس نہ پہنیں جس پر "شیو" کی تصویر یا
"پربھو" کا لفظ کھدا ہوا ہے۔ اس پر داراشکوہ ناعاقبت
اندیشی پر مبنی جواب دیتا ہے۔

رائے رایاں۔ تم داراشکوہ کو دربار کا مسخرہ سمجھتے ہو؟
جو چند چمکاتے انعاموں کی خاطر ایک وقت میں
دس رنگ بدل سکتا ہے۔"

یہ جواب کسی مثالی انسان کا ہی ہو سکتا ہے، با اختیار
بادشاہ یا ولی عہد سلطنت کا نہیں ہو سکتا۔ داراکے یہاں
کچھ قدریں تھیں، جن کا اس نے ہمیشہ خیال رکھا، اور یہی
اسکی ناکامی کا المیہ بھی بن گئیں۔ اس کا تعلق یاتریوں کے
ٹیکس کی معافی سے ہو یا شاہجہاں کی موجودگی میں تخت
پر بیٹھنے کے انکار سے ہو، غداروں کی شناخت سے
عاری، یا سب پر اعتماد کرنے ہو، یہاں تک کہ اپنے
زوال کی انتہا کو بھی وہ ایک دیرینہ مرہون منت کے
اوپر اعتماد کر کے ہی پہنچا، "ملک جیون" ایسا ہی ایک
شخص تھا، جس نے داراکو گرفتار کرکے اورنگ زیب
کے حوالہ کیا۔ یہ سب اسی سادہ مزاجی ہی کا کرشمہ ہے،
جس کا ذکر قاضی صاحب کے اس ناول کے بین السطور میں
مل جاتا ہے ان ہی قدروں کی موجودگی میں قاری اور ناول
نگار کا رویہ ہمدردانہ ہو جاتا ہے لیکن ان ہی ناعاقبت
اندیشانہ حرکتوں سے جو اثر ہوا اس کا ذکر کرکے قاضی صاحب
نے اعتدال پسندی کا ثبوت دیا ہے، اورنگ زیب کے
وقار سیاسی بصیرت اور مذہبی رنگ کو بھی بڑے وقار
اور احترام کے ساتھ پیش کیا ہے۔ آخر میں جس نیازمندی
کے ساتھ شاہجہاں کی طرف آتے ہوئے اس کو دکھایا
گیا ہے اس سے توازن کا پتہ چلتا ہے۔

اس طرح سے اندازہ ہوتا ہے کہ قاضی صاحب تاریخ اور
ناول کے لطیف فرق سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ اس کو برتنے
کا سلیقہ بھی رکھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ تحفظات
رکھتی ہے اور ان ہی کے ساتھ وہ ہمارے ساتھ چلتی ہے
اور جب یہ تحفظات ٹوٹنے لگتے ہیں تو ناول کا فن شروع
ہوتا ہے اور ابدی انسانی حقیقتیں جنم لیتی ہیں۔ اورنگ
زیب پر نوشتہ تھا ہی، شجاع بھی ہوا ہو گیا اور مراد
شاہجہاں آباد سے دور دکن سے قریب تھا، اس طرح

کی ہولناک ... دارا سے بھی سنی ہوں گی، اس کا تعلق
تاریخ سے ہے، اس کا تقابل انسانوں اور ماحول کے
ساتھ کیا ہو اور اس کے بعد صورت حال کیا ہوئی۔ یہ
ناول کا حصہ بنتا ہے۔

"وہ ساری رات وزارت عظمیٰ کے وفادار کھلے ہوئے
سوار اور پیادے دوڑتے رہے۔ توپ خانے کے کارخانے
ہتھیاروں کی گڑگڑاہٹ اور گھوڑوں کی ہنہناہٹ سے
گونجتے رہے۔ تمام شہر بیدار رہا اور دروازوں کی آنکھیں
اور دیواروں کے کان سرگوشیاں کرتے رہے۔"

ایک تاریخی ناول نگار سے یہ مطالبہ غیر ضروری ہے
کہ وہ تاریخی حقائق بیان کرتے وقت جزئیات کے التزام
میں بھی تاریخ کا سہارا لے گا۔ جزئیات میں اس کو تخیل کا
سہارا لینا ناگزیر ہے۔ موسم کا بھی لجنبہ یا فلاں بات کا ذکر
کیوں نہیں ہوا۔ اس قسم کے مطالبات سے ناول نگار کو زیادہ
واسطہ نہیں رہتا۔ اس کے لئے تاریخی شعور یا اصل واقعہ کا
احساس کافی ہے۔ اس طرح سے اگر کہانی کی بنت میں
ایسی گفتگو، مکالمات، موسم کا حال، یا کیفیات آجائیں
جو انتخابی ہوں یا ان کا ذکر تاریخ کی بڑی کتابوں میں نہ مل سکے
تو کیا ایسا ناول، فنی صداقت اور معیار پر پورا نہیں اترے گا۔

اس ناول کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ شاہی
دور کی تہذیب، دربار، دربار کا رنگ، طور طریقے، جنگوں
کا بھیانک نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے اور قاری خود
کو عہد مغل میں جیتا ہوا محسوس کرتا ہے۔

اس ناول میں قاضی صاحب کا اسلوب بڑا اہم ہے،
زبان پر بلاشبہ ان کی گرفت ہے اور بے پناہ قدرت بھی
حاصل ہے، شاہی عہد کے مناسب حال زبان بڑے
وقار اور معیار کے ساتھ استعمال کی گئی ہے، جس میں
بادشاہ، ولی عہدوں، باغیوں، خواجہ سراؤں، کنیزوں،
اور شہزادیوں سب ہی کی زبان ان کے مراتب کے لحاظ
سے استعمال کی گئی اور ان تمام آداب کا لحاظ بھی رکھا گیا
ہے، جو اس جنت ارضی کیلئے ضروری تھے۔ انھوں نے
تاریخ سے صرف خام مواد لیا ہے، اپنے منفرد اسلوب
کہانی کہنے کے ڈھنگ، لب ولہجہ کی عظمت اور بالخصوص
ڈرامائی کیفیت پیدا کرکے جلا بخشی اور ناول بنا دیا۔

اس ناول میں ڈرامائیت بے حد اہم ہے۔ چھوٹے
چھوٹے جملے، مکالمات، داراشکوہ، شاہجہاں، اورنگزیب
روشن آرا، جہاں آرا اور مختلف منصب داروں اور
عہدیداروں کی گفتگو سے مکالمہ نگاری کے کمال کا
اندازہ ہوتا ہے، جب سید جعفر اپنا دیرینہ ... سے
مجبور ہوکر، بڑی رازداری کے ساتھ جب لالہ تک
پہنچتا ہے اور لالہ سے اس کی جو گفتگو ہوتی ہے اسکی
تصویر قاضی صاحب کے فن کا ایک نمونہ ہے۔

"اور وہ اسی طرح بے نیازی سے کھڑی ہوئی بالوں
میں پھنسے ہوئے جھالوں کی زنجیر سلجھانے لگی۔

"لالہ میں اپنی جان پر کھیل کر تم تک آیا ہوں۔ مجھے
نامراد نہ کرو۔ ورنہ اپنی اور تمہاری دونوں کی زندگیاں
برباد کردوں گا۔"

"توبہ۔ توبہ"

اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔

"مجھے تو معاف رکھئے۔ اپنی البتہ برباد کر لیجئے۔ آپ کے ... کی
قسم کسی سے نہ کہوں گی،"

"میں تمہیں ایک بار پھر موقع دیتا ہوں۔ مجھے ...

"کنیز ظل الٰہی شاہ بلند اقبال ... کو سمجھنے کی کوشش کر رہی
ہے ... اس لئے آپ ... اپنا جادو ... چلائیے ...
اور دفعان ہو جائیے۔"

"جعفر نے اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلتے دیکھیں تو پیچ و تاب کھانے لگا..." [ه]

اشاراتی اور رمزیاتی انداز بھی کہیں کہیں مل جاتا ہے۔ غداروں کے ساتھوں اور سید جعفر کی سازش اور لالہ کی نادانستگی یا مجبوری کے ساتھ جب توپ خانے میں آگ لگادی گئی تو ایک زبردست دھماکہ ہوا اس پوری صورتحال اور لوگوں کی ذہنی کیفیت کو قاضی صاحب نے بڑے رمزیہ انداز میں بیان کیا۔

"مجمع البحرین کے ورق بکھر گئے۔ مہابت خاں اپنے عہد کا سب سے وزنی بکتر پہننے لگا......... لالہ خواجہ سراؤں کے ہاتھوں سے پھسل کر کھڑی ہوگئی۔ لیکن آئینے میں اپنا برہنہ عکس دیکھ کر دھپ سے بیٹھ گئی۔ جعفر کا پاؤں کئی بار رکاب سے پھسل گیا۔ اور محراب خاں دروازہ باپادلی کی نوساختہ دیوار کے نیچے شکر کے سجدے میں گر پڑا۔" [ه]

اس ناول میں اس طرح کے اشارے جگہ جگہ مل جاتے ہیں۔ اور ناول کے آخری حصہ میں جب دارا شکوہ چاندنی چوک اور دوسرے مقامات سے سلیمان شکوہ کے ساتھ، پابہ زنجیر بدحالی کے مکمل التزام کے ساتھ گذارا جاتا ہے، تو ناول نگار کو منظر نگاری اور تاثیر کی شدت کی داد دینی پڑتی ہے، کس قدر بھیانک منظر تھا۔ الاماں!

اختر انصاری
(علی گڑھ)

فنا

"ہے" اور "نہیں ہے" کے غوامض سے گذر جا

جو ہے وہ خدا ہے جو نہیں ہے وہ خدا ہے

تو صاحبِ تشکیک ہو یا لا ادری ہو

کیا اس میں بھی کچھ شک ہے کہ ہر شے کو فنا ہے؟

ہر لمحہ ہے پرّاں، گزراں ہے جو ہے موجود

لاریب کی ناپید زمانے سے بقا ہے

مفقود ہے ٹھہراؤ تو معدوم ہے اثبات

منزل بھی سراپردۂ گل بانگِ درا ہے!

ہر شے کو فنا ہے، مگر اس سے بھی کچھ آگے

بندہ یہ کہے گا کہ فنا کو بھی فنا ہے

اظہار ندیم
علی گڑھ

ہجوم

اے ادھوری چیخ !
تیرا جسم
سرد سرد وسعتوں میں تھرتھرا رہا ہے
تیرے بازوؤں کی وہ تمام قوتیں
نہ جانے اب کہاں چلی گئیں
کہ ان ہواؤں کے یہ سخت منجمد سے در، یہ کھڑکیاں
کسی کے نیم جاں بدن کا
خون پی کے مسکرا رہے ہیں
بجلیوں کی ہر لکیر مرتعش فضا میں
راکھ راکھ بن کے اڑ رہی ہے
ان گنت صداؤں کے تمام خواب پارہ پارہ ہو چکے ہیں
اے ادھوری چیخ !
تیرا جسم
اک صدائے بازگشت بھی نہ دے سکا ہے
مدتوں کی بھولی بھالی جان کو صلا ایسے جو دوست بھی نہ دے سکا ہے
اب تو بس یہ پرسکوت آندھیوں کے سلسلے ہیں
اور ان میں
رات کے ورق کی پھڑپھڑاہٹوں کا
اک ہجوم رہ گیا ہے !

سیدہ نزہت صدیقی
(ٹورنٹو۔ کناڈا)

شکستہ پر

شب سرِ بزمِ ہنگامِ عیش و طرب میں
میرا دل اچانک، میوزک کے بے سر دھماکوں سے اکتا کے
پھر ذات کے بند کمرے سے آواز دینے لگا
پھر بلانے لگا
آؤ دیکھو! تمہاری پناہ گاہ میں ہوں
تم کھلے موسموں،
چاند تاروں کی ٹھنڈی، محبت سے پُر روشنی سے
بچھڑ کر کہاں آگئی ہو؟
گاؤں کے نیم پختہ مکانوں میں جب روشنی آئی،
سورج کے ہمراہ آئی۔
کھیت کھلیان کی خوشبوئیں سب ہواؤں میں مدغم
تمہارا بدن چوم کر اپنے ہونے کا پیغام دیتی رہیں
تم ان منظروں سے کہ جن میں ہر اک رنگ سادہ، ہر اک نقش
نازک۔
بچھڑ کر کہاں آگئی ہو؟؟
تم نیم کے پیڑ کی چھاؤں میں پلنے والی وہ مخلوق ہو
جو کہ صدیوں میں بھی
ان ناشینی فضاؤں
یخ زدہ سرزمینوں سے رشتہ نہ جوڑے گی
ٹوٹنے کی بجائے اگر ذات کے بند کمرے میں
تم جی سکو تو جیو۔
آؤ! دیکھو! تمہاری پناہ گاہ میں ہوں
میری آنکھوں کے سامنے تیر میرے نلچتے ہیں
یہاں روشنی ہے مگر میری دھرتی کا سورج نہیں ہے
بند کمروں میں جانے ہوا کیسے آتی ہے
مرا دم گھٹا جا رہا ہے
تازہ ہوا کی ضرورت ہے مجھ کو
یہاں تیز میوزک کے بے سر دھماکے
وہاں ندیاں گنگناتی ہیں
بیلے میں رانجھے کی بنسی پہ بس
دھڑکنیں گیت گاتی ہیں
میری دھرتی کی آغوش میں جو سکوں تھا
یہاں خوف بن کر مرے ذہن پر چھا گیا ہے
کوئی موسمِ گل، کوئی باغباں
اک ایسے شجر کو کہ جس کی جڑیں کٹ چکی ہوں
کہاں زندگی دے سکا ہے

مشرف عالم ذوقی
(آرہ)

سمتوں کا جواب

اور پھر ایسا ہوا کہ سورج نے اپنا پورا دہانہ کھول دیا ـــــ
اور میرے جسم کی کنکریلی، ناہموار سطح اچانک دھوپ کی تمازت پاکر بگولا بن گئی۔

میں نے سمت کا اندازہ لگایا ـــــ "میں کون سی سمت جارہا ہوں؟"

اور کون سی سمت سے میں چلا تھا ـــــ!

اور کتنے سمتوں سے ہوتا ہوا اس انجان موڑ پر آکر ٹھہر گیا تھا۔

جہاں میں کھڑا تھا۔ وہیں میرے ساتھ تین دوسرے لوگ بھی کھڑے تھے۔ ان میں ایک لڑکی تھی۔ لڑکی کے بال لمبے اور بڑے بڑے تھے۔ ہواؤں کے تند جھونکے اس کی زلفوں سے سرگوشیاں کرتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ لڑکی بار بار کھڑکی دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ تیز بھاگتے ہوئے وقت سے پریشان ہو رہی تھی اور میری ہی طرح پاگلوں جیسی انجان سمتوں کو تک رہی تھی۔

اس کی بغل والا شخص ایک بوڑھا تھا۔ کمزور اور ناتواں بوڑھا۔ اس کا چہرہ جھریوں سے بھرا پڑا تھا۔ کھوئی کھوئی خاموش آنکھیں گول چشمے کے فریم سے دھوپ کی تمازت اور ماحول کی بے ربطی کو محسوس کر رہی تھیں۔ چشمے کی ایک کمانی نہیں تھی۔ اس کی جگہ ایک دھاگہ بندھا ہوا تھا جس کو بوڑھے نے اپنے کان میں لپیٹ لیا تھا۔ اس طرح دھاگہ ایک مستقیم پگڈنڈی کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ بوڑھے کے چہرے پر پسینے کی بوندیں جھلملا رہی تھیں اور وہ بھی ہونقوں جیسا منزل کی سمت کا اندازہ لگا رہا تھا۔

بوڑھے کی بغل میں ایک عورت کھڑی تھی۔ سیاہ پوش موٹی عورت۔ جس کو دیکھ کر وقت کی کرب ناکی کا احساس ہو رہا تھا۔ عورت کے بدن پر ایک ملگجی ساڑی تھی۔ اس کے نقوش حد سے زیادہ سکڑے ہوئے تھے۔ وہ بھی ان دونوں مسافروں کی طرح اپنی جگہ پر ہراساں کھڑی تھی اور انجان منزلوں کی جانب پاگلوں کی طرح گھور رہی تھی۔

اور دور تک ایک پراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

یہاں سے سڑک چار سمتوں کی طرف مڑ جاتی ہے۔
یعنی چار الگ الگ راستے، چار الگ الگ منزلیں۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

دور تک ایک طویل راہداری بچھی ہوئی تھی۔ نہ جانے کتنی سمتوں سے ہوتا ہوا میں اس انجان سے موڑ پر آکر ٹھہر گیا تھا۔ ایک سوال دل میں ابھرا۔ کاش! میں نے پہلے ہی اپنی سمت کا اندازہ لگا لیا ہوتا یا پھر کوئی سمت متعین کرکے چلا ہوتا۔

میں نے پیچھے کی طرف نظر دوڑائی ـــــ "میں کہاں سے چلا تھا؟"

مگر راستے خاموش تھے۔

میں نے پھر اپنا رخ آگے کی طرف کیا ـــــ "مجھے جانا کہاں ہے؟"

آگے کی طویل راہداری فلک شگاف قہقہے بلند کر رہی تھی۔

میں نے پھر سوچا جیسے میرے ساتھ یہ جو تین لوگ کھڑے ہیں، ان سے جواب طلب کرنا چاہئے۔ ان کے چہرے میری ہی طرح شناور نہ تھے۔ ان کی آنکھیں میرے ہی آنکھوں کی طرح سکڑی ہوئی تھیں۔ ان کے قدم میری ہی طرح ساکت تھے۔

"سنو!" ــــ میں نے آہستگی سے پوچھا: او کیا تم سب بتا سکتے ہو کہ تم کہاں سے چلے تھے؟"

ان لوگوں نے حیرانی سے میری طرف دیکھا پھر ایک دوسرے کے چہرے کو باری باری سے۔ پھر سب نے ایک ساتھ کہا:

"نہیں، ہمیں نہیں معلوم"۔

"آؤ ہم سوچیں"۔

میں نے دوبارہ کہا اور پھر ہم سب نے اپنی اپنی آنکھیں موند لیں ــــ پھر کچھ ہی لمحہ گذرا ہوگا کہ سب نے اپنی اپنی آنکھیں کھول دیں۔ سب کے چہروں پر ایک ٹھہری ہوئی روشن مسکراہٹ کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔

"ہاں ہم گمنامی سے چلے تھے"۔

ہماری ننگی خواہش کے پودوں کو زہریلے آدم خور اژدہے نگل گئے۔ اس خواہش کے پودوں کو پھلا پھولا دیکھنے کا خواب ہم کئی صدیوں سے دیکھتے چلے آرہے تھے اور پھر جب ہماری معصوم خواہشیں ان کے خوفناک منہ کی عمیق گہرائیوں میں اتر گئیں تو ہم نے محسوس کیا، ہماری سانسیں خلفشار کی گہرائیوں میں گھٹ رہی ہیں اور ایسا محسوس ہوتے ہی ہم نے بے اوسانی میں وہاں سے بھاگنا شروع کیا، بغیر سمت متعین کئے ہوئے ــــ بس ہم بھاگتے ہی چلے گئے۔

اس وقت تک ہمارا واسطہ حقیقت سے نہیں پڑا تھا۔

"ذرا ٹھہرو"۔ لڑکی نے اپنی زلفیں بکھیریں ــــ "یہ حقیقت کیا ہے؟ یہ بیچ میں کہاں سے آگئی؟"

"ہاں یہ سوال ہے"! بوڑھا بل کھا کر ٹھٹھا مار کر ہنسا۔

"حقیقت اصل میں ہے کیا؟" میں نے زیر لب اس سوال کو دہرایا ــــ "پیدائش؟"

"غلط"۔ موٹی عورت نے گہرے تفکر کے ساتھ جواب دیا۔

"بچپن؟" ــــ میں نے سنجیدگی سے پھر کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"غلط"۔ اس بار جواب بوڑھے نے دیا تھا۔ "بچپن حقیقت نہیں۔ تم جوانی کو بھول گئے۔ وہ جوانی جو بچپن کے بعد والا فیصلہ کن ہے۔ یعنی اس کا دوسرا رخ وہ حقیقت کیسے ہو سکتی ہے۔ حقیقت اٹل ہے۔ واحد۔ اس کا کوئی بدل نہیں، کوئی چیلنج نہیں، کوئی تبدیلی نہیں!"

"پھر حقیقت کیا ہے؟" میں نے غصے سے پوچھا۔

"جوانی؟" جوان لڑکی بے شرمی سے کھکھلا کر ہنسی

"جوانی بھی حقیقت نہیں اس کا بدل بڑھاپا ہے"۔

"تو پھر حقیقت کیا ہے؟ بڑھاپا؟"۔ میں نے پھر غصے سے پوچھا۔

"نہیں!" بوڑھے کا چہرہ ایک بار پھر پراسرار ہو گیا۔ اب موٹی عورت نے اپنے ہونٹ کھولے "حقیقت صرف ایک ہے، یعنی موت! موت کا کوئی بدل نہیں۔ موت حقیقت ہے۔ موت اٹل ہے"۔

وہ آہستہ آہستہ اس لفظ کو دہرا رہی تھی۔

"آؤ موت کی پرستش کریں"۔

ہم نے گہری سنجیدگی سے اس تلخ حقیقت کے سامنے سر خم کرتے ہوئے کہا۔

بوڑھے کی آنکھیں بھر آئیں.... اس کا نحیف بدن جھٹکے سے کانپا۔ سوکھے ہوئے پتلے ہونٹوں نے سرگوشی کی ــ موت کیا ہے؟

جوان لڑکی کے بدن میں پھر جھرجھری سی پیدا ہوئی ــــ "کیا موت بھیانک ہے؟ اگر بھیانک ہے تو کیا ہم سب اسی منزل کے لئے چلے تھے؟"

موٹی عورت نے آگے پیچھے کے تمام گمنام راستوں میں جھانکا۔ اور پھر دھیرے سے پھسپھسائی: ہاں،

پہلے یہ تو سمجھ لیں کہ موت ہے کیا؟"
میں نے ان تینوں کے شکن آلود چہروں کے پیچھے اسی دبیز کالو ریخ کو محسوس کرتے ہوئے کہا:
"اگر موت ہی منزل ہے تو آؤ اس کا پتہ لگائیں اور اس کی طرف چلیں۔"
"مگر کس طرف؟" لڑکی کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمایاں تھے: "یہاں سے راستے چار الگ الگ منزلوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان میں سے ہمارا اپنا راستہ کون سا ہے؟"
"ہمیں کوئی بھی راستہ اختیار کر لینا چاہئے۔ کیونکہ ہر راستہ بالآخر ایک ہی منزل پر جا کر ختم ہو جائیگا اور وہی اصل منزل ہوگی........"
بوڑھا بڑے ڈراونے لہجے میں کہہ رہا تھا۔
اور پھر ہم سبھوں نے مل کر آگے کی سمت چلنا شروع کر دیا۔
چلتے چلتے بوڑھا کچھ پل کو ٹھہرا پھر ہم تینوں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا:
"اب جبکہ ہم سب دوست ہو گئے ہیں ہمیں ایک بات صاف کر لینی چاہئے کہ ہم آخر کس لئے انجان منزلوں کی سمت روانہ ہوئے تھے"۔
وہ ٹھہرا ------ "پہلے میں شروع کرتا ہوں"۔ وہ چلتا بھی جا رہا تھا اور کہتا بھی جا رہا تھا۔ اس کی دھندلی دھندلی ہوئی آنکھیں اچانک چمک اٹھیں۔
میرا گھر پہاڑیوں کی وادیوں میں تھا۔ آنکھیں کھولیں تو سر پر پہاڑ تھے۔ ڈراونے، ہیبتناک، لق و دق، ٹیڑھے میڑھے پہاڑ۔ اور پھر میں نے ایک بے حسی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ اور یہیں سے ان ہیبتناک ڈراونے پہاڑوں سے میری نفرت کی داستان شروع ہوتی ہے۔ میں نے پہاڑوں کو جڑ سے کاٹنا شروع کر دیا۔ میرے پیر شل ہو جاتے، آنکھیں دھنس جاتیں، چہرہ پسینے پسینے ہو جاتا۔ مگر میں اپنا کام کرتا رہا۔ حتیٰ کہ پہاڑ کی ہیبت کمزور ہوتی چلی گئی۔
اور پھر ایک دن ایک تیز دھماکہ ہوا اور میرا پورا گھر ملبے کا ڈھیر بن گیا....."
بوڑھا آہستہ آہستہ کانپ رہا تھا۔
اور تب میں نے اپنے شکستہ وجود میں جھانکا۔
اس کی عریانیت میں جھانکا اور پایا کہ حقیقت پہاڑ نہیں تھی ---- اور بس میں پاگلوں کی طرح اسی عالم میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور یہاں آکر تم سب سے آملا۔"
بوڑھا خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے کی لاتعداد شکنوں میں کمی آگئی تھی۔
"آپ کی کہانی میری کہانی سے ذرا بھی مختلف نہیں"۔
لڑکی کے چہرے پر کوئی خزاں رسیدہ پودا اگ آیا تھا اور پھر اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔
"میں بچپن سے ہی پھولوں کی شوقین رہی تھی رنگ برنگے نیلے پیلے گلابی ---- ہر طرح کے پھول میری کمزوری تھے۔ اور جب میں کچھ بڑی ہوئی تو یہ کمزوری پروان جوان ہو چکی تھی۔ اور پھر ان رنگ برنگے پھولوں سے میں نے اپنا گھر آراستہ کرنا شروع کر دیا۔ میرا کمرہ رنگ برنگے پھولوں سے بھرتا گیا۔ میں ان بے شمار پھولوں کی جانب دیکھتی، ان کی سوندھی سوندھی مہک محسوس کرتی اور کچھ وقفے کے لئے حقیقت سے آنکھیں موند لیتی۔ میرا یہ شوق پروان چڑھتا رہا اور افسردہ پھول کمرے میں کمہلاتے چلے گئے.....
اور پھر ایک دن جب میں کمرے میں لیٹنے آئی تو ان پھولوں کی بدبودار سڑی ہوئی مہک کمرے میں اسقدر پھیل چکی تھی کہ میرا دم گھٹنے لگا۔ ان سڑے ہوئے بے شمار پھولوں سے میں بیزاری محسوس کرنے لگی...... اور اچانک میں ہی میں بھاگ کھڑی ہوئی، بغیر اپنی منزل کی سمت متعین کئے........"
لڑکی نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولیں.......
"اور پھر میں تم سب سے آملی۔"
"ہاں ایسا ہوتا ہے۔ پیار وقتی ہوتا ہے۔ حقیقت نہیں۔ تم نے اچھا کیا۔"

بوڑھا دوبارہ آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا تھا۔
اب موٹی عورت نے اپنی آنکھیں موند لی تھیں اور
کوئی خوشنما بودا لمحہ اس کی آنکھوں میں کھلاتا جا رہا تھا۔
"مجھے بلند ہونے کا شوق تھا۔ اتنا بلند کہ کوئی
مجھے چھو بھی نہ سکے۔ اسی خیال کے تحت میں نے اپنے
گھر کی دیوار کو بلند کرنا شروع کر دیا۔ دیوار روز اونچی
اٹھتی گئی ...... دیوار کو عام گھروں کے مقابلہ میں بلند
ہوتا دیکھ کر مجھ میں برتری کا احساس بڑھتا جاتا۔ میں
سوچتی ...... کتنے حقیر ہیں یہ چھوٹے گھر والے اور میں کتنی
بلند، کتنی عظیم۔ اور پھر ــــ بے خیالی میں دیوار اتنی اونچی
اٹھ گئی کہ وہ مزید بلندی کو برداشت نہ کر سکی اور پھر میں اپنے
ہی بلندی کے ملبے تلے دب گئی۔ اور جب میری سانسیں
گھٹنے لگیں تو میں نے محسوس کیا کہ میں نے ایک کھوکھلی سی
عمارت کھڑی کر رہی تھی۔ اور پھر میرے قدم خود بخود انجان
منزلوں کی سمت حقیقت کی تلاش میں اٹھ گئے ......
اور میں سب سے آملی۔
"تمہاری کہانی تو بالکل ہماری ہی جیسی ہے۔"
بوڑھا آہستہ آہستہ بڑبڑایا اور پھر میری گہری سکوت
زدہ آنکھوں میں جھانکنے لگا جیسے کہہ رہا ہو ــــ شروع
کرو اب تمہاری باری ہے۔
میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں ......
"مجھے ہر کھلی سے محبت تھی۔ لیکن ایک دن جب
میں نے اس کھلے پن کی عریانی میں جھانکا تو محسوس ہوا
کہ ہر کھلی چیز زندگی کا جوہڑ ہوتی ہے۔ ہر کھلا ماحول گندگی
کا منبع ہوتا ہے۔ پھر مجھے خود سے لے کر ہر کھلی شے
سے نفرت ہو گئی۔ میں ہر شے کے کھلے پن میں عفونت کے
کالے میلے بدن کو محسوس کرتا۔ اور حقارت و نفرت سے
آنکھیں موند لیتا۔ اور ایک دن جب اس عفونت کے
گھناؤنے ہاتھوں نے مجھے کس لیا تو میں چھٹپٹا اٹھا
اور آناً فاناً وہاں سے بھاگ نکلا۔ مگر کھلی چیز سے فرار ممکن
کہاں ــ وہاں سے بھاگ کر کسی ویران مقام پر آ کر بھی میں
نے وہی محسوس کیا۔ جیسے چھوٹی بڑی بے شمار لکیروں
نے مل کر اس کھلے پن کو اور بھی زیادہ ننگا کر دیا ہو۔ میری
سانس گھٹنے لگی اور میں وہاں سے بے تحاشہ بھاگتا گیا ...
اور پھر ...... یہاں آ کر تم سے آملا۔"
اتنا کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔
بوڑھے کی دھنسی ہوئی سکڑی آنکھوں میں تھوڑی
سی ہلچل مچی ــــ "تمہاری کہانی ہماری کہانیوں سے
بس ذرا سی مختلف ہے، مگر بات وہی ہے۔ تم نے بھی
حقیقت سے آنکھیں موندیں اور بس بھاگتے رہے .."
بوڑھا خاموش ہو گیا تھا۔
اور ہم سب نے بھی اپنے اپنے ہونٹوں پر خاموشی
کی سیل رکھ لی تھی۔
آسمان کی وسعتوں سے جھانکتے ہوئے کالے سورج
نے اپنا پورا دہانہ کھول دیا تھا ــــ اور ہمارے قدم
گھوڑوں کے ٹاپوں کی طرح سڑک پر کراہ رہے تھے۔
اور پھر ــ اچانک ہی ہم سب ٹھہر گئے ــ اور
ہمارے قدم بے جان کاٹھ کی طرح اپنی جگہ پر بے حرکت
ہو گئے۔
عفریت نے اپنے کاندھے سکوڑ لیے تھے۔ نے
سامنے ایک عجیب سا عریاں شخص اپنے جسم کو اتار
کی سعی کر رہا تھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کے بڑھے ہوئے
ناخنوں سے اپنے جسم کے بھرے بھرے اعضاء کو نوچتا ہوا
دکھائی دے رہا تھا۔
"یہ کیا کر رہے ہو؟" ہم نے خوف و دہشت کے تند
جھونکوں میں جھلستے ہوئے کہا۔
اس آدمی نے پلٹ کر میری طرف دیکھا ــ اس کے
چہرہ پر بڑی عجیب و غریب لکیریں پڑی ہوئی تھیں۔ اس
کی آنکھیں ہماری ہی طرح دھنسی ہوئی اور ویران تھیں۔
اس کا پورا جسم لہولہان ہو رہا تھا۔ شاید وہ بہت
دیر سے اپنی چمڑی کو نوچنے میں مصروف رہا تھا۔
اس نے ہماری طرف دیکھا اور بے چینی کے جراثیم

دفعتاً ابل پڑے۔ ویران آنکھوں میں پھر کوئی سورج مردہ ہو گیا تھا۔

اس نے قدرے خفگی سے جواب دیا: "میں اپنے جسم کی کینچلی اتار رہا ہوں۔"

اور پھر وہ وہی پرانا عمل دہرانے لگا۔۔۔۔۔ سرسراتی ہوئی تند ہواؤں نے جسم پر جیسے تیزاب الٹ دیا تھا۔

کالا سورج اور بھی زیادہ بھیانک ہو گیا تھا۔

اور آناً فاناً اس نے اپنے جسم سے اپنی کھڑی الگ کر دی۔

وہ لمحہ بڑا جاں سوز تھا ——

اس کے اندر والا جسم بڑا گھناؤنا تھا۔ ہڈیاں شکستہ صورت میں پھیل گئی تھیں اور ہڈیوں سے نچے ہوئے زخم آلود گھاؤ کا مواد رس رس کر باہر ٹپک رہا تھا۔ اچانک وہ چکرا کر گرا۔ اور اس کی بے شمار چھوٹی بڑی ہڈیاں اچانک ہی ایک دوسرے سے جدا ہو کر زمین پر بکھر گئیں ——

"یہ کیا —— ؟"

ہمارے ہونٹوں پر نیلا سانپ رینگ گیا تھا۔۔۔
جسم کی کینچلی اتار کر یہ تو ہمیشہ کیلئے سو گیا۔

دہشت کے گھوڑوں نے ہمارے جسم میں دوڑنا شروع کر دیا تھا۔ مگر بوڑھے کے اندر خلاف معمول اطمینان سا بھرا تھا۔ اس نے بغل میں رکھا ہوا پڑا اٹھا لیا تھا۔ ہماری جھلسی ہوئی آنکھوں کی کھیتی میں جھانکتے ہوئے بولا:

"آؤ اس کی ہڈیوں کو اس پٹرے پر سجا لو۔ اور بس چلتے چلو، اس کی آخری آرام گاہ تک!"

ہم نے وہی کیا۔ ہڈیوں کو یکجا کیا اور پٹرے پر سجا دیا۔ جسم کی کینچلی اب تک زمین پر بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔

"اس کا کیا کیا جائے؟" جوان لڑکی نے استفہامیہ انداز سے بوڑھے کی طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں! اسے یہیں رہنے دو۔" بوڑھا بڑے اطمینان سے بولا۔ جو چیز اس نے خود اتار دی ہو اسے اس کے پہنچانے والے ہم کون ہوتے ہیں۔"

"ہاں ہم کون ہوتے ہیں۔"

ہم نے زیر لب اس جملے کو دہرایا۔ پیچھے سے پٹرے کو موٹی عورت اور جوان لڑکی نے تھام لیا تھا۔ آگے سے میں اور بوڑھا اسے سہارا دینے کے لئے کافی تھے۔ مگر ایک سوال اب بھی میری طرف دیکھ رہا تھا ——
وہ یہ شخص کون تھا اور اس کا کیا جائے؟

بوڑھے نے ہماری پریشانیوں کو پڑھا۔ پھر تلخی سے بولا۔

"چلتے چلو۔ اس سے ہمیں کوئی مطلب نہیں کہ یہ کون تھا۔ حقیقت بس اتنی ہی ہے کہ یہ مر گیا۔ اور منزل بھی یہی ہے۔"

تب اس لڑکی نے چیخ کر کہا: "پٹرا رکھ دو حقیقت صرف اتنی نہیں ہے کہ وہ مر گیا اور یہ بھی نہیں ہے کہ ہماری منزل چار کاندھوں پر ختم ہو جائے گی۔ ہمیں جواب چاہئے، ہمیں جواب دو!"

پھر میں نے پٹرا زمین پر رکھ دیا کہ جواب واقعی یہ نہیں ہے۔

"پھر آخر جواب کیا ہے؟" موٹی عورت نے ہلکان ہو کر پٹرا زمین پر رکھتے ہوئے دل میں سوچا۔

اس کے بعد؟ اس کے آگے کا جواب؟ بوڑھا پٹرا زمین پر رکھ کر مبہوت سا کھڑا ہو گیا تھا۔

"چلتے چلو، چلتے چلو" کوئی آواز بار بار پیچھے سے تعاقب کر رہی تھی۔

ہم سب نے ہراساں ہو کر ایک ساتھ پیچھے مڑ کر دیکھا۔

اس انجان شخص کے جسم کی کینچلی اب بھی زمین پر پڑی تھی اور اس میں اب خون کا کوئی قطرہ باقی نہیں رہا تھا۔

چلتے چلو چلتے چلو۔ جواب آگے ہے۔۔۔ بہت آگے۔۔۔ اور آگے۔۔۔ چلتے چلو چلتے چلو۔۔۔ کوئی آواز بار بار آگے بلا رہی تھی۔

ابن فرید

تجزیہ

زندگی کا سفر ہر شخص مختلف انداز سے شروع کرتا ہے لیکن انجام کار وہ ایک ایسی BOTTLE NECK پر پہنچ جاتا ہے کہ اس سے گزرنا اس کے لئے ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یہ تنگ دہانہ موت کا ہوتا ہے۔ جس کے ایک سرے پر کھڑے ہو کر دوسرے سرے کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ مسافر سوچتا ہے کہ جب اس کے آگے کچھ نہیں ہے تو یہی منتہا و منزل ہے۔ افسانہ کا مرکزی خیال یہی نکتہ ہے۔

زندگی جس طرح گزرتی ہے اس کی چار تمثالیں (IMAGES) ذکی نے اس افسانہ میں پیش کی ہیں۔ یہ زندگی کے سفر کی اس نوعیت کی سمتیں نہیں ہیں جیسی کہ زمانی سمتیں ہوتی ہیں، بلکہ انھیں اگر مختلف نہج پر قرار دیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ نہج تو اختیاری نہیں ہوتی لیکن اس کی خوبی و خرابی کا شعور ہر فرد کے اندر موجود ہوتا ہے ہر فرد چاہتا ہے کہ وہ حقیقت کو گرفت میں لائے تاکہ اسے زندگی بسر کرنے کا سیدھا سچا طریقہ ہاتھ آ سکے۔ لیکن حقیقت کیا ہے؟ کبھی عقلی گھوڑوں سے سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ چنانچہ وہ اسی تلاش میں اپنا محاسبہ کرنے لگتے ہیں۔ اپنے باطن کو ٹٹولنے لگتے ہیں کہ شاید اسی میں ہی کہیں حقیقت چھپی بیٹھی ہو۔

سب سے پہلے بڈھا اپنے ماضی کو بیان کرتا ہے۔ اس کا ماضی استحکام و استواری کا نمائندہ ہے۔ لیکن اگر یہ پائندگی اپنی ذات پر ہی قائم ہو تو ایک نہ ایک دن اپنے وجود کی نفی کے ساتھ فنا ہو جاتی ہے۔

دوسری راوی نوجوان لڑکی تھی جو زندگی کو جذباتی، حسی اور نفسانی لذتوں میں گذارنا چاہتی ہے۔ لیکن تیز رفتار وقت، جس کو اس کی گھڑی بھی گرفت میں نہیں لے سکتی تھی۔ ان کی خوشبوؤں کو باسی کر دیتا ہے۔ اور عارضی کیف وقتی حقیقت کو عریاں کر دیتا ہے۔

تیسری تمثال سیاہ پوش موٹی عورت پیش کرتی ہے بلندی و برتری کی، جو غیر متناسب اور بے توازن ہو، ایک انتہا کو پہونچ کر زوال کی طرف سرنگوں ہو جاتی ہے۔ فرد کی بلندی ضمیر کی پاس داری اور ذات کے اعتماد تک محدود ہوتی ہے۔ اس سے آگے جب وہ نکلنے کی کوشش کرتا ہے تو اپنی حدود سے باہر نکل جاتا ہے اور اس کی بلندی کی دیوار اس بلندی کے بوجھ کو برداشت نہیں کر پاتی۔

تجزیہ نئی نسلیں کا مستقل سلسلہ ہے۔ ہر شمارہ میں جو کہانی مجھے اپنی کسی خصوصیت کی بنا پر متوجہ کرے گی میں اس کا تجزیہ پیش کروں گا۔ اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ اس شمارہ کی سب سے اچھی کہانی ہو۔

(ابن فرید)

چوتھی سمت کی نشان دہی افسانہ نگار واحد متکلم کی حیثیت سے خود کرتا ہے۔ وہ کھلے پن کا شاکی ہے۔ وہی کھلا پن جو ایک عرصہ تک اسے عزیز رہا جب اس پر پوری طرح آشکار ہوا تو اس میں اسے گندگی کا جوہر نظر آیا۔ آزادہ روی، بے سمتی یا بے علائقی پہلے لبرزم معلوم ہوتی ہے۔ لیکن پھر جب چھوٹی بڑی بے شمار لکیریں مل کر اس کھلے پن کو کاٹنے لگتی ہیں تو یہ ایک ویران، اجاڑ، ریگستان بن جاتا ہے۔

لیکن ان سب تمثالوں میں ایک قدر مشترک ہے کہ یہ کہانیاں ایک دوسرے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ کیوں کہ ان کا باطن ایک دوسرے سے مختلف نہیں اس کی علامت وہ شخص بن جاتا ہے۔ جو ان کے سامنے آکر اپنے باطن پر سے اپنے خول (کینچلی) کو اتار دیتا ہے۔ اس کھال کے اندر سے جو کچھ نکلتا ہے وہ صرف ہڈیاں ہیں، مواد اور بدبو ہے۔ گویا وہ شخص صرف اپنے ظاہر کی وجہ سے زندہ تھا۔ اپنے باطن کی بنا پر نہیں۔

ایسے عالم میں اگر بوڑھا کہتا ہے کہ وہ سب خواہ کہیں سے چل کر آئیں، کسی راستہ سے ہو کر آئیں، ان کی آخری منزل موت ہے تو کیا غلط کہتا ہے۔

مگر یہ بات اس لڑکی کو مطمئن نہیں کر پاتی جو وقت کی تیز رفتاری سے مضطرب ہے۔ وہ کیسے مان لے کہ زندگی کی آخری منزل موت ہے۔ چنانچہ وہ ایک سوال بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

کیا موت کے بعد کچھ نہیں؟

یہ سوال اپنا جنازہ آپ اٹھانے والوں کو مبہوت کر دیتا ہے، اور وہ سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔

ان کا اپنا آپ پہلے انھیں موت کی طرف ڈھکیلتا ہے، لیکن جب لڑکی موت کو چیلنج کر دیتی ہے تو موت سے ماورا حقیقت انھیں اپنی طرف بلاتی ہے:

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر

لیکن ہم اس ماندگی کے بعد کہاں پہنچیں گے؟

اصلاً اس کا جواب زندگی بعد موت کا صالح مثبت شعور ہی دے سکتا ہے۔ اور یہی شعور انسان کو زندگی قبل از موت کی پراگندگی سے بھی محفوظ رکھ سکتا ہے۔

"سمتوں کا جواب" علامتی انداز میں بہت خوش اسلوبی کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ ذوقی جدید افسانہ کی نزاکتوں سے آگاہ ہیں اور اچھا افسانہ لکھنے کی اچھی صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ وہ ایمائیت کو ترجیح دیتے ہوئے بھی مہملیت کے قائل نہیں ہیں۔

"سمتوں کا جواب" مثبت صالح قدروں کا حامل ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک کامیاب فنی تجربہ بھی ہے۔

حفیظ میرٹھی

لہو سے اپنے زمین لالہ زار دیکھتے تھے
بہار دیکھنے والے بہار دیکھتے تھے
اٹھا جو حشر ستم گھر میں چھپ کے بیٹھ گئے
جو ہر صلیب کو مردانہ وار دیکھتے تھے
نہ دیجیے انھیں الزام قتل کا وہ تو
بس اک ذرا نئے خنجر کی دھار دیکھتے تھے
سرور ایک جھلک کا تمام عمر رہا
ہوس پرست تھے جو بار بار دیکھتے تھے
ملے تھے ملنے کو لیکن جدا جدا ہی رہے
سبب یہ ہے کہ سب اپنا وقار دیکھتے تھے
صبا نے لمس کا مرہم جو زخم گل پہ رکھا
تری طرف ترے سینہ فگار دیکھتے تھے
اگرچہ بستر آسودگی پہ تھے پھر بھی
وطن کے خواب غریب الدیار دیکھتے تھے
کسی کو درس قناعت حفیظ کیا دیتے
خود اپنے گرد ہوس کا حصار دیکھتے تھے

شہریار

کتنا باقی ہے سفر اہل جنوں کا دیکھو
دشت تو ختم ہوا شہر کا نقشا دیکھو

میرے ہمراہ ابھی تک مری پرچھائیں ہے
تم نے چاہا تو بہت مجھ کو اکیلا دیکھو

کتنی تبدیل ہوئی کس لئے تبدیل ہوئی
جاننا چاہو تو ان آنکھوں سے دنیا دیکھو

خواب ہی جب نہیں آنکھوں میں تمہارے کوئی
مجھ کو کیا روشنی دیکھو کہ اندھیرا دیکھو

یہ نہیں ہوگا مگر ہے یہی حسرت دل میں
ایسا کچھ ہو کہ کبھی تم مرا رستا دیکھو

عرفان صدیقی

دروازوں پر دن بھر کی تھکن تحریر ہوئی
مرے شہر کی شب ہر چوکھٹ کی زنجیر ہوئی

سب دھوپ اتر گئی ٹوٹی ہوئی دیواروں سے
مگر ایک کرن میرے خوابوں میں اسیر ہوئی

مرا سُونا گھر مرے سینے سے لگ کر روتا ہے
مرے بھائی تمہیں اس بار بہت تاخیر ہوئی

اس درد کا قاتل منظر کو الزام نہ دو
یہ تو دیکھنے والی آنکھوں کی تقصیر ہوئی

تمہیں رنج بہت تھا دشت کی بے امکانی کا
لو، غیب سے پھر اک شکل ظہور پذیر ہوئی

وہی خاک مرے صدیوں کے سفر کا حاصل تھی
وہی خاک لہو میں مل کر مرا خمیر ہوئی

کہیں لشکر سے کوئی بہتا پانی رکتا ہے
کبھی جوئے رواں کسی ظالم کی جاگیر ہوئی

کوئی حیرت میرے لہجے کی پہچان بنی
کوئی چاہت میرے لفظوں کی تاثیر ہوئی

پھر لوح پہ لٹنے والے خزانے لکھے گئے
مجھے اب کے برس بھی دولتِ جاں تقدیر ہوئی

نسیم صدیقی

دل میں نہ اضطراب نہ آنکھوں میں انقلاب
عمریں گذر گئی ہیں فقط دیکھنے میں خواب

پھر آسمانِ فکر پہ ابھرے ہیں کچھ پرند
پر تولتا ہے پھر مرے اندر کوئی عقاب

دریائے پرسکوں کا کلیجہ دہل گیا
ہلکی سی ایک موج اٹھی یوں تو زیرِ آب

ہم کر گئے جو کرنا ہوا کھیل کھیل میں
سب سوچتے رہے کہ گنہ کیا ہے کیا ثواب

جوہر شناس ہونے کا دعویٰ نہیں نسیم
لیکن یہ جانتے ہیں گہر کیا ہے کیا حباب

اب کے ایسی یک رنگی ایسی ویرانی ہے
خشکی ہی خشکی ہے یا پانی ہی پانی ہے

میں مصلوب صداؤں کا زندہ سوداگر ہوں
ہر آواز یہاں میری جانی پہچانی ہے

ہوں اپنی ہی سوچوں کے صحرا میں گم گشتہ
میرے قصہ میں وہ بے سازو سامانی ہے

خوابوں کی کشتی کیسے ساحل تک پہنچے گی
تعبیروں کی ندی ہر لمحہ طوفانی ہے

برگد کے سائے میں بیٹھیں یا چھانیں صحرا
جیسے تیسے ہم کو جب یہ عمر گنوانی ہے

پل دو پل زندہ لمحوں کے سائے میں جی لیں
لوگوں سے سنتے آئے ہیں دنیا فانی ہے

فضا ابن فیضی

اسیرِ سلسلۂ فرد و ذات، سب کے سب
مگر ہیں اپنی جگہ کائنات، سب کے سب

نہاد ذرہ ہیں اور دعویٰ انا اتنا
کہ جیسے ہوں قدحِ شش جہات سب کے سب

ہوں میں ہی ایک یہاں پر کھلے ورق کی طرح
مرے سوا ہیں رموز و نکات سب کے سب

کسی کے پاس نہیں کوئی بات کہنے کی
اُچک لیں منہ کی ہمارے ہی بات سب کے سب

کھلی زباں، تو ہوا تلخ ذائقہ سارا
لگے تھے مجھ کو نبیذ و نبات سب کے سب

حصارِ تیرہ شبی سے نکل سکا نہ کوئی
چراغ بن کے جلے رات رات سب کے سب

پڑا ہے کیسے حریفوں سے واسطہ اپنا
ہیں ڈال ڈال جو ہم پات پات سب کے سب

مرے علاوہ کسی کی ہوئی نہ شنوائی!
کھڑے تھے لے کے وہاں اپنی بات سب کے سب

یہ دوسروں کے اسالیب کے مقلد ہیں!
کہو جو کچھ، تو اٹھا دیں گے ہات سب کے سب

روائتیں ہوں ادب کی، کہ تجربے فن کے!
فضا ہیں میرے قلم کی زکات سب کے سب

بساطِ دانش و حرف و ہنر کہاں کھولیں
یہ سوچتے ہیں، لبِ معتبر کہاں کھولیں

پڑاؤ ڈالیں کہاں، راستے میں شام ہوئی
بھنور ہیں سامنے، رختِ سفر کہاں کھولیں

یہاں شعور کے ناخن تو ہم بھی رکھتے ہیں
مگر یہ عقدۂ فکر و نظر کہاں کھولیں

عجب حصار ہیں سب اپنے گرد کھینچے ہوئے
وجود کی وہی دیوار، در کہاں کھولیں

نہ اس کے ساتھ ہمارا بھی مول ہونے لگے
ہیں کشمکش میں کہ رختِ گہر کہاں کھولیں

ہوا ہے تیز، نہ اس کے ورق اڑا لے جائے
صحیفۂ نفسِ مختصر کہاں کھولیں

کوئی فضا تو ملے ہم کو قابلِ پرواز
اب ان حدوں میں بھلا بال و پر کہاں کھولیں

شاکر تسلیم
(میرٹھ)

کر گیا ہر راز فاش
ان لبوں کا ارتعاش
ہائے پھر لو دے اٹھی!
میرے دل کی ہر خراش
سب سے امید کرم!
ساری دنیا سے نراش
گفتگوئے دوستاں
اور اتنی دل خراش
کل تھی ان کی جستجو
آج ہے اپنی تلاش
وقت کے ہاتھوں میں ہیں
کس قدر رنگیں تاش
وادیٔ کربل میں ہے!
اب ہماری بود و باش
اب حدودِ عشق میں!
جرم ہے فکرِ معاش
کب تک اے شاکر پھروں
خود اٹھائے اپنی لاش

ہائے یا یہی معراجِ کمال
ساری دنیا رو بہ زوال
رکھتے ہیں ہر دور میں ہم
ایک عقیدہ ایک خیال
تیری جفا کے لاکھ ثبوت
میری وفا کی کوئی مثال؟
کر گئی ایک نگاہِ لطف
درد سے دل کو مالا مال
دیکھ نہ کر پیمانِ وفا
پاؤں میں یہ زنجیر نہ ڈال
اب یہ تکلف کیوں شاکر
سورج ڈوبا جام اچھال

ڈاکٹر جمال نقوی
(ٹورنٹو۔ کناڈا)

سانس میں ہر کرب گھُلا ہو جیسے
دل کا ہر زخم کھِلا ہو جیسے
شہر ویران ہوا جاتا ہے
زندگی ایک بلا ہو جیسے
رہ گزر خوں سے دُھلے گی اب کے
ہر کوئی آبلہ پا ہو جیسے
تشنگی میں ہے یہ شدت کیسی
جام میں زہر ملا ہو جیسے
سوئے مقتل ہی اٹھے میرے قدم
میرے غم کی یہ دوا ہو جیسے

محمد حفظ الکبیر قریشی
(ٹورنٹو۔ کناڈا)

ملنا ہے تو مل آؤ کسی پیرِ مغاں سے
کھو آؤ گے دل مل کے کسی قاتلِ جاں سے
اک پنجۂ خونیں کہ مسلّط بہ گلو ہے
محفوظ نہیں کوئی یہاں ان کی اماں سے
برسات میں دیکھی تو ہے سبزہ کی طراوت
چھوٹا ہے کہاں رنگِ حنا پائے خزاں سے
اک مرحلہ بھی شوق کا طے کر نہ سکو گے
پہنچو گے وہیں پہ کہ چلے تم تھے جہاں سے
راضی کسی صورت بھی نہیں ہوتا ہے ظالم
دل سنگ کا رکھتا ہے تو در دآئے کہاں سے
ملنا نہ گلے اس سے کہ ہے رشتۂ قاطع
جاؤ گے یونہی دیکھنا تم رشتۂ جاں سے
بس ڈرتے رہو زلفِ گرہ گیر کے خم سے
خوشبو وہیں ملتے یہ لپٹ جائیں گے جاں سے
ہے راز اگر کوئی تو ظاہر نہیں اب تک
واقف نہ ہوئے ہم تو کسی سرِّ نہاں سے
رہنے دو اٹھاؤ نہ بس راز سے پردے
جاؤ بھی خدا کے لئے اب جاؤ یہاں سے

اقبال منہاس
(صفا۔ شمالی یمن)

ہر لحظہ تازہ رنج مری گھات میں نہ تھے
یہ دشمنی کے طور تو حالات میں نہ تھے
جب تھے تو اس کے خواب بھی تھے ہم سے مستعار
اور جب نہ تھے تو اس کی کسی بات میں نہ تھے
ہم دیکھتے رہے ہوں کوئی فلم جس طرح
ایسے عجیب رنگ خیالات میں نہ تھے
خود اپنے ہی وجود کی ہیبت میں چپ رہے
دشمن ہمارے ساتھ میں بہتات میں نہ تھے
اس شہر زر میں دل کے نگیں کو لئے پھرے
سوداگری کے داؤں مگر بات میں نہ تھے
آرے چلیں تو ہونٹوں سے اف بھی نہ کر سکیں
ہم آدمی تھے گنگ، نباتات میں نہ تھے
اقبال دل لگا تھا کہ تقدیر سو گئی
یہ حادثے، یہ غم، مرے دن رات میں نہ تھے

اشفاق حسین
(ٹورنٹو، کناڈا)

اپنی آنکھ سے ساحل چھوکر روتا ہے
مٹی کی حالت پہ سمندر روتا ہے
جانے کیا گزری ہے ہوا کے جھونکوں پر
آج تو شہر کا ہر اک منظر روتا ہے
شام ڈھلے یا چاند کھلے، یا بارش ہو
ایسے موقعوں پر وہ اکثر روتا ہے
چاہے ہونٹوں پر ہو تبسم کتنا ہی
دل روئے تو آنکھ کا ساگر روتا ہے
یوں روئیں ہم مل کر، جیسے جبس کے بعد
موسم اپنی پیاس بجھا کر روتا ہے
پھینک کے پتھر اس جانب، اس سوچ میں ہوں
شیشہ ٹوٹ گیا یا پتھر روتا ہے
وہ جو بہت ہنستا ہے تمہاری محفل میں
وہ بھی اپنی ذات کے اندر روتا ہے

مہدی بدایونی

فکر کچھ گلشن کی تھی یارو نہ ویرانے کی تھی
سوچئے، تو زندگی دراصل دیوانے کی تھی
آج خاطر میں نہ لا ساقی، یہ کل کی بات ہے
آبرو ہم میکشوں سے تیرے میخانے کی تھی
جس کو سن کر آج تک افسردہ خاطر آپ ہیں
وہ بھی اک ہلکی سی سرخی میرے افسانے کی تھی
وہ تو کہئے کھا چکے ہیں بادہ نوشی کی قسم
ورنہ تو اے فکرِ دنیا ایک پیمانے کی تھی
ڈھونڈتی پھرتی تھی تجھ کو ایک وحشی کی طرح
غالباً وہ خاک مہدی میرے کاشانے کی تھی

نسیم رزاق بدایونی

(توصیف تبسم کی نذر)

آئے گی وہ رُت برفانی یاد رکھ
جم جائے گا آنکھ کا پانی یاد رکھ
دیوار و در سے آنگن میں اترے گی
ختم نہ ہوگی یہ ویرانی یاد رکھ
جلتا سورج، تیز ہوا، سوکھے پتے
اس رُت کی ہر ایک نشانی یاد رکھ
عکس نہ دھندلا جائے کوئی بچپن کا
ہر قصہ ہر ایک کہانی یاد رکھ
رنگ، دھنک، سب موسم خوشبو سایہ بھی
کوئی نہیں ہے اس کا ثانی یاد رکھ

ڈاکٹر قاضی عبدالستار

آدھا درخت

دگانواں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے دو کمانوں دیو پیکر
کمانوں کی طرح بسی ہوئی دو بستیوں پر پھیلا ہوا بڑا سا گانوں
تھا اور دونوں بستیوں کے درمیان دو تیروں کا فاصلہ تھا اور
ان کے آدھے رستے پر آم کا ایک چھتنار درخت دور دور تک
باہیں پھیلائے کھڑا تھا۔ آدمی بھر اونچا تنا اتنا بھاری بھرکم
تھا کہ دو لمبے چوڑے آدمی مشکل ہی سے اپنی باہوں میں سمیٹ
سکتے تھے۔ اور اس کے چاروں طرف درجنوں چھوٹی بڑی اونچی
نیچی موٹی پتلی شاخیں تھیں جیسے اللہ میاں نے اپنے ہاتھ سے
دونوں بستیوں کے لڑکوں کے جھولا جھولنے کیلئے بنائی ہوں
جب بور آتا تو دونوں بستیوں کے دور پار کے مکانوں کی چھتوں
پر خوشبو کے شامیانے تن جاتے اور جب پھل آتا تو دونوں
بستیوں کے دونوں زمیندار بھائیوں کے شیطان کی آنت
کی طرح پھیلے ہوئے دوہرے دالانوں میں ہرے پیلے آموں
کی جا زمیں بچھ جاتیں۔ چھپروں کی چھتوں اور ٹھیکروں کے دیوارں
والے مکانوں میں بسنے والے زندہ مٹی کے ٹوٹے پھوٹے آدمی
جو آم کے چھلکوں کو ترس رہے ہوتے "کھاسے" کے آم پر نہال
ہو جاتے سیر ہو جاتے۔ مشہور تھا یہ آم کا درخت جس کا نام
خامہ تھا اور بول چال کے چاک پر چڑھ کر کھاسہ ہو گیا تھا
خودرو تھا۔ دگانواں کے آباد کرنے والے دونوں بھائی
آم کے رنگ و روپ ڈیل ڈول خوشبو اور چاشنی پر ایسا ریجھے
کہ سیتاپور میں گھر کے اپنے محلے دو محلے چھوڑ کر اسی پیڑ کے
دہنے بائیں کٹھار بنوا کر رہ پڑے تھے اور پھر دھیرے دھیرے
ان کا عملہ ان کی چھاؤں میں رہنے بسنے کو آپڑا تھا اور دگانواں
آباد ہو گیا تھا۔ دونوں بھائیوں نے خاصے کی گٹھلیاں بوئیں
اور قلمیں لگائیں لیکن ہزار جتن کے باوجود کسی ایک درخت کے پھل
کو نہ خاصے کا ڈیل ڈول ملا نہ رنگ روپ اور نہ اس کا مزہ نصیب
ہوا تھک ہار کر دونوں نے اسی ایک کے پھلوں پر تکیہ کر لیا جب
فصل خراب ہوتی اور پورے باغ کے باغ دس دس پندرہ پندرہ
ہزار پھل دے کر کھکھ ہو جاتے تب بھی اکیلا خاصہ پچیس تیس
ہزار آم دے مرتا اور جب دوسرے باغ گوندنی کی طرح پھلے
ہوتے تو خاصے کی شاخیں پھلوں کے بوجھ سے جھکتے جھکتے زمین
تک آجاتیں رہ جاتیں دھنس جاتیں ٹوٹ جاتیں۔ جب پہلی بار
آم ٹوٹتا اور پال رکھا جاتا اور تیار ہو جاتا تو چاہے ایک ہی دانہ
حصہ میں پڑے لیکن گانوں بھر کے ایک ایک آدمی کو نام بنام حصہ
ملتا اور وہ دل کے بڑے نیت کے سچے اور جیب کے کھوٹے آدمی
ایک ایک آدھی پھانک تبرک پرساد کی طرح ہاتھ چوم کر کھا
لیتے اور سینہ پھلا کر خوش ہو لیتے کہ ان کے آم کا جواب ملیح آباد کے
پاس نہیں ہے کہ خوشی چاندی کے درخت پر ہی نہیں پھلتی اسا
می کی شاخ پر بھی پھولتی ہے۔ اور تھا بھی کچھ ایسا ہی، بڑے بھیا
بھیا ہوں یا چھوٹے بھیا دونوں کی دوستی چاہے افسروں،
اہلکاروں میں ہو یا عزیزوں رشتہ داروں میں خاصے ہی کے بدولت
تھی۔ کلکٹر ہو یا کپتان گرداور ہو یا تحصیلدار جو ایک بار خاصے کا مزہ
چکھ لیتا دوسری بار چکھنے کا انتظار کرتا اور جب ڈال نہ پہنچی یا
حصہ نہ ملتا تو کسی نہ کسی حصہ پانے سے مانگ کر منہ میٹھا اور
منہ تازہ کر لیتا۔ خاصے کی ایک خاصیت یہ بھی تھی کہ چاہو تو
انگلیوں سے ملائم کر کے شہد کی مکھی کی طرح چوس لو اور چاہو تو

چاقو سے برفی کے قتلے کاٹ کر کھالو۔ تیار آم تین تین دن رکھا
رہتا۔ سڑ جاتا سوکھ جاتا لیکن رس چھلکا توڑ کر باہر نہ نکل
پاتا۔ ادھر بور آیا اور ادھر دونوں بھیا اپنا اپنا حق جتلانے لیے
اپنے سپاہیوں کے ساتھ آکے معائنہ کیا اور ایک ایک دو دو
تنہ چھوٹ اور جوان ہاد سپاہیوں کو ٹوپی دار بندوقیں دے کر
پہرہ کھڑا کر دیا۔ ایسے تو خاصے کے نیچے بچھی ہوئی زمین پر کبڈی
گلی گوی اور کبڑی کھیلنے والی چھٹھاں دن دن بھر میچ کھیلتیں
باراتیں چڑھتیں اور اترتیں۔ میلاد شریف پڑھا جاتا اور کیرتن
ہوتا لیکن کیریوں کے سر نکالتے ہی لاٹھیاں تن جاتیں کمانیں کھنچ
جاتیں اور بندوقیں بھر جاتیں۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ خاصے کا پیر چھائیں
داب سکے۔

خاصے کے پھلوں کی طرح پکی رسیلی میٹھی مہکتی زندگی
کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی راستہ پر چل رہی تھی کہ پاکستان
بن گیا اور اس کے بن جانے کی اطلاع پاتے ہی چھوٹے بھیا
کچھ کھوئے کھوئے سے رہنے لگے کر ہر روز باندھے خاصے کے
نیچے گھنٹوں ٹہلتے رہتے سوچتے رہتے اپنا آپا جلائے رہتے۔
پھر اچانک ایک دن وہ بڑے بھیا کے دیوان خانے میں
دندناتے گھس گئے بڑے بھیا کسی مصاحب کے ساتھ شطرنج
بچھائے بیٹھے تھے۔ چھوٹے بھیا کو نگاہ بھر کر دیکھا تو چہرہ
عجیب تھا اور آنکھیں عجیب تر لبادہ لپیٹ کر اٹھے اور چھوٹے بھیا
کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور چھوٹے بھیا نے جیسے اپنے ہی موت
کی سنا دی۔

میں پاکستان جا رہا ہوں آپ سے صرف ایک بات کہنے آیا
ہوں ایک وصیت کرنے آیا ہوں اور وہ یہ کہ سال بسال پوری
ایمان داری کے ساتھ میرا حصہ بھیجتے رہئے اور اس کے بدلے میں
وہ سب کچھ آپ کا ہے جو میں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔

"چھوٹے"

"بھیا میں فیصلہ کر چکا ہوں مشورہ مانگنے نہیں آیا ہوں
وعدہ لینے آیا ہوں رخصت مانگنے آیا ہوں۔"

"چھوٹے جب ابا مرے ہیں تو تم چار برس کے تھے۔"

"اور ہاں آپ نے مجھے پالا ہے۔"

"لیکن چھوٹے بھائی سے بڑا دوست
اور بھائی سے بڑا دشمن نہیں ہوتا، زمیندار سے بڑا یار اور زمیندار
سے بڑا غدار نہیں ہوتا۔"

"جانتا ہوں .... لیکن آپ صرف زمیندار بھائی
نہیں میرے باپ بھی ہیں۔"

اور چھوٹے بھیا کی آواز بھر آگئی اور کانوں میں آندھیاں
چلنے لگیں اور وہ اپنے پیٹھ پر اپنے شانوں پر اپنے گالوں پر برسوں
کے بعد مدتوں کے بعد اپنے بڑے بھائی کے بوڑھے مضبوط
اور شفیق ہاتھوں کی تھپک محسوس کرتے رہے۔

چھوٹے بھیا کے پاکستان سدھارنے کے بعد جو فصل آئی
وہ پوری نہیں ہوائی تھی۔ کئی مرتبہ پھل توڑے گئے اور ہر بار کئی
کئی ڈالان پٹ گئے۔ ڈالیوں کی لین ڈوری لگی تھی۔ تحفوں کی
ریل پیل تھی۔ آدھی پیچھے جو حصے لگے وہ بھی بھاری تھے لیکن
چھوٹے بھیا...... اور اس نام کے ساتھ چمک اٹھتے بھڑک
جاتے تنہائی ہوتے ہی اپنے سے جو جھنے لگتے۔ آدھی آدھی
رات کو بستر سے اٹھ بیٹھتے۔ چوروں کی طرح اپنا اصطبل کھولتے
گھوڑا پسند کرتے زین رکھتے اور نہر کی پٹڑی پر پہنچتے ہی
ہوا سے باتیں کرنے لگتے۔ جب دونوں پسینے سے شرابور ہو
جاتے تو چپ چاپ واپس آجاتے راس پکڑے ہوئے چلے
آتے کتنا جتن کرتے لیکن وہ اپنے آپ سے بھاگ نہیں پاتے۔
بس اتنا ہوتا کہ نڈھال ہو کر رہ جاتے۔

آم کی فصل ختم ہوتے ہی جیسے چھوٹے بھیا کا آسیب اتر گیا
اور وہ کچھ نارمل ہونے لگے تھے کہ حویلی میں آگ لگ گئی اور بور
کی مست مست خوشبو ان کا پیچھا کرنے لگتی اور پھر وہ سوچنے لگتے
داد پڑتے ہی شطرنج کی بازیاں بڑھنے لگیں اکبریاں بڑھنے لگیں
اور مجرے لمبے ہونے لگے۔

اس رات جب وہ سیتاپور میں جھمکڑا دیکھ رہے تھے اور
ان کی کانوں سے اپنی سماعت کے ریشے ریشے میں چراغ جلا رہے
تھے کہ ایک جھماکا ہوا ایک تڑاکا ہوا اور جیسے کانوں کے
پردے پھٹ گئے جیسے کہیں کہیں قریب میں بجلی گری ہو سب
سہمے پڑے تھے اپنی جان کی خیر منا رہے تھے۔ صبح ہوتے

خمرا آئی کہ خاصے پر بجلی گر پڑی۔ بڑے بھیّا کو ایسا لگا جیسے بجلی
خاصے پر نہیں انہیں پر گر پڑی وہ دیر تک اپنے ہاتھوں میں
سر پکڑے دم بخود بیٹھے رہے۔ پھر ایک ایک کرکے اپنے ہاتھوں
پیروں کا ملبہ اٹھایا اور رینگتے کڑھتے خاصے کے نیچے آئے آدھا
درخت ڈھا پڑا تھا جلا پڑا تھا۔ جیسے بجلی کے چاقو نے سوت
سوت ناپ کر چھوٹے بھیّا کے حصہ کا خاصہ جلا دیا ہو۔ بڑے
بھیّا گھنٹوں پہروں اداس رہے پھر جیسے کسی نے ان کے
کانوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے اور کہا کہ بجلی تو گرنا ہی تھی
چھوٹے بھیّا ہوتے تب بھی گرتی ہاں اگر چھوٹے بھیّا ہوتے
تو اس بچے ہوئے آدھے خاصے کا آدھا خاصہ حصہ میں آتا چھوٹے
بھیّا کے نہ ہونے سے کم از کم اتنا فائدہ تو ہے کہ پورے خاصہ کا
آدھا اور بچا کھچا خاصہ پورے کا پورا تمہارا ہے اور چہرے کی ٹوٹی
پھوٹی منڈیروں پر مٹی کے چھوٹے سے چراغ کی ہلکی ہلکی روشنی
سی پھیل گئی۔

شام ہوتے ہی باہری صحن میں چھڑکاؤ کیا گیا۔ گول چبوترے
پر کرسیاں لگائی گئیں بیچ کی جہازی کرسی کے چپو کی طرح
پھیلے ہوئے بازو کے پاس پیچوان رکھا گیا اور جب چلم سلگ
گئی اور اس کی خوشبو سے فضا معطر ہونے لگی تو بڑے بھیّا
جو اب صرف بھیّا کہلائے جاتے تھے برآمد ہوئے کرسی پر
آدھے بیٹھ کر آدھے لیٹ کر آہستہ آہستہ حقہ کے دو ایک گھونٹ
لئے تھے کہ ایک سپاہی نے اشوک کے پتوں کے دونے میں
موسم کا ٹپکا ہوا پہلا پھل جسے گاؤں والے "سیپ" کہتے
ہیں پیش کیا بڑے بھیّا نے مسکرا کر اسے سونگھا اور بچوں کی
طرح بے چینی سے اس کا ڈنٹھل کا توڑا۔ تھرتھراتی انگلیوں سے ملائم
کیا چربی نکالی کسی ملازم نے دھونے کیلئے چلمچی سے گلاس
پیش کیا لیکن انہوں نے اشارے سے ہٹا دیا اور دانت پر دانت
گڑو دیئے۔ اسکا ایک قطرہ چوس لیا پانی کا ایک گلاس پیا ڈکار
لی تو خاصے کی خوشبو خمیرے کی خوشبو پر سوار ہو گئی۔ ہاتھ دھو کے
پیچوان ہٹا دیا اور خاصے کے نیچے آکر کھڑے ہو گئے تعداد
کا تخمینہ کرنے لگے حصے بخرے ہونے لگے ابھی وہ کپتان پلس
تک پہنچے تھے کہ ایک بوڑھے پشتینی سپاہی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"مالک..... چھوٹے بھیّا کے آگے کا چلن تھا کہ پہلا آم
دونوں بھائی بانٹ کر کھاتے تھے تُل آج آپ نے"
"چپ رہو......... چھوٹے بھیّا..... چھوٹے بھیّا
..... ہر وقت چھوٹے بھیّا..... پرمٹ بنوا لے اور چلا
جا پاکستان بڑا آیا وہاں کا.......... ہنھ"
وہ سب ایک دوسرے کو چور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے
دکھی دکھی دل اور تھکے پیروں سے چپ چاپ چلے گئے
رات ہی کو حکم پہنچا کہ آم توڑ لئے جائیں۔ صبح ہوتے ہی
جالیس تن گئیں آدمی کھونچے اور تھیلیاں لے کر درخت
پر چڑھ گئے اور اتنی احتیاط سے پھل توڑے جانے لگے جیسے
وہ پھل نہیں شہد کے آبگینے ہوں۔ پوری فصل میں پانچ
یا سات آم توڑ لئے گئے ایک ایک دانے پر ایک ایک آدمی کا
پہرہ لگا دیا گیا لیکن تعداد پورے بارہ ہزار بھی نہ پہنچی۔ چوپالوں
سے آنگنوں تک اور کھیتوں سے کھلیانوں تک صرف ایک
ذکر تھا کہ خاصے کی فصل کو نیت مار گئی۔ ہاں جیسن لو کا مارا
تو بچ جائے پالے کا مارا تو بچ جائے مگر نیت کے مارے کا
کوئی منتر نائن ہے" اگلے سال اس سے اگلے سال بھی خاصے
میں فصل آتی رہی لیکن دس بارہ ہزار کی ڈھیا سے آگے
نہ بڑھی۔

پھر ایک لفافہ آیا جس کے ٹکٹ پر جناح کی تصویر بنی
تھی بڑے بھیّا نے کھولا تو سوچ میں پڑ گئے۔ چھوٹے بھیّا
آ رہے تھے۔ اور وہ آگئے۔ جب ان کی سواری خاصے کے قریب
پہنچی تو پھاند پڑے اور اسے اسطرح دیکھنے لگے جیسے وہ
اپنے آپ کو دیکھ رہے ہوں جن کے آدھے دھڑ پر فالج
گر پڑا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ بڑھے اس کی شاخوں سے لپٹ
گئے تنے سے چمٹ گئے ان کا جی چاہتا تھا کہ ایک ایک شاخ
کو نہیں ایک ایک پتے کو اپنے آنسوؤں سے سینچ دیں اپنے
خون سے نہلا دیں لیکن آنسوؤں کی دونوں پوٹلیاں برسوں
کے ہجرت کی آگ میں مدتوں پہلے سوکھ چکی تھیں اب آنکھیں
کہاں تھیں دو خالی سیپیاں تھیں جن میں دو بلب لگے تھے اور
جو صرف ضرورتاً بھر دیکھنے کی خدمت انجام دیتی تھیں۔

ن کی آنکھیں نہیں رہ گئی تھیں۔ وہ خاصے بہا کے
نہائے وہیں فرش بچھا وہیں کھانا کھایا۔ وہیں لوگوں
سے ملے۔ ان کے سکھ سنے اپنے دکھ سنائے اور جب آسمان
پر سرخ آندھی کی ہراول دھاریاں گہری ہونے لگیں
بڑے بھیا اور ان کی بیوی اور ان کے بچے بڑی لجاجت
سے گھر چلنے پر اصرار کرنے لگے تو وہ اسطرح چلے جیسے
قبرستان فاتحہ پڑھنے جا رہے ہوں۔ رات آندھی آئی اور
قیامت کی آئی۔ چھپروں کی ٹوپیاں انگلیش ٹٹیوں کی دیواریں
گر گئیں آم بیٹھ گئے۔ شاخیں جھول گئیں اور جو کچھ نہ
ہونا تھا وہ ہو گیا یعنی خاصہ آدھا خاصہ بچا کھچا خاصہ
جڑ سے اکھڑا پڑا تھا۔ جتنی شاخیں اوپر تھیں اتنی ہی جڑیں
زمین سے نکل پڑی تھیں۔ آموں کے بجائے شاخوں کی
سیکڑوں آنکھوں میں ہزاروں آنسو تھرلئے ہوئے ہرے
آنسو چمک رہے تھے۔ اور چھوٹے بھیا کے چہرے پر عجیب
سا رنگ تھا عجیب سا نور تھا عجیب سا عالم تھا۔ وہ خوش
نہیں تھے وہ رنجیدہ نہیں تھے۔ وہ کچھ بھی نہیں لیکن
اس کے باوجود کچھ کچھ مطمئن سے لگ رہے تھے ایک
بوڑھے ملازم نے ان کے پاس آکر کہا،
چھوٹے بھیا ..... بہو کا بھوا
چھوٹے بھیا ہلکے سے مسکرائے جیسے دھیرے سے
رو دئے ہوں اور گردن ہلاتے رہے پھر چپکے سے بولے
"اس بیٹے سے جس کا باپ کھو گیا ہو وہ بیٹا خوش نصیب
ہوتا ہے جو اپنے باپ کو مٹی دے سکے۔"

بقیہ ذرا ٹھہر جاؤ

میں ایسی کشش اور توانائی پیدا کی؟"
"ہاں اب مجھے یاد آیا۔ میری دادی صبح ہی صبح فجر کی نماز کے
بعد تلاوت قرآن مجید کے بعد میرے چہرے پر پھونکتیں پھر چڑیوں کے
لئے کچھ دعائیں کرتیں، اس کے بعد چڑیوں کی کنڈیلی صاف
کر کے اس میں ان کے لئے تازہ پانی رکھتیں، اس کے بعد بیگی
روٹی کے ٹکڑے انھیں ڈالتیں"۔
"کیا وہ دعا تمہیں یاد ہے؟"
"نہیں یورپ میں رہ کر میں سب کچھ بھول گیا صرف ایک آواز
رہ گئی ہے جو میرے اندر کبھی کبھی چیختی ہوئی محسوس ہوتی ہے
جیسے وہ کسی کو بلا رہی ہو۔"

ابوالخطیب
(لندن)

ذرا ٹھہر جاؤ

لندن یورپ کی جنتوں میں سے ایک دل پسند جنت ہے یہاں میں ۱۸ سال سے رہ رہا ہوں۔ اس جنت میں وہ سب کچھ ہے جس کی توقع کی جاسکتی ہے۔ یہاں عبادت اور ریاضت اور دعاؤں کی کسے فرصت ہے کیونکہ یہاں ساری ہی چیزیں انسانی کوشش دکاوش سے حاصل کی جاسکتی ہیں میں یہاں بڑی آرزوئیں اور تمنائیں لے کر آیا تھا۔ ان آرزوؤں اور تمناؤں نے میرا بڑا ساتھ دیا۔ یہ اور بات ہے کہ وقت اور حالات بھی میرے مددگار رہے۔ میں جب بچوں کے سرکاری اسکول میں جغرافیہ کا ٹیچر مقرر ہوا تو اس کے طفیل ایک مکان خریدا اس کے بیٹے اچھا کرایہ دینے والا ایک عرب طالب علم کرایہ دار مل گیا کار آئی، بنک بیلینس (BANK-BALANCE) پھل دار پیڑ کی طرح بڑھنے لگا۔ جب ان چیزوں سے فراغت اور حیثیت پائی تو پھر ان کی وجہ سے ایک مذہبی انجمن خدام ملت کی صدارت بھی پھر ڈاڑھی رکھنے کا بھی اہتمام کرنا پڑا کیونکہ یہ موجودہ حیثیت کا مطالبہ تھا۔ اس مذہبی انجمن کی صدارت کی وجہ سے اپنی ذات میں تھوڑا سا اعتماد پیدا ہوا لیکن ایمان کی بات کہہ دوں تو اعتماد سے کہیں زیادہ عزدیاد و تمکنت۔ ہر وقت یہی سودا سوار رہتا یا یوں سمجھئے جی چاہتا کہ لوگ میرے سامنے جھکیں۔ جن کو مجھ سے غرض ہے وہ میری خوشامد کریں۔ جلسوں میں قرآن مجید کی آیات کی تلاوت ہوتی ابتدا میں ان آیات کے مفہوم پر توجہ رہی جس سے قلب و ذہن پر اثر ہوتا — لیکن جب ان مقدس آیات کی تلاوت جلسے کا ایک معمول بن گئی تو ان کے مفہوم کی خوشبو میری توجہ سے محروم ہو کر معدوم ہونے لگی۔ تھوڑے عرصہ بعد تلاوت کی صرف آواز رہ گئی جو ایک کان سے میرے اندر داخل ہوتی اور دوسرے کان سے نکل جاتی اور میرا قلب و ذہن دوسری دلچسپیوں میں ڈوب جاتا۔

اپنے چہرے پر ڈاڑھی مجھے اچھی لگی۔ پھر اپنے پیشے اور انجمن کی صدارت کی عطا کی ہوئی عزت و بزرگی کے ساتھ اسے قریبی جاننے والوں نے بھی اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اس کی وجہ سے اسکول کے اسٹاف میں بھی میں غیر مقبول نہ ہوا البتہ میری ہم وطن عورتوں نے اس ڈاڑھی پر ناک بھوں چڑھائی۔ لیکن میں نے ان کی بالکل پرواہ نہ کی۔ کیونکہ ہماری عورتیں ابھی تک مغرب سے بہت مرعوب ہیں۔ یہاں جو فیشن چلتا ہے وہ ان کے لئے ایک ندرت بن جاتا ہے شاید انھیں معلوم نہیں کہ ان دنوں یورپ میں ڈاڑھی رکھنا ایک دانش ورانہ فیشن بن گیا ہے۔ مجھے اس کی بھی پرواہ نہیں یورپ میں رہتے ہوئے یہاں کے چال چلن اور فیشن سے مرعوب نہیں ہوا جاتا۔ کیونکہ برابری یا ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کا جنون یہاں سب پر سوار رہتا ہے۔ ڈاڑھی میں نے اس لئے رکھی کہ یہ میری معاشرتی ضرورت تھی اسے برقرار اس لئے رکھے ہوئے ہوں کہ یہ مجھے پسند ہے اور میری ذات کا ایک حصہ بن چکی ہے۔

جو چیزیں میرے پاس ہیں وہ یہاں بہت سے لوگوں کے پاس ہیں۔ یہاں کی دکانیں، گھر، لوگوں کے پیشے

کے دل و دماغ عیش و عشرت کی چیزیں، خیالوں، آرزوؤں اور تمناؤں سے بھرے پڑے ہیں۔ یہاں جگہ (SPACE) کا مسئلہ بڑا اہم ہے، چاہے وہ گھر میں ہو یا دل و دماغ میں فرورت سے زیادہ آمرفات سے (SPACE) کا حسن بگڑتا ہے۔ چیزوں کو گڈمڈ کرنے سے دل و دماغ پر برا اثر پڑتا ہے زیادہ لذیذ کھانوں سے معدہ خراب ہوتا ہے مرد اور عورتیں موٹے بے ہنگم ہوتے جاتے ہیں جس کی وجہ سے عیاشی میں دقتیں پیدا ہوتی ہیں اس لئے انھیں مشورہ دیا جاتا ہے کہ چیزوں، خیالوں اور تمناؤں کو بدلتے رہیں۔ جو چیزیں اور تمنائیں پرانی ہو جائیں انھیں اپنے گھروں اور دل و دماغ سے خارج کر دیں خالی جگہ کو پر کرنے کے لئے دوسری چیزیں خریدیں تاکہ کاروبار چلتا رہے۔ منافع بڑھتا رہے اور کارخانوں اور فیکٹریوں میں پیداوار بڑھتی رہے۔

معیار زندگی گھٹتے نہیں بلکہ پیداوار کے ساتھ برابر بڑھتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ صنعتی تہذیب کی روح ہے۔ یہی جدید آدمی سے اس کا مطالبہ ہے۔ لیکن ان ساری چیزوں کو حاصل کرکے میں ایک مستقل بے چینی کا شکار ہو چکا ہوں۔ یہ بے چینی رات کی تنہائی میں بہت ستاتی ہے۔ جب میں اپنے وطن میں تھا تو مجھ میں اندھیرے میں ڈھونڈنے کی خواہش پیدا ہوتی تھی ——— لیکن یہاں کے اندھیرے میں۔ مجھے بڑا ڈر لگتا ہے اور میں باورچی خانے کی بتی جلا دیتا ہوں، اس کی روشنی رسی کی طرح میرے سامنے سرکنے لگتی ہے۔ جیسے وہ میرے گلے کے قریب آ رہی ہو۔ اس روشن رسی کو متحرک دیکھ کر میرے اندر ہر چیز ٹھہر جاتی ہے۔ سوائے خوف کے۔ اس وقت میں کچھ محسوس نہیں کرتا۔ یہ خوف پھر ان چیزوں کو زندہ کر دیتا ہے جنھیں میں نے اپنے عیش و دبدبہ کے لئے حاصل کیا تھا یہ بھی روشن رسی کے ساتھ مل کر مجھے دبوچ لینے کے لئے آگے بڑھتی ہیں تو اس اندھیرے میں کہاں کھڑا ہوتا ہوں اور دوسرے کمرے۔ باورچی خانہ، غسل خانہ، سب کی بتیاں روشن کر دیتا ہوں تو اس روشنی میں میرے باہر کی رسی غائب ہو جاتی ہے۔ لیکن باہر کی رسی کی آہٹ سے میرے اندر کی رسی جو جاگتی ہے وہ اس روشنی میں میرے اندر کسی چیز کا گلا دباتی رہتی ہے اس سے میں بڑی گھٹن محسوس کرتا ہوں اس وقت گھر سے نکل جاتا ہوں اور دیر تک سڑکیں ناپتا رہتا ہوں۔ اس حرکت سے میرا خوف بہل جاتا ہے پھر گھر میں آتا ہوں گھر کے اندھیرے کی مجھ میں تاب نہیں ہوتی اس لئے پھر بتی جلا دیتا ہوں اس رات مجھے اس وقت نیند آتی ہے جب صبح کاذب کے ساتھ ٹھنڈی ہوا میرے رخساروں کو تھپتھپاتی ہے۔

عیش و دبدبے والی زندگی گزارتے ہوئے اس قسم کی بے چینی سے میرا اکثر واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ بعض مرتبہ یہ بے چینی میرے اندر درد بن جاتی ہے تو ساری حسیں میرے اندر کند سی پڑ جاتی ہیں۔ یا یوں سمجھئے کہ لذت احساس سے بالکل محروم ہو جاتا ہوں۔ ان دنوں سوائے درد کے میں کسی چیز کو محسوس کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ آخر بغیر احساس لذت کے زندگی کیسے گزاری جا سکتی ہے۔ میں زندہ رہ کر کیا کروں اپنی کیفیت سے تھک کر کبھی کبھی میں خود کو مخاطب کرکے خود سے ہی یہ سوال کر لیتا ہوں۔ یہ سوال میری گھٹن کو کچھ کم کرتا ہے تو گہرے گہرے سانس لینے لگتا ہوں جیسے میں خود کو بتانا چاہتا ہوں کہ ابھی میں زندہ ہوں۔

اس بے چینی سے تنگ آ کر میں نے کبھی ڈھکے چھپے عشق کے بارے میں سوچا۔ شاید کسی دلربا کے آنے سے اس اضطراب سے نجات مل جائے۔ اسکول میں اس ضرورت کے لئے بھی ایک ۳۷ برس کی اسکول ٹیچر مل گئی۔ اس عمر میں اسے بھی اپنے زمانے، اپنے لوگوں سے شکایت پیدا ہو چکی تھی۔ لیکن تخیل میں ایسی ندرت کہاں جو ایسی تجربے کار ذہین عورت کو زیادہ دنوں تک مغالطوں میں رکھ سکے۔ میری بے چینی اور اجنبیت کا اسے بھی بڑی جلدی پتہ لگ گیا۔ اس لئے میرا پہلا عشق میری ہی وحشت کا شکار ہو کر رہ گیا۔ محنت کا عادی ضرور ہوں لیکن اس سے صرف چیزیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ لوگ نہیں! لوگوں کو حاصل کرنے کے لئے کچھ اور چاہیئے عشق میں ناکامی کے بعد مجھے پھر اپنی بیوی یاد آئی۔ اسے لندن بلانے کے بارے میں سوچا۔ گھر والوں کو خط لکھا۔ اس

خط کا سارے قریبی رشتہ داروں کو پتہ چلا۔ جوان بیٹی کو اپنی آنکھوں سے دور کرکے ہزاروں میل کیسے بھیجا جا سکتا ہے۔ مجھے لندن پیسے کمانے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ وہاں سکونت اختیار کرنے کے لئے نہیں! یہ میری بیوی کے والدین کا ردعمل تھا جس کا عزیزوں میں ذکر ہوا تو یہ بات اڑتی ہوئی میری بیوی کے چچا کے کانوں میں بھی پہونچی۔ میرے لندن آنے پر وہ پہلے ہی خار کھائے بیٹھے تھے۔ اس بغض کو نکالنے کے لئے انھوں نے طرح طرح وسوسوں کا نمک مرچ لگا کر ذکر کیا۔ جوان لڑکی کو اتنی دور بھیجنا مناسب نہیں۔ لوگ لندن کی ہوا سے بڑی جلدی متاثر ہوتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ ایسا کچھ ہوا تو لڑکی کہاں جائے گی۔ وہاں ساری زندگی اسے دولہا میاں کے رحم و کرم پر رہنا پڑے گا۔ یہ اندیشے میرے خسر کے دل کو لگے۔ انھوں نے مجھے جواب دیا کہ لڑکی لندن نہیں آئے گی۔ تم یہاں آنے کی کوشش کرو۔ تمہیں وہاں رہتے ہوئے اتنا زمانہ گذر چکا، ابھی تک جی نہیں بھرا؟ لیکن لندن سے واپس جانے کا مطلب تو کچھ ایسا ہی ہے جیسے کسی کو جنت سے کسی پاداش میں واپس کیا جائے۔ اس خط کا تقریباً دنوں کچھ ایسا ہی ردعمل ہوا میں نے پھر دوسرا خط اپنی بیوی کو لکھا اس خط کا مضمون ہی نہیں بلکہ لب و لہجہ بھی بڑا سخت تھا۔ میں نے انھیں دھمکی دی کہ اگر وہ نہ آئیں تو میں یہاں دوسری شادی کی کوشش کروں گا۔ میری جوان بیوی سوت کو کیسے گوارہ کر سکتی تھی۔ انھوں نے فوراً جواب دیا۔ میں آنے کے لئے ہر وقت تیار ہوں تمہارے حکم سے میں کب باہر رہی ہوں اس خط کے ملتے ہی میں نے لندن سے انھیں ہوائی جہاز کا ٹکٹ روانہ کیا۔

اس کے چچا اس ٹکٹ کی خبر سن کر حسد میں انگاروں پر لوٹنے لگے۔ سرکاری آفیسر ہوتے ہوئے ان مراعات سے نہ وہ خود فیض یاب ہو سکے تھے اور نہ انکی اولاد! اس کے برخلاف ان کے غریب بھائی کی لڑکی کو لندن جانے کا موقع نصیب ہو رہا تھا۔ ٹکٹ آنے کے بعد وہ کیا کر سکتے تھے میری بیوی بھی لندن آنے کے لئے تیار تھی اور مجھے اس کا زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ وہ لندن آئی۔ پہلے تو یہاں آنا اسے خواب سا لگا اس کے بعد یہاں کی تنہائی نے اسے ستایا، اس کے بعد اسی سال وہ ماں بھی بنی۔ اللہ نے ایک خوبصورت بیٹا دیا۔ ابھی میں سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ لندن میں وہ میرے ساتھ صرف چند سال رہ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اس کے ایثار و محبت نے میرے اندر انسان سے محبت کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی تھی۔ اس کے جانے کے بعد یہ صلاحیت بھی میرے اندر سے رخصت ہو گئی

ان آسائشوں اور کامرانیوں کے بعد میں دنیا میں پھر تنہا رہ گیا۔ میرا اضطراب پھر پرانے درد کی طرح ابھر آیا۔ اس کے ساتھ معدے کی خرابی اور بدہضمی! میں ابھی تک لندن میں مرغن کھانوں کا عادی ہوں۔ انگریزی اور یورپی کھانے ابھی تک میرے منھ کو نہیں لگے۔ سب ابلے ہوئے گوشت اور ابلی ہوئی سبزی ترکاری کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔ کبھی مجبوراً انھیں کھا بھی لیتا ہوں تو طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ موسم لندن میں اکثر خراب رہتا ہے اس لئے نیند بہت کم آتی ہے۔ ساری رات بستر پر کروٹیں میں گزرتی ہے۔ یا یوں سمجھئے جب اس کیفیت کے ساتھ پرانی بے چینی بھی ساتھ ہو جاتی ہے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انگاروں پر لوٹ رہا ہوں۔ الارم میرے بستر سے اٹھنے کے بعد بجتا ہے ضروریات سے فارغ ہو کر ہاتھ منھ دھو کر بغیر بھوک کے ناشتہ کرنے بیٹھ جاتا ہوں۔ اس کے بعد کار گیرج سے نکال کر اسکول بھاگتا ہوں

مستقل بے چینی کے ساتھ اس عجلت کا بھی عادی ہوتا جا رہا ہوں۔ یہاں ہر چیز کی رفتار تیز ہے۔ اس تیزی کا ساتھ دینے کے لئے مجھے بھی تیز چلنا پڑتا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ اس تیزی سے میرے اعصاب اور حواس پر کیا کچھ نہیں گزرتا ہوگا کام کے لئے وقت پر یا وقت سے پہلے میں اپنی ڈیوٹی پر پہونچ جاتا ہوں۔ وقت دولت ہے، نہ وقت کو ضائع کیا جا سکتا ہے نہ دولت کو لیکن اب میرے بنک بیلنس کے بڑھنے کے ساتھ میری بے چینی کی شکلیں بھی بدلتی رہتی ہیں کبھی سر کے درد کے ساتھ دماغ پھٹنے لگتا ہے کبھی یہ درد

میرے جسم کے ہر حصے میں چیونٹیوں کی طرح رینگتا ہے۔ کبھی سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے، کبھی یہ بے چینی میرے اندر آواز بن جاتی ہے۔ اپنے اندر اس آواز کو سن کر میں گھبرا اٹھتا ہوں تو اپنے G.P (ڈاکٹر) کے پاس جاتا ہوں۔

میری اس بے چینی کی اس تبدیلی پر اسے بھی تشویش ہوتی ہے۔ میری ہر تکلیف کو وہ توجہ سے سنتا ہے۔ کبھی کبھی میرا معائنہ بھی کر لیتا ہے۔ اپنی ہر قسم کی تشخیص اور معائنہ کے بعد میرے جسم میں اسے کوئی بیماری نظر نہیں آتی، البتہ ہر وقت بکری کی طرح منہ چلانے سے میرا وزن ضرور بڑھ رہا ہے ڈاکٹر نے ہر وقت کے کھانے پر بھی تنبیہ کی۔ لیکن میں کیا کروں، اپنی بے چینی کو بہلانے کے لئے مجھے کسی نہ کسی طرح کی حرکت کی اکثر ضرورت رہا کرتی ہے۔ انھیں حرکتوں میں سے کچھ نہ کچھ کھاتے رہنے کے لئے بکری کی طرح منہ چلانا بھی ایک حرکت ہے

ایک دن اس کی تنبیہ کو نظر انداز کر کے میں نے اپنے ڈاکٹر سے سوال کیا "آخر میری بے چینی نے آواز کی صورت کیوں اختیار کر لی ہے؟"

"یہ آواز تمہارے اندر کس زبان میں ہوتی ہے کیا اسے سمجھنے کی تم نے کوشش کی...؟ وہ تم سے کیا کہنا چاہتی ہے؟"

ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔ اس وقت سوال سے نہیں بلکہ اس کی مسکراہٹ سے میں نے قدرے تکلیف محسوس کی۔ گھر آ کر ڈاکٹر کے سوال پر میں نے سوچنا شروع کیا کیونکہ اپنے اندر اس آواز کا تعاقب میں نے پہلے کبھی نہ کیا تھا۔ گھر میں پھر اندھیرا تھا۔ یہ بے چینی میرے اندر پھر گونجی سوائے افسوس اور خوف کے اس وقت مجھے اپنے اندر کچھ اور نہ ملا۔

دوسرے دن میں پھر اپنے ڈاکٹر کے پاس آیا۔ اس دن موسم بھی اچھا تھا اور ڈاکٹر کا موڈ بھی! اس نے ایک اچھا سا سوٹ پہن رکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور پوچھا۔

"بتاؤ میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"

"یہ آواز اب مجھے بڑا پریشان کر رہی ہے۔"

"میرے خیال میں تم اسپتال میں جا کر نفسیاتی معالج (PSYCHIRIATRIST) سے ملو۔"

"جیسا آپ مناسب سمجھیں، آپ میرے معالج ہیں۔"

"ہاں آج ہی تم اسپتال چلے جاؤ۔ میں اسے خط لکھ دیتا ہوں۔" ڈاکٹر نے خط لکھ کر ایک لفافہ میں بند کیا اور نفسیاتی معالج کا پتہ لکھ کر خط مجھے دیتے ہوئے کہا۔ "دو ہفتہ کے بعد تم پھر مجھ سے ملنے آنا۔"

"بہت اچھا، خدا حافظ" کہہ کر میں نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا۔ مطب سے نکل کر سیدھا اسپتال پہونچا، نفسیاتی معالج سے ملنے کی کوشش کی۔ RECEPTIONIST نے کارڈ پر تاریخ لکھ کر مجھے دی۔ تین دن کے بعد میں پھر اسپتال پہونچا۔

اسپتال کی نرس نے میرا نام پکارا۔ میں جلدی سے گھبرا کر اٹھا اس کے ساتھ ایک کمرے میں گیا اس کمرے کی ہر چیز سفید تھی۔ نرس کے جانے کے بعد ڈاکٹر نے اپنی پیشہ ورانہ تیز آنکھوں سے میرا جائزہ لیا۔ اس کے بعد شعوری مسکراہٹ کے ساتھ اپنے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے پھر میرا جائزہ لیا اس کے بعد فائل میں ڈاکٹر کا لکھا ہوا خط پڑھ کر مجھ سے سوال کیا۔

"آپ کو کیا تکلیف ہے۔"

"اندھیری رات میں اپنے اندر آواز سنتا رہتا ہوں۔ بدہضمی الگ، بعض اوقات بالکل نیند نہیں آتی۔"

"بیوی سے آپ کے تعلقات کیسے ہیں؟ کیا ہر اعتبار سے وہ آپ کے معیار کے مطابق ہے؟"

"ڈاکٹر صاحب عرصہ ہوا لندن میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی موجودگی میں تو میں آدمی بنتا جا رہا تھا۔"

"کبھی خودکشی کا خیال آیا؟"

"کئی مرتبہ، بڑے دلفریب انداز میں، لیکن خوف خدا نے خودکشی کے چارم (CHARM) کو احساس جرم میں تبدیل کر دیا۔" اور مجھے خیال آیا اگر اس طرح میں نے جان دیدی تو خدا مجھے کبھی معاف نہ کرے گا۔ خدا کو اس دنیا میں ناراض کر سکتا ہوں، آخرت میں نہیں! یہ احساس ہمیشہ میرے ساتھ سائے کی طرح رہتا ہے۔ اس وجہ سے خودکشی سے مجھے ہر وقت

ڈر لگتا ہے۔"

"کبھی خود کو یا دوسروں کو دکھ دینے میں تمہیں مزا آتا ہے؟"

"دوسروں کو تو نہیں البتہ جب خود سے تنگ آجاتا ہوں تو خود کو اذیت دے کر مزا نہیں، سکون سا محسوس کرتا ہوں۔"

"زندگی میں کیا بننے کی تمنا تھی؟"

"وہ حالات اور عمر کے ساتھ بدلتی رہی۔ سب سے پہلے لیڈر بننے کی تمنا، اس کے بعد آفیسر پھر فوج کا آفیسر، سب سے آخر میں تاجر۔ لیکن لندن اور اس کے حالات نے پرائمری اسکول کا جغرافیہ کا ٹیچر بنا کر رکھ دیا۔ اس کے طفیل ایک مکان، اس کے بعد کار اور اس کے ساتھ ایک مذہبی انجمن کا صدر!"

"لوگوں سے تمہارے تعلقات کیسے رہتے ہیں؟"

"میں اپنے اور لوگوں کے درمیان فاصلہ رکھنا پسند کرتا ہوں نہ ان کے قریب جاتا ہوں نہ انھیں اپنے قریب آنے دیتا ہوں۔"

"اپنے لوگوں کے درمیان یا سفید لوگوں کے درمیان؟"

"اپنے رنگدار لوگوں کو دیکھتے ہی میرے اندر شعلہ سا بھڑکتا ہے۔ انھیں دیکھنے یا ان سے ملنے میں کوفت محسوس کرتا ہوں بعض مرتبہ تو یہ کوفت وحشت بن جاتی ہے۔ میں کسی رنگ دار آدمی کو چاہے وہ ہندو، مسلمان، عیسائی، کوئی ہو اسے خود سے اونچا دیکھنا تو درکنار اسے اپنے برابر دیکھنا بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ رنگدار آدمی کو کسی اہم مقام پر دیکھ کر جلن محسوس کرتا ہوں۔ کبھی کبھی تو یہ جلن میرے اندر رنگدار آدمی کو دیکھ کر کتے کی خاصیت بن جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک کتا دوسرے کو کھاتے دیکھ کر محسوس کرتا ہے۔ معلوم نہیں میرے اندر یہ خاصیت کیوں پیدا ہوئی؟ یہاں کے ماحول اور آب و ہوا کا اثر ہے یا صنعتی تہذیب کا پیدا کردہ انسانی ردعمل؟"

"لیکن تم تو اپنے لوگوں کی مذہبی انجمن کے صدر ہو۔ صدر ہو کر تم ان کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتے ہو؟"

"ذرا ڈپلومیسی سے کام لے کر ان کی عقیدت۔ اطاعت اور خوشامد سے لطف لیتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ میں کتنے لوگوں کا حاجت روا ہوں۔ کتنے لوگوں کی امیدوں کا مرکز ہوں لیکن ان میں سے کسی کو اپنے برابر دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا۔"

"مقامی سفید لوگوں سے تمہارے کیسے تعلقات ہیں؟"

"مقامی لوگوں سے تعلقات رکھنے کا خواہش مند ہوں۔ بلکہ بعض مرتبہ ضرورت پڑنے پر میں ان کی خوشامد پر بھی اتر آتا ہوں۔"

"عورت اور مرد دونوں کی؟"

"نہیں! سفید مردوں سے صرف معاشرتی تعلقات اور سفید عورتوں سے ذاتی تعلقات!"

نفسیاتی معالج کو اس جواب پر بے اختیار ہنسی آگئی لیکن جب اسے اپنی حیثیت کا احساس ہوا تو خود کو سنبھال کر اس نے مجھے پھر مخاطب کیا۔

"سفید عورتوں سے تعلقات قائم کرنے میں کچھ کامیابی ہوئی؟"

"صرف تھوڑے عرصے کے لیے۔ اس کے بعد کچھ معلوم کر کے اور کچھ محسوس کر کے وہ مجھ سے الگ ہو جاتی ہیں۔"

"اس علیحدگی اور بے تعلقی کی وجہ معلوم کرنی چاہی؟"

"ابھی تک نہیں! البتہ ڈاکٹر صاحب ایک بات ضرور ہے جسے ابتدا میں بتلانا بھول گیا۔ اپنے اندر کسی چیز کے گم ہو جانے کا مجھے شدید احساس ہے۔ وہ گم شدہ چیز کیا ہے، یاد نہیں آتی — البتہ وہ چیز جہاں رکھی رہتی تھی وہ جگہ اپنے اندر خالی خالی سی محسوس کرتا ہوں۔ ذرا سکون و طمانیت ملے تو اس گم شدہ چیز کو تلاش کروں۔"

"تو لندن میں تمہارے کسی کالے یا گورے آدمی سے ایسے تعلقات قائم نہ ہوئے جسے دوستی قرار دیا جا سکے؟"

"تعلقات آدمی سے اس وقت قائم ہوتے ہیں جب دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے محبت اور احترام کے جذبات کے ساتھ برابری کا بھی احساس ہو۔ اس انسانی رشتہ کو قائم و دائم رکھنے کے لئے کوئی پائیدار چیز قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہو۔ تیسری چیز وہ اعتماد ہے جو غالباً انھیں دو صفات کی موجودگی میں تجربے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ ویسے اسکول میں ایک اسکول ٹیچر سے میرے معاشرتی تعلقات ہیں۔ دبلا پتلا، ٹھنگ اور چاپلوسی کا عادی، لوگوں سے خصوصاً رنگدار لوگوں سے، تعلقات قائم کرنے اور رکھنے کا شوقین دل کا اچھا دوسروں کے کام آنا اس کا محبوب مشغلہ ہے

پیش خرچ کرنے میں اسے بڑا مزا آتا ہے۔ خصوصاً حسین لڑکیوں پر، ان کے قہقہوں اور عشوؤں میں وہ زندگی محسوس کرتا ہے۔ ان پر خرچ کرنے کے حوصلے اتنے ہوتے ہیں کہ قرض پر اتر آتا ہے لیکن دوسرے دن اس قرض کو اتار بھی دیتا ہے۔ زیادہ دیر تک کسی کا زیر بار رہنا گوارہ نہیں کرتا۔ لیکن اس کے سنجیدہ اور مخلصانہ تعلقات ایک ترک مسلمان عورت سے ہیں۔ جو ترکی کے مسلمان معاشرے کو اجنبی سمجھ کر انگریزی سیکھنے لندن آئی۔ انگریزی سیکھنے کے لئے کپڑے سینے کی فیکٹری میں کام بھی کیا۔ تعلیم تو ختم ہو گئی لیکن اس کا یہ کام ابھی تک جاری ہے۔ مسٹر رچرڈ شادی کے تو قائل نہیں، اس لئے اس مسلمان ترک عورت سے ان کے تعلقات اب صرف افلاطونی ہو کر رہ گئے ہیں۔ وہ ترکی واپس جانا نہیں چاہتی، اسے صرف مسٹر رچرڈ، انگلش سوسائٹی کی خاموشی، تنہائی اور صفائی بہت پسند ہے۔ اور مسٹر رچرڈ کو موسیقی، شراب، کتابوں سے زیادہ اخبارات پڑھنے کے عادی ہیں۔ لیکن پالتو کتے کی طرح کسی بڑے مشہور مصنف کی کتاب اپنے ساتھ ضرور رکھتے ہیں۔ انگریزی کے متوسط طبقے سے ان کا تعلق ہے۔ پبلک اسکول میں تعلیم بھی پائی ہے۔ لیکن اپنی قوم کی طبقاتی ذہنیت کے بڑے مخالف ہیں۔ انگریز ہونے پر فخر، قوم پرستی اور طرف داری ضرورت کے مطابق! اسکول میں سب سے اچھے تعلقات خصوصاً طلبہ سے، کیونکہ بغیر امتیاز و تفریق کے سب کے کام آتے اس کے بدلے انھیں نیک نامی، دوستی ملتی جس سے وہ بہت خوش ہوتے۔ اسکول کے بعد ان کا زیادہ وقت ترکی محبوبہ کے ساتھ گزرتا، خصوصاً فون پر۔ اس تنہائی کی ماری ادھیڑ عمر پہنچنے والی عورت کی لمبی گفتگو وہ سارے اجنبی رومانی خیالات یورپین لیڈی بن کر انگریزی سیکھ کر یورپ میں رہنے کی تمنا اس کے ساتھ اس کی پرانی نفسیاتی الجھن۔ خود کو آدھا یورپین سمجھنے کا خبط، لندن کے ماحول میں پختہ ہو کر اس ترکی خاتون کی انفرادیت کے عناصر ترکیبی بن کر رہ گئے ہیں۔ ایک دن مسٹر رچرڈ کو میں نے اپنے دین اسلام کے متعلق سید قطب کی ایک تصنیف کا انگریزی ترجمہ مطالعہ کے لئے پیش کیا اس کا نام پڑھتے ہی وہ اسے چھونے سے ڈرنے لگے

تو میں نے کہا "آپ دنیا جہان کی خبریں اخبار میں پڑھتے ہیں یہ دنیا کی بہت بڑی آبادی کا دین ہے اس کے متعلق واقفیت حاصل کرنے میں آخر کیا حرج ہے؟"

"نہیں، نہیں، اگر مجھے مذہب ہی کا مطالعہ کرنا ہے تو عیسائیت کا مطالعہ کروں گا کیونکہ عیسائیت میرے مزاج اور روایات سے ہم آہنگ ہے۔ لیکن خدا کو میرا ذہن ابھی تک نہیں سمجھ سکا ہے"

"مسٹر رچرڈ۔ خدا تمہارے اندر ہے۔ اور تمہارے باہر بھی جب تم اس کی ضرورت محسوس کرو گے۔ اس کے ڈھونڈنے میں تمہیں کوئی دقت نہ ہوگی۔"

"اگر زندگی میں خدا کی تلاش کی ضرورت محسوس ہوئی تو وہ اسلام کا خدا نہ ہوگا، عیسائیت کا خدا ہوگا۔"

"خدا صرف ایک ہے۔ ہر مذہب کا خدا الگ نہیں ہوتا!"

میرا جواب سن کر مسٹر رچرڈ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں جیسے اپنے اندر کے خاموش اندھیرے میں وہ کچھ تلاش کر رہے ہوں۔

"پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہاں کے سفید لوگوں سے تمہارے تعلقات ذاتی نہیں؟"

"ڈاکٹر صاحب! انسانی تعلقات کی کئی سطحیں ہوتی ہیں۔ مجھے جس انسانی تعلق کی ضرورت ہے اس کا اتہ پتہ ان کے رویے میں نہیں ملتا۔ میرے خیال میں مسٹر رچرڈ نے انسانی ہمدردی اور دوسرے پسندیدہ اخلاق کو اپنی ڈپلومیسی میں کچھ گڈمڈ سا کر دیا ہے۔ ان کے رویے میں ان کی حدیں صاف صاف نظر نہیں آتیں۔ بلکہ ان کے کچھ ذاتی جذبے، احساس برتری اور دوسروں پر حکومت کرنے کی خواہش زیادہ ابھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان جذبوں کی تسکین ان دنوں اپنے لوگوں میں انھیں ممکن نظر نہیں آتی۔ کیونکہ ان کے لوگوں میں اکثر و بیشتر میں فخر، گھمنڈ اور دوسروں پر حکومت کا جذبہ وبا کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اپنے لوگوں میں ان جذبوں کی تسکین کے لئے انھیں سخت مقابلہ درپیش ہوگا۔ کامیابی وہاں اتنی ممکن نہیں جتنی رنگ دار لوگوں میں۔ یہاں سوائے ضرورت کے کوئی مقابلہ نہیں۔ جذبوں کی تسکین کے بعد اچھے تعلقات اور معاشرتی ربط!"

"یہ شک تمہارے پاس کہاں سے آیا ؟"

"یہ بھی مجھے یورپ میں ملا۔ ہر شخص مجھے یہاں یہی مشورہ دیتا ہے۔ کسی پر اعتبار نہ کرو، سوائے اپنی ذات اور اپنی جیب کے۔ ڈاکٹر صاحب یہ شک بھی اب میری بے چینی کا مضبوط عنصر بن چکا ہے۔ مجھے کریدنے اور شک کرنے میں مزا ملتا ہے۔"

"اس مزے سے تمہیں کیا ملتا ہے ؟"

"بالکل ایسی ہی تسکین جیسے کھجلی کتے اپنے جسم کو کھجانے سے، یا اپنی خارش زدہ انگلیوں کو کھجا کر سہلانے سے !"

"میرے خیال میں تمہارے خیالات کی نکاس کے لئے مختلف راستوں کی ضرورت ہے، زندگی میں مثبت قسم کی سرگرمیاں تلاش کرو۔ اس کے ساتھ اپنے لوگوں میں زیادہ سے زیادہ رہنے کی کوشش کرو جن میں تم پلے بڑھے ہو۔ تم میں اور ان میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں۔"

"لیکن اپنے لوگوں کو دیکھتے ہی مجھ میں کتے کی خاصیت کیوں پیدا ہو جاتی ہے ؟"

"ابتدا میں کچھ بھی ہو، تمہاری اور ان کی ضرورتیں مل کر اس خاصیت کو ختم کر دیں گی۔ جس مذہب کی روایات کے سائے میں تم پروان چڑھے ہو اس مذہب کے نزدیک انسانی فطرت خبیث نہیں۔ انسانی فطرت قومیت اور کلچر کے خانوں سے بدلتی نہیں صرف متاثر ہوتی ہے۔ انسان اللہ کی شبیہہ پر پیدا ہوا ہے وہ چاہے انگریز ہو، عرب یا ہندی، جرمن یا روسی، یہ سب پہلے انسان ہیں اور بعد میں کچھ اور !"

میری داستان سنتے ہوئے نفسیاتی معالج کے چہرے پر ایک قسم کی پیشہ ورانہ توجہ ابھر آئی۔ اس میں میری ذات سے کوئی دلچسپی نہ تھی سوائے میرے تجربوں اور مسائل کے! مجھے ذرا مایوسی ہوئی۔ اس نے کچھ گولیاں بھی دیں، میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

"کیا میں پھر حاضر ہوں ؟" میں گولیاں لے کر جانے کے لئے کھڑا ہو گیا اور نفسیاتی معالج سے پوچھا۔

"فی الحال نہیں! میں تمہارے ڈاکٹر کو خط لکھ رہا ہوں، اگر کسی قسم کی تکلیف ہو تو ان کے پاس جانا۔"

"بہت بہت شکریہ!" اس الوداعی شکریہ پر اس کے چہرے پر کچھ ذاتی قسم کی مسکراہٹ ابھری جو مجھے اچھی لگی۔

کمرے سے باہر آ کر مجھے زور کا پیشاب لگا۔ ایک نرس قریب سے گذر رہی تھی اس سے استنجا خانہ معلوم کیا۔ اس نے دائیں رخ کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ جلدی سے پیشاب کرتے ہوئے ساری گولیاں استنجا خانہ میں پھینک کر اس پر پیشاب کرنے لگا جب میرا معدہ خراب ہوتا ہے تو پیشاب خوب آتا ہے۔ اس وقت معدہ کے ساتھ کچھ ایسی ہی صورت تھی۔ پیشاب سے فارغ ہو کر اسپتال سے باہر نکلا، سڑک پر آیا، ٹھنڈی ہوا نے ذرا فرحت بخشی، ذرا آگے بڑھا تو ایک رنگدار نوجوان میرا ہم وطن میری طرف آتا ہوا نظر آیا۔ میں نے اسے دیکھا، وہ مجھے دیکھ رہا تھا جب وہ قریب آیا تو اس نے مجھے نظر انداز کر کے دوسری طرف منہ کر کے کچھ اور دیکھنے کی کوشش کی۔ اس وقت تازہ ہوا کے ساتھ ہتک کے تھپیڑے کو میں نے بری طرح محسوس کیا۔ اس ہتک کی وجہ سے مجھے اپنے ایمان، اپنے تصرفات، اپنی معاشرتی حیثیت کا بھی خیال نہ آیا۔ اس کا دباؤ میرے ہر جذبہ پر بھاری ہو گیا تھا چنانچہ اس کا ردعمل لازمی تھا۔ جب وہ قریب سے گزرا تو اسے نظر انداز کرتے ہوئے اس کے سامنے تھوک کر میں پھر اسی طرف دیکھنے لگا جس طرف وہ دیکھ رہا تھا۔ میرے تھوک نے اس کی اکڑ میں اور تناؤ پیدا کر دیا۔ میں نے اس کی پرواہ نہ کی، کیونکہ تھوکنے سے میری جلن کم ہو چکی تھی۔

تھوڑی دیر بعد راہ چلتے ہوئے مجھے ایک رنگدار بوڑھا نظر آیا وہ بھی میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں میرے لئے شفقت، پیار اور دوستی کا جذبہ تھا۔ وہ مجھ سے ذرا دور تھا ــــ لیکن اس فاصلے کے باوجود میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ بوڑھا مجھ سے اپنی زبان میں کچھ کہنا چاہتا ہے۔ لیکن اب میں غیر اختیاری طور پر اپنے لوگوں کو نظر انداز کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اس لئے اس کی شفقت کو محسوس کرنے کے باوجود میں نے اسے بھی نظر انداز کر دیا، لیکن اس کی

طرف سے منہ موڑ کر دوسری طرف نہ دیکھا جب وہ بوڑھا ذرا آگے بڑھ گیا تو میں نے اسے پھر مڑ کر دیکھا تو وہ خود مجھے مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اس کی دوستی اور شفقت کو نظر انداز کرنے سے اس کے چہرے پر کیسی شکایت آمیز مایوسی چھا چکی تھی، اس شکایت کے باوجود اس کی بوڑھی آنکھوں میں میرے لئے شفقت تھی اسے دیکھ کر مجھے خود پر بڑا غصہ آیا۔ غصہ کے ساتھ ملامت کا احساس بھی میرے اندر ابھرا تو میرا جی چاہا کہ اس کے قریب جا کر اپنی اس بدتمیزی کی معافی مانگوں۔ اس کی شفقت اور شرافت کا اعتراف کروں۔ اگر وہ ہندو ہے تو [illegible] نمستے کہوں، اگر وہ مسلمان ہے تو سلام کروں۔ اس احساس کو لے کر جب میں اس کی طرف بڑھا تو وہ بس میں بیٹھ کر مشرق کی طرف روانہ ہو گیا اور ملامت نے میرا گلا دبانا شروع کر دیا، اور کھلی ہوا میں مجھے گھٹن محسوس ہونے لگی تو چلتے ہوئے میں [illegible] پھر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

میرے اسکول میں ایک نئی ٹیچر آئیں۔ پورے چاند کی طرح پوری عورت۔ بے انتہا نسائیت کے ساتھ بے انتہا خصوصیت آہستہ آہستہ مسکراتے ہوئے باتیں کرنا لیکن سر کے درد کی انھیں اکثر رہتی تھی ۔ آنکھ کا درد بھی کبھی کبھی ہو جایا کرتا تھا۔ میٹھی چیزیں کھانے کی بڑی شوقین تھیں، آدھی جرمن آدھی انگریز اسکول کی تعلیم اور ٹیچر ٹریننگ کے زمانے میں اپنے ہم عمر نوجوانوں سے کچھ ہلکے پھلکے عشق رکھ چکی تھیں۔ لیکن وہ عورت جو ان کے اندر تھی وہ ہمیشہ انھیں پورے مرد کی طرف لے جانے کی کوشش کرتی تھوڑے عرصہ کے بعد اب تو جوانوں کے بجائے ادھیڑ عمر کے آدمیوں سے زیادہ دلچسپی لینے لگی تھیں۔ ان کا نام کرسٹین (CHRISTINE) تھا۔ چہرے پر معصومیت ہمیشہ خاموشی کی طرح چھائی رہتی۔ ان کے چہرے کو دیکھ کر آدمی بے انتہا رحم اور خلوص سے مغلوب ہو جاتا، لیکن نظر جب ان کے نہایت متناسب جسم اور اس کے زاویوں پر پڑتی تو آدمی میں برسوں کی پیاس کی طرح جنسی خواہش ابھر آتی۔ مس کرسٹین کے چلنے میں بڑا عجیب سا البیلا پن تھا۔ ان کے جسم کا حسن اس کے وہ زاویے تھے جو چلتے وقت ان کے لباس کے کپکپانے سے پانی میں لہروں کی طرح ابھرتے اگر کوئی دوستی اور دلچسپی کے ساتھ ان کی طرف پیش قدمی کرتا تو اس کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزار لیتیں، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ مجھ سے بھی کچھ شناسائی سی پیدا ہو چکی تھی۔ مجھے دیکھ کر ان کی معاشرتی مسکراہٹ میں تھوڑی سی اپنائیت پیدا ہو جاتی، مسکراتے ہوئے وہ مجھے کچھ عجیب انداز سے دیکھتیں اپنے متعلق اسکول کے ساتھیوں سے ان کی رائے بھی معلوم ہوئی کہ انھیں میرے ڈاڑھی سے سجے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ بڑی اچھی لگتی ہے۔ لیکن میری آنکھوں سے وہ ذرا تشویش میں پڑ جاتی ہیں۔ اس اطلاع کے بعد میں ہر روز بستر سے اٹھتے ہی سب سے پہلے اپنی آنکھوں کا جائزہ لیتا یہ حقیقت ہے کہ بعض مرتبہ مجھے خود اپنی آنکھوں سے ڈر لگنے لگتا ہے۔ ان میں مردم بیزاری سمٹ کر کتنی ہولناک ہو چکی تھی، نگاہوں میں کتنی بے رحم تلوار کی سی دھار تھی، جو ہر چیز کو کاٹتی ہوئی چلی جائے، اس پر آنکھوں کے سرخ سرخ ڈورے۔ جب [illegible] ہر صبح اپنی [illegible] بے رحم آنکھوں میں اپنی محرومی اور خود غرضیوں کو ٹوٹی ہوئی کشتی کے تختوں کی طرح تیرتے ہوئے محسوس کرتا تو آئینے میں اپنی آنکھوں کو دیکھنے میں مجھ میں تاب نہ رہتی۔ میں سر جھکا کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا۔

ویسے میری آنکھیں چھوٹی چھوٹی سی ہیں۔ ان میں دل میں اتر جانے والی تیز نگاہیں سرچ لائٹ کی طرح چوکنا سی رہتی ہیں۔ لیکن میری مسکراہٹ انھیں اکثر چھپا لیتی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ میری چپٹی ناک کے نتھنے مستقل بے چینی سے پھیلتے ہوتے، گھوڑے کے نتھنوں کی طرح دھواں نکالتے ہیں تو میں اپنے اندر کی آگ کی تپش کو محسوس کرتے ہوئے اپنے باہر اپنے نتھنوں سے نکلتے ہوئے دھوئیں کو بھی محسوس کرتا ہوں۔ اپنی مستقل بے چینی اور آنکھوں کی ہولناکی کے احساس کے باوجود میں مس کرسٹین کو چاہت سے دیکھتا، اگر موقع ملتا تو تھوڑی سی باتیں بھی کر لیتا۔ جو مجھے اس وقت اچھا لگتا۔ مس کرسٹین جب کبھی مجھے دیکھتیں تو ہلو ضرور

کہتی لیکن (اس شکایت کے بعد جو اضطراری طور پر ان کے منھ سے دوستوں کے سامنے نکل گئی) وہ میرے ساتھ بیٹھ کر تبادلہ خیال نہیں کرتیں۔ مس کرسیٹن کی اس سرد مہری کے احساس کی موجودگی میں اپنی آنکھوں کے علاوہ مجھے اپنے خیالات کی صحت پر بھی شبہ ہونے لگتا۔ اس روز جب مجھے مس کرسٹین کی رائے اپنے بارے میں معلوم ہوئی، میں اسکول سے سیدھا اپنے گھر آکر بستر پر پڑ گیا۔ اور مایوسی میرے اعصاب میں اس قدر سرایت کر گئی کہ میں تھکان سے چور چور ہو گیا۔

ایک دن اسکول کی چھٹی کے بعد مس کرسیٹن کی مجھ سے پھر ملاقات ہوئی تو ہمت کر کے میں نے ان سے بات چیت شروع کی، جب انھوں نے دلچسپی لی تو میں نے اسکول کے باہر کے ریستوراں میں انھیں کافی کی دعوت دے دی۔ انھوں نے اسے بھی قبول کر لیا اور میں انھیں ریستوراں میں لے گیا۔ اس دن موسم اچھا تھا۔ موسم کے ساتھ وہ بھی خوش خوش تھیں، اچھے موسم اور دل کی خوشی کے ساتھ انھوں نے اچھا لباس پہن رکھا تھا۔ ریستوراں میں مس کرسیٹن کو مزید خوش کرنے کے لئے میں نے کافی کے ساتھ وہاں کے مشہور کیک کی بھی پیش کش کی (دراصل اسکول سے باہر یہ ہماری پہلی ملاقات تھی) انھوں نے کیک کھانے سے معذرت کرتے ہوئے صرف کافی پر اکتفا کیا۔ ویٹرس آرڈر کے مطابق صرف دو کافی لائی اور ہمارے سامنے رکھ کر چلی گئی۔ کافی کو دیکھ کر کرسیٹن نے اپنے بیگ سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ اسے میری طرف بڑھایا تو میں نے معذرت کرتے ہوئے انکار کیا۔ "آپ کی پیش کش کا بہت بہت شکریہ میں سگریٹ نہیں پیتا۔" اس وقت سگریٹ لینے سے انکار کرتے ہوئے میں نے ذرا خفت سی محسوس کی کیونکہ ان کے اس التفات کی خاطر مجھے ان سے زیادہ سے زیادہ انسیت کی ضرورت تھی۔ اس انکار پر کرسیٹن نے میرا ہلکا سا جائزہ لیا اور کچھ سوچ کر مسکراتے ہوئے کہا:

"معاف کیجئے گا اسکول میں میں نے آپ کو کبھی سگریٹ پیتے ہوئے نہیں دیکھا۔" اس مرتبہ ذرا میری ہمت بڑھی تو میں نے کہا "جی نہیں، مجھے سگریٹ پینے کا شوق نہیں۔"

"سوائے پڑھانے اور کھانے پینے کے، آپ کو کسی اور چیز کا شوق نہیں؟"

"کھانے پینے، پڑھانے کے علاوہ آپ سے ملنے کا بھی شوق ہے۔" میرے جواب پر کرسیٹن کی باچھیں کھل گئیں۔ واقعی اس وقت اس برجستہ جملے نے FLIRTING کا حق ادا کر دیا اس سے مجھے خوشی کے ساتھ اپنی ذات پر اعتماد بھی حاصل ہوا۔

"اسکول میں آپ کے دوسرے ہم وطن لوگ اور بھی ہیں کبھی میں نے آپ کو ان کے ساتھ نہیں دیکھا؟"

"لندن میں، میں ان سے ملنے نہیں آیا۔ میں انھیں خوب جانتا ہوں۔ ان میں پلا بڑھا ہوں۔ ملنے کا شوق تو آپ سے ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایسے لوگ مجھے بور کرتے ہیں۔" کرسیٹن نے میرا جواب سن کر کافی کا کپ اٹھایا، ایک چسکی لی خاموشی سے ریستوراں کا جائزہ لیا۔ اس وقت یہاں اکثر میزیں خالی تھیں۔ صرف کونے میں ایک ادھیڑ عمر کا انگریز اسکول ٹیچر تنہا بیٹھا اخبار پڑھنے کے ساتھ کافی پی رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہمیں بھی دیکھ لیتا۔ کرسیٹن کی نظر جب ریستوراں کا جائزہ لیتے ہوئے اس پر پڑی تو اس نے "ہلو" کہا، کرسیٹن نے مسکراتے ہوئے اسے جواب دیا۔ وہ اپنا معاشرتی فرض ادا کر کے پھر اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے بعد کرسیٹن کی نظریں مجھ پر آکر ٹھہر گئیں۔ کافی کی چسکی لے کر پھر مجھ سے سوال کیا۔

"لندن میں آپ کے بال بچے بھی ساتھ ہیں؟"

"صرف ایک لڑکا ہے۔"

"اور بیوی؟"

"وہ اللہ کو پیاری ہو گئی۔"

"مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔" کرسیٹن کی زبان سے افسوس کا لفظ ضرور نکلا۔ لیکن چہرے پر بالکل دوسرا رنگ، جس سے میرے دل نے بڑی رجائیت محسوس کی، پھر کچھ سوچ کر میں نے سوال کیا۔

"اور آپ؟"

"ہاں، میرے بھی ایک لڑکا ہے۔"

"کیا آپ شادی شدہ ہیں؟" میرے سوال اور تعجب پر کرسیٹن کو ہنسی آ گئی۔ اسی معصوم مسکراہٹ کے ساتھ اس نے پھر پوچھا
"کیا میں ماں نہیں لگتی؟"
"بالکل نہیں، آپ کی عمر ماں بننے کی کب ہے"
"اسی عمر میں تو بہت سی غلطیاں ہوتی ہیں" کرسیٹن نے اس پہلی ملاقات میں اس موضوع پر ذرا صاف صاف طریقہ سے گفتگو کرنا مناسب نہ سمجھا، مصلحت کی خاطر میں نے بھی اس موضوع پر کچھ زیادہ نہ کریدا۔ اس لئے غلطیوں والی عمر کو معمہ کی طرح چھوڑ کر پھر اپنائیت کے تاثر کو پیدا کرنے کی خاطر اس کے لڑکے کے متعلق سوال کیا:
"کیا آپ کا لڑکا آپ کے ساتھ رہتا ہے؟"
"نہیں، اسے ایک ایسی شادی شدہ عورت کو دے دیا ہے، جسے بچے کی شدید ضرورت تھی۔"
"کیا وہ آپ کو یاد نہیں آتا؟" یہ سوال بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا۔ جس کا مجھے بڑا افسوس ہوا کیونکہ میرا یہ سوال تو براہ راست اس کی ذاتی زندگی میں ایسی مداخلت تھی جس کا دروازہ اس نے پہلے ہی بند کر دیا تھا۔ میرے اس سوال پر کرسیٹن کی آنکھوں میں ماں کی آنکھوں کی طرح نرمی آ گئی اور نظر بچا کر اس نے جواب دیا "کیوں نہیں۔ میں اس کی ماں ہوں۔ جب مجھے فرصت ملتی ہے اسے دیکھنے ضرور جاتی ہوں"
اس جواب کے بعد کرسیٹن پھر سنجیدہ ہو کر اداس ہو گئی۔ مجھے اپنی حماقت پھر ستانے لگی کہ میں نے یہ کیا کیا۔ عورت سے معاملہ کرنے کی سمجھ میں بالکل صلاحیت نہیں۔ مرحوم بیوی بیچاری شریف اور وفادار تھی، اسے جب میرے پلے باندھ دیا گیا تو اس غریب کو نباہ کے لئے خود ہی میں ترمیم کرنا پڑی۔ میں ویسا کا ویسا ہی رہا جیسا ماحول نے مجھے بنا دیا تھا، کافی پینے کے دوران تھوڑی سی خاموشی رہی۔ اپنی حماقت کے خوف کی وجہ سے اس خاموشی کو توڑنا میں نے مناسب خیال نہ کیا۔ اس وقت سوائے خوف کے میرے ذہن میں کچھ اور نہ تھا۔ اداسی کے بعد خاموشی کرسیٹن پر بار تھی۔ جب میرے منہ سے کچھ نہ نکلا تو اس نے میری کافی کی دعوت کا شکریہ ادا کر کے اپنے گھر جانے کے لئے کہا۔ مگر بجائے اس کے میں نے دوبارہ کافی کی دعوت دی۔
"نہیں، اب چلنا چاہئے، کافی دیر ہو چکی ہے۔"
"اس کا خیال نہ کیجئے۔ یہ ریستوران گاہکوں کے لئے ہی ہے آپ سے ملنے کی بڑی تمنا تھی۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ آپ نے میرے ساتھ بیٹھنے کی زحمت گوارا کی۔ یقین مانئے یہ میری عزت افزائی ہے جس کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔"
میرے اصرار اور وکٹوریہ کے عہد کے آداب و خوشامد سے وہ ذرا خوش ہوئی۔ اپنے بیگ کو پھر میز پر رکھتے ہوئے کہا۔
"لیکن زیادہ دیر نہیں۔"
"بالکل نہیں" میں نے بچوں کی طرح خوش ہو کر پھر کرسیٹن کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد ویٹرس کو دو کافی کا آرڈر دے دیا اس وقت مجھے کرسیٹن کی رضامندی کی طرح اس کی آنکھیں بھی اچھی لگیں۔ ان میں تھوڑا سا لحاظ تھا۔ ویٹرس اس مرتبہ کافی جلدی لے آئی۔ اس نے پھر سگریٹ نکالا۔ اور لگا کر اس کا کش لے کر کچھ سوچا اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہوئی "بڑے دنوں سے میری خواہش ہے کہ تم سے دیانت داری سے بات چیت کروں، کیا اس دیانت داری اور بے تکلفی کی اجازت ہے؟"
"بڑی خوشی کے ساتھ" میں نے کہا۔
"تم اس ملک میں کیوں آئے؟ تم یہاں خوش ہو؟"
"کرسیٹن! اگر میں یہاں خوش نہ ہوتا تو اتنے برس اس ملک میں کیسے گزارتا۔ میرا یہاں مکان ہے" اس مرتبہ میں نے ذرا تیزی سے جواب دیا جیسے میں اس تیز لب و لہجہ کو اختیار کر کے اپنی اس مستقل بے چینی کو چھپانا چاہتا ہوں۔ جو وقت کے گزرنے کے ساتھ کینسر کی طرح میرے اندر طرح طرح کے روپ دھار رہی ہے۔ لیکن اس مرتبہ کرسیٹن میرے لب و لہجہ کی تیزی سے بالکل متاثر نہ ہوئی۔ اس نے پھر میری آنکھوں کا تعاقب کیا۔ اس کی آنکھوں کو مجرموں کی طرح میں نے دیکھا ان میں تلوار کی طرح تیز دھار والے کئی سوال تھے جو میری آنکھوں کو چیر کر میرے اندر جانا چاہتے تھے۔ میں نے اپنی

آنکھیں بھی نیچی کرلیں۔ کیونکہ انھوں نے ہی تو مجھے کرسیٹن کے سامنے ننگا کرکے رکھ دیا تھا۔ اس وقت اس صورت میں میں اس کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔

"نہیں مسٹر راشدین یہاں کوئی سٹوپڈ نہیں۔ مختلف کیفیتوں کو یہاں لوگوں نے خوشی کا نام دے رکھا ہے۔ یہاں ہر آدمی اپنے دکھوں کو ناسور کی طرح چھپا کر ہی کہتا ہے، میں بہت خوش ہوں۔ میرے بہت سے دوست ہیں، اور اتنا مصروف رہتا ہوں کہ ان دکھوں سے ملنے کی فرصت نہیں۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہاں سب ہی مختلف قسم کی تنہائیوں میں مبتلا ہیں۔ مغربی آدمی نے اپنی جستجو اور مادی تحفظ کی بڑی بھاری قیمت ادا کی ہے۔ یہاں خوشی کا لوگوں کو سورج کی روشنی کی طرح انتظار رہتا ہے۔ کبھی کبھی وہ آتی ہے لیکن ان کے وسوسے اور رعادتیں اسے پھر بادلوں کی طرح چھپا لیتے ہیں یہاں لوگوں کے دکھوں اور ذاتی ضرورتوں نے ان کے دل اتنے سخت کر دیئے ہیں کہ دوسروں کے دکھوں کو محسوس کرنے کی صلاحیت ان میں ختم ہو چکی ہے۔ یا یوں سمجھو ان سے چھین لی گئی ہے، کیونکہ اب یہ اس کے قابل نہ رہے یہاں اکثر و بیشتر کو اپنے مطلب سے مطلب رہتا ہے۔ دوسروں کے دکھوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس لئے جب ان مصروف لوگوں کو مل بیٹھنے کا موقع ملتا ہے تو یہ نہ اپنے دکھ دوسروں کے سامنے رکھتے ہیں، نہ دوسروں کے دکھ سن کر اپنی صحبت کے مزے کو کرکرا کرتے ہیں۔ اس مختصر سی معاشرت میں اگر تھوڑا سا اشتراک مل جائے جسے وہ خوشی سمجھتے ہیں تو اسے غنیمت قرار دیتے ہیں۔"

"نہیں، نہیں۔ میرے ساتھ یہاں ایسی کوئی بات نہیں۔ میں یہاں بہت خوش ہوں۔ یہاں میرا اپنا مکان ہے۔ مستقل ملازمت ہے، اس ملک کی شہریت، اس کے علاوہ لوگوں کی خدمت کے لئے ایک دیسی مذہبی انجمن کی صدارت۔ اللہ نے بہت کرم کیا ہے مجھ جیسے معمولی آدمی کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے؟"

اس مرتبہ پھر میری بدحواسی میرے لب و لہجہ پر غالب آگئی (کرسیٹن کے خیالات کی شہ پاکر) انھیں دبانے کی ناکام کوشش کی لیکن ناکام رہا"

"نہیں مسٹر راشدین۔ تم معمولی خواہشوں والے آدمی نہیں۔"

اس مرتبہ کرسیٹن نے میری آنکھوں پر بالکل توجہ نہ دی بلکہ سڑک پر گذرتے ہوئے راہگیروں کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"تو آپ کے خیال میں میں کیا ہوں؟" کرسیٹن سے اس مرتبہ میں نے کچھ اس انداز سے سوال کیا جیسے میں اس کے سامنے بالکل ننگا ہو چکا ہوں۔

"تم نہ خود سے دیانت دار ہو نہ دوسروں سے۔ ہمارے یہاں کے بہت سے لوگوں کی طرح تم لوگوں اور چیزوں کو استعمال کرنے کے عادی ہو چکے ہو۔ اس رویے سے کہیں خوشی ملا کرتی ہے؟"

"معاف کیجیئے! مجھے آپ سے اختلاف ہے۔ میں یہاں بچوں کو محنت سے پڑھاتا ہوں۔ اس مصروفیت کے باوجود اپنے لوگوں کی خدمت کرتا ہوں، جس کی وجہ سے مذہبی انجمن کی صدارت کی ذمہ داری قبول کرنا پڑی۔"

"نہیں یہ محنت اور خدمت تم صرف اپنے پست مفاد کی خاطر کے لئے کرتے ہو۔ اس خدمت اور محنت کے ذریعہ نہ خدا کی محبت تمہارے دل میں پیدا ہو سکی ہے، نہ لوگوں کی محبت! لوگوں کی ضرورت سے تو تمہیں کبھی ہمدردی نہ رہی۔ لوگوں سے ملنے کی تمہیں وحشت ہوتی ہے۔ میرے خیال میں تمہیں ہر اس آدمی سے وحشت ہوتی ہے جس کا تمہارے یہاں کوئی مصرف نہیں۔ آدمی سے ملتے وقت سب سے تم اس کا اندازہ لگاتے ہو کہ تمہارے یہاں اس کا کیا مصرف ہے۔"

"نہیں، کرسیٹن، تمہارا یہ تجزیہ صحیح نہیں"

"تو تمہاری آنکھیں تمہاری مسکراہٹ کا ساتھ کیوں نہیں دیتیں؟ مجھے تمہاری مسکراہٹ بہت پسند ہے۔"

"یہ میرے اختیار میں کب ہے۔"

"نہیں مسٹر راشدین، یہ سب کچھ تمہارے اختیار میں ہے۔ تم اس وقت جو کچھ ہو مجھے پسند نہیں۔ معلوم نہیں یہ مسکراہٹ تمہارے یہاں کہاں سے آئی۔ کس چیز نے تمہاری مسکراہٹ

بقیہ ص۸۰ پر

غیاث الرحمٰن

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی

اونچے اونچے درختوں کے پیچھے گھاس کی جھونپڑیاں اور دور تک پھیلی ہوئی ہریالی۔ بستی کے چاروں طرف بے شمار خوش رنگ پھول۔ پہاڑی کے اس طرف بہتی ہوئی ندی کا شور بہت دنوں سے آسمان بالکل صاف ہے۔ نیلگوں وسعتوں میں ایک بھی ابر کا ٹکڑا نہیں۔ لیکن روزانہ بستی والے دیکھتے ہیں کہ آسمان کی بلندیوں سے دو اجلے کبوتر، سورج کی پھوٹتی ہوئی کرنوں کے ساتھ زمین پر اترتے دکھائی دیتے ہیں ——

فرشتوں کی یہ عادت بہت پرانی ہے —— بس وہ آسمان سے اتر کر شاہ بلوط کے اونچے درختوں پر بیٹھ جاتے ہیں سب کی نظروں سے چھپے ہوئے۔ بستی کے چاروں طرف اگے ہوئے پھولوں کو دیکھتے ہیں، اور ان پھولوں میں آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی ننھی منی، معصوم بچیوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔

چھوٹا فرشتہ جس کا علم کم ہے، بڑے فرشتہ سے جس کا علم زیادہ ہے پوچھتا ہے،

"ان معصوم بچیوں اور ان خوش رنگ پھولوں میں کیا فرق ہے؟"

"صرف چند روز کا ——" بڑا فرشتہ سنجیدگی سے جواب دیتا ہے۔

بستی کے کسان سورج کی کرنیں پھوٹنے سے پہلے ہی، اپنے ہل کندھوں پہ رکھ کے بیلوں کی رسیاں تھامے کھیتوں میں چلے جاتے ہیں۔ اور پھر ان کی بیویاں ان کے لئے کپڑوں میں روٹی باندھ کر، مٹی کی گگریوں میں پانی لے کر، دھوپ چڑھ جانے کے بعد بستی خالی کر دیتی ہیں صرف چھوٹی چھوٹی بچیاں بستی میں رہ جاتی ہیں۔

"وہ دیکھو، درختوں کی ڈالیوں میں جھول رہی ہیں، پھولوں میں چھپ رہی ہیں، اچھل اچھل کر شور مچا رہی ہیں اور شور مچا مچا کر بھاگ رہی ہیں۔"

"کیا انہیں کوئی غم نہیں ہے"؟

"نہیں۔"

"کیوں ——؟"

"ماضی اور مستقبل ان کے لئے بے معنی ہیں۔"

"ان کو پھولوں سے اتنا پیار کیوں ہے؟"

"اس لئے کہ پھول بھی نازک ہیں، معصوم ہیں، رنگین ہیں۔ تم جانتے ہو یہ بچیاں کون ہیں؟"

- - - - - - - - - - - - - - - -

اجلے کبوتر پھر آسمان کی بلندیوں میں پرواز کر گئے۔

بستی کے دن اور بستی کی راتیں بہت طویل ہوتی ہیں —— کل جو کچھ دیکھا تھا آج بالکل ہی بدل گیا۔ پھول مرجھانے لگے ہیں، بے شمار بھونرے ان پر منڈلا رہے ہیں۔ بستی میں چہل پہل ہے۔ کسان آج کھیتوں میں نہیں گئے —— ان کی بیویاں گانے گا رہی ہیں۔

"غور سے سنو کتنی مدھر آواز ہے۔"

"ہاں شہنائیاں بھی بج رہی ہیں —— اے دوست

یہ شہنائیاں کیوں بج رہی ہیں ـــــــ ؟"
"کل تم نے جن بچیوں کو رنگ برنگے پھولوں میں کھیلتے دیکھا تھا آج وہ جوان ہو گئی ہیں ـــــــ دیکھو تو آج بستی کے لوگ کتنے خوش ہیں، آج بستی کی تمام دوشیزاؤں کی مانگ سیندور سے بھری جائے گی، اور آج ان کے ماتھے پر بندیا سجے گی اور آج ان کے ہاتھوں میں مہندی رچائی جائے گی اور آج وہ سب دوشیزائیں ڈولی میں سوار ہوں گی، اور آج وہ سب نازک حسینائیں، اپنے دولہوں کے مضبوط بازوؤں میں سما جائیں گی۔"

ڈولیاں اٹھ رہی ہیں، رنگ برنگی ڈولیاں، بستی والوں کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ شہنائی کی تھرتھراتی ہوئی آواز انہیں الوداع کہہ رہی ہے ـــــــ دلہنیں بابل کی اداس گلیوں کو گھونگھٹ کے پیچھے سے آنسو بھری آنکھوں سے دیکھ رہی ہیں، ـــــــ بستی کے رنگ برنگے مرجھاتے ہوئے پھول، ان کے بچپن کے ساتھی، ٹوٹا ہوا مندر جہاں وہ آرتی اتارتی تھیں، اداس پنگھٹ جہاں سے انھوں نے پانی کے بھرے گھڑوں کو کر پر اٹھا کر اٹھلا اٹھلا کر چلنا سیکھا تھا، اونچے اونچے درخت جن پر جھولے ڈال کر انہوں نے پینگیں بڑھائی تھیں ـــــــ آج وہ سب ان سے بچھڑ رہے ہیں۔ آج بستی کی سب گلیاں سنسان ہیں۔

اجلے کبوتر آسمان کی وسعت میں منڈلاتے رہے۔

بستی کے دن اور بستی کی راتیں کتنی لمبی ہوتی ہیں۔

"کل جن لڑکیوں کی شادیاں ہوئی تھیں آج ان کی آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں ؟" کم تجربہ کار فرشتہ نے پوچھا۔

"آج ان کے شوہر بچھڑ رہے ہیں، وہ سب جوان اپنے ہتھیار لیئے پہاڑی کے اس پار سرحد پر جا رہے ہیں، سرحد پر جہاں جنگ چل رہی ہے۔ جوان اپنی دلہنوں کا آخری بوسہ لے رہے ہیں۔ اور دلہنیں اپنے کپکپاتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر جانے والوں کو الوداع کہہ رہی ہیں"
ـــــــ جوان جو قوم کی عزت ہیں، وطن کی لاج ہیں محافظت کے مالک، کامرانی کے رہنما ـــــــ چلے گئے۔

لڑکیاں اپنے گھروں کی چوکھٹ پر کھڑی، جنگ کے خاتمے اور اپنے شوہروں کے واپسی کا انتظار کر رہی ہیں اور وہ کر بھی کیا سکتی ہیں۔

بستی کے دن اور بستی کی راتیں اف کتنی طویل ہو گئی ہیں۔

"اے دوست! آج بستی میں اس قدر کہرام کیوں مچا ہوا ہے ؟"

"آج ان دلہنوں کی مانگ سے سیندور پونچھا جا رہا ہے، کل جن کے ماتھے کا ان کے شوہروں نے آخری بوسہ لیا تھا، آج ان ہاتھوں کی چوڑیاں توڑی جا رہی ہیں، جن کانپتے ہوئے ہاتھوں نے کل جانے والے فوجیوں کو الوداع کہا تھا۔

اور پھر بستی کی ایک طویل رات گذر جانے کے بعد، سورج کی پہلی کرن کے ساتھ بستی کے چاروں طرف رنگ برنگے پھول کھل اٹھے، صبح کی ٹھنڈی ہوائیں مسکرا مسکرا کر جھومنے لگے۔

بستی کے سارے کسان اندھیرے منہ اپنے کھیتوں پر جا چکے ہیں۔ دن چڑھ جانے کے بعد ان کی بیویاں ان کے لئے کپڑے میں روٹی باندھ کر اور مٹی کے گگری میں پانی لے کر چلی گئیں۔

"اے دوست یہ رنگ برنگے پھول اتنے حسین کیوں ہیں" ؟

"کل جن حسیناؤں نے اپنے شوہروں کی موت پر آنسو بہائے تھے، اپنے ہاتھوں کی چوڑیاں توڑ ڈالی تھیں۔ اپنی مانگ کا سیندور پونچھ ڈالا تھا ـــــــ انہیں حسیناؤں کی قبروں سے اگ آئے ہیں ـــــــ وہ دیکھو، بستی کی معصوم بچیاں آج پھر ان پھولوں میں آنکھ مچولی کھیل رہی ہیں۔"

گلوں کی خوشبو

نئی نسلیں ۱۱۔ رسالہ سرورق سے لے کر آخر تک پسند آیا۔ ایک کاپی صادق نسیم کو پہونچا دی ہے۔ ابن فرید صاحب کو مبارک باد پہونچا دینا۔

توصیف تبسم (اسلام آباد)

اسعد اور اقبال صلاح الدین کی نعتیں بہت زوردار ہیں اور تجربہ کی بھٹی سے گزری ہیں۔ ان کا ظاہر و باطن حب مصطفوی سے سرشار ہے۔ حمد و نعت کے اس طرح کے تجربات پاکستان میں کافی ہو رہے ہیں اور کامیاب ہیں لیکن اس حصے کو مقالات کے پہلے نے آئیں اور اداریہ کے بعد اس کو ترتیب میں جگہ دیں، مناسب ہوگا۔
اپنی باتیں خوب ہے۔ پیر مغاں کی پرانی اصطلاح کو ایک نئی معنویت سے آراستہ کیا گیا ہے۔ "عصر حاضر کا پیر مغاں"، مضمون نگاروں کو آپ نے ایک عنوان دے دیا ہے۔ اور بھائی جویریہ رفعت سروش نے دسویں شمارے کے توسط سے کرسی نشینوں سے لے کر پردہ نشینوں تک کی بات چھیڑی ہے اور تفصیل چاہی ہے، اسی طرح مشفق خواجہ نے تفصیل چاہی ہے کہ نوجوانوں کا استحصال کرنے والے کون ہیں۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ ایسے ہی آپ لکھتے رہیں تو بھی غنیمت ہے۔ اور میرے خیال میں :

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

کے آپ مصداق ہیں۔
افسانوں کے حصے میں عبدالصمد اور بازغہ تبسم کامیاب ہیں۔ کہانی اعتراف آخر میں چل کر غیر فطری پن کا شکار ہوگئی ہے۔ توفیق الٰہی اتنی آسان نہیں جتنا صفیہ ملک کا خیال ہے۔
غزلوں میں توصیف تبسم، مغنی تبسم، اور رفعت سروش پسند آئے۔ "خلش" کی چھ کڑیاں جادو کا اثر رکھتی ہیں۔

طارق سعید (فیض آباد)

"نئی نسلیں" کی ذمہ داری آپ نے قبول کرلی ہے بہت ہی اچھا کیا ہے۔ آپ کی تنقیدی بصیرت خود ایک سند ہے۔ توقع ہے کہ رسالہ انشاءاللہ اب زیادہ ادبی اور تخلیقی ہو جائے گا۔
تازہ شمارہ پروفیسر مدنی کے پاس دیکھا، پسند آیا، صرف کتابت و طباعت کچھ اور توجہ چاہتی ہے۔ کاتب خوش خط

ہو تو حسن نکھر جاتا ہے ۔

سید احمد شمیم (جمشید پور)

آپ کے موقر جریدہ "نئی نسلیں" سے میری وابستگی پرانی ہے۔ لیکن جب سے اس کا اشاعتی مرکز دہلی سے علی گڑھ منتقل ہوا ہے۔ استواری رابطہ کی نوبت نہ آسکی۔ میری آنکھیں نزول الماء کے مرض سے متاثر ہیں دعا فرمائیے گا اللہ تعالیٰ مدد اور فضل فرمائے ۔

فضا ابن فیضی (دہلی)

"نمائندہ نئی نسلیں" کا تازہ شمارہ پٹنہ بک اسٹال سے لے کر پڑھا۔ یہ شمارہ سابقہ شمارے سے مواد اور طباعت کے اعتبار سے بہتر ضرور ہے۔ لیکن بہترین نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال آپ لوگوں کی کاوشیں قابلِ ذکر ہیں اور آپ لوگ مبارک باد کے مستحق ہیں ۔

اکرام فرحت (پٹنہ)

"نئی نسلیں" کا تازہ شمارہ زیر نظر ہے۔ جس میں وزیر آغا، ابن فرید، طارق چھتاری، وغیرہ چوٹی کے قلم کاروں کی نگارشات کی شمولیت اس کے معیار کی ضامن ہے۔ مجموعی طور پر یہ شمارہ اچھا تاثر چھوڑتا ہے۔ دیکھیے امید کے اس پر آشوب دور میں اردو رسائل نکالنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ ایسے میں آپ کی یہ کوشش لائق صد تحسین ہے براہ کرم معیار کا دھیان رکھیے۔ خدارا ایسے گروپ بندیوں کے جھگڑے سے پرے رکھتے ہوئے یہ کوشش کیجیے کہ ہر گروپ سے وابستہ رہنے والوں کی نمائندگی ہو سکے چاہے وہ ترقی پسند ہوں یا جدیدیے یا تیسری آواز مختلف دبستان تاکہ قارئین کے سامنے پورے ادب کی مکمل تصویر آسکے ۔

خورشید حیات (گیا)

نجمہ شہریار صاحبہ کی نظم "پانی کی دیواریں" نئی نسلیں کے شمارہ نمبر ۱۱ میں بھی شائع ہوئی ہے اور دائرے نمبر ۲ میں بھی۔ میرے خیال میں یہ نظم اتنی اچھی تو نہ تھی کہ اسے ایک ہی شہر سے شائع ہونے والے دو رسالوں میں بیک وقت شائع کرایا جاتا۔ نجمہ صاحبہ سے ہماری گذارش ہے کہ وہ قناعت سے کام لیا کریں تو زیادہ اچھا ہو ۔

لاجوردی (آگرہ)

۱۹۸۲ء کے اوائل میں
نمائندہ نئی نسلیں
کا
عصری ادبی مسائل نمبر

۱۔ اقدار کا مسئلہ۔ نظریات اور ان کی اہمیت — ہماری فکری اساس اور مغرب کے اثرات — کیا ہم اپنی فکری بنیادیں اپنے ماضی میں تلاش کرتے ہیں یا مغرب سے بغیر سوچے سمجھے مستعار لیتے ہیں — آج کے اہم نظریات — کیا ادب کے لئے مقصدیت ضروری مطالبہ ہے؟

۲۔ (ادب کے حوالے سے) معاشرتی و ثقافتی مسائل — سیاسی و معاشی صورت حال اور جدید نسل پر ان کے اثرات — فرد اور اس کی کائنات — عائلی زندگی اور جنسی مسائل — نئی نسل اور معاشرتی بحران۔

۳۔ ادب میں مروجہ فکری و نظریاتی مسائل — ادب اور اس کا نظام فکر — ادب اور ESTABLISHMENT — ادب اور COMMITMENT — ادب میں فکری و ہیئتی جدید تجربات — اردو ادب کی مختلف اصناف اور ان کی عصری معنویت۔

۴۔ ہمارے معاشرے کے مسائل کا مناسب حل — نظریۂ حیات یا نظام زندگی کی ضرورت۔ کیا ادب ہمارے مسائل کے حل کے لئے مثبت کردار انجام دے سکتا ہے — کیا ادب کی بے معنویت ہمارے نسل کے بحران میں مزید اضافہ نہیں کر رہی ہے۔

اور بہت سے دوسرے موضوعات

پتہ :۔ نمائندہ نئی نسلیں شمشاد مارکیٹ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

نائندہ

ترتیب

ابن فرید
انجم نعیم

۱۳

بارہ شمارے: ۳۰ روپے

ایک شمارہ: ۳ روپیے

رابطہ

دفتر نمائندہ نئی نسلیں شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر

م۔ نسیم

۲۲۴۸، بارہ دری شیر افگن
بلیماران، دہلی ۱۱۰۰۰۶

اداریہ

مقالات

نظمیں

غزلیں

افسانے

خطوط

تبصرے

دوسرا سال   چھٹا شمارہ   ۱۹۸۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اپنی باتیں

نزاجی ادب کی انتہا بہر حال سنسنی خیز صحافت کی صورت میں ہونی چاہئے تھی۔ اب تک شخصی جھگڑے، گروہ بندی اور ان کے معرکے، بلیک میلنگ اور شخصیت کشی وغیرہ ہفتہ وار یا پندرہ روزہ اخباروں کا خصوصی فیچر ہوا کرتے تھے۔ لیکن اب یہ نوبت آگئی ہے کہ ادبی جرائد نے چٹپٹے مسائل کو اپنے پیٹوں پر سجالیا ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوا ہے کہ ان رسائل کے خریداروں کی تعداد بڑھ گئی ہے، اور ان کے آئندہ شماروں کا انتظار بے چینی سے ہونے لگا ہے۔ لیکن جلد یا بدیر اس سے یہ نقصان بھی ہوگا کہ ادبی رسائل میں "فرقہ وارانہ ادبی فسادات" بھی شروع ہو جائیں گے۔

کچھ لوگ بہت برے ہیں، کچھ لوگ ادب کا استحصال کرتے ہیں، کچھ لوگ ادیبوں کو خرید لیتے ہیں۔ یہ سب کچھ ناپسندیدہ ہے۔ ایسے نہیں ہونا چاہئے لیکن یہ پہلے اس لئے ہوتا تھا کہ جاگیرداروں اور تعلقداروں کی محفلوں میں طوائفوں کا ناچ، مجرا اور مشاعرہ وقار کے علائم تھے۔ خوش ذوقی کی نمائش کے لئے جنسی خوش فعلی ہی نہیں ذہنی احتفاظ بھی ضروری تھا۔ بہت سے جاگیردار، تعلقدار، نواب، بادشاہ شاعروں کو مصاحب بنا کر خود صاحب دیوان بن گئے۔ ٹھیک ہے، یہ فیوڈل طبقہ شاعروں کا استحصال کرتا تھا، لیکن کیا شاعر اتنے معصوم تھے کہ انھیں یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ ان کا استحصال ہو رہا ہے؟ آج فیوڈل طبقہ کی جگہ نو دولتیوں نے لے لی ہے۔ یہ جن شاعروں اور ادیبوں کا استحصال کر رہے ہیں کیا وہ جاگیردارانہ دور کے شاعروں سے بھی زیادہ مجبور ہیں؟ آخر کوئی جانتے بوجھتے کیوں بک جاتا ہے؟ اس کا جواب سرمایہ دار نہیں دے گا کیوں کہ اس کا کام ہی اپنے سرمائے سے فائدہ اٹھانا ہے۔ جواب وہ دے گا جو اپنی پیداوار کی قیمت وصول کرنا چاہتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستانی، بالخصوص اردو کا ادبی طبقہ، آسودہ حال نہیں ہے، لیکن ہندوستان کے عام نچلے متوسط طبقہ کے مقابلہ میں بہتر حالت میں بہر صورت ہے۔ اسے اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل کے لئے دریوزہ گری کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر وہ دست سوال بڑھاتا ہے تو ان چیزوں کے لئے جن کو وہ قلم کار کی شخصیت کی پہچان تصور کرتا ہے۔ اگر کوئی نودولتیہ یہ سوچتا ہے کہ اسے ادبی شخصیت بھی مانا جائے تو اسے اس کا حق ہے کیوں کہ بہت سے سوداگران ادب بازار مصر میں اپنا مال لئے ہوئے پہلے سے موجود ہیں۔ اگر کوئی سرمایہ دار کہتا ہے کہ میں ادیبوں کے سامنے ٹکڑا پھینک دیتا ہوں اور وہ دم ہلانے لگتے ہیں، تو یہ بھی درست ہے کہ ٹکڑا انھیں کے سامنے پھینکا جاتا ہے جو دم ہلاتے ہیں۔ تالی بہر نوع دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔

ادب کا اگر کوئی مقصد متعین نہیں کیا جائے گا تو اس کا خالق اس کا مصرف نکال ہی لے گا۔ اگر اس کے پیش نظر اجتماعی فلاح و بہبود نہ ہوگی تو وہ شخصی مفاد پرستی کا شکار ہو جائے گا۔ یہ قانونِ قدرت ہے۔ اور گذشتہ کئی صدیوں تک اردو شاعری

کی بدنصیبی یہی رہی ہے کہ اس کی اہم ترین صنف قصیدہ رہی ہے، یہاں تک کہ اکثر رباعی، قطعہ اور غزل میں بھی مدح خوانی طرح نکر رہی ہے۔ اگر یہ نہیں تو اودھ و دکن کے حکمرانوں کی جنسی ہوس رانی کے لئے ذہنی استلذاذ فراہم کیا گیا ہے۔ اور آگے بڑھئے تو شاعر خود انشا، رنگین، جراءت میرانجی وغیرہ کی طرح مرد سے عورت بن کر ریختی ایجاد کر لایا ہے۔ اردو کی تقریباً تمام مثنویاں بادشاہوں اور شہزادوں کی داستانِ عشق اور معاملاتِ عشق کا دفتر ہیں ان میں بے شک ادب کا کوئی مقصد نہیں ہے، لیکن جاگیرداروں اور شاعروں نے اس کا نجی مصرف ضرور نکال لیا ہے۔

ادب کا مقصد جب صرف ذاتی تسکین ہوگا تو نہ صرف یہ کہ اس کا دائرہ کار محدود ہو جائے گا بلکہ اس کا مطمح نظر بھی پست ہو جائے گا۔ ادب جب تہذیب و ترہیب ذات سے پہلوتہی کرکے انتشار ذات باطنی ذات کو اہمیت دے گا تو فن کار تعمیری بصیرت سے محروم ہو جائے گا۔ اسی طور پر جب فرد کو نظر انداز کرکے جمعیۃ کو مرکز توجہ بنائے گا تو وہ تمام اقدار بے اساس ہو جائیں گی جن سے معاشرے کے ہر فرد کو وابستگی اور پاس داری کی ضرورت ہوتی ہے ان خامیوں کو اسی وقت دور کیا جا سکتا ہے جب فرد و اجتماع کے درمیان توازن قائم کیا جائے۔ ادیب کی شخصیت کی اساس تعمیری اقدار پر ہو اور وہ آدھی بوتل شراب اور ایک عدد لش شرٹ پر اپنی ذات کا توجہ اور دوسرے کی مدح لکھنے کے لئے بے تاب نہ ہو جائے۔ ادب بیچ کر مکان، کوٹھی، کارخانہ سب کچھ بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن بکنے والے کو مجبور دبے بس اور خریدنے والے کو ظالم و مستحصل قرار دینے کے فریب سے کام نہ چلے گا۔ اگر آپ جری، صاف گو اور حق پرست ہیں تو اعتراف کیجئے کہ کوٹھے کی اس دلالی میں آپ بھی برابر کے شریک ہیں۔ دوسروں سے حسد کرنا بہت آسان ہے لیکن آپ نہ بکئے۔ کوئی دولت کے غلط استعمال کی آگ لگاتا ہے لیکن آپ حسد سے نہ جلئے۔ مگر یہ تو اسی وقت ممکن ہوگا جب ادیبوں کی کج روِیوں کے لئے عذر لنگ پیش کرنے کے بجائے سیرت سازی کے لئے مثبت اقدام کیا جائے گا۔ اور جب سیرت مثبت و صالح اقدار پر استوار ہوگی تو ادب خود صحت مند فضا میں پروان چڑھے گا اس کے لئے کسی شعوری کوشش یا آمرانہ حکم کی ضرورت نہ ہوگی۔

——— ابن فرید

اسعد بدایونی

جمال اس کا مسرتوں کو کہانیوں کی زبان دے گا
خیال اس کا سلگتے صحرا میں صدق کا سائبان دے گا

اسی کے جانباز ساری کاذب حکایتوں کو مٹا سکیں گے
کہ حق و باطل کے معرکے میں اسی کا عاشق اذان دے گا

مرے سفینوں کی کہنگی سے مہیب موجیں نہ کچھ کہیں گی
وہ کشتیوں کو شجاعتوں سے بھرے ہوئے بادبان دے گا

رہِ مدینہ پہ چلنے والے بھلا کہیں درمیاں رکے ہیں
شکستہ پر طائروں کو اس کا خیال تازہ اڑان دے گا

وہ حرف روشن ستارہ تابی کے جس میں امکان ہیں ہزاروں
مجھے بھی اپنی پناہ میں لے گا مجھے بھی غم سے امان دے گا

ابنِ فرید

جہنم کے دروا

اب سے تقریباً بتیس سال پہلے جب جہنم کے دروازے
ہی نئی نئی چھپ کر آئی اور مجھے اسے پڑھنے کا موقع ملا تو
میں خاصا جذباتی ہو گیا کیونکہ اس وقت ایرفورس سے
سبکدوش ہوئے صرف ڈھائی سال ہوئے تھے۔ اور اس
زندگی کے تجربات میرے ذہن میں بالکل تازہ تھے۔ سید
اسعد گیلانی صاحب، جو اس ناول میں حامد کے بہروپ
میں ہیں) میرے درمیان صرف اٹھارہ ہزار رنگروٹوں کا
فرق تھا۔ مجھ سے پہلے ایرفورس میں داخل ہوئے اور
اوّل روز سے گلوخلاصی کے لیے کوشاں رہے اور بالآخر
لاکھ جتن سے نجات حاصل کی۔ میں ان کے داخلے کے دو
سال بعد ایرفورس میں بھرتی ہوا اور تقسیم ہند سے پانچ
ماہ قبل اعلیٰ تعلیم کی آرزو کی بنا پر سبکدوشی حاصل
کی۔ یعنی ہمارے تجربات ایک سے تھے، ہماری
زندگیاں ایک سی تھیں۔ انھوں نے بے اطمینانی کے
بنیاد پر ملازمت چھوڑ دی، میں نے ملازمت کے دوران
گورے حاکم سے پنجہ آزمائی کی۔ چنانچہ انسین (رنگون
سے متصل شہر) میں کورٹ مارشل کا سامنا کیا،
اور سنگاپور سے واپسی پر خلیج بنگال میں دوسرے
ہوائی سپاہیوں کے ساتھ بحری جہاز پر بغاوت میں
[illegible]

کے ان لو
تسلیم یا فر
کا واضح ش
کو اسر
اور حکوم
کر دیتا
ر
دوران
افراتفر
مغرب
ساتھ
ملتا
کرتا ۔
کو وہ
کی طر
دی
ٹیڑک
کے
آیا

ابن فرید

جہنم کے دروازوں پر

اب سے تقریباً بتیس سال پہلے جب "جہنم کے دروازوں پر" نئی نئی چھپ کر آئی اور مجھے اسے پڑھنے کا موقع ملا تو میں خاصا جذباتی ہو گیا کیونکہ اس وقت ایرفورس سے سبکدوش ہوئے صرف ڈھائی سال ہوئے تھے۔ اور اس زندگی کے تجربات میرے ذہن میں بالکل تازہ تھے۔ سید اسعد گیلانی صاحب (جو اس ناول میں حامد کے بہروپ میں ہیں) میرے درمیان فرق اٹھارہ ہزار رنگروٹوں کا فرق تھا۔ مجھ سے پہلے ایرفورس میں داخل ہوئے اور اوّل روز سے گلو خلاصی کیلئے کوشاں رہے اور بالآخر لاکھ جتن سے نجات حاصل کی۔ میں ان کے داخلے کے دو سال بعد ایرفورس میں بھرتی ہوا اور تقسیم ہند سے پانچ ماہ قبل اعلیٰ تعلیم کی آرزو کی بنا پر سبکدوشی حاصل کی۔ پھر بھی ہمارے تجربات ایک سے تھے، ہماری زندگیاں ایک سی تھیں۔ انھوں نے بے اطمینانی کے بنیاد پر ملازمت چھوڑ دی، میں نے ملازمت کے دوران گورے حاکم سے پنجہ آزمائی کی۔ چنانچہ انسین (رنگون) سے متصل شہر، میں کورٹ مارشل کا سامنا کیا، اور سنگاپور سے واپسی پر بیچ خلیج بنگال میں دوسرے ہوائی سپاہیوں کے ساتھ بحری جہاز پر بغاوت میں ملوث ہوا اور انتیس دن تک کن سنٹریشن کیمپ میں قید رہا اور بغاوت کا مقدمہ جھیلتا رہا۔ یہ ایرفورس کے ان نوجوانوں کا عام مزاج تھا کیونکہ یہ فوج صد فیصد تعلیم یافتہ ہوتی تھی اور اسے اپنی حیثیت اور مجبوریوں کا واضح شعور ہوتا تھا۔ اچھی ملازمت کا شوق نوجوانوں کو اس طرف کھینچ لے جاتا تھا لیکن رنگ و نسل کا تعصب اور محکوم کے ساتھ آقا کا امتیازی برتاؤ بے چینی پیدا کر دیتا تھا۔
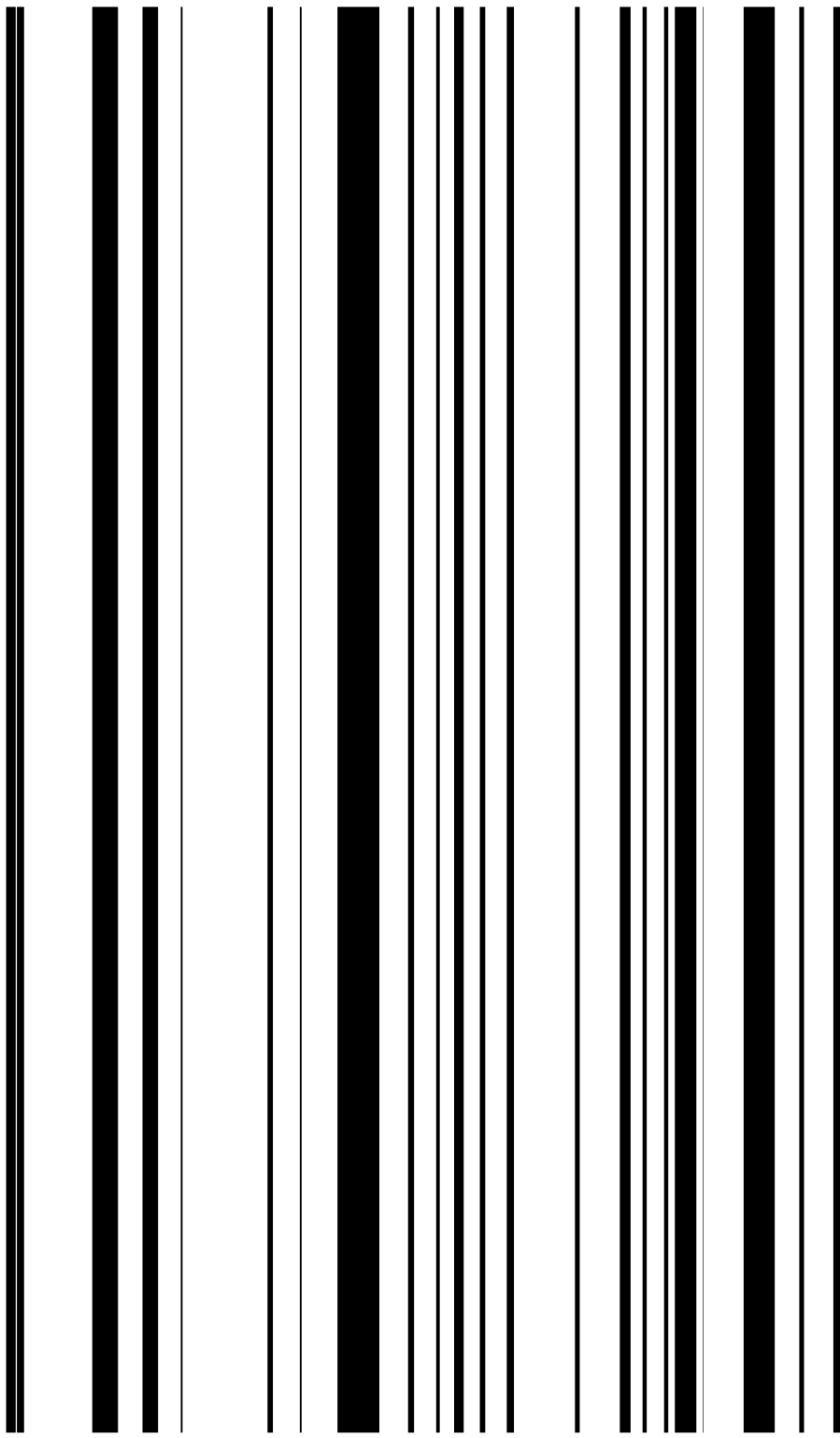
زندگی کے یہ تلخ تجربات اور جنگ عظیم ثانی کے دوران معاشرتی، معاشی اور اخلاقی بحران ایسی افراتفری کی کیفیت پیدا کئے ہوئے تھا جس پر مغرب کے ممتاز ناول نگاروں نے خصوصی توجہ دی۔ سارتر کے یہاں نسلی عصبیت کے خلاف احتجاج ملتا ہے لیکن آندرے موروا دیا اسے آغوش پناہ فراہم کرتا ہے۔ ہماری اردو زبان میں اس بحرانی زندگی کو وہ اہمیت نہ ملی جو اسے ملنی چاہیئے تھی۔ ابنِ سعید کی طرح چند ایک افسانہ نگاروں نے اس طرف توجہ دی لیکن پھر سرد مہر ہو گئے۔ اس کا سب سے بڑی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جنگِ عظیم ثانی کے ختم ہونے کے دو سال بعد ہی برصغیر ہند میں وہ عظیم انقلاب آیا جسے دو ناموں سے یاد کیا جاتا ہے:

"کیا پایا؟" کے لئے آزادی کے نام سے! اور "کیا کھویا؟" کے لئے تقسیم ملک کے نام

سودوزیاں کے یہ تجربات اتنے شدید تھے کہ پچھلے سارے
تجربات محو ہو گئے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر اسعد گیلانی
نے ناول کا مسودہ تقسیم ہند سے قبل تیار نہ کر لیا
ہوتا تو وہ بھی معاشی سیاسی زندگی کے اس اہم موڑ
کو فراموش کر جاتے۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو "جہنم
کے دروازوں پر" اس بحران کا احاطہ کرتا ہے جس
پر اردو میں کم ہی نہیں بہت ہی کم لکھا گیا ہے۔

جن لوگوں نے دوسری عالمگیر جنگ کے
جہنم میں جھانک کر دیکھا تھا ان کی پھٹی ہوئی آنکھوں
میں اس وحشتناکی کی جھلک دیکھی جا سکتی تھی جو
ان کے دلوں میں سمائی ہوئی تھی۔ شہروں، بستیوں،
ویرانوں، جنگلوں، خشکی، سمندر اور ہوا میں موت
دیوانہ وار منڈلاتی پھر رہی تھی۔ انسانی اعضا، خونی
بگولوں میں خشک پتوں کی طرح اڑتے نظر آتے تھے
سمندر کی گہرائیوں میں بھیانک سرنگیں غوطہ زن
تھیں، ہوا میں موت کے [illegible] منڈلا رہے تھے۔
تباہیاں اور بربادیاں [illegible] باندھ کر [illegible]
کئے ہوئے تھیں اور لاتعداد زندگیوں کے ٹمٹماتے ہوئے
کمزور چراغوں کو بے اماں کا تاریک سایہ نگلتا چلا جا رہا
تھا۔ فضا کو ہچکیاں، سسکیاں، آہیں اور نالہ و شیون
زہر آلود کر رہی تھیں۔ زندگی ارزاں ہو گئی تھی زندگی کے
وسائل گراں! اقدار حیات معدوم ہو گئی تھیں اور
وحشت و بربریت عام! آنے والا ہر لمحہ گذرے ہوئے
لمحے کی سنسنی خیزی کی وجہ سے بے یقینی و بے اعتمادی
کی شدت میں برابر اضافہ کرتا جا رہا تھا۔ ہر ملک اور
ہر شخص ایسی اضطراری کیفیت میں مبتلا تھا کہ زندگی
کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا یا دقت نظر اور نکتہ
رسی کیلئے فرصت عنقا ہو گئی تھی۔

برصغیر ہند براہ راست اس جنگ میں ملوث
نہیں تھا، علاوہ اس کے کہ اس کی شمالی مشرقی
سرحدیں زد پر تھیں اور اس کی فوجیں مختلف جنگی
میدانوں میں برسرپیکار تھیں۔ اس کا شہری ذہن
ایک طرف حصول آزادی کے لئے جدوجہد کر رہا
تھا اور دوسری طرف نوکری حصول زر کے مواقع
ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس طرح
اقدار کی کشمکش اور زندگی کی معنویت / لایعنیت
کا بحران نوجوان ذہنوں میں بھی کروٹیں لے رہا تھا۔
سیّد اسعد گیلانی نے اسی معاشرتی اور سیاسی
پس منظر میں "جہنم کے دروازوں پر" کے تاروپود
کی بافت کی ہے۔

ہر دور کی بے اطمینانی سے اس کا حساس ذہن
پیدا ہوتا ہے جو ان ناسوروں کا مشاہدہ کر کے مضطرب
ہو جاتا ہے جو معاشرے کی صحت مندی کو گلاتے
سڑاتے چلے جاتے ہیں۔ یہ حساس ذہن اس ناول
میں حامد کی صورت میں ابھرتا ہے جو اپنی عملی زندگی
کی ابتدا تعلیم کو نامکمل چھوڑ کر کلرکی سے کرتا ہے،
لیکن یہ مردہ اور بےجان زندگی اسے راس نہیں آتی
اس لئے وہ ایئرفورس میں بھرتی ہو جاتا ہے جہاں
تعلیم یافتہ ہی بھرتی ہوتے ہیں مگر یہاں بھی وہ ایک
کاری چوٹ کھانے سے نہیں بچتا۔ رنگ و نسل کا
امتیاز، حاکم و محکوم کی درجہ بندی اس طرح اس
خواندہ طبقہ کو مسخ کر دیتی ہے کہ وہ اپنی خودداری کو
بھی گنوا بیٹھتا ہے۔ ان نوجوانوں میں ذہنیا نہ پن،
سفلہ پن اور اخلاقی پستی کو اس طریق رچا بسا دیا
جاتا ہے کہ وہ انسان کا حیوانوں میں تبدیل ہو جاتے
ہیں۔ اس صورت حال سے حامد غیر مطمئن ہو جاتا ہے
اور وہ اس سے نجات پانے کی کوشش کرتا ہے۔
یہاں زندگی کیلئے صالح اور مثبت نظریہ حیات اس
کی رفتہ رفتہ پروان چڑھتا ہے اور بتدریج پختہ
ہوتا چلا جاتا ہے۔ حالات جس قدر ناساعد ہوتے
ہیں اس کا عزم اتنا ہی راسخ ہو جاتا ہے۔ اپنے گرد
و پیش میں ہوائی فوج کے سپاہیوں کو جس قدر

پھر بھی اس کی تمناؤں میں شریک ہو جاتا ہے۔

زندگی صرف ایک رقص نہیں ہے اس کا احساس سید اسعد گیلانی کو بھی ہے۔ چنانچہ وہ اس ناول میں ان کرداروں کو بھی نمایاں کرتے ہیں جو زندگی کی تہذیب و تزئین سے متعارف نہیں ہوتے ہیں۔ انور اخلاص کا پیکر ہے لیکن ناکت خدا ہے اپنی اہمیت اس کے نزدیک صرف اس قدر ہے کہ اس کے کندھوں پہ اس کے اہل و عیال کا بوجھ ہے۔ ناظر ہوس کا تنور ہے، اسے کسی پہلو چین نہیں۔ رحیم بخش عرف رانجھا " بے شرمی اور ڈھٹائی " کے سامنے اپنے سارے انسانی اوصاف سے دست بردار ہو جاتا ہے۔ یہ چند کردار اتنے متنوع ہیں کہ ان سے حامد کے ذہنی عمل اور شخصیتی نوع کا پس منظر تیار ہوتا ہے۔ ان میں وہ ہستیاں ہیں جو صرف حیاتی سطح پہ زندہ رہنے پر اکتفا کر لیتی ہیں، وہ شخصیتیں ہیں جو غور و فکر کی صلاحیت رکھتی ہیں لیکن عملی اقدام نہیں کر سکتیں۔ انہیں نادیدہ خوف پیش قدمی سے باز رکھتا ہے۔ چنانچہ اس ہراساں ماحول میں دلیل راہ بن کر حامد ہی ابھرتا ہے اور زندگی کیلئے نئے امکانات کو روشن کر دیتا ہے۔

سید اسعد گیلانی نے "جہنم کے دروازے پر" میں خاصی جذباتی زبان استعمال کی ہے اس کا اعتراف خود موصوف نے کیا ہے۔ ابر فورس کی ملازمت [illegible] انگریز دوست نے ایک بار ریڈیو کی خبروں کے ساتھ تبصرہ کیا کہ "تم ہندوستانی آخر [illegible]، [illegible] تیز مسالے وغیرہ کیوں [illegible] کرتے ہو؟" میں اس شدت [illegible] میں بارہا سوچتا رہا اور [illegible] الجھتا رہا۔ اس ناول میں جذباتی زبان نے

مجھے پھر ایک بار اس طرف متوجہ کر دیا۔ گیلانی لکھتے ہیں کہ انھوں نے خیالات کے اظہار کے اسی زبان کو موزوں پایا۔ اور میں سوچتا ہوں کہ غلامی، مجبوری، بے بسی اور تحقیر کا احساس اس دور کے نوجوان کو مضطرب کئے ہوئے تھا۔ چنانچہ وہ ذہنی سفر جس کی فنکارانہ نمائندگی گیلانی نے کی ہے ان انتہا ذہنی سے اکثر جا ٹکرایا کرتا تھا جو سرکشی اور قنوطیت کی نمائندہ تھیں۔ ہم اس زندگی کا اندازہ اس زبان کے بغیر کر ہی نہیں سکتے جو اپنے خاندان، ماحول اور فطری گردوپیش سے یکسر منقطع ہو کر انسانوں کے گلے میں گزاری جائے اور ذہن و جذبات کو یکسانیت کی پیدا کردہ اکتاہٹ کے سوا انکاس کی کوئی اور راہ نظر نہ آئے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ اس ناول میں کمزوریاں نہیں ہیں۔ ہیں، ضرور ہیں —— [آپ خود ہی تلاش کر لیں] —— لیکن چھوٹی موٹی کمزوریوں کے باوجود [جو آپ تلاش کر لیں گے] یہ ناول اردو میں ایک اہم موضوع کا انتخاب کرتا ہے، اسے کامیابی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اپنے عہد کے مروجہ پلاٹ سے گریز کرتا ہے اور ہیرو، ہیروئین اور ولن کی تثلیث کو نظر انداز کر کے مکمل ناول پیش کرتا ہے۔ اس نوعیت کے ناول شخصیتی بحران پر نہیں لکھے گئے ہیں اور اب جو چند ناول ہمیں نظر آتے ہیں، جن میں عبداللہ حسین کا "اداس نسلیں" سب سے ممتاز ہے، وہ سب "جہنم کے دروازے پر" کے بعد لکھے گئے ہیں۔ اس اہمیت کے باوجود اس ناول کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ اس سے کم تر اور کمزور تر ناولوں پر صفحات کے صفحات سیاہ کئے گئے ہیں لیکن اس ناول کو جو اردو ناول کی تاریخ میں زندہ رہنے کی مستحق ہے بے اعتنائی کا شکار بنایا گیا ہے۔ لیکن اس روش سے بددل ہونے کی ضرورت

نہیں ہے کیوں کہ تاریخ ادب میں ایسا اکثر ہوا ہے۔

جب یہ ناول شایع ہوا تھا تو میں نے اس پر ایک تفصیلی مضمون لکھنؤ یونیورسٹی کے اس "اردو جرنل" کے لئے لکھا تھا جو ہم اردو والوں کی اپنی سرد مہری کی وجہ سے شائع نہ ہوا۔ وہ مضمون اس جرنل کے ساتھ فنا ہو گیا۔ اب جو میں نے یہ چند سطریں لکھی ہیں تو ان کی اساس وہی یادداشتیں ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ اس ناول کا سحر آج بتیس ۳۲ سال بعد بھی قائم ہے۔ کاش اسعد گیلانی اپنے اس فن کو زندہ رکھتے۔ خیر اب بھی کیا دیر ہوئی ہے، وہ اس طرف دوبارہ متوجہ ہو سکتے ہیں اور اردو کو چند بہت اچھے ناول دے سکتے ہیں۔

ناول کے دوسرے ایڈیشن کا "پیش گفتار"

راشد شاذ

غنائیت اور شعریت کی تفہیم

شاعری ایک عظیم ترین عطیہ ہے یہ ہمارے دل میں روشنی بپا کرتی روح کو گدگداتی اور ذہن کو تعیش کی پیغمبرانہ کیفیت سے مالامال کرتی ہے اتنا ہی نہیں جب یہ پیغمبرانہ صفت نوائے پریشاں کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے تو ہمارے سوز دروں کو قوت فکر سے مسلح کرتی اور ہمیں جہد و عمل کیلئے تیار کر دیتی ہے۔ اس روحانی بصیرت کے ذریعہ درون میخانہ کے سارے راز ہم پر منکشف ہوجاتے ہیں۔ محرم راز اور پیغمبرانہ سلسلہ کے خاتمہ کے بعد شاعری ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس سے آسمان و زمین کا تعلق قائم رہ سکتا ہے۔ قرآن نے ایک جگہ شاعروں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ ملائے اعلیٰ سے اچک لے جاتے ہیں۔ اسی بنیاد پر "شاعری جزویست از پیغمبری" جیسی باتیں کہی گئی تھیں۔ اب اگر شاعری کو اس تناظر میں دیکھا جائے تو یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ شاعری اپنے انداز صرف پیغام ہی نہیں رکھتی بلکہ پیغام سے متاثر کرنے کیلئے اپنے اندر ایک زبردست نظام بھی رکھتی ہے۔ اس کی وجہ سے الفاظ و معانی سے قطع نظر سامع پر مخصوص اثرات مرتب کرنے میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہتی ہے۔ کبھی تو یہ غنایت کے راستے پر جاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور دل فرط جذبات سے معمور ہوجاتا ہے اور کبھی VIOLENT RHYTHM کے استعمال سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دلوں پر ہتھوڑے چل رہے ہوں یہ سب اسی صوتی ترتیب کا کرشمہ ہے جو ہر بڑی شاعری میں اپنی مخصوص انفرادیت کے ساتھ موجود ہوتی ہے۔ شعری آہنگ کا مطالعہ اس اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

گذشتہ چند برسوں میں جہاں اردو میں صوتیات کے مطالعہ کا رجحان عام ہوا ہے اور صوتی اثر SOUND IMPACT کی اہمیت کو محسوس کیا جانے لگا ہے وہیں شعری آہنگ کو غنایت کے تناظر میں سمجھنے سمجھانے کی کوششیں بھی ہونے لگی ہیں۔ دوسری طرف خود غنایت کا مسئلہ اور اسے ایک بہتر علم بیان کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوششوں نے غنایت کے دلدادہ حضرات کو اس بات پر مجبور کیا ہے کہ وہ غنایت کو شعری تناظر میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کریں ورنہ غنایت کا فریضہ (FUNCTION) بالکل کھوکھلا اور مستقبل تاریک ہوجانے کا اندیشہ ہے۔

غنایت کے اس مسئلہ نے اس وقت سر اٹھایا ہے جب اس کی اہمیت شاعری میں اور شاعری سے باہر فن موسیقی میں تسلیم کی جاچکی ہے لیکن غنایت کو اس کا انفرادی وجود تسلیم کرانے میں سب سے بڑی رکاوٹ شاید خود فن موسیقی ہے۔ جہاں موسیقیت سے الگ ہٹ کر غنایت کے وجود کو کبھی بھی تسلیم نہیں کیا گیا۔ لہذا اس صورت حال میں شاعری ہی وہ واحد ذریعہ ہے جو غنایت کی ترجمانی کر سکتی ہے اور اسے اس کی زندگی کی ضمانت دے سکتی ہے۔ اس مقصد کیلئے غنائی آہنگ کے

تعمیر اردو زبان و ادب کے فطری آہنگ کے نظم کا مطالعہ
بہت ضروری ہے۔ اس نقطۂ نظر سے غنایت کا مطالعہ
کرنے کیلئے اور لسانیات کے تحقیقی و توضیحی طریقہ کار
سے اس تک پہنچنے کیلئے غنائی آہنگ کی شناخت
کے سلسلے میں بڑی بالغ نظری کی ضرورت ہے۔ اس
کے لئے غنایت کی شناخت کے تمام اصول ساختیاتی
لسانیات یا ہیتی لسانیات (STRUCTURAL
LINGUISTICS) کی بنیاد پر وضع کرنے پڑیں
گے۔

غنائی آہنگ اور فطری آہنگ لسانیات کی سطح
پر کم از کم چار نقاط پر مجتمع ہو سکتا ہے۔ ان میں قدر اشتراک
تلاش کی جا سکتی ہے۔ اولاً غنائی زبان MUSICAL
NATURAL) اور فطری زبان (LANGUAGE
LANGUAGE کے تقابلی مطالعہ کے دوران
مخصوص غیر منصرف طریقۂ کار کے ذریعہ ان کے قدر و
قیمت کے تمیز کے دوران ثالثاً غنائی آہنگ اور اس
کی نحوی ساخت کے ہیتی تجزیوں کے دوران رابعاً غنایت
کی لفظیات میں تحقیقی تجزیوں کے دوران ـــ حقیقت
تو یہ ہے کہ غنایت کی شناخت کے تمام اصول اور مسائل
جن کی ابتدا کا سراغ قدیم علم موسیقی میں لگایا جاتا ہے
آج ان سوالات کے جواب دینے سے قاصر ہیں جو غنایت
پر جدید تحقیق کے بعد ہمارے سامنے آ رہے ہیں شاید اسی
لئے اب ان سب سارے مسائل کا حل لسانیات کی
سطح پر تلاش کیا جانے لگا ہے لہذا غنایت کی شناخت
کے اصول وضع کرنے کے لئے لسانیات کی قدیم
تحقیق اور کاموں پر بھروسہ کرنے کی بجائے نئے سرے
سے اس مخصوص نقطۂ نظر سے تحقیق کی ضرورت ہوگا
اور جبھی یہ مسئلہ لسانیات کی سطح پر حل کیا جا سکے
گا۔

ہیتی لسانیات کے مختلف اصول و قواعد جن
کی بنا قدیم تحقیق کی بنیادوں پر رکھی گئی شعری غنائی
آہنگ کی شناخت کے ان کاموں میں معاون تو ضرور
ہو سکتے ہیں لیکن لسانیات کسی بھی صورت میں
غنائی آہنگ کی شناخت کیلئے رہنمائی کا فریضہ
انجام نہیں دے سکتی۔ اسلئے یہ مسئلہ بھی خارج از
بحث ہے کہ غنائی شناخت کے اصولوں کو لسانیات
کی بنیاد پر وضع کیا جانا چاہئے یا نہیں۔ حقیقت تو
یہ ہے کہ لسانیاتی اکائی (Linguistic Unit)
کو غنائی اکائی (Musical Foot)
میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ کسی خاص
موقع پر استعمال کرنے کیلئے اس کی اندرونی شناخت
اندرونی ANALOGY اور مزاج سے واقف ہونا
بھی بہت ضروری ہے یا پھر یہ کہ ان دونوں زبانوں
کے آہنگ کا تجزیہ کیا جائے، فطری اور غنائی
کے فرق کو سمجھا جائے اور پھر کسی نتیجہ پر پہنچنے کی
کوشش کی جائے۔

انسانی زندگی میں فریضۂ ترسیل کیلئے غنائی زبان
اور شعری زبان دونوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔
باطنی ادراک اور ظاہری ترسیلی خصوصیات اور
ان کی لفظیات کے تقابلی مطالعہ کے بعد ہم جس نتیجہ
پر پہنچتے ہیں وہ یہ کہ ان دونوں کے درمیان دو اندرونی
روابط موجود ہیں۔ اولاً ہیتی مماثلت اور ثانیاً ان دونوں
کے ارتباط سے پیدا ہونے والے غنائی اثرات کی
یکسانیت غنائی آہنگ دراصل چند سروں (NOTES)
کے مخصوص نظام کا نام ہے یہی وہ حقیقت ہے
جو غنائی سر (MUSICAL NOTES) کو
MORPHEME (مختصر ترین بامعنی صوتی
اکائی) سے ممیز کرتی ہے۔ جس طرح نغمے کی
زبان غنائی اکائی کی بنیاد پر وضع کی جاتی ہے اسی
طرح فطری اور شعری زبان کیلئے PHONEME
کو بنیادی حیثیت سے استعمال کیا جاتا ہے۔
لفظیات کی معنوی حیثیت سے صرف نظر کرکے

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ مخصوص صوتی
ترتیب فطری ہم آہنگ اور غنائی آہنگ دونوں پر
مختلف طریقہ سے اثر انداز ہوتی ہے۔ کہیں یہ اثر انگیز
فطری آہنگ کو مسحور آتی کہیں غنائی آہنگ اپنے
اندر دلوں کو مسحور کرنے کی بے پناہ صلاحیتیں سمو
لیتا ہے۔ فطری آہنگ کے اصول و ضوابط الفاظ کی
سطحوں پر متعین کئے جاتے ہیں جب کہ غنائی آہنگ
کے اصول اس کی غنائی اکائی کی بنیاد پر تشکیل پاتے
ہیں ان دونوں آہنگوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ
غنائی آہنگ کا ارتقاء INFRASTRUCTU-
RAL LEVEL پر ہوتا ہے جبکہ فطری آہنگ
کا ارتقاء SUPERSTRUCTURAL MO-
RPHEME کی سطح پر محسوس کیا جا سکتا
ہے۔ غنائی آہنگ میں (DOUBLE ARTICU-
LATION) کا مسئلہ بھی ابھی حل طلب ہے
جسے اب تک مارفیم کی بنیاد پر حل نہیں کیا جا سکا
ہے۔ دوسری طرف Double Articulat-
ion کے مسائل پر ہونے والی تحقیقات بالخصوص
The Raga System From North
India میں سے بھی اب تک کوئی ایسی بات سامنے
نہیں آسکی ہے جسے اصول کی حیثیت سے تسلیم کیا
جا سکے۔ جیسا کہ میں نے اوپر بتایا ہے غنائی سُر
(MUSICAL NOTE) کی مدد سے مارفیم کی
شناخت نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح یہ کہنے میں بھی
کوئی مضائقہ نہیں کہ غنائی اکائی کے PHONEME
کو اپنے اندر جذب نہیں کر سکتی۔ جسے "لفظیات"
کی حیثیت سے پہچانا جا سکے۔ بلکہ ایسی حالت میں
مارفیم کی شناخت بھی ایک مسئلہ بن جاتی ہے۔
اس لئے کہ اگر MORPHEME کی لمبائی کو
اس کے PHONEMES کی تعداد کے ذریعہ متعین
کیا جائے تو ایسا فطری زبان یعنی کسی بھی بول چال کی
زبان کیلئے تو ممکن ہو سکے گا لیکن کسی PHO-
NEMES کی مخصوص لمبائی کی وجہ سے یہ کلیہ
غنائی زبان پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے
کہ اگر مارفیم کی متعین لمبائی کو تسلیم کر لیا جائے تو
یہ ناممکن ہوگا کہ کوئی شخص غنائی آہنگ میں بھی
اس متعین لمبائی کی پاسداری کرے اس لئے
کہ یہاں کسی مارفیم کی مخصوص لمبائی کا کوئی تصور
ہی نہیں۔ بلکہ اسکا اختصار اور اسکی طوالت محض
استعمال پر منحصر ہے۔

یہ مسئلہ ایک ایسے مسئلہ سے متعلق ہے جو اس سے
بھی زیادہ پیچیدہ ہے اور اسے لسانیات کی بنیاد پر
ابھی تک حل نہیں کیا جا سکا ہے۔ سوال یہ پیدا
ہوتا ہے کہ آیا غنائی آہنگ اور غنائیت بذات خود
کوئی زبان ہے یا اس کی حیثیت محض علامتوں کی
ہے؟ یہ وہ مرحلہ جہاں مختلف نقاط نظر ہمارے سامنے
آتے ہیں۔ "کسی زبان یا آہنگ کی خصوصیتیں (DO-
uble ARTICULATION)
پر منحصر ہے" "یا" علامتوں کے کسی بھی نظام کو زبان
کی حیثیت سے تسلیم کیا جا سکتا ہے"۔ بہر حال حاصل
جو کچھ بھی ہو ان طرز ہائے فکر سے ہماری گفتگو کو غور و فکر
کا ایک نیا رخ ضرور ملتا ہے۔ اگر غنائی لفظیات
ہیئت کے مطالعہ میں معاون ہے تو یہ حقیقت بھی
نہیں بھلائی جانی چاہئے کہ ہیئت مواد سے قطعی
مختلف چیز ہے۔ اس کے علاوہ غنائیت کی بھی ایک
ہیئت ہوتی ہے جو اس کی ظاہری ساخت اور نغمے
کی زبان کے باقاعدہ وجود کا احساس دلاتی ہے۔
چونکہ غنائی زبان کی لفظیات کو لسانیات کی سطح
پر تسلیم کیا جانے لگا ہے اس لئے لسانیات
کی سطح پر اس کے بہتر مستقبل کی توقع کی جا سکتی
ہے۔ موجودہ صورت حال میں اگر چند اہم اصول
مثلاً غنائی آہنگ کے تجزیے کے طریقے اور اس

کی اکائی (کچھ) MORPHEME کی سطح تک لایا جانا
ممکن ہو سکا تو غنائی لفظیات ایک زبان کی اکائی کے طور کی
حیثیت سے، ایک ایسی زبان کی حیثیت سے جو
اپنے اندر متاثر کرنے کی نسبتاً زیادہ صلاحیت رکھتی
ہو ہمارے سامنے آسکے گی۔

غنائی آہنگ اور شعری آہنگ: دو مختلف لفظیاتی نظام:-

جیسا کہ اس سے قبل بتایا جا چکا
ہے غنائی آہنگ اور شعری آہنگ دو مختلف ہیئتی
اور صوتی نظام کو ظاہر کرتے ہیں یہ نظام دراصل
مختلف مخصوص آوازوں (PHONES) کی بنیاد
پر تعمیر کئے گئے ہیں۔ لیکن ان آوازوں کی بذات خود
کوئی انفرادیت نہیں ہوتی۔ اگر ان دو میں کوئی اختلاف
محسوس کیا جا سکتا ہے تو اس کی وجہ مختلف
(ORGANS OF SPEACH)
سے نکلنے والی ایک آواز ہے جو مختلف انداز میں
سننے کو ملتی ہے۔ لہٰذا اس کے فرق کو سننے یا
بولنے والا صرف Biological سطح پر
ہی محسوس کر سکتا ہے۔ ان مخصوص PHONES
کی شناخت چار سطحوں پر کی جا سکتی ہے۔

(۱) طوالت (۲) وقفہ
(۳) قوت اور (۴) کیفیت

ان دو آہنگ کی خصوصیت جو مختلف لہجے اور
مختلف Context میں مخصوص اثرات مرتب
کرتی ہے۔ لفظیاتی نظام میں اور اس سے آگے
بڑھ کر اس نظام کو معنوی حیثیت سے آشنا کرانے
میں ایک اہم رول انجام دیتی ہے۔
دوسری طرف غنائی نظام کی موجودگی جو ان ہی
PHONES کو مختلف انداز میں اپنے ہاں استعمال
کرتی ہے راسم کی ترسیلی صلاحیت کو ظاہر کرتی
ہے۔ جس طرح غنائی آہنگ کا انحصار غنائی اصطلاحوں
پر ہوتا ہے اسی طرح فطری زبان کی جڑیں لسانی اصطلاحوں
میں پیوست ہوتی ہیں لہٰذا ان میں تقابلی مطالعہ
کی کافی گنجائش ہے۔ غنائی آہنگ مخصوص سطح
پر ترسیل کا وہی فریضہ انجام دیتی ہے جو فطری زبان
کے فرائض میں داخل ہے۔ اس لئے ایسا کہنا
ممکن ہے کہ غنائی زبان سے غنائی اکائیوں کو الگ
کر کے مختلف آوازوں کے ساتھ لفظیاتی نظام
کی روشنی میں ان کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے اور
ان کے اوپر ایک ہی گروپ سے تعلق رکھنے کی
مہر ثبت کی جا سکتی ہے۔ یہی وہ پہلو ہے جس
سے ذریعہ ابلاغ کے ترسیلی نظام میں غنائی زبان
کے مطالعہ کی اہمیت ثابت ہوتی ہے اور جس کا
تعلق کسی نہ کسی سطح پر (GENERAL SEMIOTICS)
سے جا ملتا ہے۔ زبان کی اصل
فطرت تک پہونچنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ ان دو
آہنگ میں مختلف سطحوں پر مشترک صفات
تلاش کی جائیں۔

یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ غنائی آہنگ
اور فطری آہنگ میں بنیادی فرق موجود ہیں۔
غنائی نظام ایک محدود نظام ہے جو چند علامتوں
کے ذریعہ چند مخصوص احساسات وخیالات کو ظاہر
کرتا ہے۔ جبکہ فطری زبان ایک وسیع نظام ہے۔
جس کی حدیں ترسیل (EXPRESSION)
کے مختلف طریقہ اظہار سے جا ملتی ہیں جو مخصوص
معانی کے اظہار کے لئے مخصوص الفاظ کا استعمال
کرتا ہے اس سے اظہار بیان میں وحدت پیدا ہوجاتی
ہے۔ کچھ لوگوں نے شعری آہنگ کو غنائی آہنگ
اور فطری آہنگ کے درمیان کی چیز ثابت کرنے کی
کوشش کی ہے۔ کسی نے شعری زبان کو ترسیلی
زبان Reportage Language
کہا ہے جیسے کے سائنسی زبان SCIENTIFIC LANGUAGE

سے جاسکتے ہیں تو کوئی اسے الہامی زبان قرار دینے پر
مصر ہے۔ اس کے مفہوم کی وضاحت کیلئے -Repo
rtage Poetry Music کی اصطلاح بھی
استعمال کی گئی ہے۔ لیکن اس سے ابہام کی مختلف صورتیں
پیدا ہو گئی ہیں۔ اس سلسلے میں اگر کوئی بات بہت
ہی واضح طور پر کہی جاسکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ غنائی
زبان شعری زبان کی ایک مد کے اظہار کا نام ہے۔
یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ -Repo
rtage Poetry Music کے سلسلے میں
کوئی بھی خیال جس میں عقلی دلائل کا فقدان ہو یا جو
صوتیاتی اصولوں سے براہ راست متصادم ہو ٹھکرایا
جاسکتا ہے۔

اگر ابہام AMBIGUITY کا عقلی دلائل سے
کوئی تعلق نہ ہو اور علمی لسانیات سے اسکا کوئی رشتہ
پیدا نہ کیا جاسکا ہو تو ان تینوں زبانوں یعنی Scientific
Poetical Language، language
Musical Language میں ابہام کے مزید اظہار
کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ ابہام اس سے قطع
نظر کس سطح پر اور کس صورت حال میں پیدا ہوتا ہے
اپنے اندر متعلقہ خصوصیات رکھتا ہے۔ یہ مسئلہ اس
وقت پیدا ہوتا ہے جب مفہوم کے تعین کا سوال
ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص
یہ کہتا ہے کہ ان تین مذکورہ زبانوں میں ابہام کی وجہ
سے ایک مخصوص سلسلے کا کوئی اندرونی تعلق موجود
ہے تو وہ دراصل اس بات کو قبول کرتا ہے کہ کوئی خاص
معنی ان تینوں زبانوں میں کسی خاص لفظ کیلئے تسلیم
کرلیا گیا ہے لیکن ایسی صورت حال میں وہ یہ متعین
کرنے سے قاصر ہوتا ہے کہ عقلی سطح پر اسکا مفہوم کیا
ہونا چاہیئے؟ اس لئے کہ جہاں تک غنائی زبان کا
تعلق ہے یہاں ایسی کوئی بات نہیں ہے جس سے
کسی سطح پر ان دو زبانوں میں قدر اشتراک تلاش کی جاسکے

غنائی شناخت کی علامتیں (جو دراصل غیر لسانیاتی
طریقہ ابلاغ ہے) لسانیاتی شناخت کی علامتوں سے
قطعی مختلف ہیں۔ ابہام دراصل متبدل قدر ہے جو
الفاظ میں طریقہ فکر کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ لیکن
اس قسم کی کوئی بات ان زبانوں کے بارے میں نہیں کہی
جاسکتی جن کی شناخت کی علامتوں میں ان کی فطری
خصوصیات کی وجہ سے اختلاف ہو سکتا ہو۔ اس
کے علاوہ اظہار کے کسی بھی وسیلہ میں ابہام اور تلمیحات
دراصل INDIVISIBLE UNITY
کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ان مسائل سے قطع نظر تقابلی مطالعہ کے توسط
سے غنائی زبان کے سلسلے میں یہ دیکھنا ہے کہ غنائی
علامتیں اپنے محل استعمال اور کیفیت کی وجہ سے
اظہار کی دوسری علامتوں کے مقابل کوئی اہم مقام حاصل
کرسکتی ہیں یا نہیں؟ اس لئے کہ ہماری توضیحات کے
امکانات دراصل تسلیم شدہ لفظیاتی نظام کی فطرت
پر منحصر ہیں۔ اس امر کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی
ہے کہ غنائی زبان اور اظہار کی دوسری زبانوں کے امتیازی
نقاط کو سامنے رکھکر ان کا مطالعہ کیا جائے اور غنائی
سماج کی خصوصیات کا تجزیاتی مطالعہ، غنائیت
کی انفرادی خصوصیت کا مطالعہ یا غنائی آہنگ کے
اندرونی نظم کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی جائے۔

غنائی زبان فطری زبان کے سہارے ہی کھڑی
ہو سکتی ہے اسکی ہیئت، کیفیت اور فطرت اسی
امر کی متقاضی ہے۔ غنائی زبان کچھ بھی ہو بہر صورت
اس کا ایک جمالیاتی فریضہ ہے جبکہ فطری زبان کے
فریضے کا ایک بڑا حصہ ترسیل محض تک محدود ہے۔
اس لحاظ سے غنائی زبان کو فطری تشکیل کے جمالیاتی
پہلو پر سبقت حاصل ہو جاتی ہے لیکن اس سے
قبل کہ مختلف اختلافی پہلوؤں کا مطالعہ کیا جائے
Scienti-/ Poetical Language

Language نو کی بحثیں اٹھائی جائیں
یہ ضروری ہے کہ ان اختلافات سے متعلق دلائل کا اصولیا
کی روشنی میں تجزیہ کیا جائے ۔ ابھی بحث کا ایک اہم
پہلو غور طلب ہے جسکی وجہ سے غنائی زبان شعری
زبان کے بہت ہی قریب آسکتی ہے ۔ بالخصوص ترسیل
کے فریضے میں اور لفظیاتی طریقہ اظہار میں اسے اگر کوئی
جگہ دی جاسکے ۔ ترسیل سے متعلق وہ اہم نکات جو
ان دو زبانوں کے توسط سے سمجھا جا سکا ہے اس کا
تفصیلی مطالعہ VOCAL MUSIC کی سطح پر
کیا جا سکتا ہے ۔ ترسیل کے ان دونوں طریقہ کار میں
ایک مخصوص اندرونی نظم موجود ہے جو کبھی کبھی فریضہ
کی بیرونی مماثلت کی شکل میں دیکھنے کو مل جاتا ہے ۔
ایک اہم بات جو بہت ہی واضح طور پر مطالعہ کے
آخر میں ہمارے سامنے آئے گی اس کی بنیاد کبھی آوازوں
INFRASTRUCTURAL NATURE کے
پر رکھی گئی ہے ۔ وقت کے اعتبار سے مسلسل استعمال
کے لحاظ سے اگر ان کا مطالعہ کیا جائے تو آوازوں کی
مذکورہ چار بنیادی خصوصیات کا سراغ لگایا جا
سکتا ہے ۔

غنائی زبان سے متعلق بحث کرتے ہوئے شاید یہ کہنا
بھی ضروری ہو کہ FUNCTION کی سطح پر اس
کی بیرونی مماثلت کی وجہ جمالیاتی فریضہ ہے غنائی
اور شعری آہنگ کے فریضہ ابلاغ کا مطالعہ اب
اس سطح پر پہنچ گیا ہے جہاں ساخت یا لغوی نشانات
کے ذریعہ لفظیات اور نحو کی بنیاد پر کوئی قطعی بات
کہی جا سکے ۔ یہاں ہمارا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ غنائی
آہنگ اور شعری آہنگ میں اختلافات کی فہرست
تیار کی جائے ۔ بلکہ یہ دیکھنا مقصود ہے کہ غنائی آہنگ
کا ایک مثالی نمونہ تیار کرنے کیلئے اختلافات و
اتفاقات کے کن کن نقاط کو سامنے رکھ کر غور
کرنا ہوگا ۔

شعری معنویت اور غنائی معنویت :

یوں تو پچھلے پچیس[۲۵]
سالوں میں غنائیت کی شناخت کے مختلف اصول
وضع کئے گئے ہیں لیکن ان سے نہ تو غنائیت کی
شناخت ممکن ہے اور نہ ہی کسی سطح پر شعری اور غنائی
آہنگ کی تفریق کا مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے ۔ البتہ
MUSICAL CORPUS کا تصور کسی
حد تک شناخت کے قیام میں معاون ہو سکتا ہے ۔
سہولت کی خاطر MUSICAL CORPUS کو غنائی
نظام کا FORMAL SYNTAX بھی کہا جا
سکتا ہے ۔ اسی دوران یہ بات بھی کہی جا سکتی
ہے کہ غنائی زبان جس کے مخصوص علامات کسی
چیز کی شناخت نہیں کر سکتے یا کسی OBJECT
کو REFER کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے
دراصل ایک ایسی زبان ہے جو بذات خود اپنے
لئے شناخت کی حیثیت رکھتی ہے ۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غنائیت
سامع پر مخصوص اثرات مرتب کرتی ہے البتہ یہ سامع
پر منحصر ہے کہ وہ کتنا اثر قبول کرتا ہے یا پھر اس
کی وجہ غنائیت کی اپنی کوالٹی ہو سکتی ہے ۔ MUSI-
CAL CORPUS اور اس کے نتیجہ میں پیدا
ہونے والے ہمارے شعور میں بہت ہی گہرا اندرونی
ربط ہے اس ربط کو محسوس کرنے کے بعد ہی
غنائی لفظیات اور اس کے اثرات میں وحدت
تلاش کیا جا سکتا ہے ۔ اگر یہ صحیح ہے کہ غنائی معنویت
لفظیات کے مفہوم سے لاتعین میں سامع کے فطری
عمل کو نظر انداز نہیں کرتی تو غنائی شناخت کے مطالعہ
میں بھی اس کی لفظیات کے تجزیے کو بھی نظر
انداز نہیں کیا جانا چاہیئے ۔ اس وقت جب دماغی
نفسیات کے ماہرین کی مدد سے ان عملی شواہد
کی روشنی میں اس طریقہ کار کا تجزیہ کرنا ہے نمونے

کے طور پر یہاں ہم S. MARKUS کے ایک اصول کو وضع کریں گے جس کی مدد سے معنویت اور شناخت کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

"فرض کیجئے کہ "ک" کوئی نحوی ترکیب ہے جو غنائی نظام "ع ن" سے لیا گیا ہے۔ "س" کوئی سامع ہے "و" وقت کو ظاہر کرتا ہے۔ ک کی آمد کے آخر تک (خاص طور پر یہاں ک کی رفتار اور آواز مراد ہے) مخصوص طریقہ پر س کو اس کا شعوری احساس ہوتا ہے۔ اس وقت کی صرف ایک ہی ہیئت (ک و) ہ سامع س کے شعور کا جزو بن پاتی ہے۔ یہ ہیئت اپنی مختلف تکرار کے باوجود یکساں صورت کی حامل ہوگی خواہ ک کی معنوی علامت کو حقیقی گردانا جائے یا مجازی۔ لیکن و وقت میں صرف اور صرف ایک تکرار ع (ک و) س کے شعور کا جزو بن پاتا ہے۔ ہمیں یہ کہنا چاہئے کہ ع (ک و) غنائی لفظیات ک کی شناخت کی علامت ہے۔ جو و وقت میں سامع س کے علم میں آتا ہے۔

(یہاں ع کو علامت مختصف سمجھا جائے)

یہاں ہم اصولی طریقہ کار کو MARKUS ہی کے ذریعہ پیش کی گئی ایک مثال کے ذریعہ واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

اگر سامع س کے ذریعہ ہیئت کا شناخت نحوی ترکیب ک کی سماعت کے بعد 'و' وقت میں ہو تو ہیئت ہ (ک و) = ک ہ ک ۱ ک ۲ ک ۳ ک ۴ جہاں ک ہ = ک ۴ : د ج (EQUI- VALENT TO CONSTANT) سامع اپنے سماع کے حافظے میں غنائی درجات کی ک ۱ ک ۲ ک ۳ میں اسی وقت فرق محسوس کر سکتا ہے جب کہ ک میں کوئی لائق شناخت آہنگ موجود ہو۔ لیکن کسی بھی قسم کی تکرار خواہ وہ ابتدائیہ ہو یا درمیانی آخری ہو یا طویل مصمتوں کے استعمال سے پیدا شدہ کوئی اور آواز ان سبھوں میں معنوی علامت کی تکرار کی یکسانیت کو ایک مخصوص سطح INFINITY پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر سامع کیلئے و وقت میں منتخب شدہ الفاظ یہ ہوں

تو بچا بچا / کے نہ رکھ اسے / ترا آئینہ / ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو / تو عزیز تر / ہے نگاہ / آئینہ ساز میں

ایسی حالت ع (ک و) اپنے مخصوص طریقہ کار کے ذریعہ ایک مماثلانہ پیکر کی تشکیل کرتا ہے۔ جس سے سامع س کا تعلق بہت حد تک ک سے پیدا ہو جاتا ہے۔

ہیئت ہ کی لمبائی ہ (ک و) سامع اور اس کے حافظے میں محفوظ خصوصیات کے اظہار پر منحصر ہے۔ ہیئت کا نظام ن (ک) بلا شبہ کسی مخصوص سامع کے لئے ایک غیر معین تعداد کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے ہم یہاں غنائی لفظیات کے مستقل رول کی بحث بھی اٹھا سکتے ہیں جو کسی نہ کسی حیثیت سے غنائی سماع سے متعلق ہے اس لئے کہ نظام ع (ک) جو دراصل ک کی شناخت کی ایک صورت ہے بذات خود اس کا تعین ناممکن ہے۔ لیکن یہی کچھ صورت حال شعری معنویت کی بھی ہے۔ جہاں شعری ادب پاروں میں شناختی علامتوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے اس کی وجہ شاید وہ تعلق ہے جو مزاج کی مناسبت سے قاری اور شعر و ادب کے درمیان پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف غنائی لفظیات کی ساخت بذات خود ایک وحدت ہے ٹھیک اسی طرح جیسے لفظیات ساخت اور ہیئت۔

اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ

ع (ک و) کی ہر معنوی علامت کسی بھی سطح پر دوسری معنوی علامتوں سے تعلق پیدا کرنے کے لئے آزاد ہے لیکن اس طرح کا صرف ایک ہی مجموعہ مخصوص وقت میں ک کی علامتی شناخت کو ظاہر کر سکتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ معنوی علامتوں

کا کوئی بھی مجموعہ ع (ک و) کی حالت میں غنائی لفظیات
انکے نحوی ترکیب ک کی اندرونی علامتوں کا اظہار ہے۔
بالکل یہی وجوہات شعری زبان میں معنوی علامت (ع ک ح)
اور مخفی علامتوں کی تلاش میں پنہاں ہیں یعنی غیر مخصوص
علامتوں کی بہتات۔
غنائی لفظیات ک کے پیش نظر کسی غنائی
نظام (غ ن) میں ع (ک) کی غیر حقیقی علامتوں کی
بہتات کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں۔ اولاً معنوی علامتیں
اور اس کی شناخت کی سطح پر اصولوں کے فقدان کے
سبب اور ثانیاً شناخت کے اصولوں میں سامع کے
ذاتی اثرات کے عمل دخل کی وجہ سے۔ اس لئے
شعری معنویت اور شعری لفظیات کی طرح غنائی لفظیات
اور اس کی مخصوص نحوی ترکیب میں دو اجزا کا پتہ
لگایا جاسکتا ہے۔ اوّل غنائی لفظیات اور سامع
کے درمیان پیدا شدہ تعلق کے نتیجہ میں سامنے آنے
والے ظاہری شواہد دوم غنائی لفظیات میں کثافت
کا اظہار اور اسکا تعین۔
اس تناظر میں اگر دیکھا جائے تو ایسا محسوس
ہوتا ہے کہ غنائی لفظیات اسی طرح متکلم ہے جس
طرح شعری لفظیات، جس کی ابتدا کا سراغ غنائی
ساخت کے تجزیہ اور شناخت میں لگایا جاتا ہے۔ اس
کے اندرونی نظام یکساں قوانین پر مبنی ہیں اس لئے
اس وقت غنائیت میں معنوی علامتوں کی تشکیل اور
اس کی ساخت میں زبان کی سی دریافت ایک
اہم کارنامہ ہوگا۔

عبدالحمید (الہ آباد)

کہانی کا شعری کردار

انسانی ذہن ہمیشہ اپنے ماضی کی بازیافت کرتا رہا ہے۔ حقائق کو اس کی صاف اور سادہ شکل میں دیکھنے کے لئے بھی اور اس تجزیہ کی وجہ سے بھی جس سے فن کا تمام طلسم برپا ہوتا ہے۔ انسان — وہ پہلا انسان جس کے آنے کے قبل تمنا کے کسی بھی نقش قدم سے یہ زمین عاری تھی۔ یقیناً اسے زندگی کے تمام حقائق بازدوسر الفاظ میں زندگی کے دائمی اقدار کا تمام علم سونپا گیا تھا کہ آج بھی انسانی ذہن جدید پیچیدگیوں کو سلجھانے کے لئے اسی دائمی اقدار کے علم کے منبع کی طرف جست کرتا ہے۔ قرآن اس حقیقت پر اس طرح حاشیہ حرف موزوں کرتا ہے۔ وعلّم آدم الاسماء کلّھا۔ (اور علم دے دیا اللہ نے آدم کو کل چیزوں کے اسماء کا) اسماء کے علم سے مراد دراصل حقائقِ اشیاء کا علم ہے۔

ادب ہو، فلسفہ ہو یا مذہب۔ انسانی ذہن کی اس منبع علم کی طرف بار بار رجعت کو اپنے انداز میں پیش کرتے رہے ہیں۔ ادب میں کہانی کا وجود ہمیشہ رہا ہے بلکہ کہانی کہنے کے بعد ہی ادب کی شکل اختیار کرلی ہے۔ اور یہ بیّن ہے کہ کہانی ہمیشہ صیغۂ ماضی میں ہوتی ہے اور صیغۂ ماضی اپنے اصل کی طرف واپسی کا ایک اہم نشان ہے۔

جدید شاعری سے قبل تک کہانی کے پردے میں شعری اظہار نے کبھی تلمیحی الفاظ کا سہارا تلاش کیا ہے اور کبھی مثنوی اور شاہ ناموں میں مرار شکلیں بدلتا نظر آتا ہے حکایات اور روایات میں — جدید شاعری میں یہ دونوں شکلیں نظر نہیں آتیں۔ بلکہ اب کہانی علامتی اظہار میں ایک جہانِ دیگر کی سیر کرا رہی ہے۔ ابھی حال میں زبیر رضوی نے تو کہانی سیریز ہی شروع کردی ہے۔ سہیل احمد زیدی صاحب ذکر زبیر کے بعد کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دونوں کا شعری تجربہ و اظہار ایک ہی سطح و نوعیت کا ہے۔ اور دراصل ایسا کبھی ہوتا بھی نہیں۔ لیکن ہے یہ بھی کہانی کا علامتی اظہار۔ اس اظہار سے جو شعری اسٹرکچر وجود میں آیا ہے وہ زبیر سے بالکل الگ اپنی شناخت اور قدر رکھتا ہے۔ سہیل احمد زیدی کی شاعری کے مکمل پس منظر، اس کی وسعت اس کی گہرائی و گیرائی کے بیان کے لئے تو ایک وسیع نظر نا تر درکار ہے۔ لیکن پھر بھی ان کی کہانی سیریز کی چند نظموں سے ان کی شاعری کے ایک جزو کا تو مشاہدہ کیا اور کرایا جا سکتا ہے۔ تین نظموں کو ہم اپنے سامنے رکھتے ہیں۔

پہلی نظم ' پرانی کہانی ' اس طرح شروع ہوتی ہے

ایک لڑکا تھا + کہ جس کا + خوش نما + چھوٹا سا گھر + جنگل کے بیچوں بیچ + ایک وادی میں تھا + بغیر کسی بوجھل تمہید کے نظم کی ایک خاص رنگ میں شروع ہونے والی نظم بہت دردانگیز ہے، لیکن سوز و گداز کے ان مصنوعی اور ریاکارانہ الفاظ سے بالکل خالی ہے جس کا ایک خاص تصور اردو شاعری میں مروج

٭ سہیل احمد زیدی کی تین نظموں کا تجزیاتی مطالعہ

ہوگیا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعر قاری سے بہت قریب ہے۔ اور قاری کو اپنا سمجھ کر ہم کلام ہو رہا ہے۔ تعلّی کا کوئی ایسا رنگ نہیں ہے جس سے گھبرا کر یا اوب کر قاری شاعر سے دور ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ شاعر کی اپنی کوئی سطح نہیں ہے بلکہ وہ اپنے فکر و نظر کو تیاگ کر قاری کی راہ چلنے لگا ہے تو ایسا بھی نہیں ہے — یہ تو دراصل شاعر کا وہ ہنر ہے جس کی وجہ سے شاعر کو قاری اپنی ہی طرح کا "بشر" سمجھ کر پاس آجاتا ہے اور پھر وہ نہیں جانتا کہ شاعر اسے اس کی سطح سے کتنی بلند نئی اور انوکھی راہوں پر لئے جا رہا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب شاعر ساتھ چھوڑتا ہے تو اسے اپنی پہلی حالت اور بعد کی حالت میں نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے۔ خیر! کہانی یوں آگے بڑھتی ہے کہ اس لڑکے کی ایک سوتیلی ماں تھی جو لڑکے سے نفرت کرتی تھی، یوں سمجھئے کہ وبال جان سمجھتی تھی اور کسی طرح اس کو گم کرنے اور کھو دینے کے چکر میں تھی۔ وہ صبح سویرے ایسے پر پیچ راستوں سے جنگل جاتی کہ ایک چھوٹے بچے کو اکیلے واپس پلٹنا دشوار ہی نہیں ناممکن بھی ثابت ہو لیکن وہ اس سے غافل تھی کہ خود بچے کے فطرت ہی میں اسکو محفوظ رکھنے کی صلاحیت مضمر ہے۔ واقعتاً خالق کائنات کا یہ کیسا احسان عظیم ہے کہ انسان کے فطرت ہی میں ایسی صلاحیت رکھ دی ہے کہ اگر اس نے اپنی فطرت کو زنگ آلود نہیں کیا بلکہ اسے فطری حالت میں سادہ اور صاف ستھرا رکھا تو وہ سوتیلی ماؤں سے بچ سکتا ہے جو اسے کھونا چاہتی ہیں اسے اس کے گھر سے دور کر دینا چاہتی ہیں یہاں قرآن کی وہ آیت یاد آتی ہے فالھمھا فجورھا وتقوٰھا۔ اور اپنے نبی کریمؐ کی وہ حدیث یاد آتی ہے کہ ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں۔ بہر حال یہ فطرت (یا اسلام) بچہ کی حفاظت اس طرح کرتی ہے کہ بچہ اپنے جیبوں میں مختلف چیزیں پھول، تتلی کے پر، کنکر پتھر جگنو وغیرہ بھرے رہتا ہے۔ جب ماں اپنے ناپاک ارادہ سے اسے لے کر نکلتی تو سارے راستے وہ اپنا یہ "بے مصرف

خزانہ" لٹاتا رہتا۔ اور جب ماں اسے جنگل میں چھوڑ کر واپس گھر چلی آتی تو شب ہوتے وہ اپنے خزانے کو جمع کرتے ہوئے گھر واپس آجاتا۔ اس طرح اس کا "بے مصرف خزانہ" کام آتا۔ یہ انسان کی وہ اصل اور سادہ فطرت ہے جو ہمیشہ اس کا ساتھ دیا کرتی ہے جو ایک متمدن اور صنعت پرست انسان کو دیکھنے میں تو بہت حقیر معلوم ہوتی ہے۔ وہ بے تکی کیا۔ جگنو، تتلی کے پر، سوکھے پھول وغیرہ۔ اس فطری خزانے کو حقارت سے ٹھکرا کر ترقی یافتہ انسان نے اپنی بصیرت سے ایسے خزانے ایجاد کر لئے ہیں جو خوش نما تو یقیناً اس فطری خزانے سے زیادہ ہیں لیکن اپنی وہ اس طرح جنگل سے گھر واپس آنے کا ذریعہ نہیں بنا سکتا۔ اس نے بزعم خود گمرہی سے بچنے کے لئے کیسے قانون، فلسفے اور نظریات تراشے ہیں۔ لیکن کیا یہ سب اس کی ایجاد کردہ چیزیں اسے فطری قانون (اسلام) سے مستغنی بنائے ہوئے ہیں یا کیا وہ جنگل سے گھر آنے کا راستہ پا رہا ہے یقیناً سوتیلی ماں کا حربہ کامیاب ہوتا نظر آ رہا ہے اس کے یہ قوانین اور فلسفے وہ وسائل نہیں بن پاتے جن سے وہ حقائق تک، اصلیت تک، حیات کے اصل مرکز تک، اپنے گھر تک پہنچ جائے۔ بہر حال شاعر کا کہنا یہ ہے کہ بچہ تو اس طرح واپس گھر آجاتا تھا۔ اور پھر وہ نظم کا خاتمہ اس طرح کرتا ہے۔ مجھے مت غور سے دیکھو + میں وہ لڑکا نہیں ہوں + مرا کوئی بھی گھر + خوابوں کی وادی میں نہیں ہے + میری جیبوں میں + کوئی خوش رنگ شیشہ + کوئی موتی + کوئی سوکھا پھول + جگنو + کوئی پتھر + تتلیوں کے پر + کہاں ہیں + اور وہ عورت + جسے دنیا کہیں + اس سے میرا رشتہ + کوئی رشتہ + کوئی ناتا نہیں ہے۔

اتنی کہانی سننے کے بعد آخر سامع نے شاعر کو کیوں غور سے دیکھا؟ اور شاعر نے گھبرا کر کیوں کہا کہ میں وہ لڑکا نہیں ہوں کیا اس نفی سے اثبات کی تراوش نہیں ہوتی۔ دراصل یہ بھی ایک ہنر ہے کہ شاعر کا انکار اس کے اقرار کی شدت سے غمازی کر رہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس نے اپنا فطری خزانہ گم کر دیا ہو۔ اور پشیمانی دامن گیر ہو گئی ہے۔ وہ کیسے بتائے کہ

میں بدھی لڑکا ہوں لیکن بات یہ ہے کہ اپنا خزانہ گم کر چکا ہوں اور جنگل جنگل بھٹک رہا ہوں۔ اور دنیا سے بھی میرا رشتہ ہے اور اسی دنیا نے مجھے گم کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم آپ اور شاعر اگر اس لڑکے کی طرح نہیں تو کہانی ہمارے لئے کوئی معنویت نہیں رکھتی۔ یہ انکار نما اقرار اس پاداش کو ظاہر کرتا ہے جو اپنی اصل فطرت کھو دینے کے جرم میں انسان نے پائی ہے۔

دوسری نظم ' اَن داتا ' بھی کہانی کی اسی فطری سادگی سے شروع ہوتی ہے۔ اک سپاہی تھا + بہت بھوکا تھا + اس کو + ایک بندر ملا + جس کے ہاتھوں میں چنا تھا + اس نے آدھی دال اس بھوکے سپاہی کو دیا + اور بدلے میں کہا کہ + مجھ کو گردن پر بٹھالو + یہاں نظم کا پہلا حصہ ختم ہوگیا۔ بہت چھوٹے چھوٹے جملے (مصرعے) ہیں جو کسی طرح کی سجاوٹ سے عاری ہیں۔ نہ تراکیب کا طنطنہ ہے اور نہ موٹے موٹے معلق لفظوں کا گورکھ دھندا۔ جس کو بدقسمتی سے اصل شاعری سمجھ لیا گیا ہے۔ نظم میں شاعر کہانی کے بے تکلف لہجے سے ایک اشارتی فضا تیار کرتا ہے۔ یہ بات قاری کے لاشعور سے ابھرتی ہے کہ یہ خالی خولی ایک کہانی ہی نہیں بلکہ اس میں ہمارے لئے ایک معنویت پوشیدہ ہے اور جیسے ہی یہ خیال لاشعور سے شعور میں آتا ہے قاری کی سخن فہمی متحرک ہوتی ہے۔ نظم کی اس اشاراتی فضا کو سمجھنے کے لئے یہ الفاظ سامنے رکھئے اور غور کیجئے۔ بندر، بھوکا سپاہی، آدھی دال، گردن پر بٹھالو، بدلے میں وغیرہ۔ نظم کا دوسرا حصہ اس طرح ہے۔

اب سپاہی میں جگہ رہتا + جہاں جاتا + وہ ناہنجار بندر + اس کی گردن پر سوار رہتا + بہت سے الٹے سیدھے کام لیتا + اور سپاہی جب کبھی انکار کرتا + تو وہ بندر + اپنے بخشے رزق کو + آدھے چنے کی دال کو + واپس طلب کرتا + کہانی کے اس دوسرے حصے میں کہانی کے اشارات گہرے اور واضح ہونے لگتے ہیں۔ اور ایک مخصوص سمت کی طرف مڑتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ الفاظ خاص غور کے لائق ہیں۔ ناہنجار بندر، گردن پر سوار رہنا، الٹے سیدھے کام لینا، اپنا بخشا رزق۔ قاری بالکل تیار ہے کہ اب کہانی کا انجام بھی سامنے آئے اور یہ تخلیقی تناؤ کی کیفیت کسی نقطہ پر منتج ہو۔ شاعر کہتا ہے — مجھے بچپن کی یہ ننھی کہانی + جب کبھی یاد آتی ہے + تو میرا ہاتھ جانے کیوں + میری گردن پہ جاتا ہے + جہاں بیٹھا ہوا بندر + مجھے آنکھیں دکھاتا + منھ چڑھاتا ہے۔

بچپن کی کہانی کے یاد آتے ہی ہاتھ کا گردن پر جانا، اس حقیقت کا علامتی اظہار ہے کہ آج جو کچھ ہو رہا ہے، یہ سب کچھ پہلے بھی ہو چکا ہے۔ نہ یہ اعمال نئے ہیں اور نہ یہ ردِ اعمال نئی بلا ہے۔ فرد اور قوم کی ترقی و زوال اور اس میں پوشیدہ اسباب و علل جو کچھ پہلے تھا وہی آج بھی ہے۔ ایک طرح کے اعمال و اخلاق و اقدار کا جو نتیجہ پہلے نکلا ہے وہی آج بھی نکل رہا ہے اور وہی آئندہ بھی نکلے گا۔ یہی اللہ کی سنت کہلاتی ہے۔ یہی قوانینِ فطرت کہلاتے ہیں۔ یہ اقدار ابدی ہیں۔ قرآن نے جب انسان کو اس کی گمراہی، بغاوت، اعتدال سے تجاوز، بدعملی اور ایک لفظ میں فطرت سے گریز سے روکا تو اس نے ایسی جگہ عاد اور ثمود کے قصے بیان کئے۔ اور جب انسانوں نے ان واقعات کو صرف قصے کہانی ہی سمجھنے پر اکتفا کیا تو انھیں قرآن نے بے بصیرت کہا۔ اس لئے کہ یہ قصے برائے تفریح نہیں سنائے گئے تھے بلکہ یہ وہ روشنی تھی جس میں انسانوں کو اپنا جائزہ لینا تھا۔ اور اس قانونِ الٰہی کی پابندی تھی کہ فطرت کے قوانین اٹل ہیں۔ عاد و ثمود کے افعال اگر کوئی مجموعہ افراد اختیار کرے گا تو انھیں کی طرح کے انجام سے بھی دوچار ہوگا — شاعر یہ بات جانتا ہے وہ تو بطور تجاہلِ عارفانہ کہتا ہے "جانے کیوں"۔ یہ "جانے کیوں" اس کا جواب سوچا سمجھا اور جانا بوجھا ہے۔ کسی مادی اور فوری ضرورت کے تحت ایک سپاہی آدمی کا — وہ سپاہی جو غیرت مندی، حوصلہ، جدوجہد، غیرت و انا کا ایک نشان ہوتا ہے۔ کسی جانور اور وہ بھی بندر جیسے سنہیہ اور کمزتر

جانور کا محکوم ہو جانا واضح رہے کہ شیر وغیرہ کا محکوم نہیں ہوا جو شجاعت و بہادری اور حسن کی علامت ہے۔ بلکہ بندر جس میں حسد، العبق، بے عقلی، جنس زدگی کی بو، سبزی کے ساتھ بدصورتی اور کراہت بھی شامل ہے۔ ایسے جانور سے آدھے دال کے بدلے مٹھی بھر کا عہد محکومی باندھ لینا اور پھر اس کے الٹے سیدھے کلمہ کو بہ جبر و کراہت مانتے رہنا۔ انسان کے لئے کیسی بلائے عظیم ہے کتنا بڑا المیہ ہے۔ یہ ایک بہت المناک صورت حال کو ظاہر کرتا ہے۔ نیک اور غیور انسانوں کا کسی وجہ سے ایسے انسانوں کا محکوم ہو جانا جن کی فطرت مسخ ہو کر بندر کی فطرت میں تبدیل ہو گئی ہے جن میں انسانیت کے اوصاف پائے ہی نہیں جاتے اور ایسے بندر فطرت لوگوں کے محکوم کسی بہت بڑی قیمت اور بدلے پر نہیں بنے بلکہ آدھی چنے کی دال جس سے آدمی صرف موت سے بچ سکا ایک چھوٹی مادی ضرورت پوری ہوئی لیکن اس کی قیمت یہ ادا کرنی پڑ رہی ہے کہ بندر صفت لوگوں کے احکام کو بلا چوں چرا ماننا پڑ رہا ہے۔ اس کی روحانی اذیت، نفسیاتی تناؤ، احساسِ ذلت و خواری اور اس احساس سے پیدا شدہ غم و الم اور غیض و غضب کا کیا حال ہوگا۔ آج اس کرۂ ارض پر صورت حال یہی ہے یا اور کچھ؟ اس کا جواب دینے کی صلاحیت بھی انھیں میں ہے جو بندر صفت نہیں ہوئے ہیں! یہاں پر قرآن میں مذکور اس واقعے کو یاد رکھنا بھی ضروری ہے جو 'یوم السبت' والوں کا واقعہ ہے۔ انھیں خدا کی نافرمانی کے جرم میں خائب و خاسر بندر بنا دیا گیا تھا۔ نظم کے تلازمات میں یہ حقیقت ابھرتی ہے کہ انسان جب قانونِ قدرت کی خلاف ورزی کرتا ہے تو بندر کی فطرت کا بن جاتا ہے۔ اب ان سزا یافتہ، مقہور اور مردود انسانوں کا نیک اور غیور خدا کے فرماں برداروں کا حاکم بن کر انھیں اپنی بات ماننے پر مجبور کر دینا۔ انسانیت کے لئے کتنا بڑا چیلنج ہے۔ یہ بچپن کی وہ ننھی کہانی جو عذاب دورِ حاضر سے باخبر کرتی ہے آج کی مکمل انسانی صورت حال کا احاطہ کرتی ہے۔

ایک حدیث کا مفہوم ہے "ظالم حکمراں کے سامنے کلمۂ حق کہنا بہترین جہاد ہے"۔ ہمیشہ اقتدار کا ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا رہا بلکہ یہاں تک کہ صاحب اقتدار اپنی حیثیت کو فراموش کر جاتا ہے اور اپنے جیسے دوسرے انسانوں کو اپنا بندہ سمجھنے لگتا ہے۔ انسانوں کو حق پر وہ حاکم ہے اپنے سے کمتر مخلوق سمجھتا ہے ان کے دل و دماغ اور سوچ کی آزادی کو بھی سلب کر لیتا ہے۔ اپنے آپ کو ان کا رب کہلاتا ہے۔ اگر فرعون نے اپنے کو "انا ربکم الاعلیٰ" کہا تھا تو شاید اقتدار ہی تھا جو یہ کہلاتا تھا۔ آج بھی صاحب اقتدار اگر خدا ترس ہوا تو خیر ورنہ قولاً نہیں تو عملاً اپنے آپ کو دوسروں کا رب ظاہر کرتا ہے۔ اور فرعون کے طریقہ کے ساتھ موسیٰ کا اسوۂ حسنہ بھی نظر آتا ہے۔ مثل مشہور ہے "ہر فرعون را موسیٰ"۔ ایسے سلطان جابر کے سامنے کلمۂ حق بلند کرنے والے بھی اٹھتے رہے ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں اکبر کا دور اس کا بہترین نمونہ ہے ایک طرف اکبر کے سامنے سجدہ کرنے والے تھے تو دوسری طرف اس کے ظلم و جور اور اس کے غرورِ خدائی کو حقارت سے ٹھکرا دینے والے بھی تھے۔ جب کسی فرعون صفت صاحب اقتدار کا بول بالا ہوا تو انسانی دل و دماغ میں اس کا شدید ردِ عمل شروع ہوا۔ جو بالآخر غرقِ فرعونی پر منتج ہوا۔

سہیل احمد زیدی کی تیسری نظم "گوشش برآواز" اسی انتظارِ موسیٰ کی کیفیت عیاں کرتی ہے۔ یہ نظم شاعر کے فکر و فن کے تدریجی ارتقا کو ظاہر کرتی ہے۔ 'پرانی کہانی' سے جو دور شروع ہوا اس کے نشانات زیادہ واضح ہوئے۔ مسخ فطرت لوگوں کا دوسروں کو محکوم بنا لینا۔ اب تیسری نظم میں ایسے مسخ فطرتوں کے خلاف ردِ عمل کا فنی اظہار ہوا ہے۔

'گوشش برآواز' میں ایک پرانی کہانی نئے تلازمات اور نئے اشارات و علائم کے ساتھ اس طرح شروع ہوتی ہے۔

ایک راجہ + جس کے سر پر سینگ تھا + انھیں چھپا رکھا تھا

بہت ڈرتا تھا + (کیونکہ ظلم کرتا کرتا تھا) + بہی خواہوں سے گھبراتا تھا + انسانوں سے شرماتا تھا + (کیونکہ سینگ رکھتا تھا)+ یہ بادشاہ کا ذکر نہیں راجہ کا ذکر ہے اس لیے کہ بر صغیر ہند بادشاہوں سے کچھ زیادہ میل نہیں کھاتی اس کے علاوہ کہانی اور راجہ کا بڑا گہرا تعلق ہمارے معاشرے میں رہا ہے۔ اکثر کہانیاں راجاؤں کے ذکر سے ہی شروع ہوتی ہیں۔ راجہ کے سر پر سینگ کا ہونا ایک غیر انسانی بات تھی ایک ایسی کریہہ صورت حال جس کو انسان برداشت نہیں کر سکتا۔ سینگ کی غیر انسانی علامت راجہ کی بدباطنی، ظلم غیر انسانی برتاؤ، غیر انسانی خیالات اور غیر انسانی اعمال و افعال کی غماز ہے۔

راجہ کے اپنی رعایا سے ڈرنے کی جو وجہ بتائی ہے وہ ظاہر ہے کیونکہ ظلم کرنے والے کا ضمیر کبھی مطمئن نہیں ہوتا تاریخ کے حقائق میں شامل ہے کہ بعض انصاف کرنے والے حکمراں عوام میں چپکے پھرتے تھے۔ بازاروں میں ٹہلتے گھومتے نگرانی کیا کرتے تھے۔ لیکن بعد میں ظلم زجور کرنے سے جو ڈر پیدا ہوا تو انھوں نے حفاظتی دستوں کا انتظام شروع کر دیا۔ ایسا حکمراں بہی خواہوں سے بھی گھبرانے لگا کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی مصلح اسے مشورہ دے کہ اپنے اس غیر انسانی فکر و عمل کو ترک کر دو اس سینگ کو کٹوا دو۔ راجہ کا انسانوں سے شرمانا بھی معنی خیز ہے کہ وہ غیر شعوری طور پر جانتا تھا کہ یہ انسانی شے نہیں ہے۔ انسانوں سے وہ اپنی سینگ چھپانا بھی چاہتا ہوگا۔ جیسا کہ اگلے مرحلے سے بات کھلتی ہے۔

مگر نائی + کہ جس سے بال کٹواتا تھا + سب کچھ جانتا تھا + ڈر سے کہیں کچھ بھی نہیں کہتا تھا + اب مشکل یہ ہوئی کہ انسان کو میں رہنا بھی ہے۔ ان پر حکم چلانا بھی ہے اور ایسی ضروریات بھی ہیں جو انسانوں سے تعلق کے بغیر پوری بھی نہ ہوں گی، تو آخر ایسا عیب چھپے کیسے؟ ایسی خباثت، نفاق و ظلم بدباطنی کس طرح پوشیدہ رہ سکتی ہے؟ چنانچہ نائی پر یہ بات کھل گئی لیکن نائی تو نائی ڈر سے کچھ نہیں کہتا تھا، اب ایک دوسری دشواری نائی کو پیش آئی کہ راجہ کا عیب معلوم ہو جائے اور خاموش بھی رہے۔ دراصل انسان کا ضمیر اور انسان کی فطرت کبھی بھی غیر انسانی فکر و عمل پر مطمئن نہیں رہتی۔ انسان مسلسل بے چینی و کرب اور بے کیفی کا شکار رہتا ہے۔ اور آخر اس غیر انسانی صورت حال سے نجات پانے کی راہ ڈھونڈھنے لگتا ہے۔ راجہ کے سامنے نائی خوف سے کچھ نہیں کہتا تھا لیکن اپنے داخلی اضطراب کو دبا بھی نہیں سکتا تھا۔ اب کیفیت یہ ہوئی۔

ایک جنگل میں تنہا تھا + تو دل کا بوجھ کم کرنے کو چلایا + کہ راجہ تیرے سر پر سینگ + تو ظالم ہے + انسانی ضمیر نے اس غیر انسانی صورت حال کے خلاف رد عمل شروع کیا۔ یہ ظلم کے خلاف پہلا اور دوسرا مرحلہ طے ہوا پہلا ظلم کو برا سمجھنے کا اور دوسرا اس کے خلاف آواز بلند کرنے کا۔ اب تیسرا اور آخری مرحلہ رہا یعنی اس ظلم کے خلاف عملی جد و جہد کا۔ جیسا کہ آئندہ مصرعوں سے اندازہ ہوتا ہے، نظم دوسرے مرحلے تک آ کر رک جاتی ہے۔ نائی نے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کو جنگل میں آواز لگا لی اور راجہ کے ظلم عیب کا بھانڈا پھوڑا۔ ہوتا بھی ایسا ہی ہے کہ اگر انسان ظلم کے سامنے خوف سے کچھ نہ کہہ سکے تب بھی وہ کہیں نہ کہیں جا کر اس کے خلاف آواز ضرور بلند کرتا ہے خواہ وہ جنگل ہی کیوں نہ ہو جہاں اسے کسی بھی ہمراز کا ساتھ میسر نہ ہو۔ لیکن قدرت کیسی ستم ظریف ہے وہ اس بے محل بلند کی ہوئی آواز کو اپنے وسائل سے پھیلاتی ہے اور بالآخر پوری دنیا کو راجہ کے اس عیب (ظلم) سے آگاہ کر کے تمام انسانوں میں اس کے خلاف رد عمل پیدا کر دیتی ہے۔ چنانچہ

اب جنگل کی جانب سے ہوا آئی + تو سارا شہر + اسی سچی صدا سے + گونجنے لگتا + راجہ کی کہانی میں اس سے آگے کیا ہوا اسے بتانے کی ضرورت نہیں کہ انسانی ضمیر پر یہ آپ ہی آپ منکشف ہے۔ یہاں تک کہ یہ کہانی صرف کہانی تھی۔ لیکن اس کے بعد شاعر نے جس طرح ہمارے لیے اس کہانی کو معنی خیز بنایا ہے وہ دیدنی ہے۔

بقیہ ص ۳۷ پر

سہیل احمد زیدی

پرانی کہانی

ایک لڑکا تھا
کہ جس کا
خوش نما
چھوٹا سا گھر
جنگل کے بیچوں بیچ
اک وادی میں تھا
اس کی اک ماں تھی
جو سوتیلی تھی
سونے سے لدی رہتی تھی
اور یہ چاہتی تھی
کہ
یہ لڑکا
جس کے سارے جیب
بے مصرف خزانوں سے بھرے رہتے ہیں
گم ہو جائے
جنگل میں کہیں کھو جائے
طلوع سے پہلے
بہت پہلے
اسے لے کر نکلتی
ٹیڑھے میڑھے راستوں پر
گھومتی پھرتی
گھنے جنگل میں اس کو چھوڑ کر
واپس چلی آتی

مگر لڑکا
جو سارے راستے
اپنے خزانے پھینکتا چلتا تھا
شب ہوتے ہی
اپنی گم شدہ دولت کو چنتا
ٹیڑھے میڑھے راستوں پر گھومتا پھرتا
اسی خوابوں کی وادی
خوش نما گھر میں پلٹ آتا
مجھے مت غور سے دیکھو
میں وہ لڑکا نہیں ہوں
میرا کوئی گھر
کہیں خوابوں کی وادی میں نہیں ہے
میری جیبوں میں
کوئی خوش رنگ شیشہ
کوئی موتی
کوئی سوکھا پھول
جگنو
کوئی پتھر
تتلیوں کے پر کہاں
اور وہ عورت
جسے دنیا کہیں
اس سے مرا رشتہ
کوئی رشتہ
کوئی ناتا نہیں ہے

سہیل احمد زیدی
(الہ آباد)

گوش برآواز

ایک راجہ
جس کے سر پر سینگ تھا
اپنی رعایا سے بہت ڈرتا تھا
(کیوں کہ ظلم کرتا تھا)
بہی خواہوں سے گھبراتا تھا
انسانوں سے شرماتا تھا
(کیونکہ سینگ رکھتا تھا)
مگر نائی
کہ جس سے بال کٹواتا تھا
سب کچھ جانتا تھا
ڈر سے لیکن کچھ نہیں کہتا تھا
اک جنگل میں تنہا تھا
تو دل کا بوجھ کم کرنے کو
چلایا
کہ راجہ تیرے سر پر سینگ
تو ظالم ہے
اب جنگل کی جانب سے ہوا آتی
تو سارا شہر
اس سچی صدا سے
گونجنے لگتا
ہمارا شہر بھی
چپ چاپ ہے
ساکت ہے
شاید گوش برآواز ہے

اَنّ داتا

اک سپاہی تھا
بہت بھوکا تھا
اس کو
اک بندر ملا
جس کے ہاتھوں میں چنا تھا
اس نے آدھی دال
اس بھوکے سپاہی کو دیا
اور بدلے میں
کہا کہ
مجھ کو گردن پر بٹھا لو
اب سپاہی جس جگہ رہتا
جہاں رہتا
وہ ناہنجار بندر
اس کی گردن پر سوار رہتا
بہت سے اپنے سیدھے کام لیتا
اور سپاہی جب کبھی انکار کرتا
تو وہ بندر
اپنے بخشے رزق کو
آدھی چنے کی دال کو
واپس طلب کرتا
مجھے بچپن کی یہ ننھی کہانی
جب کبھی بھی یاد آتی ہے
تو میرا ہاتھ
جانے کیوں
مری گردن پہ جاتا ہے
جہاں بیٹھا ہوا بندر
مجھے آنکھیں دکھاتا منہ چڑھاتا ہے

اڑیا : سیتاکانت مہاپاتر
ترجمہ : کرامت علی کرامت

اونٹ اور نخلستان کی شب

تمہاری پیاس ہے نادیدہ صحرا کی
تمہارا درد بھی ناآفریدہ زخم کا ہے
یہ تنہائی تمہاری ایک نامعلوم جنگل کی ہے گویا
"انھیں" اس کی خبر کیا، تشنگی کیا شئے ہے،
دردِ غم ہے کیا اور وقت تنہا کیا
یہی ہے وجہ "وہ" کرتے ہیں یوں اظہار افسوس
کہ بھوک اور پیاس سے مغلوب ہو کر دھوپ میں
لب بستہ تم گرم سفر رہتے ہو ہر دم
تمہاری مونس و ہمدم فقط ہیں ریت اور دھوپ
نظر آتے ہو تم کس درجہ تنہا!
تمہاری بدنصیبی ہے کہ "وہ" آنسو بہاتے ہیں
تمہارے حال پر ہیہم
قدم کو اپنے گن گن کر خود اپنے سائے کو پھیلانے کو دن بھر
شب غم کے اندھیرے میں چلے جاتے ہو تم ریتوں پہ
شہروں اور انسانوں کی آبادی سے آگے
انھیں ہی کیا پتہ، تم اپنی آنکھوں سے افق کی دھوپوں کو
پیتے جاتے ہو
ہے جن میں تھرتھراہٹ خواب کی سی
بھگو کے اپنا دامن دھوپ کی برسات سے تم
سرابوں کو چبائے جا رہے ہو اور کرتے ہو جگالی
نہائے جا رہے ہو پیلی پیلی روشنی کے بیکراں دریا میں
اپنے ساتھ لے کر لمحۂ ماضی کی پرچھائیں
نہیں ہے آخری حد کوئی ریتوں کی سفر کی۔

نہیں ہے انتہا سائے کی کچھ بھی
یہ بڑھتا جا رہا ہے دل میں اور مٹی میں کچھ ایسا
کہ اس کے ہاتھ چھونے لگتے ہیں حد افق کو
پھر اس کے بعد گہری کالی نیند سوتا ہے یہ ہو کے ریزہ ریزہ
پارہ پارہ خس کی جڑ میں
یا کسی دیگر شتر کے استخواں میں سر چھپائے
نہیں ہے انتہا سائے کا کچھ بھی
یہ ہے ایسا پرانا اک مسافر
جو قدموں کے تلے چلتا ہے اپنی ماں کے ہمراہ
خلا کے پالنے میں سبز پتے، پیڑ پودے جھولتے ہیں
گھنی گنجان پرچھائیں کی پرتیں ہیں کچھ ایسی
کہ جیسے آسماں سے ریت کی تہہ تک خلائے سبزگوں کی
بھیڑ پھیلی ہو
ہوا کی چیخ پر پانی کی آوازوں کا دھوکا ہو رہا ہے
نگاہوں میں مسلسل تیرتی ہیں ساحل ماضی کی آوازیں
گھروندے ریت کے، ریتوں کے لامحدود تارے
اور مسافت ریت کی پیہم
بکھرتی ٹوٹتی اک سبز نخلستان پر ریتوں کی موجیں
پہاڑ اور ریت کے تودے بگولوں کی طرح چلتے ہیں
شب کی تیرگی میں ذرّوں کی یکساں پیلی پیلی رتھی پر
وہی اک سلسلہ جو کل بھی تھا وہ آج بھی ہے
سحر بھی ہے وہی اور رہ دشت بھی وہی ہے

کہ جس میں خواب و بیداری، تبسم اور گریہ
اچھلنا ریت پر غصے سے
یا فرطِ محبت سے سلطِ پیرہن کا نقشہ بنانا
یہ سب آپس میں مل کر ایک ہی سانچے میں ڈھلتے ہیں
یہاں آتی ہے دن کے بعد شب اور اختتامِ شب
پہ پھر آتا ہے دن اک بار

ہے کل پھر اک نیا دن
اور اسی بدبخت اور مہجور لمحوں کی اندھیری
کوٹھری کی عنبریں دیوار پر پھر اک نشانِ نو
نئی اک چلچلاتی تشنگی ہے پھر اسی دیرینہ صحرا کی
نیا اک جگمگاتا درد ہے دیرینہ زخموں کا
نئی تنہائی ہے دیرینہ جنگل کی۔

رفعت سروش

سیاحت

تھک چکا ہے جسم ——— لیکن
ذہن بچپن کی اندھیری گھاٹیوں میں گھومتا ہے
اور لڑکپن کی حسیں پگڈنڈیوں پر دوڑتا ہے
نوجوانی کے روپہلے راستوں پر ناچتا ہے

یہ سیاحت
روح کے تنہا سفر کی ابتدا ہے

رفعت سروش

رات، ڈھلتی رات

رات، ڈھلتی رات
وقت کے گرتے ہوئے لمحوں کے پتوں کی صدا
سن رہے ہیں میرے احساسات
رات، ڈھلتی رات
ڈوبتے تاروں کی آنکھوں میں ہے باقی دم
آسمانوں پر ہے طاری نزع کا عالم
میرے بھی حصے میں آئی درد کی سوغات
رات، ڈھلتی رات
خامشی کی ساحرہ کا سحر جھوٹا تھا
نیند آنکھوں کے جزیروں سے نکل بھاگی
کروٹیں لینے لگے ہل چل کے امکانات
رات ——— ڈھلتی رات
خم بہ خم زلفِ سیہ پر گر رہی ہے برف
یہ فضا کے کرب میں لپٹے ہوئے لمحات
رات ——— ڈھلتی رات
کیوں یہ احساسِ زیاں ہے
ریزہ ریزہ بکھری جاتی ہے مری ہستی
ہے مرا سایہ ہی شاید
رات ——— ڈھلتی رات

حمید یورش
راولپنڈی (پاکستان)

آثار

گگر ڈھے رہی ہے
تلاطم تہہ آب ٹھہراؤ کی ذلتوں سے
مفر چاہتا ہے
شعور توانائی پلتا رہا
اب غرورِ تحرک میں ڈھلنے لگا ہے
تلاطم، جو کب سے تشنج بہ جاں تھا
تموّج قدم سطح کی سمت ابھرا چلا آرہا ہے
گگر ڈھے رہی ہے
نگر جس کی سنگلاخیاں کھوکھلی ہوگئیں
اور جواں برق رفتار لہروں کا پندار
بیدار ہو کر
نئی زندگی کے گہر
کھولتے پن کے رخنوں سے برسا رہا ہے
گگر ڈھے رہی ہے
اور اس کے مقابل
ندی اپنی سمتِ سفر کا تعین
(یہ امکان ہے)
از سرِ نو کرے گی

توصیف تبسم

اسلام آباد (پاکستان)

اک تیر نہیں کیا تری مژگاں کی صفوں میں!
بہہ جائیں لہو بن کے یہ حسرت ہے دلوں میں

دریا ہو تو موجوں میں کھلے اس کا سراپا
پاگل ہے ہوا چیختی پھرتی ہے بنوں میں

تیشے کی صدا میری ہی فریاد تھی گویا
میری ہی طرح تھا کوئی پتھر کی سلوں میں

یوں آج پھر اک حسرت ناکام پہ روئے
جیسے نہ تھے پہلے کبھی آزردہ دلوں میں

کھینچا تھا جنوں نے جسے دامانِ ہوا پر
دیکھا تو وہی شکل ہے مٹی کی تہوں میں

کیا ٹھہریں قدم دشت نوردانِ وفا کے
کانٹا تو نہیں پاؤں میں سودا ہے سروں میں

توصیف وہ یادوں کا دھواں ہے کہ سرِ بزم
چہرے نظر آتے ہیں چراغوں کی لوؤں میں

جشنِ ماہتاب رات بھر ہے یہاں
صبح کیا ہو کسے خبر ہے یہاں

کیا ہوا شہر کے مکینوں کو
صورتِ چشم ہے جو گھر ہے یہاں

ایک گردابِ رنگ ہے یہ زمیں
صدفِ گل میں بو گہر ہے یہاں

دل اسیرِ طلسم تنہائی
اپنی صورت ہی ہم سفر ہے یہاں

پار اترے ہیں ڈوبنے والے
ایک ساحل بھنور بھنور ہے یہاں

خاک ہو کر ہوا کے ساتھ چلو
اور کیا صورت سفر ہے یہاں

صبا جائسی

تند جھونکے بھی نہیں، تپتا ہوا صحرا بھی نہیں
یہ جہاں تو مرا افسونِ تمنا بھی نہیں

گردشِ وقت تھی، یا تھا مرا اندازِ جنوں
چاہنے کی طرح میں نے تجھے چاہا بھی نہیں

وہ تو اچھا ہوا خالی ہی رہا کاسۂ زہر
میرا اندازِ کسی اور سے ملتا بھی نہیں

خوف آندھی کا رہا اور نہ طوفاں کا خطر
نخلِ امید پہ سوکھا ہوا پتا بھی نہیں

کس نے کیا وار کیا، کیسے بتاؤں یہ صبا
میں نے پیچھے کی طرف مڑ کے تو دیکھا بھی نہیں

زہر کو پیتے پیتے جب شکل مری بدل گئی
گردشِ وقت روٹھ کر جانے کدھر نکل گئی

خواب جو دیکھے عمر بھر کوئی نہ آنکھوں میں ڈھلا
تلخیٔ حادثاتِ دہر کیسے ہنسی میں ڈھل گئی

میری یہ آتشِ دروں شمع نہیں کہ دوستو
صبح ہوئی تو بجھ گئی شام ہوئی تو جل گئی

میرے مکاں میں جو بھی تھا اس کو تو لے گئی ہوا
مٹی بچی کچھی جو تھی پانی پڑا تو گل گئی

وقت تھا اپنی راہ پر ہم بھی تھے اپنی راہ پر
پھر بھی کبھی کبھی صبا ہم میں اور اس میں چل گئی

عبد الحمید

آیا نہ کوئی پاس بیابان رہے ہم
معمورِ زرِ خواب تھے ویران رہے ہم
وہ قصہ عنبر خیز بظاہر تو نہیں تھا!
اے پہلی نظر کتنے پریشان رہے ہم
جانا ہے جو کچھ تیرے سبب وہ تو عجب ہے
اے بے خبری تجھ کو بھی اب جان رہے ہم
سرسبز ہیں ، وسعت آزاد کہاں تھی
فصلیں جو کٹیں دیکھ کے حیران رہے ہم

سرحد شہر میں داخل ہونا
اک عجب بھیڑ میں شامل ہونا
مطمئن ہم بھی بہت تھے پہلے
پڑ گیا اس سے مقابل ہونا
پے بہ پے قتل کراتا ہے مجھے
میرے اجداد کا قاتل ہونا
اک قدم میرا جما کر رکھنا
پھر کسی شئے کا نہ حائل ہونا
خاک کی سمت مرا جھک جانا
پنی پہچان پہ مائل ہونا

عبدالمتین جامی

دل اپنا آبجوئے حقائق کے پاس ہے
محروم کیوں ازل سے مرے فن کی پیاس ہے

ہر لمحہ اپنا رنگ بدلتا ہے یہ جہاں
اب وقت کو بھی دیکھئے موقع شناس ہے

میرے یقیں کے راستے تاریک ہیں بہت
اک عزم کا چراغ مگر اپنے پاس ہے

کہنے لگے ہو مجھ کو ہی ننگ وجود کیوں
دیکھو تو سارا شہر ہی اب بے لباس ہے

جو شیشۂ یقیں کو بھی یکلخت توڑ دے
یاروں کے ہاتھ میں وہی سنگ قیاس ہے

شاید کہ کوئی حادثہ گذرا ہے رات کو
سورج کا چہرہ صبح سے کتنا اداس ہے

میں بہار آرزو کا گل ہوں نے گلزار ہوں
غنچۂ تہذیب کا چبھتا ہوا اک خار ہوں

کرچیاں بن کر بکھر جانا مقدر ہے مرا
پتھروں کے شہر میں آئینۂ افکار ہوں

چہرہ زخمی اور گھائل سا ہے میرا تن بدن
میں تو اپنے عہد کے انسان کا کردار ہوں

میں تھکن کی دھوپ سے تم کو بچاؤں گا ضرور
کرب کی راہوں کا میں اک نخل سایہ دار ہوں

آج بھی میری صدائیں گونجتی ہیں ہر طرف
گم شدہ افکار کی مسجد کا اک مینار ہوں

روند ڈالو تم مجھے دل کھول کر اے دوستو
سانحوں کے شہر کا لٹتا ہوا بازار ہوں

تم ذرا سا سوچ کر بیٹھو مرے سائے تلے
میں تو گذرے وقت کی تہذیب کی دیوار ہوں

رحم کی امید مجھ سے کر رہے ہو تم عبث
امن کی نگری پہ میں چنگیز کی یلغار ہوں

ساری دنیا کی خبر مل جائے گی جامیؔ تمہیں
دیکھ لو تم کھول کر میں آج کا اخبار ہوں

انور مسعود

اسلام آباد

بس یونہی اک وہم سا ہے واقعہ ایسا نہیں
آئینے کی بات سچی ہے کہ میں تنہا نہیں

بیٹھے پیڑوں کی اترن کا الاؤ تاپیے
برگِ سوزاں کے سوا درویش کچھ رکھتا نہیں

اُف چٹخنے کی صدا سے کس قدر ڈرتا ہوں میں
کتنی باتیں ہیں کہ دانستہ جنھیں سوچا نہیں

اپنی اپنی سب کی آنکھیں اپنی اپنی خواہشیں
کس نظر میں جانے کیا جچتا ہے کیا جچتا نہیں

چین کا دشمن ہوا اک مسئلہ میری طرف
اس نے کل دیکھا تو کیوں اور آج کیوں دیکھا نہیں

اب جہاں لے جائے مجھ کو جلتی بجھتی آرزو
میں بھی اس جگنو کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں

کیسی کیسی پرسشیں انور رلاتی ہیں مجھے
کھیتیوں سے کیا کہوں میں ابر کیوں برسا نہیں

جھانکا ہے دلوں میں تو یہ محسوس ہوا ہے
یہ دور تو پتھر کے زمانے پہ گیا ہے

اکتا کے ہوسناک نگاہوں کے ستم سے
اک پیڑ نے شعلوں سے بدن ڈھانپ لیا ہے

ہے یاد ابھی تک وہ سریلی سی اداسی
اُس گیت کا ٹکڑا تو مجھے بھول رہا ہے

ہونٹوں پہ ترے پھول کھلے اور طرح کے
لیکن تری آنکھوں نے تو کچھ اور کہا ہے

جاری ہے وہاں رقص چراغوں کی لَوؤں کا
مانا کہ سرِ بام بڑی تیز ہوا ہے

آتے نہیں انداز مجھے حُسنِ طلب کے
اے رحمتِ یزداں یہ مرا دستِ دعا ہے

حاصل ہی جاگیر ہے بے شرکتِ غیرے
انور جو مرا غم ہے وہی صرف مرا ہے

احمد جاوید
اسلام آباد

گشت پہ نکلا ہوا سپاہی

یہاں سے کچھ نظر آتا ہے اور کچھ نظر نہیں — آسمان نظر نہیں آتا، زمین نظر آتی ہے مگر کچھ کچھ — سورج نظر نہیں آتا دھوپ نظر آتی ہے — بہت کچھ۔

تو باہر گلی ہے اور گلی میں دھوپ ہے — لُو چلتی ہے۔ ان سب مکانوں کو جو نظر آتے ہیں دھوپ جانتی ہے اور جو نظر نہیں آتے وہ بھی تپتے ہوں گے کہ دھوپ کا گذر تو ادھر بھی ہوگا — لوگ اپنے اپنے گھروں کی چوکھٹ پر بیٹھے ہیں — ایک پاؤں اندر اک باہر — کوئی کوئی کھڑکیوں کے اُدھر کھڑا ہے اور کبھی کبھی جھانکتا ہے۔

تو گلی میں دھوپ ہے اور اک قدموں کی چاپ کہ اس مسلسل دھوپ میں گلی کا رخ کرتی ہے — بس ایک ہی چاپ کہ وہ چلتا ہوا آتا ہے — لوگ کھڑکیوں سے جھانک کر دیکھتے ہیں — وہ آتا ہے اور اس مکان کے دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو جاتا ہے کہ جس کے باہر زمین پہ سایہ ہے۔ یہ چھاؤں ہے اس چھجے کی جو دروازے کے ساتھ اوپر کہیں تنا ہے — یہ تو خوانچے والا ہے لوگ اپنے سر اندر کر لیتے ہیں۔

وہ چھاؤں میں کھڑا ہے اور سامنے صرف اس کی پشت ہے کہ وہی نظر آتی ہے — تو یہاں سے کچھ نظر آتا ہے اور کچھ نظر نہیں آتا — وہ بازو اٹھاتا ہے، شاید آستین کے ساتھ چہرے سے پسینہ پونچھتا ہے — یونہی چند لمحے کھڑا رہتا ہے پھر بیٹھ جاتا ہے — اب اس کا سر سامنے ہے پشت اب نظر نہیں آتی — اور نظر آتے ہیں گلی میں سامنے کے مکان اور ان کے دروازے اور کھڑکیاں اور ان کا اندر بھی نظر آتا ہے کہ دروازے اور کھڑکیاں کھلی ہیں مگر کچھ کچھ — اور چاروں طرف نظر آتا ہے اخباروں کا ڈھیر جو گلی میں اِدھر اُدھر پھیلا ہے اور اس کے اوپر کچرا اور غلاظت جو گلی والے وقتاً فوقتاً پھینکتے رہتے ہیں اور اس کے اوپر مکھیاں۔ تو یہاں سے نظر آتے ہیں اخبار اور ان کے اوپر پڑی ہوئی غلاظت اور ان پر بھنبھناتی ہوئی مکھیاں مگر اخباروں میں چھپی ہوئی خبریں وہ نظر نہیں آتیں — اور خوانچے والے کا سر کہ وہ کبھی دکھائی دیتا ہے — سر گھمائے تو چہرہ بھی نظر آتا ہے مگر وہ سر نہیں گھماتا کہ وہ بہت نڈھال ہے۔

آدمی نڈھال ہو، سر بوجھل ہو جائے تو کیا کرنا چاہیئے کبھی کبھی تو جی چاہتا ہے کہ ایسے سر کو ہونا ہی نہیں چاہیئے۔ مگر نہ ہو تو آدمی خوانچہ کس پہ اٹھائے۔

اب اس نے اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ دیا ہے — دھوپ بہت ہے مگر اس دھوپ میں تھوڑا سا سایہ بھی بہت ہے — مگر لو چلتی ہے اور اس کے پسینے کی بو اور حبس اس دروازے پر دستک دیتے ہیں جو اس کے پیچھے بند پڑا ہے — اور اس کا خیال شاید دروازوں سے اندر جھانکتا ہے (شاید اس لئے کہ خیال نظر نہیں آتا) — پھر شاید اس کا خیال آڑھتیوں کی دکانوں کی طرف جاتا ہے۔ اور وہاں سے ہوتا ساتے ساتے اپنے گھر داخل ہو جاتا ہے — جھکا ہوا سر اٹھتا ہے — کہ وہ اٹھتا ہوا نظر آتا ہے — اس کے مردہ جسم میں کسمساہٹ ہوتی ہے اور اس کے اندر سے ایک غضب ناک شخص نکلتا ہے جس کے ہاتھوں میں تلوار ہے — تلوار ہے مگر نظر نہیں

آتی — وہ ہاتھ ہلاتا ہے کہ ہاتھ ہلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ خوانچے پر بیٹھی ہوئی مکھیاں اڑنے لگتی ہیں — "سب دشمن سب جونکیں" وہ ہاتھ ہلاتا ہے۔ ہلاتا چلا جاتا ہے۔ مگر دشمن نظر نہیں آتے، مکھیاں نظر آتی ہیں۔ جو اس کے ساتھ ہلانے سے اڑ اڑ جاتی ہیں۔ اور پیچھے سے پھر آ بیٹھتی ہیں — وہ جھلا اٹھتا ہے — کہ ایک مکان میں کچھ ہلچل ہوتی ہے جیسے کوئی گھر سے باہر آتا ہو —

ایک نوعمر لڑکا نمودار ہوتا ہے، اس کے ہاتھوں میں ایک اخبار ہے، اخبار میں کھائے ہوئے پھلوں کے چھلکے ہیں — وہ لڑکا چھلکوں کو گلی میں اچھالتا ہے۔ چھلکے زمین پر آ رہتے ہیں — اور اخبار بھی مگر کچھ لہرا کر — یک لخت خوانچے والے کے ہاتھوں کی گردش بدلتی ہے — اور اس کے اندر کا غضب ناک شخص اس کے اندر ہی کہیں روپوش ہو جاتا ہے اور اس کے دشمن اس کی جونکیں سب وہ گویا گاہک کو سامنے پا کر کچھ صدا لگاتا ہے مگر پھر خوانچے کی طرف دیکھتا ہے اور تاسف سے سر جھٹک کر رہ جاتا ہے کہ وہاں پڑا ہوا مال تو مکھیاں چاٹ گئیں۔ مکھیاں چاٹ گئیں ان اخباروں تک پہنچنے کے لئے کہ جو خوانچے پہ بچھے تھے۔

معلوم نہیں خوانچے والے کے چہرے پہ کیا رنگ آیا کیا گیا کہ یہاں سے چہرہ نظر نہیں آتا ہے۔ معلوم نہیں اس کا چہرہ ہے بھی یا نہیں ہو سکتا ہے مکھیاں چاٹ گئی ہوں مگر ہوگا نہ ہوتا تو وہ آواز کیسے لگاتا۔

سورج آسمان کے بیچوں بیچ پہنچ چکا ہوگا کہ چھجے کے نیچے کا سایہ کچھ اور سمٹ گیا ہے۔ مندے کا شکار وہ خوانچے والا کوئی ماتم نہیں کرتا بلکہ کسی بڑی چھاؤں کی تلاش میں چھجے کے نیچے سے اٹھتا ہے اور اپنے ساتھ لائی ہوئی چند مکھیاں وہیں چھوڑ کر روپوش ہو جاتا ہے۔ مکھیاں ادھر ادھر بھنبھناتی ہیں کچھ گلی کے بیچوں بیچ پھلوں کے چھلکوں پر بیٹھ جاتی ہیں اکثر اخباروں کے انبار پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔

اب سامنے غلاظت کا ڈھیر ہے اور مکھیاں — سامنے کے مکان کے دروازے اور کھڑکیاں اور دیواریں اور ان کے اوپر نیچے دھوپ کی تہہ — اور گرمیوں کی دوپہر کا سناٹا اور اس سناٹے میں کہیں کہیں کسی کسی پرندے کی آواز اور گلی کے ادھر ادھر دوسری گلیوں اور سڑکوں پر گذرنے والی کسی کسی گاڑی کے پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ اور غشی اور غنودگی — مگر سونا نہیں چاہیئے کہ ہانپنے کی آواز سنائی دیتی ہے — کوئی آتا ہے۔ شائد کوئی آدمی ہے یہاں سے فی الحال کچھ دکھائی نہیں دیتا — نہیں یہ تو کتا ہے کہ اب وہ صاف دکھائی دیتا ہے — آدمی اور کتے میں تو بہت فرق ہے — پھر غلط فہمی کیوں ہوئی۔ زمین پر صرف آدمی ہی تو نہیں بستے کتے بھی تو ہیں — کچھ آدمی ہیں کچھ کتے ہیں۔ تو گلی میں دھوپ ہے اور چھاؤں میں کتا اور وہ زبان باہر نکالے ہانپتا ہے۔ وہ یہاں سے کچھ نظر آتا ہے اور کچھ نظر نہیں آتا — مگر جس قدر نظر آتا ہے وہ بھی کتا اور جتنا نظر نہیں آتا وہ بھی کتا۔

اوپر چھجے سے کچھ آوازیں آتی ہیں — جیسے کوئی چھت پہ چلتا ہو — یا دروازے پہ دستک دیتا ہو — آدمی ؟ نہیں آدمی اتنے سے چھجے پہ کیسے اتر سکتے ہیں۔ کچھ اور ہوگا۔ کتے نے کسی بھی متوقع واقعے کے لئے کان کھڑے کر دیئے ہیں — مگر ابھی تک وہ پچھلی ٹانگوں پہ بیٹھا ہے — اوپر کیا ہے — کائیں کائیں کی آوازیں — یہ تو کوے ہیں — اچانک کچھ چھجے سے نیچے گرا ہے — کچھ گرتے ہی کووں کا ایک غول بھی نیچے اترا — وہ کسی شئے کو گھسیٹتے چونچیں لڑاتے کائیں کائیں کرتے ایک دوسرے پر گرتے پر جھلاتے دھوپ اور سائے سے بے خبر ادھر سے ادھر چکراتے سامنے سے ہٹتے جاتے ہیں — ان کی آوازیں سنائی دیتی ہیں — کتا اپنے چاروں پاؤں پر کھڑا ہو گیا ہے اور دم بھی اکڑانے لگا ہے۔ غرانے لگا ہے۔ کائیں کائیں کا شور لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جاتا ہے — کتے کی غراہٹوں میں بھی اضافہ ہوا ہے — اب وہ اکڑ اکڑ کر آہستہ آہستہ چلنے لگا ہے — اس کے ذہن نے غالباً منصوبہ بندی کر لی ہے۔

— اچانک اس نے حست کی ۔ اب وہ سامنے نہیں ہے ——— سامنے ہیں کوؤں کی کائیں کائیں اور کتے کی غراہٹیں ۔ کوئی کھڑکی کھلنے کی آواز —— ایک گالی ۔ دیوار سے پتھر ٹکرانے کی آواز —— پھڑپھڑاتے ہوئے کووں کا غول چاؤں چاؤں کرتا کرلاتا ہوا کتا دیوار کے ساتھ ساتھ دم دبائے واپس بھاگتا ہوا اور پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا ہوا کھٹ — شائد کھڑکی بند ہوئی ۔

تو کوؤں کا غول اور کتا ——

آدمی کہاں ہیں — ؟ شائد ان کے پیچھے چھپ سے گئے ہیں یہاں سے صاف دکھائی نہیں دیتے ۔ کتا نظر آتا ہے کوے نظر آتے ہیں — آدمی نظر نہیں آتے — اور اب — اور اب تو وہ بھی نظر نہیں آتے کہ سامنے سے گذرتے جاتے ہیں اور گذرتی جاتی ہے آسمانوں پہ ایک چیل کرلاتی ہوئی اور شور مچاتا ہوا وقت مگر سناٹا اور دھوپ وہ نہیں گذرتے — نہیں گذرتے اور شام ہو جاتی ہے ۔

مگر شام ہونے میں ابھی بہت دیر ہے — سامنے دھوپ میں پڑے پھلوں کے چھلکوں کی نمی کچھ خشک ہو چلی ہے اور وہ مڑنے تڑنے لگے ہیں اسی لئے اب مکھیاں ادھر کم کم نظر آتی ہیں مگر اخباروں میں لپٹی غلاظت کی طرف اب بھی بہت ہیں — اب دیکھنے کو کچھ بھی نہیں یا مگر اڑی ادھر — اور ساکت ٹھہرا ہوا منظر — کوئی کب تک دیکھے ۔

دیکھنے کو کچھ نہ ہو تو آنکھیں بند کر لینی چاہئیں — مگر کیوں ؟ دیکھتے رہنا چاہئے ۔ کیا معلوم منظر کب بدل جائے مگر سامنے کچھ بھی نہیں — کچھ بھی نہیں — آج تو وہ نوعمر لڑکے بھی ادھر نہیں آئے — جو یہاں سامنے بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے تھے — اور کبھی موج میں آ کر یا اکتا کر یا بیزاری میں کنکر پتھر اٹھا کر بھی ایک دوسرے پہ کبھی ادھر ادھر کے مکانوں کے دروازوں اور کھڑکیوں پر پھینکتے اور میٹھی نیند سوئے ہوئے لوگوں کو جگاتے ۔ مگر آج تو اکثر اپنی چوکھٹ پر بیٹھے ہیں ۔ ایک پاؤں اندر ایک باہر — یہاں سے ان کے پاؤں نظر آتے ہیں ۔ کچھ کچھ دھڑ بھی دکھائی دیتا ہے ۔ مگر چہرے بالکل دکھائی نہیں دیتے — وہ کہاں ہیں — شائد ہیں ہی نہیں — وہ بالکل ساکت بیٹھے ہیں نہ باہر والا پاؤں اندر کرتے ہیں — نہ اندر والا باہر — درمیان میں بیٹھے ہیں بالکل ساکت — البتہ کوئی گذرتا ہے تو چونک چونک جاتے ہیں — بیٹھے ہیں مگر پھر تاسف میں سر جھٹک کر واپس لوٹ آتے ہیں —

تو سامنے کچھ بھی نہیں — اور کتا ہے کہ سر پہلو میں دیئے اب اطمینان سے ہے کہ اب کوئی اس کی طرف پتھر نہیں پھینکتا — ساکت ٹھہرا ہوا منظر ۔ ایک لاٹھی کی ٹک ٹک سنائی دیتی ہے ۔ کوئی بوڑھا شخص غلاظت کے ڈھیر پر جھکا ہے ۔ شائد وہ اکتا کر ادھر نکل آیا ہے ۔ وہ وہاں سے ایک اخبار کھینچتا ہے ۔ جیب سے رومال نکال عینک کے شیشے صاف کرتا ہے ۔ پھر وہی رومال ناک پہ رکھتا ہے ۔ اور زبان نکال اخبار کو کہیں کہیں سے چاٹنے لگتا ہے بقیہ حصے پر مکھیاں چمٹی ہیں — پھر اک اور آتا ہے ۔ پھر ایک اور — پھر ایک اور —

یہ کیا کرتے ہیں انھیں کیا ہوا ہے —— ؟ کچھ بھی نہیں صبح سے یہ دقت آ لگا ہے ۔ اخبار والا ادھر کو نہیں آیا ۔ لوگ بے حد مضمحل پڑے ہیں ۔ تازہ نہ سہی باسی ہی سہی ۔

شہر کی ساری گلیوں کی طرح ادھر بھی ہاکر آتا ہے اور آواز لگا کر اخبار بیچتا ہے —— رات بھر بے خبری کی نیند سونے والے ہر صبح اس امید پر جاگتے ہیں کہ ان کے جاگنے تک ادھر ادھر کچھ نہ کچھ ہو چکا ہوگا — کچھ نہ کچھ ہوتا بھی رہتا ہے مگر صبح جب وہ اخبار ہاتھوں میں تھامتے ہیں تو اس میں کچھ بھی نہیں ہوتا — یا شائد ہوتا ہے — تصویریں ہوتی ہیں کہ کسی کے کان غائب ہیں کسی کی آنکھیں کسی کی ناک — عجیب مسخرے لگتے ہیں ۔ لوگ دیکھتے ہیں مگر ہنستے نہیں — بلکہ حیران ہوتے ہیں ان لفظوں پر کہ جن کی کوئی ترتیب نہیں ہوتی —— یہ زبان کس ملک میں بولی جاتی ہے ۔ شائد کہیں بھی نہیں — وہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ کہ

جنھیں بہت بھوک لگتی ہے اور پیاس بھی ۔۔ وہ جاننے کی کوشش نہیں کرتے ۔ بلکہ انھیں چاٹتے ہیں ۔ سطر سطر لفظ لفظ ۔ اور انھیں چاٹتی ہیں مکھیاں ۔ نہ چاٹیں تو کیا کریں بھوکے مریں ۔

تو آج اضمحلال بہت ہے ۔۔ کہ دوپہر کا وقت بھی اب جاتا ہے چھجے کے نیچے کا سایہ اپنی ہی دیوار کی طرف سمٹنے لگا ہے اور سمٹنے لگا ہے وہ کتنا مختصر سے سائے میں ۔۔ کہ اچانک بھاگتے ہوئے قدموں کی چاپ ہے اور پاؤں ہیں کہ نظر آتے ہیں ۔۔ کوئی گلی کے بیچوں بیچ آ بیٹھتا ہے ۔۔ اس کے پاس شائد پوسٹروں کا بنڈل ہے ۔ وہ انھیں جلدی جلدی کھولتا ہے ۔ ایک پوسٹر زمین پہ پھیلاتا ہے ۔ ادھر ادھر دیکھتا ہے ۔ گھبراہٹ اس کے اعصاب میں رینگتی ہے ۔۔ وہ بوکھلایا سا شائد ہر شخص کی طرف دیکھتا ہے ۔۔ وہ بھی اسے دیکھتے ہیں مگر وہ ہلنے جلنے کی سکت سے شائد اب عاری ہوتے جاتے ہیں ۔۔ اسے کچھ حوصلہ ہوتا ہے ۔ وہ پوسٹر پر تیزی سے گوند چپکاتا ہے ۔۔ پھر پوسٹر ہاتھوں پہ اٹھاتا ہے اچانک وسل کی آواز کہیں سے سنائی دیتی ہے ۔۔ وہ اور زیادہ گھبرا جاتا ہے مگر تیزی سے آگے بڑھ کر پوسٹر دیوار پر چسپاں کر دیتا ہے ۔۔ اور پلٹتا ہے ۔ لوگوں کے چہروں پہ اک ذرا رنجیدہ سی مسکراہٹ ابھرتی ہے ۔ کہ اس شخص نے گھبراہٹ میں الٹا پوسٹر چسپاں کر دیا ہے ۔ سادہ کاغذ سامنے ہے اور لفظ چھپے کہیں دیوار کے ساتھ ۔۔ وہ پھر پیچھے پلٹنے کی کوشش کرتا ہے مگر وسل کی آواز اب قریب آتی جاتی ہے ۔۔ وہ ہڑبڑا کر بھاگتا ہے ۔۔ کسی کو بھاگتا دیکھ کر کتا غرا کر جھپٹتا ہے ۔۔ آدمی کا شور اور کتے کی غراہٹیں سنائی دیتی ہیں ۔ مگر نہ آدمی نظر آتا ہے ۔۔ نہ کتا ۔۔ دونوں سامنے نہیں ہیں ۔

اب وسل کی آواز گلی کے بیچوں بیچ ہے کہ شائد گشت پہ نکلا ہوا سپاہی ادھر آ نکلا ہے ۔۔ اس کا تنومند جسم یہاں سے کچھ کچھ نظر آتا ہے وہ آگے بڑھ کر گھروں کی چوکھٹوں اور کھڑکیوں سے آدھے باہر لٹکے مضمحل لوگوں کو دھکیل دھکیل کر اندر ڈالتا ہے اور پھر باہر سے کنڈی لگا دیتا ہے کہ وہ خود اندر سے کنڈی چڑھانے کی سکت اب نہیں رکھتے ۔۔ اور شام ہو جاتی ہے ۔

شام ہوتی جاتی ہے کہ دھوپ نے ڈھلنا شروع کیا ہے ۔ تمازت اب بھی عروج پر ہے مگر بہت دیر نہیں ۔ چھجے کا سایہ اب اور مختصر ہے اور گشت پہ نکلا ہوا سپاہی فارغ ہو کر ادھر آ بیٹھا ہے ۔ کہ یہاں سے اس کا سر نظر آتا ہے اور پشت بھی ۔۔ کچھ دیر وہ یوں ہی بیٹھا اور دکھائی دیتا رہتا ہے اور دکھائی دیتی ہیں سنسان گلیوں میں مکھیاں اور غلاظت کا ڈھیر ۔۔ پھر وہ اپنی پشت دروازے سے لگا دیتا ہے ۔۔ اور اب کچھ دکھائی نہیں دیتا کہ اس کی پشت پیچھے دروازے میں بنا چھوٹا سا وہ سوراخ بند ہو گیا ہے کہ جس سے ایک آنکھ باہر جھانک جھانک دیکھتی تھی ۔۔ تو اب اندھیرا ہے ۔۔ اندر بھی اور باہر بھی ۔۔ مگر مکھیوں کی بھنبھناہٹ اب بھی سنائی دیتی ہے ۔۔ شائد وہ ابھی تک غلاظت کے ڈھیر پر بکھرے ہوئے بدبودار لفظوں کے انبار پہ بیٹھی ہیں ۔

بقیہ : کہانی کا شعری کردار

ہمارا شہر بھی چپ چاپ ہے + ساکت ہے + شاید گوش برآواز ہے +

یہ آخری تین مصرعے اس پوری کہانی کو ہمارے لیے با معنی بنا دیتے ہیں ۔ ہم پر منطبق کر دیتے ہیں ۔ اور کہانی کے ماضی کو ہمارے لیے حال میں تبدیل کر دیتے ہیں ۔ یہ بتاتے ہیں کہ وہ صورت حال یہاں بھی پیش آ گئی ہے ، اور وہی تنا ؤ اور کشمکش اندر اور باہر ہمارے لئے بھی مقدر رہا ہے نا راج کے خلاف یہاں بھی بالآخر احتجاجی صدا بلند ہوتی ہے ۔ پس اس کے گونجنے اور انسانی گروہ کو اس سے واقف ہونے کی دیر ہے ۔ اور اس کے بعد نہ سہیل احمد زیدی کچھ کہیں گے اور نہ ان کی نظم ۔ اس کے بعد تو انسانی بصیرت اور انسانی آخری مرحلہ عملی شکل میں آپ کے سامنے [illegible]

"۔۔۔۔۔ بالکل بالکل بجا ارشاد بجا ارشاد فرمایا عالی جناب نے ۔۔۔۔۔ زماں و مکاں کے فرق نے عناصر و عوامل کی ہیئت ترکیبی میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیا ہے ۔۔۔۔۔ مگر حضور ۔۔۔۔ آپ تو دانش ور ہیں ۔۔۔۔ یہ اجزائے ترکیبی ۔۔۔۔؟

اب کیا ملاحظہ فرمایئے گا حضور یہ ۔۔۔۔۔ حضور کی مہربانی سے سارا معنویاتی نظام متاثر ہو کر رہ گیا ہے ۔۔۔ منطقی ترکیب اور منطقی توجیہہ سمجھا کی ۔۔۔۔۔۔"

معاف کیجئے گا حضور بندہ سے بڑی غلیظ گالی نکل رہی تھی بڑی مشکل سے روکا ہے کیونکہ ابھی تو بندہ پرور کے نو عالی خاص ہی کی جبینوں پر بل آ رہے ہیں ۔۔۔ کہیں حضور بھی پراگندہ خاطر ہو گئے تو مبادا فدوی کے پیر کے نیچے کی زمین اور سر کے اوپر کا چرخ کج رفتار بھی نیرنگ سامانی ستم ہائے روزگار کے گل بوٹے نہ سجانے لگے ۔۔۔۔"

"نہیں بندہ پرور آپ سے کیا شکوہ ہوگا ۔۔۔۔ ۳۲ برس سے آپ ہی کا نمک تو کھا رہا ہوں اور آپ ہی کے سہارے تو جی رہا ہوں ۔۔۔۔ بیچ کا ایک برس نا حضور؟ ۔۔۔۔۔ جب غریب پرور چند آفات ناگہانی کا شکار ہو گئے تھے نا ۔۔ تب بھی تو حضور دنیا آپ کے اور آپ کے باپ دادا کے نمک خواران قدیمی اور مقربان بارگاہ دیرینہ کے ہاتھوں پھر گردش کرتی رہی ۔۔۔۔۔"

گردش بہت عجیب تیز ہے حضور ۔۔۔۔۔ اور وہ بھی گردش روزگار ۔۔۔۔ غور فرمایا جائے ۔۔۔۔ ۳۲ برس پہلے اور ۳۲ برس بعد ۔۔۔ کتنا بڑا فرق واقع ہو گیا ہے! ۔۔۔۔ مگر حضور آپ ہمیں خاطر رکھیں ۔۔۔۔ ہم اپنی جگہ بالکل ہیں ۔۔۔ آپ تو دیکھ ہی رہے ہیں کہ ادب و احترام کی کوئی امکانی حد اس غلام ابن غلام نے چھوڑنے نہ دی نہ ہو گیا ۔۔۔۔ وہ سب صحیح نطفے سے نہیں ہیں حضور ۔۔۔۔ کمینوں کی اولاد ہیں سب ۔۔۔ نہیں نہیں حضور ۔۔۔ کمینوں کی بات کا کچھ خیال نہ کریں ۔۔۔ میں جانتا ہوں ۔۔۔۔ آپ اور آپ کے باپ دادے کے باپ دادے ۔۔۔۔ اور ان کے باپ دادے ۔۔۔۔۔ سب منہ میں سونے کا چمچہ اور ہاتھ میں چاندی کا جھنجھنا لے کر پیدا ہوئے

۔۔۔۔۔ اور جس دن سے یہ دنیا پیدا ہوئی اس پورے علاقہ کی بادشاہت ستانج آپ کے پرکھوں کے سر پر رکھا گیا ۔۔۔۔۔ آپ اور آپ کے باپ دادے اور آپ کی آل اولاد نسل سے اس مٹی کے سپوت اور اس علاقے کے تخت و تاج کے مالک ۔۔۔۔۔ وہ سب بکنے ہیں دستور ۔۔۔۔ بکنے دیا جائے ۔۔۔ جاہل ہیں نا سب ۔۔۔۔ غربت کی وجہ سے جہالت آ گئی ہے حضور ۔۔۔۔ صحیح ارشاد فرمایا عالی جاہ نے سب امیر کہاں سے ہو جائیں؟ یہ سب تو خدا کی دین ہے اور خدا مستحقین کا حق صحیح طور پر پہچانتا ہے ۔۔۔۔ یہ نیچ ۔۔۔ [illegible] کی اولاد ۔۔۔ عقل سے بھی پیدل ہو گئے ہیں سرکار ۔۔۔۔ ورنہ آپ کی منادی تو آپ کے کرم بے پایاں کا ثبوت چیخ چیخ کر دے رہی ہے ۔۔۔۔ آپ نے تو ملا کے لگما شقہ، تحصیلدار سبھی پیران کمین کے اولاد کی حفاظت کا بار ڈال دیا ہے ۔۔۔۔۔

حرام زادے برابری کا درجہ چاہتے ہیں ۔۔۔ اپنی اوقات نہیں پہچانتے اور آنکھ برابر کر کے چلتے ہیں ۔۔۔۔ ٹھیک ہوا حضور کا کہنا بالکل صحیح ہے ۔۔۔۔ چالیس پچاس سے زیادہ نہیں ۔۔۔۔ یہ سب ازلی کذاب ہیں حضور ۔۔۔ ہمیشہ تل کا تاڑ بنا دیتے ہیں سب ۔۔۔۔ اور بعد میں پناہ گاہوں میں حرام کی روٹی توڑتے ہیں اور اینٹھتے ہیں ۔۔۔۔"

معاف کیجئے گا عالی پناہ ۔۔۔ حضور ۔۔۔ سرکار ۔۔۔۔ معافی چاہتا ہوں ۔۔۔۔ دراصل یہ بندہ کمینہ بھی انھیں کمینوں سے متعلق ہے نا؟ ۔۔۔۔ اس لئے کبھی کبھی خون کا فساد رنگ لے آتا ہے ۔۔۔۔ سچ پوچھا جائے تو یوں ہی پیچھے میں گرا ہوا ہوں حضور ۔۔۔ اس لئے جتنی گندگی جتنی بدبو ہے وہ سب میری ہی ہے مائی باپ ۔۔۔ گنگا نہا کر آؤں گا تو پوتر ہو جاؤں گا سرکار ۔۔۔۔۔ اس مرتبہ پھر معاف کر دیں ۔۔۔۔۔ بس اس مرتبہ پھر حضور ۔۔۔۔۔ بس اس مرتبہ پھر حضور ۔۔۔۔۔۔"

داستان گو پاگلوں کی طرح رٹتا رہا۔

اور رٹتے رٹتے پیر میں سر چھپا کر پھپک پھپک کر رونے لگا۔

حاضرین کی طبیعت بھی از حد مکدر ہو گئی تھی اور خود سرکار ذی مرتبت بھی حیرت سے داستان گو کا منہ تک رہے تھے۔

"آج اس کو کیا ہو گیا ہے؟ ایسی بے معنی، بے مطلب اور بے ربط باتیں تو ان نے کبھی نہیں کیں۔" سرکار ذی مرتبت نے حاضرین سے پوچھا۔

"کچھ دماغ پر اثر معلوم ہوتا ہے۔" سب نے بیک زبان کہا۔

"ہاں لگتا ہے یہ تو اب کسی کام کا نہیں رہا..... اور کوئی ہے جو صوفیاء کے کچھ واقعات سنائے۔"

"نہیں حضور..... حالات ایسے ہیں کہ تمام دروازے بند ہوں گے۔"

سرکار ذی مرتبت ہاتھوں پر ہاتھ دھرے خاموش بیٹھے رہے..... حضرت مالک مع بیا کا دور دور تک پتہ نہیں..... حیلال میں آکر آستین میں کعبہ دکھانے والا رفیق خاص جنگل کی خطرناک رہگذاروں اور گھنے اندھیروں میں گم ہو چکا ہے..... اور داستان گو پھپک پھپک کر رو رہا ہے۔

داستان گو پھپک پھپک کر رو رہا ہے..... اور مخدوم جہاں کے روضے میں خلقت کا اژدہام ہے..... اور مخدوم جہاں کا روضہ ویران پڑا ہے....."

اور کہیں دور..... بہت دور سے سسکیوں میں ڈوبی ایک آواز ابھر رہی ہے اور ڈوب رہی ہے....."

"..... کوس کوس پر پہرہ بیٹھا..... بیٹھو بیٹھو بٹمار....."

"ہے ودھنا کیسی رچ دینی..... ہے ودھنا کیسی رچ دینی..... ہے ودھنا کیسی رچ دینی....."

زاہدہ حنا
(کراچی)

بود نہ بود کا آشوب

سب موجود ہیں اور پھر بھی عجب عالم نا موجودی ہے۔ تمام راحت سامانی کے باوجود کیسی رائیگانی ہے۔

چاروں طرف دھواں ہے شاید سگرٹوں کا، بو ہے شاید شراب کی ——

چچا —— شاید کا گذر بھلا یہاں کہاں ہے؟ یہاں تو تطابیت کے ساتھ رائیگانی ہے دھواں ہے، خون کی بو ہے اور ان سب کے درمیان میں ہوں۔ اور اب میں بھی کہاں رہی ہوں؟ بس ایک سایہ ہے جسکی موجودگی کو یہاں پہلے سے موجود لوگوں نے محسوس بھی نہیں کیا ہے۔

میرے سامنے اور دوسروں کی موجودگی کے درمیان سفید پتھروں والی ایک چٹیل پہاڑی ہے اس پہاڑی کے ایک مختصر سے حصہ کو ہموار دیوار کی شکل دے دی گئی ہے اور دیوار میں ایک سلاخ دار دروازہ لگا ہے۔ دروازہ میں آہنی قفل ہے۔ سلاخوں والے اس دروازے کے بائیں جانب ایک خود رو جھاڑی نے نمو پائی ہے اور گردن اٹھائے ان سلاخوں سے اندر جھانکنے کی کوشش کرتی ہے جہاں اندر ایک غار ہے اور محراب ہے، محراب سے پرے ایک تنگ و تاریک غار ہے اس غار سے پرے ازل ہے، ابد ہے اور لانہایت نیند ہے جو زندوں کے درمیان حدل کرتی ہے۔

کمرے میں بھیڑیوں کے غراہٹوں کی گونج ہے۔ میں ان غراہٹوں سے وحشت زدہ ہو کر بھاگتی ہوں اور دروازے کی آہنی سلاخوں پر اپنی پیشانی رکھ دیتی ہوں۔ جب وہ غار کے اندر موجود تھا تب بھی ایک ایسا ہی سلاخ دار دروازہ تھا لیکن کچھ وقت کی دیمک اس دروازے کی لکڑی کو چاٹ گئی اور یہ دروازہ تو ابھی حال میں لگایا گیا ہے۔ میں حسرت سے اس آہنی قفل کو دیکھتی ہوں۔ یہ آہنی قفل کھل نہیں سکتا۔ میں اندر جا نہیں سکتی۔ دو سلاخوں کے درمیان سے میں اپنا ہاتھ اندر لے جاتی ہوں اور اس نیم تاریک غار کی دیوار کو چھوتی ہوں۔

سفید پتھروں والی اس پہاڑی کے اندر بنے ہوئے اس فطری غار کی دیواریں ٹھنڈی ہیں۔ میرے بدن میں کپکپی سی دوڑ جاتی ہے۔ ان کھردری دیواروں میں اس کے ہاتھ کا لمس محفوظ ہے۔ اس نے ان دیواروں کو تھام کر سلاخدار دروازے سے باہر پھیلی ہوئی دھوپ کو ۳۰ دن تک دیکھا تھا۔ اس دھوپ کو جو اسے بہت محبوب تھی اور اس روشنی کو جس میں اس نے اپنے عزیز ترین دوستوں سے زندگی کے ادنیٰ و اعلیٰ مسائل پر بحثیں کی تھیں۔

اس کی آواز آتی ہے —— ملامت کرتی ہوئی آواز —— وہ کہہ رہا ہے کہ شہر کی سیاسی زندگی کسی اصول کی پابند نہیں رہی۔ پھر وہ تیس کمانداروں کا قصہ دہراتا ہے جب شہر کے زیادہ تر لوگ سودائی ہو گئے تھے اور انھوں نے انصاف کو فراموش کر دیا تھا لوگوں کی ندامت میں ڈوبی ہوئی آوازیں سارے میں گونجنے لگتی ہیں۔ یہ واقعہ ان کی سیاسی بصیرت اور منصف مزاجی کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ وہ اس واقعہ کو بھول جانا چاہتے ہیں —— پھر وہ کہتا ہے کہ جسطرح "تیس" کے عہد آمریت میں کسی شخص کا دیانت داری سے اظہار خیال

کرنا ممکن نہ تھا، وہی حال اب جمہوریت کے زمانے میں ہے۔ اس کے الفاظ میں اجالا کا زہر ہے اور وہ لوگوں کو ڈس رہا ہے۔

"میرا خطاب تم سب سے نہیں ہے بلکہ صرف ان لوگوں سے ہے جنہوں نے میرے لئے سزائے موت تجویز کی ہے اور ان سے مجھے ایک بات اور کہنی ہے۔ تم سمجھتے ہو مجھے اس لئے سزا ہوئی کہ میرے پاس ایسے الفاظ کہنے نہیں آتے جن کی بدولت میں رہا ہو جاتا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر میں مناسب سمجھتا کہ کوئی کام کرنے سے نہ چھوٹے اور کوئی بات کہنے سے نہ رہ جائے۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ وہ کمی جو میری سزا کی باعث ہوئی، الفاظ کی کمی نہ تھی۔ ہرگز نہیں۔ البتہ نہ مجھ میں اتنی جرات و بیباکی تھی اور نہ میری یہ خواہش تھی کہ تم سے اس طرح خطاب کروں جس طرح تم پسند کرتے ہو۔ یعنی تمہارے آگے روؤں اور گڑگڑاؤں اور وہ باتیں کہوں جو تم دوسروں سے سننے کے عادی ہو اور جو میرے خیال میں میری شان کے خلاف ہیں۔ تمہارے انداز میں تقریر کرکے زندہ رہنے سے تو میں یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ اپنے انداز میں تقریر کروں اور مار ڈالا جاؤں اس لئے کہ نہ تو میدان جنگ میں اور نہ عدالت میں میرے یا کسی اور شخص کے لئے جائز ہے کہ وہ موت سے بچنے کیلئے بلا امتیاز ہر طریقہ اختیار کرے۔"

میری نظر اپنے شوہر پر پڑتی ہے وہ ہاتھ بڑھا کر اسٹیریو کا سوئچ آن کر رہا ہے Boney M کی آواز اٹھتی ہے "RA-RA-RASPUTEEN" میں دہشت زدہ ہو کر اپنے ارد گرد دیکھتی ہوں۔ وہ سفید پہاڑی، ریتیوں کے وہ ہیڑ، منہدم ہوتی عمارتوں کے مبہوت کر دینے والے آثار اور جلال و جمال کے وہ مظہر مجسموں کے چہرے بھلا یہاں کہاں ہیں۔؟

یہاں تو چار دوست ہیں، شراب کے نشے میں ڈوبے ہوئے قہقہے لگاتے ہوئے اور سامنے کتابوں کی الماری پر اس سفید پہاڑی میں لگے ہوئے سلاخ دار دروازے کی تصویر ہے۔ میں بھی اس تصویر میں ہوں۔ میں نے دروازے کی ایک سلاخ کو تھام رکھا ہے اور غار کے اندر جھانک رہی ہوں۔ میرا چہرہ غار کی سمت ہے اور پست کیمرے کا سامنا کر رہی ہے اور اسی تصویر کے برابر کالسنی کا ایک مجسمہ رکھا ہے۔ یہ تصویر ایک گزرتے ہوئے سیاح نے میری درخواست پر میرے ہی کیمرے سے کھینچی تھی۔ اور غار کے قیدی کا مجسمہ بھی میں اس قیدی کے شہر کے ایک تنگ گلی کی گمنام دکان سے ہی خریدا تھا۔

جب میں نے یہ تصویر کھنچوائی تھی اور جس لمحہ میں نے یہ مجسمہ خریدا تھا اس لمحہ میں نہیں جانتی تھی کہ ایک رات ایسی بھی آئیگی جب اس کمرے میں موجود ایک شخص اس تصویر کو اور مجسمے کو دیکھ کر ایک جملہ کہے گا اور وہ جملہ ایسی گفتگو کو جنم دیگا کہ پھر سب کچھ ختم ہو جائیگا۔

میری نگاہیں بھٹکتی ہیں اور کتابوں کی الماری کے مقابل رکھے ہوئے رنگین ٹیلی ویژن پر جم جاتی ہیں۔ ٹیلی ویژن کیبنٹ پر سیاہ فریم میں جڑا ہوا ایک فوجی اعزاز سجا ہے چند ہفتوں پہلے یہ اعزاز میرے شوہر کو اعلیٰ پیشہ ورانہ خدمات کے صلہ میں عطا ہوا تھا۔ میں اس تقریب میں شریک تھی جس میں میرے شوہر کو یہ اعزاز ملا تھا۔

میں اس تقریب میں شریک ضرور تھی لیکن کچھ نہیں جانتی تھی اور کچھ نہ جاننے کی کھیتی آج میں نے اسطرح کاٹی ہے کہ میرے دونوں ہاتھ خالی ہیں۔

کچھ دیر پہلے کا وہ لمحہ میرے اندر ابد کی طرح منجمد ہے جب میں ڈرائنگ روم کی دھواں بھری فضا سے گھبرا کر اپنے شوہر اور اس کے دوستوں سے معذرت کرکے باہر چلی گئی تھی اور رات کی خنک فضا میں ٹہلتی رہی تھی۔۔ ڈرائنگ روم کی تمام کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور میں ان کھڑکیوں کے قریب ہی ٹہل رہی تھی کہ اچانک ایک آواز نے میرے قدم تھام لئے یہ میرے شوہر کے عزیز ترین دوست کی آواز تھی۔

"یار خوب تضاد اکٹھا کیا ہے بھابھی نے اس کمرے میں ۔۔۔ ایک طرف تو صدیوں پہلے زہر پینے والے بوڑھے کے قید خانے کی تصویر اور اس کا مجسمہ ہے اور دوسری طرف تمہیں ملنے والا اعزاز سجا ہے۔ ویسے یہ طے ہے کہ اگر ڈھائی ہزار برس پہلے تم وہاں موجود ہوتے تو بھابھی کے اس محبوب

شخص کیلئے زہر کا پیالہ تمہاری ہی نگرانی میں تیار ہوتا اور اسے زہر پلانے کی ذمہ داری بھی تمہارے ہی سپرد ہوتی"۔

مجھ تک چاروں کے قہقہوں کی آواز آئی اور میں نے لڑکھڑا کر دیوار کا سہارا لیا۔

"میاں ذرا آہستہ بولو ___ تمہاری بھابھی نے سن لیا تو قیامت آجائے گی" میرے شوہر کی آواز شاید مریخ سے آرہی تھی۔

"تو کیا بھابھی کو کچھ نہیں معلوم؟ لیکن وہ اس تقریب میں شریک تھیں جس میں تمہیں یہ اعزاز ملا تھا" ___ یہ دوسرے دوست کی آواز تھی۔

"ہاں وہ شریک تو تھی لیکن اسے نہ اس اعزاز کا پس منظر معلوم ہے اور نہ میری سرکاری مصروفیات کے بارے میں کچھ علم ہے۔ وہ نہیں جانتی کہ یہ اعزاز مجھے اس شخص کو پھانسی کے انعام میں ملا ہے جسے وہ بہت عزیز رکھتی ہے۔" یہ اسی شخص کی آواز تھی جو مجھے جان سے عزیز تھا، جس سے میں نے گھنٹوں ادب اور تاریخ کے موضوعات پر باتیں کی تھیں، جو مفکروں کا دلدادہ تھا، کتابوں کا شیدائی تھا اور فلسفہ تاریخ جس کا محبوب موضوع تھا۔ کیا یہ واقعی اس شخص کی آواز تھی۔؟

میری ٹانگوں میں دم نہیں رہا تھا، میں وہیں بیٹھ گئی ___ آوازیں مجھ تک آتی رہیں، یہ انسانوں کی آوازیں تھیں یا بھیڑیوں کی غراہٹ ہے

وہ ان لوگوں کے نام لے رہے تھے، ان کی باتیں کر رہے تھے جن میں سے کئی کو میں نام سے جانتی تھی۔ ان کے ساتھ میں نے ادبی نشستوں اور ذاتی محفلوں میں گھنٹوں باتیں کی تھیں، ان کے ساتھ میں نے کئی پسماندہ علاقوں کا سفر کیا تھا۔ گورده علاقہ اور ان میں بسنے والے محروم ترین انسان جن کی زندگی کی پستیوں کا شہر میں بسنے والے تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ لوگ پسماندہ بستیوں میں رہنے والوں کے ساتھ انہی کی طرح رہتے تھے اور ان کے دکھ درد بانٹنے کی کوشش کرتے تھے۔

میں انہی دنوں میں اعلیٰ تعلیم کیلئے باہر چلی گئی ___ اور جب میرا تعلیمی سفر ختم ہو رہا تھا تو میری ملاقات اس شخص سے ہوئی جو اب میرا شوہر ہے اور ان دنوں کسی ٹریننگ کے سلسلے میں باہر گیا ہوا تھا۔ بھیا کو جب معلوم ہوا کہ میں اس سے شادی کی خواہش مند ہوں تو انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں ایک فوجی کے ساتھ زندگی گذارنے کی استطاعت بھی رکھتی ہوں ہے؟ وہ میری افتاد طبع سے بخوبی واقف تھے اور اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا ہو گئے تھے ___ لیکن عشق کے سامنے دلیلیں ہار جاتی ہیں سو وہ بھی ہار گئے ___

شادی کے کچھ دنوں بعد ہم دونوں وطن واپس گئے۔ میں تین برس ملک سے باہر رہی تھی اور جب واپس آئی تو خواہش کے باوجود میرا ان دوستوں سے رشتہ استوار نہ ہو سکا ___ جبر کی فضا میں اضافہ ہوا تھا، لوگ بکھر گئے تھے اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ میں ایک شخص کی محبت میں اس طرح اسیر تھی کہ مجھے کچھ یاد نہیں رہا تھا ___ •

اس وقت یہ لوگ جن کے نام سن رہی تھی ان کے گرفتاری کی خبر ہماری واپسی کے چند ہفتوں بعد ہی چھپی تھی، پھر خبر آئی کہ ان کا معاملہ ایک فوجی ٹریبونل کے سپرد کر دیا گیا ہے، اس کے بعد معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک کو سزائے موت دے دی گئی ___

سزائے موت پانے والے کیلئے میں کئی روز تک چھپ چھپ کر روئی تھی۔ مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ وہ روشن دماغ اور روشن ضمیر انسان مر بھی سکتا ہے۔ وہ زبان جو دانائی کے موتی رولتے نہ تھکتی تھی، وہ گویائی سے محروم بھی ہو سکتی ہے۔ وہ ہاتھ جنہوں نے ہمیشہ سچ لکھا تھا، وہ پیوند زمین بھی ہو سکتے ہیں ___

میں نے بے یقینی کی ریتیلی دیوار کی کگر کو تھام کر یقین کی پتھریلی سرزمین تک پہنچنا چاہا لیکن ریتیلی دیوار کا قامت کم ہو رہا تھا اور میری انگلیوں کے درمیان سے ریت پھسل رہی تھی، گر رہی تھی۔

آوازوں کا پگھلتا ہوا، دہکتا ہوا سیسہ بہتا ہوا میری

سماعت تک آ رہا تھا۔ یہ لوگ بار بار اس شخص کا نام لے رہے تھے جو میرے لئے موجود لوگوں میں محترم ترین انسان تھا۔ اس سے میں بس چند محفلوں میں ملی تھی لیکن اس کی شخصیت کا سحر میرے وجود میں راسخ تھا۔ یہ تھا صاحب کا نام گرد وہ بستیوں کے بے شمار محروم انسانوں کے دلوں میں امید کی آخری کرن کے طور پر روشن تھا۔

وہ ہنس رہے تھے، وہ ایک دوسرے کو بتا رہے تھے کہ انھوں نے اسے کس کس طرح اذیتیں دیں۔ اس کی انگلیوں سے ناخن کس طرح کھینچے گئے۔ اسے کتنے گھنٹوں برف کی سل پر لٹایا گیا اور کتنی مرتبہ بجلی کے جھٹکے دیے گئے۔

تب میں نے جانا کہ وہ تو ہلاک ہونے سے ہفتوں پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ اسے کتوں کی طرح چاروں ہاتھ پیروں پر چلنے کیلئے مجبور کیا گیا، اسے برہنہ کر کے غلاظت کے تالاب میں غوطے دے گئے۔ پیروں میں وزن باندھ کر اور گلا پیروں کو آہنی حلقوں میں جکڑ کر چھت سے لٹکایا گیا ——

اذیت، پر وہ اذیت جو صرف ایک انسانی ذہن ہی سوچ سکتا ہے، اسے اور اس کے ساتھیوں کو دی گئی صرف اس لئے کہ وہ ان حکمرانوں سے اختلاف کرتے تھے جنہوں نے انسانوں پر جینا حرام کر رکھا تھا۔ یہ حکمران جن کا خیال تھا کہ وہ زمین پر خدا کے نائب ہیں اور خدا کے نائب سے زیادہ بھلا اور کون عدل کر سکتا ہے —— سو انھوں نے بھی عدل کیا۔ موت کی سزا تو محض ایک رسم تھی غائبانہ پیری کی سو وہ بھی پوری ہو گئی۔

سزاؤں کا نگران اعلیٰ اندر بیٹھا تھا اور ہنس رہا تھا۔ جب اس کی نگرانی میں ان سب لوگوں کو سزائیں دی جا رہی تھیں، جب ان پر دنیا کی ہر راحت حرام تھی اور جب ان پر عقوبت کا سہرہ رکھا تھا —— انھیں دنوں اس عقوبت کے نگراں کے ساتھ میں نے ہر شب، شب لب کی تھی اس سے محبت کی تھی اور ہر شام اسکا بے تابی سے انتظار کیا تھا۔

اس لمحے میری سمجھ میں بات آئی کہ سرسبز درختوں پر جب بجلی گرتی ہے تو وہ کس طرح بھسم ہو جاتے ہیں اور یہ بھی کہ ہری بھری بستیاں کیوں کر ایک لمحہ میں ہلاک ہو جاتی ہیں۔

میرے چاروں طرف آگ تھی اور دھواں تھا، خون کی اور سڑتے ہوئے گوشت کی بساند تھی۔ مجھے ابکائی آئی اور جو کچھ میرے اندر تھا وہ باہر آ گیا۔ یہ سڑا ہوا رزق اس اذیت دہی کے عوض ملنے والے روپے سے خریدا گیا تھا۔ میں اس سڑے ہوئے رزق کے پاس بیٹھی رہی۔

میں جانے کتنی دیر تک نڈھال بیٹھی رہتی پھر میں ہمت کر کے اٹھی اور اپنی خواب گاہ میں آ گئی۔ میں نے پانی سے اس سڑے ہوئے رزق کے ذروں کو دھو یا لیکن ابھی تو بہت کچھ میرے اندر تھا۔ ابھی تو میرے اندر اس شخص کی مسخ شدہ لاشیں تھیں جس نے عزیز از جان سمجھا تھا۔

میں نے اپنے ہونٹوں پر سے لپ اسٹک صاف کی اور تب آئینے میں مجھے اپنا ہاتھ نظر آیا —— لیکن یہ ہاتھ جو مرنے والے موجود اور پیدا ہونے والے دوسرے تمام انسانوں کی طرح کھال، چربی، خلیوں، نسیجوں، پٹھوں، عضلات ہڈیوں اور جوڑوں سے بنا تھا۔ یہ ہاتھ جس کا اختتام تمام دوسرے انسانی ہاتھوں کی طرح انگلیوں پر ہوا تھا۔

میں نے آئینہ میں اپنی انگلیوں کو دیکھا —— سبک اور سڈول انگلیاں، مخروطی ناخن اور ان پر دمکتی ہوئی ہلکی نیل پالش —— سورج کی انگلی پر سفید اوپل تھا اور اس کی دودھیا سفیدی میں قوس قزح کے سات رنگ جھلکتے تھے۔

پھر وہ انگلیاں میری نگاہوں میں کھنچ گئیں جنہیں میں نے کئی برس پہلے دیکھا تھا۔ توانا اور مردانہ انگلیاں۔ صاف اور ترشے ہوئے ناخنوں کے نیچے سے خون کی سرخی جھلکتی ہوئی، مشتری اور زحل کی انگلیوں کی پہلی پوروں کے کنارے سگرٹ کے دھوئیں سے زرد —— وہ انگلیاں ایک مقالے کے صفحات الٹ رہی تھیں اور وہ ہونٹ ان صفحات پر لکھے ہوئے الفاظ کی ادائیگی میں مصروف تھے۔

وہ آخری موقعہ تھا جب میں نے ان انگلیوں کو متحرک دیکھا اور ان ہونٹوں کو بولتے ہوئے سنا ___ مجھے تو آج معلوم ہوا کہ سیاہ بالوں سے ڈھکے ہوئے وہ توانا ہاتھ جب رخصت ہوئے تو محض کھپچیاں رہ گئے تھے، ان ستھری اور توانا انگلیوں اور صحت مند گلابی ناخنوں کی جگہ سکڑی ہوئی پکی ہوئی بے ناخن انگلیاں تھیں۔

وہ انگلیاں جو شعر لکھتی تھیں، وہ انگلیاں جنہوں نے تاریخ کی جدلیاتی تعبیر کتاب لکھی تھی، جنہوں نے اپنے عہد کی بدی کے خدوخال اجاگر کئے تھے، وہ انگلیاں خاک کا رزق ہوئیں۔

ڈرائنگ روم سے Boney M کی آواز آئی ___

___ He was a steppen Wolf

میں کسی معمول کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی ۔ کیا بھیڑئیے یونہی آزاد چھوڑ دئیے جائیں گے؟ میری نگاہوں میں اس بھیڑئیے کا توانا بدن کھنچ گیا جو کچھ دیر پہلے تک مجھے جان سے عزیز تھا۔

اب میں ڈرائنگ روم میں نیم تاریک محراب کے نیچے سایہ سی کھڑی ہوں۔ ان لوگوں نے میری موجودگی کو محسوس نہیں کیا ہے، وہ ہنس رہے ہیں۔ میں اپنے شوہر کے چہرے کو دیکھتی ہوں۔ اس شخص کا پرانا چہرہ کہاں ہے؟ کیا یہ اسے رکھ کر کہیں بھول گیا ہے؟ کیا یہ وہی شخص ہے؟ وہی عزیز از جان؟ آواز تکرار کرتی ہے ___ He was a

He was a ___ Steppen Wolf

_ Steppen Wolf

میں محراب کے نیچے سے نکل کر سامنے آتی ہوں اور اسٹریو کا سوئچ آف کر دیتی ہوں۔ شور سے بھرے کمرے میں سناٹا پھیل جاتا ہے، وہ چاروں چونک کر مجھے دیکھتے ہیں۔

"ارے تم کہاں چلی گئی تھیں؟ میں نے کئی بار تمہیں آوازیں دیں۔" میرا شوہر ہنستا ہے، اسکے سفید دانت روشنی میں چمکتے ہیں۔

"میں باہر ٹہل رہی تھی۔ تم لوگوں کی باتیں سن رہی تھی" میری آواز پرسکون ہے۔

"تم باہر تھیں؟" میرے شوہر کا چہرہ پھیکا پڑ جاتا ہے۔

"ہاں اور سوچ رہی تھی کہ تم نے اس شخص کو اس کے اصل جرم کی سزا تو دی ہی نہیں۔" میرے لہجے میں استہزا ہے۔

"کس بات کی سزا؟" میرا شوہر حیرت سے مجھے دیکھتا ہے۔

"اس بات کی سزا کہ وہ میرا پہلا مرد تھا۔" میری آواز سے کمرہ بھر جاتا ہے۔ میں ہنستی ہوں، میرے ساتھ وہ سفید چٹیل پہاڑی ہنستی ہے، کالستی کا وہ مجسمہ ہنستا ہے، غار میں موجود لانہایت بلند ہستی ہے اور وہ مردم شخص ہنستا ہے جس نے کبھی اپنی زندگی میں کبھی میری انگلیوں کی پوروں کو بھی نہیں چھوا تھا۔

مصطفیٰ اکمال

سردی زوروں پر تھی۔ ہندوستان کا شمالی خطہ بری طرح متاثر تھا ـــــ لوگ دھڑا دھڑ مر رہے تھے جسم قابو میں نہ تھے سورج ایام گزشتہ کی گہری کہانی بن چکا تھا۔ لیکن دل بھر کمبلایا رہتا تھا صبح ہو چلی تھی۔ کہرے نے سورج کی کرنوں کو جذب کر لیا تھا۔ گلی میں چلنا مشکل تھا۔ چند قدم آگے سجھائی نہ دیتا تھا۔ ایسے میں دو افراد ایک گھر کے قریب پہنچے ... انہوں نے دروازہ کی کنڈی کھٹکھٹائی۔

مالک مکان نے بڑی آہستگی سے دروازہ کھولا...

اسکا چہرہ نہ دیکھا جا سکا۔ صرف اس کی داڑھی دکھائی نظر آئی اس نے پورا جسم کمبل میں چھپا رکھا تھا۔ اس نے اپنے کو دروازہ کے کھلے حصہ میں فٹ کر لیا تھا ـــ جیسے وہ ٹھنڈک کو گھر میں داخل ہونے نہ دینا چاہتا ہو اور سردی سے بھی خائف ہو۔

پاس پڑوس میں کوئی ایسا غریب ہے ...... جسے رضائی کی ضرورت ہے..

غریب.... اتنا غریب میں خود ہی ہوں.... صرف اپنا پیٹ بھر رہا ہوں....

ایسے بھی ہونگے جو پیٹ بھی نہ بھر سکتے ہونگے؟... سوال کرنے والے نے پوچھا۔

تو پتہ لگائیے ہمارے پاس پڑوس میں سب حیثیت والے ہیں ..... کسی کو پاس پڑوس کی خبر نہیں۔ یہ کہہ کر اس نے بڑی بیزاری سے دروازہ بند کر لیا۔ گویا یہ جواب مل رہا تھا سردی نے اس کا [illegible] سنبھل چکا تھا۔

کہرا تھوڑا [illegible] گہرا ہوا تھا۔ سوال کرنے والوں کی آواز دور جاتی سنائی دینے لگی۔

اتنے سویرے یہ کیسے نکل پڑی ...! ایک متحرک گٹھری کو دیکھ کر انہوں نے تعجب کا اظہار کیا۔

سمٹا ہوا انسانی صورت سے ایک گٹھری معلوم ہو رہا تھا۔ پتلی سی ایک سوتی شال گلوبند کی طرح اس کے گردن کے گرد بندھی ہوئی تھی۔ ہر قدم پر بڑی مشکل سے اس کا بدن کانپ جاتا تھا اس نے گہری نظروں سے آنکھیں دیکھا۔ زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔ اس کے منہ سے رال ٹپکنے لگی۔ بولنے میں منہ کا زاویہ ٹیڑھا ہو گیا۔ ہاتھ اٹھایا... ہاتھ اٹھایا تو نیچے اینٹھے معلوم ہوئے... اس کا ٹیڑھا منہ اور گھوم گیا۔

آنکھیں.... پلٹنے لگیں... اس نے ہتھیلیاں زمین پر رکھ کر سر جھکا لیا۔

دیکھ لیا ــــ پہلے نے دوسرے سے کہا

ہاں دیکھا ــــ دوسرے نے ہنکاری بھری۔

نوٹ کیجئے۔

بغل سے دو گدھے دولتی جھاڑتے رینگتے نکلے۔ یہ انکی لپیٹ میں آنے سے بچے۔ انھوں نے گلی میں ادھم مچا دی۔ نالی کے کنارے پیشاب کرتا آدمی الٹ گیا۔ گدھے اس کی چادر کو لپیٹے .... گھسیٹتے بھاگے۔

دوڑو.... دوڑو.... چادر لے گیا... آدمی بھی چادر کو بچانے

میں کئی ٹکڑیاں کھا گیا تھا۔ وہ چلاتا بڑی تیزی سے گدھے
کے پیچھے بھاگا۔ گلی کے کئی دروازے اچانک کھلے۔
گدھا۔ آگے چادر میں پھنس کر گرگیا۔۔۔ وہ چادر کو پھاڑتا۔۔۔
گرتا۔۔ پڑتا۔۔۔ نکل بھاگا۔
گلی والوں کی سمجھ میں یہ خوب نہ آیا۔۔۔ شور مچانے والا۔۔۔
اپنی چادر پھیلائے۔۔۔ ماتم کرتا اس کی نمائش کر رہا تھا۔
گدھے نے چادر کو بری طرح پھاڑ دیا تھا۔ درمیان میں بہت
بڑا سوراخ بنا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور باقی چادر بری
طرح مسک گئی تھی۔۔۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا لیکن چادر۔
کے غم میں اسے اپنے برہنگی کا خیال۔۔۔ ذہن سے نکل
گیا تھا۔۔۔ صرف۔۔ جانگیا اس کے جسم پر تھی۔ چادر کے سوراخ
میں سے نکلا پورا چہرہ۔۔۔ اور کمر سے اوپر کا دھڑ ننگا نظر آ رہا
تھا۔ کئی لوگ اس برہنگی کا تماشہ دیکھنے جمع ہو گئے تھے۔ اس
کے جسم پر رونگٹے کھڑے تھے اور کہرے کی سفیدی اسکے جسم
کے رونگٹوں کے ساتھ لپٹنے لگی تھی۔
دیکھا بابو یہی ایک چادر تھی۔۔۔ ان گدھوں نے اسے
بھی چیتھڑا بنا دیا۔۔۔ اس نے ان چیتھڑوں کو تاکتے ہوئے
۔۔۔ ہمدردی چاہی۔۔۔۔
کہاں رہتے ہو۔۔۔۔؟
ادھر۔۔۔ دوسری گلی میں۔
چادر کی جگہ پر اب نئی چادر ملے گی۔
کون دیتا ہے۔۔۔ بابو۔۔۔ دیکھو ٹھنڈک سے جسم قابو
میں نہیں ہے۔ کہیں ٹھنڈک نہ لگ جائے یہ کہہ کر اس نے
چادر کو اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیا۔۔۔ جیسے ٹھنڈک
سے پناہ پالی ہو۔
کیا نام ہے۔۔۔ ہمارے نام تو بتاتے جاؤ؟
گھسیٹو۔۔۔ ہاں۔ گھسیٹو۔۔۔ کس طرح زندگی کو گھسیٹ
رہا ہوں وہ سہرتے دانت کٹکٹاتے۔۔۔ بڑی تیزی سے
گلی پار کر گیا۔۔ گلی سے مڑتے ہوئے اس نے انھیں
مڑ کر دیکھا۔۔۔ دھند درمیان میں حائل ہو گئی تھی۔
بھٹی سے نکلتا دھواں حلق میں گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔

اس کی کڑواہٹ آنکھوں کو دکھا رہی تھی کوئلے سلگ رہے
تھے انھیں شعلہ بننے میں دیر تھی۔ مٹی کے تیل کا کنستا تیزی سے
دھواں دے رہا تھا۔ کوہرے کے دباؤ سے اوپر نہیں جا پا رہا تھا
ہاتھ جیب میں بھی گرم نہ ہو پا رہا تھا۔
چلو آگے بڑھو۔۔۔ آتا ہوں۔۔۔ ذرا ہاتھ گرما لوں۔۔۔
ایک نے کہا۔
چلو بھی کہاں تک ٹھنڈک کو دیکھو گے۔۔۔۔ دوسرے نے
جواب دیا۔
سنو۔۔۔ ریڈیو بول رہا ہے تاپ مان (درجۂ حرارت) گر رہا
ہے۔۔۔ کہرا اسی طرح رہے گا۔
لوگ ٹھنڈک سے بچنے کی کوشش کریں۔
یہاں مرنے کا پیام آ رہا ہے۔۔۔ وہ۔۔ جینے کیلئے
کہہ رہا ہے۔۔۔ بوڑھے میاں بھی کھانسی کے درمیان رک
رک کر بولے۔
بلغم تو بلغم۔۔۔ سانس بھی تھم کر نکل رہی ہے۔ کمر کو پکڑ کر
نہ چلوں تو چل بھی نہیں سکتا۔۔۔ وہ ان لوگوں کے پاس
کھڑے ہو کر خود ہی بڑبڑانے لگے۔۔۔
انھوں نے یہ کہتے ہوئے سیدھے کھڑے ہونے کی کوشش
کی۔۔۔ وہ آہ کر کے پھر جھک گئے۔
چائے کی تلاش میں ہوں۔ گھر میں سب بستر میں گھسے پڑے
ہیں یہاں دھوئیں سے دم گھٹا جا رہا ہے۔
رضائی۔۔ چادر کے مستحق۔۔۔ سوال کرنے والے نے بڑے
میاں سے پوچھا۔
میرا بڈھا بہت پریشان ہے۔ دس عدد ہیں پیٹ نہیں
بھرتا۔ ٹھنڈک میں مر رہے ہیں۔۔۔ ایک رات پھر جلاتا
رہا۔۔۔ سونے نہ دیا۔۔۔ رضائی کا انتظام کر دو نہیں
سب مر جائیں گے۔
ویسے ہمیں بھی رضائی کی ضرورت ہے لیکن ہم بوڑھے مر گئے تو
کوئی بات نہیں۔۔۔ زندگی سب کو پیاری ہے۔۔۔
بڑے میاں۔۔۔ دیکھئے۔۔۔ وہ چیاؤں۔۔۔ چیاؤں
کرتے آپ کے پیچھے چلے آ رہے ہیں۔۔۔

ڈنڈے سے ایک کو مارتے ہوئے.... وہ بڑبڑا اٹھے....
آدمی تو مر رہے ہیں.... یہ سب نہ جانے کیسے زندہ ہیں...
تبھی ایک کتیا بڑی تیزی سے اپنے ڈھیر سارے بچوں کو ساتھ
لے کر بھونکتی دکھی... ان بچوں نے بوڑھے کی لاٹھی کے خلاف
محاذ... بنا کر بھونکنا شروع کر دیا.... گویا.... انھوں نے
اپنے گھرانے کا ایک وسیلہ پالیا ہو۔
پانی چڑھ جائے گی... کب تک بٹھائے رکھو گے... یہ سب الگ
شور مچا رہے ہیں۔ انھوں نے یہ کہہ کر بھی جھڑکی کھائی۔
ارے بچا.... کیوں گھبراتے ہو....
دیکھو.... کونکر کو بڑ کچھ جھیل رہا ہوں.... سچ کبھی آگ تاؤ
نہیں کھا رہی ہے....
ارے رضائی کے بغیر کام نہیں چلے گا... ابھی پورا جاڑا
باقی ہے.... کتنے میں بنے گی؟ وہ ہوٹل والے سے مخاطب
ہوئے۔
روئی کا دام دوگنا ہو گیا.....
نرد بھی چالیس سے نیچے اچھا نہیں ملے گا
دھنائی دو روپے کلو....
ٹکائی دو روپے....
میا بجٹ ہے.... پچھلے سال چوک گیا.... پیٹ کاٹ کر
بنوا لیتا.... تو یہ جاڑا مزے میں کٹ جاتا۔ اب کہاں سے
لاؤں.... انھوں نے پیچھے مڑ کر بڑی حسرت سے رضائی
تقسیم کرنے والوں کو دیکھنا چاہا.... وہ سڑک پار کر کے
دوسرے محلّہ میں داخل ہو چکے تھے....
رضائی کے بارے میں ان کی تمنا جاگ اٹھی۔ وہ خود
بخود بڑبڑا اٹھے۔
اشارہ میں بات کہہ دی کھل کر کیسے کہتا.... یہ غیرت
پیر تھام لیتی ہے۔
ارے کچھ پاس پڑوس کا حال معلوم ہے.... اس
سوال کی آواز گھر کے اندر تک پہنچی.... دوسروں کا
کیا حال بتاؤں؟
صبح صبح اپنے ہی لکڑی کو نے.... کی پڑی ہے..

... گھر کے اندر ہی سے جواب ملا۔
کیا کوئی خاص بات ہے.... جواب کے ساتھ سوال
آیا....
ہاں بیت المال سے رضائی بانٹنا ہے۔
میرے خیال سے ادھر کوئی مستحق نہیں... صرف
ایک بیوہ محلّہ میں ہے۔
اس کو تو پچھلے سال ہی رضائی دے دی گئی... پھیر
جمع کرنا تو مناسب نہیں.... بیت المال کا پیسہ
تو غریب غربا کے لئے ہے۔
یار عزیزوں کی خبرگیری کیلئے نکلے ہو.... تو ایک گھر
ضرور دیکھ لو.... یاد پڑ گیا... وہاں بازار کے نکڑ
پر جو ٹوٹا مکان ہے.... آگے کا دالان پست ہو گیا
ہے... پھٹا ٹاٹ کا پردہ پڑا ہے۔
مسجد کے سامنے.... سوال کرنے والوں نے استفہامیہ
انداز میں پوچھا۔
ہاں.... ٹھیک.... ٹھیک یہ ہو نہ گئے.... ایک
بوڑھے میاں رہتے ہیں... بس انھیں کے بڑے لڑکے کے
بارے میں کہہ رہا تھا.... ایک زمانہ تک بیکار رہا...
پھر بیمار پڑا.... بیچارہ دماغی توازن کھو بیٹھا... چھ
سات بچے ہیں.... کئی کئی فاقے ہوتے ہیں۔ بڑی
حالت خراب ہے...
اوڑھنے بچھانے کیلئے بھی کچھ نہیں.... پتہ نہیں
کیسے کٹ رہی ہے۔
کچھ وظیفہ باندھ دیا جائے۔
یہ گھر سکو تو دلدر ہی دور ہو جائے۔
انشاءاللہ ابھی دیکھ لیتے ہیں....
بس بھائی.... ضرور دھیان رکھنا.... میرا
کلاس فیلو تھا... بڑا ہی تندرست و توانا....
سنجیدہ نوجوان تھا۔
کیا بتاؤں.... آپ لوگوں کو چائے پلاتا.....
لیکن ابھی سوکھی لکڑی کا انتظام کرنا ہے.... پھر

کبھی۔
دو چار محلہ اور جائزہ لینا ہے۔
جاؤ... بھائی... اللہ تم لوگوں کو طاقت دے۔ یہ
بڑے دل گردے کا کام کر رہے ہو۔
چا، پی لو... ہاتھ گرما لو... دیکھو شعلے توڑ دے
رہے ہیں۔ پہلا بولا دل کی گرمی کے آگے یہ سب
بیکار ہے دوسرے نے جواب دیا۔
بھئی... چائے تو چل جانے دو... پہلے نے دہرایا۔
اگلا محلہ سروے کر لیں تب بیٹھیں گے... دوسرا بولا۔
رُکو... اس نے دوسرے ساتھی کے بات کو نظر انداز
کرتے ہوئے...، بھاپ نکلتی کیتلی کے بغل سے جھانکتے
شعلوں پہ ہاتھ سینکنا شروع کر دیا...
سورج کو کیا جھانک رہے ہو؟...
بیچارہ کو پالا مار گیا ہے... وہ تھر تھرا رہا ہے..
ارے بابو پردہ گرا دو... ورنہ چائے بھی مزہ نہ
دے گی...
سنا ہے... مہا پالیکا چولہے جورا ہے کوڑا تاپنے کے
لئے آگ جلوا رہی ہے۔
سنتے رہو... ابھی ڈیڑھ سو مرے ہیں...
یہ آگ جب تک جلائیں گے... دو چار سو اور مر چکے
ہوں گے...
ابھی ہزاروں مریں گے... دیہات کی حالت تو بہت
خراب ہے... پانی تک جم رہا ہے۔
کہیں چین نہیں...
بھائی بھٹی سے کیوں ہٹاؤ... جلو گے تو ہم نہیں جانتے
... چائے کا پانی کھول رہا ہے...
جلاؤ گے... جسم تو گرم ہوگا...
میری چائے پیو... گرما گرم رکھے گی...
وہ تو چار کپ انڈیل چکا... اس کی 'ٹھنڈی' دیکھ
رہا ہوں...
اے برانڈی پی... ایک ہی جام میں... تن من سب

گرم... دوسرا بیچ میں ٹپکا
پھر شراب خانے میں گھس جاؤ... ہماری بھٹی پر
کیا گدھے کی طرح جھکے ہو... چائے والا بولا۔
اماں ذرا ہاتھ کی ٹھنڈک نکلنے دو... بھٹی پر جھکے
کئی منہ ایک ساتھ بول پڑے۔
اندھے نہ بنو... دل کی آنکھیں کھولو... دیکھو ان
لوگوں کی گرمی ٹھنڈک اس طرح بھاگے گی... جی جان
سے غریب غرباء کو گرمانے میں لگے ہیں۔
اور تم لوگ سیو مائی کا انڈا بن گئے ہو۔

سید علی
کلکتہ

پھول کی چیخ

آج کی بھاگتی دوڑتی زندگی کے بہاؤ میں اتنی فکر کس کو تھی کہ اس کے پڑوس میں کون آیا کون گیا؟ ہاں آشا کی شخصیت شروع میں لوگوں کا مرکز توجہ ضرور بنی تھی لیکن آشا کے سپاٹ رویئے سے لوگ جلد ہی مایوس ہو گئے۔ امر اور آشا دونوں دوافتادہ گاؤں سے اس شہر میں آئے تھے اور بھوانی پور میں دو کمروں کے ایک فلیٹ میں رہنے لگے تھے۔ دونوں فلسفہ کے طالب علم تھے۔ دونوں کی شناسائی یونیورسٹی ہی میں ہوئی تھی۔

وہ دونوں بالعموم چھٹی کے دنوں میں اپنا زیادہ وقت وکٹوریہ گارڈن کے درمیان بہنے والی نہر کے کنارے بیلا گلاب اور رنگ برنگے پھولوں کے جھنڈ میں بیٹھے گاؤں کے کھیت کھلیان، شہر کے کل کارخانے اور ملک کے رنگا رنگ کہانیوں میں گذارتے ——— آشا کبھی کبھی رنگ برنگی کلیوں کی مسکراہٹ اور پھولوں کے تبسم میں ڈوب جاتی تو اسے نہر کے شفاف پانی کی ٹھنڈک اور شبنم کی تازگی محسوس ہوتی۔ وہ جی بھر کر پھولوں کی نرم، شگفتہ اور مخملی پنکھڑیوں کا رس نظروں سے چوستی رہتی، یہاں تک کہ اس کے جسم میں گدگدی سی پیدا ہونے لگتی اور وہ کچھ دیر لذتیت کی بے کنار دنیا میں کھو جاتی۔ پھولوں کا سارا حسن و رنگ آشا میں جذب ہو جاتا۔ وہ خود گل رنگ ہو جاتی اس کے مخملی جسم سے سرور بخش خوشبو ابلنے لگتی اور امر بے خودی میں آشا کی جھیل نما آنکھوں میں اتر جاتا ——— تب غیر ارادی طور پر آشا کی گدگدی میں اور اضافہ ہو جاتا ———

آشا پر تجسس انداز میں پوچھتی، امر ان نازک نازک میری شاداب شاخوں سے رنگ برنگے شگوفے کیوں اور کیسے پھوٹتے ہیں تو امر بڑے فلسفیانہ انداز میں جواب دیتا کہ ڈاکٹر شاذ ذا کا کہنا ہے کہ ان ہرے شاداب پودوں میں سورج کی کرنیں، ہوا کے جھونکے پانی کی نمی اور شبنم کی تازگی دھیرے دھیرے اثر انداز ہوتی ہے تو ان کی آمیزش سے شگوفوں کا خمیر تیار ہوتا ہے اور پھر چھوٹی چھوٹی پنکھڑیاں بے تاب ہو کر کلیوں اور شگوفوں کے روپ میں پودوں کے جسم پر جگہ جگہ اگ اٹھتی ہیں۔

الھڑ ہوائیں پھولوں کی خوشبو ادھر ادھر بانٹ رہی تھیں۔ چاند نہر کے پانی میں اتر آیا تھا۔ آشا اور امر کی پرچھائیاں پانی کے ہلکورے سے گڈمڈ ہو رہی تھیں ——— اچھا فلسفی صاحب ——— یہ برہمن اور اچھوت میں فرق کیوں؟ برسوں کا دبا ہوا کرب آشا کے تھرتھراتے لبوں پر احتجاج بن کر ابل پڑا ——— امر اس اچانک تیکھے سوال پر حیرت زدہ رہ گیا مگر ہوش و خرد سمیٹتے ہوئے اس نے

فوراً جواب دیا، "آشا فلسفی" ہر کیوں اور کیسے" کا جواب نہیں دیتا تم یہ سوال اپنے سماج سے پوچھو ــــ مگر میں پوچھتا ہوں تمہاں ہے وہ فرق ہے
یہ کہتے ہوئے امر آشا کے قریب تر ہوگیا اور آشا سمٹ کر سکڑ گئی ــــ اس کی اور سیار سنجیدگی میں تبدیل ہوگئیں ــــ آشا پوچھ بیٹھی شرمسار امر جی یہ سماج کیا ہوتا ہے؟ آشا سماج دراصل زندگی گزارنے کی ایک میکانکی ترتیب کا نام ہے۔ اس کا اپنا کوئی مستقل وجود کوئی پائیدار قدریں نہیں۔ ایک پرانا سسکتا ہوا سماج وہ چلا آرہا ہے جو چند اخلاقی قدروں کی بنیاد پر مسرتوں اور لذتوں کی حد بندی کرتا ہے اور اچھے اور برے خانوں میں زندگی کی اکائی کو تقسیم کر دیتا ہے ــــ ایک سماج وہ ہے جو برہمن اچھوت، اونچ نیچ، ذات برادری کی تقسیم پر قائم ہے لیکن یہ سماج اندر اور باہر سے ٹوٹنے لگا ہے ــــ اور ایک وہ سماج ہے جو روایات کا نہیں حالات کا پابند ہے جہاں خوشی و مسرت جس طرح حاصل ہوسکے حاصل کرنے کی چھوٹ ہے۔ سماج حالات کے دباؤ سے بنتا ٹوٹتا ہے ہر دور کے دانشور اپنی خواہشوں اور ضرورتوں کے لحاظ سے سماج کو بدلتے ہیں اسی کو میکانکی ترتیب کا نام دے رہا ہوں۔ امر نے سینہ پھلاتے ہوئے سماج کا فلسفہ سمجھایا۔ آشا بات آگے بڑھاتے ہوئے بولی آج کا سماج خواہ کسی بھی میکانکی ترتیب کے تحت وجود میں آیا ہو یہ حقیقت ہے کہ موجودہ سماج ہمارا محسن سماج ہے جسنے صدیوں سے ٹھکرائی ہوئی جنس عورت کو تمدنی مساوات دلائی جس نے طویل لڑائی کے بعد معاشی برابری کے حقوق دلائے ہیں۔ ہمارے سماج کی یہ برکت ہی تو ہے کہ اس نے مرد و زن کی تنفسی دیوار توڑ کر آزادانہ اختلاط کی بہار آفریں فضا کو لوٹایا۔ بالکل درست امر نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے اتنا اور اضافہ کیا کہ ہمارا سماج اب اونچ نیچ اور چھوت چھات کی فصیلوں کو ڈھانے میں کامیاب ہو رہا ہے۔ ہم اور تم اس کی روشن مثال ہیں کیوں آشا اور ہماری نسلیں تو اس بھید بھاؤ کے تصور سے بھی بے نیاز ہوں گی ــــ "ہماری نسلیں" کے لفظ پر چونک کر آشا ایک طرف سمٹ گئی۔

آخر ایک دن ایسا ہوا کہ آشا کی شاخ حیات میں ایک شگوفہ پھوٹا اور اس کے وجود کا رنگ اور نکھر گیا۔ اس کے جسم میں سہی گدگدی سی پیدا ہوئی اور اس کا دل سینے میں رقص کرنے لگا لیکن انجانے خوف نے اسے جھنجھوڑ ڈالا وہ سراسیمہ سی ہوگئی اس کے دماغ میں خزاں کا جھکڑ چلنے لگا اسوقت وہ زرد آندھیوں کے نرغے میں تھی اور یہ خوف مارے [illegible] رہا [illegible] شگوفہ کے معصوم [illegible] اس میں اس کا شاداب رنگ مدھم اور شگفتگی کم نہ ہوجائے ــــ اس شگوفہ کا وجود کانٹے کی چبھن بن کر اس کے کنوارپن کو چھلنی کرنے لگا [illegible] وحدت میں کثرت اسے نہیں آرہی تھی لیکن وہ اپنے وجود کی معصوم پنکھڑیوں کو کس طرح نوچ کر فضا میں تحلیل کرسکتی تھی؟ وہ کشمکش کے مہیب بھنور میں ناچتی رہی گیلی لکڑیوں کی آگ میں سلگتی رہی ــــ!!

دن بدن کشمکش کی آنچ تیز ہوتی چلی گئی وہ فکر کی گہری لمبی پرچھائیوں میں جدید سماج کے خدوخال تلاش کرنے لگی وہ جاننا چاہتی تھی کہ ہمارا یہ سماج کن قدروں کی بنیاد پر پھیلتا سکڑتا ہے کیا معیار ہے اس کے پاس پیار اور نفرت کا؟ آشا فکر و خیال کے تیز بہاؤ میں بے پتوار ناؤ کی طرح بہتی رہی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ نرسنگ ہوم کے بیڈ پر نہیں کسی مہیب سمندر کی خوفناک لہروں کے درمیان پھنس گئی ہے۔ امر اسے ایک ماہ پہلے ہی چھوڑ کر غائب ہوگیا تھا ــــ کیا وہ اپنے

والدین کے دباؤ سے گاؤں واپس لوٹ گیا تھا یا سماجی روایات کے دلدل میں پھنس گیا تھا؟ کیا اب آشا کی ضرورت نہیں تھی، کیا اس کے سارے فلسفے محض الٹا لوی کردار تھے ۔ بے چین دماغ طرح طرح کے سوالات کا آماجگاہ بن گیا ——— امر مجھے دھوکہ مت دو امر ——— مجھے لوگوں کی آڑھی ترچھی نگاہوں کی صلیب پر مت چڑھاؤ۔ لوٹ آؤ امر ——— ہم تم سماج کے دانشور ہیں ہمیں نئے سماج کی تشکیل کرنی ہے جس میں مسرت و آسودگی کے لئے ہر فرد ہر عمل کیلئے آزاد ہو ——— سوچو ہمارا یہ شگوفہ، یہ نسلی پہلی اینٹ نہیں ہے۔ جو نہ برہمن ہے نہ اچھوت ——— آشا ہذیانی انداز میں بڑبڑاتی رہی اور ایسے میں شگوفہ کی چیخ نے اس کی فکر کا تانا بانا بکھیر دیا۔

احساس بے چارگی اور شدت جذبات سے اس کی فکر کا منفی تار پھر حرکت میں آگیا۔ اس کے ویران خیالوں کے سراب میں امر بھاگ رہا تھا اور آشا اس کا بے تحاشا پیچھا کر رہی تھی ——— امر اتنا تو بتا کر جاؤ کہ تم اور تمہارا روشن خیال سماج اس نازک موڑ پر عورت کا ساتھ کیوں چھوڑ دیتا ہے؟ لوگ پھول کے پودوں کو اس لئے چاہتے ہیں کہ پودوں میں کلیاں چٹکیں، غنچے مسکرائیں اور پھول کھلے۔ تم کو اور تمہارے سماج کو یہ شگوفہ پسند نہیں آیا؟ تم بھی اسے آبرو کا پھوڑا ہی سمجھتے ہو؟ امر یہ تو اخلاقی قدروں پر تعمیر ہونے والے آج کی فتح اور تمہارے خیالی سماج کی شکست ہے! آشا کی حیرت کا طوفان اور ہنگامہ خیز ہوتا چلا گیا یہ فلسفہ اس کی سمجھ میں نہیں سما رہا تھا کہ سماج کا وہ معمار جو فطرت کی حسین کھلونوں کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے۔ وہی اپنے کھلونوں سے نفرت کیوں کرنے لگتا ہے؟ یہ جدید استحصال تو نہیں؟ وہ سیب کے چھلکے اتار اتار کر سیب کو ننگا کرتی رہی اور الجھتی رہی کہ چاقو اور سیب کی دوستی میں صرف سیب ہی کو ہر حال میں صدمہ کیوں پہنچتا ہے؟ اس کی فکر کا آتش فشاں اندر ہی اندر کھول رہا تھا اور لاتعداد سوالات کے لاوے ابل ابل کر یخ بستہ جذبات کو پگھلا رہے تھے۔ اس کے خیالات میں بغاوت، نفرت، انتقام اور خود سوزی کی لہریں گردش کرنے لگیں وہ سوچ کے بیاباں میں بھٹکتی ہوئی بہت دور نکل گئی۔ جذبات اور ہوس شر کے ٹکراؤ میں وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ قصور امر کا نہیں بلکہ اس کا اپنا ہے۔ اتنے خود کار وسائل کے باوجود اس نے شگوفے کے زہریلے مواد کو پھوڑا بننے تک اپنے جسم میں سرایت ہونے دیا ہی کیوں؟ کیوں اس نے امر پر اتنا اعتماد کیا؟ اب تو اسے اس پھوڑے کی چبھن اور کسک برداشت کرنا ہی ہے ——— اس نے امر کو معاف کر دیا اور اپنے اندھے اعتماد کی سزا خود ہی تجویز کر لی ——— اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ یکسو ہو گئی لیکن کتے کی بے ہنگم چیخ پکار سے اس کی یکسوئی بکھر گئی۔

آشا کے اندر کی زخمی عورت جاگ اٹھی اس نے کچھ سوچا، سوچ کر پھر مسکرا دی ——— اس کی سوچ کی تمام لہریں ایک فیصلہ کن نقطہ پر سمٹ گئیں ——— آشا نے اپنے اندر پھول کی تازگی اور غنچہ کا کنوارا پن محسوس کیا اور رات کی گہری تاریکی میں چیخ کے ساتھ ایک شگوفہ گم ہو گیا۔

انسانی حقوق کا سال، خواتین کا سال، بچوں کا سال روایتی شان کے ساتھ منایا جا چکا تھا اور اخبار کی سرخیاں دھندلا چکی تھیں صبح کے اخبار میں ایک ننھی سی خبر چھپی تھی ———

"کل شیشو نرسنگ ہوم کے پاس نالی پر ایک نمالچہ پڑا تھا جس کے گوشت پوست کے ڈھانچے کو کتے کھینچ رہے تھے۔"

بازغہ تبسم

محور

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چلتے چلتے اچانک اس کے قدم رک گئے، اور اس کی نگاہیں زمین میں گڑ سی گئیں۔ اسے محسوس ہوا ــــــ اس کا سایہ لمبا ہوتا جا رہا ہے۔ خوف کی وجہ سے اس پر کپکپی سی طاری ہو گئی۔ اس کے اندر سے ایک آواز ابھری جیسے گہرے اندھیرے کنوئیں سے بھوت اپنی ڈراونی آواز میں کہہ رہا ہو۔

"کہیں ایسا نہ ہو کہ رفتہ رفتہ یہ سایہ اتنا لمبا ہو جائے کہ ایک روز بسیط کائنات کو گھیرے گا اور تمہارا قد گھٹتے گھٹتے زمین کے برابر ہو جائے گا ـــ" اس کی پتلی پتلی ٹانگیں کانپنے لگیں حلق میں کانٹے چبھنے لگے۔ وہ گہری گہری سانس لینے لگا۔ جیسے ابھی دم بھر میں اس کی جان نکل جائے گی۔ ۔ ۔

وہ اپنی لاغر ٹانگوں کو گھسیٹتا ہوا گھر کی جانب بڑھنے لگا۔ سڑک پر لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ اس نے غور سے دیکھا ہر شخص کے پیچھے زمین پر ایک ہیولا لمبا ہوتا جا رہا ہے اور وہ دوڑ کر سڑک کے کنارے کھڑے اپنے مکان میں داخل ہو گیا۔ اس کا سایہ مکان کے باہر ہی رہ گیا تھا۔

اطمینان کی ایک گہری سانس لے کر وہ کرسی پر دھپ سے گر پڑا اور کرسی کی پشت سے سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔ بھوک کی وجہ سے پیٹ میں آگ سلگ رہی تھی۔ پیاس سے اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس نے بند پلکوں کے درمیان چھوٹی سی دراز بنا کر دیکھا۔ اس کی ماں نسا ہلی سے بستر سے اٹھی اور آہستہ آہستہ باورچی خانہ کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ زور سے چیخ کر کہے

ـــ "ماں کھانا جلدی لاؤ۔ مجھے شدید بھوک لگ رہی ہے۔" اس کے دل میں آیا وہ بہنوں پر برس پڑے۔ چھوٹے بھائی کی بلا وجہ پٹائی کرے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یکبارگی اس کی نظر کھڑکی کی طرف اٹھ گئی اور اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ کھڑکی کے سفید بے داغ شیشے کے پیچھے سے سیاہ سایہ جھانک رہا تھا اور اچانک اس کے جکڑے ہوئے اعصاب کے بل ڈھیلے پڑ گئے۔

ماں نے کھانا لا کر میز پر اس کے سامنے رکھ دیا لیکن وہ چند لقمے بھی زہر مار نہ کر سکا جیسے حلق کے قریب کسی نے لکڑی کا سخت کارک لگا دیا تھا۔ اس نے بہ مشکل پانی کے چند گھونٹ حلق سے اتارے اور اٹھ گیا۔

بستر پر نیم دراز ہوتے ہی اسے کوئی ضروری بات یاد آگئی اور ایک لمحے کے لئے اس کے خشک ہونٹ مسکرا اٹھے۔ وہ تیزی سے اندر کمرے میں داخل ہوا۔ "نیوز پیپر" اس کے دماغ میں صرف ایک ہی لفظ تیر رہا تھا۔

سامنے چارپائی پر اس کا باپ آنکھوں پہ دبیز شیشوں والا عینک لگائے۔ کانپتے ہاتھوں میں نیوز پیپر تھامے کوئی بہت اہم خبر پڑھنے میں منہمک تھا۔ وہ دور دروازہ میں کھڑا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سرخیاں پڑھنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ اخبار پر پھیلتی اس کی نگاہیں زاویہ بدل کر دیوار پر آویزاں آئینہ کی طرف اٹھ گئیں۔

آئینہ میں اس کا اپنا عکس نظر آ رہا تھا اور چہرے پر آنکھیں ایسی لگ رہی تھیں جیسے دل میں گھٹی ہوئی دو چیخیں ہوں۔

چہرے پر ابھر آئی ہیں۔ پیغوں اور آہوں کا تصور تو صرف اتنا ہے کہ
وہ بے نام جذبات سے کچھ کہنا چاہتی ہیں لیکن دل میں گھٹی آہوں
کو بے نقاب کرکے وہ یہ بھول گیا تھا کہ مشینوں کی گھڑ گھڑاہٹ
اور شور و شغب نے انسانوں کی قوتِ سماعت کے ساتھ ہی ان
کی بصارت بھی چھین لی ہے۔ اور بدلتے ہوئے پیمانوں میں جذبات
و احساسات کے رنگ دھندھلا گئے ہیں۔ اوہ! کبھی کبھی وہ
اتنا دقیانوسی کیوں بن جاتا ہے .... جیسے، جیسے ...

اخبار کے پیچھے سے اس کے باپ نے چہرہ اٹھا کر لال
پیلی آنکھوں سے اسے گھورا اور سر سے پاؤں تک کانپ کر رہ
گیا۔ وہ ان نگاہوں کی تاب نہ لا کر تیزی سے پلٹا اور دروازے
سے باہر نکل گیا۔

وہ بے مقصد ہی سڑک پر چلتا رہا۔ اس نے کنکھیوں سے
دیکھا سیاہ سایہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ وہ اس
کرب ناک خیال سے فرار حاصل کرنے کے لئے اپنے وجود کو کھنگالتا
رہا لیکن چند چنگاریوں کے سوا راکھ کے اس ڈھیر میں کچھ بھی
نہ تھا۔

"ستو بیٹے مسنود" آواز پر وہ چونک کر رک گیا
گلی کی نکڑ پر ماسٹر رام کھڑے ہوئے تھے۔

"یہ فائل پرنسپل صاحب کو دے آؤ۔ پرنسپل صاحب کا
مکان معلوم ہے نا۔ تیسری گلی گلشن محلے میں ان کا مکان
ہے۔" حسبِ عادت کرخت لہجے میں حکم دینے کے بعد ماسٹر رام
نے پرامید نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور وہ خاموشی سے
فائل تھام کر گلشن محلے کی طرف چل دیا۔ حالانکہ گلشن محلے میں
اکیلے جاتے ہوئے اس کو گلی کے خونخوار کتوں سے ہمیشہ ڈر
لگتا تھا لیکن اس وقت نہ جانے کیوں بغیر کسی خوف کے وہ
گلشن محلے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ خوف، احساس، محرومی
کے ساتھ مرکب ہو کر اس کے رگ و پے میں دوڑ رہا تھا۔

پھر اچانک اسے محسوس ہوا سایہ بڑھتا جا رہا ہے اور
اس کا قد گھٹتا جا رہا ہے۔

اس نے آنکھیں میچ لیں۔ اب اسے کچھ بھی نظر نہیں
آ رہا تھا۔

نہ بڑھتا ہوا سایہ نہ راہگیروں سے بھری ہوئی سڑکیں
نہ گلی کے نکڑ پر کھڑے ماسٹر رام۔ نہ سر کے اوپر آگ اگلتا
ہوا آسمان نہ بوجھل قدموں کے نیچے سمت چلتا ہوا فٹ پاتھ۔
اس نے دیکھا ارد گرد سے گذرتے ہوئے لوگوں نے بھی اپنی
آنکھیں مضبوطی سے بند کر رکھی ہیں۔

اسے حیرت ہوئی اور عجیب سی دبی دبی خوشی کا احساس
ہوا کہ وہ آنکھیں بند کرنے کے باوجود اپنی راہ پر برابر بڑھ
رہا تھا۔ اب ہر طرف ایک خلاء تھا اور اس کا جسم معلق تیر
رہا تھا۔

ایک جون مہینے کی پہلی تاریخ۔ فیکٹری میں تنخواہ کا
پہلا دن۔ اس کی جیب میں دو ماہ کی پیشگی تنخواہ تھی۔
پچھلے کئی برسوں کی مسلسل بے کاری اور بے روزگاری
کے بعد دوستوں کے مشورے اور بزرگوں کے پند و نصائح
کا اثر قبول کرتے ہوئے اس نے فیکٹری کی ملازمت قبول
کر لی تھی اور دیوہیکل مشینوں نے بڑی تیزی سے اسے ایک
متحرک پرزے میں ڈھال دیا تھا....

بازار میں بے مقصد گھومتے ہوئے اس نے اپنی بہن
کیلئے فراک ـــ چھوٹے بھائی کیلئے کھلونے۔ ماں
کے لئے ساڑی اور ابو کے لئے شال خریدی اور اپنے محور
پر گھومتا ہوا گھر کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

موریس روڈ کی فٹ پاتھ پر تیزی سے بڑھتے ہوئے
اچانک وہ کسی سے بڑی زور سے ٹکرا گیا۔

"اوہ" غلطی سے لاشعوری طور پر آنکھیں کھول کر دیکھا
اس کے زوردار دھکے نے ایک بوڑھے اندھے فقیر کو فٹ پاتھ
کے نیچے کول تار کی سخت زمین پر گرا دیا تھا۔ بوڑھے کا نحیف
و نزار بدن بید مجنوں کی طرح کانپ رہا تھا اور ہونٹوں پہ
کچھ بے ترتیب سے لفظ پھسل رہے تھے۔

وہ ایک لمحے تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ اس
کے جسم پر کسا آہنی خول جگہ جگہ سے ہٹ رہا تھا۔ اندھے فقیر
کی کمزور اور مجبور آواز اس کے ذہن پر چھائے جمود میں تلاطم
بپا کر رہی تھی۔

وہ ساکت و صامت کھڑا تھا۔ اور سخت خول کے اندر اس کے وجود میں زبردست سرد جنگ جاری تھی۔ اس نے ارد گرد نظریں دوڑائیں جیسے شکست خوردہ زخمی سپاہی پڑوسی ملک سے امداد طلب کر رہا ہو۔ "زن" سے فراٹے بھرتی ہوئی سفید ایمبیسڈر اس کے قریب سے گذری۔ ـــ رائل فیکٹری کا منیجر کار کی پچھلی سیٹ پر ڈھیر تھا۔ اسے دیکھ کر منیجر نے ایک شیلی مسکراہٹ اس کی طرف اچھال دی اور ہوا میں ہاتھ لہرا کر اسے الوداعی اشارہ کیا تھا لیکن نہیں! منیجر نے تو دراصل کھڑکی سے باہر انگلیوں میں سلگتی سگریٹ کی راکھ جھٹکی تھی اور وہ اس حرکت کو اپنے لئے اشارہ سمجھ کر خوش ہوگیا پھر جیسے بہت ضروری بات اسے یاد آگئی اس نے بے نیازی سے آنکھیں بند کیں اور برق رفتاری سے آگے بڑھ گیا۔

گھر پہنچتے ہی اس نے سامان پلنگ پر اچھال دیا اور ماں کو کھانے کا آرڈر دے کر کرسی پر نیم دراز ہوگیا۔

"اے رینو کی بچی! جلدی سے ایک گلاس ٹھنڈا پانی لے آ۔ پھر بعد میں اپنے کپڑے دیکھ لینا۔" اس کی آواز میں شہنشاہ اکبر کا رعب عیاں تھا۔

اس نے شکم سیر ہو کر کھانا کھایا ـــ اور الماری کی طرف دیکھتے ہوئے بے نیازی سے بولا۔

"ماں کچھ پھل ہوں گے تو لاؤ۔ تھوڑا منھ کا مزہ بدل لوں۔"

اس نے پانی کا بھرا ہوا گلاس ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا۔ پھر اس نے چند پھل کھائے۔

"نیوز پیپر" ایک سوال اس کے ذہن میں ابھرا۔ اس کو دیکھتے ہی والد نے اخبار ہاتھ سے رکھ دیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اخبار لیا اور غیر ضروری خبروں سے لے کر فلم کے اشتہار، اداکاران کی فہرست، تھیٹرز کے نام تک پڑھ ڈالے۔

پھر اخبار کو چھوڑ کر وہ گنگناتا ہوا باہر آنگن میں نکل آیا۔ اس کی نظریں اچانک قدموں میں جھک گئیں ـــ

اور دل انجانے خوف سے دھڑک اٹھا ـــ سایہ؟؟

اس نے ذہن کو جھٹک دیا۔۔۔۔۔۔۔۔ "آوہ"

او ـ ہ "یہ! یہ"

مسرت کی کرنیں آہستہ آہستہ اس کے دل میں اترنے لگیں۔ اسے اپنے بدن میں ایک ہلکی سی کپکپی محسوس ہوئی۔ یوں تو ہر چیز بظاہر اپنی جگہ موجود اور محفوظ تھی ـــ لیکن سایہ ـــ؟

سیاہ سایہ اس کے قدموں میں سمٹ رہا تھا۔

اس نے ایک بار پھر نگاہوں کے زاویہ کو موڑ دیا۔ اور تھکی ہوئی نگاہیں آسمان کی وسعتوں میں پھیلا دیں۔ اس کی نگاہوں کے قیدی پرندے تیزی سے آسمان کی وسعتوں میں پرواز کرتے رہے۔۔۔۔۔

سیاہ، سفید، نیلا، سرخ ـــ، آسمان بڑی تیزی سے رنگ بدل رہا تھا۔ معصوم بچے کی طرح حیرت اور دلچسپی سے وہ آسمان کے بدلتے رنگ اور دلکش مناظر دیکھنے میں اتنا محو ہوگیا کہ سڑکوں کا بے ہنگم شور، بولتے بدقوق چہروں پر پھیلی کرب ناک لکیریں۔ زندہ ہستیوں میں ابھرتے مسائل کے کریہہ داغ اس کے لاشعور میں سمٹتے چلے گئے۔ تجسس اور عالم استعجاب میں وہ بسیط کائنات کی نیرنگیوں کو تکتا گیا اور پھر ہمیشہ کے لئے الجھ کر رہ گیا۔۔۔

اب وہ اپنے آپ کو بہت ہی ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا قد اونچا ہوتا جا رہا ہے۔ وہ اوپر ہی اوپر اٹھتا جا رہا ہے۔ اچانک وہ اتنا قد آور ہوگیا کہ اس نے ہاتھ بڑھا کر چاند ستاروں کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا۔ !!!

عروج زیدی

کس لئے زندانیٔ دیوار و در ہو جائیے
بال و پر ہوتے ہوئے بے بال و پر ہو جائیے

مثل بوئے مشک یہ اپنا تعارف آپ ہے
کیوں عبث شرمندۂ عرض ہنر ہو جائیے

یہ حجاب لالہ و گل، ماہ و انجم تا کجا؟
اب تقاضائے نظر ہے جلوہ گر ہو جائیے

ہر گھڑی سوچے کہ اس راہی کی منزل اور ہے
ایک کانٹا بہر قلب راہبر ہو جائیے

دانش حاضر کی پھیکی چاندنی سے فائدہ
بے خبر بن جائیے یا باخبر بن جائیے

کاروبار زیست میں لگ جائیں گے خود چار چاند
ہر نشانہ کے لئے سینہ سپر ہو جائیے

ہر نفس پر اک چھناکے سے پڑے گا سابقہ
پتھروں کے شہر میں آئینہ گر ہو جائیے

تاب نظارہ پریشاں، عقل حیراں ہوش گم
کون جلووں سے یہ کہتا "منتشر ہو جائیے

میرا ذمہ مہر و مہ آئیں منانے کے لئے
اک ذرا بیگانۂ شام و سحر ہو جائیے

اس سے پہلے داد کا طالب نہیں شعر عروج
اہل دل بن جائیے اہل نظر ہو جائیے

اظہار عابد (اناؤ)

گھروں میں اپنے نہ الجھا ہوا دھواں رکھئے
جو ہو سکے تو اب آزاد کھڑکیاں رکھئے

چمٹ نہ جائے بدن سے مہیب سناٹا
فضا میں کچھ نہ کچھ آواز کا نشاں رکھئے

کہیں چراغ تہہ آب کیجئے روشن
کہیں گرفت میں خوابوں کی تتلیاں رکھئے

رہے گا دھند سے بے رنگ آئینہ کب تک
کوئی تو شہر میں اپنا مزاج داں رکھئے

پلک جھپکتے ہی کیا وقت چال چل جائے
ہوا کی دھار پہ تیار کشتیاں رکھئے

ہزار سمت سے اڑتی ہے گرد رنگ ہوس
بچا کے کون سے گوشے میں نقش جاں رکھئے

نہ باز آئیں گے بارش گران سنگ یہاں
ہزار دست دعا سوئے آسماں رکھئے

گزرنے والا ہے وہ آہوئے رمیدہ سا
بہت سنبھال کے ہاتھوں پہ اب کماں رکھئے

شعور ذات کے جوہر سمیٹ کر عابد
برائے نام سمندر میں سیپیاں رکھئے

ناصر شکیب
(ونگال گڑھ)

کچھ تو کہو یہ دوستو کیسا عذاب ہے
چہرہ ہر ایک شخص کا سوکھا گلاب ہے

صحرا کی تیز دھوپ میں ہے زندگی رواں
سر پر نہ سائباں ہے نہ عکسِ سحاب ہے

دیکھو تو پُر سکوت ہے دریائے زندگی
سوچو تو اس کی تہہ میں بہت اضطراب ہے

جب بھی سفر کیا کبھی صحرائے ذات میں
محسوس یہ ہوا کہ کوئی ہم رکاب ہے

ہر موج سطحِ آب پہ لیتی ہے کروٹیں
پوشیدہ زیرِ آب کوئی انقلاب ہے

بہتر ہے بھاگ جاؤ کہیں جنگلوں کی سمت
ماحول بستیوں کا بہت ہی خراب ہے

عرفانِ ذات دیکھیئے کب تک نصیب ہو
دریائے آگہی میں ابھی اضطراب ہے

جمیل قریشی
ادے پور (راجستھان)

اثر زہر کا جس کے پانی میں تھا
وہی شوخ دریا روانی میں تھا

گیا تو بہت اس کی شہرت ہوئی
وہ جب تک رہا بے نشانی میں تھا

سبھی ڈھونڈھتے تھے اسے شہر میں
جو اک شخص میری کہانی میں تھا

وہ ہر شب مجھے قتل کرتا رہا
بڑا لطف اس مہربانی میں تھا

پلٹ کر وہ آجائے گا ایک دن
گماں سا کہیں بے گمانی میں تھا

بدن اس کا سارا تھا حرفِ کلام
وہ مشہور گو بے زبانی میں تھا

امجد بستوی
(لکھنو)

دیوانہ صحرا کو چلا ہے
پھر در زنداں ٹوٹ گیا ہے
وہ اور میرے گھر کا رستہ
شائد رستہ بھول گیا ہے
حرف تمنا خون کا دریا
دل کا سفینہ ڈوب رہا ہے
شب کی نیندیں اچٹ گئی ہیں
دن کو جب وہ یاد آیا ہے
دیکھو اس کو چھیڑ نہ دینا
وہ اب تم کو بھول رہا ہے
کتنے چہرے اتر گئے ہیں
شائد وہ پردیس چلا ہے
لب پر اس کا نام آتے ہی
درد کا سورج ڈوب گیا ہے
سننے والو دھیان سے سن لو
پتہ پتہ بول رہا ہے
لمحہ لمحہ جیسے پرندہ
اڑنے کو پر تول رہا ہے
رات کی بے خوابی کے ڈر سے
شام ہی سے امجد سہما ہے

اس پیڑ کی شاخوں کو طوفان نے توڑا ہے
جو دھوپ کے جنگل میں لوگوں کا سہارا ہے
دروازے کھلے مجھ پر صبحوں کے تقدس کے
جھونکے سے ہوا کے جب آنچل کوئی ڈھلکا ہے
تپتی ہوئی دھرتی پر برسات ہوئی ایسی
پیڑوں کا ہر اک پتہ اب خون میں ڈوبا ہے
برسوں میں کہیں جا کر یہ راز کھلا ہم پر
وہ صبح جسے سمجھے تاریک اجالا ہے
زہریلی ہوائیں ہیں انگاروں کی بارش ہے
یہ شہر نہیں ایسا موسم کا شگوفہ ہے
خود فہمی کی گرمی نے موسم کو سکھا ڈالا
سنتے ہیں سمندر سے جھونکا کوئی آیا ہے
اے دنیا کے ہنگامے آ میری مدد کو آ
پھر مجھ کو مرے گھر میں سناٹوں نے گھیرا ہے

صدائے دوستاں آباد

نئی نسلیں کا یہ شمارہ[۱۲] اپنی روایتی آن بان کے ساتھ شائع ہوا ہے اور حسبِ معمول آپ کا اداریہ اردو ادبی سماج کے کھوکھلے پن کو بے نقاب کر رہا ہے اور اہلِ نظر کو لمحہ فکریہ عطا کر رہا ہے۔ آپ کی بات چند سوالات پر ختم ہوتی ہے اور ان سوالات کے دامن میں جوابات بھی پوشیدہ ہیں۔ واقعی یہ سب کچھ ذاتی اغراض کی تکمیل کے لئے کیا جاتا ہے اور یہ ذاتی اغراض ہی ہیں جو اچھے اور معیاری کام کو لاحاصل اور بے مصرف بنائے دے رہے ہیں۔

مضامین میں عتیق الرحمٰن قاسمی کا مضمون قاضی عبد الستار کے ناولوں کا اچھا جائزہ ہے۔ البتہ بہت مختصر ہے۔ ہر ناول پر الگ اور بھرپور مضامین درکار ہیں لیکن پھر بھی اس مضمون سے ایک خاکہ ابھرتا ہے ——— ڈاکٹر احمد سجاد کا مضمون "جدید شاعری کی پہچان" بہت سرسری اور نامکمل ہے۔ آدھا مضمون تو نقطی گورکھ دھندا ہے۔ وہی گئے گذرے لوگوں کے اقوال اور فقروں کا مجموعہ۔ یہ باتیں پیشہ ور نقادوں کے ہر مضمون میں میں دہرائی جاتی ہیں۔ دراصل اس نقالی نے ہماری تنقید کو بے اثر کر دیا ہے اس کے بعد جدید شاعری کی پہچان وہ صرف چند غزل گو شعراء کے اشعار کے ذریعہ کرانا چاہتے ہیں جو ناکافی ہے۔ جدید شاعری کا بیشتر حصہ جدید نظم پر مشتمل ہے۔ اور جدید لب و لہجہ کی غزل دراصل جدید نظم کی کوکھ سے ہی پیدا ہوئی ہے۔ احمد سجاد صاحب نے ایک بھی حوالہ کسی نظم کا نہیں دیا ہے۔ بلکہ سامنے کی غزلوں پر اکتفا کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس موضوع پر زیادہ سنجیدگی سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ ایسی پہچان سے کوئی فائدہ نہیں۔

نظموں اور غزلوں کا انتخاب آپ کے حسنِ ادارت کی گواہی دے رہا ہے۔ آپ کا تجزیہ خوبصورت ہے۔

(رفعت سروش دہلی)

نئی نسلیں صحت مند ادب کا ترجمان ہے۔ شہریار، فضا ابنِ فیضی اور حفیظ میرٹھی کی غزلوں نے متاثر کیا۔ سیدہ نزہت صدیقی کی نظم عصری حسیت کی نمائندگی کرتی ہے۔ قاضی عبد الستار کا افسانہ "آدھا درخت" لاجواب ہے۔ قاضی صاحب کے ناولوں کے سلسلے میں عتیق الرحمٰن قاسمی کا مضمون تشنہ ہے۔ "تجزیہ" اس پرچہ کا حاصل ہے۔

(مختار شمیم، اندور)

نئی نسلیں کا تازہ شمارہ زیرِ نظر ہے جس میں وزیر آغا، ابن فرید، طارق چھتاری وغیرہ جیسے چوٹی کے قلم کاروں کی نگارشات کی شمولیت اس کے معیار کی ضامن ہے۔ مجموعی طور پر یہ شمارہ اچھا تاثر چھوڑتا ہے ویسے اردو کے اس پرآشوب دور میں اردو رسائل نکالنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ ایسے میں آپ کی یہ کوشش لائقِ صد تحسین ہے۔

براہ کرم معیار کا دھیان رکھئے۔ خدارا اسے گروپ

بندلیوں کے جھگڑے سے پرے رکھتے ہوئے کوشش
کیجئے کہ ہر گروپ سے وابستہ رہنے والوں کی نمائندگی ہو
سکے۔ چاہے وہ ترقی پسند ہوں یا جدیدیے یا تیسری آواز
کے مختلف دبستان، تاکہ قارئین کے سامنے پورے ادب
کی مکمل تصویر آسکے۔

(خورشید حیات، گیا)

'نئی نسلیں' کا ایک شمارہ ملا تھا۔ آپ کا تجزیہ پڑھ
دیا تھا۔ پسند آیا تھا۔ میں جب سے آپ کی تنقیدیں پڑھ
رہا ہوں۔ تب سے آپ کے مخصوص نقطۂ نگاہ کا احترام
کرتا ہوں۔

(حمید سہروردی، بیدر)

'نئی نسلیں' کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ رسالہ نہایت
صاف ستھرا اور خوبصورت ہے۔ کتابت اور طباعت پر مزید
توجہ کی ضرورت ہے۔ آپ کا اداریہ نہایت فکر انگیز ہے
خدا کرے اس سے لوگوں کو عبرت حاصل ہو۔

(کرامت علی کرامت، کٹک)

بہت خوب، آپ نے نئی نسلیں کو بین الاقوامی بنا
دیا۔ کہاں کہاں اس کی فضائیں جا پہنچیں۔ اللہ اللہ۔ لاہور
سے لندن! اور یہیں سے کناڈا تک۔ کہاں کہاں زقند لگائی
ہے۔ میں یوں کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ رسالہ آپ کی بکھری ہوئی
شخصیت کا پرتو ہے۔ آپ آفاقی و بین الاقوامی کے ABJ-
ECTIVES پہلے ہو چکے ہیں۔ مگر یہ بکھراؤ (اگر یہ صحیح
لفظ ہے۔) جدیدیوں جیسا نہیں بلکہ سورج کی شعاعوں
جیسا ہے جو اپنے مرکز سے اپنا تعلق ہمیشہ قائم رکھتی ہے
چنانچہ خواہ کسی گوشۂ ارض کی ہو ہر تخلیق میں آپ کے
فکر کی خوشبو موجود ہے۔

رفیع الدین ہاشمی نے اقبال کے سوانحی سرمایہ کا جائزہ
خوب لیا ہے مگر حیرت ہے کہ ڈاکٹر جاوید اقبال کی "زندہ رود"
کو فراموش کر دیا ہے جس کی دو جلدیں سامنے آچکی ہیں۔ اور
جو حیاتِ اقبال پر غالباً اب تک کا سب سے معتبر، مفصل اور
قابلِ قدر کارنامہ ہے۔

کہانی کے تجزیہ کا فیچر شروع کر کے آپ نے ایک بڑا
قرض ادا کر دیا۔ اس طرح نئے افسانہ نگاروں کی تربیت
ہو گی اور تعمیر پسند اہلِ قلم جو میدانِ افسانہ نگاری میں لنگڑا
کر چل رہے تھے اسپِ تازی کی طرح تگ و تاز کریں گے۔
قاضی عبدالستار صاحب کے ناولوں کا تجزیہ اور
سعیدان کا افسانہ دونوں اس شمارے کے وزن و وقار
میں اضافہ کے موجب ہیں۔ محترمی و مکرمی اختر انصاری صاحب
کے ترشحاتِ فکر سے فیضیاب ہونے کا موقع آپ نے
مہیا فرمایا۔ اس کے لئے خصوصی طور پر آپ کا شکر گذار
ہوں اور سعید ابو الخطیب اور اس کا محورِ تخلیق، دیارِ فرنگ
کا طلسماتی شہر لندن، بے ساختہ غالب کا یہ شعر زبان
پر آگیا:

کلکتہ کا ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے دل پہ وہ مارا کہ ہائے ہائے۔

ابو الخطیب "دوامِ مرحوم" کے لئے اتنے اہم تھے جتنے
کہ گذشتہ صدی میں نول کشور کے "اودھ اخبار" کے لئے
رتن ناتھ سرشار تھے۔ موصوف کی یہ خوبی ہے کہ وہ
لندن میں اپنی قیام گاہیں تبدیل کرتے رہتے ہیں چنانچہ میں
ان کی تلاش بسیار کے باوجود ناکام رہا۔ یہ بھی نہ معلوم
کر سکا کہ ان کے ناول "اجالے میں موت" کا کیا انجام ہوا۔
کہاں سے شائع ہوا یا ہنوز محتاجِ اشاعت ہے۔ آپ نے
ان کو زندہ لا کھڑا کیا ہے یہ آپ ہی کی مسیحائی ہے مجھے
بھی اس مقبرہ کا پتہ دیں جہاں سے موصوف برآمد ہوئے
ہیں تو شکر گذار ہوں گا۔ اور حفیظ و فضا کی غزلوں کے لئے
بھی آپ کو مبارکباد دیتا چلوں۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ
حفیظ کو سکونِ قلب عطا فرمائے اور فضا صاحب کو
نزولِ الماء سے شفایاب کرے۔ (آمین)

(شبنم سبحانی۔ سلطان پور)

'نئی نسلیں' کا تازہ شمارہ ملا۔ اس عنایت خاص کیلئے
شکر گذار ہوں۔ تازہ شمارہ حسبِ معمول بھاری بھرکم
ہے بلکہ خاص نمبر کا حکم رکھتا ہے۔ منظومات کم ہیں۔

لیکن انتخاب ہیں۔ شہریار کی غزل بطور خاص پسند آئی۔ فضا ابن فیضی اپنی غزلوں کی وجہ سے کم اپنا رنگ و روپ کی وجہ سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔ بے طرح لمبی چوڑی غزلیں لکھنے کی وجہ سے ان کی اکثر غزلیں بالکل سپاٹ اور تاثر سے عاری ہوتی ہیں۔ احمد سجاد کا مضمون ہلکا پھلکا ہے۔ معلوم افزا تو ہے لیکن اس میں علمی بصیرت نہیں ہے۔ ذوقی کے افسانہ پر آپ کا تجزیہ قابلِ توجہ ہے۔ قاضی صاحب کا افسانہ تازہ شمارے کی خاص چیز ہے۔ مجھے بہت پسند آیا۔

(فاروق شفق، کلکتہ)

'نئی نسلیں' کے منصوبوں پر انجم صاحب سے کچھ گفتگو ہوئی۔ مسائل تو بہت ہیں اور مشکلات بھی۔ پھر آپ اور میں دونوں ہی کچھ عدیم الفرصت اور کچھ مبتلائے عوارض۔ بس حتی المقدور کام کئے جاتا ہوں۔ یہی مقدر ہے اور یہی آرزو۔ شاید کہ یہ حقیر مساعی قبول حق تعالیٰ ہوں۔

(ڈاکٹر عبدالمغنی پٹنہ)

تازہ واردانِ ادب

نام کتاب : تیسری دنیا کا افسانہ
• مرزا حامد بیگ • احمد جاوید
خالدین پوسٹ بکس ۱۱۹۷ - لاہور
قیمت : دس روپے

یہ مختصر سی کتاب نہ تو تیسری دنیا (THIRD WORLD) کے ممالک میں لکھے جانے والے افسانوں کا انتخاب ہے اور نہ ہی اس کتاب میں تیسری دنیا کی افسانہ نگاری کے لئے کسی طرح کے اصول و ضوابط طے کئے گئے ہیں ___ یہ کتاب دراصل نئی نسل کے دو ادیبوں مرزا حامد بیگ اور احمد جاوید کے ایک ایک مضمون یعنی دو مضامین کا مجموعہ ہے۔ مرزا حامد بیگ اور احمد جاوید افسانہ نگار بھی ہیں اور تنقید نگار بھی۔ ان کے افسانے عموماً ہندوپاک کے رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں، اور ان کی تنقیدی مضامین بھی وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں ___ میں یہ بحث اور کسی موقع کے لئے اٹھا رکھتا ہوں کہ کوئی افسانہ نگار جب تنقید لکھتا ہے تو تنقید کے ساتھ اس کا سلوک کیا ہوتا ہے؟ غور طلب بات یہ ہے کہ یہ دونوں افسانہ نگار اپنے مضامین میں مسائل و موضوعات کو ثانوی اہمیت دیتے رہے اور ادب کے ازلی معیاروں سے برگشتہ رہے ہیں پھر یہ تیسری دنیا کے افسانے کے عنوان سے رنگریزی تیگ مین اور ماضی پرستی جیسے مباحث میں سائل پرستی، ترقی پسند طرزِ فکر اور تیسری دنیا کے موضوعات کے تعین کے دوران افسانہ نگاروں سے غیر ضروری مطالبات کرتے کیوں نظر آتے ہیں؟ لطف کی بات یہ ہے کہ مرزا حامد بیگ نے قرۃ العین حیدر کو ماضی پرست اور انتظار حسین کو ماضی سے حال کی طرف سفر کرنے والا بتلایا ہے۔ یہ بات دلچسپ اس لئے بھی ہے کہ اس بیان سے قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین دونوں کے فن تک لکھنے والے کی نارسائی کا شبہ ہوتا ہے ___ خدا جانے یہ بھارت اور پاکستان کے افسانوں کے درمیان خطِ فاصل کھینچنے کی کوشش ہے یا کچھ اور ___ بایں ہمہ حامد بیگ نے اپنے مضمون میں نئی نسل کی تشکیک، بے یقینی اور احتجاج کے محرکات و عوامل کی جستجو کی ہے اور ماضی پرستی کے ساتھ حال کے حوالے سے ماضی کی تخلیقِ نو پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے ___

مرزا حامد بیگ کے مضمون کا عنوان "تیسری دنیا، آگہی کی مخفی نفسیات اور ہمارا افسانہ" ہے تو احمد جاوید کا موضوع "تیسری دنیا، برصغیر کا سیاسی رویہ اور ہمارا افسانہ" ___

احمد جاوید کا مضمون نسبتاً واضح، ان کی نثر غیر مبہم اور موضوع سے ان کا ربط زیادہ سچا معلوم ہوتا ہے ___ کہ موصوف نے عموماً سنی سنائی باتوں اور چلتے ہوئے تنقیدی افکار سے احتراز کیا ہے ___ یوں تو یہ بات مرزا حامد بیگ کے مضمون میں بھی مشترک ہے مگر مرزا حامد بیگ نے اپنے ذیلی عنوانات یا ضمنی موضوعات میں الجھ کر مضمون کا رخ صراحت سے زیادہ اغلاق کی طرف موڑ دیا ہے ___ اس کی ضرورت اس لئے بھی نہ تھی کہ یہ خصوصیات تیسری دنیا کے مسائل سے وابستہ افسانوں اور افسانہ نگاروں میں یوں بھی بہت زیادہ پائی جاتی ہیں۔ پھر یہ کیا ضروری کہ ان پر لکھا جانے والا

مضمون بھی انھیں امتیازات سے مالامال ہو ـــــ
اس کتاب کو پڑھنے کے دوران مجھے بار بار فرانز فینن کی
کتاب "THE WRETCHED OF THE EARTH"
یاد آئی۔ اس کے ساتھ اس کتاب پر مراں، پال، سارتر
کا پیش لفظ یاد آیا۔ یہی نہیں بلراج مین را کا خیال آیا اور محمود ہاشمی
کے ایک مضمون کا بھی ـــــ بلراج مین را کا اس لئے کہ
شعور میں انھوں نے تیسری دنیا کے افسانے کے عنوان سے چند
افسانوں کا ایک باقاعدہ انتخاب شائع کیا تھا اور اس حصہ پر
"آگہی کی تمثیل" کے عنوان سے محمود ہاشمی نے مضمون لکھا تھا
ـــــ ان چار حضرات کا یاد کرنا اس لئے بھی ناگزیر تھا کہ
حامد بیگ اور احمد جاوید غیر معمولی طور پر ان چاروں سے کسی نہ
کسی طور پر متاثر اور بعض جگہ ان کے خیالات سے مرعوب نظر
آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے کسی تاثر اور مرعوبیت سے اجتناب
کئے بغیر خود مکتفی باتیں نہیں کہی جا سکتیں۔
مجموعی اعتبار سے تیسری دنیا کا افسانہ ایشیائی ممالک
امریکہ اور افریقی مملکتوں کے مشترک مسائل اور غیر ترقی
یافتہ یا ترقی پذیر قوموں کے استحصال کے موضوع پر لکھے
جانے والے فکشن کا احتساب نامہ ہے، گو کہ اس کا کینوس اس
محدود ہے، لیکن اس کو ایک عمدہ کوشش سے ضرور تعبیر کیا جانا
چاہیے ـــــ کہ اردو میں دہرائی ہوئی باتوں کا ورد
کرنے اور اگلے ہوئے نوالوں کو چبانے والوں کی تعداد اتنی بڑھ
گئی ہے کہ اب کوئی بھی نیا زاویۂ نظر ہمیں نئے ذائقے کا احساس
دلاتا ہے اور رطب و یابس کے انبار میں غنیمت معلوم ہوتا
ہے۔

(ا - ق)

نام کتاب : خطوطِ غالب، فنی تجزیہ
مصنفہ : حامدہ مسعود
ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ علی گڑھ
قیمت : ۲۰ روپے

غالب صدی تقریبات نے غالب
شناسی کے جہاں بہت سے گوشے روشن کئے وہیں کلاسیکی
شعراء کی فنی اور ادبی قدر و قیمت کے تجزیے اور تعین کی راہیں
بھی ہموار کیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قدیم شعراء کو صرف محققوں کا
تختۂ مشق نہ بننے دیا گیا اور بعد کے لکھنے والوں نے تحقیقی دریافت
کے متوازی معروضی طور پر شاعری کی پرکھ کے رجحان کو عام کیا۔
حامدہ مسعود کی کتاب 'خطوطِ غالب' بھی اسی نوع کی ایک کاوش
ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ درس و تدریس سے وابستہ اہلِ قلم
کو پچھلے دنوں جس طرح مکتبی طرزِ فکر کا حامل اور کلاس روم
تک ہی تنقید کا علم بردار قرار دیا جاتا رہا، یہ کتاب اس کی نفی
کرتی ہے۔ حامدہ مسعود صاحبہ اس کتاب سے اردو کی استاد
ہونے کے ساتھ ایک بالغ نظر تنقید نگار کے روپ میں سامنے
آتی ہیں اور اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ نے نہ صرف یہ کہ خطوطِ غالب
کے دائرے میں محدود رہ کر محض تاثراتی انداز میں اپنی بات کہنے کی کوشش نہیں
کی ہے بلکہ وہ اپنے معاصر تنقیدی رجحانات اور رویوں سے بھی
بخوبی واقف ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ نثر کی پرکھ کے ادبی
معیار کیا ہو سکتے ہیں، مختلف اسالیب نثر میں کیوں کر امتیاز
کیا جا سکتا ہے۔ لفظ کا داخلی اور خارجی مطالعہ جن
صلاحیتوں کا متقاضی ہے اور خطوط میں لکھے ہوئے الفاظ سے
زیادہ ان الفاظ کے بین السطور میں شخصیت اور نفسیات کی
کیا کیا گرہیں اور پیچیدگیاں دریافت کی جا سکتی ہیں ـــــ
اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کتاب کے بعض ضمنی موضوعات
مثلاً تخاطب و تکلم، مرقع کشی، شوخی ظرافت وغیرہ پہلے
بھی غالب کے سلسلے میں مطالعے کا موضوع بنتے رہے ہیں مگر جملوں
کی ساخت اور صوتی کیفیات، تزئین معنوی اور اسلوب
نثر جیسے موضوعات پر غالب کے خطوط کے ضمن میں ہنوز

بہت کم لکھا گیا ہے۔

حامدہ مسعود نے غالب کے مطالعہ کے سلسلے میں ان تشنہ پہلوؤں کی طرف توجہ دی ہے اور ژرف بینی کے ساتھ تجزیاتی تنقید کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ کے دوران اس کمی احساس ضرور ہوتا ہے کہ اگر مصنفہ کو غالب کے خطوط کے تمام مجموعے دستیاب ہو جاتے تو شاید اس کتاب میں مزید وسعت پیدا ہونے کا امکان تھا۔ اسی بات سے میری مراد صرف یہ کہ مصنفہ کی اس وضاحت کی روشنی میں کہ ان کی رسائی صرف غلام رسول مہر اور مہیش پرساد کے مرتبہ مجموعہ ہائے خطوط تک رہی، یہ اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے کہ موصوفہ نے خطوط کی تعداد کی تحدید سے اپنے زاویہ نظر کو محدود نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے زیر مطالعہ خطوط کے توسط سے بڑی حد تک ان تمام مسائل کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے جن مسائل کا ادراک غالب کے خطوط کے تمام مجموعوں کو سامنے رکھ کر کیا جا سکتا ہے۔

کتاب کے اخیر میں خطوط غالب کا ایک جامع انتخاب بھی شامل ہے جو اس کتاب کے مندرجات اور مباحث کی توثیق کرتا ہے ——— جہاں تک مباحث کا سوال ہے تو خطوط میں غالب کی شخصیت کے علاوہ اہم اسالیب نثر کے تناظر میں خطوط غالب کے اسلوب کی پہچان اور صنائع، بدائع اور تزئین معنوی جیسے مباحث اس کتاب کی اہمیت کے ضامن کہے جا سکتے ہیں ———

"خطوط غالب فنی تجزیہ" کے آغاز میں 'تعارف' کے عنوان سے پروفیسر عتیق احمد صدیقی کا تعارفی پیش لفظ شامل ہے ۔۔۔ تعارف مصنفہ کا نہیں بلکہ فی نفسہ خطوط غالب اور زیر نظر کتاب کا ہے جسے جامع کہنا چاہیئے اور معنی خیز بھی۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب خطوط غالب کے مطالعہ کی ایک ایسی جہت سے ہمیں روشناس کراتی ہے جس جہت میں سفر کرنے کا عزم ہی مشکل پسندی اور ادب شناسی کی غمازی کرتا ہے۔

(ا - ق)

Numainda
NAI NASLEN, Monthly
2448, Ballimaran, Delhi-110006
Registered with Registrar of Newspapers No. (N) 360
Regd. No. D (D) 910

تعمیری ادب کا

نمائندہ

نئی نسلیں

دہلی

ترتیب

ابن فرید

انجم نعیم

۱۴

بارہ شمارے : ۳۰ روپے   ایک شمارہ : ۳ روپے

رابطہ

دفتر نمائندہ نئی نسلیں شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر

م. نسیم

۲۳۳۸، بارہ دری شیر افگن

بلیماران - دہلی ۶–۱۱۰۰

ترتیب

اداریہ

حمد

نعت

تنقید

نظمیں

بین العلومی مطالعہ

غزلیں

افسانے

مطالعہ

تبصرے

دوسرا سال — ساتواں شمارہ — نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اداریہ

اپنی باتیں

1 وہ لوگ تو بڑی شدت کے ساتھ اس امر کی تردید کرتے ہیں کہ ادب کا کوئی مقصد بھی ہوتا ہے اکثر خود اپنے موقف کا ابطال کرتے نظر آتے ہیں جب ان کی نگاہ میں شاعر یا ادیب اپنے مقام و مرتبہ سے نیچے گرنے لگتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "ادیب یا فنکار کو ایسا نہ کرنا چاہیئے تھا، یہ اسے زیب نہیں دیتا۔" پھر اسے کیا کرنا چاہیئے تھا؟

اس سوال کا جواب میں کیا دوں۔ یہ تو ان اصحاب نظر کو دعوت فکر دیتا ہے جو اس پرانی بحث کو از کار رفتہ تصور کرتے ہیں جس نے "ادب برائے زندگی" "کو کبھی تخیل کا موضوع بنا رکھا تھا۔ جدید تر نسل کہتی ہے کہ یہ بحث ہی فرسودہ اور لغو ہے۔ ادب کو نہ زندگی سے لاتعلق رکھا جا سکتا ہے اور نہ اسے اپنے فنی محاسن سے محروم کیا جا سکتا ہے۔ یہ موقف نسل در نسل کے تجربات کا ماحصل ہے اور مبنی بر حق بھی ہے۔

لیکن کچھ لوگ اب بھی ان تصورات کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں جو ان کے بیتے دنوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ادب اس طرح تخلیق نہیں ہوتا کہ آپ حکم دیں اور ہم لکھ ڈالیں۔ یہ "اجتماعی پیداوار" ادب نہیں ہوتی، کیونکہ نہ یہ ادب سے قریب ہوتی ہے اور زندگی کے گداز سے آشنا ہوتی ہے۔ ادب تو دراصل اس پورے فرد کا نمائندہ ہوتا ہے جو اپنے مادی، اقداری اور ذہنی ورثہ کا حامل ہوتا ہے۔ میں نے معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی ورثہ کی بات اس لئے نہیں اٹھائی ہے کہ موخرالذکر تینوں عناصر اپنی اصل ہیئت صرف اس صورت میں اختیار کرتے ہیں جب فرد ان میں عامل کا کردار انجام دیتا ہے۔ بہرحال، فرد کی تعمیر ان تمام عوامل کے ذریعہ ہوتی ہے جن کا ادب سے براہ راست تعلق نہیں ہوتا، لیکن جو فرد کے باطن کے اسرار میں اتر جاتے ہیں۔ فرد جس گرد و پیش میں پروان چڑھے گا اسی میں اس کا ذہنی سانچہ تیار ہوگا۔ یہ ذہنی سانچہ اس کا دیدہ بینا بن جاتا ہے اور اسی کے ذریعہ وہ پوری کائنات کو دیکھتا ہے۔ پھر جو زاویہ اس کائنات اور اس کے حقائق کا اس کے سامنے ہوتا ہے اسی کو وہ اپنے اظہار کا محور بنا لیتا ہے۔

زندگی ہمیں کس طور گذارنی ہے؟ ادب سے ہمیں کیا لینا ہے؟ یہ فرد اس زاویہ کے سیاق میں ہی طے کرتا ہے جس سے اس نے کائنات کا مشاہدہ کیا ہے۔

مجھے اپنی ادبی پیداوار کی قیمت آج چاہیئے اس کا رویہ اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے جو فن کو مقدس تصور کرتا ہے اور اس کے لئے ریاض کرتا ہے۔ لیکن یہاں پھر میرے ذہن میں ایک اور سوال ابھرتا ہے — ہندوستانی رقص، موسیقی، مصوری، سنگ تراشی، ناٹک اور رہس کو ہی مثال کے طور پر لے لیجئے۔ کیا ان کا ریاض محض ریاض کیلئے رہا ہے؟ اس سوال کا جواب بھی میں آپ سے ہی چاہتا ہوں۔

میرے ایک کرم فرما نے اس کا جواب یہ دیا کہ وہ زمانہ توہم پرستی کا تھا، اس لئے فن کو معتقدات سے آزاد کر کے برتا گیا۔ ہر چند کہ یہ بڑا طفلانہ سا جواب ہے لیکن ہم اسے اس لئے لائقِ توجہ تصور کرتے ہیں کہ آج کا تعلیم یافتہ طبقہ اسے وزنی دلیل تصور کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ ادب جو معتقدات سے آزاد ہو کر رکھا جا رہا ہے، اس کی نوعیت کیا ہے؟ کیا وہ واقعی عجب ہے؟ کیا وہ ہر طرح کے عقیدے سے آزاد ہے؟ اگر ان سوالات کے جوابات میں ہیں تو کیا ہم فنکار کے ذہنی سانچے اور اس کے تخلیقی عمل کے ماحصل کے درمیان دیوار نہیں کھڑی کر رہے ہیں؟

اگر ہمارا اصرار اس موقف پر ہے کہ فن کا تعلق فن کار کے ماحول حیطہ سے نہیں ہے، تو پھر ہم کو فنکار کا احتساب کرنے کا حق کیوں کر حاصل ہو جائے گا۔

ابنِ فرید

---

۲ اردو کے ادبی رسالوں کی حالت ہمیشہ تشویشناک رہی ہے۔ کب کس رسالے کی موت کا اعلان ہو جائے، کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا یہی وجہ ہے کہ جب کوئی رسالہ اپنے وقت مقررہ پر قارئین تک نہیں پہنچ پاتا تو وہ رسالے کی طرف سے مطمئن ہو کر کسی اعلان کے بغیر اس کی موت کا یقین کر لیتے ہیں۔ ہمارے رسالے کے متعلق بھی کبھی کبھی ہمارے معزز قارئین نے ایسا ہی یقین کر کے اپنی تشویش اور ہمدردی کے خطوط ہمارے نام لکھے ہیں لیکن پھر جیسے ہی رسالہ ان کے پاس پہنچا ہے انہوں نے حیرت اور مبارکبادی کے خطوط لکھنے میں بھی دیر نہیں کی ہے خدا کا فضل ہے کہ ہمیں ایسے پڑھنے والوں کا تعاون حاصل رہا ہے جو رسالے کی تاخیر یا اسی قسم کی کسی دوسری "گستاخی" پر ڈانٹ پھٹکار کے بجائے اپنی ہمدردی اور تعاون سے نوازتے رہے ہیں۔ لیکن میں نہیں سمجھ پاتا کہ ان کی ہمدردی آخر کب تک برقرار رہے گی۔ آخر صبر و استقامت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ کب تک تعاون کا یہ انداز برقرار رکھا جا سکتا ہے؟ پھر بھی اپنے معزز قارئین کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ ہم انشاء اللہ ان کو صبر و استقامت کے اس حد سے تجاوز نہیں کرنے دیں گے جس کے بعد "صلہ رحمی" کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ ہمارے سامنے بہت ساری مجبوریاں ہیں جن سے ہم آخری جنگ لڑنے میں مشغول ہیں اور جس دن ہم اس جنگ سے کامیاب و کامران لوٹیں گے اس دن اپنے تمام خیر خواہ قارئین کے خلوص کا ایک ایک قرض ادا کر دیں گے جو اس وقت ہمارے دست و بازو کو توانائی بخش رہے ہیں ———— اور یقیناً وہ دن اب زیادہ دور نہیں رہ گئے۔

ہم نے اس شمارے سے اپنے رسالے میں کچھ موضوعاتی تبدیلیاں کی ہیں۔ بین العلومی موضوعات پر مضامین اور ایک یادو قابلِ ذکر کتاب پر مبسوط تبصرے ہمارے مستقل فیچر ہوا کریں گے۔ بین العلومی موضوعات سے دلچسپی رکھنے والے قلم کاروں سے اس سلسلے میں قلمی تعاون کی درخواست ہے۔ کسی قابلِ ذکر کتاب پر مبسوط تبصرہ کوئی ضروری نہیں کہ تبصرہ کے لئے آئی ہوئی کتاب پر ہی کیا جائے بلکہ ہم خود جسے ضروری سمجھیں گے، خرید کر اس پر کسی فاضل مبصر کی ناقدانہ رائے اپنے قارئین تک پہنچانے کی کوشش کریں گے۔

انجم نعیم

حمد

بود و نابود امتحاں تجھ سے! سب یقیں اور سب گماں تجھ سے
شش جہت میں خموشیاں تجھ سے نطق تجھ سے، بیاں، زباں تجھ سے
تجھ سے ادراک و فہم و شعر و شعور ہو گئے لفظ جاوداں تجھ سے
تجھ سے پرواز، رقص اور رفتار پڑ گئی پتھروں میں جاں تجھ سے
تجھ سے بستی میں دف، گجر، ناقوس دشت میں کلمۂ اذاں تجھ سے
شمع و شمس و قمر ہیں دایم و ماں روشنی ہے کمراں کمراں تجھ سے
پھول، سبزہ، دھنک، شفق، تتلی رنگ پاشی کہاں کہاں تجھ سے
پھول تو پھول خاک نم میں بھی ہے مہک تیری (یکساں تجھ سے)

تجھ سے حائل سمندروں میں حجاب
رنگ تسریع ایں و آں تجھ سے

توصیف تبسم
اسلام آباد (پاکستان)

جو ذوقِ نغمہ ہمیں عشقِ مصطفائی دے
کلی بھی چٹکے تو صلِّ علیٰ سنائی دے

وہ ملتفت ہوں تو پھر ہجر بھی ہے عین وصال
جو دل میں ہے وہی صورت مگر دکھائی دے

یہ دل ہے خاک، مگر خاک تیری راہ کا ہے
حدودِ کون و مکاں سے اسے رہائی دے

پڑھوں قصیدہ میں ہر شب تمہاری زلفوں کا
ہر ایک شام جو اذنِ غزل سرائی دے

ہر ایک صبح لکھوں وصف روئے روشن کا
مرے قلم کو جو خورشید روشنائی دے

وہ لفظ بخش جو سوزِ دروں سے بھر جائیں
مرے کریم مجھے کاسۂ گدائی دے

از عبد الغنی

حسرت کی شاعری

حسرت کی ایک چھوٹی سی غزل ہے

یاد کر وہ دن کہ تیرا کوئی سودائی نہ تھا
باوجود حسن تو آگاہ رعنائی نہ تھا
عشق روز افزوں پہ اپنے مجھ کو حیرانی نہ تھی
جلوۂ رنگیں پہ تجھ کو ناز یکتائی نہ تھا
دید کے قابل تھی میرے عشق کی بھی سادگی
جب کہ تیرا حسن سرگرم خود آرائی نہ تھا
کیا ہوئے وہ دن کہ محو آرزو تھے حسن و عشق
ربط تھا دونوں میں گو ربط شناسائی نہ تھا
تو حسرت کی یہاں تہذیب رسم عاشقی ۔ اس سے پہلے اعتبار شان رسوائی نہ تھا

یہ کلیات حسرت موہانی مطبوعہ ۱۹۵۹ء کے دیوان اول سے ماخوذ ہے جس میں ۱۹۰۳ء تا ۱۹۱۲ء کا کلام ہے، جو نو مشق کے ایام (۱۸۹۴ء تا ۱۹۰۳ء) کے بعد پہلے دور کے اشعار پر مشتمل ہے جب کہ ۱۹۵۱ء تک کہے ہوئے حسرت کے تقریباً سات ہزار اشعار پر مشتمل کل تیرہ ۱۳ دیوان ہیں۔ اس طرح تشکیل و تعمیل فن میں حسرت کا حصہ کم از کم نصف صدی کا قصہ ہے۔ اس نصف صدی میں حسرت نے کامیاب محبت بھی کی اور بامراد سیاست بھی، اگرچہ سیاست ان کے لئے سراسر مشقت تھی اور محبت یکسر مسرت۔ ضدین کا یہ اجتماع ایک ایسی طبیعت کا کمال تھا جو خود بقول شاعر ایک طرفہ تماشا تھی ظاہر ہے کہ اتنے پر پیچ احوال میں اتنی طویل مدت تک جو شاعری کی جائے گی اس میں پست و بلند اور رطب و یابس دونوں کا جلوہ ہوگا، خواہ خود فن کار کتنا ہی سادہ دل اور وضع دار ہو، حسرت کی شخصیت اور شاعری کی صورت حال یہی ہے۔

اس پس منظر میں مذکورہ بالا غزل کے اشعار کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حسن و عشق کی رسمی تصویروں اور ان کے روایتی تصورات کے باوجود کلام میں تجربے کی اصلیت، احساس کی تازگی اور اظہار کی رعنائی ہے۔ ایک اچھا شاعر بننے کے لئے فکر و فن کا اتنا سرمایہ کافی ہے اور یہ سرمایہ اس کی شاعری کی عمدگی کا ضامن ہے۔ لیکن حسرت کی شاعری کی قدر شناسی کے لئے یہ بیان واقعہ کافی نہیں، وہ صرف اچھے شاعر نہ تھے، بہت ہی اچھے شاعر تھے، سراپا اور مکمل شاعر تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ خالص شاعر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کی ساری سرگزشت اور اپنے خیالات و واردات کی ساری روداد اپنی شاعری ہی میں درج کر دی ہے اور شاعری اس طرح کی ہے جس طرح انسان آب و دانہ سے شغل کرتا ہے۔ یہ شاعری گویا مولانا فضل الحسن حسرت موہانی کا گزٹ ہے جس میں صرف گفتنی ہی نہیں بلکہ عام گزٹ کے برخلاف ناگفتنی بھی شائع کر دی گئی ہے اور آمد کی شاعری کی جو تقسیم انھوں نے خود عاشقانہ، عارفانہ اور فاسقانہ کی قسموں میں کی ہے وہ سب کی سب بہ یک وقت ان کی شاعری میں پائی جاتی ہیں چنانچہ شاعری ان کی جلوت بھی ہے اور خلوت بھی اور انھوں نے بڑے خلوص اور سادگی کے ساتھ دونوں کی ادائیں اپنے اشعار میں منقش کر دی ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ ایسی بے تماشا اور بے محابا شاعری خود انتقادی سے خالی ہے، اس

میں غور و فکر اور امتیاز و انتخاب سے کام نہیں لیا گیا ہے۔

بہر حال زیرِ نظر غزل کا ہر شعر انتخاب ہے اور شروع سے آخر تک پوری غزل ایک خاص کیف میں ڈوبی ہوئی ہے، جو ابتدائے عشق کی نہایت معصوم، پرشوق اور آرزومندانہ کیفیات پر مشتمل ہے، اور ان کے اظہار و بیان میں بڑی انفرادیت، روانی اور بے ساختگی ہے۔ آمد کی اس شان کے باوجود ہر لفظ معنی خیز اور ہر ترکیب خیال انگیز ہے اور نہ صرف ہر شعر کے دونوں مصرعے ایک دوسرے کے ساتھ بڑی چستی سے وابستہ و پیوستہ ہیں بلکہ ہر شعر دوسرے شعر کے ساتھ بھی مربوط اور ہم آہنگ نظر آتا ہے، گویا غزلِ مسلسل کا سماں ہے۔ اس سلسلے میں منفرد الفاظ کی سادگی اور صفائی بیان کے باوجود فارسی ترکیبوں کا استعمال کثرت، شدت اور جدت کے ساتھ کیا گیا ہے، مثلاً باوجود حسن آگاہ و رعنائی عشقِ روز افزوں، جلوۂ رنگیں، نازِ یکتائی، سرگرمِ خود آرائی، محوِ آرزو، ربطِ شناسائی، یہاں تک کہ تہذیبِ رسمِ عاشقی اور اعتبارِ شانِ رسوائی جیسی توالیِ اضافات بھی موجود ہیں۔ ان میں معروف و مروج ترکیبیں بھی ہیں اور بالکل نئی اور انوکھی بھی، مگر دونوں کا استعمال یکساں بے تکلفی سے کیا گیا ہے اور ہر استعمال اپنے مخصوص خیال کے ابلاغ کے لیے بالکل فطری معلوم ہوتا ہے حالاں کہ بعض تراکیب پر ذہن چونک اٹھتا ہے، جیسے آگاہ و رعنائی اور ربطِ شناسائی، لیکن وہ اپنے سیاق و سباق میں یہ ترکیبیں بڑی مانوس سی لگتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ پوری غزل ہی فارسی تراکیب کے اشارات و مضمرات سے معمور ہے اور مقطع کے دونوں مصرعوں میں تو پورا بیان ہی توالیِ اضافات پر مبنی ہے اور یہی بیان نہ صرف خاتمۂ کلام بلکہ موضوعِ سخن کی نشان دہی کرتا ہے۔ قبل کے چار اشعار میں حسن و عشق کے ازلی موضوع پر بالکل شخصی تجربے کا اظہار اس کی پوری تازگی و طرفگی کے ساتھ نہایت عمدگی سے کر کے پانچویں اور آخری شعر میں مقطع و تخلص کے ساتھ ایک منفرد تجربے کا یہ خلاصہ و کارنامہ پیش کیا گیا ہے:

تو نے حسرت کی عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی
اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا

تہذیبِ رسمِ عاشقی اور اعتبارِ شانِ رسوائی دونوں بیانات نہ صرف اپنی اپنی جگہ اقوالِ محال ہیں بلکہ آپس میں بھی تضاد کی نسبت رکھتے ہیں۔ رسمِ عاشقی اور شانِ رسوائی تو بجائے خود ایک دوسرے کے ساتھ روایتی طور پر ہم آہنگ ہیں لیکن پہلے بیان میں تہذیب اور دوسرے میں اعتبار کا اضافہ بجائے خود الگ الگ ہم آہنگ ہونے کے باوجود اپنی خاص ترکیب میں جس کے اندر واقع ہوا ہے ایک نئی شان پیدا کر دیتا ہے جو ابتداءً ترکیب کے عام معنی سے متصادم نظر آتی ہے۔ رسمِ عاشقی تو غزل کی روایات میں شانِ رسوائی ہی کا دوسرا نام ہے، اس میں تہذیب اور اس کے اعتبار کا کیا سوال؟ اس لئے کہ تہذیب اور اعتبار کا مطلب ہے ضبط و احتیاط اور یہ دونوں باتیں رسمِ عاشقی اور اس کی شانِ رسوائی کے خلاف ہیں، بالکل منافی اور مزاحم ہیں۔ حسرت کی شاعری کے ماحول پر غور کیا جائے تو غالب کے بعد انیسویں صدی کے اواخر کی غزل گوئی پر چھائی ہوئی رسمِ عاشقی اور شانِ رسوائی کی وہ حقیقت آشکار ہو جائے گی جو داغ کی شاعری سے عبارت ہے تب اس فضا میں تہذیبِ رسمِ عاشقی اور اعتبارِ شانِ رسوائی کے متعلق حسرت کا دعویٰ زیادہ مبالغہ آمیز نہ معلوم ہوگا۔

بلا شبہ حسرت کے ایک بزرگ ہم عصر شاد عظیم آبادی بھی تھے جنھوں نے غزل کو مابعدِ غالب کے انحطاط و زوال سے نکال کر ایک ہموار ارتقاء کی راہ پر دوبارہ لگا دینے میں ایک کارنامہ انجام دیا تھا اور خود حسرت کے ہم عصر ہم عصروں میں فانی، اصغر اور یگانہ جیسے باکمال تھے۔ پھر اقبال نے پوری غزل گوئی میں ایک انقلابِ عظیم برپا کر کے اس کے امکانات کو نقطۂ عروج تک پہنچا دیا تھا۔ اور ان سب شعراء میں ہر ایک کو حق ہے کہ وہی دعویٰ کرے جو حسرت نے کیا ہے، لیکن اپنے خاص ماحول میں یہی حق حسرت کو بھی ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ بیسویں صدی کی اردو غزل گوئی میں حسرت تہذیبِ رسمِ عاشقی اور اعتبارِ شانِ رسوائی قائم کرنے کے صرف دعوے دار ہوں میں نہیں

حق داروں میں بھی ہیں۔ اس سلسلے میں حسرت کے امتیازات اور
کمالات بھی ہیں جس طرح دوسرے ان شعراء کے ہیں جن کے نام
ابھی لیے گئے ہیں۔

ان امتیازات اور کمالات کو واضح کرنے کے لیے میں
حسرت کے دیوان اول ہی کی ایک غزل پیش کرتا ہوں:

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے
دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے
خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد!
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے
ترے ستم سے میں خوش ہوں کہ غالباً یوں بھی
مجھے وہ شاملِ اربابِ امتیاز کرے
غمِ جہاں سے جسے ہو فراغ کی خواہش
وہ ان کے دردِ محبت سے ساز باز کرے
امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے!
ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرت
اب آگے تیری خوشی ہے سرفراز کرے

اس غزل میں غمِ جہاں اور دردِ محبت حسرت ہی کے الفاظ
میں ایک دوسرے کے ساتھ بالکل ساز باز کئے ہوئے ہیں۔ شروع
سے آخر تک ساتوں اشعار ایک ہی کیفیت کے غماز ہیں جس میں
مجاز اور حقیقت کی تمیز بھی ختم ہو گئی ہے اور صرف ایک صداقت
ہے جو شاعر کے جذبے اور تجربے کی واقفیت پر مبنی ہے۔ ایک
دبا دبا جوش، ایک ٹھہری ٹھہری مستی ہر شعر میں بسی اور ہر تصویر
میں رچی ہوئی ہے۔ یہ فدا دالی اور سرشاری ظاہر ہے کہ قلب و
روح کے وفور کے بغیر ممکن نہیں، جس کا وافر حصہ حسرت کو
ملا ہے، یہی وفور ان کی طبیعت کے بے پناہ سرور کا ضامن ہے
اور ان کے کلام میں انبساط و نشاط کی ایک فضا پیدا کرتا ہے۔
تغزل کے اس گداز کا سرچشمہ درحقیقت رسمِ عاشقی کی وہ تہذیب
ہے جس کی طرف اشارہ پہلی غزل میں کیا گیا ہے۔ حسرت کا
یہ مہذب عشق معلوم و معروف ہے۔ ان کی محبوبہ نہ تو کوئی
خشک خیالی پیکر ہے نہ تر دامن شاہدِ بازاری بلکہ ایک پردہ
نشین خاتون جس کی عفت و عصمت اور غیرت و حیا نیز رفاقت
و قناعت کی شمع زینتِ محفل بننے کی بجائے حسرت کے چھوٹے
سے تنگ و تاریک گھر میں پیہم جلتی رہی اور اسی چراغِ خانہ
کے سوز و گداز نے قلبِ حسرت کو ہمیشہ گرم و تپاں رکھا، اور
محبت کی اس دھیمی آنچ کی لے پر شاعر کی روح مسلسل رقص
کرتی رہی، نغمہ سنج رہی۔ اردو شاعری اور تنقید کے محاورے
سے قطع نظر، ایک حقیقی عشق تک بھی اس مجازی عشق نے حسرت
کی رسائی کرائی۔ یہ ایک بالکل معصوم اور فطری عشق تھا جس
نے ایک انسانی حسن میں حسنِ ازل کا جلوہ دیکھا تھا۔ اس
عشق کی تہوں میں حسن و صداقت گویا مترادف ہو گئے تھے
یہ عشق اتنا بسیط ہے کہ بہ یک وقت جمالیات و اخلاقیات
دونوں کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حسرت
کے اشعار میں مجاز و حقیقت کے تانے بانے کسی ابہام، الہام
یا اشاریت پر مبنی نہیں بلکہ ایک ہی کیفیت کے دو مرکب
عناصر ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ حسرت کے تعشق میں تصوف کی
بھی ایک شان ہے یا یہ کہ ان کا اگر کوئی تصوف ہے تو وہ ان
کے تعشق سے پیوستہ ہے۔ جو لوگ حسرت کی شاعری کو
لخت لخت کر کے دیکھتے ہیں اور ان کے جسمانی محبوب کی
ارضیت کو ان کے مذہبی احساسات اور سیاسی اشغال
سے بالکل الگ بتاتے ہیں۔ وہ تعشق و تصوف کی یک رنگی
کے اس بیان پر چونکیں گے لیکن انھیں غور کرنا چاہیے
کہ حسرت کی شخصیت میں محبت، مذہب اور سیاست
کے اجزا کی پریشانی کا عالم جو بھی ہو، ان کے فن میں ان
تینوں عناصر کا ظہور ترتیب ہے اور اسی ترتیب سے اس کی
زندگی و تابندگی قائم ہے، یہ مانی ہوئی بات ہے کہ حسرت
کے یہاں دو رنگی نہیں، یکسوئی ہے۔ یہ یکسوئی ان کی شخصیت
سے زیادہ ان کے فن میں نمودار ہوتی ہے، اس لیے کہ ان
کے فن میں ایسی یکسانی ہے جو ان کی زندگی کی تمام اور
متفرع اداؤں کو ایک ہی رنگ میں رنگین کرتی اور ایک ہی

ہی آہنگ کی نغمگی مخفی ہے ، زیر نظر غزل رنگ و آہنگ کی اس یکسانی ہی کا کرشمہ ہے۔

غزل کا پہلا شعر جس نگاہِ یار کا ذکر کرتا ہے اسی کے کرم سے سرفراز ہونے کی تمنا آخری شعر میں پائی جاتی ہے۔ اس طرح مطلع سے مقطع تک ہمارا آشنائے راز شاعر جس خوبیٔ قسمت پر ناز کرتا ہے اس کا بہترین اظہار اس معنی خیز اور فکر انگیز شعر سے ہوتا ہے جو مطلع کے بعد ہی واقع ہوا ہے:

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

یہ جنوں کس کا ہے جس کا سلسلہ دراز کرنے کی دعا خدا سے کی جا رہی ہے؟ کیا یہ خدا کے علاوہ کسی ہستی کا جنوں ہے؟ بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ دعا خدا سے کی جا رہی ہے کسی کے جنوں کا سلسلہ دراز کرنے کی لیکن ایسا کون سا جنوں ہو سکتا ہے جو سبھی انسانوں کے دلوں کو بقولِ شاعر فکرِ دو عالم سے آزاد کر دے۔ کہنے کے لئے تو ایسا جنوں بھی گوشت پوست کے کسی محبوب کا ہو سکتا ہے لیکن ایک انسان کے لئے جنوں کو اتنا آفاقی بنانا بڑی لمبی کھینچ تان ہوگی جب کہ اس کے لئے کوئی مجبوری نہیں ہے، یہاں تک کہ تیسرا شعر 'خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا نام خرد / جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے' بھی ہمیں ایسی کھینچ تان کے لئے مجبور نہیں کرتا، حسنِ کرشمہ ساز اگر جنوں و خرد کی تاثیر بدل سکتا اور دونوں اضداد کے درمیان یک جہتی قائم کر سکتا ہے تو وہ حسن اول درجے میں حسنِ ازل ہی ہوگا، اور چوتھا شعر اس سلسلے میں ہمارا امتحان لینے کے ساتھ ساتھ ہماری رہنمائی بھی کرتا ہے:

ترے ستم سے میں خوش ہوں کہ غالباً یوں بھی
مجھے وہ شاملِ اربابِ امتیاز کرے

یہ تیرا ستم کس کا ہے؟ اور کون ہے وہ جو کسی کو شاملِ اربابِ امتیاز کر سکتا ہے۔ بظاہر یہ دو مختلف ہستیاں ہیں۔ دنیا کی کسی محبوب مخلوق کا ستم سہہ کر ہی ایک دردمند دل خدائے عزیز و کریم کے منتخب و ممتاز بندوں میں شامل ہو سکتا ہے، اس لئے کہ یہ ستم روزگار در اصل نگاہِ یار کے اشارے پر امتحانِ دل کے لئے ہوتا ہے اور اس آزمائش میں کامیاب وہی ہو سکتا ہے جو ایک بسیط غمِ یار سے مالا مال ہو۔ پھر یہی کامیابی آدمی کو آشنائے رازِ حیات کرتی ہے، یہاں تک کہ وہ حوادث و آفات میں ابتلا کے درمیان بھی اپنی خوبیٔ قسمت پر ناز کرنے لگتا ہے۔ بلاشبہ اس طرح واحد حاضر کا ستم اور واحد غائب کا کرم دونوں ایک ہو جاتے ہیں اور من و تو کی تمیز ختم ہو جاتی ہے، نظر آتی ہے، تو عشق کی انتہا یہی ہے جو فی الواقع حاصل تو نہیں ہوتی ہے مگر زندگی کا سارا کاروبارِ شوق اسی کی آرزو میں چلتا ہے۔

ہر دو عشق کی اسی یک جہتی کا اشارہ پانچویں شعر سے ملتا ہے:

غمِ جہاں سے جسے ہو فراغ کی خواہش
وہ ان کے دردِ محبت سے ساز باز کرے

چھٹا اور مقطع سے قبل کا آخری شعر گویا اس یک جہتی پر مہر لگا دیتا ہے۔

امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

ظاہر ہے کہ ہر سمت عاشقوں کے گروہ اگر کسی ایک معشوق کی نگاہِ دل نواز کے امیدوار ہو سکتے ہیں تو وہ محبوب ازلی کے سوا کوئی اور نہیں۔ اسی لئے مقطع میں حسرتؔ اس محبوب کے کرم کا سزاوار نہیں ہونے کا عاجزانہ اعتراف کرنے کے بعد بڑے عاشقانہ انداز میں اس کی رضا سے سرفراز ہونے کی آرزو کرتے ہیں:

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرتؔ
اب آگے تیری خوشی ہے سرفراز کرے

غزل کے اس مطالعے اور تجزیے سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں عشق کا وہ تصور پوری طرح کارفرما ہے جو مشرقی بالخصوص فارسی اور اردو تغزل کا امتیازی نشان ہے۔ اس تغزل میں رسمِ عاشقی کی ایک ایسی تہذیب ہے جس کے آداب و اقدار مادیت کو روحانیت اور روحانیت کو مادیت کے ساتھ ترکیب دے کر حیات و کائنات کا انتہائی لطیف، دلپذیر اور نفیس تخیل پیش کرتے ہیں۔ یہ تہذیبی انداز اور د...

اور فارسی غزل کو معروف معنوں میں مہذب ترین صنفِ سخن
بنانے کے لئے کافی ہے اور عصرِ حاضر میں حسرت کی غزل گوئی خالص
تغزل کا ایک حسین ترین نمونہ ہے جو بالکل روایتی غزل گوئی کے
نقشے پر بروئے عمل آیا ہے، احساسات کے لحاظ سے اس پر اقبال
تو کیا غالب کی بھی پرچھائیں نہ پڑی ہے۔ گرچہ فارسی تراکیب کے
استعمال میں دونوں کے ساتھ مشابہت نمایاں ہے، لیکن بطرزِ
بیان اردو کے دوسرے غزل گویوں مثلاً حسرت ہی کے دور میں
فانی، اصغر، یگانہ اور جگر کے یہاں بھی عام ہے اس لئے
کہ اردو زبان و ادب بالخصوص شاعری کا خمیر فارسی سے ہی اٹھا
ہے۔ بہرحال حسرت کی شاعری کا آب و گل میر سے مومن تک
کا خالص، روایتی اور سکہ بند تغزل ہے اور حسرت کے کمالات
اسی کے پس منظر میں ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ ان کی منفرد استعداد
نے اسی معروف روایت میں تجربے کئے ہیں، توسیع کی ہے۔
رہی یہ بات کہ میں نے حسرت کی غزل کا جو تجزیہ کیا ہے
اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ غزل مسلسل ہے جس کے اشعار کے
درمیان ربط باہمی ہے، جب کہ عام طور پر اردو غزلوں میں
ربط و ترتیب کا فقدان بتایا جاتا ہے، تو سب سے پہلے میں
یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ یہ تسلسل جو زیرِ نظر غزل میں عیاں ہے
حسرت کی بہتیری غزلوں میں پایا جاتا ہے اور اشعار میں داخلی
ربط کا سراغ تو اردو کی بے شمار ان غزلوں میں لگایا جا سکتا
ہے جو اساتذہ سخن کے قلم سے نکلی ہیں لیکن اگر غزل کے اشعار
متفرق بھی ہیں تو ضروری نہیں کہ انھیں انتشارِ خیال کا نتیجہ قرار
دیا جائے غزل اپنی جگہ اسی طرح ایک ہیئت سخن ہے جس طرح
قصیدہ، مثنوی، رباعی اور انگریزی نظم کی ہیئتیں ہیئت غزل
کی صنفی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مستقل بالذات اشعار کا مجموعہ
ہے جو معانی کے اعتبار سے باہم مربوط بھی ہو سکتے ہیں اور جدا
جدا بھی اور غزل کی طویل اور وسیع روایات میں دونوں قسم
کے اشعار پائے جاتے ہیں ان سب اشعار کو جو چیز غزل بناتا
ہے وہ تغزل ہے جس میں کلام کبھی خدا سے ہوتا ہے کبھی خودی
سے اور بسا اوقات بیک وقت دونوں سے۔ اس کلام میں
بنیادی شعر اور عامل شاعر کی اپنی ذات ہوتی ہے جس کے ہر قسم

کے کوائف کا اظہار منفرد اشعار میں ہوتا ہے، خواہ وہ محبت
سے متعلق ہوں یا سیاست سے۔ غزل صریحاً اظہارِ ذات
ہے، خواہ ذات کا نشانہ کائنات ہی کیوں نہ ہو۔ اس طرح غزل
فنائے شخصیت نہیں ہے اعلانِ شخصیت ہے، خواہ انگریزی
تنقید کے بدلتے ہوئے نظریات شاعری جو بھی کہتے ہوں۔ ظاہر
ہے کہ انگریزی تنقید اپنی ادبی تخلیقات کے نمونوں کو سامنے
رکھ کر نظریہ سازی کرتی ہے جس طرح اس کی پیش رو یونانی
و رومی تنقید نے کیا تھا، اور اس تنقید کے سامنے یہ بھی ظاہر
ہے کہ غزل کا کوئی نمونہ نہ تھا، یہاں تک کہ جس چیز کو انگریزی
میں لیرک یا سونٹ کہتے ہیں اس کا غزل کی ہیئت اور فن سے
کوئی تعلق نہیں، خواہ اس کے احساسات میں تغزل کے جو
عناصر بھی پائے جاتے ہوں۔ لہٰذا غزل ایک منفرد اور مستقل
صنفِ شاعری ہے اپنے کمالات و امکانات کے لحاظ سے دنیا کے کسی
دوسری صنفِ شاعری کے لحاظ سے کم تر نہیں ہے۔ حسرت
کی غزل اپنی صنف کے انھیں کمالات و امکانات کی سرمایہ
دار اور آئینہ دار ہے۔ اس میں حسرت کی رنگارنگ شخصیت
کے تمام پیچ و خم آشکار ہوتے ہیں۔ ان کی ذات کا ہر پہلو
عکس فگن ہوا ہے، ان کی زندگی کی ایک ایک ادا ضوفشاں ہے،
وارداتِ محبت بھی جلوہ ساماں ہیں اور واقعاتِ سیاست بھی
حشر بداماں۔ غزل کی ہیئت سخن بڑی خوبصورتی سے ان اجزائے
پریشاں کی شیرازہ بندی کرتی ہے اور اس کی فنی لچک داری
فکر و خیال کی ہر لہر کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ واقعہ یہ
ہے کہ غزل ایک چشمۂ خیال ہے جس کا سوتا کبھی خشک نہیں
ہوتا اور جس کے دھارے برابر رواں رہتے ہیں، راستے کے
ہر کنکر پتھر کو اپنی رو میں بہاتے ہوئے بڑی بڑی چٹانوں
سے کبھی کترا کر اور اکثر ان کے اوپر سے گزر کر نکلتے ہوئے اور
آگے کی طرف بڑھتے ہوئے۔ اردو غزل کے ایک زبردست
چشمۂ خیال کی بہار حسرت کی شاعری میں نظر آتی ہے جس
میں قوسِ قزح کے رنگ بھی منعکس ہیں اور آفتاب کی
کرنیں بھی۔
حسرت کی شاعری غزل گوئی کے سوا کچھ اور نہیں اور

چکی کی مشقت کے ساتھ غزل کی یہ مشق سخن حسرت نے پچاس سال سے زیادہ کی طویل مدت تک کی لیکن نیاز فتحپوری اور آل احمد سرور جیسے تغزل کے ادا شناس اور رمز آشنا نقاد کہتے ہیں کہ حسرت کی شاعری اپنی اصلیت اور کمال کے ساتھ ان کے کلام کے دورِ اول یعنی دیوان دوم (۱۹۱۲-۱۶ء) تک ہی جلوہ گر رہی جس کے بعد صرف اس کے آثار باقی رہ گئے۔ گویا یہ فقط عہد شباب کا افسانہ و افسوں ہے، اس لئے کہ حسرت ارضی محبت کے شاعر ہیں۔ چنانچہ جب تک اس کا جوش قائم رہا شاعر کا تخیل بھی بلندیوں کی طرف پرواز کرتا رہا اور جیسے جیسے یہ جوش دھیما پڑتا گیا تخیل کی پرواز پستیوں کی طرف بڑھتی رہی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حسرت کی محبت نہ صرف ارضی بلکہ محض جسمانی اور اعصابی تھی حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے اور حسرت کے ناقد بھی اپنے تصور کا یہ نتیجہ قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گے، اس لئے کہ یہ حقیقت مانی ہوئی ہے کہ حسرت ایک عاشقِ صادق تھے اور ان کا جذبۂ محبت بہت ہی گہرا اور وسیع تھا جس پر ماہ و سال اثر انداز نہ ہو سکتے تھے اور نہ ہو سکے۔ دوسرا اہم نکتہ یہ کہ حسرت کے دردِ محبت اور جنونِ عشق کے سلسلے بہت دراز تھے۔ نگاہ یار نے انھیں آشنائے راز بنا دیا تھا، اس لئے غمِ یار کے ساتھ غمِ روزگار بھی ان کے جذبات و احساسات کو تحریک ملتی تھی اور وہ سامان شاعری بن جاتے تھے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ حسرت کے دونوں عشق ان کی زندگی میں ایک دوسرے کے اندر مدغم ہو گئے تھے لہٰذا یہ ناممکن تھا کہ اس ادغام کا اثر ان کے فن پر نہ پڑتا، اس لئے کہ یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ حسرت کے کردار میں دورنگی نہیں تھی وہ بڑی سادہ طبیعت رکھتے تھے اور ہر کام ایک جذبۂ بے اختیار شوق کے تحت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ عشق بیوی کا ہو، عوام کا ہو، اولیاء کا ہو، سب کا اثر طبع حسرت پر اس حد تک ہوتا تھا کہ وہ مائل اظہار ہو جاتی تھی اور اس کے اظہار کی سب سے آسان صورت حسرت کے لئے ان کی غزل تھی جس میں ہی وہ ہر رسم عاشقی کی تہذیب کرتے تھے اور اسی مہذب تغزل سے ان کی ہر تخلیق شانِ رسوائی کا اعتبار قائم تھا۔ میں ذیل میں کلیات حسرت کے دیوان پنجم ([illegible] تا [illegible]) سے دورِ آخر ([illegible]) تک کی غزلوں کے صرف چند اشعار مشتے نمونہ کے طور پر پیش کرتا ہوں جن پر ایک نظر ڈال لینے سے معلوم ہو جائے گا کہ حسرت کے تغزل کا چراغ اپنے خاص رنگ و روغن کے ساتھ ان کی شمع حیات کی آخری لو تک جلتا رہا۔

رنگ تیری شفق حجابی کا
اک نمونہ ہے بے مثالی کا
آئینہ ہے تبسم لب دوست
حسن خوباں کی بے ملالی کا

روشن جمال یار سے دنیائے عشق ہے
گویا شراب حسن سے مینائے عشق ہے
اب تلاشِ منزلِ مقصد میں دل میرا
آوارۂ مراحلِ صحرائے عشق ہے

اپنے آپے میں نہیں شوق کے مارے گیسو
پھیلے جاتے ہیں رخِ یار پہ سارے گیسو
نور افشاں کے معاون ہیں تمہارے عارض
کفرِ عشاق کے حامی ہیں تمہارے گیسو

رنج راحت ہے سکونِ غم ہجراں کی قسم
یادِ جاناں کی قسم جلوۂ جاناں کی قسم
تجھ کو مخمور جو دیکھا ہے تو اے پیکر ناز
مست ہم بھی ہیں تری مستی لرزاں کی قسم

آشنا ہو کر نظرِ آشنا کرنے لگے
ہم سے کیا دیکھا کہ تم پاسِ حیا کرنے لگے
دلربائی کا بھی کچھ کچھ ڈھب انھیں آنے لگا
بات مطلب کی اشاروں میں ادا کرنے لگے

عجب ہیں محبوب کی ہر بات بجا ہے

اب مجھ سے تغافل بھی فرمائیں تو کیا ہے
کہنے کو تو ظاہر میں خفا ہم بھی ہیں لیکن
کچھ دل کا عجب حال ہے جب سے وہ خفا ہے

ہر سمت میری چشم تمنا نگراں ہے
معلوم نہیں جلوۂ جاناں نہ کہاں ہے
حسرت کا دل آئینہ ہے اک صورت حق کا
گو اس کی نظر شیفتۂ حسن بتاں ہے

حسن بے پردہ بے نقاب نہیں
کیا حجاب نظر حجاب نہیں

عاشق وہی عاشق ہے جو رسوائے جہاں ہو
معشوق وہی حق ہے جو بے نام و نشاں ہو

گزرا اسی طرف سے ہے جو کاروانِ عشق
ہر ہر قدم پہ اب بھی ہیں پیدا نشانِ شوق

شوق کو داد حیا ملتی نہیں
وہ نگاہ آشنا نہیں ملتی

ان میں بعض اشعار بالکل رسمی و روایتی قسم کے معلوم ہوں گے، لیکن جو دوسروں کا قال ہے وہ حسرت کا حال ہے۔ اردو غزل کی روایت عشق حسرت کا انفرادی تجربہ بھی ہے اور مجاز و حقیقت کی ہر سطح پر ہے اس لیے جس حال و مقام میں بھی حسرت نے اشعار کہے ہیں وہ بالعموم ان کے ذاتی کوائف پر مبنی ہیں اور ان کوائف کے اظہار کو ایک منفردِ تغزل کا اعتبار و استناد حاصل ہوتا ہے۔ اس زبان و بیان یا لب و لہجہ اور طرز و اسلوب سے جو پختگی کے ساتھ ایک تازگی بھی رکھتا ہے اور اپنی امتیازی شان کے لیے معروف ہے۔ اس شانِ امتیاز میں بے تکلفی، بے ساختگی، سادگی اور روانی کے ساتھ شگفتگی، خوش وضعی، نفاست، ملائمت اور شیرینی بھی ہے۔ یہ شیوۂ گفتار نہ تو میر کا ہے، نہ مومن کا، نہ غالب کا، گرچہ اس کی تشکیل میں شامل ہر استاد کا فیض ہے جیسا حسرت نے خود ہی اقرار کیا ہے، بہرحال روایات کے سانچے میں ڈھلا ہوا یہ اسلوب سخن منفرد اور ممتاز ہے۔ یہ طرزِ حسرت ہے۔

حسرت کی شاعری کے سلسلے میں ایک بحث ان کی اشتراکیت کی رہی ہے۔ اس موضوع پر خاص کر ان اشعار کا حوالہ دیا جاتا ہے جو ۱۹۲۵ء میں انھوں نے کان پور میں کہے تھے اور ان کے کلیات میں "مقام اشتراکیت" کے عنوان سے درج ہیں پہلا ہی شعر اس طرح ہے:

معیشت میں بہر سو رنگِ فطرت ہے جہاں میں ہوں
اخوت ہے جہاں میں ہوں سوویت ہے جہاں میں ہوں

گویا حسرت سوویت روس کے مارکسزم، لینزم برانڈ کمیونزم کے علم بردار تھے۔ لیکن یہ حسرت کی سیاست نہ کہ شاعری کے اشتراکی رجحان کی بالکل غلط تعبیر و تاویل ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اپنی سیاسی تحریک اور جہد و جہد میں حسرت ایک انتہا پسند تھے اور ملک میں آزادی کامل کے ساتھ معیشت میں ایک بنیادی انقلاب کے علم بردار تھے اور یہ بھی صحیح ہے کہ اپنے دور میں وہ جذباتی طور پر روس کے اشتراکی نظام سے حسن ظن رکھتے تھے۔ لیکن وہ اصولاً اور عقیدۃً کمیونسٹ اور مارکسٹ نہیں تھے بس اپنے مطالعے کے حدود میں ان کا خیال تھا کہ سیاست کے لحاظ سے روس برطانوی سامراج کا مخالف ہے اور معاشی اعتبار سے اشتراکیت سرمایہ داری کی ضد ہے چنانچہ شخصی طور پر ان کی ہمدردی روسی اشتراکیت یا اشتراکی روس کے ساتھ تھی۔ مگر اوّل تو حسرت روس کی دہریت کے بالکل خلاف اسلامی مذہبیت پر کامل اور والہانہ اعتقاد رکھتے تھے اور عشقِ رسولؐ سے محبت اور دینیات کے موضوعات پر ان کے بہترے پرجوش اشعار نہایت ایمان افروز ہیں۔ دوسرے خود اشتراکیت کے متعلق حسرت کے تصور کی بنیاد "مقام اشتراکیت" کے تیسرے شعر سے واضح ہو جاتی ہے:

اصول اشتراکیت آئینِ بیت المال سے مشتق
اساس کار جمع و خرچ ملت ہے جہاں میں ہوں

یعنی یہ وہی بات ہے جو اقبال نے روس میں اشتراکیت کے آغاز پر اس طرح کہی تھی کہ شاید جو فلسفہ معاشیات قرآن کے "حرف قل العفو" میں پوشیدہ ہے وہ اب ظاہر ہو گویا حقیقت یہ ہے کہ حسرت نے اپنے خیال میں اشتراکیت کے اندر اسلام ہی کی ایک خوبی کی جھلک دیکھی تھی۔ یہ نکتہ پہلے شعر کے لفظ "معنویت" سے بھی عیاں ہے، جس کا معنی مساوات ہے۔ یعنی حسرت نے روسی سوویت کا عربی ترجمہ سوویت کر لیا تھا اور دونوں کو ایک ہی سمجھتے تھے۔ یقیناً یہ ان کی خوش فہمی تھی۔ اسی لئے وہ اشتراکیت پر وہ فکری تنقید نہ کر سکے جو اقبال نے خاص کر "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں کی ہے۔ ظاہر ہے کہ حسرت تفکر اور تعقل سے بہت کم بہرہ ور تھے اور ان کی شاعری سراسر جذباتی تعشق اور تصوف پر مبنی تھی۔

بہ حال اخوت اور مساوات کے معاملے میں حسرت بڑے بڑے اشتراکیوں اور ترقی پسندوں سے زیادہ مخلص تھے۔ اسی لئے یہ ان کی فطرت کا رنگ تھا، ان کے مذہب اسلام کا آہنگ تھا، کوئی سیاسی نعرہ یا اقتصادی نظریہ نہ تھا۔ اس سلسلے میں "مقام اشتراکیت" کا پہلا ہی مصرع ایک بین شہادت ہے :

معیشت میں بہر سو رنگ فطرت ہے جہاں میں ہوں

اب یہ دوسری بات ہے کہ حسرت کو خبر نہ تھی کہ روس کی اشتراکی جنت میں بہر سو رنگ صفت ہے۔ تاہم حسرت اپنی ذاتی زندگی میں ایک سچے اور کھرے مزدور تھے۔ بالکل فطری معصوم اور سادہ قسم کے مزدور جس کا استحصال جتنا سرمایہ داری کرتی ہے اتنا بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی اشتراکیت کرتی ہے۔ چکی کی مشقت جتنی حسرت نے اٹھائی ہے کم از کم اردو کے کسی ترقی پسند یا اشتراکی شاعر نے نہیں اٹھائی ہے، سو انسان بن دانش کے اچھن کی شاعری کے ساتھ حسرت کے [illegible] کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

بقیہ اقبال اور عالمی ادب، صفحہ ۵۵ سے آگے

موثر ترین وسائل شعری میں تبدیل کر دیا اور اس طرح طرح ادبی و شعری اظہار و بیان کے امکانات بے حد وسیع کر دئے۔"

"بہر حال اقبال نے زندگی کے ایک نصب العین کو شاعری کی ہیئت میں، اس کے تمام لوازم و عناصر کے ساتھ نافذ کیا، اس طرح کہ نصب العین کی اصولی قطعیت شاعری کے تخلیقی عمل میں گرچہ برقرار رہی مگر اس نے ایک ایمائی پیرایہ اختیار کر لیا۔ یہ فکرا ایک ایمائی پیرایہ اختیار کر لیا۔ یہ فکر اور فن کی مستقل بالذات ہستیوں کے درمیان ایک ازدواج کامل کی مثال تھی۔ یہ خلوص فکر و فن کا تخلیقی امتزاج تھا۔ اقبال کے مفکرانہ سوز اور شاعرانہ گداز نے مل کر ایک ایسی ہیئت اظہار اختیار کی جس کی کوئی نظیر عالمی ادب کی پوری تاریخ میں نمودار نہیں ہوئی ہے۔ اقبال کی شاعری درحقیقت مشرقی اور مغربی ادبیات کا، ایک آفاقی پیمانے پر، نقطۂ اتصال ہے اور نقطۂ عروج بھی۔ شاید یہ واقعہ بیسویں صدی ہی میں رونما ہو سکتا تھا اور اگر جدید تہذیب میں آفاقی نقطۂ نظر عمومی طور پر بروئے عمل آجائے تو اب یہ واقعی ممکن ہے کہ پورے معنی میں عالمی ادب کی تخلیق ہو، جس کی قدر و قیمت صحیح معنی میں ایک بین الاقوامی معیار تنقید سے متعین کی جائے۔ اس وقت اقبال کا نمونۂ کامل عالمی ادب کا سب سے روشن مینار ہدایت ہوگا۔

مشرق سے ہو بیزار، نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

وحید اختر
(علی گڑھ)

اعتراف

مجھے تسلیم ہے اپنی جہالت
کہ میں نے مشرق و مغرب کے ذہنوں کی رفاقت میں بسر کی زندگانی
مجھے تسلیم ہے اپنی حماقت
کہ ہر اک احمق و جاہل سے میں دنیا کی بازی ہار جاتا ہوں

مجھے تسلیم ہے اپنی شقاوت
کہ دل ٹوٹے کسی کا میرا دل فریاد کرتا ہے

مجھے تسلیم ہے اپنی زنانیت
کہ روئے آنکھ کوئی میری پلکوں پر ستارے کانپ اٹھتے ہیں

مجھے تسلیم ہے خود ذات سے اپنی محبت
کہ میں نے عمر کے اک ایک لمحے کا لہو اپنے عزیزوں کو پلایا ہے
خود اپنی فاقہ کش جہد و کشاکش کا ثمر ان کو کھلایا ہے

مجھے تسلیم ہے اپنی بغاوت

کہ میری تشنگی جام مجازی کو نہیں کہتی حقیقی عشق کا نشہ
کہ میری معصیت ایمان کو دھوکا نہیں دیتی

مجھے تسلیم ہے اپنی دنائت
کہ وہ جادے نشاں ہیں جن پر اوروں کے قدم کے، مجھ کو ڈستے ہیں
کہ ہر نقشِ قدم میرے لیے رستے کا پتھر ہے
مٹایا ان کو تب آگے بڑھا ہوں
اگر اضافِ کہنہ کو چھوا ہے، تازہ کاران کو بنایا ہے
اگر پژمردہ سبوں کو اٹھایا تو بہاران کو بنایا ہے

مجھے تسلیم ہے اپنی حیانت
کہ میں ہر ایک کی محرومی کو اپنا حصہ جاں جانتا ہوں
جو غم اوروں کے ہیں ان کو بھی میں اپنی ہی دولت مانتا ہوں

مجھے تسلیم ہے اپنی گنہ گار آدمیت
خدایا
اپنے ان سارے گناہوں کا اٹھا کر بوجھ تیرے سامنے روز جزا آکر کھڑا ہوں
کراماً کاتبیں نے کیا لکھا اعمال نامے میں
نکیریں آکے اس عاصی کا کیا محضر سنائیں گے
وہ جائیں اور تو جانے
میرا تو یہ عقیدہ ہے
شفیع روز محشر، رحمتِ عالم ہیں
جامِ ساقی کوثر مداوائے عطش ہے
شفاعت ان کی، ان کا جام مل جائے
تو میرے سب معاصی نیکیوں کے خالی پلڑے میں بہم ہو کر
تیرے انصاف کی میزان کو میرے حق میں کر دیں گے۔

عرفان صدیقی

ایک نظم نئے چاند کے نام

مرادوں والی بی بیوں کی گودیاں ہری رہیں
کلائیوں میں چاہتوں کی چوڑیاں بھری رہیں
زمین سے آسمان تک
گل ہزار برگ والے راستے کھلے رہیں
سپید سبز شہپروں کے طائروں کا
پھر مرے نواح میں نزول ہو
لبوں پہ حرفِ لازوال کے چراغ بھی جلیں
اگر مرے نصیب کی سیاہ شب کو طول ہو
مرے امید کی علامتوں کے زخم زخم جسم پہ
قبائے رنگ اسی طرح سجی رہے
گھروں میں روشنی رہے
سروں پہ چاند تاروں والی ٹوپیاں دھری رہیں
مرادوں والی بی بیوں کی گودیاں ہری رہیں

اسعد بدایونی

○

کوئی بدن میں ہجرتوں کے زائچے بنا گیا
کوئی لہو میں انتشار لکھ گیا
کوئی فصلِ جسم و جاں گرا گیا
شہر اداس رہ گیا
سب پرند اڑ گئے
نویدِ جانفزا کی منتظر سماعتیں
نہ جانے کب نصیب ہوں وہ ساعتیں
کہ لوحِ دل پہ حرفِ جاوداں کی رونمائی ہو
اور ہم سے سادہ دل مسافروں کی
جگ ہنسائی ہو . . . . . .

○

ہمارے شہر کے بچوں کو آدابِ جنوں سے کب علاقہ ہے
انھیں تو سنگ ریزوں سے
سر و دستار پر اپنے نشانے تیز کرنا ہے
میاں یہ سر یہ دستاریں قیامت ہیں
مگر بچے بھی آفت ہیں ۔
میں اکثر سوچتا ہوں
اس قیامت کا بدل کیا ہو
اور اس پت جھڑ کے موسم میں
غزل کیا ہو . . . . . . !!

محمد ذکی کرمانی

جدید علوم کی فکری اساس

مبسوط علم کی ابتدا کے سلسلے میں مغربی مفکرین اور محققین کی یہ رائے کہ ان علوم کی ابتدا یونان میں ہوئی ہے جانے کیوں ہمیں appeal نہیں کرتی۔ اگر ان کا گہوارہ صرف مغرب یا یونان ہوتا تب بھی یہ بات اس لئے درست نہیں لگتی کہ علوم تاریخ کا عرصہ بہت ہی مختصر ہے جس کو بنیاد بنا کر کوئی نتیجہ اخذ کرنا علمی اور تحقیقی معیارات کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ کے جس دور سے بھرپور واقفیت کا دعویٰ ہے اس میں بھی تقریباً ایک ہزار سال کا عرصہ ایسا گذرا ہے جس کے بارے میں مغربی محققین بڑی پراسرار خاموشی اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ اتنی ہی اہم بات یہ بھی ہے کہ اس دور میں چین و ہند میں صرف دیومالائی راج نہ تھا بلکہ یہاں بھی زندگی اجیرن تھی۔ یہاں بھی علم وحکمت کے خزانے بالکل خالی نہ تھے مسئلہ چاہے سیاست ملکی کا ہو یا علوم وفنون کا۔ ادب زندگی کا ہو یا ادب لطیف کا۔ ہر پہلو سے یہاں بھی قوموں میں زندگی رواں دواں تھی۔ دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں رہا جہاں کی قوموں نے فکری ارتقا نہ کیا ہو۔ چنانچہ کسی خاص قوم یا علاقہ کو علم وفن کا گہوارہ کہنا اور اس کی تاریخ کو تاریخ علمی کہنا اور بقیہ قوموں کی تاریخ کو ignore کر دینا بہت بڑی بددیانتی ہے جس کا ارتکاب اس دور کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوم نے کیا ہے۔

چنانچہ جب ہم تاریخ عالم پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو یہ کہے بغیر نہیں رہ پاتے کہ ہمارے دور کی طرح ایک دور انسانوں پر اس سے قبل بھی ایسا گذرا ہے جب علوم وفنون میں ایک ہی میدان سب سے معتبر اور سب سے محترم تسلیم کیا جاتا تھا۔ علم نجوم جو زمانۂ دراز سے علماء وقت کی نظروں کو خیرہ کرتا اور نابغہ روزگار شخصیتوں کی دعوت فکر وتحقیق دیتا رہا ہے۔ اس دور میں ہر مہذب قوم میں وقت کا سب سے بڑا علم تسلیم کیا جاتا تھا۔ یہ بات بہرحال سوچنے کی ہے کہ آخر انسان کس طرح لاکھوں میل دور سے نظر آنے والی ان مخلوقات سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس وقت سے لیکر آج تک آسمان اور اس کے باشندے ہماری ذہن کے دروازے پر دستک دیتے رہتے ہیں اور آج بھی ان دروازوں کو کھلا پاتے ہیں۔

جب انسانی زندگی بڑی سادہ اور ستاروں والے مسائل سیدھے سادے تھے تو آخر ایسا کیوں ہوا کہ انسانی آنکھیں اوپر اٹھیں اور انھیں ستاروں والے آسمان نے جنون میں مبتلا کر دیا اور ماضی بعید میں بھی یہ فن اس مقام تک پہنچا کر Astronomy کے ذریعہ ستاروں کی چال اور ان کے مقام کا تعین کیا جانے لگا۔ اس کا جواب مغربی مفکرین کے قلم سے یوں نکلتا ہے کہ قدیم انسان اور خاص طور سے ان ممالک کے لوگ جہاں یہ علوم اپنی عروج کو پہنچے ہیں اپنے مذہبی تصورات میں آسمان کو دیوی دیوتاؤں کا مسکن خیال کرتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مختلف ستارے جو رات میں جگمگاتے ہیں اور ان

ان دیویوں اور دیوتاؤں کے مظہر ہیں جن کو انھوں نے اپنی مختلف ضروریات کے پیش نظر تصور کر رکھا ہے۔ اس تعلق خاص کی بنا پر علم نجوم نے ابتدا میں ترقی کی اور اس کا حصول اور اس میں کمال ایک فیشن بن گیا۔ اس Theory کے ثبوت کے طور پر بعض ایسے افراد کے نام نام آتے ہیں جو بیک وقت بہت اچھے ماہر فن بھی تھے اور مذہبی رہنما بھی۔ معبد جن کے مسکن بھی تھے اور تعلیم و تجربہ کاہیں بھی۔

اگر یہ بات صحیح تسلیم کرلی جائے تو اس سوال کا کیا جواب ہوگا کہ وہ نظریات جو بے جان اشیاء کو معبود کا درجہ دے کر ان کے تئیں تقدس اور عظمت اور بے چارگی کے جذبات کو نشو و نما دیتے ہیں اور اس طرح تفکر و تجسس تحقیق و تجزیہ مطالعہ اور آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی خواہش سے عبارت اوصاف کے پنپنے اور ابھرنے کے مواقع سلب کر لیتے ہیں تو پھر انسانی تاریخ کے اس دور میں اس کے برعکس کیوں ہوا جبکہ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ان اوصاف سے متصف معاشروں میں علم و فن کبھی ترقی نہیں پا سکے۔

ہمارے خیال میں بنی نوع انسان کی ایسی تاریخ بہت کم ملے گی جہاں مخلوق معبود بھی بنی ہو اور ان معاشروں میں علوم و فنون کو ترقی بھی حاصل ہوئی ہو کیونکہ اس طرح کے معاشرے انسانی فکر و فطری تجسس اور کائنات کے عناصر کے درمیان اتنا بڑا حجاب قائم کر دیتے ہیں کہ انسانی ذہن اس کے پار دیکھ ہی نہیں پاتا۔ کواکب پرستی بت پرستی اور مظاہر پرستی۔ شرک کی کوئی بھی معروف شکل ہو جو عناصر کائنات کو ذہن انسانی کے سامنے کسی معظم تر کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ وہ علوم و فنون کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک مکمل طور پر یہ پردے اٹھ نہیں گئے اس وقت تک تاریخ جہالت کے ان بھول بھلیوں میں کھوئی رہی چنانچہ چھٹی صدی عیسوی سے قبل کے زمانے میں علمی ترقی کی رفتار اتنی سست ہے کہ بعض محققین نے یہ کہنے کی غلطی کر

ڈالی ہے کہ اس دور سے قبل کا دور جہالت کا دور تھا چنانچہ فرائڈ نے ادوار کی تقسیم کرتے ہوئے ماضی کے دور کو مذہب اور توہمات کا دور اسی پس منظر میں کہا ہے۔ اسی کے نزدیک اس دور میں علم نہیں بلکہ تصورات، اعتقادات اور توہمات زندگی کو آگے بڑھاتے اور اس کو قوت بخشتے تھے۔ ہمیں نہ تو اس تقسیم سے اتفاق ہے اور نہ اس نتیجے سے جو فرائڈ اخذ کرتا ہے۔ ہمارے علم کے مطابق تاریخ عالم کے وہ ادوار جہاں انسانی ذہن اور کائنات کے عناصر کے بیچ تعلقات کی اس نوعیت میں تبدیلی آئی ہے اور ان حجابات کو اٹھانے کا عمل تیز ہوا ہے اس سے متصل زمانہ علمی کاوشوں کا زمانہ ہے اور جب اس کائنات کی اصل پوزیشن انسان پر مکمل طور پر واضح ہو گئی اور خود اس کی اور کائنات کے مختلف عناصر کی حیثیت کا تعین ہو گیا تو یہ علوم و فنون کی تیز رفتاری سے پھیلے کہ تاریخ میں نہ تو کبھی ایسا ہوا تھا اور نہ ہی ذہن انسانی نے اس سے قبل کبھی ایسا سوچا تھا علم و فن کی اس تاریخ گری میں وہی ممتاز رہے جن کے ذہن اور فطری مطالعہ کے بیچ وہ پردے حائل نہ تھے جو عقلوں کو ماؤف کرتے اور آنکھوں کی بینائی چھین لیتے ہیں۔

اسی طرح جب سائنس ٹکنالوجی سے متعارف ہوئی تو اس کی ترقی میں مزید اضافہ ہوا۔ ابتدا میں جو علوم بڑے گنجلک تھے کہ جنگل کی طرح جھاڑ جھنکار نظر آتے تھے آہستہ آہستہ صاف ہوتے گئے اور پھر باقاعدہ اور منظم علوم کی شکل میں ڈھلنے لگے اور آج ہر علم شاخ شاخ ہو کر تناور درخت بن گیا ہے۔

علم و فن کی یہ ترقی بین السطور میں اپنے ساتھ ایک اور current لئے چلتی ہے۔ یہ کرنٹ علم میں فکری یکسانیت اور ہمہ گیری سے عبارت ہے۔ ابتدائی دور میں بھی یہ اپنے وجود کا احساس دلا کر کبھی ابھرتا اور کبھی ڈوبتا رہا ہے لیکن علمی ترقیوں کا یہ دور جو چھٹی صدی عیسوی سے لے کر بارہویں صدی عیسوی تک محیط ہے اس اعتبار سے انتہائی ممتاز ہے۔ بعضوں کے بیان یہ صفت ان کی فطرت کی حیثیت سے جلوہ گر ہے بعضوں کے یہاں ان کے ایمان و یقین کی بدولت

اور بعضوں نے اس سے استدلال بھی پیدا کیا ہے۔ یہ صفت ان کی فکر کو ایک خاص راہ پر گامزن کئے لئے جاتی ہے اور نتیجہ کے طور پر ان کو کجروی سے بچاتی اور فکری انتشار کا شکار ہونے سے روکتی ہے لیکن آہستہ آہستہ علمی ترقیوں کی تاریخ جب اپنے باب میں مزید اضافہ کرتی ہے تو یہ صفت معدوم ہونے لگتی ہے۔ ایک طرف تو علوم میں اضافہ اور اس کی شاخوں میں روزافزوں ترقی ہے۔ تو دوسری طرف ان شاخوں میں اپنے وجود کا احساس، اپنی یکتائی اور خودی کی خواہش ان کی اصل اور بنیاد سے رشتہ کاٹنے لگتی ہیں۔ اور نتیجہ کے طور پر یہ علوم بٹتے تو ہیں اور اپنے دائروں میں رہ کر خوب ترقی بھی ہوتی ہے لیکن یہ ترقی vertical ہوتی ہے اور یہیں سے علمی انتشار کا آغاز ہو کر ذہنی و فکری انتشار کی ابتداء ہو جاتی ہے اور پھر صرف اتنا ہی نہیں ہوتا کہ یہ علوم اپنی اپنی حدوں کو تعین کرتے اور ان دائروں میں ترقی کرتے ہیں بلکہ انسانوں کی ذہنیت بھی متاثر ہوتی ہے جو ان کی سرگرمیوں، اعمال اور کردار کو بھی متاثر کرتی ہے۔ چنانچہ انسانی معاشروں میں ایسے نظام دیکھنے کو ملتے ہیں جو ان کا حصہ ہوتے ہوئے بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ ان کا وجود الگ، ان کا نظریہ مختلف اور ان کے سوچنے کا انداز جدا ہوتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں انسانی معاشرہ انتشار کا شکار رہتا ہے اور وہ یکسانیت اور توحید فکری جو انسانی زندگی اور کائنات و فطرت کے بیچ ایک توازن کی بدولت ہر دو اجزاء کی متوازن ترقی اور ارتقاء کے راز سے آشنا کرتی ہے آہستہ آہستہ ختم ہونے لگتی ہے۔

انتشار کا یہ عمل صرف معاشروں ہی کی حد تک محدود نہیں رہتا بلکہ خاندانی اور انفرادی زندگی کو بھی متاثر کرتا ہے خاندان ٹوٹنے لگتے ہیں اور فرد اندر سے ٹوٹ کر بکھرنے لگتا ہے۔

ماضی میں یہ توحید فکری کس طرح قائم تھی اور آج کے دور میں ہم اس سے کیوں محروم ہو گئے ہیں یہ ایک ایسا موضوع ہے جو تفصیل ہی کا نہیں بلکہ تحقیق و تجزیہ کا بھی تقاضا کرتا ہے۔ مثالوں سے ہم اپنے مقصد کو واضح کر چکے

ہمارے نبی کا قول حدیث کی بہت سی کتابوں میں منقول ہے جس کے متعلق نبی محترم نے فرمایا "پہلوان و طاقت ور وہ نہیں ہے جو مدِ مقابل کو پچھاڑ دے بلکہ پہلوان اور شہ زور درحقیقت وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے"۔ یہ حدیث ایک طرف تو عام اخلاقی تعلیم ہے لیکن دوسری جانب اسی حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جو لوگ غصہ میں اپنے اوپر قابو نہیں رکھ پاتے اور جلد مشتعل ہو جاتے ہیں وہ کمزور ہیں یہ کمزوری کسی بھی قسم کی ہو سکتی ہے جسمانی بھی اور نفسیاتی بھی۔ چنانچہ قابلِ توجہ ہے۔ تیسری بات جو بڑی اہم ہے وہ یہ کہ کہنے والا جس مقام اور مرتبہ کا آدمی ہے اس کا اثر قائل ہی پر بالکل ہی دوسری نوعیت کا ہوتا ہے۔ یعنی کہ یہ یقین اور اس کے قول و عمل پر پورا پورا بھروسہ اور [illegible] یہ الفاظ ادا کرنے والا شخص سوائے سچ کے اور کچھ نہیں کہتا اور سوچے سمجھے بغیر کہنے کا عادی نہیں ہے۔ یہ یقین و اعتماد اس قول میں ایسی صداقت بھر دیتا ہے جو سننے والے، پڑھنے والے اور یقین کرنے والے کو اس کیفیت سے دوچار کر دیتی ہے کہ اس پر عمل پیرا ہونے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہتی چنانچہ ایک قول کے ذریعہ ایک اخلاقی تعلیم، ایک علمی اطلاع جو صدیوں بعد لوگوں کو معلوم ہوتی اور ایک قوتِ عمل کی بیک وقت فراہمی ایک ایسا معجزہ ہے جس کا عام انسانوں کے اقوال سے ظہور میں آنا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ اس کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ اس طریق تعلیم میں اخلاق، صحت اور قوت عمل بظاہر الگ الگ میدان ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بڑا گہرا ربط رکھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک ہی تعلیم بیک وقت اخلاق بھی سدھارتی ہے صحت و تندرستی کی طرف بھی متوجہ کرتی ہے اور قوت عمل بھی فراہم کرتی ہے۔ ہمارے زمانہ کی اصل بدنصیبی یہ ہے کہ ہم علم و فن میں عظیم ترین کامیابیوں اور بے مثال ترقیوں کے باوجود زندگی کے مختلف پہلوؤں کو integrate نہیں کر سکے اور ان سے متعلق علوم کے درمیان خلوص اشتراک واضح نہیں کر پائے۔ ان کے درمیان موجود

رشتوں کو سمجھ نہیں پاتے اور نتیجتاً ہم Integration کے بجائے Disintegration کے شکار ہو گئے۔

ماضی کا دور اس بنا پر بڑا مثالی نظر آتا ہے کہ وہاں زندگی میں اتنی رسّا کشی نہیں تھی بلکہ یگانگت اور تعاون تھا اور زندگی بحیثیت مجموعی ترقی کرتی تھی۔ لیکن آج زندگی کی ترقی بڑی یک رخی ہے اور ہمیں خوف ہے کہ اگر یہ اسی رفتار سے جاری رہی تو ایک دن انسان بری طرح ٹوٹ نہ جائے

ایک اور نمایاں پہلو یہ ہے کہ اطلاع فراہم کرنے والوں پر یقین و اعتماد بالکل اٹھ گیا ہے۔ ان کی فراہم کردہ معلومات جذبات کو متاثر نہیں کرتیں۔ اعداد و شمار میں روز افزوں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے اور ان سے دلچسپی رکھنے والے افراد بھرپور فائدہ بھی اٹھا رہے ہیں لیکن انسانی جذبات متحرک نہیں ہوتے۔ جذبات اور علم میں یہ بعد اسی انتشار کی دین ہے۔

ابن سینا رح سے متعلق ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک بار ان کے ایک ہونہار شاگرد نے کہا کہ یا شیخ اب آپ علم معرفت کے جس مقام پر ہیں اور حکمت کے جو موتی آپ لٹا چکے ہیں مناسب وقت ہے کہ آپ دعوئ نبوت فرمائیں۔ شیخ موصوف یہ سن کر خاموش ہو رہے۔ ایک روز جب سخت برف باری کی بنا پر سردی اپنے عروج پر تھی تو پڑاؤ کے دوران ان کے شاگردوں نے کسی کو صبح سویرے غسل کرتے دیکھا تو بڑا تعجب ہوا اور افسوس بھی کہ کون نادان اس جان لیوا سردی میں موت کو دعوت دے رہا ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ نماز فجر کی باجماعت ادائیگی کے لئے غسل ضروری تھا۔ اگلے روز جب شیخ نے اپنے اسی شاگرد سے باہر جا کر کسی بوٹی کو تلاش کرنے کے لئے کہا تو سردی کے باعث وہ ہمت نہ کر سکا۔ شیخ ابن سینا رح یوں گویا ہوئے کہ میاں نبوت کا دعویٰ تو اسی کو زیب دیتا تھا جس کا ایک حکم صدیوں بعد بھی اس سخت سردی میں لوگوں کو غسل کرنے کی ہمت عطا کرتا ہے۔ کہاں میں اور کہاں وہ ہستی۔ میرے حکم پر تم ذرا باہر بھی قدم

نہیں نکال سکے۔ یہ حکایت ہو یا سچا واقعہ بہرحال علم کے اثرات کے باب میں شخصیتوں کے کردار کی اہمیت کا آئینہ دار ہے۔

یہ توحید فکری جس کی مضبوط اور معتبر ترین بنیاد نبی محترم کی تعلیمات نے ڈالی جس کے ذریعہ انسانی زندگی اور کائنات کے درمیان رشتوں کو صحیح خطوط پر منظم و مستحکم کیا آگے چل کر کس کس طرح ظاہر ہوئی اور علوم و فنون میں تقسیم و اضافہ کے باوجود یہ توحید کس طرح برقرار رہی اس کی مثالیں بڑی حسین اور دلآویز ہیں۔ چنانچہ علامہ ابن خلدون کا مقدمہ اس approach کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ علامہ محترم علم کیمیا کے سلسلے میں اپنی رائے اور تحقیق جس انداز سے بیان فرماتے ہیں اس میں اسی اثریت کا پرتو ہے جو کلام نبوت کا خاصہ ہے۔ چنانچہ آپ یوں رقم طراز ہیں۔

"کیمیا کی لت اکثر تو انھیں لوگوں کو لگتی ہے جو کمائی کے طبعی راستوں سے مایوس ہو کر تھک رہتے ہیں اور فلاحت، تجارت اور صناعت کو چھوڑ کر کیمیا کی دھت میں پڑتے ہیں تاکہ یک بیک دولت ان کے ہاتھ لگ جائے اور آناً فاناً وہ امیر ہو جائیں۔ اس لئے آپ دیکھیں گے کہ اکثر و بیشتر فقیروں اور محتاجوں کو کیمیا کا خبط ہوتا ہے اور امیر اس سے منھ موڑتے ہیں۔ خود حکماء میں اس فرق کو ملاحظہ کر لیجئے کہ مثلاً ابن سینا رح جو وزیر تھا اور صاحب دولت کیمیا کا محال جانتا تھا اور ایک محض ڈھکوسلہ اور دوسری طرف فارابی ہے جو محتاج تھا اور روٹی تک کو ترستا تھا کہ وہ کیمیا کو ممکن جانتا تھا۔

(مقدمہ صفحہ ۱۵۴، مکتبہ خیر و شر کراچی)

یہ عبارت اس بات کی مظہر ہے کہ اگر کسی فن کی ترقی کے نتیجہ میں انسان سے فطری راستوں کو چھوڑ کر غیر فطری راستوں کو چھوڑ کر غیر فطری راستوں کو اپنانے کا احتمال

ہویا اس قسم کے فنون کی ترقی میں افراد کی یہ کمزوری کارفرما ہو کر وہ سہل ذرائع کے لئے غیر فطری راستے اپنائیں تو اس قسم کے فنون یا تو غلط ہیں یا ان کو ترقی نہیں دینا چاہتے۔ یہ نقطہ نظر ہمارے دور کے نقطہ نظر سے مختلف ہے جس کے مطابق اصل اہمیت مجرد علم وفن کی ہے۔ اس کے اثرات عام لوگوں پر کیا پڑتے ہیں یا اس کے پھیلانے والے اور اس میں تحقیق وجستجو کرنے والوں کے مقاصد کیا ہیں اس سے نہ تو کوئی بحث ہے اور نہ ہی کوئی سروکار۔ اس کے علاوہ یہ عبارت قارئین کو ان کمزوریوں کی طرف بھی متوجہ کرتی ہے جو بظاہر بڑے ہی مسحور کن الفاظ مثلاً "تحقیق وجستجو" اور "حصول علم" کے پردے میں چھپ جاتی ہے اور عام قارئین کو محسوس بھی نہیں ہوتیں۔ اس کے علاوہ یہ بات کہ اللہ ہی رازق ہے اور تمام قوتوں کا مالک جو احساس انسان کے ذہن میں پیدا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ حصول رزق کی خاطر فطری اصول کو توڑنے کی کوشش کرنا بڑا ہی لایعنی کام ہے جس کا نتیجہ یقیناً ناکامی ہی میں نکلنے والا ہے۔ اس لئے انسان کو چاہئے کہ وہ اس رزاق پر یقین کرے جو تمام مخلوقات کا خالق ہے اور جو رزق عطا کرنے کا وعدہ بھی فرماتا ہے۔

مذکورہ بالا مثالیں اس دور کی ہیں جس میں توحید فکری، زبان وقلوب پر غالب تھی۔ چنانچہ مختلف علوم وفنون کی ترقی کے نتیجہ میں نہ تو فرد کی بے قراریاں بڑھتی تھیں، نہ خاندان منتشر ہوتا تھا اور نہ ہی معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا تھا۔ علم کے مختلف میدان تو [illegible] ہوتے تھے اور ان میں دلچسپی رکھنے والے ان میں اختصاص بھی حاصل کرتے تھے۔ لیکن بحیثیت مجموعی علوم وفنون میں جو ترقی ہوئی وہ انسانوں کی فلاح کا باعث بنی۔ معاشرتی علوم اور فطری یا طبیعاتی علوم نے متوازی شکل اختیار نہیں کی۔ اس دور میں جو تصور کائنات تھا اس کے نتیجہ میں انسان ایک "غالب حکمراں" کی طرح نہیں بلکہ "غالب نگہباں" کی طرح کام کرتا ہوا نظر آتا ہے رحم وکرم انسانی معاشرے کا وصف اور دیانت داری بہترین پالیسی ہی نہیں بلکہ بہترین طرز عمل نظر آتی ہے۔

لیکن دنیا کی تاریخ تبدیلیوں اور انقلابات سے عبارت ہے۔ یہاں آہستہ آہستہ ایسی اندیکھی اور غیر محسوس راہوں سے تبدیلیاں آتی ہیں کہ ابتداء میں تو محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ہم تبدیل ہو رہے ہیں۔ یہ بھی پتہ نہیں چل پاتا کہ زندگی کا سفر کون سا موڑ مڑ گیا۔ بڑے بڑے دوربین اور عبقری ذہن مستقبل میں جھانک کر دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔

چنانچہ پھر ایسا ہی ہوا۔ ایک میدان خالی ہونے لگا اور دوسرے میدان میں زندگی کے آثار پیدا ہونے لگے جن کے قوی جواب دینے لگے تھے اور زندگی کی کشاکش میں آگے بڑھنے کی صلاحیت سے محروم ہو رہے تھے جہاں کار میں موجزن حیاتیاتی قوتوں نے ان کو پیچھے دھکیل دیا۔ اور وہ لوگ جن کے قوی مضبوط اور صلاحیتیں قابل اعتبار تھیں آگے بڑھتے گئے یہ ایک فطری عمل تھا جو ازل سے کارفرما ہے۔ لیکن اس بار یہ تبدیلی اتنی وسیع الاثر تھی کہ پورا کرۂ ارض اسکی زد میں آگیا اور کوئی بھی اس سے بچ نہ سکا۔

پہلی مرتبہ انسان نے یہ دیکھا کہ کائنات میں رونما ہونے والی بعض تبدیلیاں ایسی حسابی ترکیبوں سے عبارت ہیں جن کی کنجی خود اس کے پاس بھی ہے۔ یقیناً انسانی علوم میں یہ بہت بڑا اضافہ تھا اور جیسا کہ وقت نے ثابت کر دیا کہ یہ دریافت بڑی انقلابی تبدیلیوں ہی کا باعث نہ ہوئی بلکہ انسان کی ذہنی دنیا میں ایک عظیم انقلاب کا پیش خیمہ بھی بنی۔ یہ راز ہاتھ آجانے کے بعد وہ پردے جو نارسائی کی بنا پر انسانی ذہن اور عناصر فطرت کے درمیان حائل ہوا کرتے تھے کچھ اس انداز سے اٹھے کہ ذہن انسانی نے کائنات کو اس طرح تو دیکھا جس میں کائنات ایک مشین کی طرح نظر آتی ہے۔ پودوں کے اگنے سے لے کر اجرام فلکی کی رفتار تک وہ ہواؤں کے چلنے سے انسانی زندگی کی پیدائش کے عمل تک تمام تر عوامل بعض حسابی

اصولوں اور قوانین کے تابع نظر آتے اور یوں کائنات کا میکانکی نظریہ آہستہ آہستہ ترقی کرنے لگا۔ معاملات چاہے انفرادی زندگی سے متعلق ہوں یا اجتماعی۔ یہ مسئلہ مادی علوم کا ہو یا ان علوم کا جو انسانی قلب و ضمیر سے متعلق ہیں سب کی تعبیر اسی میکانکی عمل کے ذریعہ کی جانے لگی۔

مزید ترقیوں کے ساتھ یہ بات بھی کہی جانے لگی کہ Ph...ematics تمام علوم کی بنیاد ہے۔ ان علوم کا تعلق چاہے فطری سائنس سے ہو یا عمرانیات سے اور چاہے یہ فنون لطیفہ ہی کیوں نہ ہوں مگر کل میتھمیٹکس ہی کے ذریعہ ان تمام علوم و فنون میں تحقیق معیار کو پہنچ سکتی ہے اور اس کے ذریعہ اخذ کردہ نتائج ہی قابل اعتبار ہو سکتے ہیں حالانکہ بیسویں صدی کی ابتداء ہی سے اس تصور کے خلاف آوازیں اٹھنے لگی تھیں لیکن یہ آوازیں بڑی کمزور و ناتواں تھیں۔ غالباً علمی ترقیوں کے سامنے انسان اتنا حیرت زدہ ہوا کہ اس کی زبان گنگ اور ذہن ماؤف ہو کر رہ گیا۔ وہ قلب کی ان آوازوں کو دبا تا رہا جو اس کی طرز فکر اور زاویہ نگاہ میں تبدیلی کے خلاف احتجاج کرتی تھیں۔ یہ ایک ایسا زبردست ریلا تھا جس کو نہ تو کلیسا کا جبر و تشدد روک سکا، نہ مذہب پر پختہ یقین و اعتقاد اور نہ ہی قلب و ضمیر کی آہ و فغاں۔ ماضی کے سکون و اطمینان قلبی کو یاد کر کے آہیں کبھی کبھی چیخیں بن جاتیں انسانی اقدار کی پامالی اور اخلاقی دیوالیہ پن کو دیکھ کر کبھی کبھی چیخیں بن جاتیں۔ انسانی اقدار کی پامالی اور اخلاقی دیوالیہ پن کو دیکھ کر کبھی کبھی احتجاج بھی ہوتا۔ لیکن یہ اتنا نحیف و ناتواں کہ سمندر میں تنکے کی مانند اور بس۔

ایٹم کو توڑ کر قوت و توانائی کے نئے اور عظیم سلسلہ کی دریافت، پیغام رسانی کے میدان میں مسحور کن تحقیقات اور عام انسانوں تک ان کی رسائی، خلا میں انسانی قدم اور پھر چاند کی تسخیر جیسے معرکے۔ پھر خلا کی وسعتوں اور کائنات کی عظمتوں کو ناپتے ناپتے جب انسان خود اپنے وجود کی طرف متوجہ ہوا تو بات یہاں تک پہنچی کہ اپنی مرضی کا انسان پیدا کرنا بھی ممکن معلوم ہونے لگا۔ یہ ترقیاں اتنی مسحور کن اور اتنی انقلابی تھیں کہ ان انقلابیوں کی طرف سے جو کچھ بھی آیا "حقیقت مطلق" کی طرح آیا اور زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کرتا چلا گیا۔ مختلف علوم و فنون پر اس کے کیا اثرات پڑے اس کے لئے بڑی تفصیل درکار ہے۔ بعض اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ اس انسان نے اور ان ترقیوں کے خالق نے کس طرح سوچا ہے اور پھر اس سے کس طرح کی ذہنیت بنی ہے۔

پچھلی دہائی میں جو ترقیاں ہوئی ہیں ان میں ہمارے نزدیک اہم ترین وہ نتیجہ ہے جس کے مطابق حیاتیاتی عمل کے مختلف مراحل وہی اصول و قوانین follow کرتے ہیں جو کسی بھی مشین میں موجود نظر آتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بالکل مشینوں کی طرح حیاتیاتی نمونے بھی تیار کئے جا سکتے ہیں۔ یعنی زندگی کی پیدائش انسان کے بس سے باہر نہیں ہے۔

I am a physicist (کیٹا گورسکی
1977)

آگے چل کر یہی مصنف کہتا ہے:

آج ہم بیانگ دہل یہ اعلان کر سکتے ہیں کہ اصولی طور پر مشین اور آدمی میں کیا کوئی فرق نہیں ہے۔ میرے خیال میں بیسویں صدی کی سائنسی ترقیات میں یہ سب بڑی دریافت ہے۔ اس عظیم ترین دریافت کے سامنے ماضی کی تمام بڑی بڑی اور انقلابی دریافتیں جو فزکس کے میدان میں ہوتی ہیں اپنی اہمیت کھو بیٹھی ہیں۔ ویسے بھی کیا واقعی اس سے بڑی دریافت ہو سکتی ہے جو انسان کو خود اپنے متعلق نیا نقطہ نظر فراہم کرے۔ تاریخی اہمیت کے لحاظ سے اس کا مقابلہ صرف ڈارون کی دریافت سے ہی کیا جا سکتا ہے جس نے یہ ثبوت فراہم

کیا کہ زندگی کی ابتدا حقیر ترین جانوروں سے ہوتی ہے۔

"I am a physicist" گیشا گورسکی

نتیجہ کے طور پر "آدمی" اور مشین میں اصولی فرق کا خاتمہ اس عزم کا اعلان کرتا ہے کہ آدمی بالکل مشینوں کی طرح manufacture ہو سکتا ہے۔ بہت سے منچلے جن میں خاص طور پر سطحی علم رکھنے والے سائنسداں اور صحافی شامل ہیں اس مسئلہ میں بہت آگے چلے جاتے ہیں لیکن ایسے افراد جو اس عظیم دعوے سے متعلق مسائل پر نظر رکھتے ہیں اور انسانی ذہن کی نارسائی اور اپنی کم مائیگی کا احساس بھی ان دریافتوں اور نتائج سے انحراف کی جرأت تو نہیں کر پاتے البتہ کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

اور میں اب بھی سوچتا ہوں کہ ہماری کوشش یہ ہونا چاہئے کہ مشین اور انسان کے درمیان مماثلت کا مطالعہ کریں نہ کہ اختلافات کا۔ درحقیقت سوال یہ ہے ہی نہیں کہ آدمی انسان بنایا جائے یا نہیں میں نہیں سمجھتا کہ اس سے کیا فائدہ حاصل ہوگا اور اس سے ہمارا کون سا مقصد حل ہو جائے گا۔ عملی طور پر ہمارا مقصد ہونا چاہئے کہ ایسے خودکار آلات بنائیں جو انسان کے اس کے ذہنی کاموں میں مدد کریں ہمارا یقین بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ ایک بالکل مادی نقطہ نظر سے عبارت دائرہ کار میں رہتے ہوئے ایک ایسی زندہ مخلوق پیدا کی جا سکتی ہے جو پھلنے پھولنے اور ارتقاء کرنے کی صلاحیت سے متصف ہو جو جذبات بھی رکھتی ہو۔ اعلیٰ ذہنی استطاعت کی بھی مالک ہو اور با اختیار بھی۔ ہمارے نزدیک یہ ایک اصولی بات ہے کہ ہم اس میں کسی اختلافات کی گنجائش نہیں پاتے۔

Kolmogrove in,
I am a physicist.

اس قبیل کے نقطہائے نظر اپنے جلو میں "بڑے نام" اور "انقلابی دریافتیں" لئے ہوئے تھے اس نے ان کو آگے بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے لئے کسی بیرونی ذریعہ کی ضرورت نہ تھی چنانچہ جہاں جہاں سائنس اور اس کی ترقیات کے قدم پہنچے گئے یہ نظریات اور نقطہائے نظر خود بخود وہاں پہنچتے گئے اور پھر ایسا معلوم ہونے لگا کہ سائنس اور یہ نظریات لازم و ملزوم ہیں اور پھر یہ ہوا کہ سائنس پیچھے رہ گئی اور یہ نظریات اس سے قبل ہی پھیلنے لگے خاص طور پر مشرقی ممالک اور تیسری دنیا کے وہ ممالک جن میں ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے بیشتر ممالک شامل ہیں سائنسی ترقیوں میں تو آگے نہ بڑھ سکے البتہ ان نظریات کو وہاں قبول عام حاصل ہوا انھوں نے وہاں کی معاشرت، نظام تعلیم، نظام معیشت اور نظام اخلاق ہی کو نہیں بلکہ فرد اور معاشرہ کو بھی بری طرح متاثر کیا۔

ہم یہ اعتراف کرتے ہیں کہ یہ نظریات جہاں جہاں پہنچے وہاں کے متحرک اور ذہین افراد کو انھوں نے متاثر ہی نہیں کیا بلکہ اپنا گرویدہ بنا لیا چونکہ یہ نظریات روایت کے خلاف بغاوت ہیں اس لئے ہر ملک میں ان نظریات کے مشتہر باغی کہلائے اور اس طرح ان افراد کے نام، کردار اور ان کی سرگرمیاں افسانوی ہیرو کی اہمیت اختیار کر کے عام ناظرین اور قارئین کے ذہنوں کو متاثر کرتے ہیں لیکن ستم ظریفی یہ تھی کہ ان مشتہرین میں اکثریت ایسے افراد کی تھی جو سائنس سے قطعی نابلد تھے اور جو لوگ سائنس سے واقفیت رکھتے تھے ایک طرف تو ان کی یہ واقفیت سطحی تھی اور دوسری طرف معاشرہ سے ان کا رابطہ بڑا کمزور تھا۔ جنگ اوّل عظیم کے بعد کا دور اس نظریاتی کشمکش سے عبارت ہے اور آج حالانکہ ان نظریات کا ریلا دم توڑ رہا ہے۔ ان کی خرابیاں اور کمزوریاں واضح ہو گئی ہیں لیکن تقریباً ۵۰ سال کے دوران قوموں نے کتنا کھویا ہے، افراد اور معاشروں نے اس کی کتنی بڑی قیمت ادا کی ہے؟ اس کا اندازہ یا تو ان لوگوں کو ہے جو ان واقعات سے

چشم دید گواہ ہیں یا ان کو جو ماضی اور حال پر نظر رکھ کر مستقبل کو تعمیر کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔

یہ دور ایک طرف تو ترقی و کمالات اور بنی آدم کی رفعت پرواز کا دور ہے دوسری طرف پستیوں کا۔ اس دور میں انسان نے اسفل سافلین کی تفسیر بھی پیش کی ہے یہ دور قہقہوں کا دور بھی ہے اور چیخوں کا بھی اور یہاں ایک ہی واقعہ قہقہوں کا باعث بھی بنا ہے اور چیخوں کا بھی کبھی بہیمیت نے سر اٹھایا ہے اور کبھی انسانی ضمیر چیخ اٹھا ہے۔ یہ کردار کچھ خاص طبقوں ہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ اس میں سائنس داں اور ماہرین عمرانیات بھی ہیں۔ ادیب، شعراء بھی اور مفکرین و عام لوگ بھی ہیں لیکن انسان میں بعض ایسی خصوصیات ہیں جو اس کو دوسرے جانداروں سے ممتاز کرتی اور اشرف المخلوقات کے مقام پر کھڑا کرتی ہیں۔ کچھ کر لے اور کچھ کرتے رہنے، جستجو کرنے کی خواہش اور اس کی صلاحیتیں ایسے اوصاف ہیں جو انسان کو ایک مقام پر نہیں رہنے دیتے۔ چنانچہ بیسویں صدی کی اس نظریاتی کشمکش کے دوران جب خود انسان کی بدولت انسانیت کو خطرہ لاحق ہونے لگا تو ایسی آوازیں اٹھنے لگیں جو کسی نئے انقلاب کا پتہ دیتی تھیں۔ ابتداء میں ان آوازوں میں زیادہ معتبر مذہبی طبقہ سے متعلق علماء کی آوازیں تھیں اور خاص طور پر اسلامی ممالک کے علماء ان میں آگے تھے جن میں سرفہرست برصغیر کی سب سے معتبر شخصیت سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تھی اور ممالک عربیہ میں سید قطب شہیدؒ کی۔ مغربی نقطۂ نظر، نظریہ کائنات اور کائنات میں انسان کی پوزیشن جیسے بنیادی اور اہم ترین مسائل پر ان حضرات کی پراثر اور انتہائی عالمانہ تنقید نے ابتداءً مشرقی ممالک میں اس فسوں کو توڑا جو ذہنی غلامی کی بنا پر یہاں کی فکر و نظر پر چھایا ہوا تھا۔ اول الذکر دو افراد کی تنقیدیں جس دور میں سامنے آئیں وہ دور سائنسی نظریات کے عروج کا دور تھا۔ اس دور میں جس بالغ نظری اور جرأت کا ثبوت ان حضرات نے پیش کیا وہ اپنی مثال آپ ہی ہے۔ محمد قطب نے براہ راست ان موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جو مغرب میں ان سائنسی ترقیوں کی بنا پر پیدا ہوئے تھے اور مشرقی ممالک میں جن کا چلن تھا۔ چنانچہ علامہ موصوف نے "انسانی زندگی میں جمود و ارتقاء" "جدید جاہلیت" اور "اسلام اور جدید مادی افکار" جیسی معرکۃ الآراء کتابیں لکھ کر فرائڈ اور ڈرخیم کے نظریات پر تنقیدی لٹریچر میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔

جہاں تک خود مغربی ممالک کا تعلق ہے یہ بات تسلیم کی جانی چاہئے کہ وہاں کے انسان نے جس کرب کا اظہار کیا تھا اور جو احساس زیاں پیدا ہوا تھا وہ صرف احساس ہی نہیں رہا بلکہ وہاں کے انسان نے ان وجوہات کی تلاش بھی شروع کر دی جن کی بنا پر ان کے معاشرہ میں یہ خرابیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ تحقیق و جستجو اور تجزیاتی نظریہ نے بعض مفکرین کو اس مقام پر لا کھڑا کیا کہ وہ خود از سر نو سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ یونیورسٹی کیلی فورنیا میں ہسٹری آف سائنس کے ایک محقق کیرولائن مرچینٹ نے کہا:

> ہمارے ماحول میں بڑھتی ہوئی خرابیوں کی جڑ کا پتہ لگانے اور یہ معلوم کرنے کہ ان کا تعلق ہماری سائنس ٹکنالوجی اور معیشت سے کیا ہے ہمیں اس سائنسی اور نظریہ کائنات پر نظر ثانی کرنا پڑے گی جس نے زندگی کو مشین کا تصور دے کر ہمیں فطرت اور عورت کا غلام بنا دیا ہے۔ فرانسس بیکن ہو یا ولیم ہاردے اور دیکارٹ یا ٹامس ہوبس اور نیوٹن جیسے نادر روزگار سائنس داں اور فلاسفہ اور چاہے ان حضرات کا مقام جدید سائنس میں باوا آدم ہی کا کیوں نہ ہو۔ ان کے مقام کو ہمیں دوبارہ جانچنا ہوگا۔
>
> CAROLYN MERCHANT
>
> THE DEATH OF NATURE XVIII

یہ احساس اپنے جلو میں جو فکری تموج لئے ہوئے ہے اور علم و فن کی دنیا میں جن انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت کا احساس پیدا ہو رہا ہے وہ واضح طور پر اس حقیقت کے

اعتراف پر منتج ہو رہا ہے کہ کائنات میں کوئی شے بلا مقصد نہیں ہے چنانچہ ہر شے کا ایک دوسرے سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ یہ تعلق اور یہ رشتے کیا ہیں ہمارے مفکرین مغرب کے پاس اس کا جواب واضح نہیں ہے۔ یہ لوگ ان رشتوں کی اہمیت ان کی ضرورت اور ان کو تسلیم نہ کرنے کے اثرات سے بخوبی آگاہ ہیں لیکن ابھی وہ خطوط نہیں ابھر پائے ہیں جو ان رشتوں اور تعلق کو رقم کریں گے۔

ضیاء الدین سردار جو سائنس کے ایک معتبر ناقد ہیں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ بعض علماء کا یہ خیال کہ آج کے انسانی ذہن اور اس کی سرگرمیوں پر سوشل سائنس کے اثرات زیادہ غالب ہیں اور اس قبیل کے علوم نے ہمارے دور کی تمام برائیوں کو جنم دیا ہے غلط ہے۔ آج کے تمام علوم و فنون کی جڑ سائنس اور ٹکنالوجی ہے یہ سائنس اور ٹکنالوجی ہی ہے جس نے آج کی سیاست، آج کے معاشی [illegible]، علم معیشت، علم نفسیات، فلسفہ اور شعر و ادب کو [illegible] اثر کیا ہے۔ چنانچہ ہمارے دور میں اصل توجہ کے طالب علوم عمرانیات نہیں بلکہ سائنس اور ٹکنالوجی ہیں۔

(MUSLIM WORLD BOOK REV.
2 (4), 1982, p.p. 13)

اسی فکر کی بازگشت مشہور امریکی سائنس داں فرجوف کیپرا کے یہاں بھی سنائی دیتی ہے جس کے مطابق آج کے تمام علوم کی فلسفیانہ اور نظریاتی بنیادیں [illegible] کی فزکس سے ملتی ہیں۔ یہ مصنف آگے چل کر اپنی ایک کتاب میں بتاتا ہے کہ کس طرح مختلف علوم سائنس، [illegible]، معیشت اور میڈیکل سسٹم وغیرہ کی بنیادیں نیوٹن کی فزکس سے جڑی ہوئی ہیں۔ اس مصنف کے نزدیک فزکس کی نئی تحقیقات کے نتیجہ نقطہ نظر اور زاویہ نگاہ میں جو تبدیلی رونما ہوگی اس کے مطابق مستقبل میں سائنس .... نزدیک

خصوصیات کی اہمیت زیادہ اور اعداد و شمار کی اہمیت کم ہوگی اس کی بنیاد ان تجربوں پر زیادہ ہوگی جو مشترک اور معروف ہوں گے نہ کہ ایسے تجربوں پر جن کو جانچنے اور پرکھنے کی ضرورت محسوس ہو۔

(THE TURNING POINT PP. 376)

یہی مصنف آگے چل کر Ecology سے متعلق مسائل کے سلسلہ میں یوں لکھتا ہے

حقیقت کا یہ نیا ادراک دراصل آفاقیت کا ادراک ہے جو [illegible] تصور سے بہت بلند ہے جس کے مطابق [illegible] کی آلودگیوں سے بچانا ہی اصل کام ہے۔ [illegible] آفاقیت کے اس نئے عنصر کو متعارف کرانے اور اس کی اہمیت کو واضح کرنے کیلئے سائنس دانوں اور فلاسفہ نے "گہری آفاقیت" اور "سطحی ماحولیت" کے بیچ فرق کو واضح کرنے کی کوشش شروع کردی ہے۔ چنانچہ سطحی ماحولیت کا تعلق ان انتظامی امور سے ہے جن کے نتیجہ میں فطرت [illegible] انسان کا کنٹرول بڑھ جاتا ہے۔ تاکہ اس کے ذریعہ انسان زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکے۔ دوسری طرف گہری آفاقیت کا تصور اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ پوری کائنات میں توازن قائم رکھنے کے لئے یہ بات جاننا ضروری ہے کہ اس آفاق کے اندر انسان کا رول کیا ہے؟ اس سلسلہ میں ہمیں نئے نظریہ اور نئے ادراک کی ضرورت ہے۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے لئے ایک فلسفیانہ اور مذہبی بنیاد کی ضرورت ہوگی۔

(THE TURNING POINT PP. 411)

یہ الفاظ جس عظیم تبدیلی کی خبر دے رہے ہیں اگر ایسا ہو گیا تو سائنس کی مادی بنیادیں کمزور ہو جائیں گی اور پھر بقول کیپرا (FRITJOF CAPRA) سائنس تصوف ہوگی اور تصوف سائنس۔ اس انقلابی تبدیلی کا امکان کتنا ہے اسے نظری فزکس (Theoratical Physics) کے ماہرین ہی

زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں بشرطیکہ وہ یہ سمجھ لیں کہ ہر Theory نظر ثانی کے قابل ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ لوگ غور و فکر کرتے ہوئے کسی عصبیت کا شکار نہ ہوں۔

بہت سے محقق اور مفکر اس انداز سے سوچنے پر مجبور ہیں کہ تمام علوم و فنون ہی نہیں بلکہ کائنات میں موجود تمام اشیاء مثلاً فرد، معاشرہ اور ماحول اور ان سے متعلق تمام چیزیں آپس میں بڑا گہرا ربط رکھتی ہیں۔ یہ کائنات بے جان مادہ کا انبار نہیں بلکہ ایک باشعور وجود ہے جس میں اس کے اجزا ظاہری طور پر الگ الگ ہونے کے باوجود آپس میں بڑا گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ فرد کی سرگرمیاں صرف معاشرہ پر ہی اثر انداز نہیں ہوتیں بلکہ پورے ماحول کو متاثر کرتی ہیں۔ معاشرے کی تبدیلیاں افراد اور ماحول کی تبدیلی کرتی ہیں۔ ایسے کام جو بظاہر فرد کی بہتری کی خاطر انجام پا رہے ہوتے ہیں کبھی کبھی ماحول کو پامال کر ڈالتے ہیں۔ اس طرح علوم و فنون جن میں تحقیق و جستجو فطرت کے رازوں کو افشا کرتی اور اس دعویٰ کا موجب بنتی ہے کہ ترقی انسانیت کی خاطر اور زندگی کو زیادہ آرام دہ بنانے کے لئے ضروری ہے۔ اکثر و بیشتر یہ تحقیقات انسانیت کی بہتری کے لئے کم اور مخصوص افراد کی بہتری کے لئے زیادہ استعمال ہوتی ہیں۔

یہ ایک طویل بحث ہے جس کے آغاز سے بچتے ہوئے اختصار کے ساتھ یہ بات عرض کرنی ہے کہ اب ماہرین سائنس اسی طرح سوچنے لگے ہیں کہ یہ ترقیاں صحیح! انسانی ذہن کی یہ رفعت پرواز بجا! لیکن چند ایسی کڑیاں ضرور ہیں جو یا تو ہمیں ابھی تک مل نہیں پائی ہیں یا پھر یہ کہ ہم نے انھیں سمجھنے اور ان کی تفسیر کرنے میں غلطی کی ہے۔ یہ کڑیاں انسان، معاشرہ اور کائنات کے بیچ ان رشتوں سے عبارت ہیں جو اس کائنات میں انسان کی پوزیشن کو واضح کرتے ہیں اور معاشرہ و ماحول کے ساتھ اس کے رویہ اور برتاؤ پر روشنی ڈالتی ہیں۔

MAN THE UNKNOWN (1935) کا خالق الیکس کارل، THIRD WAVE اور FUTURE SHOCK کا خالق الوِن ٹافلر اور THE TURNING POINT/ THE TAO OF PHYSICS کا خالق فرجوف کیپرا جیسے نمائندہ مصنفین نے اپنے اپنے انداز میں انھیں مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ کارل ایک نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر ہیں، الوِن ٹافلر ایک مشہور ماہر عمرانیات اور فرجوف کیپرا ایک مشہور ماہر فزکس اور سائنس کا ناقد۔ ان کے علاوہ ایسے مصنفین کی ایک طویل فہرست تیار کی جا سکتی ہے جو اپنی فکر و جستجو اور مشاہدہ کے نتیجے میں ان رشتوں کی ضرورت محسوس کرتے اور اب تک کی تسلیم شدہ مسلمات پر بھرپور تنقید کرتے ہیں۔ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ حضرات اپنے اعلان بغاوت کے باوجود ابھی ان سطحوں سے بلند نہیں ہو پائے ہیں جو انسان کو Observer کے مقام پر لاتی ہیں چنانچہ ان کا Observed Object یعنی ابھی دھندلا ہے۔ کاش یہ حضرات اپنے ہی تخلیق کردہ ان دائروں سے باہر نکل کر سوچ سکتے جو انھیں محسوسات کے جال میں پھنسائے ہوئے ہیں۔

انسان اپنی فطری صلاحیتوں کی بنا پر اس پر تو قادر ہے کہ اس ذہن کے بنیادی مسائل کی اہمیت، ان کے حل کی ضرورت اور حل نہ نکلنے پر نقصان کا اندازہ لگا سکے لیکن یہ کہ اس حل تک پہنچ بھی جائے ایسا تاریخ میں کبھی نہیں ہوا۔ ہمارے دور کے علم و فن کا یہ المیہ ہے کہ اس کے ذریعہ بے شک بڑی معتبر "خبریں" تو ہم پہنچائی جا سکتی ہیں لیکن اس کے ذریعہ ان رشتوں کی پہچان نہیں ہو سکتی جن کی ضرورت سطور بالا میں واضح کی گئی ہے۔ شاید مسئلہ انسانی ذہن کی رسائی سے ماوراء ہو۔

قرآن میں رب عظیم نے یوں فرمایا کہ "اگر اس طرح اللہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعہ ہٹاتا نہ رہتا تو زمین کا نظام بگڑ جاتا۔" یہ آیت دنیا میں امامت کے اسٹیج پر آنے اور جانے ہی سے متعلق نہیں ہے بلکہ یہ اصول علمی سرگرمیوں میں بھی کارفرما محسوس ہوتا ہے۔ کل کے مسلمات آج اپنی اہمیت کھوتی جا رہی ہیں۔ ... انسانی ذہن کی نارسائی اور نامائیگی کا احساس دلا کر نئے علم و فن کی طرف اشارے کر رہی ہے۔ چنانچہ شاید ایک

بقیہ صفحہ ۵ پر

عبدالعزیز خالد

لکھنے والے نے عمر بھر کے لئے
مری قسمت میں رت جگے لکھے

رہی سعیِ وصال نامشکور!
نہ مٹے فاصلے جدائی کے

کر سکے قید کون خوشبو کو؟
کوک کوئل کی کون روک سکے

ہر درخت اگ سکے نہ گملے میں
ہر پرندہ قفس میں گا نہ سکے!

فکر و فن خواستگارِ آزادی
فلسفۂ بے تعصبی مانگے!!

لادوا ہو چکا مرض اب تو
پہرہ داروں پہ کون پہرہ دے؟

کون سچ بات کا کرے اقرار؟
کون اپنے دہی کو ترش کہے؟

لوگ ہیں آتش برگ کی مانند
چھپے رہتے ہیں اکثر آنکھوں سے

ہیں کہاں وہ کشیدہ قد جن کے
منتظر ہیں لگے ہوئے ناکے

نظر آئے نہ کوئی دلبرِ دلدار مجھے
کر لیا خود کو سبک اظہارِ تمنا کر کے؟

میں نہیں شاملِ رندانِ تنک بادۂ فن
کوئی مرد افگنیِ مے کا مجھے طعنہ نہ دے

بے ثمر سوزشِ پنہاں کی بھولا نشتر زنی
روح کی پیاس کہاں کم ہو کھلی باتوں سے

سینکڑوں "کاش" "اگر" ذہن پہ یلغار کریں
دلِ آگاہ خود آگاہی کا تاوان بھرے

سانس لینا بھی ہے دشوار گھٹن اتنی ہے
تا دمِ باز پسیں کیا یوں ہی جینا ہے مجھے؟

بے نوا ہوں میں کسی چیز کا محتاج نہیں
مرا لاحاصل و حاصل نظرے خوش گذرے

ہے آباد خراباتِ محبت یارب!
ہمیں نوشابِ لبِ لعل ملے یا نہ ملے

ہم نہیں وہ جو ہیں تا زندہ بسرمایۂ خویش
کیف چیزے دگرے نشہ ہے چیزے دگرے

کس قدر عمر کا اندوختہ ناکافی ہے
کیا پس انداز کرے آدمی کیا صرف کرے

عرفان صدیقی

غزل

تم ہمیں ایک دن دشت میں چھوڑ کر چل دیے تھے تمہیں کیا خبر یا اخی
کتنے موسم لگے ہیں ہمارے بدن پر نکلنے میں یہ بال و پر ، یا اخی

شب گزیدہ دیاروں کے ناقہ سواروں میں مہتاب چہرہ تمہارا نہ تھا
خاک میں مل گئے راہ تکتے ہوئے سب خمیدہ کمر بام و در ، یا اخی

یہ بھی اچھا ہوا تم اس آشوب سے اپنے سر سبز بازو بچا لے گئے
یوں بھی کوئے زیاں میں لگانا ہی تھا ہم کو اپنے لہو کا شجر ، یا اخی

جنگ کا فیصلہ ہو چکا ہے تو پھر میرے دل کی کمیں گاہ میں کون ہے
اک شقی کاٹتا ہے طنابیں مرے خیمۂ خواب کی رات بھر ، یا اخی

نہر اس شہر کی بھی بہت مہرباں ہے مگر اپنا رہوار مت روکنا
ہجرتوں کے مقدر میں باقی نہیں اب کوئی قریۂ معتبر ، یا اخی

زرد پتوں کے ٹھنڈے بدن اپنے ہاتھوں پہ لے کر ہوا نے شجر سے کہا
اگلے موسم میں تجھ پر نئے برگ و بار آئیں گے تب تلک صبر کر ، یا اخی

عرفان صدیقی

سرحدیں اچھی کہ سرحد پہ نہ رکنا اچھا
سوچیے آدمی اچھا کہ پرندہ اچھا

ہیں اسی کوچہ میں اب تک مری آنکھیں آباد
صورتیں اچھی، چراغ اچھے، دریچہ اچھا

ایک چھاگل سے بھرے گھر کا بھلا کیا ہوگا
ہم کو بھی نہر سے پیاسا پلٹ آنا اچھا

پھول سے چہروں کے پیارے تو نہیں ہیں جنگل
شام ہو جائے تو بستی ہی کا رستہ اچھا

رات بھر رہتا ہے بندِ قبا کے چراغاں دل میں
رفتگاں ہم نے لگا رکھا ہے میلا اچھا

جاکے ہم دیکھ چکے نیند سے [illegible] شہر
ایک [illegible] پہ رکنے کا بہانہ اچھا

ہم اپنے ذہن کی آب و ہوا میں زندہ ہیں
عجب درخت ہیں، دشتِ بلا میں زندہ ہیں

گزرنے والے جہازوں کو کیا خبر ہے کہ ہم
اسی جزیرۂ بے آشنا میں زندہ ہیں

گلی میں ختم ہوا قافلے کا شور، مگر
مسافروں کی صدائیں سرا میں زندہ ہیں

سبھی سمجھتے ہیں جائیگا اس طرف کوئی راہ
سبھی تو دامنِ کوہِ ندا میں زندہ ہیں

خدا کا شکر ابھی میرے خواب ہیں آزاد
مرے سفر مری زنجیرِ پا میں زندہ ہیں

تحسین فراقی

استاد شعبۂ اردو
گورنمنٹ ایم۔اے۔او کالج لاہور

وہ شخص جس نے مجھے آئینہ دکھایا نہیں
مرا مثیل تو ہے مری ماں کا جایا نہیں

جو مڑ کے دیکھے مزید کی نہیں کہ بت ہو جائے
خدائے شہر یہ ایسا تو قہر آیا نہیں!

میں جگنوؤں کو بڑی حسرتوں سے تکتا ہوں
کہ طاقِ جاں میں ابھی دل کا نور آیا نہیں

خدا کرے کہ گزرگاہِ خاص و عام رہے
وہ دل کہ جس کو ابھی اس نے تو میا یا نہیں

میں سانس سانس کا سودا سود دے چکا ہوں مگر
محاسبو! مرے ذمہ کوئی بقایا نہیں!

یہ جرم ہے تو فلک ہی کے سر لکھا جائے
زمین والوں کا اپنا تو کوئی سایا نہیں

میں اپنے گریۂ گمنام پہ پشیماں ہوں
میں کھل کے برسا تو ہوں ابر بن کے چھایا نہیں

جو تو نے درد دیا ہے وہ بھول پاؤں گا کیسے
میں تجھ کو بھول کے تیری گلی میں جاؤں گا کیسے

پلک جھپکتے ہی طے ہو گیا وداع کا منظر
میں سوچتا تھا تجھ سے نظر چراؤں گا کیسے

ہوائے ہجر کچھ اس زور کی چلی تھی کہ اس شب
تو سوچتا تھا دیا ہوں تو بجھ نہ پاؤں گا کیسے

مجھے تو میرا مکمل ثبوت تجھ سے ملا ہے
ترے بغیر میں تجھ کو گلے لگاؤں گا کیسے

کرشن کمار طورؔ

ہوں کشتِ جاں میں دلاویزیٔ انا میں بھی
ہر آئینے میں رہوں صورتِ صدا میں بھی

مجھے یہ علم تھا اس کو ہے دکھ بچھڑنے کا
تھا واقعہ ہی کچھ ایسا کہ چپ رہا میں بھی

وہ برگِ زرد ہے مانا مگر کہوں کیسے
کہ ایک لمحہ میں ہوں موجۂ ہوا میں بھی

وہ رنج دے گا مجھے میری خود پسندی پر
میں چپ رہوں گا کہ ہوں زائدہ انا میں بھی

ڈبو دوں اپنے آپ کو ایسے میں خود نمائی طورؔ
کہ اپنے جسم پہ لکھ دوں کبھی ہوا میں بھی

ہجومِ جاں میں ہے یہ آگہی بلا خود کو
سمجھ رہا ہوں میں اک موجۂ ہوا خود کو

یہ کیسا سکوں ہے کہ جو دل کو چیرے جاتا ہے
یہ کیسی چپ ہے کہ سنتا ہوں بارہا خود کو

متاعِ ترک و قبول ان کے سامنے رکھ دے
وبالِ جرمِ تمنا سے اب بچا خود کو

کرو گے سارے جہاں سے مفاہمت کیسے
کہ اس نظر سے تماشا ہے دیکھنا خود کو

مری شناخت اگر ہے تو بس اسی سے ہے
میں طورؔ کیسے کروں اس سے اب جدا خود کو

احمد رئیس

(کراچی)

یہ لمحہ ایک وقفہ ہے سفر کا
نظر میں ہے سماں ہر رہگذر کا
سحر کی جستجو میں پھرنے والو
کبھی دیکھا ہے نقشہ اپنے گھر کا
پرائی دھوپ سے کیا ہم کو لینا
رہے روشن یہ سورج اپنے سر کا
ہمارے ساتھ ہے اپنا مقدر
نہیں کھٹکا ہمیں زادِ سفر کا
اسی کی چھاؤں میں یارو کھڑے ہو
پتہ کیا پوچھتے ہو اب شجر کا!
سبھی دیوار و در ہیں اجنبی سے
گماں ہوتا ہے پھر بھی اپنے گھر کا
بھٹک کر خارزارِ زندگی میں!
نشاں تو مل گیا ہے بال و پر کا
ہتھیلی پر چراغِ دل سجائے
مسافر تھا کوئی شب کے سفر کا
صحیح تاریخ کو جھٹلا رہے ہو
مٹاتے ہو نشاں خود اپنے گھر کا
ہمیں معلوم ہے معیارِ ہستی
قرینہ جانتے ہیں سب ہنر کا

خاک کی خوشبو، ستاروں کا چھونا چاہیئے
کچھ نہ کچھ زادِ سفر تو ساتھ ہونا چاہیئے
لہلہاتی کھیتوں کا خواب گھر میں تا کجا؟
کاٹنا ہے تو زمیں پر کچھ تو بونا چاہیئے
راستے کی دھند تو خود آپ ہی چھٹ جائیگی
جگنوؤں کی روشنی کو ساتھ ہونا چاہیئے
دل کے پیڑوں پر ہوا کی دستکوں کے ساتھ ساتھ
شبنمِ احساس سے یادوں کو دھونا چاہیئے
چاندی ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں پاس بیٹھا
ایک پیکر کے لیے صدیوں کا رونا چاہیئے
روز کہتی ہے کہ ابو آج میلے میں چلیں
میری گڑیا کو بھی چابی کا کھلونا چاہیئے!

مظفر ایرج

ہر آنکھ تھی اعتبارِ منظر یہ حادثہ ہے
بہار آئی غبار لے کر یہ حادثہ ہے

لپکتے ہیں بے جہت خلاؤں سے ٹھنڈے شعلے
ہوا سلگتی ہے میرے اندر یہ حادثہ ہے

برہنہ لاشیں، پھٹی قبائیں، لہو سمندر
نہ تھا تو نیزے پہ کاسۂ سر یہ حادثہ ہے

اداسیوں سے بھی دھوپ گذری تو حادثوں کی
دھواں دھواں سب ہرا سمندر یہ حادثہ ہے

مہیب پرچھائیاں سی لرزاں تھیں خامشی میں
برس رہے تھے فضا سے پتھر یہ حادثہ ہے

تم اپنے چہرہ کی سلوٹیں بھی سنوارتے ہو
زمانہ ہنستا ہے آئینوں پر یہ حادثہ ہے

بے لفظ کی زباں وہ سنے گا نہ سوچئے
ریگِ رواں پہ نقش بہے گا نہ سوچئے

مغرب سے آفتاب ابھرنے کی دیر ہے
مشرق سے کوئی چاند اگے گا نہ سوچئے

کب کیسے مسخ ہو گئی کردار کی کتاب
یہ راز اب کسی پہ کھلے گا نہ سوچئے

سب عکس عکس کھو گئے منظر شفق لہو
پانی میں رنگِ شام گھلے گا نہ سوچئے

جلتی ہوئی اجاڑ زمینوں کی پیٹھ پر
پھر شعلہ شعلہ پھول بنے گا نہ سوچئے

ہر کوئی منجمد ہوا پتھر کے خول میں
ایرجؔ طلسمِ لمس چلے گا نہ سوچئے

مصنف :- احدیت مہاراجا
ترجمہ :- قرۃ العین حیدر

کیریکٹر کرائسس

(انڈونیشین کہانی)

ایسے موقعوں پر حمید کو اپنی بیوی شدت سے یاد آتی تھی یا بیوی کی طرح کوئی اور ملاح - جس کو وہ بتلا سکتا کہ اس نے جلسہ میں کس قدر زور دار تقریر کی ہے۔

بی بی کو اپنے گئے تین ہفتے ہو چکے تھے گھر پر اسکی دوسراتو کے لئے محض سلیم تھا جو کھانا بھی پکاتا ـــــ شام ہو گئی تھی نہا دھو کر حمید باہر آیا اور بید کی کرسی چبوترے پر کھینچ کر اپنے موٹے جسم کو اس میں گرا دیا ـ وہ ابھی تک میٹنگ کے متعلق سوچ میں اتنا ڈوبا ہوا تھا کہ اسے ان سائیکل رکشا والوں کی موجودگی کا بھی احساس نہیں ہوا جو سامنے کھڑے اپنی رکشاؤں کے لیمپ صاف کرتے گپیں ہانکتے اور سڑک پر سے گزرنے والی نوجوان لڑکیوں پر فقرے کسنے میں مشغول تھے۔ مہریاں ان کی باتیں سن کر لجاتی ہوئی آگے بڑھ جاتی تھیں۔ جب کوئی فقرہ حمید کے کانوں تک پہنچتا تو وہ بھی دفعتاً چوکنا ہو جاتا اور ایک عجیب سے خوف سے لرزنے لگتا۔ یہ لوگ کتنے لچر، کتنے غلیظ ہیں۔ اسے ان لوگوں سے نفرت تھی۔ اسے اپنے آپ سے نفرت تھی کہ اس نے پچھلے ہفتہ اپنی سیاسی جماعت کی میٹنگ میں ان غنڈوں کو آزادی کے مجاہدین کے نام سے پکارا تھا۔ صدر سوکارنو نے ایک مرتبہ ان بدمعاشوں کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے کیوں ملائے تھے؟ صدر سوکارنو ان لوگوں سے کتنے واقف تھے؟ صدر مملکت کے محل اور بستی کے جھونپڑوں کے درمیان بہت بڑا فاصلہ ہے، لیکن وہ خود حمید ان کو خوب جانتا تھا۔ یہ لوگ اس کے گھر کے پچھواڑے رہتے تھے۔

سورج ڈوب گیا۔ شام کی نوبت بجی۔ حمید نے روشنی جلا کر جلدی جلدی وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اللہ اکبر ـــ اللہ اکبر! سلام پھیرنے کے بعد اس نے بے دلی سے تھوڑا سا کھانا زہر مار کیا۔ سلیم کی طباخی سے وہ عاجز آ چکا تھا۔ تلی ہوئی سیم کے لڈو ـــ روز ہی تلی ہوئی سیم کے لڈو ـــ
پھر اس نے ایک امریکن سگریٹ سلگایا اور دھوئیں کے مرغولے بنانے میں مصروف ہو گیا۔

بی بی کے چلے جانے سے گھر بڑا بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ حمید باتوں کا شوقین تھا۔ شام کے وقت آرام سے پاؤں پسار کر گپیں ہانکنے میں اسے بڑا مزا آتا تھا۔ اس وجہ سے تنہائی اسے بہت کھلتی تھی۔ ہفتہ بھر پہلے تک اس تنہائی کا مداوا کرنے کے لئے وہ دفتر کی کار میں بیٹھ کر کسی دوست کے وہاں جا پہنچتا اور جب تک پٹرول ختم نہ ہو جاتا سارے شہر کا چکر لگاتا پھرتا۔

لیکن کار ایک حادثہ میں ٹوٹ گئی تھی اور اب اسے گھر ہی میں قید تنہائی بھگتنا پڑ رہی تھی۔ اکثر وہ سلیم کو باتیں کرنے کے لئے بلا لیتا۔ مگر سلیم خود ایک نمبر کا باتونی آدمی۔ وہ حمید کو ایک لفظ بھی نہ بولنے دے۔ اور بعض دفعہ وہ آقا و خادم کے حدود کو اس طرح پھلانگ جاتا گویا وہ حمید سے ہم کلام نہیں جو اسے تنخواہ اور دو وقت کا کھانا دیتا ہے۔ بلکہ اپنے دوست عبدل یا اپنے چھوٹے بھائی اوٹنگ یا اپنی محبوبہ اوما سے باتیں کر رہا ہے۔

مزید برآں، سلیم نارمل ٹیچ دور کا آجکل کے زمانے سے موازنہ
کرنے کا بہت شوقین تھا۔ اور مسلسل یہی ٹرٹراتا رہتا کہ پہلے زمانے
میں وہ اچھے سے اچھا کھا اور پہن سکتا تھا۔ اور اپنی محبوبہ کے ساتھ
ہر شے پکچر دیکھنے جاتا تھا۔ حمید اسے مقدس قومی جدوجہد کا غدار
تصور کرتا تھا۔ اور اسے سلیم پر اس وجہ سے رحم آتا کہ وہ اس لئے
اپنے گاؤں واپس نہیں جاسکتا دارالسلام کے لیڈر کارتوس ویرجو
کا اس پر قبضہ تھا ورنہ اس نے سلیم کو کب کا اپنے گھر سے نکال
باہر کیا ہوتا۔

اب کیا کیا جائے؟ جب سے اوورٹائم کا قانون سینئر سرکاری
افسروں پر لاگو ہوا تھا، حمید دفتر کے فائل بھی گھر نہیں لا سکتا تھا۔
دفتر کے اوقات کے بعد شام تک دفتر میں کام کرنا زیادہ فائدہ مند
چیز تھی۔ اخباروں اور بالتصویر رسالوں کے علاوہ حمید کو کچھ پڑھنے
سے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ وہ صحافی یا مصنف تو تھا نہیں کہ مضمون
یا کتاب لکھنے کی غرض سے گھر پر مطالعہ کرے۔

"آج آپ باہر نہیں جا رہے؟" سلیم نے دریافت
کیا۔ حمید خاموش رہا۔

ڈچ حکومت کے زمانے میں حمید محض سکنڈ گریڈ کلرک
تھا۔ آج وہ "سی" درجہ کا افسر بن چکا تھا۔ اس کی سیاسی سرگرمیوں
ہی نے اسے اس عہدے پر پہنچایا۔ اس کی پارٹی کے منسٹر کابینہ
میں شامل ہوتے ہی اس کا تقرر اس عہدے پر کر دیا تھا اور یہ خوش
خبری سننے کے بعد حمید نے لوار باتنگ کی درگاہ پر جا کر چڑھاوا
چڑھایا تھا اور شیخ عبدالمحی کے مزار پر فاتحہ پڑھی تھی اور [illegible]
کے بعد مقدس توپ "جاگر" سے لپٹا تھا۔ یہ توپ ایک جنگ میں
پرتگالیوں سے چھینی گئی تھی۔ اور اسی روز رات کو اس نے اپنے مکان
پر منسٹر کو دعوت کھلائی تھی۔

حمید کے دوستوں کا کہنا تھا کہ اس کی تقریریں بڑے کمال کی
ہوتی تھیں اور دوستوں ہی کو نہیں خود حمید کو بھی اپنی تقریریں
سننا بہت اچھا لگتا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ ممی کے سامنے
اس بات کا اعتراف بھی کیا تھا اور ممی نے کہا تھا ——
"آپ تو اپنی اسپیچ سن کر خوش ہوتے ہی ہیں۔ مگر میری خوشی کا
تو آپ اندازہ ہی نہیں لگا سکتے۔" اس جواب پر حمید کھل اٹھا تھا
اور اس کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو آ گئے تھے۔

آج شام بھی حسب معمول حمید اپنی تقریر کے متعلق
سوچ سوچ کر خوش ہو رہا تھا۔ اسے اس وقت بھی اپنی آواز
سنائی دے رہی تھی کس طرح اس نے اسٹیج پر گھوم گھوم
کے، ہاتھ ہلا ہلا کے بھاشن دیا تھا۔ اس کی تقریر آج خاص طور
پر پسند کی گئی تھی۔ آج اس نے "جلی دنگ تہذیب" کے پرخچے
اڑا دئے تھے۔ یہ تہذیب جکارتا کے اس طبقہ میں رائج تھی جس
کے افراد گارڈن، ہال، ہوٹل ڈی اینڈی اور رائر پورٹ پر
جا کر مغربی رقص کرنے اور اسی قسم کی دوسری باتوں کے رسیا تھے۔
اس تقریر پر قیامت کی تالیاں بجیں۔

لہٰذا ان سب باتوں سے ثابت ہوا، اس نے کہا تھا، کہ
انڈونیزین معاشرہ مغربی تہذیب کے جارحانہ حملے کے زیر اثر
کیرکٹر کرائسس میں مبتلا ہے۔ اس تہذیبی حملے کے علمبردار ولندیزی
ہیں جو انڈونیزیا کو دوبارہ اپنی نوآبادی بنانا چاہتے ہیں اور اپنے
خوشامدی ٹٹوؤں کی اعانت کے ذریعہ ہائی اسکولوں اور یونیورسٹی
میں ڈچ زبان باقی رکھنے کے خواہش مند ہیں۔ اس حملے سے
مدافعت ضروری ہے کیونکہ اس کی وجہ سے قومی کردار تباہ
ہو رہا ہے۔ مغربی رقص سوئمنگ۔ حکومت نے جو آنکھو توئی
کہتی تھی اور "نیچ شیل" کے فلسفہ پر کاربند تھی، اس اندھیر کی
اجازت دے رکھی تھی۔ اسکولوں میں لڑکے لڑکیاں اکٹھے پڑھ
رہے تھے اور کھیل کے میدان میں اچھلتے کودتے پھاندتے تھے
کیا یہ باتیں مشرقی تہذیب کے خلاف نہیں تھیں؟ قوم کدھر
جا رہی تھی؟ کیا سابقہ سامراجی حکومت کے مانند قومی حکومت
بھی یہ چاہتی ہے کہ ہم صراط مستقیم سے بھٹک جائیں؟ کیا
اسی لئے ہمارے ملک نے قربانیاں دی تھیں؟ جنگ کی
تھی؟ کیا ہمارے سپوت اسی لئے شہید ہوئے تھے؟

اچانک حمید کرسی سے اچھل پڑا۔ وہ زیادہ دیر تک
اکیلا یا خاموش اب نہ بیٹھ سکتا تھا۔ اسے خیال آیا کہ حکومت
پر اعتراض کرنا غیر وفاداری ہوگی کیونکہ اس کی پارٹی بھی اس حکومت
میں شامل تھی۔ اس نے جلدی سے اپنے کمرے میں جا کر کپڑے
بدلے لیکن چلتے وقت [illegible]۔

"سلیم میں باہر جا رہا ہوں۔ کوارٹر بھیڑ لینا، یہ مت سمجھو میں چلا گیا ہوں اور تم چپکے سے اوما کے گھر کھسک جاؤ۔"

اس وقت پونے آٹھ بجے تھے، باہر آ کر وہ ایک سائیکل رکشا میں بیٹھ گیا۔

"چلو"

"کدھر صاحب؟" رکشا والے نے اپنے ساتھی سے بیڑی مانگتے ہوئے سوال کیا۔

"جہاں چاہو"

رکشا والا متعجب نظر آیا۔

"چلو ——— اچھا تانا انگ چلو ———"

"بہت اچھا صاحب"

رکشا والا اچک کر سیٹ پر بیٹھا اور تیزی سے پیڈل چلانے لگا: اریل کے تیوں سے بنی ہوئی بیڑی اس کے دانتوں میں کرڈلی۔

"موج کرنے نکلا ہے صاحب!"

حمید نے سنی ان سنی کر دی۔ کچھ توقف کے بعد اس نے کہا

"میں ذرا سا گھماناچاہتا ہوں۔ تاتا انگ کا سڑک بہت دلوں سے نہیں کھایا ہے!"

امات بڑی مہارت کے ساتھ رکشا کو گاڑیوں کے بھیڑ بھڑکے سے نکالتا آگے بڑھتا گیا۔ ہر دفعہ جب ٹکر ہوتے ہوتے بچتی، حمید زور سے چلاتا ——— مگر امات کہتا ——— "تجربہ ——— صاحب ——— چنتا نہ کرو ——— دس سال سے رکشا چلا رہا ہوں دفتر میں ہوتا تو اب تک افسر بن گیا ہوتا"۔ ایک نسبتاً خاموش سڑک پر پہنچ کر اس نے موضوع پر مزید روشنی ڈالی۔ "آج تک ایک ایکسیڈنٹ نہیں کیا صاحب! میں دوسرے چھچھورے رکشا والوں کی طرح نہیں ہوں۔ وہ اتنے دھیان سے رکشا نہیں چلاتے۔ ذرا سی بات میں گھبرا جاتے ہیں۔ اسی لئے ایکسیڈنٹ کرتے ہیں روز۔ ابھی دیکھ لیجئے، کس مزے سے آپ کو بزریا میں سے نکال لایا۔ ایک دفعہ بسم اللہ پڑھ لی بس بیڑا پار ہے۔"

اور اب کے رکشا یکبارگی اس زور سے ایک طرف کو مڑی کہ حمید کی ٹوپی سر پر سے کھسک گئی اور وہ پائیدان میں کو لڑھک لڑھک گیا۔

"گدھے کہیں کے۔ کیا جان سے مارنے کا ارادہ ہے؟"

اس نے دھاڑ کر کہا۔

"تجربہ صاحب ——— تجربہ ——— چنتا نہ کرو ———"

کچھ دیر دونوں خاموش رہے پھر امات نے کہا۔

"میں بیگم صاحب کو بہت دنوں سے بازار نہیں لے گیا، کہیں باہر گئی ہوئی ہیں صاحب؟"

"بند تگ گئی ہیں"۔ حمید نے ترشی سے جواب دیا۔

"بند تگ گئی ہیں صاحب؟"

"پھر امات سیکل پر سے اتر کر رکشا کو چڑھائی پر ڈھکیلنے لگا۔ اب وہ بری طرح ہانپ رہا تھا لیکن اتار پر آتے ہی اس نے باتیں شروع کر دیں۔

"صاحب تانا انگ میں ایک ——— وہ ——— ہے۔ میں اسے جانتا ہوں۔

"وہ کون ہے؟"

"نئی نئی مسکا بوتی سے آئی ہے۔ فرسٹ کلاس چیز ہے ——— ایک دم نمبر ون ——— ابھی ابھی بیوہ ہوئی ہے۔ اور یہ جوان بیوائیں، تو آپ جانو ———"

طیش میں آ کر حمید زور سے چلایا ——— "تم مجھے کیا سمجھتے ہو ———؟"

امات اس ڈانٹ سے ذرا شرمندہ ہو گیا۔ شاید اس نے غلط اندازہ لگایا تھا۔ یہ مچھلی آسانی سے نہیں پھنسنے کی۔ اس نے طے کر لیا کہ اب چپکے رہنا ہی بہتر ہے۔

نکڑ پر سنیما ہاؤس کے قریب اتر کر حمید نے ڈھائی روپے امات کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

"یا اللہ ——— صرف ڈھائی روپے! میں رکشا چلاتے چلاتے ادھ موا ہو گیا اور مجھے ڈھائی روپلی دیتے ہیں۔ واہ - واہ ——— کچھ اور تو دیجئے ———"

حمید نے اس کا مزید نوٹس نہیں لیا اور ہجوم میں گھس گیا۔ امات کی اونچی آواز اور تحقیر آمیز جملے اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ "اگر جیب میں دام نہیں ہیں تو سواری میں کیوں بیٹھتے ہو ——— چلے ہیں وہاں سے سیر کرنے ——— دنیا بھر بے شرم ———" لوگوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔

ہمیشہ کی طرح تانا بنگ میں کھوئے سے کھوا چھل رہا تھا۔ انسانوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ بے چین چیونٹیوں کی مانند سائے میں سرسرا رہے تھے۔ دکان دار فٹ پاتھ پر دریاں بچھا کر کپڑوں کے تھان، ریڈی میڈ ملبوسات، چائے دانیاں اور پیالیاں، دوائیں، کنگھیاں، پنیں اور دوسرا آئم غلم بکری کے لئے سجانے میں منہمک تھے۔ ان کے سامان کے اوپر گیس کے ہنڈے سنسناتے تھے۔ بساتی اور پھیری والے چلانے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ادھر آیئے مہربان ——— یہ لیجئے گا بابو صاحب ——— میم صاحب ——— ادھر ——— کیا چاہیئے میڈم ——— ؟

چیختے چیختے ان کا گلا بیٹھ جاتا اور وہ پسینے پسینے ہو جاتے تو میگا فونوں میں منہ ڈال کر دھاڑنا شروع کر دیتے۔ قہوہ کی دکانوں اور ریسٹورانوں میں ریڈیو پوری آواز سے بج رہے تھے۔ یہاں بھی اپت ساری مانا ایک سوڈانی گانا گا رہی تھی ادھر دمین گیرون جانگ مریکا الاپنے میں مصروف تھیں۔ ایک اور ریڈیو پر تقریر ہو رہی تھی، اس کے چند الفاظ نے حمید کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ موضوع اس کا پسندیدہ تھا قومی کردار کر ائسس اور مقرر کوئی خاتون تھیں۔ ان کی آواز اجنبی تھی۔ مگر حمید کو ان سے لفظ بہ لفظ اتفاق تھا۔ اکثر وہ سر ہلا کر مسکرا دیتا، وہ پوری تقریر سننا چاہتا تھا۔ مگر مجمع اسے مستقل آگے کی طرف دھکیل رہا تھا۔ قریب ہی ایک رائس ہاؤس میں بکری کے گوشت کے ساٹے کا اشتہار لگا تھا۔ اندر جا کر جب اس نے بیس ٹکڑوں کا آرڈر دیا تو معلوم ہوا خوش قسمتی سے اس خاتون کی آواز یہاں کے ریڈیو پر بھی آ رہی تھی، وہ سر ہلا ہلا کر مسکراتے ہوئے کھانا کھاتا رہا اور پھر باہر آ کر انسانوں کے سمندر میں دوبارہ بہنے لگا۔ تنہائی میں وہ عموماً ناخوش رہتا تھا۔ مگر اس وقت آس پاس کی چہل پہل میں اسے محسوس ہوا کہ ماحول کی اس پوری کیفیت کو وہ تنہا ہی اپنے اندر جذب کر سکتا تھا۔

یہ عوامی زندگی کا اکھاڑہ تھا۔ یہ ناریل کے پتوں کی بیڑیاں پیتے ہوئے مرد اور ناریل کے تیل میں چپڑے ہوئے بالوں کے جوڑے باندھے عورتیں۔ فرانسیسی عطریات اور ہوانا کے سگاروں کی دنیا سے بہت دور ——— یہ دنیا معصوم اور پاکیزہ تھی۔ تصنع نے کبھی اسے تباہ نہ کیا تھا۔ حمید نے خاص طور پر نظر دوڑائی مگر گارڈن ہال اور ہوٹل ڈی انیڈی میں رقص کرنے والی نیم عریاں عورتیں اسے دکھائی نہ دیں۔ اس چیز کا وہ خصوصیت کے ساتھ اپنی تیز نگاہوں سے جائزہ لیتا رہا کہ جھونپڑوں اور گندی گلیوں کے باسی یہ مرد اور عورتیں منظر عام پر ایک دوسرے سے بے تکلفی نہیں برت رہے تھے۔

حمید بساطیوں کی آوازیں اور دوا فروشوں کی لچھے دار تقریریں سنتا رہا۔ اور سوچا کہ فن خطابت میں تو پریسیڈنٹ سوکارنو بھی ان لوگوں سے بازی نہیں لے جا سکتے۔ اپنی اس صلاحیت کو یہ لوگ بنگ کارنو کی طرح یا خود اس کی طرح لیڈری کے لئے کیوں نہیں استعمال کرتے؟

پھر دفعتاً اسے خیال آیا کہ اگر وہ اپنے فن تقریر کو دوا فروشی کے لئے استعمال کرے تو زیادہ فائدہ میں رہے گا۔ جلد ہی دوسرا خیال اس کے ذہن میں آیا۔ بازاری دوا فروش کا رتبہ سبزی فروش سے زیادہ نہیں ہوتا دنیا کے عظیم ترین بازاری دوا فروش کیلئے بھی کوئی جرنلسٹ گھنٹوں بیٹھ کر انٹرویو کا انتظار نہ کرے گا جیسا کہ دس روز قبل حمید کے انٹرویو کے لئے انتظار کھینچا گیا تھا۔

ہجوم نے اس چوک کی طرف دھکا دے دیا۔ یہاں دھندلی روشنی میں مرد اور عورتیں شور مچا مچا کر ناچ رہے تھے۔ ان کے وسط میں تین بتیوں والی مٹی کے تیل کی لالٹین ایک بانس پر آویزاں تھی۔ ڈرم پیٹا جا رہا تھا۔ بانسری بج رہی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد گھنٹہ بجتا اور ایک عورت جس کی آواز اب بالکل بیٹھ چکی تھی بے تکان گائے جا رہی تھی۔

ایک لمبے آدمی کے پیچھے سے اچک کر اس نے چوک میں جھانکا سامنے پانچ "شیکسی گرلس" تماشے میں مصروف تھیں، تین جن کو ابھی پارٹنر نہیں ملے تھے۔ بینڈ والوں کے سامنے کھڑی تھیں اور ان کا رخ مجمع کی طرف تھا۔

باری باری یہ لڑکیاں بیہودہ گانے گاتیں۔ سب بہت کمسن تھیں۔ ان میں چند ایک تو تیرہ چودہ سال کی رہی ہوں گی انہوں نے

نے مصنوعی ریشم کے سبز، زرد اور سرخ "بیڈل اسپر" پہن رکھے تھے کانچ کے ہار اور چوڑیاں، گھرارا وڈر، چند ملکی لباس بھی پہنے ہوئے تھیں۔ ایک پرزور دھکے سے وہ لمبے آدمی سے باہر نکل گیا۔ اب سارا منظر اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ اب بقیہ لڑکیوں کو بھی پارٹنر مل گئے تھے گانا اور ناچ زیادہ جوشیلا ہو گیا۔

حمید تماشائیوں کا بھیڑ چیرتا بالکل سامنے پہنچ گیا۔ یکبارگی اس نے دیکھا کہ ایک پارٹنر نے اپنی ہم رقص کے ہونٹوں پر پیار کر لیا۔ حمید آگ بگولہ ہو گیا۔ بے ننگے —— آوارہ۔ کمینے کمبخت —— اس نے دل میں کہا۔ لیکن اب اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اس رقصاں جوڑے کو دیکھتا رہا۔ ایک عجیب وغریب جذبہ اس کے اندر امنڈتا شروع ہوا۔ بڑی مشکل سے اپنے غصہ پر قابو پایا۔

اسی وقت اسے محسوس ہوا کہ کوئی اسے پیچھے سے دھکا دے رہا ہے۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ ایک لڑکی اس کے بالکل قریب کھڑی تھی۔ لڑکی کے بالوں میں اٹکے ہوئے چمپا کے پھول اور سستے پوڈر کی تیز مہک نے اس کے طیش کو اور ہوا دی۔ لڑکی بہت خوبصورت تھی اور نوجوان —— اور اس کی ناک اوپر کو اٹھی تھی۔ ہونٹ سرخ تھے اور آنکھیں بے حد کالی اور جھلملاتی ہوئی۔ نظریں ملتے ہی وہ مسکرائی حمید کا دل اور زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لڑکی اب بھی اسے دھکا دیئے جا رہی تھی۔ حمید کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ لیکن اس کے دل کی دھڑکن بھی بہت بڑھ چکی تھی۔ یکلخت اس نے لڑکی کو پکڑ لیا اور بجلی کی ایسی رو اس کے سراپا میں کوند گئی۔ لڑکی کا ہاتھ تھام کر وہ رقصاں جوڑوں کو تکنے لگا جو لہو ولعب اور فسق وفجور میں اسی طرح مبتلا تھے۔ چند لمحوں بعد لڑکی نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ورآہستہ سے کہا۔

"آیئے —— !"

وہ ایک تنگ اندھیری گلی میں داخل ہوئے۔ یہاں پہونچ کر حمید نے لڑکی کو اور زیادہ مضبوطی سے پکڑ لیا اور لڑکی نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ "یہاں نہیں صاحب —— یہاں نہیں —— وہ کہے گئی۔

دفعتاً حمید کو ہوش آیا۔ لڑکی نے جھک کر اس کی ٹوپی زمین پر سے اٹھالی جو نیچے گر چکی تھی۔ وہ خاموشی سے راستہ طے کرتے رہے۔

"تفریح کر رہے ہیں مولینا ——" ایک آدمی کی آواز آئی۔ حمید نے جلدی سے لڑکی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کی جان سن سے نکل گئی۔ ایک خستہ حال پھونس کے مکان کے دروازے پر جلتی ہوئی سرخ لالٹین کی روشنی میں وہ بے حد زرد نظر آ رہا تھا۔ کیونکہ یہ آواز سنوسی جرنلسٹ کی تھی جس نے کریکٹر کرائسس کے متعلق اس کا انٹرویو کیا تھا۔ حمید کو چکر سا آ گیا۔ لڑکی نے اس کی آستین پکڑ کر کھینچی "چلئے صاحب آگے چلئے ——"

"نہیں —— بڑا افسوس ہے —— معاف کرنا —— میں ——" اس نے گھبرا کر بیس روپے کا نوٹ لڑکی کے ہاتھ میں ٹھونس دیئے۔ لڑکی بہت متحیر ہوئی۔ پھر اس نے تمسخر سے کہا۔ "صاحب بڑا فضول خرچ ہے گھریلو بجٹ میں کمی تو نہیں پڑے گی؟" پھر اس نے تیز آواز میں قہقہہ لگایا۔ اس کی یہ ہنسی چھری کی طرح حمید کے دل میں اتر گئی —— ایک اعلیٰ افسر —— مقبول لیڈر کے گھریلو بجٹ میں کمی —— ؟ اس گستاخی اور دیدہ دلیری کی حد نہیں! حمید کو بے حد تاؤ آیا۔ اس نے بیس کا نوٹ چھین کر پچاس روپے کا نوٹ لڑکی کے منہ پر دے مارا۔

"خفا کیوں ہوتے ہو صاحب؟" لڑکی نے جھک کر زمین پر سے نوٹ اٹھاتے ہوئے کہا، نوٹ کا سائز دیکھ کر وہ پھر ہنسی۔

لیکن حمید سنوسی کے تعاقب میں آگے جا چکا تھا

"تم نے اسپورٹس شرٹ اور گرے پتلون میں کوئی آدمی تو نہیں دیکھا ——؟" اس نے ایک شخص سے پوچھا جو ایک جھونپڑے کے سامنے چاول ابال رہا تھا۔ دروازے پر سبز لالٹین جل رہی تھی۔

"ابھی اسی گلی میں گیا ہے ——" جواب ملا۔

"شکریہ ——" حمید تیزی سے آگے بڑھا۔ چند قدم جا کر اسے سنوسی ایک سرخ لالٹین والی جھونپڑی میں داخل

پھر تاؤ کھائی پڑا حمید کی آواز پر وہ چونک کر مڑا۔

"اوہ ـــــ حمید نے ہکلا کر کہا "کسی سے کہنا نہیں بھائی جان ـــــ اپنے کالم میں اس کا ذکر نہ کر دینا ـــــ"

سنوسی نے ایک زور دار قہقہہ لگایا۔ "میں تو کچھ بھی نہیں ـــ میں ـــــ تو ـــ"

سنوسی کا قہقہہ بلند ہوتا گیا۔ پھر وہ کھنکارا۔ اس کی ہنسی میں بڑی مفاہمت پنہاں تھی۔ اس کا یہ انداز دیکھ کر حمید کے چھکے چھوٹ گئے۔ سنوسی اس طرح کیوں ہنس رہا تھا؟ سٹھیا گیا تھا کیا؟

"فکر نہ کیجئے مولینا ـــ میں خیال رکھوں گا۔"

"شکریہ شکریہ ـــ" حمید کی جان میں جان آئی اور وہ اندر جانے کے لئے پلٹا۔

"ذرا ایک منٹ مولینا ـــــ یہ معاملہ تو مجھ پر چھوڑیئے مگر ذرا ایک بات ہے ـــ آپ جانتے ہی ہیں بھئی میں اور آپ اس قصہ کو ایک طرح نپٹا سکتے ہیں۔ سنوسی نے کندھے اچکا کر کہا۔

سور کا بچہ، بدمعاش، حمید نے سوچا۔ پھر اس نے جیب سے ایک اور پچاس روپے کا نوٹ نکال کر سنوسی کی مٹھی میں ٹھونس دیا۔ سنوسی نے سرخ بتی کی روشنی میں نوٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھا پھر وہ بھی بڑے استہزا سے ہنسا۔

"پچاس روپے ـــــ ہاہا ـــــ!"

اس کی اسپورٹس شرٹ اس کے قہقہہ کے ساتھ ہلنے لگی ـــــ کمینہ، الو کا پٹھا ـــــ جرنلسٹ ـــــ حمید نے ایک اور اور نوٹ بٹوہ سے کھینچا۔ اب کی مرتبہ بھی اسے جواب میں قہقہہ ہی سننے کو ملا ـــ" ہاہا۔ دس اور ـــ اتنے بڑے سرکاری افسر۔"

اب حمید اس قدر برافروختہ تھا کہ اس نے مطلق پرواہ نہیں کی۔ جہنم میں جائے، اپنے کالم میں جو چاہے لکھے۔ میں کسی کے باپ سے نہیں ڈرتا۔ وہ سنوسی کی چپٹی ناک پر گھونسا رسید کرنا چاہتا تھا۔ مگر طرح دے گیا اور الٹے قدموں لوٹا۔ سنوسی ابھی تک دونوں نوٹ ہاتھ میں تھامے بے تحاشا ہنسے جا رہا تھا۔

مبلغ ساٹھ روپے نقد ـــــ سنوسی خود سے کہہ رہا تھا۔ اللہ میاں جب دیتے ہیں چھپر پھاڑ کر دیتے ہیں۔ من و سلویٰ۔ دو منٹ میں ۶۰ روپے قلم کی ایک جنبش کے بغیر ـــــ اللہ کی شان ہے ـــــ" مسکراتے ہوئے وہ جھونپڑے کے اندر چلا گیا۔

سڑک پر آکر حمید ایک سائیکل رکشا میں بیٹھ گیا۔

"کھیانگ اسٹریٹ چلو۔"

وہ ابھی تک بہت مضطرب تھا۔ وہ منظر کسی طرح اس کے ذہن سے محو نہ ہوتا تھا۔ رقصاں جوڑے۔ نہ لڑکی، سنوسی ـــ سنوسی ذلیل کتا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ سنوسی کو جان سے مار ڈالے۔ لیکن خوف نے غصہ پر غلبہ پایا۔ اسے ڈر تھا کہ قومی کردار کی کرائسس کے اس زمانے میں عین ممکن ہے کہ سنوسی اپنے کالم میں یہ سارا واقعہ لکھ مارے۔ کیوں کہ اس کے قہقہوں سے حمید نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اس نے بالفعل جرنلسٹ کو اچھی طرح رشوت نہیں دی تھی۔ اپنی بے چارگی کا خیال کر کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یکایک اس نے سوچا کہ سکوتو سے مدد لے۔ سکوتو ٹریڈنگ قسم کا سارجنٹ منیجر تھا اور پہلے گوریلا سپاہی رہ چکا تھا۔ وہ ضرور اس کی مدد کرے گا۔ سو روپے دے کر آسانی سے سکوتو کی اعانت حاصل کی جا سکتی ہے اگر ضرورت پڑی تو سنوسی کو اس کے ذریعہ دھمکایا بھی جا سکتا ہے۔

حمید کو فوراً اطمینان محسوس ہوا۔ ایک لیڈر، ایک اعلیٰ افسر اور ایک بلند کردار کے انسان کی حیثیت سے اس کی عزت اب محفوظ رہ سکے گی ـــــ رکشا اس کے گھر کے سامنے جا کر رکی۔ اس وقت رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ باہر والے کمرے میں اب تک روشنی کیوں جل رہی تھی؟ کیا سلیم اب تک جگ جگ رہا تھا۔

حمید نے کواڑ کھٹکھٹایا سلیم ـــ سلیم۔ دروازہ کھولو ـــــ دروازہ فوراً کھل گیا ـــ ممی جی! ارے ممی جی تم کب آئیں؟

اپنی شدید گھبراہٹ میں اس نے پائیدان پر جوتوں کو اس طرح رگڑنا شروع کیا گویا وہ کیچڑ میں لت پت تھے۔

بقیہ صفحہ ۶۱۴ پر

عبدالصمد

پرانا قانون

وہ پہاڑوں، دریاؤں، ہواؤں اور فضاؤں کی گود میں کھیلا اور وسیع زمین اور کھلے آسمان کے سائے میں پروان چڑھا ہوا ایک بہت ہی خوبصورت، پھل پتیوں سے آلودہ سبزہ زار تھا جس پر شاید کسی کی نگاہ نہیں پڑی تھی کہ اس کی خوبصورتی جوں کا توں تھی، کسی کے قدم نہیں آئے تھے کہ اس کے کنوارپن کی خوشبو چاروں طرف اٹھلاتی پھرتی تھی لیکن کھونٹ کھونٹ گھومنے والے اور ہواؤں کے سونے پن کو جان کر اپنا سمت مقرر کرنے والے ایک چرواہے نے بے سمتی کا شکار ہو کر اس جگہ کو دریافت کر لیا اور اس کی خوبصورتی میں، چاروں طرف بھینسوں کے کالے کالے دھبّے پھیلا کر، درختوں چھاؤں میں بیٹھ کر چین کی بانسری یوں بجانے لگا جیسے بانسری کی لے پر ہی دنیا کے نشیب و فراز طے ہوتے ہیں اور اپنی دھنوں پر زندگی اور موت کے رقص شروع اور ختم ہوتے ہیں۔

یوں تو ہوا ہے کہ دریافت کرنے والے کا جھنڈا سر بلند رہا ہے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہاں پر صرف وہی پھلا پھولا ہے کیونکہ اب تک کوئی ایسا قانون ایجاد نہیں ہوا جس نے کسی کو زمین کے ایک چپہ کا بھی مالک بنا دیا ہو۔ چنانچہ جب دوسرے چرواہے کو اس سبزہ زار کی خبر ملی تو وہ بھی خوشی سے پھولا نہ سمایا اور اپنی بھینسوں کو اسی رخ پر ہانکنے لگا۔ ان کے درمیان سبزہ زار کی خبر پر خوشیاں منانا عین اس امر کا نتیجہ تھا کہ دقت میں سبزہ زاروں کا قحط پڑ چکا تھا۔ ڈھونڈنے پر دیکھنے کو ایک پتہ نہ ملتا تھا اور پتے کے نام پر خشک تڑی مڑی اور کھڑکھڑاتی ہوئی چیزیں لگتی تھیں، وہ لمس پاکر ریت جیسی بکھر جاتی تھیں کہ ان کا کوئی مصرف باقی نہیں رہ جاتا تھا۔ بھینسوں کو سبز چشمہ پہنا کر بھی انھیں دکھایا جاتا تو بھینسیں انھیں منہ نہیں لگاتی تھیں۔ اور سونگھ سونگھ کر، پھونک پھونک کر انھیں اڑا دیتی تھیں، ایسے میں سبزہ زاروں کی خبروں سے خوشیوں کی سرخیاں نچوڑنا بالکل فطری بات تھی۔ خوشیاں منانا اور سبزہ زاروں سے لطف اندوز ہونا بھی عین فطری بات تھی۔

پہلے نے دوسرے کو دیکھا تو خوش نہیں ہوا لیکن کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا سوائے اس کے کہ اپنے اندر کو اندر ہی قید رکھے اور باہر کو باہر۔ لیکن بھینسیں، دوسری بھینسوں کو دیکھ کر بدکنے لگیں۔ کیونکہ ان کے پاس اندر باہر کو تقسیم کرنے کی کوئی روایت کہیں پر موجود نہیں تھی۔ ان کے ہاں جو اندر تھی وہی باہر تھا اور جو باہر تھا وہی اندر۔ چنانچہ انھیں اپنی ہی جیسی دوسری بھینسوں کو دیکھ کر جو خوشی نہیں ہوئی اس کا انھوں نے برملا اظہار بھی کیا۔ دیر تک غرا غرا کے سینگیں بھی لڑائیں لیکن پھر آپس میں مل کر یوں شیر و شکر ہو گئیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ یہاں تک کہ جب سورج سوا نیزے پر ٹھہر کر ٹھنڈی ٹھنڈی مسکراہٹیں بکھیرنے لگا اور چرواہوں کو واپسی کے لئے اپنی اپنی بھینسوں کی فوج کی تشکیل کی ضرورت پیش آئی تو انھیں خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ بھینسیں آپس میں یوں مل گئی تھیں کہ ان کی اپنی پہچان تو مٹ ہی گئی،

تھی جن ہاتھوں میں ان کی تکمیل تھی وہ بھی ان کی پہچان بھلا چکے تھے لیکن یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے کہ کوئی کلیسا بن کر ذہنوں میں ایسا بیٹھ جائے کہ آنے والی نسلیں تک اس سے روشنی حاصل کر سکیں، نہیں تو پھر بھینس اور چرواہے میں فرق ہی کیا رہ جاتا۔ یہ معلوم کرنا بھی ممکن نہ تھا کہ کس کی تکمیل کس کے ہاتھوں میں ہے، اور کون کسے کس رخ کو ہانک رہا ہے۔ بارے بھینسوں کی تقسیم ہوئی اور چرواہوں نے انھیں اپنے اپنے رخ پر ہانک لیا۔

بھینسوں کا یہ عمل لائق تحسین تھا کہ وہ اپنے مالکوں کے تیور پہچان کر ہوشیار ہو جائیں اور اس کے بتائے ہوئے سمت کو بے چوں چراں اختیار کر لیں۔ انھیں اپنے مالکوں کی آوازوں، سیٹیوں اور ہنکار کی یوں پرکھ تھی کہ وہ ہزاروں لاکھوں میں بھی انھیں پہچان ہی لیتیں۔ چرواہے کوئی انھیں آواز دے، سیٹی بجا بجا کر بلائے، یا کتنے ہی پیار سے ہنکارے، اس معاملے میں وہ اپنے مالکوں سے پوری پوری وفاداری کا ثبوت دیتیں اور ہر حال میں ثابت قدم رہتیں۔ ایک چرواہے کی بھینسیں دوسری سے مل کر ہزار شیر و شکر ہو جائیں، چرواہے اس سلسلے میں بے پروا اور مطمئن رہتے اور سارا دن آپس میں بیڑیاں پی کر، بانسری بجا کر، کبڈی کھیل کر، دوڑ لگا کر، پہاڑیوں میں کود کر اور ندی میں نہا کر وقت کو برتتے رہتے اور شام کو اپنی اپنی بھینسوں کو اپنی اپنی سمتوں میں ہانک کر شان کے ساتھ یوں سدھارتے جیسے کوئی فاتح میدان جنگ سے اپنی فوجوں کو فتح کے نشے میں سرشار ہو کر لوٹتا ہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہتا یہاں تک کہ وہ اختتام کو پہنچ جائے اگر ان کے درمیان ایک ایسا شخص نہیں کودتا جس کے پیچھے نہ بھینسیں تھیں اور نہ کوئی ایسی چیز ہی جو اس کے پیچھے یا آگے سر جھکا کر بے چوں چراں چل سکتیں۔ اس کے ہاتھوں میں ایک لاٹھی ضرور تھی لیکن اسی وقت نظر آتی تھی جب نظر میں بہت کچھ تلاش کر کے تھک جاتیں۔ بھینسوں کو اس بات سے لینا دینا نہیں تھا کہ انسانوں سے ان کا واسطہ ہی کیا تھا اور جو واسطہ تھا وہ بقدر ضرورت تھا۔ انھوں نے اس کی آمد پر ایک

مکھی بھی نہیں اڑائی اور سر جھکائے یوں مصروف رہیں کہ کہیں سے کوئی آیا نہ گیا۔ لیکن چرواہوں کے زندگیوں کے ٹھہرے ہوئے پانی میں ایک پتھر چھپاک سے آن گرا۔ انھوں نے نووارد کو آڑی ترچھی نگاہوں سے اوپر نیچے، دائیں بائیں دیکھا تو انھیں ہر جگہ سے ایک ہی جواب ملا ——— یہ جواب پانی میں ٹھہرا ہوا کنول نہیں تھا بلکہ مسلسل حرکت کرتا ہوا خوفناک گھڑیال تھا لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ وہ دو تھے اور وہ ایک، لیکن اس کے ہاتھوں میں لاٹھی تھی جو ان کے پاس نہیں تھی۔ ان کے پاس صرف بھینسیں تھیں جنھیں وہ اپنی آوازوں، سیٹیوں اور ہنکار سے اپنے اپنے رخ کو ہانکتے تھے۔

نووارد نے سب سے پہلے ندی میں غسل کیا پھر دیر تک اپنے جسم کی نمائش کرتا رہا، بیڑی پی، گیت گایا اور بلا کسی وجہ کے زور زور سے ہنسا کیا لیکن ان تمام عمل میں لاٹھی مستقل اس کے ہاتھوں میں رہی، لاٹھی کو اس نے چھوڑا نہ لاٹھی نے اسکو۔ وہ دونوں چپ چاپ خاموش تماشائی کی طرح اس کی تمام حرکتوں کو دیکھتے رہے۔ انھیں بیڑی پینا یاد رہا، نہ ندی میں نہانا، نہ بانسری بجانا، نہ کبڈی کھیلنا، نہ پہاڑیوں میں کودنا، یوں جیسے ان کو آنے والے نے لمحہ بھر کے اندر سلب کر لیا ہو۔ وہ تو اس وقت چونکے جب شام پہاڑیوں پر سے اچانک اتر آئی۔ اور انھوں نے اپنی اپنی بھینسوں کو اپنے رخ اختیار کرنے کا اشارہ دیا تو بھینسیں یوں کھڑی کی کھڑی رہیں جیسے یا تو انھوں نے کوئی اشارہ دیا ہی نہیں یا انھوں نے کچھ سنا ہی نہیں۔ چرواہوں کو بڑا تعجب ہوا ——— یہ نئی بات ———؟؟؟

انھوں نے اپنے حلق سے سیٹیوں کی آوازیں نکالیں لیکن بھینسیں یا تو اسے بھی سنی ان سنی کر گئیں یا پھر انھوں نے کچھ سنا ہی نہیں۔ پھر انھوں نے اپنی اپنی بانسریاں اپنے ہونٹوں سے لگا لیں کہ بانسری سے مسحور ہو کر بھینسیں جگالی کرنا چھوڑ دیتی تھیں اور چرنا بھول جاتی تھیں ——— بانسری کی صدا پہاڑیوں میں ٹکراتی رہی لیکن بھینسوں کی ثابت قدمی میں کوئی فرق نہیں آیا تو وہ بہت مایوس ہوا کہ یہ ان کی آخری کوشش تھی جب

بقیہ صفحہ ۴۶۴ پر

رفعت نواز

رنگ رفتہ

حمید کے فوت ہو جانے کی خبر سن کر آفس میں کھلبلی سی مچ گئی۔ کل شام کو وہ بھلا چنگا کام کر کے گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ صبح اٹھتے ہی اس کے سینے میں درد ہونے لگا اور درد سے وہ تڑپنے لگا اور اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اس کی روح جسم کا پنجرہ توڑ کر پرواز کر گئی۔ نہ وہ بیمار پڑا نہ دوا کھائی۔ بس خاموشی سے گھر والوں کو روتا چھوڑ کر چلا گیا۔ حمید بڑا زندہ دل آدمی تھا۔ تھا تو چپراسی لیکن حوصلہ بڑا تھا۔ پریشان ہونا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ ہمیشہ خوش رہتا اور دوسروں کو بھی خوش رکھتا تھا۔ کبھی حالات کا رونا نہ روتا۔ میرے گھر چھٹی کے دن ضرور آتا تھا۔ بچوں کے لئے چاکلیٹ، کھٹی میٹھی گولیاں یا پھل ضرور لاتا، ادھر ادھر کی باتیں ہوتیں، گھر کی صاف صفائی میں مدد کرتا بچوں کو لطیفے سنا کر، جانوروں کی آوازیں نکال کر نقلیں اتار کر خوش کیا کرتا تھا۔ آفس میں بھی وہ مقبول تھا۔ ہر ایک کا کام کیا کرتا اور دلچسپ باتیں کر کے سب کا دل موہ لیتا تھا۔ حمید کے اس طرح اچانک بچھڑ جانے کا سب ہی کو ملال تھا۔ اکیلا کمانے والا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ بڑا لڑکا میٹرک پاس کر چکا تھا لیکن بیکار تھا، جوان لڑکی تھی جس کی شادی کی بات چل رہی تھی۔ تینوں چھوٹے لڑکے اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ لڑکی کی شادی کے لئے حمید پیسوں کی فکر میں بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ اکثر کہا کرتا "بیٹی کی شادی کر کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں گا باقی کے تو مرد بچے ہیں بڑا سنبھال لے گا۔"

حمید خود پندرہ برس کا تھا جب اس کا باپ مرا تھا، اس نے ہی بھائی بہنوں کو سنبھالا تھا، بھائی کو پڑھایا تھا، بہنوں کی شادیاں کی تھیں۔ اپنے لڑکے کو بھی گریجویٹ بنانا چاہتا تھا لیکن رؤف کو پڑھنے لکھنے سے دلچسپی نہیں تھی، جیسے تیسے میٹرک تو پاس کر لیا تھا، اب آگے پڑھنے کے لئے وہ راضی نہیں تھا۔ باپ کی مرضی کے خلاف وہ چھوٹے موٹے کام کیا کرتا تھا۔ کبھی پینٹر کے ساتھ بلڈنگ رنگنے چلا جاتا، کبھی انڈے بیچتا، گرمیوں میں قلفی اور برف کے گولوں کی گاڑی لے کر پھیری لگاتا تھا۔ باپ کی طرح وہ بھی محنتی تھا لیکن اکھڑ اور منہ زور تھا۔ حمید اکثر رؤف کی شکایتیں کرتا کہ کماتا تو خاصا ہے لیکن گھر میں بہت کم پیسے دیتا ہے۔ دوستوں کے ساتھ گلچھرے اڑاتا ہے، قیمتی کپڑے پہنتا ہے اور چھوٹے بھائیوں پر حکومت کرتا ہے۔ بڑوں کو پلٹ کر جواب دیتا ہے اور منہ زوری کرتا ہے۔

آفس میں ہر جگہ حمید کے موت ہو جانے کا چرچا تھا اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ حمید کے متعلقین کے لئے کچھ نہ کچھ کرنے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ دو چار کارکن چھٹی لے کر گئے تھے اور کفن دفن کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ طے پایا تھا کہ میت چھ بجے شام کو گھر سے نکالی جائے گی تاکہ آفس کے ملازمین جنازے کو کاندھا دے سکیں۔ شام

کو حمید کے مکان کے سامنے سب ہی واقف کار جمع تھے۔ تین چارپائیاں گھر کے سامنے والی نالی پر ڈالی گئی تھیں، چارپائیوں پر میلی دریاں اور چادریں بچھی تھیں، مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ رؤف دوڑ دوڑ کر آنے والوں سے مل رہا تھا۔ سب اسے دلاسا دے رہے تھے اور گھر کو سنبھالنے کی تلقین کر رہے تھے۔ اس کے تینوں چھوٹے بھائی حیرانی سے آنے والوں کو دیکھ رہے تھے اور روئے جا رہے تھے۔ منیجر صاحب کی موٹر گلی کے موڑ پر رکی تو کھلبلی سی ہوئی۔ آفس کے دو کارکن لپک کر صاحب کی پذیرائی کو پہنچے، رؤف بھی ان کے ساتھ تھا۔ صاحب آہستہ آہستہ ایک وقار سے چلتے حمید کے گھر تک آئے۔ رؤف کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور چار باتیں کیں، اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گئے۔ تھوڑی دیر بعد رؤف اکیلا ہی لوٹا۔ معلوم ہوا کہ صاحب دوسری گلی سے نکل کر چلے گئے ہیں۔ چہ مگوئیاں ہونے لگیں، کوئی کہہ رہا تھا صاحب نے رؤف کو سو روپے دئے ہوں گے۔ حمید پانچ سال سے صاحب کے اجلاس پر کام کر رہا تھا۔ سب ہی جاننا چاہتے تھے کہ صاحب نے رؤف کو کیا دیا ہے کیا کہا ہے۔ ایک پرانے تجربہ کار کارکن نے کہا "صاحب نے روپے دئے ہی ہوں گے اور رؤف کو حمید کی جگہ کمپنی میں لگا لینے کا وعدہ بھی کیا ہوگا" یہ سنتے ہی مقدم کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ کئی دنوں سے اپنے بھتیجے کو کمپنی میں لگانے کی فکر میں تھا لیکن کوئی جگہ خالی نہیں تھی اب امید بندھی تھی۔

جب جنازہ اٹھ گیا تو ایک شور سا ہوا، بچے دھاڑیں مار کر رو رہے تھے، عورتیں بین کر رہی تھیں، دل ہلا دینے والا منظر تھا، رؤف جنازے کے آگے آگے چل رہا تھا۔ وقفے وقفے سے وہ رک کر جنازے کو کاندھا دیتا جاتا تھا۔

حمید کو مرے ہوئے پندرہ دن گذر چکے تھے ہر روز اس کا تذکرہ ہوا کرتا، اس کے متعلقین کو کمپنی سے ملنے والی رقم کا حساب لگایا جاتا اور رؤف کی نوکری کے بارے میں باتیں ہوتیں۔ جب بھی رؤف آفس آتا ہر کوئی اس سے دلجوئی کی باتیں کرتا، چائے کی دعوت دیتا مگر اس کی ملازمت کا معاملہ ابھی کھٹائی میں پڑا ہوا تھا۔ منیجر صاحب اسے کارکن بنانا چاہتے تھے اور فی الحال کوئی جگہ خالی نہیں تھی۔ ادھر مقدم اپنے بھتیجے کو حمید کی جگہ لگانے کے لئے ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ بات ذرا الجھ گئی تھی اور دن گذرتے جا رہے تھے۔ رؤف پریشان تھا جو کام وہ کر رہا تھا اس میں آمدنی کم تھی اور کمپنی سے ملی ہوئی رقم خرچ ہو رہی تھی۔ بہن کی شادی کا مسئلہ الگ تھا۔ تنگ آ کر وہ چپراسی بننے پر تیار ہو گیا تھا۔ مقدم اسے روک رہا تھا سمجھا رہا تھا کہ عجلت نہ کرے۔ چپراسی کی حیثیت سے بھرتی ہوگا تو چپراسی ہی رہے گا ترقی نہیں ملے گی۔ حمید تو تجھے بابو بنانا چاہتا تھا۔ بابو بیتی پرشاد ریٹائر ہونے والے ہیں ان کی جگہ تجھ کو رکھ لیا جائے گا۔

اسی طرح تین مہینے گذر گئے۔ مقدم کا بھتیجہ حمید کی جگہ رکھ لیا گیا تھا، بیتی پرشاد کی مدت ملازمت میں ایک سال کی توسیع کر دی گئی تھی۔ رؤف پھر سے قلفی اور برف کے گولے بیچنے لگا تھا۔ پریشانیاں تھیں، ذمہ داریاں تھیں لیکن رؤف ہمت سے حالات کا مقابلہ کر رہا تھا۔ رات میں رکشہ چلاتا تھا۔ ماں اور بہن گھر میں بیٹھ کر بیڑیاں بناتی تھیں، ردی کے لفافے بناتی تھیں۔ اس طرح استعمال جاتا کہ کسی سے مانگے بنا گذارہ ہو جاتا تھا اور کبھی پس انداز بھی کیا جاتا تھا۔ رؤف کبھی کبھی آفس کا چکر بھی لگا لیا کرتا اور نوکری کے بارے میں پوچھ تاچھ کر لیتا تھا۔ مجھ کو گھر کے حالات بتاتا۔ بہن کی شادی جلد ہی ہونے والی تھی اور وہ انتظامات میں لگا ہوا تھا رؤف اب بھی صاف ستھرے کپڑے پہنتا تھا اور باتوں سے یہ ظاہر ہونے نہیں دیتا تھا کہ وہ پریشان ہے۔ کچھ ہی دنوں بعد رؤف، بہن کی شادی کے دعوت نامے لیکر آفس آیا تھا اور ہر ایک سے شادی میں شرکت کی درخواست کر رہا تھا۔ اس کی بہن کی شادی ہوئی اور دھوم دھام سے ہوئی۔ حمید بھی شاید ایسی شادی نہ کر پاتا۔ ڈیڑھ دو سو آدمیوں نے منڈپ میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ بینڈ باجے سے بارات نکلی، آتش بازی ہوئی اور سب ہی نے رؤف کے حوصلے کی داد دی۔ مجھے معلوم تھا کہ رؤف نے گھر رہن رکھوا کر

پیسہ حاصل کیا تھا۔ کمپنی کے برانچ آفس میں چپراسی کی جگہ خالی ہوئی تو رؤف کو رکھ لیا گیا۔ خیر خواہوں نے اطمینان کا سانس لیا کہ حق دار کو حق مل گیا۔ پہلے پہلے تو رؤف نے دل لگا کر کام کیا لیکن کام کی یکسانیت اور وقت کی پابندی سے جلد ہی اکتا گیا اور لاپرواہی برتنے لگا۔ بے دلی اور بغیر ذمہ داری سے کام کرتا۔ اکثر دیر سے آتا بغیر پوچھے غائب ہو جاتا اور بار بار رخصت لے کر گھر بیٹھ جاتا تھا۔ متعلقہ افسر اس کی شکایتیں لکھ کر بھیجنے لگا۔ جب بھی اسے سمجھاتا وہ چپ چاپ میری باتیں سن لیا کرتا اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتا لیکن اپنی حرکتوں سے باز نہ آتا تھا۔ کمپنی کے صدر دفتر سے وارننگ دی گئی۔ نوکری سے نکال دیے جانے کا ڈر دکھایا گیا تو تھوڑا محتاط ہو گیا۔

اس کی ماں بہولانے کے لئے بے تاب تھی۔ بیٹی کی شادی کے بعد کام کاج کے لئے بہو لانا ضروری ہو گیا تھا۔ ماں نے دوڑ دھوپ کر کے بہو تلاش کر ہی لی تھی۔ ملازم پیشہ شریف لوگ تھے اور وہ محض اس وجہ سے لڑکی دینے پر راضی ہو گئے تھے کہ رؤف ایک مشہور کمپنی میں ملازم تھا آگے ترقی کے امکانات تھے۔ شادی کے بعد رؤف دل لگا کر کام کرنے لگا تھا، ٹائپنگ بھی سیکھ رہا تھا اور لکھا پڑھی کا کام بھی کر لیا کرتا تھا۔ نیا برانچ منیجر اس کے کام سے بہت خوش تھا اور اکثر اسے اپنے ساتھ رکھا کرتا تھا۔

کمپنی کی سالانہ میٹنگ میں برانچ منیجرس کو بلایا گیا تھا اور میں میٹنگ کے انتظامات میں مصروف تھا، میٹنگ کا وقت ہو گیا تھا۔ برانچ منیجر موٹر سے اتر کر میٹنگ ہال کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتا جا رہا تھا۔ اس کے پیچھے بریف کیس سنبھالے کلف دار وردی پہنے رؤف چلا جا رہا تھا۔ میرے قریب آکر رؤف نے مسکرا کر سلام کیا اور رک کر باتیں کرنے لگا۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک سایہ سا لہرایا۔ ارد گرد نظروں سے اوجھل سا ہو گیا اور لگا کہ سامنے رؤف نہیں حمید کھڑا مسکرا رہا ہے۔

بقیہ کریکٹر ایکٹرس صفحہ ۱۱ سے آگے

... آپ کے جانے کے ... میں آگئی پھنک پر بس خراب ہو گئی تھی ۔۔۔ آپ کہاں گئے تھے؟"

اس گھبراہٹ دو چند ہو گئی۔ جب تک فوری جواب سمجھ میں آئے اس نے رومال میں ناک سنکنا شروع کر دی۔

"ایک میٹنگ میں گیا تھا می تی۔ "کئی مرتبہ ناک سنکنے کے بعد وہ صرف اتنا کہہ سکا۔ می تی مسکرائی۔

رات کو سونے سے پہلے می تی نے اپنے شوہر کو بلایا کہ وہ سنوسی والا انٹرویو پڑھ کر کس قدر نازاں تھیں۔ میں نے سارا انٹرویو پڑھ کر اماں کو بھی سنایا تھا۔"

حمید مسکرایا۔

رات بھر می تی بڑی قناعت سے اس کے پہلو میں سویا کی۔ اور حسب معمول بڑا منافقت آمیز تبسم اس کے ہونٹوں پر کھیلتا رہا۔

بقیہ پرانا قانون، صفحہ ۴۶۲ سے آگے

انھوں نے افسوس اور غم سے معمور ہو کر بھینسوں کو یوں دیکھا جیسے آخری بار دیکھ رہے تھے تب ان پر حیرت اور تعجب کے جذبات طاری ہوئے جب انھیں یہ نظر آیا کہ کیا جوان، کیا بوڑھی سبھی بھینسوں کی نگاہیں یک ٹک نو وارد کی لاٹھی پر ٹکی ہوئی تھیں اور جب نو وارد نے اپنی لاٹھی کی ایک ہلکی سی جنبش سے بھینسوں کو اشارہ دیا تو بھینسیں بے چون چراں خاموشی کے ساتھ اس کے اشارے پر یوں چلنے لگیں جیسے وہ اس لاٹھی کو ہمیشہ سے پہچانتی ہوں اور جنم جنم سے ان کا رشتہ لاٹھی سے رہا ہو۔

احمد رشید
علی گڑھ

ٹوٹی زمیں، بکھرے مکیں

(وہ اس لمحے دونوں، پتھرے ہوگئے اور یہ 'پیچھے' مڑ کر دیکھنے کا ردِ عمل ہے۔)

راوی کہتا چلا آیا ہے "کہ اگر وہ قیمتی، خوبصورت اور چمکدار شے حاصل کرنے کے لئے مسافت طے کرے تو پیچھے مڑ کر دیکھنے میں پتھر کا ہو جائے گا۔"

(ہوا بھی یوں ہی ـــ تمام کاروان سناٹے میں آگیا ہے' ڈوبتے سورج کے سرخ نشانات آسمان پر صاف دکھائی دے رہے ہیں۔ تمام پرندوں کی چہچہاہٹ دور کہیں وسیع و عریض آسمان میں معدوم ہو گئی ہے)

"میں پورس ہوں جو چاہے سلوک کرو"

"میں بہادروں کی قدر کرتا ہوں جس حالت میں ہو گلے سے لگ جاؤ۔"

(ہونٹوں کے مسکراتے ہی دونوں آنکھوں کی شبنم سے بھیگ گئے ہیں۔ مگر کچھ ہنسے، کچھ خفا ہوئے اور کچھ روئے ـــ لگتا ہے ہواؤں نے سازش کر لی ہو۔ مگر وہ دونوں بے پرواہ ہو کر ایک ہی زمین کی سوندھی سوندھی مٹی کی خوشبوؤں کو ایک دوسرے کے اندر تلاش کرنے میں معروف ہیں۔)

"تمہیں یاد ہے نا ...... وہ نیم کا درخت جس پر پتنگ بلک گئی تھی ..... تم نے بہت کوشش کی ......)

"ہاں مجھے یاد ہے سب کچھ ... ایک ایک حرف اس کا یاد ہے" (پورس نے قطع کلامی کی ـــ اس کی آنکھوں سے ہونٹوں تک پانی کی لکیریں کھنچ گئیں اور زبان نمکین ذائقہ سے تر ہو گئی۔

"لو"

"اس نے رومال کو پانی میں جذب کر لیا۔ اسے انواع اور اقسام کے رنگ ایک ہی رنگ میں تبدیل ہوتے ہوئے محسوس ہوئے ..... من و تو کا فرق مٹتا ہوا نظر آیا۔)

"کتنا مزا تھا ـــ آسمان ایک، زمین ایک ..... مگر پتنگ سے ڈور کٹ گئی ..... پتنگ کہیں ..... ڈور کہیں ..... میں نے کس قدر کوشش کی تھی پتنگ پکڑنے کی ... سوچا تھا لوٹ میں غنیمت کے طور پر مل جائے۔ مگر پتنگ اور ڈور کے درمیان میں ایک سرحد قائم ہو گئی"۔

"یہ سرحد کا تصور کس نے دیا؟" (سکندر بولا)

"کس نے دیا"

(دونوں غور کرنے لگے ..... فضا میں سنسنی پھیلی ہے آسمان بدستور سرخ ہے)

"مگر ہمیں آسمان کی سرخی سے کیا لینا؟" (سکندر نے گفتگو جاری کی)

"آسمان تو رنگ بدلتا ہے، بدلے گا ..... لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ زمین ٹوٹ جائے اور مخلوق بکھر جائے"

"ہاں .... ! جب کہ یہ بوڑھا آسمان ایک ہے، نہ ٹوٹتا ہے، نہ بکھرتا ہے، نہ جھکتا ہے!!"

"پھر .... ہم سب کیوں جھکے؟ ..... فاصلے کیسے سمٹے ...

"تجھے یاد ہے اے فاتح ..... وہ پتنگ کتنی خوبصورت تھی! بسنتی رنگ کی تھی وہ! کتنا دلفریب رنگ ...!؟"

"ہاں ... !! اف اتری سردی تھی۔ موسم پرلطف تھا ہواؤں کی سازشوں سے دور، وہ خوب ناچتی تھی مستی میں درخت جھوم جھوم کر تالیاں بجا رہے تھے۔ ندی کا پانی خاموشی سے بہہ رہا تھا اور تو کنارے کے قریب، پتنگ کو جھٹکے دے رہا تھا۔ وہ بھی مستی میں لہرا رہی تھی۔ گیہوں فصل پکھر رہی تھی۔ سب ہی مست ہو گئے تھے۔"

"پھر .... پھر یہ سب کیا ہوا؟ .... کیسے ہوا؟"

(اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ لیا)

صبح نازل ہونے سے پہلے، ہم دونوں خوب دوڑے تھے، تو مجھ سے آگے نکل جاتا تھا۔ پھر ہم پسینہ میں ڈوب جاتے تھے۔"

"ہا ..... ہا .... ہاپ .. ہاں کتنا .... نا ...

مزہ آرہا ہے" تو کہتا تھا۔

"اپنے پہلے سانس ..... لے .... لے ... ہا ..

ہاں" میں کہتا تھا۔

"تو بھی سانس لے .... لے ... ہا ... ہا ... ہاں

..... " تو کہتا تھا۔

"ہا ... ہا .... ہاہاہا" قہقہوں کی آواز جنگل کے اوپر حاوی ہو جاتی تھی ... سورج طلوع ہوتا تھا۔ کرنیں فضاؤں کو چیرتی ہوئی ندی کی لہروں پر رقص کرتی تو پانی چمکنے لگتا ... اور ہماری آنکھیں روشنی سے چکاچوند ہو جاتی ... ہم دونوں سورج کی سنہلی کرن کو سلام کرتے۔ پھر بدن پر خوب پانی انڈیلتے تھے۔"

"یار ... پورا کا پورا گاؤں یہی کرتا تھا .... طہارت اور پاکیزگی کے لئے۔" (پورس نے کہا)

"پھر یہ غلاظت کہاں سے آئی؟"

"ہم لوگ اتنے غلیظ کیوں ہیں؟ .... ہم دونوں ایک دوسرے کے اندر سمانے کے لئے بیتاب ہیں مگر میرے ہاتھی میرے اپنے — تیرے ہاتھوں پر ٹوٹ پڑنے کے لئے بیتاب ہیں — صرف اشارہ کا تو منتظر ہیں۔"

"ہاں میں یہ دیکھ رہا ہوں .... دراصل ہم کو اپنے "خود" پر بھروسہ نہیں رہا .... کیا یہ اپنے ..... میں کچھ کھو سا گیا ہوں اور اپنے آپ کو تلاش کر رہا ہوں .... میرے یہاں ایک ندی ہے۔ جو سچ بولتی ہے ..... لیکن اس کے قریب جانے میں، میں ڈرتا ہوں .... اور جب کہ ایک مرتبہ میں اس کے کنارے پر کھڑا ہو گیا تو اس لمحہ ڈر گیا تھا۔ چونکہ میں وہ نہیں رہا ..... جو کہ تھا۔"

"ہم کتنے معصوم تھے! ؟ کتنے ہلکے پھلکے سے! ؟ وسیع و عریض میدان میں بھی ہمارا وجود تھا ... چونکہ ہم — صرف ہم تھے۔"

ندی کے کنارے بیٹھ کر باتیں کرنا — پرندوں کی چہچہاہٹ سننا ... گلے میں بستہ — اور ہاتھوں میں آم، ہونٹوں سے چوسنا ... عرق گلے میں انڈیلنا۔ کھٹے، میٹھے، پھیکے ذائقہ سے بے نیاز۔" (سکندر نے کہا)

"اور جبکہ گلے سے بستہ اتر کر ہاتھوں میں مختصر کتابوں کا بوجھ آگیا ... تو من ... یعنی "میں" اور "... اور "تو" یعنی تو ... پھر ہمیں یاد نہیں رہا کہ میں نے پتنگ اڑائی تھی — بس اتنا یاد ہے۔ وہ بسنتی رنگ کی تھی — جو کٹ گئی تھی۔"

"تجھے یاد ہے وہ ڈوبتے سورج سے، ذرا پہلے کا وقفہ جبکہ ہزاروں رنگ برنگی کرنیں ندی کی ہزاروں باریک باریک سفید لہروں کے قریب آ رہی تھیں اور ہم دونوں قریب ہی چھوٹے چھوٹے بیریوں کے پیڑوں پر اچھل اچھل کر بیر توڑ رہے تھے۔ ہماری جیبیں پھول گئی تھیں اور جب سورج کی کرنیں لہروں میں ڈوب گئیں اور پھر کھو گئیں تو نیلا آسمان دھندلا ہو گیا ... تو ہم نے دوڑ لگائی۔ اور دوڑتے دوڑتے ہم سے گاؤں چھوٹ گیا تھا۔

راوی کہتا چلا آیا ہے "علم سیکھو کہ انسان بننے کیلئے"

"ہاں ... ہاں مجھے حرف حرف یاد ہے" پورس نے کہا۔

"لیکن اب یہ کیا ہے ہا، ہم دونوں کہیں ایک دوسرے کو شکوک لگا ہوں سے تہیں دیکھ رہے۔ (دو دلوں نے کہا)

" یہ پتنگ، یہ بے اعتمادی نہیں..... بلکہ ہم دونوں دور ہو گئے " (پورس نے بات کا سلسلہ جاری رکھا)

(آسمان سرخ آلود ہے، فضا ساکت ہے، ہر ایک خاموش پل پل شمار کرنے میں مصروف، لمحہ لمحہ وقت کی تقسیم ہوتی ہے۔ لمحہ لمحہ وقت کا جوڑ بھی ہوتا ہے۔ سورج بھی وہی ہے، آسمان بھی وہی ہے، زمین بھی وہی ہے، ندی بھی بہتی ہے، آموں کا موسم بھی آتا ہے)

"پھر تبدیلی کس بات میں آئی؟" (دونوں ایک ساتھ گویا ہوئے۔ اور پھر سوالیہ نشان بن گئے)

" ہم انسان بننے کے لئے شہر آ گئے تھے " (سکندر نے بات کا کنارا پکڑا۔

" شہر اچھا لگا تھا بہت "

" بھاگتی ہوئی سڑکیں، کھنکتی ہوئی پیالیاں، اٹھلاتی ہوئی تتلیاں..... اور ہمارے سر پر کتابوں کا بوجھ انسان بننے کے لئے ہیں

" ہاں "

" وہ تتلی یاد ہے تجھے، کتنی خوبصورت تھی ... تو پتنگ کی بات کرتا تھا اور میرا موضوع گفتگو تتلی تھی "

" ہا.... ہاں ... یاد ہے ... پھر ... ہاں کیا ہوا؟ "

" وہ تتلی اڑ گئی ... تلاش کیا .... پتہ نہیں کہاں چلی گئی؟ ... زمین ٹوٹ گئی ... مخلوق بکھر گئی اور وہ کہیں بھیڑ میں کھو گئی .... "

" آج بھی ہم بھیڑ میں کھو سے گئے ہیں۔ میرے اپنے تیرے اپنے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں اور منتظر ہیں کہ کب موقع ملے ہتھیاروں کو خون پلانے کا ... ہم نے بھی ہمیشہ خون کا کھیل کھیلا ہے مگر آج کیوں پتھر کے ہو گئے ہیں "

(آسمان پر سیاہی پھیل رہی ہے، دور دور تک پرندوں کا نشان نہیں، ہر ایک کی بے چینی میں اضافہ ہو رہا ہے)

" بے چین .... بے چین، تو ہم اس وقت بھی تھے "

" جبکہ گدھوں نے زمین پر پڑاؤ ڈال دیا تھا "

" ہاں "

" وہ نوچ نوچ کر گوشت و پوست کھا چکے تھے .. صرف ہم لوگ ڈھانچے رہ گئے تھے "

" بڑی بے چینی تھی ہر چہرے پر "

مگر ہم نے چہرے پڑھ لئے تھے ... چونکہ ہم پڑھ چکے تھے۔

" ہمارے بزرگ اسوقت بڑے بے وقوف تھے جبکہ زمین کی حفاظت نہیں کر پائے "

" لیکن یہ اچھا کیا کہ ہمارے اوپر کتابوں کا بوجھ لاد دیا .... اور ہم یہ سمجھ گئے کہ یہ زمین ہماری ہے اور ہمیں ہر خطرے سے اس کی حفاظت کرنی ہے "

" اور اب بھی وہی سوال ہے مگر ہم پتھر کے کیوں ہو گئے؟ .... کیا ہمارے ہتھیاروں کو بصارت مل گئی ہے جو ایک دوسرے کو پہچان گئے ..... ہم میں سے کسی ایک کو خاک چاٹنی تھی ... مگر پھر بھی ہم ایک دوسرے کے گلے سے لگے ہیں "

" تجھے یاد ہے ہم دونوں ایک دوسرے کے گلے سے لگے تھے "

" ہاں یاد ہے ... تب ہم نے قسم کھائی تھی .. کہ گدھوں کو نیست و نابود کر دیں گے "

" فیصلہ کیا تھا کہ جہاں تیرا پسینہ گرے گا وہاں میں خون گراؤں گا ... اور میرا پسینہ گرے گا تو تو خون بہائے گا "

مگر اب کیا ہوا ... اب تیرے اپنے اور میرے اپنے ایک دوسرے کا خون پینے کا موقع تلاش کر رہے ہیں "

(آسمان کا دھندلا پن گہرا ہو رہا ہے ... سب بے چین ہیں "... ماحول کی بے پناہ خاموشی میں اضطرابی کیفیت پوشیدہ ہے ... وہ دونوں پتھر کے ہو گئے ہیں۔

" اس سمے ایک ہی کارواں تھا، سب ہی اپنے تھے خاموشی میں غرق ایک کمرے میں۔ ایک موم بتی جل

رہی تھی اس کے اوپر ہتھیلیاں رکھ کر ہم نے ایک زبان ہو کر قسم کھائی "کہ گدھوں کا سر توڑ دیں گے ... ان کا قلع قمع کر کے ہی دم لیں گے۔"

ہم نے اپنے اپنے قلموں میں روشنائی کی جگہ گولیاں بھریں ... اور ہاتھ میں ننگے خنجر سے انگوٹھا کاٹ کر خون کا ٹیکہ لگایا تھا"

"ٹیکہ تو ہم نے اب بھی لگایا ہے ... مگر ہم پھر بھی پتھر کے کیوں ہو گئے۔"

(دونوں نے آسمان کو دیکھا ... اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے لیکن رفتہ رفتہ جیسے وقت تھم گیا ہو)

"اور ہم نے اسی وقت دم لیا جب گدھے بھاگ گئے"

"ہاں خوب سالوں کی پٹائی کی تھی ... ہم ایک تھے"

"مجھے یاد ہے وہ واقعہ جب کہ ایک مکان میں دیوار قائم کر دی گئی تھی۔ پورے گاؤں میں طوفان سا آگیا تھا"

"مجھے سب کچھ یاد ہے (اس کی آنکھیں سمندر میں ڈوب گئیں ... اور پھر دونوں کی ... پھر سب کی)"

"لیکن پھر کیا ہوا؟"

"پھر ... پھر مجھے کچھ یاد نہیں ... (اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سوچتے ہوئے کہا)

"ہمیں یاد ہے ... سب کچھ یاد ہے" (ایک فلک شگاف چیخ فضا میں گونجی ... زمین پر اتھل پتھل ہو گئی ... آسمان پر سیاہی کے بھیانک سائے اور گہرے ہو گئے)

"مارو ... مارو" (فضا میں گونجنے لگی۔ چاروں سمتوں سے سنگ باری شروع ہو گئی)

راوی نے کہا تھا "جب تک کہ وہ ندی میں غسل نہیں کرے گا تب سے انسان نہیں بنے گا۔"

ولیکن ہوا یوں کہ وہ دونوں خون آلود ہو گئے، بشدید زخمی ہو کر نیچے گر گئے ... اند ... ا ... نسان ... انسان بننے سے پہلے وہیں ڈھیر ہو گئے۔

بقیہ جدید علوم کی فکری اساس، صفحہ ۲۸ سے آگے

بار پھر علمی دنیا میں دوسرے لوگ برسر اقتدار آنے والے ہیں لیکن یہ کون ہوں گے؟ ہمیں نہیں معلوم۔ البتہ اتنا یقین ہے کہ نئے علم کی بدولت کائنات سے ہمارا تعلق زیادہ جامع خطوط پر قائم ہوگا اور کائنات انسان کے درمیان کا رفرما رشتوں کو غلط سمجھنے کی بنا پر بحر و بر میں جو فساد برپا ہو گیا ہے اس کا علاج ہوگا۔

طیّب عثمانی

اقبال اور عالمی ادب

عبدالمغنی

اردو زبان و ادب کے ممتاز ناقد اور ملک کے مشہور دانش ور ڈاکٹر عبدالمغنی کی نئی کتاب "اقبال اور عالمی ادب" اردو ادبیات پر اس سال ۱۹۸۳ء کی بہترین تصنیف قرار دی جا سکتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اپنے عالمانہ انداز، ناقدانہ بصیرت اور ماہرانہ اقبال شناسی کی وجہ سے یہ کتاب اپنے موضوع پر بڑی منفرد اور دانشورانہ تصنیف ہے۔ ڈاکٹر عبدالمغنی گذشتہ دو دہائی سے اردو میں تنقیدی مضامین مسلسل لکھتے رہے ہیں جس نے اردو میں تنقید کو ایک نیا "نقطۂ نظر" دیا ہے ساتھ ہی اردو تنقید کو افراط و تفریط سے ہٹ کر "جادۂ اعتدال" پر لانے کی بڑی اچھی کوشش کی ہے۔ اس طرح اردو زبان و ادب کی "تشکیل جدید" کے ساتھ ساتھ اس کے "معیار و اقدار" میں اضافہ ہوا ہے۔ جدید اردو تنقید میں وہ اخلاقی نقطۂ نظر اور اعلیٰ معیار و اقدار کے نمائندے اور نقیب رہے ہیں۔ اس لحاظ سے اردو تنقید میں عبدالمغنی اپنے منفرد اسلوب اور صحت مند نقطۂ نظر کی وجہ سے ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں اور پھر اقبال کے فکر و فن پر ان کی ماہرانہ صلاحیت اور تخصص کے پیش نظر یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس کتاب میں ڈاکٹر عبدالمغنی نے نہ صرف یہ کہ جناب پروفیسر کلیم الدین احمد کے اردو میں تنقیدی کارناموں کا بھرپور جائزہ لیا ہے بلکہ خاص طور پر "اقبال — ایک مطالعہ" میں جناب کلیم الدین احمد نے اقبال کا جو ناقص مطالعہ اور مبالغہ آمیز انداز نظر اختیار کیا ہے، اس کا تحلیل و تجزیہ کر کے جلوہ دانش فرنگ سے ان کی خیرگی کو نمایاں کیا ہے۔ اقبال کا یہ معروضی مطالعہ عالمی ادب میں اقبال کے فکر و فن اور اس کے مقام کا تعین کرتا ہے۔ تو دوسری طرف کلیم الدین احمد کی مغربی ادب و تہذیب سے ذہنی مرعوبیت، مشرقی شعریات و ادبیات سے ان کی ناواقفیت کے باعث اقبال کے سلسلے میں ان کا معاندانہ انداز نظر اور محکومانہ فکر کا پتہ چلتا ہے، کتاب کا انداز بیان عالمانہ اور تحلیل و تجزیہ حکیمانہ اور بہت ہی مدلل اور موثر ہے۔ بقول "حرف ناشر" اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پہلی بار مغربی ادب اور اس کے تصورات سے مرعوب ہوئے بغیر، نہایت وقار کے ساتھ پورے عالمی ادب کے بنیادی تصورات کا ایک زبردست تنقیدی جائزہ لے کر ان کے پس منظر میں اصولی و فنی طور پر اقبال کے اعلیٰ مقام کی نشاندہی کی گئی ہے۔" اس طرح یہ تصنیف نہ صرف اقبالیات بلکہ عام ادبیات کے تنقیدی مطالعہ کا ایک بالکل نیا، منفرد اور امتیازی انداز پیش کرتی ہے جس سے جناب کلیم الدین احمد کی تنقیدی لغزشیں اور مغربی انداز تنقید کی اصلیت آشکارا ہوتی ہے۔

ڈاکٹر عبدالمغنی کی کتاب اقبال اور عالمی ادب جو زیر تبصرہ ہے اور بظاہر جناب کلیم الدین احمد کی کتاب اقبال — ایک مطالعہ کا جواب نظر آتا ہے لیکن حقیقتاً یہ کتاب عالمی ادب، خصوصاً انگریزی ادب کا بھرپور جائزہ اور اس کے مقابلہ میں اقبال کے مقام و مرتبہ پر ایک مستقل بحث جو بیک وقت ادب کے عالمی تصورات اور کلام اقبال کے

فنی و فکری معنویت کا احاطہ کرتی ہے۔ "اقبال ایک مطالعہ" میں کلیم الدین احمد نے اقبال کا عالمانہ اور ناقدانہ مطالعہ کرنے کے بجائے تمام تر معاندانہ انداز نظر اختیار کیا ہے، انھوں نے اردو تنقید میں بت پرستی کا رونا رویا ہے اور الزام یہ ہے کہ غالب اور اقبال دو دیوتا بنا دیے گئے ہیں، اس حقیقت کے اعتراف کے باوجود کہ غالب اور اقبال اردو شاعری کے دو مقبول ترین شاعر ہیں جو فکر و فن کے بلند ترین معیار پر پورے اترتے ہیں، اسی پر انگریزی شاعری سے موازنہ و مقابلہ اور بھرپور جائزہ، عبدالمغنی کی اس کتاب کا اہم موضوع ہے اور واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اس موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ عبدالمغنی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بیک وقت مشرقی ادب، خصوصاً اردو، فارسی اور عربی ادبیات کے ماہرانہ اداشناس ہیں اور ساتھ ہی انگریزی ادبیات سے براہ راست واقفیت نے ان کے نوجوہ و فکر کو جلا بخشی ہے۔ ان کا ادبیات کا مطالعہ وسیع متنوع اور عالمانہ ہے، جس کا اندازہ ہر اس شخص کو ہوگا جو اس کتاب کا مطالعہ غیر جانبداری سے کرے گا۔ عبدالمغنی نے "اقبال ایک مطالعہ" کے جائزہ میں اس میں اٹھائے گئے موضوعات 'اقبال اور دانتے'، اقبال اور ملٹن، اقبال کی طویل اور مختصر اردو نظمیں، اور اقبال کی فارسی نظمیں کے عنوان سے اقبال کے فکر و فن کا ایسا مطالعہ پیش کیا ہے جو اردو تنقید میں نیا اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے، اقبال کی نظموں کے مطالعہ میں، ان کا موازنہ مغربی شاعروں کے تقریباً تمام اہم شاعروں سے کیا ہے اور ان پر اقبال کی اہمیت و فوقیت ثابت کر دی ہے۔ خصوصاً اس کتاب کے دو ابواب اقبال اور دانتے اور اقبال اور ملٹن پڑھنے کی چیز ہے اس سے ان کے فکر و نظر کی گہرائی اور وسیع مطالعہ کا اظہار ہوتا ہے، مغربی ادبیات کے ساتھ کلام اقبال خصوصاً "جاوید نامہ" کا جس عالمانہ اور ناقدانہ بصیرت کے ساتھ جائزہ لیا ہے وہ اہل علم و دانش کے لئے ایک گراں قدر تحفہ ہے۔

ڈاکٹر عبدالمغنی کی یہ چونکا دینے والی، شاہکار کتاب جناب کلیم الدین احمد کے اب تک کے تنقیدی کاموں کا بھرپور جائزہ ہے اور مغربی ادب کو معیار بنا کر تنقید ادب کے جو پیمانے اور اصول جناب کلیم الدین احمد نے وضع کئے ہیں اور اپنی وحشیانہ تنقید سے اردو شاعری اور تنقید پر جس طرح خط نسخ پھیرنے کی کوشش کی ہے عبدالمغنی نے ان کا نہایت عالمانہ انداز سے جائزہ لیا ہے اور ان کے تنقیدی نقطۂ نظر کی خامیوں کو اجاگر کیا ہے۔

کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے آٹھ عنوانات پر مشتمل ہے جو تقریباً چھ سو صفحات پر محیط ہے، پہلا باب بعنوان "اقبال ـــــ ایک مطالعہ" ہے جو جناب کلیم الدین احمد کی کتاب کا نام بھی ہے۔ اس عنوان کے تحت کلیم الدین احمد کے تنقیدی کارناموں اور اردو شعر و ادب کی تنقید میں، ان کے نقطۂ نظر کا عمومی جائزہ ہے۔ کلیم الدین احمد کے اس نقطۂ نظر پر بڑی سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے کہ شاعری کا بہترین اظہار ڈرامہ، رزمیہ شاعری اور مفصل نظموں ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ عبدالمغنی کا کہنا ہے کہ دوسری اصناف شاعری مثلاً مثنوی مرثیہ مسدس قطعہ رباعی میں کیوں نہیں ہو سکتا؟ اور کیا اردو کی بہترین طویل و مختصر نظمیں، انگریزی شاعری کے بالمقابل نہیں آ سکتیں ان سارے مباحث پر ڈاکٹر عبدالمغنی نے مشرقی و مغربی اصول و فن و تنقید کو سامنے رکھ کر گفتگو کی ہے اور اپنی ناقدانہ بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ اس کی داد مطالعہ کے بعد ہی دی جا سکتی ہے اس مختصر سے مقالہ میں ان کا احاطہ ممکن نہیں، میں یہاں بطور نمونہ صرف ایک اقتباس پیش کروں گا جو ۵۰ صفحات پر پھیلے ہوئے مضمون کا حاصل مطالعہ کہا جا سکتا ہے۔

"اقبال کی شاعرانہ عظمت یہ ہے کہ انھوں نے جدید تمدن و تہذیب کے پیدا کئے ہوئے انھی مسائل زندگی کو وسائل فن میں ڈھال

دیا "انھوں نے برقِ حیات سے ہی اپنی شمع
فن روشن کی۔ اس سے کس کو انکار ہو سکتا
ہے کہ ٹیگس اور ایلیٹ، شیلی اور کیٹس جیسے
بونوں کو تو چھوڑئیے، شیکسپیئر، گوئٹے اور دانتے
جیسے دیوزادوں سے بھی بڑی شخصیت اقبال
کی تھی۔ اقبال کی زندگی ان سب مغربی
شاعروں سے زیادہ بھرپور اور ان کا ذہن
زیادہ معمور، محیط اور مرکب تھا۔ رہی یہ
بات کہ اقبال نے فکر اور تجربے کی اس ثروت
کو فن اور شعر میں تبدیل کیا یا نہیں۔ تو اقبال
کی شاعری کا اصلی بنیادی اور اہم ترین جوہر
یہی ہے کہ انھوں نے زندگی کے وسیع ترین
اور پیچیدہ ترین مواد کو بہترین ہیئت فن
میں پیش کیا۔ دقیق ترین موضوع کو حسین
ترین اسلوب میں ظاہر کیا۔"

انھوں نے واقعات کو استعارات میں بدل دیا ہے
اور حقائق کو علامت کی لطافت عطا کی ہے۔ تاریخ اقبال
کی چابک دست فن کاری اور خلاق تخیل کے ہاتھوں تلمیح
بن گئی۔ انھوں نے زندگی کے ٹھوس عناصر کو اپنے فن
کے رنگ و آہنگ میں ڈبو کر اساطیر بنا دیا ہے۔ اقبال
کے کلام میں کائنات کی ہر داستان شاعرانہ تمثیل و ترنم کے
ساتھ نقش پذیر ہوئی ہے۔"

اقبال اور عالمی ادب صفحہ ۴۳، ۴۴

کتاب کا دوسرا باب "اقبال اور دانتے" کے عنوان
سے ہے جو جناب کلیم الدین احمد کی کتاب "اقبال
ایک مطالعہ" کا بھی مرکزی مضمون ہے، جناب عبدالمغنی
نے اس عنوان کے تحت تقریباً ایک سو ستر صفحات
پر اقبال اور دانتے کی شاعری کا موازنہ دکھایا کیا
ہے، چونکہ مصنف مشرقی و مغربی ادب و شاعری
کے حقیقی ادا شناس ہیں اور اقبال کے "جاوید نامہ"
اور دانتے کی "ڈیوائن کامیڈی" دونوں کا مطالعہ
اور ان کی فن کارانہ خوبیوں خامیوں پر ان کی ناقدانہ
دسترس ہے صرف سنی سنائی باتوں، شرح اور
نوٹس کی مدد اور دوسروں کے چبائے ہوئے مطلب
اور باتوں کو دہرانے کے وہ عادی نہیں ہیں بلکہ دونوں
کا انھوں نے بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ اس لئے یہ
مقالہ ان کی ناقدانہ بصیرت کا شاہکار ہے۔ ان دونوں
نظموں کا جو فکری پس منظر اور ان کے تاریخی و فکری مضمرات
ہیں ان پر ان کی وسیع نظر ہے۔ ان دونوں نظموں کے فکری
و علمی پس منظر اور فنی حسن کا جیسا عالمانہ اور بصیرت افروز تجزیہ
عبدالمغنی نے پیش کیا ہے اس کی داد اہل علم اور دانش ہی دے
سکتے ہیں۔ اس طویل مقالے کی تلخیص یہاں مشکل ہے اور مقصود
بھی نہیں ہے۔ یہ صرف ایک عمومی تبصرہ ہے لیکن واقعہ
یہ ہے کہ مشرقی و مغربی شعر و ادب کے مطالعہ و موازنہ اور
تقابلی تنقید کا یہ مقالہ بیش بہا نمونہ ہے، اس میں فن
شاعری، فلسفہ و حکمت، جدید سائنسی نظام شمسی، مسیحی
دینیات و اخلاقیات، اسلامی افکار و روایات کا جیسا وسیع
مطالعہ پیش کیا گیا ہے، وہ آج کے ایک رخے محدود
اور ناقص علم و مطالعہ رکھنے والے ادیب و ناقد کے
بس کی بات نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عبدالمغنی کی یہ
کتاب مغربی خصوصاً انگریزی ادب سے مرعوب ذہنیت
رکھنے والے افراد کے لئے ایک معنی میں "ضربِ کلیم"
ہے۔ اس طرح ڈاکٹر عبدالمغنی نے دنیائے شعر و ادب میں
مغربی و انگریزی شاعری کے مقابلے میں، اقبال کی شاعرانہ
عظمت و فنکارانہ ندرت کو نمایاں کیا ہے۔ اس طویل
مقالہ کا صرف ایک اقتباس یہاں پیش کروں گا جسے
اس پورے مقالہ کا حاصل اور عطر کہا جا سکتا ہے۔

"اقبال کی شاعری میں شعر و فن کی عظمتوں
کا جو امتزاج کامل ہے وہ دنیائے شاعری
میں اپنی مثال آپ ہے، واقعہ یہ ہے کہ
مشرق و مغرب میں کہیں بھی نہ تو کسی شاعر
نے آج تک اتنے زبردست تفکر سے کام

لیا ہے اور نہ کسی مفکر نے ایسی عظیم شاعری کی ہے
پھر تفکر بھی ایک منظم فکر اور مربوط فلسفے کی شکل میں
اور شاعری صنائع و بدائع اور فصاحت و بلاغت
کے جملہ سامان فن کے ساتھ، پھر فکر و فن دونوں
کے سلسلات ایک انتہائی طاقت ور جذبے اور
اس کے پیدا ہونے والے سوز و گداز سے پگھل
کر ایک ہم آہنگ مرکب میں ڈھلے ہوئے جس
کے نتیجے میں حسن و صداقت کی ایک ایسی کامل
یک جہتی کہ اس سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جا
سکتا اور اس یک جہتی میں ایسی آفاقیت کہ جدید
وقدیم اور مشرق و مغرب کے تمام صحیح و صالح
افکار اور حسین و جمیل استعارات کا عطر مجموعہ ۔
اقبال کی شاعری کا ئی داس، دانتے، رومی و
حافظ، شیکسپیئر، گوئٹے اور غالب کی بہترین
اقدار فکر اور روایات فن کی امانت دار
اور ان میں توسیع و اضافہ کرنے والی ہے اسی
عظیم، بسیط، مرکب و منظم، زیبا و رعنا اور دل
ورانہ و حکیمانہ شاعری پر تنقید صرف
اس قول سے کی جاسکتی ہے۔ اِنّ من الشعر
الحکمۃ و انّ من البیان السحرا ۔ (شعر سے حکمت
ٹپکتی ہے اور بیان سے جادو جاگتا نظر آتا
ہے۔)

ادب و فن کی تاریخ میں اقبال کا ایک عدیم النظیر کارنامہ
یہ ہے کہ انہوں نے ایک عظیم شاعری کے ذریعہ عالمانہ انقلاب اور
آفاقی ارتقاء کا پیغام صرف اپنی قوت فکر اور طاقت
فن کی بنیاد پر دیا ہے جو ایک بدترین حال میں بہترین
مستقبل کی بشارت اور اس کی طرف پیش قدمی کا
بصیرت افروز اور ولولہ انگیز نغمہ ہے۔"

(اقبال اور عالمی ادب صفحہ ۲۱۱، ۲۱۲)

جناب کلیم الدین احمد نے "اقبال ایک مطالعہ" میں
اقبال کی پانچ طویل اردو نظمیں خضر راہ، طلوع اسلام، ذوق
و شوق، مسجد قرطبہ، ساقی نامہ اور آٹھ مختصر نظمیں ایک آرزو،
ستارہ، شعاع امید، علم و عشق، فرشتوں کا گیت، فرمان خدا
روح ارضی کا آدم سے خطاب، لالۂ صحرا کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔
عبدالمغنی نے اپنی کتاب میں دو مستقل عنوان قائم کئے ہیں،
اقبال کی طویل اردو نظمیں اور اقبال کی مختصر اردو نظمیں، ان
عنوانات کے تحت جو تقریباً دو سو بارہ صفحات میں پھیلے
ہوئے ہیں۔ اقبال کی ان طویل و مختصر تیرہ نظموں کا فکری و فنی
تجزیہ اور انگریزی شاعری سے ان کا تنقیدی موازنہ کیا ہے جو
نہ صرف فن کارانہ اور دانش ورانہ بلکہ عالمی تنقید کا بیش بہا نمونہ
بھی ہے۔ تمام نظموں کی فنی و فکری خوبیوں اور محاسن کے اظہار
میں ایک صاحب نظر ناقد کی بصیرت، اس کا ثروت خیال
اور ذوق جمال نمایاں نظر آتا ہے۔ ساتھ ہی کلیم الدین احمد کا
ان نظموں پر جانب دارانہ اور معاندانہ تنقید کی حقیقت کھول
کر رکھ دی ہے، تعصب سے خالی اور مغربی ادب سے مرعوب
ذہنیت نہ رکھنے والے غیر جانب دار قارئین، جوان دونوں
کتابوں کا کھلے دل و دماغ سے مطالعہ کریں گے وہ عبدالمغنی کے اس دانشورانہ اور ناقدانہ
مطالعہ کا ضرور اعتراف کریں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ اقبال کی یہ شاہکار نظمیں مسجد قرطبہ
ساقی نامہ اور ذوق و شوق میں جو شاعرانہ حسن اور فکری و فنی ارتقاء پایا جاتا
ہے وہ اقبال کی شاعرانہ عظمت کے لئے کافی ہے، اور یہ
نظمیں عالمی شعر و ادب میں ان کے بلند مرتبہ و مقام کی
حامل ہیں۔ مصنف نے ان نظموں کے مطالعہ میں اپنی جس
ماہرانہ صلاحیت اور ناقدانہ بصیرت کا ثبوت دیا ہے وہ عام
قارئین کے لئے جہاں وجہ مسرت و بصیرت ہوگا وہاں دنیائے
شاعری میں اقبال کی شاعری کے اعتبار و وقار میں اضافہ کا
باعث بنے گا۔

اس کے بعد اقبال اور ملٹن، اقبال کی فارسی نظمیں
اقبال کی اردو اور فارسی غزلیں کے علیحدہ علیحدہ عنوانات
کے تحت عبدالمغنی نے کلام اقبال کا فنکارانہ مطالعہ پیش کیا ہے
اور ہر جگہ جناب کلیم الدین احمد کے اٹھائے ہوئے تنقیدی
سوالات اور عیب جوئی کا پردہ فاش کرتے ہوئے اقبال
کی شاعرانہ و فن کارانہ عظمت کا بصیرت افروز ثبوت فراہم

کیا ہے۔ ان مقالات کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ عبدالمغنی نے اقبال کے اردو فارسی کلام کا مطالعہ کتنی گہرائی اور دقت نظر سے کیا ہے اور ان کی ناقدانہ بصیرت نے کلام اقبال کے پس منظر میں فکر و فن کے کیسے کیسے چراغ روشن کیے ہیں۔ ملٹن کی تمثیلی نظم "پیراڈائز لاسٹ" میں شیطان کی مجلس شوریٰ اور اقبال کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" پڑھنے کی چیز ہے۔ ان باتوں کو یہاں دہرانا تحصیل حاصل ہے جو مقصود نہیں۔ اسی طرح فارسی نظموں کے مطالعہ میں اسرار خودی، پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق اور مسافر کا جیسا طویل ناقدانہ تبصرہ پیش کیا ہے اس سے ان کے فارسی شعر و ادب کے مذاق کا پتہ چلتا ہے اور فارسی شعر و ادب سے ان کی مناسبت اور ماہرانہ قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس طرح کلام اقبال سے جو انہیں ذہنی لگاؤ اور فکری مناسبت ہے اور اس کے شعری و فنی حسن و جمال کے وہ جس طرح اداشناس ہیں، اس کا اظہار ان کے مقالہ "اقبال کی فارسی اردو غزلیں" سے ہوتا ہے۔ جناب کلیم الدین احمد تو غزل کے کڑے ناقد اور اسے نیم وحشی صنف شاعری قرار دیتے ہیں۔ لیکن عبدالمغنی اقبال کی اردو اور فارسی غزلوں کا مطالعہ اور تحلیل و تجزیہ یہ ثابت کرتا ہے کہ واقعی غزل صرف اردو ہی نہیں، فارسی شاعری کی بھی آبرو ہے۔

سب سے آخر میں "عالمی ادب میں اقبال کا مقام" اس کتاب کے مصنف کا آخری مقالہ ہے جسے اس کتاب کا خلاصہ یا مقدمہ سمجھنا چاہیئے جو پہلے لکھا گیا تھا اور اب جب اس موضوع پر مستقل کتاب لکھی گئی تو اس کتاب کا آخری تتمہ بنا۔ اس مقالہ میں اختصار لیکن بڑی جامعیت کے ساتھ عالمی ادب میں اقبال کے مقام کا تعین اور اس کی قدر و قیمت کو دلائل کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے۔ یہ اقبال کے فکر و فن اور عالمی ادب کے عمومی جائزہ کی بہترین مثال ہے۔ "اقبال ایک مطالعہ" اور "اقبال اور عالمی ادب" دو معیاری علمی و ادبی تصانیف کے ذریعہ اردو کے دو بڑے ناقد اور دانشوروں کے درمیان جو مباحثہ چل پڑا ہے اس پر عبدالمغنی کی یہ کتاب ایک "احسن المجادلہ" کا بہترین نمونہ ہے۔ مناسب یہ ہے کہ اس تعارفی تبصرہ کے اختتام پر ان کی کتاب کے آخری حصہ کے دو اقتباسات پیش کر دیئے جائیں جن سے اس پوری کتاب کا موضوع اور مقصد واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے اور جس پر علم و ادب اور تنقید کی وہ فلک بوس عمارت قائم ہے جو اس تصنیف کا طرۂ امتیاز ہے۔

"تیرہویں صدی کے دانتے، سولہویں صدی کے شیکسپیر اور اٹھارہویں صدی کے گوئٹے کے مقابلے پر بیسویں صدی کے اقبال کے مسائل فن جتنے زیادہ تھے اتنے ہی وسائل فن مہیا ہوئے۔ سائنس اور صنعت، سیاست اور معیشت کی ترقیات نے عصر حاضر کے ادب و شاعری کے سامنے جو مسائل کھڑے کر دیئے ہیں ان کا تصور بھی قبل کے ادوار میں نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ خود دنیا کی جو ترقیاں اقبال کے زمانے میں ہو چکی تھیں ان کا کوئی سراغ دانتے، شیکسپیر اور گوئٹے کے زمانوں میں ظاہر ہے کہ نہیں ملتا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ بین الاقوامی ادب اور عالمی شاعری کا کوئی تخیل گوئٹے شیکسپیر اور دانتے کے سامنے تھا ہی نہیں۔ یہ تو صرف اقبال ہی کو نصیب ہوا۔ چنانچہ دنیا کے عظیم ترین شاعروں میں اقبال وہ تنہا شاعر ہیں جنہوں نے شعوری طور پر اعلان کر کے آفاقی قدروں کو سامنے رکھ کر ایک عالمی شاعری کا نمونہ کمال تخلیق کیا، اس اعتبار سے فکر و فن، فلسفہ و شاعری دونوں میں اقبال نے مشرقی و مغربی تمام ہی ادبیات کی بہترین روایات اور عظیم ترین تجربات کو اپنی منفرد تخلیقات میں ترکیب دے کر ایک بہتر اور عظیم تر فنکاری کا ثبوت دیا ساتھ ہی انہوں نے شعر و ادب کی پیش آنے والے مشکل ترین مسائل کو اپنی فنی ریاضت اور فکری بلوغت کے بل پر

بقیہ صفحہ [illegible]

نامی انصاری
۹۷/۱ پریڈ، کانپور

کتاب شناسی

ظ۔ انصاری

تبصرے کے فن اور علمی تبصروں پر مشتمل ظ۔ انصاری کی تصنیف "کتاب شناسی" کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے جو تاثر ابھرتا ہے اسے تین لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ دلچسپ، خیال انگیز، متنازعہ فیہ۔

فن تبصرہ نگاری پر اپنے ۴۴ صفحات کے فاضلانہ مقدمے میں ظ۔ انصاری نے تبصرہ نگاری کا یہ بنیادی اصول بتایا ہے کہ "تبصرے کا کوئی متعین اصول نہیں۔ پہلے تصنیف اور مصنف کے مقصد کو نظر میں رکھا جائے اور اسی مقصد کی روشنی میں اصول کو لچک دی جائے۔ مقدمے کے آخری حصہ میں مصنف نے تبصرہ نگاری کی پانچ قسمیں بتائی ہیں۔ تعارفی تبصرہ، تفصیلی تبصرہ، سرسری علمی تبصرہ، تاثراتی اور تعمیری تبصرہ اور مقصدی تبصرہ۔ انھیں اقسام کی تشریح میں ضمناً وہ اصول بھی آ گئے ہیں جن کی بنا پر تبصرہ نگار کسی کتاب کی قدر و قیمت کا جائزہ لیتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے وابستگی ناوابستگی، تبصرہ نگار کی بے طرفی، ایپروچ، دیانت داری، ناپ تول، مدلل مداحی، منفی تبصرہ نگاری جیسے موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہوئے بھی تبصرہ نگاری کے آئین مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ظ۔ انصاری نے اپنے طویل مقدمے میں تبصرہ نگاری کے سارے پہلوؤں کا احاطہ کرنے، ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں اس فن کے سرخیل مثلاً جارج برنارڈ شا، چیخوف، ماورگورکی وغیرہ کے میلانات اور رجحانات پر روشنی ڈالنے اور اردو زبان میں تبصروں کے معیار کو بلند کرنے کی سعی بلیغ کی ہے مگر قاری آگے چل کر جب خود ان کے لکھے ہوئے تبصروں کو پڑھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مدون کئے ہوئے سارے اعلیٰ اصول محض برائے بیت ہیں اور مصنف نے اس پوری کتاب میں خود اپنے اصولوں کی جی بھر کر خلاف ورزی کی ہے۔ تنقید اور تبصرے کے رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ "اعلیٰ درجہ کا تبصرہ وہ ہے جو تنقید کی تمام صفات اپنے اندر جذب کر کے بھی تبصرہ ہی رہے یعنی جو زیر نظر تصنیف پر لیکن آئندہ کے امکانات اور اچھے برے پہلوؤں کی نشاندہی بھی کرتا چلے اور اس کی سند آئندہ بھی اپنا وزن رکھے۔" مزید یہ کہ "سکڑے تو تبصرہ، پھیلے تو تنقیدی مقالہ۔ تبصرے میں تبصرہ نگار خود کو اتنا ہی نمایاں کرے جتنا کتاب کے تعارف، اس کی چھان بین + ناپ تول اور جانچ پڑتال کے لئے ضروری ہو۔ اس سے زیادہ علمیت بگھارنا، ہائی کورٹ کا واحد جج بن کر بیٹھنا، مصنف کی رہنمائی کی خاطر حوالوں اور بیانوں کا پورا دفتر کھولنا اور تبصرے کے بہانے اپنی اطلاعات اور تاثرات کی پوتھی پھیلا دینا، تنقیدی مقالوں کے لئے چھوڑ دینا مناسب ہے۔"
(ظ۔ انصاری کا مطلب غالباً یہ نہ ہوگا کہ تنقیدی مقالے انھیں عیوب کا پشتارہ ہوتے ہیں جن کا ذکر ابھی کیا گیا ہے) ان ۱۔ "کتاب شناسی" میں جب ہم نے "نقوش اقبال" مصنفہ سید ابوالحسن ندوی پر ظ۔ انصاری کا تبصرہ پڑھا تو بے ساختہ ان کا قول بیان سامنے آگیا۔ اس تبصرے [illegible]

ملا سہالغنوہ ساری باتیں در آئی ہیں جس سے مصنف نے اعدادوں کو (خود کو نہیں) دور رہنے کا مشورہ دیا ہے۔
یہ تبصرہ زیر نظر کتاب پر تو کم ہے البتہ فنون لطیفہ کے متعلق اقبال کے افکار و نظریات پر ظ۔ انصاری نے اپنی معلومات کا ذخیرہ پورے سات صفحوں تک پھیلا دیا ہے۔ حالانکہ نقوشِ اقبال کے متعلق ہم بھی یہی سمجھتے ہیں کہ اگر مولانا اس کتاب کو عربی ہی میں رہنے دیتے، اردو میں نہ چھپواتے تو یہ اقبال اور اقبالیات پر ان کا احسان ہوتا۔ بہر حال مجموعی طور سے اقبال سے متعلق تو کتابوں پر ظ۔ انصاری کا معقول تبصرہ غالباً "کتاب شناسی" کا سب سے فکر انگیز حصہ ہے اور مصنف نے فکرِ اقبال کے بعض گوشوں کو اجاگر کرنے میں دیدہ ریزی اور کاوش سے کام لیا ہے۔
قرۃ العین حیدر کے سوانحی ناول (فیملی ساگا) "کارِ جہاں دراز ہے" پر ظ۔ انصاری کا تبصرہ، جسے انھوں نے خود پیروڈی سے تعبیر کیا ہے، کتاب شناسی کا سب سے زیادہ عبرت ناک باب ہے۔ اس کو پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تبصرہ نگار کے دل کا چور لفظ لفظ میں موجود ہے۔
دیانت داری، بے طرفی اور علمی و فنی نقطۂ نظر سے کتاب کی قدر و قیمت متعین کرنے کے بلند و بالا اصولوں کی وکالت کے باوجود ظ۔ انصاری نے "کارِ جہاں دراز ہے" کی ہجو جس پیرایۂ بیان میں کی ہے وہ قرۃ العین حیدر کے اس نادرہ کار ادبی و فنی کارنامے کو دیکھتے ہوئے ایسی ہے جس سے کنہیا لال کپور اور رشید احمد صدیقی دونوں نے (پس مرگ) عبرت پکڑا ہوگا۔ پیروڈی سمجھ کر پڑھئے تو انداز بیان بڑا پر لطف نظر آئے، تبصرے کی نگاہ سے دیکھئے تو تنقید اور تہدید کی جھلکیوں سے قدم قدم پر واسطہ پڑے۔ مثال کے لئے ظ۔ انصاری کے لکھے ہوئے یہ پیراگراف دیکھئے:
(۱) (عالم ارواح میں) کتاب باصواب آئی سلطنت کی طرح دست بدست گھومی۔ اپنے وقت کے ابدال پیر رومی نے ملاحظہ فرمایا۔ اقبال سیالکوٹی کی جانب سرکایا کہ "اے مرید ہندی دیکھ! جو خاک تیرے اشکوں سے سیراب ہوئی، ابھی نم ہوتے ہی زرخیز نکلی۔ اب اس سے مواص معنی اگ رہے ہیں۔ آید کہ ناید کا کھٹکا دل سے نکال دے"۔ وہ مرد مومن اپنی پر نور پیشانی پر کف دست مل کر بولے ؎
دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم۔
ستیر قونیہ والے رومی نے کہا "لو در دلیشو! ہم نے آٹھ صدی پہلے ایک نکتہ سمجھایا تھا۔ آزمودہ نسخہ بتایا تھا کہ ؎
خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں ⁂ گفتہ آید در حدیث دیگراں
مگر یہ دخترِ نیک اختر ہندی نژاد کون ہے جو صدیوں کے تاریخی افسانوں اور دیو ہیکل انسانوں کا رشتہ اپنے گھر سے جوڑتی ہے اور ہر کہانی کی تان اپنے ابا اماں پر توڑتی ہے۔ اللہ اکبر! جانے غور کر داستان کے ۱۸۰ صفحے۔ یعنی دونوں دفتیوں کے درمیان ایک تہائی سے زیادہ ورق صرف والدین! بلکہ والد بزرگ وار کے بیان میں صرف کردے ہیں۔ الگ سے انھیں کی سوانح حیات پر کتاب کیوں نہ لکھ دی۔
(۲) احمد علی (انگارے والے) کچھ کبیدہ خاطر ہوئے، نہ جانے تھے، سجاد ظہیر سے یا بیٹا (قرۃ العین حیدر) سے یا دونوں سے رسوائی سے ہونے۔ فیملی میمائرس کا ادب چل تو پڑا تھا اور پہلے سے مگر ایسے نہیں کہ ہاتھی سے کودے بیل گاڑی میں اور بیل گاڑی سے اچھلے تو فٹن میں۔ اور ہر مقام پر آپ ہی آپ ہیرو!۔
اپنے وقت میں ہم نے تم نے بھی اپنے گھروں سے کردار چنے لیکن یہ کیا کہ دلی کے جھٹ پٹے میں، گلی کوچوں میلوں میں، بازار کی مخلوق ہی نظر نہ آئے اور آئے بھی تو نوکر چاکر کی گینٹری میں۔"
(۳) اگر کہیں کسی کے دل میں (سجاد حیدر یلدرم کی طرف سے) برائی بھی پڑی رہ گئی ہو تو بیٹیا کے اس سوانحی ناول نے قینچی، چاقو، بلیڈ اور ایسڈ (ACID) سے صاف کردی۔ میاں یلدرم کا پورٹریٹ ایسا صاف آیا کہ واللہ! پنڈت رتن ناتھ سرشار کہتے تھے کہ شیوجی کی جٹاؤں سے گنگا بہی ہے اور کوثر و سلسبیل میں جا ملی ہے مگر میاں سجاد حیدر نے بے نیازی کے مارے کبھی یہ کتاب کھول کر بھی نہ دیکھی، سر ورق کا ڈیزائن دیکھتے رہے۔"

قارئین بآسانی خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ظ۔ انصاری کی ان سطور کو تبصرہ نگاری کے کس خانے میں فٹ کیا جائے کیوں کہ نہ اس میں رواداری ہے نہ بے طرفی، نہ علمی اپروچ ہے نہ کتاب شناسی کا جذبہ، پھر بھی یہ تبصرہ ہے بلکہ تبصروں کا تبصرہ ہے۔ عجب ستم عجب!

کتاب شناسی میں ظ۔ انصاری کے تقریباً سو تبصرے شامل ہیں جو مختلف عنوانات کے تحت اکٹھے کئے گئے ہیں مثلاً تنقید، تحقیق، طنز و مزاح، شاعری اور متفرقات۔ پوری کتاب کا تقریباً نصف حصہ یعنی ۱۲۷ صفحات صرف شاعری کی کتابوں پر تبصرے کے لئے وقف ہوا ہے۔ (شاعری کی کتابیں چھپتی بھی زیادہ ہیں اس لئے لامحالہ انھیں پر تبصرے بھی زیادہ شائع ہوتے ہیں)۔ اس حصے میں خالی مکان اور تیسری کتاب (جدید شاعری، محمد علوی) شب کا سندیسہ (وحید اختر) شجر صدا (عتیق حنفی) شاخ نہال غم اور جستہ جستہ (خورشید الاسلام) طلسم حرف (مظہر حنفی) زرد زرخیز (زیب غوری) منافقوں میں روز و شب (مدحت الاختر) نیم خواب (شاذ تمکنت) کے ساتھ ساتھ نازش پرتاب گڈھی، بیکل اتساہی، کاوش بدری، مختار ہاشمی، اعزاز افضل اور سب سے بڑھ کر سکندر علی وجد کی شعری تخلیقات پر تبصرے شامل ہیں۔ (سکندر علی وجد کی کتاب پر تلخ مقدمے بازی تبصرہ نگاری کی تاریخ کا جزو بن چکی ہے) ان تبصروں کا مطالعہ کرنے سے چند باتیں ذہن میں ابھرنے یا اگنے لگتی ہیں (اگنا اور اس کے مشتقات، اگتے ہیں، اگتی ہیں، اگی ہیں، اگ رہے ہیں وغیرہ وغیرہ ظ۔ انصاری کے محبوب ترین افعال کے صیغے ہیں۔ جن کا اطلاق وہ مرد عورت، چرند پرند، شجر حجر لفظ و معنی سب پر یکساں جوش و خروش سے کرتے رہتے ہیں)۔

(ا) ظ۔ انصاری، زیر تبصرہ کتاب کو سرسری نہیں ٹالتے بلکہ پورم پور مطالعہ کرنے کے بعد ناپ تول اور چھان پھٹک کر رائے دیتے ہیں (خوب کرتے ہیں، ہونا بھی یہی چاہیئے)

(ب) معاملہ جدید شاعروں، خاص کر نظم نگاروں کا ہو تو طرف بلکہ دلداری سے بھی گریز نہیں کرتے مگر دوسروں کے معاملے میں سخت دشمن فہم واقع ہوئے ہیں۔

(ج) ظ۔ انصاری غزل گو شاعروں کے حال اور مستقبل دونوں سے مایوس ہیں۔ غزلوں کے مجموعوں پر وہ زیادہ تر تلخی اور تندی سے لکھتے ہیں۔ شاعر اگر دور کا ہوا تو ان کا وار براہ راست اور اگر قریب کا ہوا تو آڑے ترچھے پینتروں سے ہوتا ہے مگر بخشتے وہ کسی کو نہیں۔

(د) ان کی نظر شعری محاسن پر کم تر، شعری معائب پر زیادہ تر رہتی ہے۔ ایسا شاید اس وجہ سے ہو کہ حسرت موہانی کی "معائب سخن" برابر ان کے مطالعے میں رہتی ہے اور جا بہ جا وہ اس کے حوالے دیتے رہتے ہیں۔

(س) شعری مطبوعات پر تبصروں کے لئے ظ۔ انصاری کا اکل کھرا ذہن اور کٹیلا اسلوب دونوں سم قاتل ہیں۔

ظ۔ انصاری اپنے تبصروں میں مصنفین اور شعرا کی زبان و بیان کی خامیوں پر کڑا احتساب کرتے ہیں۔ اچھی بات ہے۔ کرنا بھی چاہئے۔ مگر جب خود اس کتاب میں زبان اور محاورے کی "اڑن گھائیاں" نظر آتی ہیں تو تعجب ہوتا ہے۔ مثلاً

(۱) "ناول اور افسانہ ایک طرف، شعری مجموعے جو مغرب کے بازاروں میں پڑے پھرتے ہیں" (صفحہ ۱۴)
"پڑے پھرتے ہیں" اردو کا ٹکسالی محاورہ ہرگز نہیں ہے۔ 'مارے مارے پھرتے ہیں' ہونا چاہیئے۔

(۲) نیون لائٹس (NEON LIGHTS) کے زمانے میں موم بتی سے اپنی گلی کا راستہ دکھانے پر آدمی راضی ہو تو بے نیازی سے جم کر بیٹھے۔ اور آنکھیں ٹپکائے۔ (صفحہ ۱۲۳)
آنکھیں ٹپکانا، کون سا محاورہ ہے ہم نے نہ تو کہیں لکھا دیکھا نہ کانوں سے سنا۔

(۳) "قدر دانی سے گذر کر وہ تجربے کی جس بھٹی میں کودے ہیں وہاں دیر تک رہنے والوں کی راکھ اڑ جاتی ہے یا کشتہ بن جاتا ہے۔"
راکھ اڑجانا۔ چہ معنی دارد؟ یہ اردو کا محاورہ تو ہے نہیں۔

(۴) "جاویدکو قدرت نے دردیلی اور مردانہ آواز کی نعمت بخشی ہے" دردیلی سڑک چھاپ ترکیب ہے جو یو۔ پی۔ کے بجر بٹ دیہاتوں کے گنوار بولتے ہیں۔ درد انگیز ہونا چاہیئے

آخر میں چند باتیں ظ انصاری کے تیکھے، کٹیلے، کھردرے اور دردرے اسلوب کے متعلق جس کی تعریف سبھی اخبار اور رسالے والے کرتے ہیں ہم اس کی مزید تعریف کیا کریں، البتہ یہ کہنے میں حرج نہیں کہ یہ اسلوب تنقید اور تبصرے کے قامت پر بالکل نہیں سجتا۔ تخلیقی کاموں پر تنقید یا تبصرہ بھی تخلیق کے شایانِ شان ہونا چاہیئے۔ نفسِ مضمون کے اعتبار سے بھی اور اسلوب کے اعتبار سے بھی۔ خالص سونے کی پرکھ ریل کی پٹریوں کے درمیان پڑے رہنے والے پتھروں پر گھس کر نہیں کی جاتی۔ اس کے لئے ایک خاص قسم کی کسوٹی درکار ہوتی ہے، اسی پر سونے کو کستے ہیں تنقید میں لطفِ بیان کی خاطر بذلہ سنجی، اور خوش مذاقی تو گوارہ کی جا سکتی ہے مگر طنز و مزاح، شائر اور پھبتی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ظ انصاری کے تبصروں میں کبھی با موقع کبھی بے موقع یہ سب چیزیں ایک ایک کر کے در آتی ہیں۔ جو بذات خود تو پر لطف ہوتی ہیں مگر تنقید کے چوکھٹے میں بے محل اور بے جوڑ معلوم ہوتی ہیں۔ نقوشِ اقبال (از مولانا علی میاں) پر ظ انصاری کے تبصرے میں یہ جملے بھی شامل ہیں۔

"ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی طرح علی میاں بھی قلم کے رستم ہیں۔ ہر ایک تصنیف گویا ایک ہی نشست اور ایک ہی موڈ میں رواں دواں چلی جاتی ہے، اور بہاؤ میں کنارے کے خس و خاشاک، شجر حجر سبھی ساتھ ہو لیتے ہیں۔ اقبال پر علی میاں کی تصنیف کا بھی یہی حال ہے حیثیت عام تعارف کی، روانی دریا کی، پاٹ چوڑا، موتی نایاب، سننے میں آیا ہے کہ کسی کسی کو نظر آجاتے ہیں"۔ (صفحہ ۱۵۸)

واجدہ تبسم کی کتاب "اترن" کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"ڈھائی سو صفحے کے اس افسانوی مجموعے میں حیدرآباد کے نکھارے بیگنوں کا پورا مسالہ پڑا ہے اور رنگ بھی چوکھا آیا ہے۔ فنکار نے اسے قبولِ عام کی سند دلوانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ واجدہ تبسم کی "اترن" اگر فلم ہوتی تو اسے 'A' کے خانے میں شمار کیا جاتا اور لڑکوں بالوں کی رال ٹپکتی۔ اس میں "نوکھا ہار" جیسا شاہکار افسانہ بھی ہے جسے نابالغ پڑھے تو بالغ ہو جائے۔"

محمد علوی کی تیسری کتاب کے بارے میں رقم طراز ہیں:۔

"داہنے بائیں ان دو نقادوں (وارث علوی اور شمس الرحمٰن فاروقی) کے فاصلانہ فیصلوں سے ہم اتنا مرعوب ہوئے کہ محمد علوی کی بہار منہ شاعری کی سوندھی مہک کا لطف نہ اٹھا سکے شعر کے تنِ نازک کو دو طرف سے گھیر دار بھاری پیرہنوں نے بری طرح ڈھک لیا ہے۔"

اس تبصرے میں "بہار منہ شاعری کی سوندھی مہک" کے نو ایجاد استعارے سے قطع نظر، محمد علوی کی شاعری میں تو شعر کے تنِ نازک پر ظ انصاری کو بڑا ترس آتا ہے مگر جب وہ خود شعر کے اس تنِ نازک پر صرف نوک نشتر سے چرکا نہیں لگاتے بلکہ آرے سے چیرتے ہیں تو ان کا جمالیاتی احساس کہاں سو جاتا ہے۔ مثالیں بہت دی جا چکی ہیں، اس لئے مزید مثالوں سے گریز کرتے ہوئے بطور خلاصہ کلام ہم اتنا ہی کہیں گے کہ یہ چند آڑی ترچھی باتیں جو ہم نے ظ انصاری ہی کی زبان اور اسلوب میں لکھی ہیں ان سے اصل کتاب کی اہمیت اور افادیت کم نہیں ہوتی۔ اہلِ ذوق جتنا ٹھہر ٹھہر کر اس کتاب کا مطالعہ کریں گے اتنا ہی لطف پائیں گے۔ پڑھنے اور محفوظ رکھنے کے قابل کتاب ہے بوقت ضرورت کام بھی آسکتی ہے۔

تبصرے

نام کتاب : **ناخن کا قرض**

نام مصنف : میرزا ادیب

امتزاج پبلیکیشنز : ۶/اے، نصیر الدین روڈ، اسلام پورہ، لاہور

قیمت : پچیس روپے

ایک شخص ادب کی دنیا میں داخل ہوتا ہے حسین خوابوں کے ساتھ لیکن مادی طور پر تہی دست! کبھی اس کا خاندان بڑا نام آور تھا لیکن اس نے جب آنکھ کھولی تو وہ اس کے کھنڈر پر کھڑا تھا۔ وہ جب ان شکستہ کنگروں، بوسیدہ دیواروں اور زمین بوس ڈیوڑھی سے نکل کر تخیل و تصور کی دنیا میں آیا تو اسی طرح گرد آلود چہرہ اور ہاتھوں کے ساتھ۔ اس دنیا میں اس نے بہت سے بلند پرواز دیکھے، متعدد عالی مقام، لیکن ان کے علاوہ ایسے بھی کچھ لوگ تھے جو ظاہر و باطن میں بالکل اسی کے جیسے تھے، اور اس کے ساتھ ساتھ غیر معروفیت کی راہ پر چل رہے تھے۔ ان سے تعلق کا قرض میرزا ادیب کے ناخن پر تھا جسے انھوں نے اس سوانحی مضامین کے مجموعہ کے ذریعہ ادا کیا ہے۔ اس کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر غلام اظہر نے لکھا ہے جو خاص اس مجموعہ میں صرف دو خاکے ایسی شخصیتوں (سجاد ظہیر اور منٹو) پر ہیں جن پر لکھنا آجکل فرض کفایہ تصور کیا جاتا ہے۔ بقیہ جتنی شخصیتیں ہیں ان پر یا تو کم لکھا گیا ہے یا انھیں بہت جلد بھلا دیا گیا ہے۔ صحافت کی دنیا میں صلاح الدین احمد اور شاہد احمد دہلوی نے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔ یہ دونوں حضرات نہ صرف یہ کہ خود صاحب قلم تھے بلکہ ان کی نظر توجہ نے بہت سے نو واردوں کی تربیت و ہمت افزائی کی اور انھیں شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ ابن انشا اور مصطفےٰ زیدی بڑی جلدی اس دنیا سے رخصت ہو گئے، شاید اسی لئے بہت ہی جلد ان کی یاد میں معدوم پڑنے لگیں۔ چودھری برکت علی، شبلی بی کام، حافظ محمد عالم، حکیم فقیر محمد چشتی، میاں محمد اسحاق، کمال احمد رضوی، خوشتر گرامی اور خدا بخش اظہر ان شخصیات میں سے تھے کہ جنھوں نے صلہ و ستائش کی تمنا سے بالاتر ہو کر ادب و فن کی خدمت کی، ان میں سے بہت سے کیا بلکہ سارے کے سارے وہ تھے جنھوں نے مرزا ادیب ہی کی طرح تہی دستی اور بے سر و سامانی کے عالم سے نکلنے کی خود جد و جہد کی اور "خود خریدگی" کا ثبوت دیا۔ ان کا ذکر وہ لوگ کیوں کریں گے جنھوں نے آسودہ حالی میں ساری زندگی گذاری اس کے باوجود مفلوک الحال طبقہ کے نمائندہ ہیں۔ ان کے یہاں عالی شان محل ہیں، اشراف کی محافلِ رقص و سرود ہیں، اعلیٰ ترین تعلیم کی سہولتیں ہیں، جاگیر داروں اور حاکموں کا تذکرہ ہے، لیکن اگر نہیں ہے تو وہ طبقہ جس کے غم کا مداوا "کسی اور طرح" کرتے ہیں۔ دیویندر ستیارتھی آج بھی ترقی پسند ہیں، لیکن ان کے ساتھ لوگوں کو کتنی اور کیسی ہمدردی ہے، یہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا

ہوں۔ ان تمام شخصیات کا تذکرہ میرزا ادیب نے اس انداز سے کیا ہے کہ ان کا قرب و تعلق بالخصوص نمایاں حیثیت سے نہیں! سوانح نگار کے لئے یہ مرحلہ بہت مشکل ہوتا ہے، وہ قدم قدم پر اپنے ہیں کے سحر میں گرفتار ہو جاتا ہے اور مذکورہ شخصیت پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ میرزا ادیب نے اپنے میں کو جس طرح اپنے قابو میں رکھا ہے وہ سوانحی خاکوں کے فن میں انھیں امتیاز بخشتا ہے۔

ہر سوانح نگار کی ایک محوری شخصیت ہوتی ہے۔ مرزا ادیب کی سوانحی خاکوں کی مرکزی شخصیت اختر شیرانی ہیں، جن پر حالانکہ انھوں نے بڑا تفصیلی خاکہ لکھا ہے لیکن وہ تقریباً ہر خاکہ میں راوی، سند یا وسیلہ کے طور پر موجود ہیں۔ میرزا ادیب نے ان کی کمزوریوں کے گرد تقدس کا ہالہ نہیں کھینچا ہے۔ اپنے استاد کے سلسلے میں یہ معروضی رویہ خاکہ نگار کی دیانت داری کی تصدیق کرتا ہے۔ راجہ مہدی علی خاں، شمش آغا، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ وہ شخصیات ہیں جن کو انھوں نے بے حد عام سی زندگی کے قرطاس پر پیش کیا ہے اور ان کا اعتراف بھی کیا ہے۔

مرزا ادیب ایک شخصیت کا ذکر کرتے کرتے اکثر دوسری تفصیلات اور شخصیات کے بیان کی طرف مڑ جاتے ہیں لیکن یہ گریز مطالعہ کے تسلسل میں خارج نہیں ہوتا۔ انھوں نے کچھ ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ ان کی مذکور شخصیت تنہا ہونے کے بجائے معاشرتی جلو میں زندہ رہتی نظر آتی ہے۔ انھوں نے بلا وجہ خود کو طبقۂ اعلیٰ میں شمار کرانے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ ان لوگوں کو زیادہ اہمیت دی ہے جو مصعب علی کی طرح ہمارے معاشرے کی حقیقت ہیں۔ وہ انسانی کمزوریوں کو انسانی رنگ میں پیش کرتے ہیں، قاری کے لئے آوارگی کے چٹخارے فراہم نہیں کرتے۔ ان کے افسانہ نگاری کے فن نے انھیں ایک پرکشش اسلوب عطا کیا ہے۔ ہر خاکہ میں ایک فضا پیدا ہو جاتی ہے اور مذکور شخصیت کرداری اوصاف

کے ساتھ ابھرتی ہے۔ اس حسن کو برقرار رکھنے کے لئے انھوں نے تاریخ، دن اور ماہ و سال کو اہمیت نہیں دی ہے۔
ایک بزرگ ادیب نے اپنے پختہ و پرکشش و سادہ اسلوب میں "جہاں گرد کے رومان"، "ناخن کا قرض" ادا کرنے کے لئے محفوظ کر لئے ہیں۔ انھیں فراموش کرنا مشکل ہوگا۔

ابن فریدا

نام کتاب : محمد حسن عسکری: آدمی یا انسان
مصنف : سلیم احمد
: مکتبہ اسلوب، ۲ ڈی ۲۴/۹ ناظم آباد، کراچی ۱۸
قیمت : پندرہ روپے

محمد حسن عسکری نے اپنی زندگی کے آخری دور میں ادب سے اپنی برأت کا اعلان کر دیا تھا۔ وہ اسے دورِ جاہلیت کی پیداوار قرار دیتے تھے لیکن ان کا حشر بھی غالب سے کچھ زیادہ مختلف نہ ہوگا۔ غالب نے ہر چند اپنے فارسی کلام کی طرف توجہ دینے کی اپیل کی اور اردو کلام کو بے رنگ قرار دیا، لیکن وہ آج اپنے اردو کلام اور خطوط ہی کی وجہ سے زندہ ہیں۔ بالکل اسی طرح عسکری ان تحریروں کی وجہ سے ہی زندہ رہیں گے جن کو انھوں نے "عاق" کر دیا تھا۔ عسکری کے عزیز دوست، رفیق اور شاگرد سلیم احمد نے (جو خود جدید اردو تنقید میں اپنا مقام بنا چکے ہیں) ایک مختصر سی سوانحی کتاب اس نام سے لکھی ہے کہ "موضوع بحث" سے روز روشن کی طرح نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس کتاب پر تفصیلی دیباچہ نظیر صدیقی نے لکھا ہے اس دیباچہ سے عسکری اور سلیم احمد کے تعلقات و مراسم اور کتاب کے مباحث کا اجمالی تعارف ہو جاتا ہے۔

سلیم احمد نے عسکری کی فکری اساس کو متعارف کرنے کے لئے ان مباحث کو اٹھایا ہے جن سے عسکری کے ذہنی ارتقا کو سمجھنے میں بھی مدد ملے۔ انھوں نے جبلی فرد اور شعوری فرد، تنہا فرد اور اجتماعی فرد، مادہ پرست فرد اور اقدار پرست فرد، مشرقی فرد اور مغربی فرد وغیرہ کے

موازنات کے ذریعہ نہ صرف یہ کہ عسکری کے نظام فکر کو پیش کیا ہے بلکہ جدید معاشرہ کے المیہ اور اس کی خوبیوں کو بھی مدلل انداز میں بیان کیا ہے۔ سلیم احمد موقع بہ موقع سوالات اٹھاتے جاتے ہیں اور پھر ان کے سیر حاصل جوابات دیتے ہیں۔ اس طرزِ بیان کے ذریعہ قاری کے اندر خشک فلسفیانہ مباحث میں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے اور مسئلہ کا حل تلاش کرنے کا تجسس دوگنا ہو جاتا ہے۔ انتہائی خشک موضوع کو انھوں نے جس طرح لائق مطالعہ بنا دیا ہے وہ صرف انہیں کے بس میں تھا۔ سادہ و پرکار نثر تو سلیم احمد کی انفرادیت ہے۔

دیباچہ میں زبیر صدیقی نے جو انگریزی الفاظ یا فقرے استعمال کئے ہیں ان کی جگہ آسانی سے اردو الفاظ استعمال کئے جا سکتے تھے۔ سلیم احمد نے کئی ابواب میں پچھلی بحث کے خلاصہ کو دہرایا ہے۔ یہ "استحضار" درسی کتابوں کے لئے تو موزوں و مناسب ہے لیکن جس معیار کے قارئین کو وہ دعوت مطالعہ دے رہے ہیں، ان کے لئے غیر ضروری ہے۔ ایک جگہ انھوں نے MAN IN THE STREET کو راستہ کا آدمی کہا ہے۔ کیا یہ لفظی ترجمہ اصل مفہوم کی صحیح ترجمانی کرتا ہے؟ لیکن خیر یہ سب فروعات ہیں ان گرفتوں سے کتاب کے محاسن پر کوئی جراحت نہیں لگتی۔

یہ کتاب عسکری کی ذہنی نشو و نما اور فکری بالیدگی کا بصیرت افروز اور فکر انگیز مطالعہ ہے۔ یہ ایک نوعیت سے عسکری پر تمہیدی کتاب بھی ہے جس سے آئندہ بہت سے مباحث کا آغاز ہوگا۔ کچھ کا تو ابھی سے ہو چکا ہے۔

—— ابنِ فرید

عصری ادب (اپریل تا جولائی ۱۹۸۲ء)

مدیران :— سید بہاؤ الدین، روشن آرا

پتہ : ڈی ۔ ے ۔ ماڈل ٹاؤن ۔ دہلی ۹

عصری ادب ایک جانا پہچانا ادبی رسالہ ہے۔ اس رسالہ کا ایک امتیاز یہ رہا ہے کہ اس میں ادب کو زندگی، سیاست اور معاشرتی صورتِ حال سے الگ رکھ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اس رسالے کو اس سلسلے میں بھی اہمیت حاصل ہے کہ اس سے ایک مخصوص طرزِ فکر کی عکاسی ہوتی ہے اور اپنے سکہ بند ترقی پسند موقف میں ادارہ عصری ادب نے آج تک کوئی لچک پیدا نہیں کی —— یہ سب کچھ ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس ادبی رسالہ کا مقصد زبان و ادب کی ترویج و اشاعت اور ادبی سرگرمیوں کا اظہار رہا ہے بھی یا نہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ عصری ادب کے نکلنے اور جاری رہنے کے محرکات ادبی اور لسانی سے زیادہ سیاسی اور غیر ادبی ہیں یہ خیال اس لئے بھی پیدا ہوتا ہے کہ ترقی پسند نقطۂ نظر سے ہی سیاسی، سماجی اور ذاتی مقاصد کو ادب کے وسیلے سے حاصل کرنے کا نام رہا ہے۔ اس تحریک کے زیر اثر ادب کی جو بھی خدمت ہوئی اس کی حیثیت انگریزوں کے منصوبہ بند نورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات کی طرح ثانوی اور ضمنی حیثیت رکھتی تھی۔ اس شبہے کو ترقی پسند ادیب آج بھی ادب کا استعمال اپنے تعصبات کی تسکین کے لئے کر رہے ہیں: زیر نظر شمارے سے مزید تقویت ملتی ہے ——
کیفی اعظمی جیسے تیسرے درجہ کے شاعر پر گوشہ، تجدد پسندوں پر او چھے وار اور مذہب پسندوں کو ہدف ملامت بنا کر ایسی ہی خدمات انجام دی جا رہی ہیں ——

آیئے سب سے پہلے پاکستانی مطبوعات پر محمد حسن کے جائزے پر نگاہ ڈالی جائے۔ فاضل مبصر نے پاکستانی تنقید کا سب سے مہلک اور منفی رجحان ہند پاک کی سرحدی ادب کی تقسیم کو بتلایا ہے اور اس طرح بعض مسلمان نقادوں کو صرف اسی لئے مورد الزام قرار دیا ہے کہ وہ ادیب و نقاد ہو کر بھی اسلام کے ماننے والے ہیں —— اس سے پہلے موصوف عصری ادب ہی کے کسی پچھلے شمارے میں کمار پاشی کو ہندو مائتھالوجی سے استفادے پر، خلیل الرحمٰن اعظمی کو آخری عمر میں مذہبی ہو جانے پر اور عادل منصوری کو نماز پڑھنے پر اپنی ہرزہ سرائی کا نشانہ بنا چکے ہیں —— حسب معمول زیر نظر شمارے میں اس مذہب دشمن مبصر کا حملہ عسکری پر ہے۔ موصوف کے چند جملے آپ بھی برداشت

کریں۔

"محمد حسن عسکری مرحوم نے پاکستانی تنقید کو مفلوج کرنے میں بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔ فکر اور شعور سے رشتہ توڑ کر اسے سریت، مذہب، مابعد حتیٰ کہ الہام اور جنون تک کی منزلوں تک لے آئے اور ہیئت ہیئت کے نعرے بلند کرتے رہے .... ترقی پسندوں سے ہنتی تھی اس لئے عقل سماجیات شعور اور استدلال سے رشتہ توڑ کر وجدان اور سریت یا ماورائیت سے رشتہ جوڑا۔"

فاضل مبصر کا آخری جملہ ان کو بے نقاب کرنے کے لئے کافی ہے کہ گویا ترقی پسندوں کا ہم نوا ہونا باشعور اور معقول ہونے کی دلیل ہے اور اس سے انحراف نا معقولیت اور جنون ـــــ اس کا مطلب صاف ہے کہ عسکری کا ترقی پسندی کے شر سے محفوظ رہنا اور مذہب کی باتیں کرنا فاضل مبصر کے لئے سب سے بڑا جرم ہے ـــــ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ مبصر نہ تو اردو کی ادبی روایت سے واقف ہے اور نہ ادب اور ذاتی عقیدے کے فرق کی تمیز رکھتا ہے۔

ذرا غور کیجئے کہ اگر عسکری نے سریت اور ماورائیت کی باتیں کیں اور یہی اس کا جرم ہے تو اس سے پہلے خواجہ میر درد اور دوسرے صوفی شعراء کو گردن زدنی قرار دینا چاہیئے۔ اگر مبصر کے خیال میں عسکری نے مابعد الطبیعا کی رستہ ڈھونڈھے تو کیا ان سے قبل مشہور ماہر نفسیات اور مفکر ادب یونگ نے ایسا کچھ نہیں کہا اور لکھا، پھر اسے کیوں معاف کیا جائے ـــــ پوچھنے کی بات یہ ہے کہ اگر ایک ترقی پسند مارکس اور انجلز کا فکری طور پر غلام اور پجاری ہو سکتا ہے تو کیا کوئی مسلمان اپنے خدا کی پرستش نہیں کر سکتا ـــــ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ کسی ادیب کے ذاتی عمل سے آپ کو کیا غرض ـــــ آپ اس کی ادبی قدر و قیمت پر غور کیجئے اور بس ـــ یہی دیانت داری ہے اور یہی ادبی اقدار کا تقاضا ـــــ جب

کوئی آپ سے یہ نہیں پوچھتا کہ آپ روسیوں کے سبز انقلاب کو مانتے ہیں یا چینیوں کے سرخ انقلاب کو تو پھر آپ کو کسی کے ذاتی عقائد پر طنز کرنے کا کیا حق ہے؟ کیا آپ کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ اس صدی کا ایک غیر معمولی نقاد اور شاعر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اپنی ساری ادبی آزادی کے باوجود مذہبی اعتبار سے خالص کیتھولک ہونے پر نازاں تھا ـــ کیوں نہیں اٹھ کر پیچھے پڑ جاتے اس رجعت پسند کیتھولک ادیب پر ؟

بات کچھ زیادہ طول پکڑ گئی اور پورے رسالے کا جائزہ مزید طوالت کا خواہاں ہے۔ اس لئے زیر نظر رسالے کی اس ایک بات کو بہت جانئے اور اندازہ لگایئے کہ اس کے علاوہ اور جو کچھ عصری ادب کے اس شمارے میں شامل ہے وہ سطحی، معمولی اور تعصبات سے پر ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس طرح کے رسالے ترقی پسند تحریک کی موت پر آنسو بہانے کے بجائے مسلسل اس تحریک سے الگ رہ کر لکھنے والوں پر لعن طعن کا سلسلہ برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور اس طرح میدان جنگ میں کام آنے والے بوڑھے گھوڑوں کی زندگی کا یقین دلانا چاہتے ہیں انھیں کون بتلائے کہ اردو ادب کا کارواں بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ ۳۶ء اب گرد راہ کے سوا اور کچھ نہیں رہا اس لئے مزید دھول اڑا کر ادب کے کارواں کی راہ میں مزاحمت پیدا نہ کی جائے تو بہتر ہے۔ خدا ہر صالح ادب دوست کو اس طرح کے منفی افکار کے شر سے محفوظ رکھے ـــــ آمین ـــــ (لیجیے اس آخری دعائیہ جملہ کو بھی رجعت پسندی کا نام دے دیجئے)

ـــــ سلیم احمد

نام کتاب : نشانِ منزل
مصنف : پروفیسر جگن ناتھ آزاد
ناشر : موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹۔ گولا مارکیٹ۔ دہلی
قیمت : ۴۰ روپے

نشانِ منزل جگن ناتھ آزاد کا دوسرا تنقیدی مجموعہ ہے۔

جگن ناتھ آزاد اردو کے ان بے لوث خادموں میں ہیں جنہیں عشق اردو اور عشق اقبال نے ہمارے نزدیک قابل احترام شخصیت بنا دیا ہے اور جن کی ہر تحریر کو ہم تبرکاً پڑھ کر فیض حاصل کرتے ہیں۔ اس مجموعے میں چودہ مقالات اور نو ریڈیو کے نشریات شامل ہیں اور سبھی تحریر غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔

چودہ مقالات میں دو مقالے راست اقبال سے متعلق ہیں اور بقیہ مقالوں میں بھی اقبال کا ذکر کسی نہ کسی طرح سے کر کے انہوں نے اقبال کے عاشق ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے۔ نشریات والے حصے میں بھی دو مضامین اقبال سے متعلق ہیں۔

پہلا مضمون "حسرت موہانی اور اقبال" ہے جن میں دونوں کے سیاسی مسلک، تصور تصوف اور تصور اشتراکیت پر بحث کی گئی ہے۔ مضمون کے شروع میں اس ادبی مباحثہ کا ذکر ہے جس میں حسرت نے تنقید ہمدرد کے نام سے اقبال کے کلام پر تنقید لکھی اور جس کے جواب میں مولانا عبدالمجید سالک نے اقبال کی طرف داری کا حق استعمال کیا تھا۔

آزاد کا خیال ہے کہ تصوف کو ہماری شاعری میں آبرو اقبال اور کلام اقبال سے ملی ہے لیکن اقبال تصوف میں رہبانیت اور خانقاہیت کے قائل نہیں تھے جبکہ حسرت کے یہاں تصوف اپنے روایتی انداز سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے۔ اشتراکیت سے متعلق آزاد کا خیال ہے کہ اقبال کے یہاں گرچہ اشتراکیت کی لے خاصی مدھم رہی لیکن اقبال اشتراکیت اور اسلام کے نظریہ مساوات میں ایک ہم آہنگی پیدا کرنا چاہتے تھے جبکہ حسرت اشتراکیت کے معاملہ میں کمیونسٹ تھے۔ گویا اقبال اور حسرت صوفی بھی تھے اور کمیونسٹ بھی۔ اقبال پر "اسلام اور اشتراکیت میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا یہ الزام لگانے میں آزاد کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں یہ تو میں اس کتاب کے قارئین پر چھوڑتا ہوں۔ ہاں اتنی بات ضرور عرض کروں گا کہ اقبال کی تحریر سے جس طرح آزاد نے اسلام اور اشتراکیت کی ہم آہنگی کا جواز نکالا ہے وہ اقبال کی روح کے لئے واقعی بے چینی کا سبب بن سکتا ہے۔

دوسرا قابل ذکر مضمون "ترقی پسند شاعری کے عنوان سے ہے۔ یہ مضمون ۱۹۶۲ء میں لکھا گیا تھا اور اسی سال محکمہ السنہ پنجاب کی مجلس مصنفین کے سالانہ جلسہ میں پڑھا گیا تھا اس مضمون کے بارے میں چونکہ خود آزاد کا خیال ہے اس کے اکثر حصے ترمیم و تبدیلی کے محتاج ہیں اور اس وقت نظر ثانی کی فرصت نہیں ہے اس لئے اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں اس کا اہتمام کیا جائے گا لہذا ہم اس دوسرے ایڈیشن تک انتظار کرنے کو تیار ہیں جب ترمیم و تبدیلی کا یہ مضمون محتاج نہیں ہوگا۔ ویسے احتیاطاً اتنی بات عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ ترقی پسند شاعری پر طلباء کے لئے یہ ایک کارآمد مضمون ثابت ہو سکتا ہے۔ اس مجموعہ کا سب سے اہم اور قیمتی مضمون 'فرحت کی زمائش' ہے جو آزاد کی تحقیقی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ یہ مضمون کافی محنت سے لکھا گیا ہے۔

جدید شاعری پر بھی ایک قابل قدر مضمون ہے جو غالباً کالج کے طلباء کی ضرورت کے پیش نظر لکھا گیا ہے۔ لیکن اس مضمون کے بارے میں اتنی وضاحت ضروری ہے کہ یہ جدید شاعری وہ جدید شاعری نہیں ہے جس میں عمیق حنفی، شہریار اور ان جیسے دوسرے جدید شاعروں کا ذکر کیا جاتا ہے بلکہ یہ جدید شاعری عبادت بریلوی والی وہ جدید شاعری ہے جس میں حالی، حسرت موہانی اور اسی قبیل کے دوسرے شعراء کا ذکر پایا جاتا ہے۔

مقالات کے حصے میں آخری مضمون پھر اقبال کے متعلق ہے جس کا عنوان "اقبال صرف مسلمانوں کے شاعر ہیں" ہے عنوان کے ساتھ ایک سوالیہ نشان بھی ہے جس کا جواب خود آزاد نے انگریزی، اردو اور فارسی کے بہت سے حوالوں کی روشنی میں دیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اقبال مسلمانوں کے شاعر بھی ہیں ہندوستان بلکہ ہندوستان کی بیداری کے شاعر بھی ہیں ایشیا کی بیداری کے شاعر بھی ہیں اور عالم انسانیت کے شاعر بھی ہیں۔

آزاد نے ہر موضوع پر اپنا حق ادا کر دیا ہے یہ الگ بات ہے کہ ہر موضوع کا حق کس قدر ادا ہو سکا ہے۔

موڈرن پبلشنگ ہاؤس نے حسب روایت یہ کتاب بھی کافی صاف ستھری شائع کی ہے اور اس سلسلہ کا کریڈٹ بیگم کوبل ... جاتا ہے۔

—— انجم نعیم